کلیاتِ ماجدی

(جلد اول)

شخصیت

ترتیب وتدوین

عطاءالرحمٰن قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

کلیات ماجدی

(جلد اول)

شخصیت

ترتیب وتدوین

عطاالرحمٰن قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت : 2013
تعداد : 550
قیمت : -/196 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1707

Klulliyat-e-Majidi Vol- I
Compiler/Editor : Ataur Rahman Qasmi

ISBN :978-81-7587-925-6

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی-110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

تاریخ اردو زبان وادب میں مولانا عبدالماجد دریابادی ایک معتبر نام ہے۔آپ تحقیق و تنقید، صحافت اور فلسفہ ونفسیات کے حوالے سے ہندوستان ہی نہیں برصغیر میں نیک شہرت رکھتے ہیں۔آپ کی تحقیقی وتنقیدی تحریریں استناد واعتبار کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں اور مآخذ ومصادر میں شمار ہوتی ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو زبان وادب کے معماروں و فنکاروں کے کلاسیکل ادبی وثقافتی سرمایوں وذخیروں کو محفوظ ومدون کرنے کا ایک جامع منصوبہ بنایا ہے، جس کے تحت اب تک متعدد ادیبوں، فنکاروں اور شاعروں کی تحقیقات وتخلیقات کو''کلیات'' کی صورت میں شائع کیا گیا ہے اور متعدد مصنفین ومولفین کی تصنیفات ونگارشات زیر ترتیب وتدوین ہیں۔قومی کونسل کی طرف سے اسی علمی منصوبہ کے تحت پچھلے دنوں مولانا عبدالماجد دریابادی کی جملہ تصنیفات وتالیفات کو''کلیات'' کی شکل میں شائع کرنے کی منظوری دی گئی تھی۔جس کے تحت ''کلیات ماجدی'' کی پہلی جلد منظر عام پر آرہی ہے۔''کلیات ماجدی'' کی ترتیب وتدوین کی ذمہ داری مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب کے سپرد کی گئی ہے۔انھوں نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' کو نہایت اہتمام سے لائق اشاعت بنایا ہے۔ جس کے لیے کونسل ان کی شکر گزار ہے۔

مولانا محمد علی جوہر تحریک آزادی کی صف اول کے مجاہد آزادی، عظیم قومی رہنما اور انگریزی واردو زبان کے ممتاز صحافی اور مایہ ناز ادیب وشاعر تھے۔مولانا جو ہفت روزہ کامریڈ اور

روزنامہ ہمدرد کے مدیر بھی تھے۔ آپ نے مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام
آزاد جیسے قومی رہنماؤں کی رفاقت و معیت میں تحریک آزادی اور تحریک خلافت میں قائدانہ حصہ لیا
اور اپنی تحریر و تقریر کی جادو بیانی سے غیر منقسم ہندوستانیوں کے دلوں میں حریت پسندی اور وطن کی
آزادی کی نئی روح پھونک دی تھی۔ جس کی پاداش میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں و تکلیفیں
برداشت کرنی پڑیں۔ چونکہ علی برادران کی پشت پر بی اماں جیسی دلیر و بہادر اور حریت پسند ماں
موجود تھیں۔ جو شب و روز تحریک خلاف کے دوران اپنے بچوں کو للکارتی تھیں ۔

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی ماں کا کچھ غم نہ کرنا — کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا

اس تحریک خلافت میں مہاتما گاندھی پیش پیش تھے اور دوسرے قومی قائدین بھی
شریک تھے اور اس خلافت تحریک کے ذریعہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کیا گیا تھا۔ یہ پوری
تحریک انگریزوں کے خلاف تھی۔ چونکہ انگریزوں نے عالم اسلام کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا
تھا۔ غرض کہ یہ ڈائری آپ کی زندگی کے مختلف کارناموں پر مشتمل ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی
کے اسلوب اور طرز تحریر سے جو لوگ واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا دریابادی سمندر کو کوزہ
میں بند کرنے کا فن جانتے تھے۔ اس ذاتی ڈائری میں مولانا کا مخصوص اسلوب جلوہ گر ہے۔ تحریک
آزادی اور تحریک خلافت کے دوران علی برادران کے ساتھ پیش آمدہ واقعات کو نہایت اختصار کے
ساتھ لکھ جاتے ہیں۔ جس سے پورا منظر اور پس منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس ڈائری
کے ذریعہ سے پوری قومی تحریک پر بھر پور روشنی پڑتی ہے اور اردو زبان، اردو صحافت اور اردو
شاعری کا روشن کردار قوم و ملک کے سامنے آتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ "کلیات ماجدی" علمی و ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے
دیکھی جائے گی اور ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

ڈائرکٹر

حرفِ چند

تاریخ زبان وادب میں روزنامچہ نگاری کی ایک قدیم اور صحت مند روایت رہی ہے۔ جو ہماری تاریخ کا ایک اہم منبع وسرچشمہ ہے۔ جسے عرف عام میں ڈائری نویسی بھی کہتے ہیں۔

ڈائری نویسی عموماً دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ خود مبتلا بہ انسان خواہ وہ صاحب اقتدار ہو، یا صاحب علم وفضل ہو، کمال صحت وصداقت کے ساتھ روز بروز کے پیش آمدہ واقعات وحقائق کو سپرد قرطاس وقلم کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ایک صاحب قلم تاریخ نویسی کے جملہ ضروری شرائط ولوازمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی محبوب اور اہم شخصیت کی آپ بیتی وسرگزشت کو دلچسپ اسلوب اور شگفتہ پیرائے بیان میں ''یوماً فیوماً'' قلم بند کرتا ہے۔ اور اسے تاریخ زبان وادب کا حصہ بنا دے۔

تاریخ نویسی کی یہ دونوں قسمیں کوئی نوخیز ونوایجاد نہیں ہیں، بلکہ صدیوں پرانی ہیں۔ جن کی وجہ سے ماضی کی بہت سی اہم شخصیتوں اور باکمال ہستیوں کے ذاتی احوال وکوائف اور جلوت وخلوت کے مشاغل ومعمولات سے ہم آگاہ وباخبر ہو سکے ہیں۔ ورنہ بہت سے سبق آموز واقعات وحقائق اور ادبی جواہر پاروں سے ہم محروم رہ جاتے اس بنا پر ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ ڈائری نویسی کی دونوں قسمیں تاریخ زبان وادب کے اساسی وبنیادی مآخذ ومصادر کے زمرے میں آتی ہیں۔

''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' ڈائری نویسی کے دوسرے زمرے میں آتی ہے۔ جس

میں غیر منقسم ہندوستان کے ایک عظیم قومی رہنما، اردو و انگریزی زبان کے باکمال صحافی، جادو بیان خطیب اور مجاہد آزادی کے شب و روز کے واقعات و حقائق کو نہایت ہی خوش اسلوبی و شگفتہ بیانی اور احتساب نفس و جواب دہی کے تصور کے ساتھ احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔

کہنے کو تو یہ ایک مختصر ذاتی ڈائری ہے۔ لیکن حقیقت میں ہندوستان کی تاریخ آزادی، تاریخ خلافت، تاریخ صحافت اور تاریخ زبان و ادب کے باب میں ایک اہم دستاویز اور شاہکار تصنیف ہے۔ جو اپنی معروضیت، سحر نگاری، صدق بیانی، معنی آفرینی، تجزیہ نگاری اور منظر کشی کے اعتبار سے اکثر و بیشتر عربی و فارسی اور اردو زبان میں لکھی گئی ذاتی و سیاسی ڈائریوں اور روز ناموں پر بدرجہا فائق ہے اور بلا شبہ اسے جو استناد و اعتبار حاصل رہا ہے وہ بہت کم دوسرے روز ناموں کے حصے میں آیا ہے۔

''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' کے ڈائری نویس اور وقائع نگار مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم ہیں۔ جو اردو و انگریزی زبان و ادب کے مایہ ناز ادیب، عظیم ناقد، ممتاز صحافی، ماہر فلسفہ و نفسیات اور تحریک خلافت کے ایک اہم رکن تھے۔ آپ کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ آپ 1912 سے مولانا محمد علی جوہر کی وفات حسرت آیات 1931 تک 18-17 سال متواتر و بلا انقطاع اپنی محبوب و ممدوح شخصیت رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے معرکۂ صحافت و خلافت میں ایک صاحب فکر دانشور اور مخلص رفیق کار کی حیثیت سے بڑی مضبوطی و ثبات قدمی کے ساتھ شریک کارواں رہے ہیں اس طرح اگر کہا جائے کہ علی برادران بالخصوص مولانا محمد علی جوہر کی کوئی بھی آپ بیتی و سرگزشت دراصل مولانا عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی و سرگزشت بن جاتی ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اصلاً نہیں ضمناً سہی، اس ڈائری میں قوم و ملک کی دوسری اہم و قد آور شخصیات بھی جلوہ گر ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم اس ''ذاتی ڈائری'' کے دیباچے میں مولانا محمد علی جوہر کی ملکی و عوامی شہرت و مقبولیت اور ان سے اپنی دیرینہ وابستگی کی مدت اور اس ڈائری نویسی کی نوعیت و حیثیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''رئیس الاحرار مولانا محمد علی ماضی قریب میں (یہ ''قریب'' و ''بعید'' اضافی

ہی مفہوم رکھتے ہیں) مسلمانان ہند کے سب سے بڑے سردار تھے۔
مجھے ان سے شرف نیاز وسط 1912 سے ان کی آخری عمر یعنی 1931
تک، کہنا چاہیے کہ 18 - 17 سال کی مدت تک حاصل رہا۔ آئندہ
صفحات میں میں نے اتنے دن کے تاثرات ومشاہدات کو یکجا قلمبند
کر دینے کی کوشش کی ہے۔
ان کی مستقل سیرت یا سوانح عمری ایک بالکل الگ چیز ہے کوئی صاحب
اس "ذاتی ڈائری" کو اس کا بدل یا قائم مقام نہ خیال فرمالیں"

دیباچہ محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق صفحہ 15

مولانا دریابادی نے دیباچے میں گرچہ از راہ تواضع وانکسار یہ ضرور رقم فرمایا ہے کہ یہ کوئی مستقل سوانح عمری نہیں ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ ڈائری نویسی سوانح عمری اور سیرت نگاری سے قدرے مختلف چیز ہوا کرتی ہے۔ جس میں اختصار وایجاز سے کام لیا جاتا ہے۔ بسط واطناب سے کلی طور پر اجتناب وگریز کیا جاتا ہے۔

محمد علی ذاتی ڈائری میں بھی حد درجہ اختصار نویسی وایجاز بیانی سے کام لیا گیا ہے جو اسلوب ماجدی کا خصوصی رنگ ہے۔ اس کے باوجود یہ ڈائری، محمد علی کی عبقری ومتضاد شخصیت کے مختلف ومتنوع گوشوں و پہلوؤں پر محیط ہے اور ان کی پوری کتاب زندگی کا کوئی ورق تشنہ نہیں ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو مولانا محمد علی جوہر سے بے پناہ محبت تھی جس کا برملا اظہار انھوں نے اپنی بعض کتابوں میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

"عقیدت دینی، مذہبی، روحانی رنگ کی، جس زور وقوت، جوش وولولہ سے حضرت حکیم الامت (مولانا اشرف علی تھانویؒ) کے ساتھ ہوئی کسی دوسری زندہ ہستی کے ساتھ نہ تھی۔ لیکن عقیدت سے ذرا ہٹ کر ایک شی محبت بھی ہے، یہ محبت اسی جوش وقوت کے ساتھ محمد علیؒ سے تھی، گویا ایک مقتدا تھے تو دوسرے محبوب"۔ (حکیم الامت نقوش وتاثرات صفحہ ۱۴۴)

مولانا محمد علی جوہر سے اس والہانہ محبت اور غایت تعلق کے باوجود اس ڈائری نویسی کے تاثرات ومشاہدات میں گاہ بگاہ بعض ایسے حقیقت پسندانہ اور چبھتے ہوئے فقرے بھی آگئے ہیں

جومولانا جوہر کی آفاقی شخصیت کی افتادِ طبع، خدوخال اور ان کے فکر ونظر میں رونما ہونے والے نشیب وفراز کی تفہیم وتعبیر میں بے حد معاون ومددگار ہیں۔ اور مولانا دریابادی کی حق پسندی کی واضح دلیل بھی۔

ڈائری کے چند مندرجات ومشمولات پر طائرانہ نظر ڈالتے چلیے۔ جس سے بحسن وخوبی اندازہ ہوسکے گا کہ یہ ایک جامع ترین کتاب ہے۔

نظر بندی، قید فرنگ، اسلام سے شیفتگی، شاعری، خلافت وترک موالات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، کانگریس کی صدارت، گاندھی جی کی مہمانی، ہمدرد اور کامریڈ نقش ثانی، خاتمہ خلافت، سال غم، بی اماں کی وفات، کامریڈ کا خاتمہ، محاربات ہمدرد، شریفی سعودی جنگ، پیر اور مرید کی آویزش، شرعی جمہوریت، ڈائری نویس پر ڈانٹ، نئی اودھ خلافت کمیٹی، خلافت کانفرنس، مرشد کی آخری گھڑیاں، حج اور وفد خلافت، بیباکی، شوخی اور فراخ دلی، تنگ دستی، صاحبزادی کی شادی، بیمار کا سفر یورپ، مکتوب مسافر یورپ، مشاہدات فرنگستان، زخمی شیر بپھرا ہوا، سب وشتم کی گرم بازاری، یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے۔ چھوٹی لڑکی کا عقد، عالم ناسوت میں آخری ملاقات، بیمار مظلوم، مظلوم کی آہ، بیمار کی کراہ، مرنے کے لیے اللہ کے شیر کی آخری گرج، سفر کی کہانی مسافر کی زبانی، ملت یتیم ہوگئی، جوہر میزان جواہر میں، محمد علی کا مقام، اسلام کا دیوانہ، آخری لمحے اور وصیتیں وغیرہ۔

ان کے علاوہ بھی بڑے دلچسپ ودلآویز عنوانات ہیں، جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور دوران مطالعہ قاری پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ دراصل یہ ڈائری قومی وملی خادموں وکارکنوں کے لیے عبرت نامہ اور پند نامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

چونکہ مولانا محمد علی کے ساتھ مسلمانوں بالخصوص ملی وقومی قائدین نے جو سلوک کیا ہے وہ بڑا ہی عبرت ناک والمناک ہے۔ اور اس ذاتی ڈائری میں مولانا محمد علی کی المناک زندگی کی پوری پوری تصویر کشی کی گئی ہے۔

''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' کی پہلی جلد 1954 میں اور اس کی دوسری جلد 1956 میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی زندگی ہی میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے بڑے اہتمام سے شائع ہوئی تھی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی۔ افسوس کہ یہ اہم ڈائری ایک طویل عرصہ سے نایاب

تھی، حالانکہ اہل علم کو اس کی اشاعت کا شدید انتظار اور اس کے مطالعہ کا بے حد اشتیاق تھا۔ اتفاق سے کچھ دنوں قبل کراچی پاکستان میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ جس کے ناشر محمد راشد شیخ ہیں جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے عقیدت وارادت مند ہیں، جنھوں نے ''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی دونوں جلدوں کو علاحدہ علاحدہ شائع کرنے کے بجائے یکجا کر کے طبع کیا تھا اور قدیم کتابت کے بجائے کمپوزنگ کرائی تھی اور بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا اس کے باوجود بہت سی اغلاط تھیں اور متعدد ابواب مکرر درج ہو گئے تھے۔

پھر اسی پاکستانی نسخے کا عکس صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ آج کل بازار میں صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ کے مطبوعہ نسخے دستیاب ہیں۔

''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' کی ترتیب وتدوین میں پاکستانی اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے نسخوں کو سامنے رکھ کر ''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' کا صحیح ومستند ترین نسخہ تیار کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ کلیات ماجدی کی ترتیب وتدوین اور اشاعتی پروجیکٹ میں سب سے پہلے ''محمد علی ذاتی ڈائری کے چندورق'' کی ترتیب وتدوین اور تنقیح وتصحیح کے ساتھ پریس میں جارہی ہے، ایسے خوشگوار موقعے پر میں اپنے کرم فرما بزرگ اور معروف مصنف ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب سابق استاذ شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ وسابق ممبر پارلیمنٹ کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتابوں کی فراہمی میں غیر معمولی مدد کی اور قدم قدم پر اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا ہے۔ کم وبیش تین دہائیوں سے ڈاکٹر قدوائی صاحب کی شفقت وسرپرستی مجھے حاصل رہی ہے، موصوف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں میرے بڑے بھائی کے مربی اور شفیق استاذ رہے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے مجھے بھی عزیز رکھتے ہیں۔

یقین ہے کہ یہ ذاتی ڈائری علمی وادبی حلقوں میں قدرومنزلت کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی نیک شہرت میں مزید اضافے کا باعث ہوگی۔

17 اپریل 2012 — عطاء الرحمٰن قاسمی

نئی دہلی

دیباچہ

رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ ماضی قریب میں (یہ "قریب" و "بعید" اضافی مفہوم رکھتے ہیں) مسلمانانِ ہند کے سب سے بڑے سردار تھے۔ مجھے ان سے شرف نیاز وسط 1912 سے ان کی آخری عمر یعنی ختم 1930 تک کہنا چاہیے کہ 17، 18 سال کی مدت تک حاصل رہا آئندہ صفحات میں میں نے اپنے اتنے دن کے تاثرات ومشاہدات کو یکجا اور قلمبند کردینے کی کوشش کی ہے۔ان کی مستقل سیرت یا سوانح عمری ایک بالکل الگ چیز ہے۔کوئی صاحب اس "ذاتی ڈائری" کو اس کا بدل یا قائم مقام نہ خیال فرمائیں۔

سردار ملت کی عمر کے آخری 5، 6 سال ملت ہی کے بعض طبقات سے شدید اختلافات میں گزرے۔ جنگ ومقابلہ آج اس طبقہ سے ہے کل اس طبقہ سے۔ اور اخیر زمانہ میں تو ان کے خلاف بغاوت بہت عام ہوگئی تھی۔ یہ ساری داستان یقیناً بڑی تلخ ہے اور بہت سے اکابر معاصرین کے عقیدت مندوں کے جذبات کو اس حصہ سے ضرور ٹھیس لگے گی۔لیکن اگر اس جزو کو سرے سے نظر انداز کردیا جاتا تو پھر کتاب کے لیے رہ ہی کیا جاتا۔اپنی والی پوری کوشش اس کی البتہ رہی ہے کہ ان تلخیوں کو زیادہ سے زیادہ نرم اور ہلکے پیرایہ میں پیش کیا جائے۔بعض پڑھنے والوں کی دل شکنی اور ناگواری کسی نہ کسی حصہ سے ناگزیر ہے۔یہ اگر جرم ہے تو اللہ اسے معاف فرمائے اور پڑھنے والے بندے بھی آگے بڑھنے سے قبل عفوودرگزر کی نیت اپنے دل میں پختہ فرمالیں۔

واقعات کے پیش آنے اور ان کے قلم بند ہونے کے زمانے کی درمیانی مدت برسوں کی ہوگئی۔ حافظہ نے ضرور کہیں کہیں دھوکہ دیا ہوگا، اور متعدد واقعات عجب نہیں جو خلط ملط ہوکر رہے ہوں۔ بس اس لازمۂ بشریت کے سوا کوئی ارادی غلطی یا غلط بیانی انشاء اللہ اوراق میں نہ ملے گی۔ گو ان حدود کے اندر بھی اپنے نفس کے تبریہ کا دعویٰ کرنا انسان کے لیے دشوار ہے۔ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ.

ڈائری کا جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے، بارہا ایک ہی واقعہ کو مختلف سیاقوں میں لایا گیا، اور مختلف زاویوں سے اسے دیکھا گیا ہے، اس کے بعد تکرار بیان کے عیب جا بجا پیدا ہو جانا لازمی سا ہو گیا ہے۔ خدا ان اوراق کے ناظرین کو ایسی چشم عیب پوش عطا فرمائے کہ یہ عیب (اور ایک اسی پر کیا موقوف ہے، سارے ہی عیب) انھیں نظر آتے بھی نظر نہ آئیں، اور جب وہ کتاب بند کریں تو ان کی زبان سے ڈائری نویس کے حق میں دعائے خیر ہی نکلے۔

فروری 1952
جمادی الاولیٰ 1371

عبدالماجد
دریاباد۔ بارہ بنکی

فہرست مضامین

باب:1

1912

''چو بہ تو افتدم نظر''

زمانہ 1912 کی برسات کا ہے، اگست کے مہینہ کی کوئی تاریخ ''مسلم یونیورسٹی'' ابھی قائم ہوچکی کہاں ہے، قائم ہورہی ہے، اس کے قیام کے غلغلہ سے ساری فضا گونجی ہوئی، ہرزبان پراس کا تذکرہ، ہرمجلس میں اسی کا چرچا، 1910 سے گویا یہی شغل پڑھے لکھے اور بے پڑھے ہندی مسلمان کا رہ گیا ہے، ہزہائینس سرآغا خان کا طوفانی دورہ، زرخیز اور ''چندہ انگیز'' ملک کے طول وعرض میں ختم ہوچکا ہے۔ اوراب دور دورہ راجہ صاحب محمودآباد کا ہے (مہاراجہ بہت بعد کو ہوئے، اس وقت صرف راجہ تھے) وہی اس کشتی کے ناخدا، وہی یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے صدر، کانسٹیٹیوشن کمیٹی (مجلس وضع آئین وضوابط) اپنا کام شروع کرچکی ہے، اورقوم کی نگاہیں اب ان کی طرف لگی ہوئی...... ہائے 1948[1] میں کوئی 1912 کی فضا کو کیسے واپس کھینچ بلائے...... چوٹی کے افراد، قوم وملت سے چنے ہوئے اس کمیٹی کے ممبر ہیں۔ کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں طلب ہوا ہے، اورراجہ صاحب کی صدارت میں انھیں کے قصر قیصر باغ میں ہورہا ہے...... وہ قصر محمودآباد جو مہمانوں کی دعوتوں اور ضیافتوں کے لیے وقف تھا، اور جس کا ''ڈائننگ روم''

---

[1] اس کتاب کے مسودہ اول کا سن تحریر۔

قابوں اور پلیٹوں اور چمچوں کی جھنکار سے ہر وقت گونجتا ہی رہتا تھا۔

کمیٹی کے سامنے وقت کے بڑے بڑے اہم اور نازک مسئلے چھڑے ہوئے۔ اور ملت کے دل و دماغ کا عطر جیسے کھینچ کر یہیں آ گیا ہے۔ سر راجہ صاحب (نام، جس سے کم ہی لوگ واقف و مانوس تھے، علی محمد خان) وسیع ڈرائنگ روم کے صدر میں تشریف فرما۔ سامنے ایک بڑی لمبی میز، دورویہ کرسیوں کی قطار۔ میز کے ایک سمت میں ایک جوان رعنا، تندرست وتنومند، کوئی 33، 34 سال کی عمر کا، اعلیٰ درجہ کے انگریزی سوٹ میں ملبوس بیٹھا ہوا۔ داڑھی تازی منڈی ہوئی، مونچھیں ذرا گھنی اور نوکیلی۔ ذہانت بشرہ سے ٹپکتی ہوئی، شوخی وذکاوت چہرہ سے برستی ہوئی۔ ممبروں میں ایک سے ایک قابل وفاضل۔ اس کے بڑے اور مخدوم بھی۔ لیکن نظریں بار بار اسی کی طرف اٹھ رہی ہیں، اور کان اسی کی آواز پر لگے ہوئے۔ وہ بولا تو سب سننے لگے۔ وہ اٹھا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا، مگر متوجہ سب ہی ہو گئے...... یہ تھا کامریڈ کا شہرۂ آفاق ایڈیٹر محمد علی، رامپور کا باشندہ اور علی گڑھ اور آکسفورڈ کا گریجویٹ۔ جس کی جادو نگاری اور انگریزی انشا پردازی کا سکہ اس وقت بھی دلوں پر بیٹھ چکا تھا، حالانکہ کامریڈ کو نکلے ہوئے، ابھی سال ڈیڑھ سال کا ہی عرصہ ہوا تھا، اور اردو روزنامہ ہمدرد کا ابھی وجود بھی نہ تھا۔

میں نے لکھنؤ کیننگ کالج سے بی اے کی ڈگری ابھی ابھی لی تھی۔ سن 20 سال کا۔ لکھنؤ میں رہتے کئی سال گزر چکے تھے، پھر بھی قصباتی ہونے کی خوبو باقی تھی۔ اور فطری شرمیلا پن اس پر مستزاد۔ لوگوں سے ملنے جلنے، بات چیت کرنے میں شرم اور جھیپ غالب۔ اپنے بعض بڑے بھائیوں کے ساتھ بڑی ہمت کر کے راجہ صاحب کے ہاں پہنچا تھا، اور تمام تماشائیوں کی مختصری صف میں کرسی پر بیٹھ گیا تھا کہ میں سب کو دیکھوں اور کوئی مجھے نہ دیکھے۔ محمد علی کا نام 8، 10 سال سے کان میں پڑ رہا تھا۔ علی گڑھ میگزین میں ان کی طالب علمی کے زمانہ کی شوخ تحریروں کے علاوہ ان کے بعض انگریزی مضامین (مندرجہ ٹائمس آف انڈیا، بمبئی) کا مجموعہ Thought of the Present Discountal کے نام سے دو ہی ایک سال ہوئے، پڑھنے میں آیا تھا۔ اور کامریڈ کا مطالعہ ہر ہفتہ، انگریزی ادب کی چاٹ میں تو گویا فرض ہی ہو گیا تھا۔ شوق دیدار آج پہلی بار پورا ہوا...... 12 کو آج 48 میں 36 سال ہو چکے، لیکن لوح حافظہ پر یہ نقش

اتنا گہرا کہ جیسے ابھی کل کی بات ہے!

یہ سرگزشت دوپہر کی تھی۔ اسی شام کو بعد مغرب، باہر سے آئے ہوئے لیڈروں کے خیر مقدم میں مسلم کلب لکھنؤ کے بالا خانہ پر ایک مختصر سی صحبت مرتب ہوئی۔ 12 کا مسلم کلب لکھنؤ کچھ چیز ہی اور تھا۔ آج اسے کس چیز سے مثال دے کر سمجھایا جائے۔ امین آباد پارک میں واقع تھا، جنوبی قطار کی تعمیرات کے مشرقی گوشہ میں۔ وہیں کہیں جہاں آج صدیق بک ڈپو اور انور بک ڈپو ہیں۔ پارک خود اس زمانہ میں نیا نیا تیار ہوا تھا، اور ایک نمائش گاہ بنا ہوا تھا۔ (سڑک اس پار مقابل کے امین الدولہ پارک کا ابھی وجود بھی نہ تھا) کلب کے خوبرو اور خوش صفات سیکرٹری سید میر جان مستعدی، اخلاص وقوت عمل کے ایک پیکر مجسم تھے۔ کلب کے دومنزلہ کی کھلی ہوئی پر فضا چھت پر برف اور شربت اور سوڈا اور لمونیڈ اور پان اور سگریٹ کے دور چل رہے ہیں۔ اور لیڈروں کی جھلک دیکھنے کو مشتاقانِ دید کا ایک خاصہ گروہ موجود...... یاد کر لیجئے کہ یہ ذکر دور ''جمہوریت'' سے قبل کا ہو رہا ہے۔

12 کا لیڈر 48 کا لیڈر نہ تھا۔ اس وقت اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ہی کسے نصیب ہوتا تھا بجز چند خوش نصیبوں کے؟

دن کی میٹنگ اگر خواص کی مجلس تھی، تو شام کی یہ تقریب ایک دربار عام۔ اسلامی ہند کے چنے ہوئے لیڈر اور مشاہیر عوام کے درمیان ایک جگہ مجتمع، آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ ہنس بول رہے ہیں۔ لیکن بارات کا دولہا اس وقت بھی کامریڈ کا ایڈیٹر ہے۔ سج دھج صبح سے اس وقت بالکل مختلف۔ بجائے ہیٹ اور انگریزی سوٹ کے، سر پر ترچھی رامپوری پگڑی، جسم پر باریک ونفیس انگرکھا، چوڑی دار تنگ موری کا پاجامہ، ولی کا جوتا...... محمد علی اپنی زندگی کے اس دور میں بھی صاحبیت میں یکسر غرق نہیں ہوئے تھے۔ معاشرت میں فی الجملہ مشرقیت واسلامیت اس وقت بھی ملحوظ رکھتے تھے...... ملنے اور بات چیت کرنے کی ہمت تو کیا ہوتی، دل اسی سے نہال ہوا جارہا تھا کہ اتنے قریب سے دیکھنے اور گفتگو سننے کا موقع تو مل گیا۔ کامریڈ کی سحر نگاری سے مسلمان تو مسلمان، کالج کے ہندو لڑکے بھی متاثر تھے۔ ان کے سامنے محمد علی کا نام لے کر فخر کرنے کے لیے یہ کچھ کم تھا:

ان کے اک جاں نثار ہم بھی ہیں!

....

12 ختم ہو رہا تھا کہ سرکار انگریزی نے دار الحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہونے کا اعلان کیا، اور کچھ روز بعد اس پر عمل درآمد بھی ہوگیا۔ ''مسٹر'' محمد علی اور ان کا کامریڈ ان دونوں کو بھی اب دہلی آنا پڑا۔ کامریڈ ستمبر 12 میں کلکتہ سے ہٹا، اور 12 اکتوبر 12 کو دہلی سے نکلنا شروع ہوگیا۔ ہمدرد نکلا تو نہیں، لیکن نکلنے کا اعلان اس کا بھی ہوگیا، بلکہ کچھ عرصہ بعد نقیب ہمدرد کے نام سے ایک مختصر سا روزنامہ نکلنے بھی لگا۔ ہمدرد کی ادارت کے ساز وسامان جس پیمانہ پر شروع ہوئے، وہ اس زمانہ میں اردو اخبارات کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھے۔ بدایوں کے ادیب جلیل میر محفوظ علی، بی اے (علیگ) کسی زمانہ میں محمد علی کے نیم استاد رہ چکے تھے، وہ اس وقت مالک ومدیر ''ہمدرد'' کے مشیر خاص تھے۔ ان ہی کے مشورہ سے ایڈیٹری کے لیے پہلے تو مولوی عبد الحق صاحب بی اے سے (جو اب ''بابائے اردو'' کے لقب سے مشہور ہیں اور اس وقت حیدر آباد دکن میں انسپکٹر آف اسکولز تھے) مراسلت رہی۔ لیکن پہلا تقرر بالآخر اس عہدہ پر اردو زبان کے نامور ادیب وناول نویس مولانا عبد الحلیم شرر کا ہوا۔ چنانچہ ستمبر میں شرر مرحوم دہلی روانہ ہوگئے اور وہاں سے از راہ قدر افزائی مجھ طالب علم سے بھی پرچہ کے لیے علمی مضامین طلب فرمائے۔

میں نے اسی سال لکھنؤ سے بی اے فلسفہ لے کر کیا تھا۔ مغربی منطق وفلسفہ کے بری طرح پیچھے پڑا ہوا تھا۔ لکھنا برسوں کی مشق سے بھی آ گیا تھا۔ اس لیے شہرت تھوڑی بہت اسی زمانہ سے علمی اور فلسفیانہ مضامین کی ہوگئی تھی۔ الناظر (لکھنؤ) ادیب (الہ آباد) وغیرہ وقت کے معزز ومقبول ماہناموں میں بکثرت مضامین نکل چکے تھے۔ شرر صاحب کو حسن ظن اسی بنا پر قائم ہوا تھا۔ 16 اکتوبر کو والا نامہ انھوں نے حسب ذیل تحریر فرمایا:

''محلہ چھلی والاں''۔ نمبر 9/2023، دہلی

مکرمی۔ تسلیم!

میں آپ سے رخصت ہو کے آیا۔ لیکن ہمدرد کی اشاعت میں اس لیے تعویق ہوئی اور ہو رہی ہے کہ ابھی تک اردو کا ٹائپ نہیں آیا۔ اب آ گیا ہے مگر پھر بھی کمپوزیٹروں کی کمی کی وجہ

سے ایسی ایسی دشواریاں پیش ہیں کہ اگر چہ یکم نومبر تک پر چہ شائع کر دینے کا قطعی ارادہ کر لیا گیا ہے مگر نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کامیابی ہو سکے گی یا نہیں کیونکہ جب تک ٹائپ آنے کے بعد بھی ایک ہفتہ تک ''ریہرسل'' نہ کر لیا جائے جرأت اشاعت نہیں ہو سکتی، مجھے ہمدرد کے لیے قابل لکھنے والوں کی ضرورت ہے۔ کیا براہ کرم آپ میری مدد کے لیے آمادہ ہو سکیں گے؟ میں چاہتا ہوں کہ ہفتہ میں کوئی نہ کوئی آپ کا مضمون چھاپنے کے لیے ضرور مل جایا کرے۔ مہربانی فرما کر کوئی ایک مضمون تو ارسال فرمایئے۔ اور اگر آپ مسلسل بھیجنے کا وعدہ فرمائیں تو روزانہ پر چہ بھی آپ کے نام جاری کر دیا جائے۔ پہلا مضمون جلد سے جلد مرحمت ہو۔

خاکسار

عبدالحلیم شرر

......☆☆☆......

باب:2

1912-13

(ہمدرد۔مولانا شرر)

محمد علی کا معیار پرچہ کے ایڈیٹوریل اسٹاف اور لکھنے والوں ہی کے لیے اعلیٰ نہ تھا، بلکہ کاغذ، چھپائی وغیرہ ظاہری لوازم کے اعتبار سے بھی وہ اردو کے ہمدرد کو اپنے انگریزی کامریڈ ہی کی سطح پر دیکھنا چاہتے تھے۔اور کامریڈ ظاہری صفائی اور زینت کے معیار سے ولایت کے ہفت روزہ جریدوں کا گویا ہم سطح تھا۔ چھپائی لیتھو کے بجائے ٹائپ کی ہمدرد کے لیے طے پائی، اور خوشنما، نئے ٹائپ کے لیے آرڈر بیروت، شام اور مصر کو بھیجے گئے۔قدرتاً وہاں سے آنے میں مہینوں کی مدت لگی.....میں اس دوران میں فلسفہ میں ایم اے کرنے علی گڑھ چلا گیا تھا (لکھنؤ میں اس کا کوئی انتظام اس وقت تک نہ تھا) مل اور اسپنسر قسم کے فرنگی فلسفی اس زمانہ میں ہر وقت سر پر سوار رہتے تھے۔شرر صاحب کی فرمائش پر مل کی کتاب ''لبرٹی'' (آزادی) کے کچھ حصہ کا ترجمہ کر کے ان کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ترجمہ والی ترکیب محمد علی کو کچھ زیادہ پسند نہ آئی۔خود اس وقت انگریزیت مآب ہونے کے باوجود بہر حال فرنگیوں اور فرنگیت کے جامد مقلد نہ تھے۔ان کی چیزیں لینا چاہتے بھی تو انھیں اپنا کر۔شرر صاحب کا دوسرا والا نامہ 26 اکتوبر کو لکھا ہوا حسب ذیل موصول ہوا:

مکرمی۔تسلیم!

آپ کے علی گڑھ آنے کا حال سن کر مجھے خوشی ہوئی۔آپ نے مل کی کتاب ''لبرٹی'' کا جو پہلا جزو بھیجا،اسے دیکھ کرنہایت شکرگزار ہوا۔ میں نے محمد علی صاحب کو بھی اسے دکھایا۔ان کی یہ رائے ہے کہ کتاب کا ترجمہ مسلسل نکالنا تو مناسب نہیں لیکن آپ اسی کو اپنے طور پر اور اس سے اخذ کر کے اگر مختلف مضامین کے عنوان سے تحریر فرمائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید آپ بھی اسے پسند فرمائیں گے۔

....

ٹائپ اور پریس کے الجھاوے جلد ختم ہونے والے نہ تھے۔نقیب ہمدرد تو جوں توں نکلتا رہا۔ اصل روزنامہ 8 صفحہ کی ضخامت والا،ملتوی ہی ہوتا چلا گیا،اور 12 مدت ہوئی ختم ہو چکا۔کچھ روز بعد شرر صاحب بھی اکتا کر لکھنؤ واپس آ گئے.......... لکھنؤ والوں کا دل ذرا باہر لگنا مشکل ہی ہوتا ہے، چاہے وہ ''باہر'' دہلی ہی ہو!اور پھر یہ کچھ ضروری بھی نہیں کہ جو کامیاب ناول نویس اور ادیب ہو وہ روزنامہ کا ایڈیٹر بھی بہت اچھا ہو......نہ ہر اچھے باورچی کے لیے رکابدار ہونا لازمی ہے،اور نہ ہر رکابدار کے لیے اچھا باورچی ہونا!

شرر صاحب کے بعد محمد علی کو ایڈیٹوریل صفحہ کے لیے قاضی عبدالغفار بی اے،مراد آبادی اور سید جالب دہلوی مل گئے۔اور کچھ روز بعد محمد فاروق ایم اے دیوانہ گورکھپوری بھی ہاتھ آ گئے۔مئی 13 میں ایک خط خود محمد علی کی طرف سے چھپا ہوا وصول ہوا:

مکرمی۔السلام علیکم!

ہمدرد چار صفحہ کا نکلتا ہے۔اور یکم جون سے انشاءاللہ آٹھ صفحہ کا نکلنا شروع ہوگا۔اب ضرورت ہے کہ میں آپ سے قلمی امداد کے لیے عرض کروں۔اس سے غالباً آپ کو بھی عذر نہ ہوگا کہ ہمدرد آپ کی امداد کا حاجت مند بھی ہے اور مستحق بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اصل ہمدرد کے ابتدائی پرچوں سے آپ کے مضامین نکلنے شروع ہو جائیں،اس لیے اگر بہ واپسی ڈاک مضامین عنایت کریں گے تو اور بھی زیادہ میری مشکوری کا باعث ہوگا۔

والسلام

نیازمند۔محمد علی

یہ گشتی خط تھا۔ یقیناً بہت سے اور لوگوں کے نام بھی گیا ہوگا۔ میرے نام کا الگ ذاتی خط نہ تھا۔

....

جون 13 سے خدا خدا کرکے ہمدرد نکلنے لگا۔ اور اردو صحافت کی تاریخ میں ظاہری، معنوی دونوں حیثیتوں سے گویا ایک نیا باب کھل گیا۔ میں نے اپنے عریضہ میں لکھ دیا تھا (جیسا کہ اس کے کئی مہینہ قبل شرر صاحب کو بھی لکھ چکا تھا) کہ مل کی ''لبرٹی'' کے ترجمہ کے اجزا، قسط وار اشاعت کے لیے حاضر کرسکتا ہوں۔ 24 جون کا لکھا ہوا خط قاضی عبدالغفار مرادآبادی سب ایڈیٹر کے قلم سے، حسب ذیل موصول ہوا:

'' جناب بندہ۔ تسلیم۔ عنایت نامہ وصول ہوا، یاد فرمائی کا شکریہ قبول فرمایئے، آپ نے جس مضمون (ترجمہ) کا جناب حوالہ دیتے ہیں، وہ ضرور عنایت فرمایئے، اور بلا تاخیر عنایت فرمایئے ہمدرد کا نصب العین یہی ہے کہ بھرتی کے مضامین سے پاک رہے اور علمی مضامین کا انبار لگادے جس سے پبلک کی معلومات میں اضافہ ہو۔ یہ آپ کی عنایت ہے اور میں اس کا مشکور ہوں کہ آپ ہمدرد کو اپنے مضامین کے قابل سمجھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہمدرد میں ابھی اصلاح اور ترقی کے لیے بہت گنجائش ہے مگر مجھے قوی امید ہے کہ اگر قابل اہل قلم میسر آجائیں تو جہاں تک ترتیب اخبار کا تعلق ہے، انشاءاللہ ہمدرد قابل اعتراض نہ ہوگا۔ لغوگوئی کا جو ایک خاص انداز اردو اخبارات نے پیدا کردیا ہے اس کی بیخ کنی ہمدرد کے فرائض میں داخل ہے، محمد علی صاحب کو آپ کے مضامین کا نہایت اشتیاق ہے۔ اور انھوں نے مجھے تاکید کی ہے کہ ان کی جانب سے میں آپ سے عرض کروں کہ اگر فرصت ہوتو دو چار دن کے لیے دہلی تشریف لایئے۔ محمد علی صاحب کے مہمان عزیز ہوجایئے۔ تاکہ آپ سے تفصیلی گفتگو کا موقع ملے، اور ہمدرد کے مستقبل کے متعلق بہت سے معاملات کا تصفیہ ہوسکے۔ اگر جناب اس دعوت کو قبول کریں تو مجھے یہ بتا دینا چاہیے کہ محمد علی صاحب 3 جولائی تک دہلی ہوں گے اور اس کے بعد باہر چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر انصاری کی واپسی پر وہ [1] پھر دہلی میں ہوں گے، اور اپنے دوران قیام دہلی میں جب آپ تشریف لانا پسند کریں، وہ بڑی خوشی سے آپ کو اپنا مہمان بنانا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ جواب سے جلد یاد فرمایا

---

[1] ڈاکٹر صاحب اس وقت محمد علی ہی کی تحریک پر اپنا مشہور طبی وفد لے کر جنگ بلقان کے زخمیوں کی تیمارداری اور علاج کے لیے ترکی گئے ہوئے ہیں۔

جاؤں۔ مہربانی فرما کر مضمون بہ واپسی عنایت فرمائیے۔

نیاز مند

ایم۔اے۔غفار

سب اڈیٹر ہمدرد (بہ خط انگریزی)

ہمدرد کی داستان کا تسلسل ڈائری نویس کو بہت دور نکال لایا۔ ''ذاتی'' ڈائری میں ذاتی نقوش و تاثرات کے لیے اب پھر دو ایک سال قبل کی طرف واپس چلیے۔

......☆☆☆......

باب:3

1913-14

اے درلبِ لعل تو اعجازِ مسیحائی!

(جلسۂ مسلم یونیورسٹی کمیٹی۔ پہلی رسائی)

دسمبر 12 کی آخری تاریخیں ہیں۔ لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری میں کانفرنس کا بڑے معرکہ کا سالانہ جلسہ ہو رہا ہے۔ ''کانفرنس'' سے مراد اس زمانے کی بڑی اہم مجلس ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' ہے۔ لیکن کانفرنس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہنگامہ خیز و ہنگامہ پرور جلسہ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا ہو رہا ہے۔ کلکتہ کے ''الہلال''، لکھنؤ کے مسلم گزٹ کلکتہ اور دہلی کے کامریڈ کے مسلسل پر جوش مقالات نے مسلمانوں کے عام طبقہ میں پہلی بار بیداری اور خودداری کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ اب تک عوام اور حاضرین کا کام جلسوں میں صرف ''سمع وطاعت'' تھا یعنی تقریر کا سننا، فصاحت بیان کی داد دینا، اور زیادہ سے زیادہ ووٹ کے لیے ہاتھ اٹھا دینا۔ تجویزوں کی تحریک وتائید اور فیصلہ صادر کرنا صرف لیڈروں کے لیے مخصوص تھا۔ آج مسلم پبلک (عامۃ الناس) نے غلط یا صحیح بہر حال پہلی بار طے یہ کیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے مسائل کو وہ خود ہی طے کریں گے۔ ایک طرف ''تجربہ'' تھا دوسری طرف ''جوش'' اور ان کی یہ پہلی معرکۃ الآرا جنگ قابل دید تھی۔ ایک طرف پرانے کارکنوں کا یہ اصرار کہ گورنمنٹ جن شرائط پر بھی یونیورسٹی کا چارٹر دے رہی ہو، قبول

کرلیا جائے۔ دوسری طرف "آزادخیالوں" کا یہ نعرہ کہ لیں گے تو یونیورسٹی اپنی شرائط پر لیں گے ورنہ نہ لیں گے۔

"علی گڑھ پارٹی" کے دوسرے بزرگوں کے لیے تو اسٹیج پر آنا اور زبان کا کھولنا ہی دشوار تھا۔ ادھر وہ نمودار ہوئے نہیں، کہ ادھر جلسہ نے ان کے خلاف طرح طرح کے آوازے کسنے اور نعرے لگانے شروع کیے نہیں! صاحبزادہ آفتاب احمد خان مرحوم اس جماعت میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور سلجھی ہوئی تقریر کرنے والے خوش بیان مقرر تھے۔ ان کی متین، مدلل و فصیح تقریر بھی جلسہ کو مطمئن کرنے میں ناکام رہی۔ قوم نے یہی بہت کیا کہ ان کی تقریر کو صبر وسکون کے ساتھ سن لیا۔ ایک جوش و تلاطم ہر سو برپا تھا۔ اور وقت کا ہر لحظہ "باغیوں" کے سردار مولانا ابوالکلام آزاد (صاحب الہلال) کی فتح مندیوں کو نمایاں سے نمایاں کرتا جارہا تھا۔ اور محمد علی کا شمار بھی اسی جماعت میں تھا...... اجلاس اس منزل پر پہنچ کر دوسرے دن کے لیے ملتوی ہورہا۔

....

رات فریقین نے خدا جانے کن کن امیدوں اور آرزوؤں، کن کن اندیشوں اور مایوسیوں کے ساتھ، اور کہیں کہیں پس پردہ کارروائیوں میں گزاری۔ اجلاس شروع ہوا تو آج قیادت کا علم بجائے "الہلال" کے کامریڈ کے ہاتھ میں تھا۔ محمد علی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو سارا جلسہ پیکر اشتیاق وانتظار تھا۔ محمد علی کی انگریزی انشاء وتحریر کا لوہا سارا ہندوستان مانے ہوا تھا، لیکن تقریر کی اب تک کوئی خاص شہرت نہ تھی۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے اتنے ہی دنوں میں محمد علی کا سکہ ملک بھر میں بیٹھ گیا تھا۔ لیکن لیڈر کی حیثیت سے محمد علی کا شمار بھی صف اول میں نہ تھا۔ ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کو ابھی ابھی ان ہی نے ترکی و بلقان روانہ کیا تھا۔ اس جلسہ میں جب تقریر کو کھڑے ہوئے تو وہی طبی وفد والی خاکی وردی زیب تن تھی۔ عمر کی طرح صحت بھی شباب پر تھی۔ اور آواز اتنی بلند کہ عمارت (قیصر باغ بارہ دری) کے ہر گوشہ میں صاف اور بے تکلف پہنچ جائے..... محمد علی کی لیڈری (قیادت) کا یہ پہلا امتحان تھا۔

تقریر شروع ہوئی۔ اس میں نہ ابوالکلام کا جوشِ خطابت اور الفاظ کی طلسم بندی تھی، اور نہ آفتاب احمد خان مرحوم کی متانت استدلال۔ بلکہ شروع سے آخر تک اپنی ذاتی ذمہ داری اور

ضمانت کی تحریک تھی۔ محمد علی نے نہ دلائل منطقی سے کام لیا، نہ خطابت کا حربہ چلایا۔ بس اپنے کو صداقت و اخلاص کے ساتھ قوم کے آگے پیش کر دیا۔ خلاصۂ تقریر یہ تھا کہ بحثا بحثی بہت ہو چکی ہے، آپ لوگ بے شک یونیورسٹی چارٹر کو آنکھ بند کر کے نہ قبول کریں، یقیناً اپنے ہی شرائط کی تفصیل و تعیین کے لیے تو یہ بڑا جلسہ موزوں نہیں۔ یہ کام ایک چھوٹے سے وفد کے سپرد کیجیے، وہ آپ کا نمائندہ ہو کر گورنمنٹ سے نپٹ لے گا۔ اس وفد میں مجھ کو رکھیے، اور مجھ پر اور میرے رفیقوں پر اعتماد رکھیے۔ آپ سے "سادہ چیک" مانگنے کھڑا ہوا ہوں، آپ میری ساکھ پر سادہ چیک دیجیے۔ رقم کی خانہ پری میرے اوپر چھوڑیے۔ تقریر جس قدر موثر و کامیاب رہی، اس کی توقع شاید خود مقرر کو بھی نہ رہی ہو۔ مخالفانہ نعرے اور آوازے رکے، پیشانیوں کے بل مٹے، اور تجویز تالیوں کی گونج اور مسرت کے جوش میں پاس ہوگئی...... محمد علی پہلے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اور بگڑے ہوئے جلسوں کے سنبھالنے کا جہاں تک تعلق ہے کامریڈ کے ایڈیٹر کا نام بھی مسلمان لیڈروں کی صفِ اول میں آنے لگا۔

عین یہی زمانہ تھا کہ والد مرحوم کی خبر وفات عین حج کے بعد مکہ معظمہ سے موصول ہوئی۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کیا چیز تازہ یتیمی بھی ہوتی ہے!. سوال یہ یک بیک نظر کے سامنے آ گیا کہ اب روزمرہ کا خرچ کیسے چلے گا۔ اور آئندہ تعلیم جاری رکھنے کی کیا صورت ہوگی؟ آگے چل کر تو اس سوال کو اللہ نے راجہ صاحب محمود آباد مرحوم کے ہاتھوں ایک بڑی حد تک حل کرا دیا۔ لیکن معاً اس وقت نظر ہمدرد ہی پر پڑی کہ اسی سے مضامین کے لیے کوئی مستقل ماہانہ معاوضہ طے کر لیا جائے۔ تلاش ہمدرد کے مالک کی ہوئی کہ ان ہی سے زبانی معاملت کر لی جائے۔ جلسہ گاہ کے اندر محمد علی شاگردوں، معتقدوں، مداحوں کے جھرمٹ میں آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اجنبی ہونے کے باوجود بڑھ کر قریب پہنچا اور عرض کی کہ " کچھ وقت دیجیے، الگ کچھ عرض کرنا ہے" نرمی اور ہمدردی کے لہجہ میں بولے "الگ وقت کہاں سے لاسکتا ہوں، یوں ہی چلتے پھرتے جہاں چاہے پکڑ لیجیے، اور جو کچھ کہنا ہو فرما ڈالیے...... محمد علی کی مانگ اب ہر طرف بڑی رہنے لگی تھی۔ اس کا اندازہ اسی وقت ہوا۔

....

بی اے لکھنؤ سے وسط 12 میں کرلیا تھا۔ ایم اے (فلسفہ) کی تحصیل ناکام، پہلے علی گڑھ اور چند روز کے لیے سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں کی۔ اور اب شروع 14 میں تلاش معاش شروع ہوئی۔ مدتوں خبط یہ رہا کہ کسی کالج (اور ''کسی'' کیوں، اپنے ہی پرانے کیننگ کالج) میں فلسفہ پڑھانے کی جگہ حاصل کر لیجیے۔ کامیابی ہوتے رہ گئی۔ محکمۂ ریلوے میں ایک نیانیا اونچا عہدہ اسسٹنٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کے نام سے کھلا تھا، نیت اس طرف گئی، اونچی ملازمتوں کے لیے ذرا اونچی سفارشیں اس وقت بھی لازمی تھیں۔ تقرر ریلوے بورڈ کے ممبروں اور صدر کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں تک اپنی رسائی کہاں۔ ہمارے بارہ بنکی کے ایک وکیل اور علی گڑھ کے نامور گریجویٹ شیخ ولایت علی مولوی مرحوم، محمد علی کے خاص الخاص دوستوں، رفیقوں، معتقدوں میں تھے۔ ''بمبوق'' کے عجیب اور فرضی نام سے ان کے ظریفانہ مضمون کامریڈ کے کالموں میں انگریزی کی بہترین انشاء پردازی کے ساتھ نکلتے رہتے تھے۔ اردو میں بھی کبھی کبھی لکھا کرتے تھے، انھوں نے صلاح دی کہ ''دہلی چلے جاؤ'' محمد علی کے نام تعارف نامہ لکھے دیتا ہوں۔ ان کے دہلی کے اعلیٰ حکام سے تعلقات ہیں۔ ریلوے بورڈ والوں سے بھی ضرور ہوں گے۔ وہ ان لوگوں سے ملا دیں گے''۔

14 میں برسات کا موسم تھا، اور رمضان کا مہینہ، جب یہ اپنی خالص ذاتی غرض لے کر دہلی پہنچا۔ اسٹیشن سے سیدھا ''دفتر ہمدرد'' کوچۂ چیلان کے لیے تانگہ کیا۔ فاروق صاحب دیوانہ گورکھپوری اب عرصہ ہوا ہمدرد میں آچکے تھے، اور ''تجاہل عامیانہ''[1] میں لگے رہتے تھے۔ ان سے پرانی شناسائی علی گڑھ کے زمانہ کی تھی۔ یہ ریاضیات میں ایم اے ہو چکے تھے جب میں ایم اے کرنے علی گڑھ پہنچا تھا۔ انھیں کھوج لگا کر ساتھ لیا۔ وہیں دفتر کے متصل ہی رہتے تھے۔ اور انھیں ہمراہ لے کر ڈرتے ڈرتے محمد علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا...... باقاعدہ ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ وقت کی ایک مشہور شخصیت کے سامنے جاتے ہوئے، وہ بھی تمام تر اپنی ایک غرض لے کر، حجاب اور خوف دامن گیر ہونا ایک حد تک طبعی تھا، اور پھر مجھ جیسے شرمیلے اور ملاقات چور نوجوان کے لیے۔

---

1 یہ ہمدرد کے ایک مستقل ظریفانہ کالم کا عنوان تھا۔ اکثر فاروقی صاحب اسے لکھتے تھے۔

باب:4

1914-16

(نظر بندی، ملاقات، مراسلت)

صبح سویرے کا وقت تھا، اور رمضان کا مہینہ۔ میں فرنگی الحاد میں غرق، مجھے اس زمانہ میں رمضان سے کیا واسطہ ہوسکتا تھا۔ ہمدرد کامریڈ کے دفتر کوچۂ چیلان میں ایک خاصی عالیشان عمارت میں تھے۔ ٹھیک اس کے مقابل، سڑک کے اس پار ایک مکان اوسط درجہ کی حیثیت کا اور تھا۔ محمد علی صاحب اس میں رہتے تھے، اور وہیں میری حاضری ہوئی۔ کمرہ معمولی سا، اور بجز ایک مختصر سیتل پاٹی کے ہر قسم کے فرنیچر سے معرا۔ نہ میز نہ کرسی، نہ کوچ نہ صوفے۔ اس جانماز نما سیتل پاٹی پر ٹھیٹھ ہندستانی قسم کا کرتا، پاجامہ پہنے ہوئے کامریڈ کا ایڈیٹر بیٹھا ہوا! اور چند سخت مذہبی قسم کے مسلمانوں سے جامع مسجد کے انتظامات فرش وشامیانہ سے متعلق بحث وگفتگو میں سرگرم! ....میں دور سے کامریڈ پڑھنے والا اور محمد علی کی آکسفورڈ کی ڈگری سے مرعوب، اس سادگی اور اس اسلامیت اور مشرقیت کے منظر کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اپنی انگریزیت پر قیاس کرکے سمجھ رہا تھا کہ مکان اور مکین دونوں صاحبیت اور فرنگیت کا مکمل نمونہ ہوں گے۔

وہ لوگ رخصت ہوئے اور اب میری پیشی ہوئی۔ محبت اور تپاک کا برتاؤ پہلے لحہ شروع ہوگیا۔ بسوق مرحوم کا خط لے کر پڑھا اور زیادہ ملتفت ہوگئے۔ ذرا دیر کے بعد اٹھے۔ اور سڑک

پارکرکے، بالاخانہ پر اپنے دفتر کے کمرہ میں لائے۔ یہاں کی شان دوسری تھی۔ ڈرائنگ روم، کچھ انگریزی اور کچھ ترکی وضع کے بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ۔ کوچ اور کرسیاں، اور قالین، اور دیوار تصویروں سے مرصع۔ 14 کا محمد علی اب 12 کا محمد علی نہ تھا۔ بڑھی ہوئی سیاسی آزادخیالی اور ترکوں سے (جن کے کاندھوں پر اس وقت تک خلافت اسلامیہ کا بھی بار تھا) روز افزوں ہمدردی دیکھ کر انگریز کھٹک گئے تھے۔ اور اب محمد علی کی وہ پوچھ گچھ، وہ قدر و منزلت اعلیٰ حکام میں باقی نہیں رہی تھی۔ دیر تک تفصیل کے ساتھ اپنی معذوریاں بیان کرتے رہے۔ گویا میرا کام نہ نکال سکنے پر شرمندہ و محجوب تھے۔ اور باتیں بھی ادھر ادھر کی خوب کیں۔ سیاسیات، ادبیات، لطائف و ظرائف سبھی کچھ۔ اچھی انگریزی لکھنے والے ہندوستانیوں کا ذکر آیا۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی، عبداللہ یوسف علی اور آر۔سی دت کے نام اب یاد پڑ رہے ہیں۔ اس پہلی ہی ملاقات میں محمد علی نے ان ہندوستانیوں سے اپنی پوری بیزاری کا اظہار کردیا جو انگریزیت کے شوق میں خود بھی انگریز یا نیم انگریز بن گئے تھے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا اور باوجود خود روزہ دار ہونے کے مجھ سے کھانے کے لیے صرف کہا ہی نہیں، بلکہ اصرار دیر تک جاری رکھا۔ پہلی ملاقات میں ایسے گھل مل گئے کہ جیسے برسوں کی پرانی شناسائی ہے۔ میری واپسی شام کی گاڑی سے ہوئی۔ اس سے بہ اصرار روکتے رہے۔ اور یہ مشرقی مہمان نوازی کی ایک دیرینہ سنت ہے...... ہمارے لیڈروں کے اخلاق پبلک کے سامنے جیسے بھی کچھ ہوں۔ نجی زندگی میں اس سادگی، اس اخلاص، اس بے تعصبی کی مثالیں اس سے قبل تو کیا دیکھنے میں آئیں، اس کے بعد بھی کمتر ہی ملیں۔

....

کامریڈ کی دھوم تو مچی ہوئی تھی ہی، ہمدرد نکلا تو اس کی بھی دھوم مچ گئی۔ بڑے، چھوٹے سب اس کے گرویدہ۔ لیکن محمد علی کا قدم اب روز بروز اسلامیت کی طرف اور زیادہ ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ مئی 13 میں شہر کانپور میں ایک سڑک نکالنے کے سلسلہ میں میونسپلٹی اور کلکٹر نے ایک مسجد کے غسل خانہ کو گرا دیا، اور اس پر جب مسلمانوں نے اپنے پرجوش احتجاج کا مظاہرہ کیا، تو ان کے مجمع پر گولیاں تک چل گئیں۔ بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ اور اس کے لیڈروں میں محمد علی بھی تھے۔ کامریڈ نے

اپنے احتجاجی اور تنقیدی مضامین میں کلکٹر تو الگ رہے، خود صوبہ کے حاکم اعلیٰ سر جیمس مسٹن کی بھی خوب خبر لے ڈالی۔ حکام اس وقت بھی مسلمانوں کی زبان سے کسی کڑی نکتہ چینی کے عادی نہ تھے۔ اور پھر یہ سر جیمس مسٹن تو محمد علی کو اپنا بڑا پرانا ''یار وفادار'' سمجھ رہے تھے۔ قدرتاً بہت بگڑے۔ ادھر جنگ بلقان کے سلسلہ میں ترکی کی ہمدردی میں بھی محمد علی پیش پیش۔ اور اب چہرہ پر داڑھی بھی!...... یہ سب تو تھا ہی کہ نومبر 14 میں یورپ کی پہلی جنگ عظیم میں ترکی بھی جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے برطانیہ کے مقابل آ گیا۔ اور کامریڈ نے اپنے بڑے لمبے اور بڑے زوردار مقالہ میں جو Choice of the Turks کے زیر عنوان ٹائمس (لندن) کے ایک مقالہ کے جواب میں تھا، ترکوں کو اپنے اس انتخاب میں معذور ٹھہرایا۔ یہ شرارہ غضب کا تھا۔ حکام انگریز اب کیسے اور کب تک درگزر سے کام لیتے۔ کامریڈ فوراً بند اور محمد علی نظر بند ہوئے..... وہی محمد علی جو ابھی سال دو سال قبل تک بڑے بڑے حکام کی آنکھوں کے تارے اور منظور نظر بنے ہوئے تھے!

یہ نظر بندی پہلے تو دہلی کے قریب مہرولی (درگاہ قطب صاحبؒ) ہی میں رہی۔ اس کے بعد دونوں بھائی (آہ، وہ شوکت علی و محمد علی کا ضرب المثل اتحاد، اس وقت تک یکجان و دو قالب کا صحیح نمونہ!) نجیب آباد کے آگے لینسڈون کے پہاڑی مقام پر منتقل کر دیے گئے۔ اور یہاں سے نومبر 15 میں چھندواڑہ (سی۔ پی) بھیجے گئے۔ راستہ لکھنؤ سے ہو کر تھا۔ ادھر سے صبح گاڑی سے گزرے۔ اس وقت سرکار کے ان ''باغیوں'' سے ملنا بھی جرم کی سی اہمیت رکھتا تھا۔ اس پر اسٹیشن پر خاصہ مجمع مشتاقان دید کا ہو گیا۔ اور ان ہی میں یہ خاکسار بھی تھا۔ دونوں بھائی ایک ایک سے لپٹ لپٹ کر ملتے تھے، اور ہر کس و ناکس کے آگے گویا بچھے جاتے تھے۔ شوکت صاحب کی نظر تو میں بچا گیا، کچھ تو اپنے اس شرمیلے پن اور جھیپ کی بنا پر کہ وہ میرے لیے اجنبی ہیں، ان سے کیا ملوں، اور کچھ اپنے اس وقت کے اس ملحدانہ ''پندار تفوق'' کی بنا پر بھی، شوکت علی کا علمی پایہ میرے برابر کا نہیں، ان سے ملنے میں اپنی کسر شان ہے!.... آج اپنی ان حماقتوں پر جتنی بھی نفریں کر لوں، اس وقت اپنی 22، 23 سال کی عمر میں ان ہی کو عین سرمایہ دانش و خودداری سمجھ رہا تھا! محمد علی سے ملاقات رہی۔ کوئی خاص بات اس وقت لوح حافظہ پر محفوظ نہیں۔

....

15 ختم ہورہا تھا کہ نفسیات اجتماعی کے ایک مبحث پر اپنی کتاب انگریزی میں ''سائیکالوجی آف لیڈر شپ'' کے عنوان سے لندن میں، اس وقت کے ایک نامور پبلشر ٹی فشر انون (T. Fisherunwin) کے اہتمام سے نکلی۔ اور دل نے اس پر بڑا ہی فخر محسوس کیا۔ 16 میں کچھ کاپیاں ہندستان پہنچیں۔ اخبارات نے برطانیہ اور ہندوستان دونوں میں خوب خوب ریویو کیے۔ بعض نے بڑے مداحانہ، اکثر نے بین بین اور دو ایک نے مخالفانہ۔ میں نے بعض اقتباسات اشتہار میں چھپوا کر کچھ لوگوں کے پاس بھجوا دیے۔ اور ان میں ایک امتیازی نام چھندواڑہ کے نظر بند محمد علی کا بھی تھا۔ دل نے کہا کہ ''داد اگر ان سے نہ ملی، تو کچھ نہ ہوا، اشتہار دیکھ کر کتاب یقیناً منگائیں گے اور داد بھی دل کھول کر یقیناً دیں گے''۔ اشتہار گیا اور چند ہفتوں بعد اس کا اثر اس عنایت نامہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ خط انگریزی میں تھا، اور ہونا ہی چاہیے تھا۔ ذیل میں اس کا ترجمہ پیش ہو رہا ہے۔

چھندواڑہ۔ سی، پی 23 مئی 1916

مکرم! کوئی مہینہ بھر ہوتا ہے کہ انگریزی کتاب ''سائیکالوجی آف لیڈر شپ'' (مطبوعہ ٹی، فشر انون لندن) کا ایک اشتہار موصول ہوا تھا۔ لفافہ کے اندر سوا اس اشتہار کے اور کچھ نہ تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اشتہار آپ کے ایما سے یا کم از کم آپ کے علم میں میرے پاس روانہ کیا گیا تھا۔ اگر کتاب آپ ہی کی تصنیف ہے تو یقیناً دلآویز ہوگی۔ متعدد ولایتی اور ہندستانی اخبارات کی مدحیہ رائیں اس اشتہار میں پڑھ چکا تھا کہ ایک مفصل ریویو مسز بسنت کے روز نامہ ''نیو انڈیا'' (مدراس) میں نظر سے گزرا، جو بہت ہی مداحانہ تھا۔

اچھا، تو میں اب بجائے مشتہر صاحب کے براہ راست آپ ہی کو لکھتا ہوں کہ کتاب کی ایک کاپی میرے نام وی پی بھجوا دیجیے۔ اس وی پی کی فرمائش کو کتاب کا نسخہ مفت ہاتھ آنے کے لیے حسن طلب نہ سمجھیے گا۔ مجھے یہ دل سے ناپسند ہے کہ مصنف کے احباب اس سے کتاب وصول کرنے کی گھات میں رہیں۔ اب وہ زمانہ تو ہے نہیں کہ مصنفین غریب کو شاہانہ سرپرستیاں حاصل ہوں۔ کتابیں اگر فروخت نہ ہوں تو آخر طبع و اشاعت کے مصارف کہاں سے نکلیں گے۔ اور ان میں اگر دوست احباب ہی بخل کرنے لگیں تو پھر امید کس سے رکھی جائے؟

تھوڑا بہت وقت مجھے اس جبریہ تعطیل کے زمانہ میں مل جاتا ہے۔ اور سائیکالوجی آف لیڈرشپ (نفسیات قیادت) سے بڑھ کر موزوں موضوع مطالعہ کے لیے ہوگا بھی کیا، خصوصاً اس لیے کہ آج ہندوستان میں کوئی قابل ذکر لیڈر رہے ہی نہیں۔ خدا معلوم آپ نے ہمارے پیغمبر (روحی فداہ) کی سیرت کا مطالعہ قائد اعظم کی حیثیت سے کیا ہے یا نہیں [1]۔ مکہ کو فتح کرنا جانی دشمنوں کے حق میں "لَاتَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ" کے مشہور فرمان کے ساتھ اور انصار مدینہ سے اس بغیر کشت وخون والی اور بغیر مال غنیمت والی فتح کو قبول کرالینا، یہ قیادت کے عظیم الشان کارنامے ہیں [2]۔ لیکن یہ سب میں قبل از وقت لکھنے لگا، پہلے کتاب تو دیکھ لوں، پھر رائے قائم کروں۔

جملہ احباب کی خدمت میں سلام

مخلص محمد علی

مراسلت کی باقاعدہ بنیاد اسی خط سے پڑی ہے

......☆☆☆......

---

1 خیال رہے کہ یہ زمانہ گاندھی جی کے دور سے بہت پہلے کا ہے۔

2 میں اس وقت دور الحاد سے گزر رہا تھا، اور رسول خدا کی عظمت کیا معنی سرے ہی سے خدا ہی کی عظمت سے دل خالی تھا! محمد علی میرے اس مرض سے ایک تو کچھ زیادہ واقف بھی نہ تھے، اور پھر جس حد تک واقف تھے بھی، دینی تبلیغ کے جوش اور دھن میں اس کی پرواہی کب کرتے تھے۔

باب:5

1:1916

(نظر بندی۔ مراسلات)

چھندواڑہ، سی۔ پی کا ''شہر'' جغرافیائی حیثیت سے ہو تو ہو، اس وقت ملک میں کسی گاؤں یا دیہات ہی کی طرح گمنام تھا۔ لوگوں کے کان میں پہلی بار اس کا نام جبھی پڑا، جب علی برادران وہاں نظر بند کیے گئے........ یوسف علیہ السلام نہ ہوتے تو آج کنعان کی یہ شہرت شعروادب کی دنیا میں کہاں سے ہوگئی ہوتی؟.....اب چھندواڑہ کا نام ایک ایک کی زبان پر تھا۔ اور عوام تو نہیں، لیکن پڑھے لکھوں اور خواص میں جسے دیکھیے، علی برادران کی زیارت کے لیے کھنچا ہوا چھندواڑہ پہنچ رہا ہے۔ اور پھر خالی ہاتھ بھی نہیں دل کی عقیدت واخلاص کے نذرانہ کے ساتھ ساتھ، مادی اعتبار سے بھی کوئی پھلوں کی ٹوکری ساتھ لیے اور کوئی مٹھائی کی ہانڈی، کوئی ٹوپی یا چھڑی پیش کر رہا ہے، اور کوئی پاتابہ اور جوتا۔ چھندواڑہ کیا ہوا، گویا ویرانہ میں کسی بزرگ کی درگاہ، خلقت کے لیے زیارت گاہ، اور محمد علی کے اور ان کے بھائی زندہ پیر! محمد علی کا خاص مشغلہ اس وقت تلاوت قرآن مجید تھا۔ حافظہ ماشاء اللہ یوں بھی بہت قوی تھا، پھر قرآن مجید ایک بڑی حد تک انھیں حفظ ہی ہوگیا، اور محمد علی کہنا چاہیے کہ نیم حافظ ہو ہی گئے۔ یعنی جس طرح مبتدی کو حافظہ کرنے کے دوران میں قرآن کچا کچا یاد رہتا ہے، انھیں بھی برزبان ہی سا ہوگیا تھا، اور اس دورِ زندانی کی یہ برکت اخیر عمر

تک قائم رہی۔

تلاوت قرآن اور حدیث وسیرت نبوی وغیرہ کے مطالعہ سے جو وقت بچتا، وہ زائروں اور مہمانوں کی خاطرداری میں صرف ہوتا۔ محمد علی غضب کے مہمان نواز اور دوست پرست تھے۔ اچھا کھانے کے بڑے شوقین، لیکن اس سے بھی زیادہ دوسروں کو اچھا کھلانے کے حریص۔ قرض لیں یا کسی سے مانگ کر لائیں، بہرحال دوستوں کو کھلانا اور خوب ہی کھلانا فرض۔ جوان کے مہمان نہ بھی ہوتے، انھیں بھی پکڑ پکڑ لاتے، اور ٹھونس ٹھونس کر انھیں کھلاتے ضرور۔ بذلہ سنج ایسے کہ روتے ہوؤں کو بے ہنسائے نہ رہیں۔ رقیق القلب اتنے کی بات بات پر، بلکہ بلا بات کے بھی، آنسوؤں کے دریا بہادیں۔ شخصیت ایسی جامع وہمہ گیر کہ دینی، تاریخی، ادبی، سیاسی، شعری ہر موضوع سے یکساں دلچسپی اور سب پر یکساں تیار۔ طبیعت ہر وقت حاضر۔ کوئی تذکرہ کسی قسم کا چھڑ جائے، تو بس اب ختم ہونے ہی کو نہیں آتا۔ ان محفل طرازیوں سے بھی جب فرصت ملتی، تو دور افتادہ دوستوں، عزیزوں کی یاد آتی، اور ان کے آئے ہوئے خطوط کے جواب کی طرف توجہ ہوتی۔ اور وہی زندہ شخصیت خطوط میں جھلکتی رہی۔ ہر خط ایک پند نامہ، لیکن خشک ذرہ بھر بھی نہیں، بلکہ حد کمال تک دلکش وشگفتہ۔

خط لکھنے کے زیادہ عادی نہ تھے اور پابندی کے ساتھ لکھنے پر تو آخر عمر تک بھی قادر نہ ہو سکے۔ اوقات کے نظم و پابندی سے طبیعت فطرتاً بیگانہ تھی۔ اور اس کا خمیازہ ان لوگوں کو اٹھانا پڑتا، جو اپنے خطوط کے جوابات کے بہ پابندیٔ وقت منتظر رہتے۔ کئی کئی دن کیا معنی، کئی کئی ہفتے گزر جاتے کہ اچھے ضروری خط تک، جواب کی نیت ارادہ کے باوجود، جیب کے اندر یا میز کی دراز میں پڑے کے پڑے رہ جاتے۔ اور جب دیکھتے کہ دیر بہت ہی زائد ہو چکی ہے، تو بجائے خط لکھنے کے تار دیتے! نیت ہمیشہ، زبانی گفتگو کی طرح، خطوط کے بھی خوب مفصل لکھنے کی رکھتے۔ ہجوم مشاغل کے درمیان اتنی فرصت قدرتاً شاذ و نادر ہی ہاتھ آتی۔ لیکن جب کبھی لکھتے، حتی الامکان پچھلی انتظار کشی کا پورا کفارہ کر دیتے۔

محمد علی سے مراسلت رکھنا ایک نعمت تھی۔ جن کے پاس ان کے خطوط آتے وہ اپنے کو خوش قسمت سمجھتے اور بڑے فخر ومباہات کے ساتھ اس کا ذکر دوسروں سے کرتے رہتے۔ مجھ سے ذاتی

مراسلت 16 سے شروع ہوئی۔ پہلے دو ایک خط انگریزی میں آئے گئے۔ان کی انگریزی انشاء پردازی تو خیر مسلم تھی ہی، میں بھی اس زمانہ میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی لکھ لینے کی مشق رکھتا تھا۔دو ہی ایک خطوں کے بعد میں نے زبان بجائے انگریزی کے اردو کر دی۔اور میری ہی درخواست پر محمد علی نے بھی۔لطیف نکتہ سنجیاں وہ جس طرح انگریزی میں کرتے، اردو میں بھی کرنے لگے۔وہ اس وقت تک مذہب میں غرق ہو چکے تھے، میں سرے سے مذہب سے بیگانہ اور (معاذ اللہ) اسلام کا دشمن۔

ان کی ذات سے اپنی عقیدت و محبت جو کچھ تھی، وہ محض ان کی ذہانت، ذکاوت، زور قلم اور انگریزی حسن انشاء کی بنیاد پر۔ 16 میں ایک بار اپنے نزدیک بڑی ہوا خواہی اور دلسوزی کے ساتھ انھیں یہ لکھا کہ آپ تو تاریخ کے جید عالم ہیں، یہ جبریہ فرصت کا زمانہ آپ خالی کیوں جانے دیتے ہیں۔کیوں نہ کوئی کتاب تاریخ پر لکھ ڈالیے۔جواب آیا (مراسلت کی زبان ابھی انگریزی ہی تھی) اور کتنا سچا آیا کہ .....''یہ وقت تاریخ نگاری کا نہیں، تاریخ سازی کا ہے۔اغیار تاریخ بنا رہے ہیں، اور آپ مجھے تاریخ لکھنے کی صلاح دے رہے ہیں۔عالم اسلامی کی بربادیوں نے دل و دماغ میں وہ سکون ہی کب قائم رہنے دیا ہے جو میں تصنیف و تالیف پر توجہ کر سکوں''۔

اپنی زندگی کے اس دور میں اس جواب کی گہری سچائی کی کیا قدر کرتا۔اس وقت اسے محض ایک ادبی لطیفہ سمجھ کر داد دی۔اس کا احساس تو کئی سال بعد ہوا کہ عالم اسلامی خصوصاً خلافت ترکی کی بربادیوں نے بیشک اس مسلم ہندی کا دل خون کر رکھا تھا۔اور وہ جو کوئی شاعر محض اپنی شاعرانہ

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

یہ محمد علی کے ہاں شاعری نہیں، بلکہ عالم اسلامی کے حدود کی حد تک واقعہ تھی۔دنیا کے کسی گوشہ میں پھانس کسی مسلمان کے جسم لگتی اور اس کی چبھن محمد علی کے دل میں ہونے لگتی۔

....

جون 16 شروع ہی ہوا تھا کہ میرا عقد، خاندان میں ایک لڑکی کے ساتھ دستور خاندان کے خلاف میری خاص پسند اور شوق سے ہوا۔اور عین اسی زمانہ میں علی گڑھ کے مشہور و معروف کارکن

صاحبزادہ آفتاب خان صاحب نے ازراہ محبت وقدر افزائی مجھے علی گڑھ بلایا، اور کانفرنس آفس میں لٹریری اسسٹنٹ (مشیر علمی) کے عہدہ پر مامور کردیا۔ اور محمد علی سے مراسلت کا سلسلہ دراصل یہیں آکر شروع ہوا۔ پڑوس میں منشی انوار احمد مارہروی زبیری اور منشی محمود احمد عباسی امروہوی رہتے تھے۔ یہ دونوں بھی کانفرنس آفس میں منسلک تھے، اور محمد علی کے بڑے معتقد۔ (اور اس زمانہ میں کون پڑھا لکھا مسلمان ان کا معتقد نہ تھا؟) جس روز ڈاک میں محمد علی کا کوئی مکتوب ہوتا، وہ گویا یوم عید ہوتا۔ خط سلطان جہاں منزل (دفتر کانفرنس) کے ہال میں بآواز بلند پڑھا جاتا اور یہ دونوں صاحب اپنا کام چھوڑ چھاڑ اسی طرف متوجہ ہوجاتے..... محمد علی کو دنیا اس وقت تک صرف انگریزی کا ادیب جانتی تھی۔ جوہر کی اردو شاعری کے جوہر سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ یہ امر میرے فخر کے لیے کافی ہے کہ ان کے اس جوہر کا انکشاف سب سے پہلے میرے ہی نام کے ایک عنایت نامہ میں ہوا، اور پھر میں نے ہی اسے خوب پھیلایا۔ جس روز ان کے خط میں کوئی غزل نامہ آتا، ایک ایک شعر پر واہ واہ کی دھوم مچتی۔ اور دفتر کا خشک کاروبار کچھ دیر کے لیے بزم مشاعرہ کی چہل پہل میں تبدیل ہوجاتا۔ پورے پورے مکتوب تو انشاء اللہ آئندہ ملاحظہ میں آئیں گے۔ دو چار پھڑکتے ہوئے شعر ابھی اور اسی منٹ سن لیجئے۔ حالی کی غزل وفا کے بعد، سزا کے بعد، پر غزل کہی، اور کیا خوب کہی۔ مطلع لاثانی تھا۔

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو میں گویا ضرب المثل بن گیا ہے۔

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور اس شعر نے تو خدا معلوم کتنے کشتگانِ یاس کو بارانِ رحمت کے چھینٹوں سے زندہ کردیا ہے۔

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل ھل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

عاشقانہ رنگ میں یہ چوٹ بھی کیا برابر کی کرڈالی ہے۔

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

غالب کی مشہور غزل ''تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی'' پر یہ غزل کہنا بھی جوہر ہی کا کام تھا۔

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی	اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
رب عزت کے لیے بھی کوئی رہنے دو خطاب	تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
ہم وفا کیشوں کا ایمان بھی ہے پروانہ صفت	شمع محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

....

گفتگو پرلطف سہی، لیکن بہر حال بے ترتیب شروع ہوگئی۔ ذکر تو ابھی کچھ قبل یہ ہوا تھا کہ 23 مئی 16 کے خط میں محمد علی نے میری کتاب ''سائیکالوجی آف لیڈرشپ'' طلب فرمائی تھی۔ سوال قدرتاً یہ ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اس فرمائش کا حشر کیا ہوا؟ حشر یہ ہوا کہ کتاب پہلی ڈاک سے ہدیۃً ان کی خدمت میں بھجوا دی گئی۔ اور جب جون کا مہینہ بھی گزر گیا اور کتاب پر کوئی رائے نہ موصول ہوئی، تو دل میں ایک بے چینی سی رہنے لگی۔ کیا کتاب نہیں پہنچی؟ پہنچی، مگر اتنی ناپسند ہوئی کہ اس پر اظہار رائے سے گریز کیا گیا؟ یا اور کوئی بات ہوئی؟ غرض طرح طرح کے وسوسے دل میں آنے لگے اور آخر شروع جولائی میں ایک تقاضا خط لکھا جس میں یہ فقرہ بھی تھا کہ ''آپ ملک کے ان گنے چنے چند افراد میں ہیں جن کی رائے اور تبصرہ کی میں وقعت کرتا ہوں''۔ جواب آیا اور اتنا مفصل کہ مکتوب کے بجائے رسالہ بن گیا۔ اور اگلے باب میں تمام وکمال اسی کو ملاحظہ کیجیے۔ یہ یاد رہے کہ مراسلت ابھی اردو میں نہیں شروع ہوئی تھی۔ کتاب انگریزی میں، میرا خط انگریزی میں، تبصرہ بھی قدرتاً انگریزی میں۔ آگے ظاہر ہے کہ خط بجنسہ نہیں بلکہ اس کا ترجمہ نقل ہو رہا ہے۔

......☆☆☆......

باب:6

1916:2

(نقادی، نظر بندی، شاعری)

(دستخط سنسر) یکم اگست 16۔ چھندواڑہ۔ 25/جولائی 16

مکرمی۔ جی ہاں جیسا کہ آپ نے یاد دلایا ہے، کہ آپ کی ''سایکالوجی آف لیڈرشپ'' میرے پاس میری ہی فرمائش پر آئی ہے۔ اور آپ کے اس فقرہ کو میں اپنے لیے باعث عزت افزائی سمجھتا ہوں کہ میں ان گنے چنے لوگوں میں سے ہوں جن کے تبصرہ کی آپ کوئی پروا اور وقعت رکھتے ہیں۔ کتاب اگر ہدیۃً نہ موصول ہوئی ہوتی، جب بھی اغلب یہ ہے کہ میں اس کے موضوع پر ضرور آپ کو کچھ لکھتا۔ لیکن اخبارات میں میں نے پڑھا کہ آپ کی شادی ہوئی اور آپ معاً بعد موٹر میں کہیں باہر جشن عروسی منانے روانہ ہو گئے۔[1] اور میں نے خیال کیا کہ کم از کم ''ماہ جشن'' بھر تو ''فلسفۂ محبت'' کے آگے ''فلسفۂ قیادت'' کا تذکرہ بہت ہی بے محل و نامناسب ہوگا اس لیے اب تک خاموش رہا۔ امید ہے کہ یہ عذر معقول ٹھہرے گا۔

خیر اب سہی۔ کتاب مصنف کی جس غور و فکر، وسعت مطالعہ اور زبردست قوتِ مشاہدہ کی

---

[1] عقد لکھنؤ میں 2 جون کو ہوا تھا، اور اس کے دوسرے ہی دن ہم میاں بیوی دریاباد کے لیے روانہ ہو گئے تھے، رخصتی کی سادہ اور ہندستانی تقریب انگریزی اخباروں میں جا کر 'ہنی مون' بن گئی، مولانا نے اس خبر کو پڑھا تھا۔

شہادت دے رہی ہے، اس لحاظ سے میں داد دیتا ہوں۔ ہمارے پڑھے لکھوں سے غور وفکر کی طرح ذوق مطالعہ بھی عنقا ہوگیا ہے اور اتنا بھی مادہ باقی نہیں رہا ہے کہ دوسروں ہی کے خیالات سمجھ کر پڑھ لیے جائیں۔ لیکن آپ نے اپنی مختلف واقعاتِ نفسیاتی کی جو مثالیں درج کی ہیں ان سے ظاہر ہورہا ہے کہ یہاں صرف دوسرے خیالات پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے۔ میں داد وستائش کی زبان میں اور بہت کچھ لکھ سکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو مقصود میری ''تقریظ'' نہیں بلکہ ''تنقید'' ہے۔ آپ سے ملاقات ہوتی تو زبان میں بہت تفصیل سے اپنے خیالات ناقص عرض کرتا۔ ایک خط کے حدود کے اندر ایک فلسفہ کی کتاب پر تفصیلی ریویو کیوں کر آسکتا ہے۔ آپ کو صرف مختصر اشارات پر قناعت کرنا ہوگا، یہ محض خاکہ کے طور پر آئیں گے۔ اور آپ غالباً ان سے یہ سمجھیں کہ کتاب کا مطالعہ محض سرسری اور متفرق مقامات سے کیا گیا ہے۔ لیکن آپ یقین کیجیے کہ میں عموماً مطالعہ بہت آہستہ آہستہ کرتا ہوں اور آپ کی کتاب کا بغور مطالعہ تو میں نے کئی دن میں کیا، بہر حال میرے منتشر نوٹ حسب ذیل ہیں:

1- عبادت

موجودہ فلسفیانہ زبان پر آپ کو جو قدرت بلکہ عبور حاصل ہے، اس پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں بیان ہر جگہ صاف ہے اور جو شخص نفسیاتِ جدید سے واقف ہے اسے آپ کے مفہوم کے سمجھنے میں کہیں بھی دقت نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس ضرورت کو تو آپ بھی نظر انداز نہیں کرسکتے کہ پڑھنے والوں کی ایک تعداد اہل ''اجتماع'' کی بھی ہوگی اور آپ ان ''عوام'' کی داد وتحسین سے خواہ کتنے ہی بے نیاز ہوں لیکن ان کی ضرورتوں سے تو آپ قطع نظر نہیں کرسکتے۔ اور ان کی ضرورتوں کا تقاضا یہ ہے کہ زبان میں مصطلحات ذرا کم استعمال کیے جائیں یا یوں کہیے کہ نفسیاتی زبان کے ساتھ ساتھ توضیحات اور مثالوں کا حصہ ذرا زیادہ ہو۔ ممکن ہے کہ میں کچھ زیادتی کررہا ہوں، اس لیے کہ مجھے خود طوالت کی لت پڑی ہوئی ہے۔ اور محض اپنا خیال، پڑھنے والے کے سامنے پیش کردینے پر بس نہیں کرتا، بلکہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح زبردستی اس کے دل کے اندر بھی اتار دوں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ بغیر طوالت کے عیب کے بھی آپ اپنی کتاب کو اس کی موجودہ صورت ضخامت سے

کر ہی سکتے ہیں۔

2- مغز

مغز کے لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ اجتماع سے تو آپ نے بڑی تفصیلی بحث کی ہے، لیکن ''قائدین'' (لیڈروں) میں اسی قدر اجمال سے کام لیا ہے۔ یہ بالکل درست ہوتا کہ آپ اجتماع کی نفسیت پر بحث کر کے لیڈروں کے متعلق ایک منفیانہ پہلو اختیار کرتے یہ کہہ کر کہ اجتماع میں جن اوصاف کی کمی ہوتی ہے، وہ اس کے افراد میں پوری طرح پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھیے۔ کہ جس عمومی حیثیت سے آپ اجتماعات پر بحث کر سکتے ہیں، وہ اس کے لیڈروں کے لیے کافی نہیں کر سکتے۔ کتاب کی نظر ثانی کے وقت، میں آپ سے پرزور سفارش کرتا ہوں کہ لیڈروں کے متعلق اپنے اس تناسب کو بدل دیجیے۔ کتاب کا یہ حصہ زیادہ تفصیل کا مستحق ہے۔ اور اس حصہ میں مزید شرح وبسط کی گنجائش ہی نہیں، ضرورت بھی ہے۔

3- اجتماع

اجتماعات سے متعلق آپ کے نظریات سے اجمالاً متفق ہوں، لیکن یہاں بھی مزید تفصیل وتقسیم کی ضرورت تھی، نظم وضبط کی اہمیت کو تو آپ نے بھی تسلیم کیا ہے اور مانا ہے کہ اجتماع جب اس وصف سے متصف ہو جاتے ہیں تو ان کی قوت زبردست بھی ہو جاتی ہے اور مفید بھی۔ لیکن اجتماع کا مفہوم آپ کے ذہن میں بس ان بڑے بڑے جلسوں اور مظاہروں کے مترادف معلوم ہوتا ہے جو ہندوستان میں ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں نہ کہ ان ''مجلسوں'' اور ''کانفرنسوں'' کا جہاں **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** کے ارشاد ربانی کی تعمیل ہوتی رہتی ہے اور جہاں آزادانہ بحث ومباحثہ نظر وفکر کے بعد ''اجتماع'' کے فیصلے اکثر افراد کے فیصلوں سے زیادہ معقول اور ''اجتماع'' کا عمل بھی افراد کے عمل سے زیادہ منظم ہو جاتا ہے۔ آپ کے فحوائے تحریر سے ظاہر ہے کہ ''اجتماع'' (بھیڑ) کی حقارت آپ کے ذہن میں بیٹھی ہوئی ہے (خود یہ لفظ ہی تحقیر آمیز ہے۔ عربی لفظ ''جمیعۃ'' اس سے کہیں بہتر ہے) کیا میرا یہ خیال صحیح ہے کہ آپ ''اجتماع'' کی تحقیر کر رہے ہیں یا یہ ہے آپ اپنے خیالات پوری طرح

واضح نہیں کر سکے؟ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مجھے اس طرف (بلکہ یوں کہیے) کہ آج سے 15 مہینہ قبل، نظر بندی کے وقت تک جمہور سے خوب خوب سابقے رہے اور ممکن ہے کہ آپ مجھے بھی ان عوام پسند زعیموں میں شمار کر رہے ہوں، جو زبان سے تو عامۃ الناس کی بڑی تعریف کرتے رہتے ہیں، مگر دل ہی دل میں ان عوام کو کالانعام اور چوپایہ سمجھتے رہتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً میں جہاں تک اپنے جذبات اور خیالات کا اندازہ لگا سکا ہوں، میرے خیال میں نسبتاً سب سے بہتر بلکہ اکثر تو بہترین فیصلے جماعات ہی کے ہوئے ہیں نہ کہ افراد کے۔ گو سرعت عمل کے لیے افراد ہی کی قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن خیر یہ تو ایک الگ بحث ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ مجھے آپ سے توقع یہ تھی کہ آپ مختلف اجتماعات کی مختلف نفسیتوں پر نظر رکھیں گے۔ مومنین کی وہ آزاد جماعت جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی 23 سالہ مدتِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کے 30 سالہ زمانہ میں موجود رہی، ایک ایسے ہی اجتماع کی مثال ہے جو اپنے قائدین کی سلیم ترین منبع ثابت ہوئی [1]۔ کیا عمرؓ کے متبعین میں کبھی بھی ایسا ہوا ہے کہ نکتہ چیین نہ رہے ہوں۔ اور پھر آج کل کے بھی کسی ایسے ''اجتماع'' کی بابت جیسا کہ برٹش ایسوسی ایشن [2] جو ہر سال برطانیہ اور اس کے علاقوں میں اپنے اجلاس کرتی رہتی ہے، آپ کیا رائے دیں گے؟ (بطور جملۂ معترضہ مجھے اس سے مسرت ہو رہی ہے کہ اب آپ کو اس کا موقع حاصل ہے کہ جس ''اجتماع'' کو ہمارے قدیم دوست آفتاب [3] بارہ چودہ سال سے برابر ہانکتے چلے آتے ہیں اب اسے صحیح معنی میں کانفرنس بنانے میں مدد دے سکیں [4]) لیکن آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ آپ ''اجتماع'' پر اعتماد کریں اور احتیاط سے بھی کام لیتے رہیں۔ نہ یہ کہ ان کی طرح اس سے بے اعتمادی قائم رکھیں اور ان سے خوف کھاتے رہیں۔

---

[1] اب تبلیغ دین کھلم کھلا ہو رہی ہے۔

[2] برطانیہ میں سائنس کی ممتاز ترین علمی مجلس۔

[3] صاحبزادہ آفتاب احمد خان مرحوم سیکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مولانا کے اور ان کے مسلک میں بڑا اختلاف تھا اور برابر چشمک چلی جاتی تھی۔

[4] صاحبزادہ صاحب نے مجھے بطور لٹریری اسسٹنٹ کے رکھا ہے میں اس وقت اتفاق سے کانفرنس کے دفتر ہی میں ہوں

4- قیادت

آپ کے فحوائے کلام سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ قیادت جس کا نام ہے وہ محض ایک تسلسل ہے چالبازیوں اور فریب کاریوں کا، احمق عوام الناس کے احمق بنائے جاتے رہنے کا۔ سکیلین اور کنگ کی طرح شعبدہ بازیوں کا محض ایک طلسم ہے...... یہ صحیح ہے کہ آپ نے یہ لفظوں میں کھل کر نہیں کہا ہے بلکہ کہیں کہیں تو آپ نے قیادت صادقہ وقیادت کاذبہ کا امتیاز بھی قائم کیا ہے۔ لیکن نفسیات کے اندر صدق وکذب کا فرق ہے بھی؟ نفسیات کے نقطۂ نظر سے تو جو کچھ بھی ہے حقیقت ہی ہے۔ لیکن محرکاتِ عمل ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں اور اخلاقی حیثیت سے بعض قابل ستائش ٹھہریں گے اور بعض قابل مذمت۔ مجھے توقع تھی کہ آپ مختلف انواع کے قائدین کے اعمال، خیالات وجذبات پر تفصیلی بحث کریں گے اور فرق دکھائیں گے کہ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو عمداً دوسروں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ اور کچھ ایسے جو غیر ارادی فریب دہی سے قبل خود فریبی کا شکار ہو چکتے ہیں۔ اور پھر کچھ ایسے بھی جو پہلے تو ارادتاً دوسروں کو فریب دیتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ خود فریب نفس میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ بہت ہی سرسری ہے اور اتنا مجمل ہے کہ مطالعہ نفسیات میں اس سے مدد نہیں مل سکتی۔

5- نظائر

مثالیں اور نظیریں، جیسا میں پہلے کہہ آیا ہوں میری رائے ناقص میں کافی تعداد میں موجود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تقسیم بھی نامساوی ونامتناسب ہے۔ شبلی مرحوم کا ندوہ والا واقعہ اور کلکتہ کے بدمعاشوں کے ہاتھوں سے دو عیسائی مبلغوں کا پٹنا، یہ چیزیں اس قابل نہ تھی کہ انھیں ایسی کتاب میں بطور مثال درج کیا جائے جس میں آپ نے کثرت سے اہم تاریخی واقعات بیان کیے ہیں جو ناظرین کے لیے عموماً مشہور ومعلوم ہیں۔

6- پیغمبر خدا کا ذکر

میری تنقید کا آخری عنوان آپ کے ان تذکروں سے متعلق ہے جو آپ نے پیغمبر خدا اور

قرآن مجید کی تمثیل لاتے وقت کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سچے اور حقیقی مسلمان ہیں۔ اس بنا پر مجھے سخت حیرت ہو رہی ہے کہ آپ نے ایسی مقدس شخصیت اور ایسی مقدس آسمانی کتاب کا ذکر کس ہلکے پن سے کیا ہے۔ کیا آورد اور تصنع اپنی ''ناطرفداری'' اور ''خالص علمی تحقیق'' کے اظہار کے لیے ہے یا کیا؟ یہ سوال میں ایک نقادنفسیات کی حیثیت سے نہیں کر رہا ہوں، جو ایک مسلمان مصنّف سے کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ کے وقت ادب و احترام کی توقع رکھتا ہے۔ میں اس سے بے شبہ خوش ہوا کہ آپ نے محض دنیوی قائدین کی مثالیں دینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ہمارے الوالعزم نبی محترم کی شخصیت سے بھی قیادت اور نفسیاتِ قیادت کی مثال میں کام لیا لیکن آپ کے لب ولہجہ میں تو صاف عیسائی مشنریوں کی بو آ رہی ہے، جو یہ دکھانا چاہتے ہیں یا کم از کم پڑھنے والے کے ذہن کو اس جانب منتقل کر دیتے ہیں کہ محمد (جن کے وین پر میں اور میرا سارا کنبہ قربان ہو) نعوذ باللہ ایک پیغمبر کاذب یا محض لسّان تھے۔ بلکہ آپ تو یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ قریش اور یہود جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد محض ان کی اہانت وتحقیر کی غرض سے جمع ہوتے تھے اور ان کی بدتمیزیوں پر قرآن مجید میں احکام صادر ہوئے ہیں آپ نے ان احکام پر نقد شروع کر دیا ہے۔ اگر آپ کوئی سی بھی سیرت اٹھا کر دیکھ لیتے تو آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں ادب سے گفتگو کرنے کی آیات کی شانِ نزول مل جاتی۔ اسی طرح سعد بن عبادہؓ کا بھی وہ واقعہ کہ تقسیم غنیمت کے سلسلہ میں جب انصار کو مہاجرین سے شکایت پیدا ہوئی اور سعدؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انصار کے جذبات کی ترجمانی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تقریر فرمائی۔ آپ نے اس واقعہ کو بھی توڑ مروڑ ڈالا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں رسول اللہ ﷺ کی یہ تقریر محض لفاظی وشعبدہ بازی تھی؟ مجھے امید نہیں کہ آپ کا ایسا خیال ہو۔ لیکن آپ کا لہجۂ تحریر یقیناً اسی خیال کا اظہار کر رہا ہے۔ آپ کی بحث قیادت پر مجموعی حیثیت سے مجھے یہ کہنا ہے کہ بہتر ہوتا اگر آپ نے قیادت کے اصلاحی پہلو کو صفات قیادت سے الگ رکھا ہوتا۔ پبلک زندگی میں کم وبیش ہم سب کچھ نہ کچھ تصنع سے کام لیتے ہیں۔ بناوٹ ہم سب میں ہے۔ اسی لیے ہمارے خدمت گار اور ان سے بڑھ کر ہماری بیویاں ہمارے دھوکے میں نہیں آتیں۔ لیکن ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے پورے چالیس سال مکہ والوں

کے درمیان ایک عام انسان کی حیثیت سے گزارے۔ اور اس طویل مدت میں انھیں ان کی صداقت کے جانچنے کے ہر طرح کے موقعے حاصل رہے۔ جب چالیس برس کے بعد انھیں ''امین'' کا لقب حاصل ہوگیا اور وہ اپنے مقدس فرض کی ادائیگی کے لیے تیار ہو چکے، جب جا کر ان پر اللہ کی وحی نازل ہوئی اور جب بھی انھوں نے اسے قبول کیوں کر کیا؟ غم کے ساتھ ڈرتے ہوئے، جھجکتے ہوئے اور سب سے پہلے ایمان ان پر کون لایا؟ سب سے پہلے ان کی چہیتی بیوی، پھر کمسن چچازاد بھائی، پھر ان کا عزیز ترین وقدیم ترین دوست۔ فریب باہر والوں کو دیا جاسکتا ہے اور تصنع اور ابن الوقتی سے ان کے سامنے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں یہ حال تھا کہ تصدیق کرنے والے اور تسلی دینے والے وہی تھے جو خلوت کے محرمانِ راز تھے۔ کم از کم یہ ہستی تو چالبازیوں سے بالاتر تھی [1]۔ یہی صحیح ہے کہ خدا نے اس کے سامنے سب کو خاموش رہنے یا مؤدب گفتگو کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن یہ اس رعب وسطوت وجاہ کے قیام کے لیے نہ تھا، جس کی دھن میں مٹھی بھر پردیسی لاکھوں کروڑوں پر حکومت کرنے کے لیے لگے رہتے ہیں جو اس جاہ واقتدار کے بھوکے ہیں وہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا کبھی اعتراف نہیں کرتے لیکن قرآن تو ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں پیغمبر کو کہیں تو تنبیہ ہے کہ دیکھو فلاں غلطی نہ کر بیٹھنا، جس کے بہت قریب پہنچ گئے ہو۔ اور کہیں یہ فہمائش ہے کہ فلاں بات جو کر چکے ہو، خبردار آئندہ نہ ہونے پائے۔ ہر مفسر اور تفسیر داں آپ کو بتا سکتا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن بعض افعال سے قرآن میں اپنی جس ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اس کے لیے خاص اصطلاح ہے۔ یا پھر جب پیغمبرؐ کے صاحبزادہ کا انتقال ہوا ہے اور سورج میں گرہن اسی وقت پڑا ہے اور عرب کے لوگ گرہن کو اسی سانحہ ہی کا نتیجہ قرار دینے لگے تو اس موقع پر کوئی جاہ پسند شخص ہوتا تو اس حسن اتفاق سے کیا کچھ فائدہ اٹھاتا۔ لیکن قرآن جو وہم پرستوں کا خاتمہ کرنے آیا تھا اس نے اس موقع پر بھی اپنا فریضہ خاص طور پر ادا کیا۔ ایک طرف ذرا دیلز کے مدعی تقدس آدین گلنڈ ودرس کا یہ دعویٰ ملحوظ خاطر رہے کہ میری پیدائش کے وقت آسمان گرجا اور دوسری طرف قرآن کو دیکھیے اس

---

[1] مولانا کی تنقید کا یہ حصہ تمام تر واقعیت پر مبنی تھا۔ میں اپنی زندگی کے اس ملعون دور میں ''فرنگی محققین'' ہی کا اہم عقیدہ وہم زبان، بلکہ ان کا گراموفون بنا ہوا تھا۔

قسم کے اوہام کو کس کس طرح مٹایا ہے۔ آدین گلند ودرس کو بالآخر یورپ ہی میں جواب یہ ملا تھا کہ یہ موسمی کڑک اور گرج اس موسم میں تو اس وقت بھی ہوتی ہے جب کوئی بلی بچہ جنتی ہوتی اور وہ خود بخود پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن ادھر دیکھیے اللہ نے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس خیال باطل کو جو طبعاً شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا، یوں دور کر دیا کہ آفتاب اور ماہتاب میں گرہن اپنی اپنی طبعی میعاد پر پڑا کرتے ہیں، انھیں انسانوں کی شادی غمی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک اور مثال لیجیے۔ صحابہؓ کے خیال میں یہ جما ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس عقیدہ پر وہ مضطر و مجبور تھے اور جب آپ کی وفات کا واقعہ پیش آیا تو جن کا ایمان سب سے زیادہ قوی اور مستحکم تھا، وہ فرط صدمہ سے دنگ و ششدر رہ گئے۔ انھیں خیال بھی نہیں آتا تھا کہ کوئی زمانہ ایسا بھی آئے گا، جب پیغمبر خدا اس دنیا میں موجود نہ ہوں گے۔ جن کا ایمان اس درجہ کا نہ تھا یا جن کی عقلوں پر عقیدت مندی غالب تھی، ان کا تو ایمان ہی متزلزل ہو چلا۔ عمرؓ خود اس درجہ متاثر ہوئے کہ جہاں ایک سردار اعظم اور عملی انسان ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ان لوگوں کی روک تھام کی فوری ضرورت محسوس کی، وہاں کوئی عملی تدبیر سوا اس تخویف کے ان کے ذہن میں نہ آئی کہ ''خبردار! اگر کسی نے پیغمبر خدا کو متوفی کہا تو اس کا سر اتار دوں گا''۔ عین اس وقت وہ شخص جسے بجا طور پر صدیق کا لقب ملا تھا، اٹھا اور اس نے تسلی دلا سہ دے کر لوگوں کو مطمئن کیا۔ لیکن یہ کیوں کر؟ محض ان آیات قرآنی کو سنا کر جنھیں خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے (میری ماں اور باپ اور اولاد سب ان پر قربان) نے دنیا تک پہونچایا تھا۔ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ (اور محمد کیا ہیں بجز ایک رسول کے ان سے قبل اور بھی رسول ہو گزرے ہیں، اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر (کفر کی طرف) واپس چلے جاؤ گے؟
حضرت ابوبکرؓ نے بالکل صحیح طور پر حضرت عمرؓ کو ٹوکا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی تھی۔
لیکن رب محمد کی وفات نہیں ہوئی تھی اور وہ حی وقیوم زندہ تھا۔ یہ تھا اس انسان کی ساری زندگی کا حاصل وعظ جس نے کبھی اپنی عبدیت کے باب میں شک وشبہ بھی نہیں پیدا ہونے دیا۔ ''جاہ و سطوت'' کا جو مفہوم آج شائع ہے وہ تو یہ ہے کہ نہ صرف فرمانروا معصوم ہے بلکہ حکام بھی اس

معصومیت کے حصہ دار ہیں۔ نہ صرف ''قانون'' ماوراء تنقید اور معصوم ہے (قانوناً تو قانون معصوم ہی ہے اس لیے کہ بادشاہ کوئی جرم پیش نہیں کر سکتا۔ قانوناً بادشاہ سے برتر کوئی قوت نہیں اس لیے بادشاہ کا جرم کس کی عدالت میں ہو) بلکہ اس قانون کے نافذ کرنے والے بھی امکان خطا سے ماوراء ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عقیدہ کو شرک قرار دیا جس سے دنیا کو نجات دلانے وہ مبعوث ہوئے تھے۔ وہ خود معصوم بے شبہ تھے مگر اس حیثیت سے کہ پیغمبر الٰہی تھے، اور پیغامبر بھی اگر معاصی کا شکار ہو سکتا تو خود پیام کی صحت مشتبہ ہو جاتی۔ لیکن آپ نے اس کی صاف تشریح کر دی ہے کہ جس وقت میں اپنے منصب رسالت سے الگ ہوں، اس وقت میری تمہاری حیثیت یکساں ہے۔ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ ۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو آپ نے بحیثیت ایک تجارت پیشہ مکی کے مدینہ کی زراعت پیشہ آبادی سے اس وقت فرمائے جب ان لوگوں نے ایک فصل میں آپ کے مشورہ کے بموجب اور اپنے دیرینہ معمول کے خلاف اشجار خرمہ میں قلم نہیں لگائے تھے۔ لیجیے یہ خط بہت زائد طویل ہو گیا ہے اور اس لیے ہوا ہے کہ مجھے خواہ غلط ہی سہی یہ شبہ ہو گیا ہے کہ آپ نے دنیا کے مخلص ترین قائداعظم کی جانب چالاکی کا انتساب کیا ہے۔ اگر میرا یہ شبہ بجا ہے تو آپ اس طوالتِ بیان کو معاف کریں اور عبارت متعلقہ پر ایک بار پھر غور کر لیں۔ جب کتاب کی طبع ثانی کی نوبت آنے لگے اور طبع ثانی کی نوبت جلد ہی آنی چاہیے، اس وقت تک کے لیے میرا شکریہ قبول ہو کہ آپ نے ایسا تحفہ مجھے دیا ہے جس کے باعث مجھے بھی بہت کچھ غور کا موقع مل گیا۔ زیادہ آداب و تسلیمات۔

آپ کا مخلص۔ محمد علی

مکرر۔ آپ نے مجھے رائے دی کہ میں ان جبریہ تعطیل کے زمانہ میں کوئی کتاب لکھنا شروع کر دوں [1] اور مجھ سے اس کی توقع بھی کی جا رہی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو جن لوگوں نے مجھ سے اس کی توقع قائم کی ہے، وہ مجھ سے واقف نہیں ہیں، اولاً تو مجھ میں وہ صبر تحمل اور استقلال ہی نہیں ہے جو ایک عالم محقق میں ہونا چاہیے۔ دوسرے جو کچھ علم و عقل رکھتا بھی ہوں۔ اس پر میرے جذبات کہیں زیادہ غالب ہیں۔ رہی یہ جبریہ فرصت سو مجھے یہ فرصت ملتی ہی کیوں پاتی،

---

[1] میں نے عرض کیا تھا کہ اس جبریہ فرصت کے زمانہ میں تاریخ پر کچھ لکھ ڈالیے۔

اگر میرے جذبات اس قدر ضعیف ہوتے کہ جس وقت اغیار تاریخ سازی میں مصروف ہیں، میں تاریخ نویسی میں لگا رہتا۔نہیں میرے عزیز دوست نہیں۔میرا دماغ، میرا دل، دونوں اس وقت جس عالم میں ہیں وہاں تصنیف وتالیف جیسی ''تفریحات'' کی گنجائش کہاں؟ البتہ کبھی کبھی دل کے ایما سے دماغ دو چار شعر موزوں کر لیتا ہے۔اگر آپ کو اس کا ذوق ہو تو میں ایک آدھ غزل آپ کو بھیج سکتا ہوں۔یہ وہ غزلیں ہیں جو 15 مہینے کے زمانۂ فرصت میں مہلت کے لمحے نکال نکال کر ضبط تحریر میں لا سکا ہوں۔یہاں کے ایک حاکم صاحب نے وہی رائے دی جو آپ نے پیش فرمائی، یعنی تصنیف وتالیف۔میں نے جواب دیا کہ اس وقت تو میرا موضوع تصنیف دو ہی چیزیں بن سکتی ہیں، ایک ''کربلا'' دوسرے ''قبل ہجرت''۔اپنے چند شعر اسی وقت پیش کیے دیتا ہوں۔میری ترجمانی کسی قدر ان ہی سے ہو سکے گی۔(انگریزی سے ترجمہ ختم ہوا)۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتل حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

....

اس طرح سے جینے میں بھی مرنے کا مزہ ہے — قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ
اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالہ — اس سادگی پہ شوخیِ خونِ شہدا دیکھ
ہے سنت ارباب وفا صبر وتوکل — چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ خدا دیکھ
تو طیر ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور — بے چارگی پر اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ

....

آساں نہ تھا تقرب شیریں تو کیا ہوا — تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہ کن سے دور
ہم تک جو دور جام پھر آئے تو کیا عجب — یہ بھی نہیں ہے کہ گردشِ چرخِ کہن سے دور

....

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈار — ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی
عہد اول کو بھی اچھا ہو جو پورا کردو — تم وفادار ہو، تھوڑی سی وفا اور سہی

......☆☆☆......

باب:7

3:1916

(مزید مراسلت، اسلام سے شیفتگی)

کتاب پر تبصرے بہتوں نے کیے تھے، اچھے اچھے پیشہ ور تبصرہ نگاروں نے بھی۔ محمد علی کا تبصرہ، سب سے بڑھ چڑھ کر رہا۔ کوئی دوسرا ریویو نہ اتنا جامع تھا نہ اتنا مفصل، نہ اتنا گہرا نہ اتنا مبصرانہ، نہ اتنا پرمغز، نہ اتنا مخلصانہ، نہ بیجا مداحی نہ خواہ مخواہ کی تنقیص، اور نہ فنی پہلوؤں سے قطع نظر کیجیے، تو تبلیغ کا انجکشن شروع سے آخر تک جابجا موجود! خاکسار مؤلف کا اپنے دور الحاد و بے دینی میں سابقہ، اور گہرا سابقہ، بہت سے مسلمان دوستوں اور صاحب علم وفضل مسلمانوں کے ساتھ رہا کیا۔ ان میں سے تقریبا سب کو افراط یا تفریط ہی میں مبتلا پایا۔ اکثر تو ایسے ملے، جو دوستی اور مروت کے غلو میں میرے ہر عیب کو ہنر ہی بنا کر پیش کرتے بلکہ شاید خود بھی یہی سمجھتے رہے۔ اور میری صریح بیہودگیوں پر پردہ ڈالتے رہے۔ اور کچھ ایسے بھی نکلے جو اس کے برعکس سرتاپا شعلہ وشرر تھے۔ حمیت دین کی زیادتی اور حرارت مذہبی کی افراط انھیں میرے ساتھ انصاف میں مانع ہوتی رہی۔ اپنوں میں کہنا چاہیے کہ ایک محمد علی ہی ایسے تھے، جو ایک طرف میرے الحاد و بے دینی پر برابر مجھے ٹوکتے رہے، اور دوسری طرف دوسری حیثیتوں سے میری حوصلہ افزائی اور دلجوئی میں بھی لگے رہے۔

....

قدرتاً اس تنقید نامہ کی بڑی قدر ہوئی۔ دو ایک روز تو یہ عنایت نامہ خود گشت میں رہا۔ 7 اگست کو اس کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ خط کا مضمون تو اب 36 سال بعد ذہن میں کیا رہ سکتا ہے، ہاں بطور خلاصہ کے یہ خیال پڑتا ہے کہ پہلے تو اتنے مفصل انتقاد کا شکریہ تھا، پھر کچھ اپنی حمایت میں یہ جھوٹی تاویل تھی کہ کتاب کا مقصد پیمبری سے انکار نہیں، بلکہ ''ناطرف دار'' رہ کر ان شخصیتوں کو محض بشری حیثیت سے پیش کرنا تھا۔ اپنی نئی اردو کتاب ''فلسفۂ اجتماع'' کا ذکر تھا جو حقیقتاً اور معناً اسی انگریزی کتاب کا ایک مفصل ومشرح ایڈیشن تھا۔ یہ بھی ذکر تھا کہ اب انگریزی میں ''نفسیات قرآنی'' (سائیکالوجی آف دی قرآن) پر لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اور آخر میں کلام جو ہر کی دل کھول کر داد دینے کے بعد یہ سوالات تھے کہ یہ تو آپ بڑے چھپے رستم نکلے۔ شاعری کب سے شروع کی کس سے سیکھی؟ کتنا کلام ہو گیا ہے؟ وغیرہ۔ اور اسی میں ایک چبھتا ہوا فقرہ اس قسم کا بھی تھا کہ آپ کی ''امت'' آپ کے کلام سے لذت اور تسکین دونوں پائے گی........ جواب محمد علی نے خلافِ عادت وخلاف معمول بہت جلد یعنی 16 اگست کو لکھ ڈالا۔ خط نہیں بلکہ اب کے بھی رسالہ اور پہلے رسالہ سے ضخیم تر! مراسلت کی زبان اب بجائے انگریزی کے اردو ہو چکی تھی میں نے اردو میں لکھنا شروع کر دیا تھا اس لیے جواب بھی اردو ہی میں آیا۔ کچھ ابھی اور فوراً ملاحظہ کیجیے اور کچھ کئی صفحوں کے بعد اگلے باب میں۔

....

16 اگست 16 چھندواڑہ

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ مورخہ 7 اگست چند روز ہوئے ملا۔ مجھے تو خوف تھا کہ کہیں آپ میری تنقید سے ناراض نہ ہو جائیں۔ مگر نیت بخیر تھی۔ اور جانبین کو صرف اصلاح مطلوب تھی نہ کہ فساد۔ اس لیے میرا خیال صحیح نکلا کہ آپ کو ایک سچی اور دلسوزی کی تنقید محض تقلیدی تعریف وتوصیف سے زیادہ پسند ہوگی۔ عریضہ ہی مفصل تھا۔ مگر پھر بھی اگر ہم دونوں ساتھ ہوتے تو جزئیات کے متعلق بھی بہت کچھ عرض کر سکتا۔ اس زمانہ میں استبداد اور استعباد نے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے دو لفظ گھڑ لیے ہیں

Constructive اور Destructive (تعمیری یا تخریبی)۔ اور اس میں سے موٴخر الذکر کو تو ہر تیجی تنقید کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور مقدم الذکر کو اس عنقا صفت تنقید کے لیے سینت کر رکھ لیا ہے۔ جو نہ آج تک آنکھوں نے دیکھی اور نہ کبھی کانوں نے سنی، اور جو نہ کسی متنفس کے دل و دماغ میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی جاگزیں ہوئی۔ حالانکہ اگر فن نقادی کو صحیح طور پر دیکھا جائے تو اس کا اولین فرض یہ ہوتا ہے کہ اس قصر سربہ فلک کی تعمیر کے لیے جس کا نقشہ اس کے تصور میں ہوتا ہے (یا کہیں کہیں شاعر یا فلسفی یا ادیب کے کلام میں بھی کوئی محراب یا گنبد نظر آجاتا ہے)۔ زمین کو صاف کرنے اور آس پاس کے بوسیدہ مکانات، بدنما جھونپڑے اور تنگ و تاریک بے قاعدہ گلیاں وہاں سے دور کر دے۔ بہر حال تعمیر سے پہلے تخریب تھوڑی بہت کرنی ہی پڑتی ہے۔ اگر استبداد کے عام اعتراض میں کوئی اصلیت ہے تو محض اس قدر کہ تنقید تخریب کی غرض سے نہ ہو، بلکہ تعمیر کا پیش خیمہ ہو۔ سو میں نے جو کچھ بھی لکھا، اسی غرض سے لکھا تھا کہ جب کبھی نظر ثانی کا موقع آئے تو آخری فیصلہ کرتے وقت میرے پراگندہ خیالات میں سے جو ضروری اور مفید معلوم ہوں پیش نظر رکھے جائیں۔

پیغمبر ﷺ اسلام (روحی فداک یا رسول اللہ) کے متعلق ظاہر ہے کہ آپ ان کو اتنا بڑا پیشوا مانتے ہیں اور کتاب کے ہر پڑھنے والے سے بھی منوانا چاہتے ہیں، جتنا کہ کوئی اور پیشوا ہو گزرا ہو۔ جس کی نظیر کتاب میں ہے۔ ورنہ ایک مسلمان کو کچھ بھی ضرورت نہ تھی کہ جہاں نپولین وغیرہ کا موازنہ کیا جاتا وہاں ذکر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیا جائے۔ آج کل کی سیاست بین الاقوامی کی اصطلاح میں آپ کا ''غیر طرفدار'' رہنا بھی ایک ایسی کتاب کے لکھنے میں جسے ہر مذہب و ملت والا پڑھے، قرین مصلحت تھا۔ میں نے اس خیال (Conception) پر ہرگز اعتراض نہیں کیا ہے، اگر اعتراض ہے تو محض طرز عمل (Execution) پر۔ اب چونکہ خود آپ کی تحریر سے واضح ہو گیا کہ آپ وہی چاہتے ہیں جو میں سمجھتا تھا کہ آپ چاہتے ہوں گے، اس لیے میری تنقید کی نوعیت بھی واضح تر ہو گئی۔ اور وہ ابھی باقی ہے۔ یعنی ایک عام پڑھنے والے پر آپ کے الفاظ اور جملوں کی اور نیز ان موقعوں کا جن پر تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا گیا ہے ایک حد تک ضرور اثر پڑتا ہے کہ وہ بار بار غور کرے کہ کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مار گو لیتے

(یہ میری بدنصیبی تھی کہ آکسفورڈ میں جب میرا ارادہ تحقیق (Honours) کی ڈگری لینے کا تھا تو یہ میرے رہنما مقرر کیے گئے تھے، اس کے علاوہ پیشتر بھی کچھ عربی ان سے پڑھی تھی) وغیرہ کی طرح ایک چلتا ہوا لیڈر تو ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ چونکہ یہ نہ آپ کا مفہوم ہوسکتا تھا نہ ہے اس لیے میری توقع بے جا نہیں کہ آپ اپنی تصنیف کو ایک بار اس شبہ کو دل میں جگہ دے کر پڑھیں کہ مصنف کوئی غیر مذہب والا ہے جو مسلمانوں کو یا کم از کم غیر مسلموں کو تو ضلالت کی طرف آہستہ آہستہ لے جانا چاہتا ہے، تا کہ وہ عظمت جو ایک وحی پانے والے رسول کی اس کے دل میں ہو، وہ دور ہو جائے، اور اس طرح دور ہو کر خود پڑھنے والوں کو بھی اس تبدیلیٔ خیالات کا احساس نہ ہونے پائے اور اسی لیے بطور ایک نعم البدل کے خلعتِ نبوت اتار کر لیڈری کی گون (Gown) پہنادی۔ یہ ہرگز آپ کا خیال نہ تھا نہ ہے نہ ہوسکتا ہے مگر جس طرح حساب میں بچے اپنے سوالات کے جوابات کی جانچ کرتے ہیں کہ تقسیم کا ہے تو ضرب دے کر دیکھتے ہیں اور تفریق کا ہے تو جمع کر کے۔ اسی طرح ایک پڑھنے والے کے جذبات اور اس کے دل پر جو اثرات پیدا ہوسکتے ہیں، ان کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ اس سلسلۂ تاثیر کو الٹ دیا جائے اور تنقید جو ایک نقاد پیش کرتا ہو، اس کو صحیح تسلیم کر کے اور جو اثر کہ آخر کار پڑھنے والوں کے دل پر بقول اس کے پڑنا ممکن یا اغلب ہو اسے قبول کر کے پھر کتاب کو پڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ جو نقوش پڑھنے سے پیشتر ہی دل پر نقش ہو گئے تھے، باقی رہتے ہیں یا مٹتے جاتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب گھڑی ساز گھڑی کے کسی ٹوٹے ہوئے پرزے کو سنبھالنا چاہتا ہے تو خوردبینی شیشہ لگا لیتا ہے جس سے نقص اصلیت سے کہیں بڑا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس غرض سے کہ باریک سے باریک نقص بھی صاف نظر آئے اور اصلاح کی جاسکے۔ اچھے سے اچھا نقاد بھی اکثر اس غرض سے مبالغہ سے کام لیتا ہے اور عوام سے کہیں زیادہ اسے لطیف و باریک بین بننا پڑتا ہے۔ چونکہ غرض اصلاح ہے نہ کہ فساد۔ اس لیے یہ بال کی کھال نکالنا اس کے لیے جائز ہی نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اس کے لیے اصرار کرنا چاہیے۔ اسی وجہ سے میں نے بھی اس تنقید میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور مصر ہوں کہ آپ خود اس سے بھی زیادہ مبالغہ سے کام لیں۔ جوہری جب نگین تراشی میں مصروف ہوتا ہے تو زیادہ وقت اس کا اس تراش وخراش میں صرف نہیں ہوتا جو عوام کو نظر آسکے بلکہ ایسی باریک اصلاح میں جس کا نظر آنا تقریبا

ناممکن ہے اور جو کچھ وہ گھنٹوں کی محنت میں تراشتا ہے وہ نہایت باریک خاک کے چند ذرے ہوتے ہیں جن کو تراشتے تراشتے ہی ہوا لے اڑتی ہے۔ مصنف کسی طرح جوہر فروش سے کم نہیں، اور اس سے زیادہ باریک بین نقاد اس کی تصنیف کا اور کوئی نہ ہونا چاہیے۔

''فلسفۂ اجتماع'' کب 1 تیار ہوئی؟ افسوس ہے کہ انجمن ترقی اردو اپنی طرف سے شائع کردہ کتابوں کا کافی اشتہار نہیں دیتی۔ اسے چاہیے کہ اگر کسی کتاب پر ایک ہزار روپے صرف کرے تو کم از کم دو سو پچاس اس کے متعلق اشتہاروں پر بھی صرف کرے، اخبار والے اس کے ساتھ ضرور رعایت کریں گے۔ میں نے خود ہمدرد میں یہی کیا تھا مگر خود انجمن کے کارکن اس معاملہ میں تساہل برتتے تھے۔ آپ بیسویں صدی کی اس ضرورت اور (Psychology of the Advertising) پر عبدالحق صاحب کو ضرور لکھیے 2۔

نفسیات القرآن پر آپ نے جو کچھ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، اس کے متعلق کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کام کا نقشہ اور تخمینہ، باصلاح تعمیرات کیا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی ریڈیکل کے جسم میں ایک مذہبی دقیانوسی کی روح رکھنے والا سمجھیں گے، اگر میں عرض کروں کہ بقول حالی ؔع

ہاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہے 3

جو کچھ بھی لکھا جائے، وہ یہ سمجھ کر کہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ محاورہ انسانی ہے مگر اس کی تمام Psychology خلاق زمین و آسمان کی ہے۔ غالباً آپ نفسیات القرآن سے یہ ثابت کرنا چاہیں کہ بڑے سے بڑا Psychologist بھی انسانی نفسیات کے اسرار و نکات سے نہ اس

1 میری دوسری کتاب کا نام ای انگریزی لیڈرشپ ہی کا گویا اردو ایڈیشن تھا۔ زیادہ مفصل و مطول۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔

2 مولوی عبدالحق صاحب (بعد کو ڈاکٹر عبدالحق اور بابائے اردو) اس وقت بھی انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری تھے۔

3 اس وقت انگریزی میں ''سائیکالوجی آف دی قرآن'' پر لکھنے کا ارادہ تھا، اسی ملحدانہ رنگ میں بحمد للہ کہ یہ ارادہ اس وقت محض ارادہ ہی کی حد تک رہا۔ محمد علی اس وقت بظاہر بالکل انگریزیت میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن دل و دماغ کے ریشہ ریشہ میں اللہ اکبر کس درجہ اسلامیت رچی ہوئی ہے۔

طرح واقف ہوسکتا ہے نہ اس کے اظہار کے لیے الفاظ اور ترکیبیں اور فقرے کسی زبان میں پا سکتا ہے۔ جس طرح خود اس ذاتِ پاک نے قرآن کریم میں ظاہر فرمادیا ہے، جو عــالــم الـغـیـب والشـهـادة اور انسان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے، تو میدان نہایت وسیع ہے مگر رہرو کو ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے۔ میں ہرگز ان لوگوں کے طرفداروں میں نہیں ہوں جو کلام ربانی سے اس درجہ خائف ہو جائیں کہ اسے کبھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں نہ اس کے متعلق کچھ سوچیں نہ پوچھیں لکھیں۔ کلام پاک ریشم کے جزدانوں اور الماری کے بالاترین حصوں اور وہاں کے گرد و غبار کے لیے آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کا ہر ایک نسخہ اس کثرت سے مستعمل ہو کہ پنسل کے نشان، کاغذ کی پٹیاں، بین الاوراق یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر کے دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ماننے والے کسی کتاب کو نہیں پڑھتے، نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر مجھے ان لوگوں سے ہمدردی ضرور ہے جو قرآن کو نہایت احتیاط و اہتمام کے ساتھ چھوتے ہیں گو برس دو برس میں ایک ہی دفعہ کیوں نہ ہو۔ یہ ام الکتاب ہے اور اس کا ادب باقی رکھنا اس لیے لازم ہے کہ اگر اتنی احتیاط نہ برتی جائے تو تحریف کا اندیشہ ہے۔ اور باقی تمام صحفِ ماقبل اس خطرہ کے بیجا نہ ہونے کا کافی سے زیادہ اور سخت دلخراش ثبوت ہیں۔ اس لیے ایک صاحب نے جب ایک ترجمہ بلامتن میرے پاس ریویو کے لیے بھیجا تو میں نے انھیں اطلاع دے دی کہ مجھے ایندھن کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا مسلمانوں کے لیے یہ بات مایہ ناز نہیں ہے کہ تیرہ سو برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر مسلمانوں نے اس ام الکتاب کو اس احتیاط سے رکھا کہ آج تک ایک لفظ یا حرف تو کجا زیر و زبر کا بھی فرق نہیں ہونے پایا۔ اور تمام فرقے اس پر اتفاق کلی کرتے ہیں۔ قرآن پاک تو قرآن پاک دوسرے صحائف ہمارے کتبِ حدیث کی تحقیق و تدقیق اور صحت و حفاظت کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتے۔ قصہ مختصر، مجھے امید ہے کہ جو کچھ بھی آپ لکھیں گے، آدابِ قرآن کو ہر طرح ملحوظ رکھیں گے۔ مگر لکھیے ضرور۔ اس سے ہرگز نہ خائف ہو جیے، یہ تو ایسی سیدھی سادھی کتاب غیر ذی عوج ہے کہ عرب کے گنوار مدینہ منورہ جاتے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسے سنتے اور ہم سے کہیں زیادہ سچے اور پکے مسلمان بن کر اپنے بالوں والے خیمے اور ریگستان اور اپنے

گلوں میں واپس آجاتے۔ مفسرین کا جہاں شکریہ ادا کرنا ہے، وہاں یہ شکایت بھی باقی ہے کہ باوجود سچی محبت واحترام کے انھوں نے بھی ایک حساب سے ادب قرآن پاک قائم نہیں رکھا، جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر اس نیت سے کہ اپنا تمام کمال اس صحیفۂ اکرم پر صرف کردیں۔ مگر بعض اوقات یہ بھول گئے کہ کہیں حاشیہ متن کو اپنے بوجھ اور پھیلاؤ سے چھپا اور دبا نہ لے۔ یہی حال شیکسپیئر کے جرمن مشرحین کا ہے، ان کا ساری دنیا پر احسان ضرور ہے کہ شیکپیئر کو خود ان کے ہم وطنوں کے تغافل سے نجات دی مگر اب تو بعض نے شیکپیئر کو محض اپنی مضمون آفرینی کا آلہ بنالیا ہے۔ خدا مسلمانوں کو قرآن پاک کے متعلق اس شر سے بچائے۔ آمین!

......☆☆☆......

باب:8

4:1916

(شاعری کی کہانی شاعر کی زبانی)

خط کا ایک حصہ نقل ہو چکا۔ دوسرا جزو جو شاعری کے متعلق تھا، وہ اب نقل ہو رہا ہے اور آج سے پیشتر بھی خدا معلوم کتنی بار کن کن پرچوں، رسالوں اور کتابوں میں نقل ہو چکا ہے۔

''آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں اس وقت زلف وابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رام پور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا، جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے، جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خان صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خان اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خان صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خان صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا، تا کہ وظیفہ محض ''کار بے کاراں'' کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب میں تھا اس لیے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں،

جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو) ۔

آیا دلی سے ایک مشکی خر آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجیے ۔

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار علی روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔ داغ نے پہلے دن پوچھا کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں۔ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیے تھے، جنھیں میں نہایت شان اور زور سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیے۔ سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچہ کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سنیے میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں۔ بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں، اس کو ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں، غرض کوئی بے ادبی و گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔ میری پیدائش 1878 کے آواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت لغو وفضول شعر مگر با معنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ وہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری Official Biography یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری امت کی طرف سے لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا، اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتش دان کی نذر کیا جائے یا سیرت پیشوائے قوم وملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے سنسر [1] نے (جن چند ماہ کے بعد ہی یکایک انتقال ہوگیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑے چڑیا کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ ''بھائی ہے تو چڑیا چڑے ہی کی کہانی، مطلب بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے، نہ معلوم اس میں کچھ زہر بھر دیا ہو اور جوابدہی ہمارے سر آپڑے''۔ آپ نفسیات کے ماہر ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ میرا اوپنے والا سیرت نگار باوجود نقاد سخت ہونے کے ۔

---

[1] ہمدرد 1916 میں سنسر بھی رہا تھا۔ کوئی مضمون بغیر سنسر کی منظوری کے نہیں چھپ سکتا تھا۔

محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہوکر دنیا کو نئی نئی معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کردیں؟ اس لیے بہتر ہے کہ انھیں داخل ہی کر دو اور اس طرح ہمیشہ کے لیے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنیے۔ گیارہ برس کی عمر میں علی گڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھی تھی، اٹھا کر پڑھنے لگا اور میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا، حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعہ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہوگئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے، انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا، مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصا شہرہ ہوا۔

اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحان نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم میں شعرائے باکمال نے حاجی اسماعیل خان صاحب 1 (تربیت الدجاج اور ''یونین جیک'' والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی۔ ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا، ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب تازہ آنریبل و آزمودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے برادر ''اصغر 2''۔ خیر

---

1 رئیس دتاؤلی اپنے زمانہ میں مشاہیر علی گڑھ میں تھے۔

2 سید اصغر حسین صاحب بی اے (علیگ) نے سیشن ججی سے پنشن پائی۔ سید وزیر حسن نے اودھ چیف کورٹ کی چیف ججی تک ترقی پائی، اب سر وزیر حسن ہیں (48)۔

ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعدۂ حسرت 1 نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا، چودھویں کو پیش ہوا کرتا تھا، اور شمع پیش نہ کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا ''لان'' جائے مشاعرہ تھا۔ ایک چودھویں کو بارش ہوگئی تو 4-3 دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر یونین ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح اس شعر کا بھی اضافہ کردیا۔

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی، مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو بس اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور سبزۂ خط وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کردیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد وتقویٰ کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا دو برس کسی اور خیال نے۔ مگر یہ آخری خیال باعصمت تھا اور محض حالات گردوپیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد ''کپڑے پھاڑے گھر کو آئے'' تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کردیا۔ گزشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ، مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے، اور تغزل کا زور ہے، یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانہ میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں، نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بہ غایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ کر بھیجو، اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں۔ Touchstone کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں A poor thing but my own۔

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں۔ بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب۔ عزیزی مسعود 2 کے رشتہ سے بھی سیر احق پہنچتا ہے۔ والسلام۔ محمد علی

---

1 یعنی مشہور شاعر حسرت موہانی

2 باندہ کے خان بہادر حاجی مسعود الزماں بیرسٹرایٹ لا اور ممبر یوپی کونسل۔ میر اعقدان ہی کی چھوٹی ہمشیرہ سے ہوا تھا۔

مکرر یہ کہ مجھے سخت تعجب ہوگا، اگر آپ صاحبزادہ[2] صاحب کے ساتھ نباہ کر سکے۔ ہمارا تجربہ مدتوں کا ہے۔ گو اوروں کے لیے اپنا تجربہ اکثر بے سود ہوتا ہے۔

تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی (غالب)

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی	اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر	ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی
کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کرلو	سیر ظلم کو تھوڑی سی فضا اور سہی
ربِ عزت کے لیے بھی کوئی رہنے دو خطاب	تم خدا وند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
عہد اوّل کو بھی اچھا ہو جو پورا کردو	تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی
حکم حاکم نہ سہی مرگِ مفاجات سے کم	مالک الملک پہ ایماں کی سزا اور سہی
جس نے ہنگامہ عدالت کا تری دیکھا ہے	اس گنہگار کو ایک روزِ جزا اور سہی
بندگی میں تری سہتے ہی ہیں لو کی لپٹیں	چند دن کے لیے دوزخ کی ہوا اور سہی
دل تو جا ہی چکا گر جان بھی جاتی ہے تو جائے	ترکش کفر میں اک تیر قضا اور سہی
ہم وفا کیشوں کا ایمان بھی ہے پروانہ صفت	شمع محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

مار ادیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور (غالب)

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور	جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور
گر بوئے گل نہیں، نہ سہی یادِ گل تو ہے	صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور
پاداش جرم عشق سے جو کب تلک مفر	مانا کہ تم رہا کیے دار و رسن سے دور
کچھ بھی وہاں نہ خنجر قاتل کا بس چلا	روحِ شہید رہتی ہے نعش و کفن سے دور
تقویٰ کے بعد خوف کہاں حزن پھر کہاں	عالم ہی اک جدا ہے وہ رنج و محن سے دور
مست مئے الست کہاں اور ہوس کہاں	طرز وفائے غیر ہے اپنے چلن سے دور
واعظ کا ارتداد نہ میرا ہی ترکِ کفر	کچھ بھی نہیں ہے ساقی توبہ شکن سے دور

---

[2] مراد وہی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سکریٹری کانفرنس علی گڑھ ہیں، محمد علی کی ان سے پرانی چشمک تھی۔

ہے بعد کربلا سے بھی قربِ یزید بھی
اور چاہتے یہ ہیں کہ نہ ہو پنج تن سے دور

اللہ رے نور چشم محبت کی جستجو
نکلا اسیر مصر نہ کچھ بھی وطن سے دور

آساں نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا
تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہ کن سے دور

مسلم اجل سے دور نہیں روز کربلا
رہتا نہیں برات میں دولہا دلہن سے دور

منقار عندلیب کو صیاد سے چکا
مانا کہ گوش گل ہے لب نالہ زن سے دور

یوں پی سکو مواخذۂ حشر سے تو، ہاں
مارو دیار غیر میں ہم کو وطن سے دور

مفتیِ مفت خوار کو سب کچھ حلال ہے
بوئے شرابِ شرک ہو پھر کیوں دہن سے دور

دست دراز کو ترے اے رند باصفا
رکھے خدا عمامہ شیخ زمن سے دور

ہم تک جو دور جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردش چرخ کہن سے دور

میں اتنے لاف شوق پہ مرعوبِ حسن بھی
یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد وزن سے دور

تم ہو تو نذر عشق، نہ لکھیں وہ مرثیہ
یہ بات ہے مروت اہل سخن سے دور

تاویل بڑھ کر اقرب للکفر ہوگئی
کچھ بھی نہیں ہے شیخ ترے علم وفن سے دور

تم سے بعید تھا کہ بھلادو، اگرچہ ہم
اک عمر ہوگئی کہ ہوئے انجمن سے دور

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی
اک لاش تھی پڑی ہوئی گور وکفن سے دور

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر
ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

غیروں کے ساتھ ہم سے الگ حیف ہے اگر
یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذر حیا کے بعد

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

کیا زندگی جو دل میں کوئی آرزو نہ ہو
رہتی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

ہے کس کے بل پہ حضرت جوہر یہ روکشی
ڈھونڈھیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

یہ نور خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا
کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ تو بھی بجھا دیکھ

سمجھا بھی ہے کچھ تو کہ یہ ہے کس سے تمرد
اللہ کو مان، اپنی حقیقت کو ذرا دیکھ

سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل
رنگ فلک پیر، زمانہ کی ہوا دیکھ

ہے سنت ارباب وفا صبر وتوکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ خدا دیکھ

اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا
اس سادگی پہ شوخی خونِ شہدا دیکھ

خو تیری دو روزہ مرا پیماں ہے ازل کا
پابند جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ

ہم کہہ نہیں سکتے وہ کریں چارہ گری بھی
حالِ دلِ بیمار طبیبوں کو سنا دیکھ

تو طیر ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور
بے چارگی پر اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ

دشت رہ غربت میں اکیلا تو نہیں تو
بطحا کے مہاجر کا نقش کف پا دیکھ

عقبیٰ تو کہاں، واں نہیں دنیا بھی کچھ ٹھیک
اس کافر بے فیض سے دل تو بھی لگا دیکھ

اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزا ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہ قضا دیکھ

ہو حسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا دیکھ

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہوں
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

سینہ ہمارا فگار دیکھیے کب تک رہے
چشم یہ خوں نابہ بار دیکھیے کب تک رہے

عشق، سودہ بھی ترا، صبر طلب ہے بہت
صبر ہمارا شعار دیکھیے کب تک رہے

سب کو یہاں ہے فنا ایک تجھے ہے بقا
یہ ستم روزگار دیکھیے کب تک رہے

یوں تو ہے ہر سو عیاں آمد فصل خزاں
جور و جفا کی بہار دیکھیے کب تک رہے

زور کا پہلے ہی دن نشہ ہرن ہوگیا
زعم کا باقی خمار دیکھیے کب تک رہے

پہلے رہا درد دل مونس جاں مدتوں
درد مگر اب کی بار دیکھیے کب تک رہے

ہم نے یہ مانا کہ یاس کفر سے کمتر نہیں — پھر بھی تیرا انتظار دیکھیے کب تک رہے
حق کی کمک ایک دن آ ہی رہے گی و لے — گرد میں پنہاں سوار دیکھیے کب تک رہے
رونق دہلی پہ رشک تھا کبھی جنت کو بھی — یوں ہی یہ اجڑا دیار دیکھیے کب تک رہے
طاعت وآزادگی یوں تو نہ تو ضدین تھی — جبر کا یہ اعتبار 1 دیکھیے کب تک رہے
دین پہ دنیا فدا کرتے رہے مدتوں — کفر پہ ایماں نثار دیکھیے کب تک رہے

یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے بقول آپ کے میری ''امت'' ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہر حال مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق، یہ صرف اپنی دست افشانی اور پا کوبی کے لیے ہیں۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔

آپ کا نیاز مند
محمد علی

انوار احمد صاحب کو اور نیز عباسی صاحب کو سلام شوق دونوں کی طرف سے 2۔

......☆☆☆......

---

1 عجب نہیں جو یہ لفظ ''اختیار'' ہو۔ مطبوعہ کلام جوہر سے یہ شعر خارج ہے۔

2 دونوں صاحب کانفرنس میں اہلکار تھے ''دونوں کی طرف سے'' یعنی شوکت علی صاحب کی طرف سے بھی کہ وہ بھی نظر بندی میں ساتھ تھے۔

باب:9

5:1916

اسلام کا دیوانہ نظر بند

خط کیا آیا، یہ کہیے کہ بزم مشاعرہ میں شمع گردش میں آئی۔ابھی اس کے ہاتھ میں ہے، ابھی اس کے۔ خدا جانے کتنوں نے پڑھا، کتنوں نے دوسروں کو پڑھتے ہوئے سنا، کتنوں نے ان اوراق کو آنکھوں سے لگایا، کتنے پڑھ کر جھوم جھوم اٹھے، لوٹ لوٹ گئے۔کلام خود دلکش، اور پھر سب سے بڑھ کر وقت کی فضا، جتنا حصہ سیاسیات اور ایمانیات کا تھا، وہ قال نہیں، سرتا سر حال تھا۔لوگ کیسے نہ وجد میں آ جاتے........جواب میں ایک خط جلد ہی لکھ ڈالا۔اور جب اس کا جواب نہ آیا تو انتظار کر کے دوسرا خط 25 ستمبر کو، اور مزید انتظار کر کے تیسرا خط 11 اکتوبر کو ڈاک کے سپرد کیا۔گھر کا ایک لڑکا کام کاج میں رہتا تھا اور خط ڈاک خانہ اکثر اسی کے ہاتھ جاتا تھا۔ بدگمانی یہ ہوئی کہ کہیں اسی نے ٹکٹ کے لالچ میں آ کر ٹکٹ تو نہیں اکھاڑ لیے اور خط پھاڑ کر پھینک دیے۔اس درمیان میں یعنی ختم اگست پر علی گڑھ سے تعلق قطع کر کے میں لکھنؤ واپس آ گیا تھا اور قیام زیادہ تر لکھنؤ یا کبھی اپنی سسرال باندے میں رہتا تھا........شادی کے ابھی تین ہی چار مہینے تو ہوئے تھے۔

علی گڑھ سے واپس آ جانا تمام تر اپنا ہی فعل خود اختیاری تھا۔وطن سے باہر جی نہ لگا، طبیعت نے بہانہ علی گڑھ کی آب و ہوا کی خرابی کو بنایا، بدنامی تھوڑی بہت بیچارہ صاحبزادہ آفتاب احمد خان

کے حصہ میں آئی کہ انھوں نے جمنے نہ دیا۔ حالانکہ ان مرحوم کا اس میں قصور ذرہ بھر بھی نہ تھا، وہ غریب تو مجھے دل سے روکنا چاہتے تھے۔

میرے ان تینوں خطوں میں تھا کیا؟ کچھ تھوڑی سی نوک جھونک محمد علی کی سخت مذہبیت پر تھی کہ آپ میری زیر نظر نفسیات القرآن (سائیکالوجی آف دی قرآن) میں مجھ سے کسی مولویت یا اسلامیت کی توقع کیوں رکھتے ہیں، میں تو قرآن کے فلسفہ پر (نعوذ باللہ) اسی طرح لکھوں گا جس طرح یونان اور یورپ کے بڑے بڑے فلسفی ارسطو یا کانٹ پر لکھا جاتا ہے۔ یہ بھی مسرت کے ساتھ ذکر تھا کہ مشہور برطانوی صحافی سر ویلنٹائن شیرول (Chirol) نے سائیکالوجی آف لیڈرشپ پر اچھی رائے لکھ کر بھیجی ہے۔ لکھنؤ سے ''ہمدم'' نیا نیا یکم اکتوبر سے سید جالب دہلوی (سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر ہمدرد) کی ایڈیٹری میں نکلا، کچھ اس کا ذکر خیر تھا۔ اور ایک چوٹ یہ بھی تھی کہ آپ کا اپنے اس جوش دینی اور تقشف مذہبی کے ساتھ، علی گڑھ کے ظریف محمد ایم اے سے (جو دہریت والحاد کے مبلغ تھے) دوستی کو نباہ کیوں کر ہوا؟...... جواب وسط نومبر کے قریب آیا اور اتنا مفصل و دلچسپ کہ سارے پچھلے انتظار کی تلافی ہوگئی آج آپ کو کسی انتظار کی بھی ضرورت نہیں۔ معاً پڑھنا شروع کر دیجیے۔

....

10 نومبر 1916 چھندواڑہ

مکرمی۔ تسلیم

یہ سچ ہے کہ آپ کے ملازم صاحب نے ایک خط آپ کا ضرور تلف کر دیا مگر اس کے بعد کے دونوں خط مورخہ 25 ستمبر و 11 اکتوبر مجھے ملے۔ میری اس خاموشی سے آپ ضرور متردد اور غالباً مجھ سے ناخوش بھی ہوں گے مگر میرے عذرات سن کر ضرور مجھ سے ہمدردی بھی فرمائیں گے۔ آپ کا پہلا عنایت نامہ مجھے 28 ستمبر کو ملا۔ اکتوبر کو مسٹر معظم علی [1] میرے سالے

---

[1] معظم علی خاں مرحوم بی اے، بیرسٹر ایٹ لاء، علی برادران کے زمانہ اسیری (22,23) میں مرکزی خلافت کمیٹی کے سیکریٹری رہے۔ اس وقت (1912) میں بانکی پور میں بیرسٹری کرتے تھے۔ آخر عمر میں رامپور میں ہائی کورٹ کے جج ہوگئے۔

بانکی پور سے مع اپنی بیگم صاحبہ اور دو چھوٹے بھائیوں کے تشریف لائے۔ چونکہ والدہ رامپور تھیں، اور میری اہلیہ کو کامل صحت نہ ہونے پائی تھی۔ اس لیے خانہ داری کا تھوڑا بہت کام میرے بھی متعلق تھا۔ یہی کچھ کم نہ تھا کہ مجھے تیمارداری بھی کرنا پڑی۔ اور وہ بھی ایک نرس کی طرح۔ میرا منجھلا سالا بانکی پور سے ہی بخار ساتھ لایا۔ یہاں دو روز بعد ڈاکٹر نے ٹائیفائیڈ تشخیص کیا اور یہ بھی جتلا دیا کہ اس عمر میں یہ مرض سخت ترین امراض سے ہوتا ہے اور علاج سوائے نرسنگ کے کچھ نہیں۔ شوکت صاحب تو ہمیشہ کے میرے تیماردار تھے۔ اب کی بار بالکل بیکار ہو گئے۔ ایک ناتجربہ کار ڈاکٹر نے کچی پھوڑیا میں نشتر لگا دیا۔ معدہ خراب پہلے ہی سے تھا ارتیھیا میں مبتلا ہو گئے اور سخت تکلیف رہی۔ دس بارہ دن برابر مسہل ہوئے۔ تب جا کر چلنا پھرنا نصیب ہوا۔ میں اپنی چھوٹی لڑکی کی تیمارداری ٹائیفائیڈ میں حال ہی میں کر چکا تھا۔ میری اہلیہ سخت علیل رہیں تو ان کی تیمارداری بھی مجھی کو کرنا پڑی۔ ان امراض پیہم نے مجھے جھنڈواڑہ کی اچھی خاصی مس فلارنس نائٹ انگیل [1] بنا دیا تھا۔ یہ تو امر مسلم ہے کہ ''ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف'' اپنے سالے کی تیمارداری میں ایسا منہمک ہو گیا اور ایسا منہمک ہونا پڑا کہ آپ کو ایک کارڈ بھی اطلاعانہ لکھ سکا کہ دونوں عنایت نامے مل گئے۔ میرے متعلقین کو اس کوردہ میں پڑے پڑے ایک سال ہونے کو آیا تھا مگر تنہا چھوڑنا بھی گوارا نہ تھا۔ دوسرے لے دے کر صرف ڈھائی سو روپیہ کے وظیفہ پر معاش تھی۔ اب جب تک اس Subsistence Allowance [2] پر ایک Separation Allowance [3] کا اضافہ نہ ہوا، ان لوگوں کو علاحدہ رکھنے کی نظر بند بجٹ میں گنجائش بھی نہ تھی۔ ایک ہنڈیا مشکل سے چڑھنے پاتی تھی۔ دو ہنڈیوں کا چڑھنا معلوم۔ مگر یہ بھی سوچتا تھا کہ ہم تو پھر بھی شہر میں چل پھر لیتے ہیں، رہتے رہتے بہت لوگوں سے واقفیت ہو گئی ہے۔ دوسرے اپنے افکار و اشغال کا کام کرتے ہیں۔ ان بیچاروں کے لیے تو یہ بھی موجود نہیں۔ سوائے ایک دو گھروں کے کہیں آنا جانا نہیں ''ملا کی دوڑ مسجد تک'' اگر ہوا خوری کے لیے کہیں باہر گئیں بھی تو سول لائنس میں دو ایک جگہ۔ حدود میونسپلٹی سے باہر نکلنے پر نظر بندوں کے

---

[1] ایک انگریز خاتون، میدان جنگ میں تیمارداری کے کام کے لیے مشہور۔

[2] گزارۂ معاش۔ [3] گزارۂ افتراق۔

پر جلتے تھے۔ پھر گھر میں پیہم بیماریوں کا ہونا۔ اور خصوصاً موتی جھرا کے دو واقعات پے در پے اس لیے گورنمنٹ کو لکھا کہ جس زمانہ میں یہ الاؤنس مقرر ہوئی تھی صرف میرا بار اس پر تھا اور میں نے دراصل اصولاً اس پر زور دیا تھا اور بھائی Haily 1 سے ''دوستانہ'' خط و کتابت عرصہ تک صرف اصول کے لیے جاری رکھی تھی۔ مگر ہمدرد کے بند ہو جانے کے بعد صرف یہی ایک ذریعہ معاش کا میرے اور میرے متعلقین کے لیے رہ گیا تھا۔ میرے ہی لیے کافی نہ تھا مگر ع

این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

کے اصول پر جس طرح بن پڑا، اب تک کام چلایا مگر اس الاؤنس کے دو ٹکڑے کرنا اور چھ چھ برس کے دو ملازم نوکر رکھنا برابر ہے۔ سفر خرچ کی بھی گنجائش نہیں سفر خرچ دیا جائے اور الاؤنس میں اضافہ کیا جائے۔ یہ تحریر اب گورنمنٹ کے زیر غور ہے۔ نہ معلوم خزانہ عامرہ کی کیا کیفیت ہے۔ تہی ساغری ہے یا لبریزی۔ بہر حال متعلقین کا زیادہ رکھنا مناسب نہ تھا۔ ان کو یکم نومبر کو براہ بانکی پور روانہ کر دیا ہے۔ ڈھائی تین ماہ بعد پھر آ جائیں گے۔ والدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم تنہا رہ گئے تو بیچاری فوراً رخت سفر باندھ چل دیں۔ اور 5 مئی کو یہاں آ گئیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ اب تک مجھے کس قدر کم فرصت ملتی ہوگی۔ 18 تک تو عزیزی مسعود کو حرارت رہی اس کے بعد جا کر ٹوٹی اور بفضلہٖ تعالیٰ صحت کامل حاصل ہوگئی۔ مگر 12 تک سخت تردد تھا۔

اس قدر لمبی چوڑی معذرت کے بعد آپ کے عنایت ناموں کا جواب دیتا ہوں۔ بھائی علوی 2 بھی مجھ سے کچھ خفا ہیں کہ اب تک فلسفۂ اجتماع کی جلد روانہ نہ کی۔ مجھے پہلے بھی خوف تھا اور اب تو آپ کے لکھنے سے اس خیال کو اور تقویت ہوگئی کہ آپ کو اجتماع سے نفرت ہے۔ مگر تعجب ہے کہ صاحبزادہ صاحب کو بھی اجتماع سے نفرت ہے اور آپ کو بھی اور پھر دونوں میں نہ نبھ سکی 3۔ نہ معلوم نفسیات القرآن میں آپ '' وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' اور ''شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ'' کی شان میں کیا فرمائیں۔

بہر حال فلسفہ اجتماع کے دیکھنے کا مشتاق ہوں۔ ظفر الملک صاحب سے کہہ کر جلد روانہ

---

1 سر ملکم ہیلی چیف کمشنر دہلی۔

2 یعنی مولوی ظفر الملک علوی الناظر بک ایجنسی۔ 3 اب میں کانفرنس سے واپس چلا آیا تھا۔

کرائیے۔ سائیکالوجی آف لیڈرشپ پر میں تو اپنی رائے دے چکا ہوں۔ سرویلنٹائن شیرول[1] ایک خبیث و بد باطن شخص ہے، نہ معلوم اس کی تعریف کی آپ نے کس طرح وقعت کی۔ وہ ہمارے لیے غلامی اور اپنے لیے خواجگی ہی کو پسند کرتا ہے۔ ابھی حال میں شملہ میں میرے ایک چغد صفت دوست جگندر سنگھ صاحب نے ان کے لیکچر میں صدارتی تقریر کی تھی اور فرمایا تھا کہ 20 برس سے انھیں مشرق بلا رہا تھا، ان کی مشرق کے حال پر یہ بڑی ہی نوازش ہوئی کہ تشریف لائے۔ ''خانہ خانۂ تست'' کا مضمون ہے۔ مگر کاش ان کو 4 ہی سال پہلے مغرب بھی پکارتا[2] اور وہ اس کے حال پر بھی رحم فرماتے اور وطن مالوف کی طرف مراجعت فرماتے۔ مگر ان لوگوں کی صرف یہی سزا ہے کہ قانونِ قدرت ان کی خاطر نہیں بدل سکتا۔ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود اس میں گرتا ہے۔ غلامی کو دوسرے کے لیے پسند کرنا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے اپنی غلامی کا۔ اگر اجتماع ہمارے لیے برا سمجھا جاتا ہے تو کل کو خود ایسا کہنے والوں کے لیے برا سمجھا جائے گا۔ روما کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ تاریخ اسلام خود اس کی شاہد ہے۔ جس طرح آپ مجھے لکھ رہے ہیں، اس سے تو نفسیات القرآن کے متعلق بھی میرا خوف روبہ ترقی ہے۔ ''ناطرفدارانہ طرزادا'' مخالفین کے رام کرنے کے لیے شوق سے استعمال کیجیے لیکن اگر آپ کا قلب ''ناطرفدار'' ہے اور وہ حصۂ جسم بھی جس میں ایمان جاگزیں ہوتا ہے، محض ایک سادہ لوح ہے، جس پر آپ کی ''عقلیت'' کی بدولت کچھ نقوش منقش ہوں گے تو ایک مسلم اور مومن سے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ آپ کو مسلم اور مومن بھی سمجھے۔ جب ایک بار قلب نے اعتراف و اقبال کیا کہ آمنا و صدقنا تو پھر تو یہی صادق آنا چاہیے کہ ''مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجائے کہیے'' گو روئے سخن اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہونا چاہیے، نہ ہر گیسو دراز و ریش

---

[1] برطانوی صحافت کا ایک نامور رکن، ٹائمس (لندن) کے شعبہ خارجہ کا مدیر اعلیٰ ہندوستان و مشرق سیاح (Chirol) اس زمانہ میں ہندوستان آیا ہوا تھا۔ میں نے اپنی کتاب لیڈرشپ اس کی خدمت میں تحفتاً پیش کی تھی، اس نے اس کی ایک خط میں بہت داد دی تھی۔ افسوس کی داد میں معراج کمال سمجھتا تھا۔

[2] میں نے اپنی ملحدانہ شوخ چشمی کے ماتحت لکھ بھیجا تھا کہ نفسیات القرآن بالکل اسی آہنگ پر لکھی جائے گی جس پر نفسیات ارسطو یا نفسیات کانٹ لکھی جاتی۔

دراز کی طرف۔ میں اجتہاد پر ایمان رکھتا ہوں اور اس کو بہت ضروری بلکہ لابدی سمجھتا ہوں۔ کورانہ تقلید میرا ہرگز مذہب نہیں۔ اگر آپ اس طرح لکھیں کہ اپنا ایمان مقدمہ کتاب میں واضح ہو جائے اور محض اس Faith کی تشریح اصل کتاب میں جس سے خود آپ کے قلب کی لوحِ سادہ پر بتدریج ایمان وعقیدہ منقش ہو گیا۔ تاکہ ناظر فدار تو ناظر فدار خود مخالفین کے دلوں پر کفر وشرک کے نقوش دھندلے پڑتے جائیں اور بتدریج مٹ جائیں۔ اور پھر اس ورق سادہ پر آپ کی کتاب کلمہ ''لاَاِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' جلی حروف میں لکھ دے تو میں واقعی آپ کی نفسیات کی قدر کروں گا۔ برادرم ایمان ہر شے پر مقدم ہے اور میرا خیال ہے کہ جب مسلمانوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفۂ اول بنایا تو دراصل اس امر کا اعتراف کیا کہ ایمان ابوبکرؓ، عدل عمرؓ، غناوحیائے عثمانؓ، اور فقر وشجاعت علیؓ سے بھی زیادہ قابل قدر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آفتاب محمدی بہ تقاضائے بشری 23 سال کی نبوت کے بعد غروب ہو گیا اور سارے عالم پر اندھیرا سا چھا گیا تو جو لوگ ہر امر میں اس شمع ہدایت کی روشنی کے عادی ہو گئے تھے، خدا کی دی ہوئی آنکھیں بھی گویا کھو بیٹھے تھے اور بعض مؤلفۃ القلوب کے ارتداد اور زندیق ہو جانے سے ان کے ایمان بھی تھوڑی دیر کے لیے معرض خطر میں آ گئے، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کو سوائے اس کے کچھ نہ سوجھا کہ تلوار نکال کر کھڑے ہو گئے اور چلانے لگے کہ اگر کسی نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ) قضا کر گئے تو اس کی قضا اسی وقت اسی تلوار کے ذریعہ اس تک پہنچ جائے گی۔ ایسے وقت میں وہ ''آمنا و صدقنا'' کہنے والا آیا اور اس نے ایک بدیہی امر ان سراسیمہ اور پریشان لوگوں کو جتلایا۔ آفتاب محمدی غروب ہو گیا تھا مگر خدا کا شمار آفلین میں نہ تھا۔ آفتاب اسلام اسی طرح درخشاں تھا، بھائی یہ سب ایمان کے کرشمے تھے۔ یہ فطرت صدیقی تھی، اگر کچھ کمی تھی تو اس امین اعظم کے ایمان نے پوری کر دی تھی۔ جب غارِ ثور میں ابوبکرؓ کو بتایا گیا تھا کہ وہاں سینکڑوں دشمنوں سے خائف اور مارے ڈر کے غار میں چھپے ہوئے صرف بندگانِ خدا ہی نہ تھے بلکہ ایک تیسرا اور بھی وہاں موجود تھا، جو ان دونوں کا نگراں ونگہبان تھا۔ ''اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا'' کی تعلیم کے بعد ایمان ابوبکرؓ پختہ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ امین صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت صدیقؓ کو ملی۔ اگر آپ فلسفہ اور استدلال سے مدد لیتے ہیں تو لیجیے مگر صرف اسی طرح اطمینان قلب کے

لیے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے مردہ کو زندہ کرنے کے لیے اطمینان قلب چاہا تھا۔ مخالف کے لیے دلیل اور ثبوت کے ہتھیار تیار کیجیے۔ استدلال وتحقیقات کی توپیں اپنے کارخانہ اسلحہ سازی میں ڈھالیے۔ یہ تو ایک مومن کے لیے ضروری ہیں تاکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر جاری رہے جس کے لیے ہم کو ''خیر امۃ'' کا لقب عطا ہوا ہے۔ مگر کیا ''یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہ'' قرآن کریم سے خارج کر دیا گیا ہے۔ مجھے اگر اعتراض ہے تو صرف اس پر کہ کہیں خود قلب ودماغ ناطرفدار نہ ثابت ہوں۔ اسلوب بیان تمام تر ارسطو اور کانٹ کی کتابوں پر تنقید کا[1] کیسے ہوسکتا ہے جبکہ ہم ان دونوں کو مرکب من الخطا مانتے، ان کی تقلید ہر امر میں فرض نہیں جانتے مگر قرآن حرف بہ حرف فرمودۂ خدا ہے اور خدا خاطی نہیں ہوسکتا، ص 73۔ آپ شوق سے اسے فرمودۂ خدا ثابت کیجیے مگر خود آپ کے قلب کو مستغنی عن الحجۃ ہونا چاہیے۔ بھائی جتنی شاعری چاہو باہر کی عورت پر صرف کرو اور اسے لبھاؤ اور رام کرو مگر گھر کی بیوی تمھاری ہے نہ دوسرے پر نظر ڈال سکتی ہے نہ اس کو تمھاری گریہ وزاری اور التماس وگزارش کی ضرورت ہے۔ بلکہ اصل تو یہ ہے کہ بقول میرے ۔

نہ تبسم کی ضرورت نہ نگہ کی حاجت   نہیں جز دل کی ضرورت کوئی دل آنے میں

غزالی کا فلسفہ مجھ سے زیادہ آپ نے پڑھا ہوگا۔ ان کی ''احیاء العلوم'' کا اگر ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوگیا ہوتا تو ڈیکارٹ کو دنیا چور سمجھتی۔ مگر ان کی خود تصنیف کردہ سیرت بلکہ سوانح قلبی ودماغی کو ملاحظہ فرمایئے۔ آخر میں اسی کا اعتراف ہے کہ اصل وہی مشاہدہ ہے جو حسیات ظاہرہ سے مستغنی اور استدلال وحجت سے بے نیاز ہے۔

خدا نے ہم پر بڑا رحم فرمایا جو مسلمان کے گھر میں پیدا کیا۔ Heredity[2] کا رجحان اسلام وتوحید کی طرف، تربیت اسلام اور توحید کے دائرہ میں۔ اگر اس پر ہمارے فلسفہ نے ہماری امداد کی ہے تو سونے پر سہاگا ہے۔ اسلام اور ایمان کو اور بھی تقویت ہوگئی اور عقل ونقل دونوں کی زد سے باہر ہوگئے۔ اب نہ ارسطو کا جادو چل سکتا ہے نہ کانٹ کا۔ لیکن اگر صرف

---

1. میں نے اپنی ملحدانہ شوخ چشمی کے ماتحت لکھ بھیجا تھا کہ نفسیات القرآن بالکل اس آہنگ پر لکھی جائے گی جس پر نفسیات ارسطو یا نفسیات کانٹ لکھی جاتی۔

2. یعنی وراثت۔

استدلال ہی پر بھروسہ ہے اور خود اپنی عقل پر اس قدر زعم ہے کہ جو اس میں نہ سمائے وہ خدا نہیں اور جو اس میں نہ آئے وہ ایمان نہیں۔ تو اس کا جواب یہی ہے کہ "پائے استدلالیاں چوبیں بود"۔ اور باوجود اس کے کہ میرے اور شاید آپ کے بھی استاد (شبلیؒ) آخر میں اسی ہیئت سے چلتے تھے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ "پائے چوبیں سخت بے تمکین بود" خواہ کسی طرح تفسیر کیجیے، مگر قرآن خود صاف صاف کہہ چکا ہے کہ علم انسانی بہت ہی کم ہے۔ میں اس کا ضرور قائل ہوں کہ خواہ کسی قدر کم کیوں نہ ہو وہ خدا کی دین اور ایمان کے بعد اس کی بہترین دین، بلکہ اس کے بغیر ایمان کمزور و ضعیف رہتا ہے۔ اس لیے اس کا پورا پورا استعمال کرنا چاہیے، اور ایمان کے لیے علم کا پشتہ ایمان کو مستحکم کرنے والا ہوتا ہے، اس لیے اس کے ذریعہ سے ایمان کا استحکام کرنا چاہیے۔ مگر زعم علم سے پرہیز ضروری ہے۔ رحمت خدا کی رحمت ہو اقبال پر خوب تعلیم مولانا روم کا اہتمام کر رہا ہے [1]۔

پرزن واز جذب خاک آزاد باش	ہم چوں طائر ایمن از افتاد باش
تو اگر طائر نوائے ہوشمند	برسر غار آشیانِ خود مبند
اے کہ باشی درپے کسب علوم	با تو می گویم پیام پیر رومؒ
علم را برتن زنی مارے بود	علم را بردل زنی یارے بود
آگہہ از قصہ اخوند روم	آں کہ داد اندر حلب دریں علوم
پائے در زنجیر تو جیہات عقل	کشتیش طوفانی ظلماتِ عقل
موسیٰ بیگانۂ سینائے عشق	بے خبر از عشق و از سودائے عشق
از تشکک گفت و از اشراق گفت	وز حکم صد گوہر تابندہ سفت
عقدہ ہائے قول مشائین کشود	نور فکرش ہر خفی را وا نمود
گرد وپیشش بود انبار کتب	برلب او شرحِ اسرار کتب
پیر تبریزیؒ ز ارشاد کمال	جست راہِ مکتب ملا جلال
گفت ایں غوغا و قیل قال چیست	ایں قیاس ووہم واستدلال چیست

[1] اقبال کی اس وقت تک صرف دو ابتدائی مثنویاں "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" شائع ہوئی تھیں۔

پائے خویش از مکتبم بیرون گزار قیل وقال ست ایں ترا باوے وچہ کار
قال ما از فہم تو بالاتر است شیشہ ادراک را روشن گرست
حرفِ ملا شمس را حدت فزود آتشے از جانِ تبریزی کشود
برزمین برقِ نگاہ ارفتاد خاک از سوز دمِ او شعلہ زاد
التہابِ دل خس ادراک سوخت دفتر آں فلسفی را پاک سوخت
مولوی بیگانہ از اعجاز عشق ناشناسِ نغمہ ہائے ساز عشق
گفت ایں آتش چساں افروختی دفترِ اربابِ حکمت سوختی
گفت شیخ اے مسلم زنار دار ذوق وحال است ایں ترا باوے وچہ کار
حالِ ما از فکر تو بالاتر است شعلۂ ما کیمیائے احمر است
ساختی از برفِ حکمت ساز وبرگ از سحاب فکر تو بار دتگرگ
آتشے افروز از خاشاکِ خویش شعلہ تعمیر کن از خاک خویش
علم مسلم کامل از سوز دل است معنی اسلام ترکِ آفل است
چوں زبند آفل ابراہیم دست درمیانِ شعلہ ہا نیکو نشست
علم حق را در قفا انداختی بہر نانے نقد دین در باختی
گرم رو در جستجوئے سرمۂ واقف از چشم سیاہِ خودنۂ
آب حیوان از دم خنجر طلب از دہانِ اژدہا کوثر طلب
سنگ اسود از دربت خانہ خواہ نافۂ مشک از سگ دیوانہ خواہ
سوز عشق از دانش حاضر مجوے کیف حق از جامِ ایں کافر مجوے
مدتے محو تگ و دو بودہ ام راز دانِ دانش نو بودہ ام
باغبانان امتحانم کردہ اند محرم این گلستانم کردہ اند
گلستانے لالہ زار عبرتے چون گل کاغذ سراب نکہتے
تاز بند ایں گلستاں رستہ ام آشیان برشاخِ طوبیٰ بستہ ام
دانش حاضر حجابِ اکبر است بت پرست وبت فروش وبت گراست

پابہ زندان خطا ہر بستۂ　　از حدود حس بروں ناجستۂ
در صراط زندگی از پافتاد　　برگلوئے خویشتن خنجر نہاد
آتشے دارد ومثال لالہ سرد　　شعلہ ہائے او مثال خوالہ سرد
فطرتش از سوز عشق آزاد ماند　　در جہانِ جستجو ناشاد ماند
عشق افلاطون علت ہائے عقل　　بہ شود از نشترش سودائے عقل
جملہ عالم لساجد ومسجود عشق　　سومناتِ عقل را محمود عشق

ایں مئے دیرینہ در میناش نیست
شور ''یارب'' قسمت شبہاش نیست

لکھنے بیٹھا تھا خط، مگر لکھ گیا اقبال کی مثنوی شریف۔ مگر چونکہ بحیثیت ادب کے اس کا پایہ میری نثر سے اتنا ہی اونچا ہے، جتنا کہ زمین سے آسمان کا، اور آپ باوجود فلسفی ہونے کے ادب کو استدلال پر مرجح سمجھتے ہیں، اس لیے اسرار خودی کا یہ حصہ نقل کر دیا گیا۔ امید ہے کہ تشفی ہوگئی ہوگی۔

رہا ظریف[1] مرحوم کا معاملہ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ مجھے مرحوم سے بے حد محبت تھی۔ میں ان کی قابلیت اور اس سے زیادہ ان کی محبت کا قدرداں تھا۔ مگر ان کی فلسفیانہ گفتگو کو میں ہمیشہ ہذیان سرائی سمجھا اور وہ مجھے اس کا قدردان نہ پاکر محض اپنی ادبیت، ظرافت اور محبت سے محظوظ فرمایا کرتے تھے۔ ایک مصرع غالب کا مجھے لکھا:

''دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز''

مطلب یہ تھا کہ دعا وغیرہ سب کچھ لغو ہے۔ جس کے پاس توپ گولہ نہیں وہ ضرور ہارے گا نہ دنیا کا کوئی خدا ہے نہ اس کا کوئی بندہ نہ وہ بندہ نواز۔ بندگی بیکار ہے۔ ان کی ''عقلیات'' صرف یہیں تک راستہ روشن کرتی تھی مگر 21 جون 1913 کو ایڈریانوپل پھر غازی انور پاشا

[1] ظریف محمد ایم اے (علیگ)، ان کی کتاب ''اسلام اور عقلیت'' دہریت والحاد سے لبریز تھی۔ بڑے توانا وتندرست تھے، عین عالم شباب میں دفعتہ انتقال ہوگیا۔ محمد علی سے پوچھا تھا کہ اس دینی جوش اور مذہبی تقشف کے ساتھ آپ سے اور ظریف سے دوستی کیوں کر نبھی؟ سنا ہے کہ ظریف غالباً 1915 میں موت سے پہلے تائب اور از سر نو مسلمان ہو چکے تھے۔

ادام اللہ فیضہ کے قبضہ میں آ گیا اور دائرہ حکومت اسلام میں از سرنو داخل ہوا۔ اور شبلی مرحوم کا شعر جو انصاری صاحب کے مشن کی واپسی والی نظم میں تھا، صادق آیا ؎

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے

کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھا ہے

اس کو عقلیات کہیے یا نقلیات، بہرحال شبلی مرحوم کا شعر، ظریف مرحوم کی ''ظرافت'' سے صحیح تر تو اسی وقت ثابت ہو چکا تھا۔ ''بحمد للہ اب خون شہیداں رنگ لایا ہے 1۔ والے قطعہ نے صحیح ترین ثابت کر دیا۔ میں مرحوم سے اوائل 1914 میں کلکتہ میں ملا۔ ہم دونوں تفریح کے لیے چندر نگر گئے تھے اور شب ماہ میں دریائے ہگلی کی سیر ساتھ ساتھ کی تھی۔ مسلم قومیت کا دریا بھی موجزن تھا۔ وہ تو یہی کہتے تھے اسلام اور ایمان نہیں ہے۔ مگر ایمان چھپائے سے نہیں چھپتا۔ قرآن کریم کے بے مثل ادب کے قائل تھے۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ . هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰىؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. کے ادب پر وجد کرتے تھے۔ اس کے چند ماہ بعد میں رامپور گیا اور نظر بند ہوا، وہاں نصیر حسین خان خیال 2 کا خط آیا کہ مرحوم تفریحاً ایام رخصت میں وزیگاپٹم گئے تھے، وہاں سے تار آیا ہے کہ ان کا یکایک انتقال ہو گیا۔ ان کے پسماندگان کو اطلاع دے دو کہ مال اسباب لے جائیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ مرحوم پر آج ہم سے کہیں زیادہ اسرار ہستی آشکارا ہو گئے ہوں گے۔ امید ہے کہ خاتمہ اسلام اور ایمان پر نہ کہ عقلیات پر ہوا ہو۔ دل سے مرحوم کے لیے دعا نکلتی ہے جس کے قبول ہونے کا انھیں اقبال بھی نہ تھا، آپ کو بفضلہ تعالیٰ خدا اور رسول کا انکار نہیں ہے۔ برائے

---

1 مصرعہ حضرت اکبر الہ آبادی کی ایک مشہور نظم کا ہے۔

2 اب یہ بھی مرحوم ہو چکے ہیں۔ پٹنہ کے ایک ادب نواز شیعہ رئیس تھے۔ ان ہی کی روایت ہے کہ ظریف آخری عمر میں تائب ہو گئے تھے۔ خدا کرے صحیح ہو۔ 3 مارگولیتھ کی ماں ایک شامی عورت تھی۔

خدااور رسول اپنی عقل وتمیز علم وتحقیقات کو اسلام اور صرف اسلام کے لیے وقف کر دیجیے۔ اور اس دانش حاضر کے حجابِ اکبر میں مستور و محجوب نہ رہئے۔

آپ نے مارگولیتھ کا ذکر فرمایا ہے۔ میں وہ بدنصیب ہوں کہ اس مردود وخبیث ولعین سے آکسفورڈ میں عربی پڑھی ہے۔ عربی اس کی مادری زبان ہے 3۔ قابلیت علمی بے شک بہت رکھتا تھا مگر دشمن اسلام اور سب سے زیادہ زہر آلود کتاب سیرت النبی پر اسی لئیم کی تصنیف کردہ ہے۔ مجھے خوف خدا ہے کہ ہمارے لٹریری نوجوان اس کے پھندے میں آکر نبی امی ﷺ (روحی فداک یارسول اللہ) کو عرب کا بطل اعظم نہ سمجھنے لگیں، اور رحمت للعالمین کے خدائی لقب سے محروم نہ کردیں۔ سر ولیم میور کی سیرت میں سید احمد خان مرحوم نے یہی سب سے بڑا عیب اور پوشیدہ مطلب ڈھونڈ نکالا تھا۔ اور خطبات احمد یہ اسی غرض سے لکھ کر بہ صرف کثیر انگریزی میں ترجمہ کرا کے طبع کرائی تھی 1۔

ہمدم سے میں قطعی خوش نہیں۔ نہ اس سے زیادہ کی اس سے توقع بھی تھی۔ اس جنگ کے خاتمہ پر ایک جنگ اور چھڑے گی اور وہ بھائی جالب سے میری ہوگی Cause abelly (بنائے مخاصمت) وہ دوچشمی ''ھ'' ہوگی جوان کے ''ہمدم'' کے پیچھے لگی ہے۔ خدا کی مار ہو ''ہمدرد'' کو اگر اس نے ''ہمدم'' کے قالب میں جنم لیا ہے۔ اور خدا سمجھے میرا اکبر حسین ابن الوقت معروف بہ ''لسان العصر'' سے جنھوں نے ''ہمدرد'' کی سرخی وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيْعاً کو ''ہمدم'' کے لیے یوں بدلا ہے۔ میری غزلوں کی تعریف وہ فرمائیں یا آپ یا آپ کے احباب، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ادب میں داخل نہیں ہیں، محض میرے درد کی آواز ہیں۔ ''دیکھیے کب تک رہے'' والی زمین شگفتہ کیوں کر ہوسکتی ہے۔ گو چشم انتظار وا ہونے سے شگفتہ چیزوں میں شمار ہو سکے تو اور بات ہے۔ حال میں چند اشعار لکھے ہیں اور لکھ کر غزل پوری کروں گا۔ غالب کا ایک شعر مانع اظہار وحشت ہو رہا ہے اور ورد زبان ہے۔ اس کی ردیف کو محدود کر کے غزل لکھ رہا ہوں۔ وہ شعر یہ ہے:

چاک مت کر جیب بے ایام گل　　　　کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

1۔ مارگولیتھ کے مقابلہ میں میور ہزار درجہ غنیمت ہے۔ مارگولیتھ کی زہر افشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔

اسی پر چند اشعار لکھے ہیں۔

صبر پہلی شرط غم خواری کی ہے ضبط کا یاروں میں یارا چاہیے

تھک کے کہتا ہوں جنوں کیسا حجاب خاک اڑنا آشکارا چاہیے

دشمنوں سے گر ''تلطف'' ہے تو کچھ دوستوں سے بھی مداوا چاہیے

(حافظ تو تلطف کی صلاح دیتے تھے۔ مگر آج کل ایں ہم غنیمت است)

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے ایک فقط تیرا سہارا چاہیے

نہ معلوم کیوں ان ایام حج بیت اللہ میں بار بار یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

تم تو کعبہ کے خدا تھے پھر نکالے کیوں گئے اے بتو! کیسے خدائی ہوتے ہوتے رہ گئے

اس پر ایک شعر خود بھی لکھ دیا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ بے اختیار زبان پر آ گیا

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دیکھیے یہ دونوں غزلیں کب پوری ہوں۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ امید ہے کہ میری مذہبی ''نقادی'' بار خاطر نہ ثابت ہوگی۔

خوب یاد آیا المعارف [1] میرے پاس نہیں آتا۔ شکر خدا کہ بھائی ظفر الملک نے الناظر تو بھیجنا شروع کر دیا۔ ہاشمی [2] جوہر و حسرت کی لے میں کچھ لکھ گئے مگر سنا ہے کہ جوہر پر پہلے بھی کچھ لکھا تھا، دیکھنے کا خواہشمند ہوں۔ میں تو پہلے ہی سے اس کا قائل ہوں کہ:

تم ہو تو نذر عشق نہ لکھیں وہ مرثیہ

یہ بات ہے مروتِ اہل سخن سے دور

آپ کا خیر طلب

محمد علی

......☆☆☆......

---

[1] مراد معارف (اعظم گڑھ) ''المعارف'' ایک اور رسالہ تھا، جو مدتوں تک علی گڑھ سے نکلا تھا، اور اسے مدت ہوئی بند ہو چکا تھا۔

[2] سید ہاشمی فرید آبادی

باب:10

1916-19

(اسٹیشن کا ایک پر اثر سفر، راس مسعود، مولانا سید سلیمان ندوی)

محمد علی کے ایک رفیق خاص الخاص راجہ غلام حسین پنجابی[1] تھے۔ علی گڑھ کے نامور اولڈ بوائے۔ انگریزی لکھنے میں محمد علی کے شاگرد رشید۔ کامریڈ میں مدتوں سب ایڈیٹر رہے۔ جب کامریڈ اپنے ایڈیٹر کی نظر بندی پر بند ہو گیا، تو یہ لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں اس وقت ایک انگریزی روزنامہ انڈین ڈیلی ٹیلی گراف نکلتا تھا۔ اس میں منسلک ہو گئے۔ پھر کچھ روز بعد غالباً راجہ صاحب محمود آباد کی مالی امداد سے آخر 1916 یا شروع 17 سے اپنا ایک مستقل انگریزی ہفتہ وار نیو ایرا (New Eara) کے نام سے نکالا اور اس کی بھی خوب دھوم دھام رہی۔ محمد علی خود تو چھندواڑہ میں تھے اور ان کے یہ نائب اول لکھنؤ میں۔ ان کے گرد "محمد یوں" کا ایک پورا حلقہ قائم۔ چودھری خلیق الزماں، شعیب قریشی، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر ایٹ لا، ڈاکٹر نعیم انصاری، عبدالولی لکھنوی اور بارہ بنکی کے شیخ ولایت علی "بمبوق"، عبدالعزیز انصاری وغیرہم، ایک ایک فرد جوش ملی سے لبریز۔ اور ان سب کے علاوہ فرنگی محل........ایسا مجمع اب کبھی کیوں دیکھنے میں آنے لگا! ......نیو ایرا ایک خاصی حد تک کامریڈ کا قائم مقام ہو چلا تھا۔ پرچہ ابھی چند ہی مہینہ نکلا تھا کہ

---

1 راجہ، پنجابی مسلمانوں کے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ یہ مراد نہیں کہ وہ کوئی رئیس یا نواب تھے۔

غلام حسین بیچارہ کا بلاوا عالم بالا سے آ گیا۔ اچھے خاصے ہٹے کٹے جوان، سر شام سڑک پر ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے نے پیچھے سے آ کر زور سے ٹکر دی، اور یہ غریب ہسپتال میں پہنچ کر راہی ملک بقا ہو گئے۔ محمد علی ظاہر ہے کہ اس ساری مدت میں سینکڑوں میل دور نظر بند تھے، لیکن ان کے ذکر خیر سے لکھنؤ کی یہ محفلیں ہر وقت گرم رہتیں، اور اٹھتے بیٹھتے خدا معلوم کتنے موقعوں اور کتنے مختلف طریقوں سے ان کا نام زبانوں پر آتا رہتا۔ بلکہ نیوایرا نے سنسر کی آنکھ بچا کر واللہ اعلم کیوں کر ان کے ایک آدھ مضمون بھی حاصل کر لیے اور انھیں گمنام چھاپ بھی دیا تھا۔

شروع ستمبر میں میرا جانا حیدرآباد (دکن) ہوا۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی، اور کلاسوں کے کھلنے سے ایک سال قبل ایک مستقل ''سررشتۂ تالیف وترجمہ'' درسی کتابوں کی تیاری کے لیے قائم ہو گیا تھا، اور میں اسی کے شعبۂ فلسفہ کے لیے ناظم تعلیمات سید راس مسعود صاحب (جو بعد کو نواب مسعود یار جنگ ہوئے) اور ناظم سررشتہ مولوی (ڈاکٹر) عبدالحق صاحب کی تحریک پر طلب ہوا تھا۔ سال بھر وہاں رہنا ہوا۔ محمد علی سے مراسلت یہاں سے بھی کبھی کبھار رہی۔ جواب میں کم از کم دو خط تو ادھر سے بھی آنے یاد ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ دونوں محفوظ نہ رہے۔ ایک خط کا صرف اتنا ٹکڑا یاد ہے کہ میں نے راس مسعود صاحب کی کچھ شکایتیں لکھ کر بھیجی تھیں۔ سابقہ رہنے کے بعد اچھے اچھے دوستوں کے بھی آپس میں رنجش پڑ جانے کے واقعات دنیا میں انوکھے نہیں .... میرے خیال کی ادھر سے تائید ہو کر آئی۔ محمد علی کو پرانی شکایتیں، صحیح یا غلط، صاحبزادہ آفتاب احمد خان سے ان کے استبداد اور خشک ضابطہ پرستی کی تھیں۔ وہی شکایتیں اب انھیں ان کے داماد (راس مسعود صاحب) سے بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کا فقرہ غالباً یہ تھا:

''راس مسعود صاحب اس وقت وہاں سرسید کے پوتے بن کر ان کی گدی پر نہیں، بلکہ داماد مسعود پاشا کی حیثیت سے اپنے خسر کی کرسی پر بیٹھے ہیں''

18 کی آخری سہ ماہی میں واپس آ گیا اور اب پھر قیام لکھنؤ میں رہنے لگا۔ شروع 1919 کا زمانہ تھا، غالباً جنوری کی کوئی تاریخ کہ نظر بند علی برادران کو کسی اہم خانگی ضرورت کی بنا پر چند روز کے لیے چھندواڑہ سے وطن یعنی رامپور جانے کی اجازت ملی۔ پولیس کی چوکی پہرہ میں۔ نظر بندی کا سلسلہ ابھی ختم کہاں ہوا تھا، چل ہی رہا تھا۔ راستہ وہی لکھنؤ ہو کر تھا۔ سہ پہر کا وقت۔

پنجاب میل لکھنؤ اسٹیشن پر 20، 25 منٹ ٹھہرتی تھی۔ آج دونوں بھائیوں کے پیر و مرشد اور وقت کے مشہور عالم اور لیڈر مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی اسٹیشن پر موجود تھے۔ گاڑی رکی، اور معاً دونوں بھائی مولانا کی طرف قدم بوسی کے لیے لپکے۔ ادھر سے خود مولانا بھی اسی تیزی کے ساتھ ان دونوں کو قدم لینے کو بڑھے۔ اور منظر عام پر ایک خاصی کشمکش باہم شروع ہوگئی۔ ان کو ان قدموں پر جھکنے پر اصرار، اُن کو اِن کے! ضابطہ سے ظاہر ہے کہ مولانا مرشد تھے، اور علی برادران مرید۔ لیکن اس باہمی برتاؤ کو دیکھ، دیکھنے والے اس حیص بیص میں پڑ گئے کہ مرشد کسے ٹھہرائیں اور مرید کس کو قرار دیں!...... شمس تبریزیؒ اور مولانائے رومیؒ کے باہمی عشق و محبت کے قصے بھی تو کچھ اسی طرح مشہور ہیں!

محمد علی حسب عادت حاضرین میں بڑے چھوٹے ایک ایک سے ملے۔ آج کے زائرین میں ایک بڑی تعداد دارالعلوم ندوہ کے طلبہ کی تھی۔ محمد علی نے فرمائش کی کہ آپ لوگوں میں سے کوئی خوش لحن ضرور ہوگا۔ سورہ یوسف کا پندرھواں رکوع ذرا سنایئے۔ محمد علی کو قرآن مجید کی بعض اور آیتوں کی طرح ان دو آیتوں سے بھی عشق خصوصی تھا:

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ. مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِهٖ إِلَّا أَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَا أَنْتُمْ وَآبَائُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ.

اے جیل کے دونوں رفیقو! یہ بتاؤ الگ الگ معبود اچھے یا اکیلا اللہ سب پر غالب؟ (کیسے غضب کی بات ہے) تم اسے چھوڑ کر صرف ناموں کی پوجا کرتے ہو جنھیں تم نے اور تمھارے بڑوں نے گڑھ رکھا ہے، اللہ نے تو کوئی دلیل ان کی اتاری نہیں حکومت تو بجز اللہ کے اور کسی کی نہیں، حکم ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے، پر (افسوس ہے کہ) اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں۔

....

محمد علی کے لیے یہ کلام قال نہیں رہا تھا، حال بن چکا تھا۔ اسے سن کر وجد میں آجاتے، روتے، ہاتھ پیر پٹختے۔ فرمائش کی تعمیل ہوئی۔ پنجاب کلکتہ میل کی سی اہم گاڑی، اور لکھنؤ اسٹیشن کا پہلے نمبر کا پلیٹ فارم نمبر ایک۔ مسافروں کی بھیڑ اور پھر مشتاقانِ دید کا بھی خاصہ ہجوم۔ سب ارد گرد

حلقہ باندھے کھڑے، اور درمیان میں محمد علی، کلام پاک کے بول خوش الحان قاری کے منہ سے نکل رہے ہیں اور محمد علی کی آنکھوں سے آنسو جاری۔ اتنی دیر پلیٹ فارم پر نہ غل غپاڑہ، نہ شور ہنگامہ، سب کے سب خاموشی کے ساتھ صورتِ تصویر۔ زمانہ یاد کر لیجیے کہ 1919 کا تھا۔ سردی کا موسم، فرسٹ اور سیکنڈ کے مسافر کثرت سے انگریز۔ یہ سب اور انگریز حکام دونوں دور کھڑے یہ منظر حیرت سے دیکھ رہے ہیں! ریل چھوٹنے پر ہوئی، گھنٹی بجی، اور قرأت موقوف...... محمد علی کوئی بہتر سے بہتر تقریر کر ڈالتے، جب بھی شاید یہ سماں اتنا موثر نہ بندھ سکتا!

گاڑی چلی، اور میں سندیلہ اسٹیشن تک کے لیے ساتھ ہولیا۔ یہی پہلے سے کہہ بھی رکھا تھا۔ شوکت علی غریب نے دو ایک بار اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا، میری اس وقت کی خود بینی ان بیچارہ کو کب خاطر میں لاتی تھی۔ اب جب خیال آجاتا ہے تو اپنے اوپر نفریں کرنے لگتا ہوں۔ بہرحال بحث و مباحثہ جو کچھ بھی رہا، محمد علی ہی سے رہا۔ میں نے اپنے کسی خط میں یہ گستاخانہ اور گندہ فقرہ بھی لکھ دیا تھا...... آگے بڑھنے اور فقرہ پڑھنے سے پہلے پھر ایک دفعہ اس حقیقت کو متحضر کر لیجیے کہ اس فقرہ کا لکھنے والا وہ نام نہاد ''مولانا'' نہیں جو 55،56 سال کی عمر میں یہ ڈائری مرتب کر رہا ہے بلکہ 26، 27 سال کی عمر کا ایک ''عقلیت پرست'' (نیشنلسٹ) ملحد تھا...... کہ ''سنا ہے آپ اس فرصتِ نظر بندی میں قرآن رٹ رہے ہیں، لیکن قوم میں بہت سے حافظ نبی بخش اور حافظ غلام رسول پہلے ہی سے موجود ہیں۔ ضرورت تو اس وقت کامریڈ کے ایڈیٹر کی ہے''۔ بس اس فقرہ پر لے دے شروع ہوئی، اور گفتگو کا آغاز اس طرح فرمایا کہ ''کیوں صاحب، اب حافظ نبی بخش بیچارہ حقارت کے لیے ضرب المثل ہو گئے ہیں''۔ اور پھر خط میں لکھا ہوا تو شاید ایک ہی آدھ جواب آتا، زبانی تقریر مسلسل جوابات ہی کی نذر رہی...... کامریڈ کا ایڈیٹر، اور شیکسپیئر کے ڈراموں کا ناقد و شارح، اور اولڈ بوائز کے جلسہ میں رقص کرنے والا، اب دین کا مبلغ داعی بن چکا تھا، اسے دھن تھی، تو اسی کی۔ اور ریلوے کمپارٹمنٹ اور مسجد کا منبر دونوں اب اس کی نظر میں ایک تھے۔

دارالمصنفین (اعظم گڑھ) سے میری وابستگی اور نیازمندی ان کے علم میں تھی۔ معارف اور اہل معارف کا ذکر خیر رہا۔ مولانا سید سلیمانؒ ندوی سے متعلق ایک فقرہ اب بھی کان میں گونج رہا ہے ''اب کے باہر نکلنے پر سید سلیمانؒ سے کام لینا ہے''۔ ''کام'' سے مراد وہی دعوت و تبلیغ تھی۔

باب:11

1919-20

(رہائی، لیڈری، خلافت و ترک موالات)

رامپور سے واپسی چند روز بعد ہوئی۔ لکھنؤ اسٹیشن پر اب کے بھی میں نے حاضری دی۔ اور اب کے بھی اسٹیشن کی حاضری کو ناکافی سمجھ، پنجاب میل کے رکنے والے پہلے اسٹیشن رائے بریلی تک ساتھ گیا۔ درجہ اتفاق سے خالی تھا، اور رائے بریلی تک وقت بھی اچھا خاصہ لگتا ہے۔ باتوں کا موقع خوب مل گیا۔ ٹائمس (لندن) کے لٹریری سپلیمنٹ کا تازہ پرچہ میرے ہاتھ میں تھا۔ محمد علی اس میدان کے مرد تھے ہی، لیکن دو چار منٹ بعد ہی علمی وادبی موضوع چھوڑ، اپنے اسی محبوب موضوع، دعوت وتبلیغ پر آ گئے۔ آواز پڑی ہوئی، گلا بیٹھا ہوا تھا۔ خدا معلوم میری طرح اور کتنے بکواس کرنے والے انھیں پہلے مل چکے تھے۔ آواز کھولنے والی ڈاکٹری گولیاں ساتھ تھیں۔ ان کے سہارے مجھ ملحد کو قائل معقول کرنے پر آمادہ ہو گئے...... اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ہر ہر فرد کو تبلیغ کرنا اب اپنا فرض سمجھ لیا تھا...... اور اپنی آواز گاڑی کی شدید گھڑگھڑاہٹ پر غالب رکھی!

خبر اس زمانہ میں گرم تھی کہ نظر بندی سے رہائی عنقریب ملنے والی ہے۔ اس کا حوالہ دے کر میں نے عرض کیا ''آپ کے باہر آنے پر کامریڈ اور ہمدرد تو یقیناً نکلیں گے۔ اور جلد سے جلد

نکلیں گے۔تقریباً کب تک؟ بولے کہ ”نہیں، اخبارات کا خیال تو فوراً نہیں۔ باہر آ کر تو سب سے پہلے دورہ کرنا ہے۔اور بجائے قلم کے زبان سے تبلیغ کرنا ہے، ہندوستان کے طول وعرض میں بھی اور یورپ جا کر بھی“.........دنیا کے ہوش وفرزانگی پر اب دین کی مستی اور دیوانگی غالب آ چکی تھی!

اسٹیشن قریب آنے لگا، تو موضوع شعر وسخن کا چھڑا۔اور گاڑی جب پلیٹ فارم آ کر رکی، تو اپنی تازہ نظم شہدائے کلکتہ پر سنائی۔ 1918 میں ایک انگریزی اخبار کے جرم توہینِ رسول ﷺ سے مشتعل ہو کر مسلمانوں نے بلوہ کر دیا تھا۔اور بہت سے مسلمان پولیس کی گولیوں سے شہید ہو گئے تھے۔کامریڈ ابتداً کلکتہ ہی سے نکلا تھا۔اور محمد علی کو بعض دوسرے مقامات کی طرح کلکتہ سے بھی خاص انس تھا۔تین شعر اس شہادت نامہ کے ملاحظہ ہوں۔

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شانِ کلکتہ — روحِ رسول آج ہے مہمانِ کلکتہ
ہر سو ہیں لاشہ ہائے شہیدانِ سرخ پوش — ہے آج کل بہار پہ ایمانِ کلکتہ
ہے امتحاں منافق ومومن کا دوستو! — میزان حشر بن گئی میزانِ کلکتہ

....

رہائی اس وقت تو نہ ہوئی۔ بلکہ چھندواڑہ کی نظر بندی کے بعد کچھ دن بیتول جیل کے اندر بھی کاٹنے پڑے۔ دسمبر 19 ختم ہو رہا تھا، جب رہائی کا حکم ملا۔ عین اس وقت انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس دور دراز شہر امرتسر میں ہو رہا تھا۔دونوں بھائی بجائے وطن جانے کے اور کچھ دن بیوی بچوں میں گزارنے کے، سی پی سے ہزار بارہ سو میل شوق کے پروں سے اڑ کر (ہوائی جہاز اس وقت تک کہاں نکلے تھے) امرتسر پہنچے۔اور ان بھائیوں کی شرکت گویا ساری مسلم قوم کی شرکت تھی.........مسلمان بحیثیت قوم اب تک کانگریس سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ بلکہ چند سال ادھر تو اسے ہوّا سمجھ اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ایڈیٹر مجیب الرحمٰن اور بیرسٹر عبدالرسول، اور پٹنہ میں بیرسٹر مظہر الحق اور بمبئی کے بیرسٹر جناح جیسے دس بیس سو پچاس نیشنلسٹ قسم کے مسلمان اگر جٹ کر کے شریک ہوئے بھی تو کیا۔شرکت ان ہی خال خال افراد تک محدود رہی۔عام مسلمانوں کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی۔

کانگریس کی تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ جب چہرہ پر داڑھیاں رکھائے ہوئے، ٹوپیوں پر

نشانِ ہلال لگائے ہوئے، اور زبان سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہوئے ان دونوں بھائیوں نے کانگریس کے پنڈال میں قدم رکھا تو ساتھ میں ایک لاؤ لشکر بھی تھا اور.........''علی'' برادران کا نام ذہن میں رہے.........''یا علی'' کے نعروں سے ملک کا ملک گونج اٹھا!

امرتسر سے واپسی میں لکھنؤ بھی اپنے پیرومرشد سے ملنے آئے۔ سلسلۂ بیعت میں اپنے اسی نظر بندی کے زمانہ میں داخل ہوگئے تھے، یا کر لیے گئے تھے۔ لکھنؤ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم ومغفور کی ذات بھی عجب جامع صفات تھی۔ فیاض، سیر چشمی، مہمان نوازی، خلق ومروت میں اپنی نظیر آپ۔ دستر خوان کی وسعت، دوست ودشمن وموافق ومخالف کی تفریق سے نا آشنا۔ محمد علی ہی کی طرح مولانا بھی ان چند لوگوں میں تھے جو دوسرے کو کھلا کر خوش ہوتے اور بجائے اس پر احسان رکھنے کے الٹے اس کے شکر گزار ہوتے۔ فرنگی محل میں ان کی وسیع حویلی محل سرا کے نام سے مشہور تھی۔ مرحوم کی زندگی میں اس کا نام بجائے محل سرا کے مہمان سرا ہوتا تو زیادہ صحیح رہتا! بہر حال علی برادران کا استقبال شہر میں خوب دھوم دھوم سے ہوا۔ اس تزک واحتشام کے ساتھ ان کا داخلہ لکھنؤ میں پہلی بار ہوا۔ جلوس اسٹیشن سے شہر کا گشت کرتا کرتا کہیں سہ پہر کو فرنگی محل پہنچا۔ جلسہ محل سرا میں منعقد ہوا۔ چائے، ناشتہ، ایڈریس، تقریریں، جلسہ کے سارے لازمے موجود۔ خلقت کا ہجوم بھیڑ یا دھسان۔ جلسہ کی حیثیت بالکل خانگی تھی۔ صرف مخصوصین مدعو تھے۔ لیکن عقیدت مندی کے سیلاب کو کون روکتا؟ خلقت ٹوٹی پڑتی تھی۔ عوام اپنے کو آخر خواص سے پیچھے کیوں رکھنے لگے تھے۔

....

وسیع صحن کا گوشہ گوشہ ہجوم سے پٹ گیا۔ دبکا دبکایا میں بھی ایک صف میں کرسی نشین تھا۔ اور دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ محمد علی کی نظر نہ پڑے تو اچھا ہے اس مجمع عام میں سب کے سامنے ملتے ہوئے جھیپ رہا تھا، یہ کہاں ممکن ہوا؟ ایڈریس ابھی پڑھا ہی جا رہا تھا کہ نظر سے نظر مل گئی، اور وہاں اب تاب کب تھی۔ نہ مجمع کا لحاظ نہ اپنے مرتبہ کا پاس، جھٹ وسط جلسہ سے صدارت کی کرسی چھوڑ ادھر بڑھے۔ میں لپک کر فوراً پہنچ گیا۔ کرسی سے اٹھ ہی چکے تھے۔ بھینچ بھینچ کر گلے لگایا، اور ترکی اظہارِ التفات وگرمجوشی کے طریقہ پر پیشانی اور کنپٹی کے بوسے لینے بھی شروع کر دیے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ محمد علی میں تصنع وتکلف کہیں چھو نہیں گیا تھا۔ خودداری یا اپنے کو لیے دیے رہنے کا جو مفہوم عرف عام میں لیا جاتا ہے، اس کے تو وہ قریب بھی ہو کر نہیں گزرے تھے۔ قبول خلائق اور مرجعیت کے اس بلند مرتبہ پر پہنچ کر بھی اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ نیاز مند سے، خلوت ہو یا جلوت، اسی بے تکلفی کے ساتھ ملتے اور خود ہی بڑھ کر ملتے۔

لکھنؤ کا غالباً یہی سفر تھا، جب دونوں بھائیوں کو ''مولانا'' کی باقاعدہ آزیری ڈگری فرنگی محل (یا اس کے مدرسۂ نظامیہ) سے عطا ہوئی۔ اور جہاں تک محمد علی کا تعلق ہے، انھوں نے تو اس لقب کی لاج رکھ لی۔ اور دینی مطالعہ کر کے خاصی حد تک ''مولانا'' اپنے کو بنا ہی لیا۔ باقی ان کی تقلید میں ہر کس و ناکس قومی کارکن کو ''مولانا'' کہنے کی جو بدعت سیۂ چل گئی، اس کی سند جواز کسی درجہ میں نہ اس وقت موجود تھی، نہ آج ہے۔

وفد خلافت جس کے رئیس وفد محمد علی تھے، یورپ کے لیے فروری 20 میں غالباً لکھنؤ ہی سے روانہ ہوا تھا۔ ارکان وفد میں ایک مولانا سید سلیمان ندویؒ تھے، اور ایک مسٹر سید حسین (جو اس وقت بمبئی کرانیکل میں تھے، اور اس وقت 1948 میں ڈاکٹر سید حسین کے نام سے مصر میں سفیر ہند ہیں 1) وفد کے سکریٹری علی گڑھ کے نامور اولڈ بوائے، حسن محمد حیات قرار پائے۔ جو کسی زمانہ میں پنجابی تھے، اور اب تو ایک عمر سے بھوپالی ہیں 2۔

......☆☆☆......

---

1 اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (1951)

2 اب غالباً پاکستانی (1951)

باب:12

1920

(لیڈری۔گاندھی جی)

اکتوبر 1920 کا آغاز تھا کہ وفد خلافت یورپ سے واپس آ گیا۔اور اب گاندھی جی اور شوکت علی کی معیت میں مولانا محمد علی.....اس وقت سے مولانا گویا ان کے نام کا جزو بنتا ہے......کا طوفانی دورہ ملک بھر کا شروع ہوا۔اب وہ''مولانا'' خاص وعام سب کی زبان پر تھے۔تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کا یہ عہد شباب تھا۔اور ملک کا چپہ چپہ''مہاتما گاندھی کی جے'' کے ساتھ ساتھ''محمد علی شوکت علی کی جے'' سے گونج رہا تھا۔''اللہ اکبر'' کے نعرے ہندوؤں تک کی زبانوں پر چڑھے ہوئے۔یہ فضا تھی کہ ایک روز گاندھی جی علی برادران کو ساتھ لیے ہوئے،صبح کے وقت دن نکلتے ہوئے لکھنؤ اسٹیشن پر وارد ہو گئے۔آج کے ہجوم کا کیا پوچھنا! آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا تھا۔اسٹیشن کے اندر بھی اور باہر بھی انسان کا ایک جنگل!.......گاندھی جی نے صاف کہہ دیا کہ ''جب تک یہ ریلا ایک باقاعدہ مجمع کی شکل نہ اختیار کر لے گا،اور راستہ نہ بنا لے گا، میں گاڑی سے نہ اتروں گا''۔

دیکھنے کے قابل اب یہ منظر تھا۔مولانا،خلقت کی نظر میں بحیثیت لیڈر کے اب اگر گاندھی جی کے ہم پلہ نہیں،تو ان سے بس کچھ کم ہی تھے۔فرق وہی 18 و 20،کا۔لیکن یقین کیجیے کہ اس

وقت راستہ صاف کرنے کے لیے جو اترا وہ کوئی اور نہیں، مولانا ہی تھے! وہ چاروں طرف چیخ چیخ کر اور دوڑ دوڑ کر اس طرح کام کر رہے تھے۔ کہ جیسے وہ کامریڈ کے ایڈیٹر اور برابر کے لیڈر نہیں، بلکہ کوئی معمولی والنٹیر یا رضا کار ہیں! ایک کا ہاتھ پکڑا، دوسرے کو گھسیٹا، اس کو ڈانٹا، اس کو چمکارا، کام دومنٹ کا نہ تھا۔ وقت بیس پچیس منٹ سے کیا کم لگا ہوگا۔ مجمع سا مجمع تھا! مولانا کے چہرہ بشرہ کسی چیز سے بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ یہ بھی اپنے کو کسی درجہ کا لیڈر یا مخدوم سمجھتے ہیں۔ بس محض ایک خادمانہ حیثیت! اور پھر پلیٹ فارم سے باہر جب نکل کر آئے تو دوسرا منظر اس پہلے سے بھی کچھ بڑھ چڑھ کر۔ جوڑی گاڑی جو لینے آئی تھی، اس کے لیے مولانا کا اصرار کہ میں اندر گاندھی جی کے برابر نہیں، بلکہ باہر کوچوان کے پاس کوچ بکس ہی پر بیٹھوں گا! میں نے تو اپنے تجربہ میں کسی ایک لیڈر کو بھی اپنی شخصیت دوسرے لیڈر میں اس طرح فنا کرتے ہوئے نہیں دیکھا، نہ اس کے قبل نہ اس کے بعد۔ اور مسلمان لیڈروں میں تو کیا، ہندو لیڈروں میں بھی نہیں۔ آپ کے مشاہدہ میں کوئی ایسی مثال آئی ہو تو آپ ہی فرمائیں۔

....

مولانا اب خالی ایک ایڈیٹر یا انشا پرداز نہ تھے۔ گاندھی جی کے تقریباً ہم پلہ و ہم دوش۔ گورنر یو۔ پی سر جیمس مسٹن کی دوستی، اور گورنمنٹ آف انڈیا کے فنانس ممبر، سر گے فلیٹ وڈ ولین کی یاری ختم ہوئے مدتیں ہو چکی تھیں۔ اب وہ شدید دشمن حکومت کے تھے، اور حکومت شدید دشمن ان کی۔ خلقت ان کے اوپر پروانہ وار گر رہی تھی اور دن رات میں مشکل سے کوئی وقت ایسا نکلتا جسے وہ اپنا کہہ سکتے۔ عوام و خواص سب ہی کی باگ ان کے ہاتھ میں تھیں۔ عوام دل سے فریفتہ اور خواص مصلحتِ وقت کے تقاضہ سے گرویدہ۔ راجہ صاحب محمود آباد (جو اب شاید مہاراجہ ہو چکے تھے) بھی بڑے ذی حوصلہ، سیر چشم، فیاض اور مہمان نواز رئیس تھے۔ لیکن بہر حال رئیس تھے، راجہ تھے، یا انگریزی اصطلاح میں ''ارسٹاکریٹ'' تھے ایسے عوامی لیڈر کے لیے جگہ ان کے ہاں نکلنی ذرا دشوار رہی تھی۔ محمود آباد ہاؤس کی شاہانہ مدارات اور ضیافتوں سے لطف اٹھانے کے لیے ہز ہائنس سر آغا خان، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لعل نہرو اور مسٹر جناح کیا کم تھے۔ گاندھی اور علی برادارن کے لیے وہی فرنگی محل کی محل سرا کافی ہوئی۔

محل سرا خاصی وسیع تھی۔ محل سرا کے مالک کا قلب اس سے بھی وسیع تر۔ مولانا عبدالباری مرحوم کے ہاں ''فقیری'' میں بھی ایک شاہی شان۔ صبح سے شام اور شام سے آدھی رات ایک میلہ سا لگا ہوا۔ گاندھی جی کے لیے تو پھر بھی تنہائی کا اہتمام، حاجب ودربان کا انتظام، لیکن علی برادران کا سارا وقت وقف عام۔ جب دیکھیے لوگوں سے گھرے ہوئے۔ ابھی اس سے بحث ومباحثہ، ابھی اس سے قیل وقال۔ خدا معلوم غسل وطہارت، آرام واستراحت کے لیے وقت کون سا اور کب نکال پاتے تھے!

....

یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے گاندھی جی سے شخصی نیاز، گو بہت ہی سرسری، حاصل ہوا۔ اس وقت کلکتہ کے مقتدر رسالہ ماڈرن ریویو میں انگریزی مضامین لکھتا رہتا تھا۔ عین اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون ''ستیا گرہ اور اسلام'' کے عنوان سے نکلا تھا...... یاد رکھیے کہ اس وقت گاندھی جی کے چلائے ہوئے الفاظ ''ستیا گرہ'' اور ''شانتی'' نئے ہونے کے باوجود بچہ بچہ کی زبان پر تھے...... آیات قرآنی کی مدد سے مقابلہ میں دکھایا یہ گیا تھا کہ ''ستیا گرہ'' کی تعلیم اسلام کے لیے کوئی نئی اور انوکھی تعلیم نہیں۔ یہ تو صاف قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ زمانہ پھر یاد کیجیے اب اکتوبر 20 کا تھا۔ اب میں نہ ملحد رہا تھا، نہ معاند اسلام۔ مادیت سے تمام تر روحانیت کی طرف منتقل ہو آیا تھا (اور اس انتقال فکر میں خود گاندھی جی کی تعلیمات کا بھی ایک حد تک دخل تھا) اور پختہ مسلمان اگر نہیں تو نیم مسلمان سے زائد تو اس وقت تک ضرور ہو چکا تھا۔ اور قرآن مجید کو اگر لفظاً وحرفاً نہیں تو کم از کم معناً ومفہوماً تو کلام الٰہی بہرحال ماننے لگا تھا۔

غالب نے ''تقریب بہر ملاقات'' کے لیے ''مصوری'' سیکھنی شروع کی تھی [1]۔ یہاں تقریب کے لیے اس تازہ مضمون کو کام میں لایا گیا۔ لیڈروں کی پارٹی دوسرے دن سہ پہر کو پنجاب میل سے شاہجہاں پور، بریلی کی طرف روانہ ہوئی۔ حسب معمول میں اسٹیشن آیا۔ اور سندیلہ تک ہم سفر ہولیا۔ اتفاق سے مولانا ابوالکلام بھی اسی ٹرین میں کلکتہ سے چلے آرہے تھے۔ اور گاندھی جی اور مولانا محمد علی کو جگہ ان ہی کے سیکنڈ کلاس میں ملی۔ (شوکت صاحب کہیں دور بیٹھے۔

---

1 سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری   تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔

شاید کہ حکیم اجمل خان مرحوم بھی اسی ٹرین میں کہیں اور تھے، اور شوکت صاحب وہیں گئے)۔ گاندھی جی تھک کر چور ہو چکے تھے، اور گاڑی چلتے ہی ناوقت ہونے کے باوجود ایک برتھ پر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ بیچ کے برتھ پر گاڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے مولانا ابوالکلام، وسط میں مولانا محمد علی اور کنارہ پر یہ خاکسار۔ ماڈرن ریویو کا پرچہ ہاتھ میں۔

....

اصل مقصود تو اسے گاندھی جی کی خدمت میں پیش کرنا اور ان سے اس مضمون کی داد لینا تھا۔ سو یہ غرض تو پوری طرح حاصل نہ ہوئی، گاندھی جی خود ہی نیند کے ماتے ہوئے تھے البتہ وہ پرچہ مولانا نے ہاتھ میں لے لیا۔ اور مضمون کی چند ہی سطر پڑھ، اس کے اصل منشا یعنی قرآنی عقیدۂ صبر اور گاندھوی عقیدۂ ستیا گرہ کے اتحاد کو پا کر، پرچہ تو بند کر دیا، اور اس کے اصل موضوع پر بحث شروع فرما دی......مولانا اپنی ذات و شخصیت کو گاندھی جی میں فنا کیے ہوئے تھے لیکن عین اس خوش عقیدگی اور بقول مخالفین کے ''گاندھی پرستی'' کے زمانہ میں بھی اپنے عقائد اسلامی پر بالکل پختہ اور گاندھوی فلسفہ سے غیر متاثر تھے۔ ان سے کہیں زیادہ متاثر گاندھویت سے تو میں خود تھا! گاندھی جی کو اصلاً ایک معلم اخلاق و پیکر روحانیت سمجھ رہا تھا اور وہ صرف ایک بلند پایہ سیاسی لیڈر!

بہر حال میں یہ عرض کرتا رہا کہ قرآن کا اصلی وعدہ اپنے پیرووں سے روحانی حکومت یا مسیحیوں کی اصطلاح میں، آسمانی بادشاہت کا ہے۔ اور وہ فرما رہے تھے کہ نہیں، اسلام اس مادی دنیا میں بھی پوری طرح حکمران اور غالب رہنا چاہتا ہے۔ مولانا ابوالکلام بھی پوری طرح ان ہی کے ہمنوا تھے۔ اور میرے اوپر گولہ باری اس دہرے مورچہ سے ہو رہی تھی......میں نے ایک بار عرض کیا کہ اچھا یہ بتایئے کہ ایک طرف ملک روم کی سلطنت ہو اور دوسری طرف مولانائے روم کی شخصیت اور آپ کو حق انتخاب حاصل ہو تو آپ انتخاب کس کا کریں گے؟ میں تو سلطنت پر لات مار دوں گا، اور مولانا کو لے لوں گا۔ مولانا ابوالکلام نے فرمایا ''ہرگز نہیں، ہم ملک و سلطنت کو لیں گے''۔ مولانا محمد علی نے معاً، ایک منٹ کا انتظار کیے بغیر فرمایا ''بے شک۔ اور یہ اس لیے کہ جب سلطنت اسلامی ہو گئی، تو وہ خود ہی مولانا کی سی شخصیتیں پیدا کرتی رہے گی''......ابوالکلام اور محمد علی کے درمیان اس وقت بھی نقطۂ نظر کا جو فرق تھا، اس کی پوری جھلک ان جوابوں میں نظر آ رہی ہے۔

محمد علی کے ہاں مادی غلبہ، روحانی غلبہ سے الگ اور کوئی مستقل وجود رکھتا ہی نہ تھا، اس کا ضمیمہ اور لازمی نتیجہ تھا۔

میں اپنی بات پر اڑا رہا، اور یہی کہے گیا کہ "آپ نے ترتیب الٹ دی، شخصیتیں سلطنتیں پیدا کر دیتی ہیں۔ سلطنتیں شخصیتیں نہیں پیدا کر سکتیں"۔ گاندھی جی کچھ سوتے، کچھ جاگتے، یہ بحث آدھی تہائی کچھ سنتے رہے، اور جابجا مسکراتے بھی گئے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں یہ پرلطف صحبت ختم ہوگئی۔ میرا اسٹیشن آگیا، اور گاڑی آگے روانہ ہوگئی۔ عقیدت مندوں اور "درشن" کے طالبوں کا ریلا اس چھوٹے سے اسٹیشن پر بھی آیا۔ اور مولانا کی پوری کوشش رہی کہ کوئی زحمت مہاتما جی کو نہ ہونے پائے اور ان کے آرام میں خلل نہ پڑنے پائے۔ خود ہر زحمت برداشت کر لینے اور اپنے اوپر لے لینے کو موجود...... گاندھی جی کا ایثار اس میں شک نہیں کہ بہت بڑھا ہوا تھا اور ضرب المثل کی شہرت رکھتا تھا لیکن اپنی آنکھوں کی اس شہادت کو کیا کروں کہ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی ہر وقت کی پیش آنے والی باتوں میں مولانا محمد علی نے اپنے کو جس جس طرح، ان کے سامنے دبایا، مٹایا، گرایا، اس کی نظیر بھی ملنی آسان نہیں۔

......☆☆☆......

باب:13

1920-21

(خلافت ۔ جامعہ ملیہ)

اسی دور کا ذکر ہے کہ ایک بار پھر علی برادران کا پھیرا لکھنؤ کا ہوا (وقت کی تفصیل اب یاد نہیں) قیام حسب معمول فرنگی محل میں۔ شب کو دعوت بھی حسب معمول فرنگی محل میں۔ وقت مقرر پر ہم سب لوگ منتظر، اور محمد علی کا پتہ نہیں۔ انتظار اور مزید انتظار۔ معلوم ہوا کہ اسٹیشن سے سیدھے، یا اور کہیں ہوتے ہوئے، غلام حسین مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھنے قبرستان عیش باغ کو چلے گئے ہیں۔ ''فاتحہ'' محمد علی کے ہاں کوئی رسمی چیز نہ تھی۔ قبر پر رو رو کر ایصال ثواب کرنے، اور رحمت ومغفرت کی دعائیں خشوع وخضوع، گریہ وزاری کے ساتھ کرنے میں جتنی دیر بھی لگ گئی ہو، اس وقت کے گزرنے کا احساس ہی محمد علی کو کب ہوا ہوگا؟...... جو شخص ہر اجنبی مسلمان کی مصیبت اور موت سن کر آب دیدہ ہو جائے، اور اس کی چوٹ کو اپنی چوٹ سمجھنے لگے، تو پھر یہاں تو معاملہ اپنے ایک گہرے مخلص اور عزیز ترین رفیق، اسسٹنٹ ایڈیٹر کامریڈ اور ایڈیٹر نیو ایرا کا تھا۔ آدھی رات بھی اگر بالین تربت پر گزر جاتی تو ذرا تعجب نہ ہوتا۔ بہر حال محمد علی اچھی خاصی دیر کر کے واپس آئے، جب لوگ خوب بھوک سے بیتاب ہو چکے تھے۔

کھانے کے لیے ہاتھ دھو رہے تھے کہ میں نے قریب جا کر باتیں شروع کر دیں۔ ٹیگور کا

انگریزی مضمون (Penalties of being Known) ''شہرت کا جرمانہ'' اسی زمانہ میں نکلا تھا۔ اس کا حوالہ دے کر میں عرض کیا کہ ''اب تو آپ سے بات کرنے کا موقع نکلنا دشوار ہو گیا ہے، ہر وقت اور ہر جگہ لوگ گھیرے رہتے ہیں اور آپ کی بھی زبان رکتی نہیں، اپنے فرط اخلاق سے باتیں کیے ہی جاتے ہیں'' بولے کہ ''ہاں بولتے بولتے گلا پڑ پڑ جاتا ہے، لیکن اس کا کوئی علاج بھی نہیں۔ اب یہ گلا تو جب اس میں پھانسی کا پھندا پڑے گا، جب ہی خاموش ہو گا۔ یوں تو ماننے کا نہیں''...... قید سے ابھی چھوٹ کر آئے تھے، لیکن قید و بند، بلکہ دار و رسن کے لیے بھی ہر وقت اب بھی تیار ہی رہتے تھے۔

....

20 کی آخری سہ ماہی تھی، جب علی برادران کا حملہ اس وقت کے علی گڑھ پر ہوا، محمد علی کو اپنے علی گڑھ سے محبت نہیں، عشق تھا۔ خدا معلوم دل پر کیا گزر رہی ہوگی، جب اس ''بت کدہ'' کو توڑ رہے تھے۔ ایک اسلام کے نام کے آگے سب کچھ بھلائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ علی گڑھ کو بھی!...... امرتسر کی ایک تقریر میں خود زار و قطار رو رو کر اور دوسروں کو رلا رلا کر کہہ بھی تو چکے تھے:

''کعبۃ اللہ کی حفاظت ہمارا سب سے بڑا اور آخری فرض ہے۔ اس کے بچانے کے لیے ہمیں اپنی جانیں قربان کرنا ہیں۔ جب اس پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور ہمارا قبلہ ہی خطرہ میں پڑ رہا ہے۔ تو ہم سب یہاں سے ہجرت کر کے گرتے پڑتے اس کی حفاظت کو جا پہنچیں گے۔ اپنے گھروں کو ویران کر دیں گے، تا کہ اللہ کا گھر محفوظ رہے۔ یہاں کی مسجدوں میں قفل ڈال جائیں گے کہ وہ بڑی مسجد آباد رہے۔ یہاں کی عبادت گاہیں سونی کر جائیں گے کہ اس معبد اعظم کی رونق اور بہار میں نہ فرق پڑنے پائے''۔

بہر حال مہم علی گڑھ کے معاً بعد محمد علی ایک سرکاری اثر سے آزاد ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کی طرح ڈالنے میں لگ گئے۔ خود ہی بڑی محنت سے اس کا نصاب بنایا، اس پر مضامین لکھے، ان کی نشر و اشاعت کی، کلاس قائم کیے، اور خود ہی پڑھائی بھی شروع کر دی...... جامعہ ملیہ آج ماشاء اللہ قائم ہی نہیں، بلکہ بڑی اچھی حالت میں ہے۔ لیکن یہ یاد دلاتے رہنے کی ضرورت آج بھی باقی

ہے کہ اس کے اصل بانی محمد علی ہی تھے۔ جیسے علی گڑھ کے اصل بانی سرسید، رفیقوں، شریکوں کی رفاقت سے اصل بانی کی شخصیت مشتبہ نہ ہونی چاہیے۔

....

سال کی یہ آخری سہ ماہی محمد علی کے لیے بڑی آزمائش کی سہ ماہی تھی۔ علی گڑھ کی تخریب اور جامعہ کی تعمیر، دونوں کے کام ساتھ ساتھ۔ فرصت بالکل عنقا۔ خدا جانے کھانے اور سونے کے اوقات کہاں سے نکال لیتے تھے۔ بہرحال جنوری 21 میں جب ذرا دم میں دم آیا، تو 13 جنوری کو مجھے جامعہ آنے کی دعوت دی۔ مراسلت اب عرصہ دراز سے بند تھی۔ یہ مکتوب پا کر مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ اصل خط ملاحظہ ہو:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

12 / جنوری 1921 قومی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

برادرم! السلام علیکم

اپنی عدیم الفرصتی کا اب کیا دکھڑا روؤں۔ آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں۔ اسی باعث مفصل خط لکھنے سے معذور ہوں اور مجملاً لکھنے کا نتیجہ غالباً یہ ہوگا کہ آپ میرے مفہوم کو نہ سمجھ سکیں گے۔ بہرحال یا قسمت یا نصیب کہہ کر لکھتا ہوں۔

جی چاہتا ہے کہ آپ کو یہاں دیکھوں، مگر علم سے زیادہ مذہب عزیز ہے۔ اور ایک مسلمان کے مذہب کے متعلق اگر قومی مسلم یونیورسٹی میں بھی شک وشبہ کیا جائے گا تو ہم یہ کہہ کر پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ ہر شخص کا مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے جس سے اس دارالعلوم کا کوئی تعلق نہیں۔ اب تک عمداً میں نے فلسفہ کے سینئر پروفیسر کی جگہ کے متعلق کوئی سفارش نہیں کی ہے۔ چونکہ اردو میں تعلیم دلانا منظور ہے، اس لیے اور بھی آپ کی ضرورت ہے اگر تکلیف نہ ہو تو ایک دودن کے لیے میرے مہمان بن کر یہاں کی دال روٹی کھایئے اور تمام معاملات کا تصفیہ کیجیے۔ اگر ہم دونوں ایک ہی بات پر راضی ہو گئے تو مجھے یقین ہے کہ دارالعلوم کو آپ سے بیش قیمت مدد مل سکے گی۔ ممکن ہے کہ آپ شروع ہی سے یہاں آنے سے انکار کرتے ہوں اور مذہب کے متعلق میرے اس قدر لکھنے کو بھی خواہ مخواہ کا دخل در معقولات تصور کریں۔ لیکن مجھے تو پروپیگنڈہ کرنا ہے۔ اس لیے تبلیغ ہی

کا موقع دیجیے اور آ جایئے۔ بہر حال آپ سے نصاب و نظام تعلیمات کے متعلق مشورہ کرنا ہے اسی کے لیے آ جایئے۔

اب رخصت ہوتا ہوں۔

والسلام

آپ کا قدیم نیاز مند

محمد علی

....

اس ارشاد کی تعمیل تو میں کیا کرتا، اور اپنا لکھنؤ کا گوشۂ عافیت (خاتون منزل) چھوڑ، سرکاری یا قومی کسی قسم کی بھی قید ملازمت میں اب کیا پڑتا۔ بلکہ اب تو اس منزل میں تھا کہ خود لکھنؤ کی سکونت بار معلوم ہو رہی تھی، اور سالہا سال کے قیام کے بعد، اور گوناگوں دلچسپیوں کے باوجود اسے ترک کر کے اپنے وطن قدیم دریاباد کو ازسرنو آباد کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس لیے جواب میں تو غالباً محض معذرت لکھ بھیجی۔ لیکن یہاں ذکر میرے جواب کا نہیں، ذکر مولانا کے اصل مکتوب کا ہے...... عبارت مکرر ملاحظہ کر لی جائے۔

اللہ اللہ! محمد علی کو مجھ سے جس درجہ محبت و شفقت تھی، اوپر کے صفحات سے ظاہر ہو چکی ہے۔ حسن ظن بھی مجھ سے (میری کتاب پڑھ کر) اتنا رکھتے ہیں کہ جامعہ میں فلسفہ اردو میں پڑھانے کا بہترین معلم میں ہی ثابت ہو سکتا ہوں۔ اسی ذاتی تعلق اور اتنی خوش ظنی، دونوں کے باوجود لکھتے ہیں، تو یہ کہ "مگر علم سے زیادہ مذہب عزیز ہے"...... محمد علی کے سوا کوئی دوسرا ہوتا تو بھلا اس موقع پر یہ فقرہ لکھتا، یا اور کوئی شرط اس قسم کی لگاتا؟

میں بحمد للہ اس وقت تک الحاد و دہریت کے چکر سے پوری طرح نجات پا چکا تھا، اور پختہ مسلم ہو چکا تھا۔ مولانا کو ان تفصیلات کی اطلاع نہ تھی۔ وہ اپنی پرانی واقفیت کی بنا پر اب تک میرے عقائد کو ناقابل اطمینان سمجھ رہے تھے۔ اسلام اور اللہ کے دین کا یہ گہرا درد ان کے دل میں تھا کہ مجھے بلا بھی رہے ہیں، میرا ہونا وہاں دل سے بھی چاہ رہے ہیں اور اس کو جامعہ کے حق میں مفید بھی پا رہے ہیں لیکن ان سب کے باوجود اس کے ذرا بھی روادار نہیں کہ ایک ملی درسگاہ میں

الحادو دہریت کے جراثیم لیے ہوئے قدم رکھوں..... محمد علی کی سیرت کا سارا نچوڑ اس ایک مختصر خط، بلکہ اس کے ایک فقرہ کے اندر آ گیا۔ دین کے لیے اتنی صلاحیت اچھے اچھے علما میں بھی اس دور میں کمتر ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ نہیں کہ محمد علی کو اپنے دوستوں، عزیزوں، رفیقوں سے محبت نہ ہو۔ محبت میں کمی کیسی، اور زیادتی ہی رہتی تھی۔ لیکن اللہ اور اس کے دین کی محبت ان سب محبتوں پر حاکم اور غالب۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کی عملی تفسیر۔

کہتے ہیں کہ علی برادران کی ان ہی والہانہ خدا پرستیوں کو دیکھ کر ایک بار ان کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے فرمادیا تھا کہ ''یہ دونوں بھائی اگر عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوتے تو ان کی مسلسل فدا کاریاں تو ایسی ہیں کہ جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دس مخصوص صحابیوں کے نام ایک صحبت میں لے لے کر انھیں جنت کی بشارت دے دی تھی، ایسے ہی ان دونوں کے لیے بھی کیا عجب ہے کہ نام لے کر ارشاد ہو جاتا کہ محمد علی فی الجنۃ، شوکت فی الجنۃ'' اور کون کہہ سکتا ہے کہ مرشد کا یہ قول حقیقت سے خالی اور نری تخیل پر مبنی تھا؟

......☆☆☆......

باب:14

1921

(''مستحق دار کو حکمِ نظر بندی ملا'')

21 علی برادران کے شباب شہرت کا سنہ تھا۔ گاندھی جی کے ہمراہ لق ودق ملک ہندوستان (غیر منقسم ہندوستان یعنی موجودہ ہندوستان و پاکستان دونوں کے مجموعہ کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ آج کلکتہ میں ہیں تو کل ممبئی میں، صبح دہلی میں کی تو شام لاہور میں۔ شہر شہر بلکہ قصبہ قصبہ پہنچے۔ اور جہاں کہیں پہنچے۔ نام کی شہرت استقبال کے لیے پیشتر ہی سے موجود ہوتی۔ خلافت کمیٹی جب ابتدأ 19 میں قائم ہوئی۔ جب تو علی برادران بیتول جیل میں نظر بند تھے۔ لیکن جب سے باہر نکلے، خلافت کمیٹی پر ایسا چھا گئے کہ لوگ اس کے بانیوں کو بھول ہی گئے اور زبانوں پر صرف محمد علی، شوکت علی کے نام رہ گئے۔ یہ خلافت کمیٹی کے مرادف اور خلافت کمیٹی ان کے مرادف!

فروری 21 کا اخیر تھا، جب لکھنؤ میں صوبہ خلافت کانفرنس کا جلسہ رفاہ عام [1] کے احاطہ میں دھوم دھام سے منعقد ہوا۔ خلافت کا معمولی سا معمولی جلسہ بھی اس وقت انتہائی گرم جوشی کے ساتھ ہوتا تھا اور پھر اس کی صدارت کے لیے تو مولانا محمد علی آرہے تھے۔ اس نام کی کشش

---

[1] اس وقت تک بڑے پبلک جلسے وہیں ہوا کرتے تھے۔ سٹی اسٹیشن کے قریب رفاہ عام کلب اور جلسۂ تہذیب کی جو عظیم الشان عمارت ہے، جلسے کبھی اس کے اندر ہال میں ہوتے اور کبھی باہر احاطہ کے میدان میں۔

نے اور چار چاند لگا دیے ۔ یہ عین وہ زمانہ تھا کہ میں لکھنؤ کے ہمہ وقتی ہنگاموں سے اکتا کر اور تنگ آ کر لکھنؤ سے 42-40 میل دور اپنے وطن آبائی قصبہ دریاباد (ضلع بارہ بنکی) کو منتقل ہو آیا تھا اور سیاسی جلسوں سے بالکل الگ اور گوشہ گیر تھا۔ لیکن محمد علی کا نام سن کر کیسے نہ آتا.... بقول شخصے سر کے بل آیا۔

....

محمد علی اب اپنے وقت کے مالک کسی درجہ میں نہیں رہے تھے ۔ ہر وقت مصروف ہی رہتے ۔ ابھی ایک کام اٹھایا ہی تھا کہ اسے ادھورا چھوڑ، دوسری طرف مڑ جانا پڑا ۔ ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ دوسری بات چھڑ گئی ۔ معاصرین میں اچھے اچھے ناموراور مشاہیر پوری بات کرنے کو ترس جاتے ۔ خطبہ صدارت لکھنے لکھانے کی فرصت اب کہاں سے لاتے ۔ صدارتی تقریر زبانی ارشاد کی، جو شاید کئی گھنٹہ میں ختم ہو پائی ۔ ایک نالہ درد تھا ۔ طویل و مسلسل ۔ خود بھی بات بات میں روتے اور دوسروں کو بھی رلاتے ۔ آج ان تقریروں کا کوئی حصہ بھی کاش کہیں محفوظ ہوتا!...... گراموفون کی ایجاد اس وقت بھی موجود تھی اور سینکڑوں فاسقانہ گیت ان میں محفوظ کیے جا رہے تھے ۔ اللہ کی حمد وثنا کی یہ دلکش اور دلدوز مناجاتیں بھی اس وقت ریکارڈ کر لی جاتیں ۔

مجھے ناچیز سے وہی بحث ومباحثہ، قیل وقال، جلسہ گاہ کے باہر بھی اور محل سرائے فرنگی محل کے اندر بھی ۔ جلسہ دو دن رہا ۔ کارروائی اردو میں تھی ۔ جلسہ میں جو اہم اور مرکزی تجویز منظور ہوئی اس کے انگریزی ترجمہ کا حکم مجھے ملا ۔ خدا معلوم مجھے اپنے اوپر قیاس کر کے انگریزی زبان کا ماہر کس بنا پر سمجھنے لگے تھے! تخت صدارت کے قریب مجھے بلایا، اور ارشاد یہ فرمایا کہ "یہ تجویز بہت اہم ہے ۔ تار پر وزیر اعظم برطانیہ کے پاس جائے گی ، اس کا ترجمہ تم ہی کرو" ۔ اتنی بڑی ذمہ داری کی اہلیت اس نااہل میں کب تھی ۔ حیلہ حوالہ کر کے کام دوسروں پر ٹال، خود وہاں سے کھسک گیا!..... شیخ شوکت علی بی اے مرحوم (وکیل لکھنؤ) بہت پیش پیش تھے، عجب نہیں جوان ہی غریب کو ترجمہ کا کام بھی انجام دینا پڑا ہو ۔ قومی وملی معاملات میں اپنی ذمہ داری کی طرف سے غفلت، اور اپنا کام دوسروں کے سر ڈال دینے کی لت، اس وقت بھی ایسی ہی عام تھی، جیسی آج ہے ۔

شام کو فرنگی محل میں حسب معمول زوروں کی دعوت......اب ہر دفعہ بار بار اس کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔

....

اب محمد علی سارے ملک میں زمین کا گز بنے ہوئے تھے۔ پورے اور صحیح معنی میں ''مشائی'' تھے۔ ابھی یہاں ابھی وہاں۔ صبح کہیں، شام کہیں۔ ساری فضا میں تین ہی نعرے ایک ''اللہ اکبر'' دوسرے ''مہاتما گاندھی کی جے'' تیسرے ''محمد علی شوکت علی کی جے''۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ملک کی حکومت ان ہی تین بے تاج کے تاجداروں کے ہاتھ میں ہے، اور ساری خلقت کے دلوں پر یہی تثلیث حکمرانی کر رہی ہے۔ ٹھیٹھ گنوار اور دیہاتی، اخبارات کی صورت تک سے بے خبر، لیکن ان ناموں سے وہ بھی خوب واقف۔ کلمہ ان ہی ناموں کا پڑھ رہے ہیں۔ شہرت ایسے ایسے دور افتادہ علاقوں تک پہنچی ہوئی، جہاں اس کے قبل نہ کسی لیڈر کے نام کی رسائی ہوئی تھی نہ کسی واعظ یا ''سیاس'' کی.......لطیفہ یہ کہ خواص کے علم میں تو محمد علی، شوکت علی گو ''یک جان'' تھے لیکن بہر حال ''دو قالب'' تھے۔ عوام الناس کے ذہن میں دوئی اتنی بھی نہ تھی، جان بھی ایک اور قالب بھی ایک۔ گویا ''شوکت علی'' کوئی دوسرا نام تھا ہی نہیں۔ بلکہ محمد علی ہی کے پورے نام کا ایک جزو تھا۔ ''محمد علی شوکت علی''!

محمد علی اب انسان کاہے کو تھے، محض ایک ''خبر'' ہو کر رہ گئے تھے جو روزانہ چھپتی رہتی۔ آج اگر تصویر نکلتی تو کل تقریر چھپتی، اور پرسوں بیان شائع ہوتا۔ محمد علی کو اپنی ماں سے بیوی سے، چاروں بچیوں سے، سب سے بے انتہا محبت تھی۔ سب کے عاشق زار تھے۔ آج خدمت ملک وملت کے پیچھے (جسے وہ خدمت دین اور عبادت سمجھ کر کر رہے تھے) 'ان سب کو بھولے ہوئے، سب سے چھوٹے ہوئے تھے.........ذاتی مراسلت مکاتبت کا موقع بھلا اس درمیان میں کیا ملتا۔ روز روز کی خیریت اخبارات سے ملتی ہی رہتی۔

....

ستمبر 21 کا آغاز تھا کہ محمد علی مدراس جاتے ہوئے راستہ میں والٹیر اسٹیشن پر گرفتار کر لیے گئے۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی ایک غضبناک تقریر کئی ہفتہ قبل اس خبر کے لیے کانوں کو تیار

کر چکی تھی۔ اور گرفتاری کے بعد اپنے مشہور و معروف مقدمہ کے لیے کراچی لائے گئے۔ جرم یہ تھا کہ کچھ روز قبل کراچی خلافت کانفرنس میں بحیثیت صدر کانفرنس ایک باغیانہ تقریر کی تھی، اور ایک باغیانہ ریزولیوشن پاس کرایا تھا، جس سے مسلم سپاہیوں میں سرکار انگریزی کے خلاف بددلی و ناراضگی پھیلتی۔ ساتھ کے اور مجرم پیر غلام مجدد صاحب، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد، ڈاکٹر کچلو اور مولانا نثار احمد کانپوری وغیرہ تھے۔

ہمدم (لکھنؤ) اس وقت زوروں پر نکل رہا تھا۔ اور یوپی اور دہلی میں کہنا چاہیے کہ وہی ایک روزنامہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے مالک آنریبل شیخ شاہد حسین قدوائی مرحوم تعلقہ دار گدیہ تو بالکل دوسرے سیاسی مسلک کے تھے، لیکن ایڈیٹر سید جالب مرحوم ایک زمانہ میں خاص رفیق مولانا محمد علی کے رہ چکے تھے، اور ہمدرد میں کام کیے ہوئے تھے۔ یہ علی برادران کے حالات تفصیل کے ساتھ چھاپتے رہتے۔ اور مسلمانوں کا مذاق عام اس وقت مانگ بھی اسی چیز کو رہا تھا۔ جالب مرحوم کو کہیں سے (غالباً فرنگی محل سے) مولانا کا ایک خانگی مکتوب ہاتھ آ گیا، حسب معمول خوب مفصل تھا، اور اس میں مولانا کے قلم سے والٹیر سے کراچی تک کا سفرنامہ درج تھا۔ ہمدم نے اسے بجنسہ شائع کر دیا۔ دریاباد میں ڈاک اس وقت صبح، کچھ دن چڑھے تقسیم ہوتی تھی۔ پرچہ جس وقت آیا، بیت الخلا جا رہا تھا پرچہ ہاتھ میں لیے وہیں چلا گیا۔ اور فرط اشتیاق میں وہیں کھول کر پڑھنا شروع کر دیا......خدا کے لیے کوئی صاحب یہاں پہنچ کر، لاحول ولاقوۃ پڑھ کر، اس عمل کے جواز وعدم جواز فقہی بحث نہ چھیڑ دیں۔ بیان نفس واقعہ اور فرط اشتیاق کا ہو رہا ہے، نہ کہ کسی مسئلہ کے جواز وعدم جواز کا۔

خط کے اور حصے بھی مؤثر تھے لیکن جب اس مقام پر نظر پہنچی کہ ''رات کے طول وطویل گھنٹے درود شریف کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گزار دیے اور آسی غازی پوری کا یہ شعر برابر وردِ زبان رہا کہ

وہاں پہنچ کے یہ کہیو صبا سلام کے بعد
تمھارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

تو معاً آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ رواں ہو گیا......دنیا بھی کیسی اندھی تھی، اور آج تک

اندھی چلی آ رہی ہے۔ محمد علی کو دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح محض ایک سیاسی لیڈر سمجھنا کتنا کھلا ہوا ظلم تھا! جو اپنے آپ کو رسول کی محبت میں فنا کیے ہوئے تھا جس پر عشق اپنے دین کا سوار تھا، اس کے لیے یہ رائے قائم کرنا کہ اس کا منتہائے مقصود اپنے وطن کی آزادی اور ہندوستان کی خودمختاری تھا، یہ کیسی صریح ناانصافی اس کے حق میں بھی ہے اور اپنے حق میں بھی! محمد علی کو تو ہندوستان کی آزادی بھی اس لیے عزیز تھی کہ اس سے حرمین شریفین بھی آزاد ہو سکیں گے!......سچ کہا ایک دوسرے عارف اور دیوانہ (مولانا مناظر احسن گیلانی) نے دس سال بعد محمد علی کی موت پر ؎

بہ دین مصطفےٰ دیوانہ بودی	فدائے ملت جانانہ بودی
سیاست را نقابِ چہرہ کردی	وگرنہ عاشق مستانہ بودی

......☆☆☆......

باب:15

1921-22

(قید فرنگ۔ ''جان بیٹا خلافت پہ دے دو'')

کراچی کی عدالتوں میں، پہلے مجسٹریٹ کے اور پھر صوبہ کی سب سے اونچی عدالت جوڈیشنل کمشنر کے سامنے محمد علی نے جو بیانات دیے۔ اور جیسے جیسے قانونی نکتے اور ادبی لطیفے دوران مقدمہ میں پیدا کیے، ان کی تفصیلات کو اس ''ذاتی ڈائری'' کے محدود موضوع اور گنجائش سے کیا تعلق۔ مختصر یہ کہ لفظ لفظ جوش ایمانی اور غیرت دینی کا ترجمان تھا۔ انگریزی اخبارات کے لمبے لمبے کالم مقدمہ کی کارروائیوں اور ''سنسنی خیز'' سرخیوں سے بھرے رہتے۔ اور ادھر ہر روز تازہ اخبار کا انتظار بے چینی کے ساتھ رہا کرتا۔ صبح ہوئی نہیں، اور اخبار کا انتظار شروع ہوا نہیں۔ اور جب اخبار ہاتھ میں آ کر کچھ دیر میں ختم ہو جاتا، دل اسی وقت سے دوسرے دن کے اخبار میں اٹک جاتا! کوئی دو مہینہ حوالات میں عام قیدیوں کی طرح گذارے۔ نومبر میں حکم سنایا گیا۔ دو دو برس کی سزا سب ملزموں کے ساتھ محمد علی کو بھی!...... محمد علی بہت گھوم پھر چکے تھے، مارے مارے پھرتے بہت دن ہو چکے تھے، اب مشیت تکوینی کے حاکم کا حکم نافذ ہوا کہ مدت دراز کے لیے ایک جگہ جم کر بیٹھیں! ان ہی کی زبان میں ؎

دیکھیے اب یہ گردشِ تقدیر　　کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

اللہ اللہ کیا سماں تھا! آکسفورڈ کا گریجویٹ، آنرز پایا ہوا گریجویٹ، کامریڈ کا ایڈیٹر، ملک کا ایک معروف ترین لیڈر، چوروں اور نقب زنوں، ڈاکوؤں اور خونیوں کے ساتھ قفس میں بند! اور جس کے ملنے والوں میں ابھی کل تک گورنر اور نصف گورنر، راجے اور مہاراجے، ایگزیکٹیو، کونسلر اور خود وائسرائے بہادر تھا، آج اس کی عزت جیل کے ادنیٰ پہرہ داروں اور برقندازوں کے رحم وکرم پر تھی! کوچ اور صوفے اور گدے اور قالین کی جگہ زمین کا کھردرا فرش، اور غذا وہ مل رہی تھی، جو کبھی اس کے چاکروں اور خدمت گاروں نے بھی کیوں کھائی ہوگی!

....

اور یہ سب کچھ دعویٰ اسلام کے جرم میں! محبت اسلام کے پاداش میں! فرد جرم جو لگی تھی، اس میں آزادی ہند، سوراج وغیرہ کا کہیں نام نہ تھا۔ الزام یہ تھا کہ جو احکام قرآنی اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم، قتل مسلم کی وعید میں ہیں، ان کے مسلمان سپاہیوں تک پہنچانے کی کوشش کیوں کی تھی۔ تاریخ ہلکے پیمانہ پر سوا تیرہ سو برس کے بعد اپنا اعادہ کر رہی تھی..... اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ(الحج) اور وَمَا نَقَمُوْا مِنْھُمْ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ (البروج) اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی تفسیر کا مشاہدہ لفظ وعبارت کے وساطت کے بغیر ہو رہا تھا۔

ادھر محمد علی جیل گئے اور ادھر بچہ بچہ کی زبان پر

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کا ترانہ آ گیا!.....جس پر اپنے بیوی بچوں، عزیزوں، دوستوں سے دو چار دن کی بھی جدائی شاق تھی، اسے حکم 24 مہینوں تک، سب سے الگ، قید فرنگ میں بند رہنے کا.....اللہ اللہ! کیا شانِ بے نیازی ہے! اپنے عاشقوں کے امتحان کیسے کیسے کرائے جاتے ہیں۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔

....

ستمبر 21 سے 23 تک، گرفتاری کے وقت سے رہائی کی گھڑی تک اس مظلوم پر کیا کیا گزری، اس کی تفصیل کا نہ یہ موقع نہ یہ بیان یہاں مقصود۔ مختصر یہ کہ حوالات کی مادی سختیوں اور

جیل کے جسمانی شدائد کے علاوہ، سرکاری ونیم سرکاری ایجنسیوں نے بھی کوئی دقیقہ روحانی اور دماغی تکلیف کا اس مظلوم کو پہنچانے کا اٹھا نہیں رکھا۔ اس وقت کے پانیر، اس زمانہ کے اسٹیٹسمین، اس دور کے لیڈر کی فائلیں آج بھی کہیں سے ان کی گرد جھاڑ پونچھ کر اٹھا دیکھئے ایک ایک صفحہ سب وشتم سے رنگین ملے گا۔ انگریزوں اور غیر کانگریسی ہندؤوں کے علاوہ، خود مسلمان اخبار چی اور کالم نویس خدا جانے کتنے ایسے نکل پڑے تھے جن کی کہنا چاہیے کہ روزی ہی کھل گئی تھی۔ صبح ہو یا شام، جب دیکھیے محمد علی کے حق میں کوئی نہ کوئی الزام تصنیف کر رہے ہیں۔ گویا ہر افتراء جائز اور ہر اتہام درست ٹھہر گیا ہے...... شیر لوہے کی سلاخوں کے اندر بند تھا اور بازار کے اوباش چھوکرے، دور سے لمبی لمبی لکڑیوں سے اسے کونچ کونچ کر اپنے ظرف کا ثبوت دے رہے تھے!

مشیت کے بھی عجائب کاروبار ہیں۔ ایک طرف یہ معاملات جاری تھے، اور اسلام کے دیوانہ سے ان کے ذنوب ومعاصی گویا، رگڑ رگڑ کر دھلائے جا رہے تھے۔ تو دوسری طرف ان الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا(مریم) جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے، عنقریب خدائے رحمٰن ان کے لیے (دلوں میں) محبت پیدا کردے گا۔ ان کی تجلیات بھی مستور نہیں رہ سکتی تھیں۔ کراچی کے قیدی کچھ روز بعد سب الگ الگ کر دیے گئے۔ شوکت علی راج کوٹ بھیجے گئے۔ محمد علی کے حصہ میں بیجاپور (دکن) کا جیل آیا، بیجاپور کے قیدی کی مقبولیت ومرجعیت کا یہ عالم تھا کہ اگر نا وقت اسے چھینک آجاتی تو اس کی بھی تار برقیاں دوڑنے لگتیں، اور دم کے دم میں یہ خبر بھی ملک کی فضا میں گونج جاتی۔

نظمیں چھوٹی بڑی، رطب ویابس، خدا جانے کتنی کہہ ڈالی گئیں۔ ایک نظم خود محمد علی ہی کی طرح مقبول ہوئی۔ ''جان بیٹا خلافت پہ دے دو''۔ شہر شہر، گلی گلی، گاؤں گاؤں، کم از کم اودھ اور جوار اودھ میں تو بس یہی ترانہ تھا:

''جان بیٹا خلافت پہ دے دو''

نظم، محمد علی کی والدہ ماجدہ کی زبان سے ادا کی گئی تھی۔ کوئی خاص شاعرانہ خوبی نہیں رکھتی تھیں۔ فن کی غلطیاں بھی موجود تھیں۔ شاعر صاحب بھی کوئی مجہول الحال، غیر معروف سے تھے۔ اس پر بھی کچھ فضا کا اثر، کچھ جذبات کا اخلاص، کچھ درد انگیز دھن، مل ملا کر نظم کو وہ خداداد مقبولیت

حاصل ہوئی، جو اچھے جید شاعروں کے لیے بھی باعثِ رشک ہو سکتی تھی۔ شروع کے دو بند آج 20-31 سال کے بعد بھی سن لیجیے۔

بولیں اماں محمد علی کی　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہی شوکت علی بھی　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا　　کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحاں میں اترنا　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے　　کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو
حشر میں حشر برپا کروں گی　　پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعویٰ کروں گی　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو

....

22 کا ایک عام منظر۔ شام کا وقت ہے۔ امین آباد کے چوراہے پر یہی ''صدائے خاتون'' دو دو پیسہ کو بک رہی ہے۔ خدا جانے کتنی تعداد میں روز نکلتی رہتی ہے۔ لڑکے درد انگیز آواز سے گا گا کر پڑھ رہے ہیں، اکثر نواب مرزا شوق کی مثنوی ''زہر عشق'' کی دھن میں۔ صدہا راہ گیر کھڑے سن رہے ہیں۔ پولیس کی لاری آئی، بہتوں کو پکڑ پکڑ کر جیل خانہ پہنچا دیا۔ روز سہ پہر سے لے کر رات گئے تک یہی تماشا رہتا ہے۔ جیل جانا ایک ہنسی کھیل ہو گیا ہے۔ پہلے جس کے نام سے لوگ تھراتے تھے، سہمے جاتے تھے، اب خود اس کا جیل لے جانا ایک مذاق سا معلوم ہونے لگا ہے..... محمد علی جب کانگریس میں آئے تو قوم کی آگ کو ساتھ لے کر آئے، محمد علی جب جیل گئے تو یہی آگ قوم پر گلزار ہو گئی۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں مسلمان، اچھے اچھے عالی خاندان وذی مرتبہ، گریجویٹ اور وکیل، بیرسٹر اور ڈاکٹر، عالم وفاضل ہنسی خوشی خلافت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جیل بھرتے چلے گئے۔

اسی 22 کے آخری فروری یا شروع مارچ کا ذکر ہے کہ خواجہ صاحب اجمیری کا سالانہ عرس پڑا (فاتحہ کی اصل تاریخ 6 رجب ہے عرس اور میلہ کئی دن قبل سے شروع ہو جاتا ہے) اب میں

زندگی کے جس دور سے گزر رہا تھا، اس میں درگاہوں، آستانوں پر حاضری اور عرسوں میں شرکت لازمی تھی۔ اجمیر میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ خوش قسمتی سے ساتھ مولانا عبدالباری فرنگی محل کا ہو گیا۔ مولانا باوجود عالم جید ہونے کے صاحب سماع تھے۔ ان کے قافلہ کے ساتھ اپنی بھی چھوٹی سی پارٹی کو لے کر اجمیر حاضر ہو گیا۔ ان ہی کے ساتھ ٹھہرا، اور سفر میں حضر کا سا آرام اور لطف ان ہی کے لطف و کرم سے اٹھایا۔ اپنے قوال دریاباد سے لایا تھا۔ ایک روز شام کو درگاہ میں گاندھی جی آئے اور اصل مزار پر حاضری دینے کے بعد صحن میں قوالی سننے کے لیے بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے قوالوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے کلام حضرت جوہر ہی کا شروع کر دیا۔ وہ مشہور غزل ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے　　　پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

گاندھی جی سنتے جاتے تھے، اور ڈاکٹر سید محمود (جو اس وقت صوبہ بہار میں وزیر ہیں، اور اس وقت تک غالباً مرکزی خلافت کمیٹی کے ایک سکریٹری تھے) انگریزی میں انھیں مطلب سمجھاتے جاتے تھے...... کلام جوہر سے اس وقت بڑے بڑے آستانے گونج رہے تھے۔

عین اسی زمانہ میں محمد علی کراچی سے بیجاپور جیل منتقل کیے گئے تھے۔ کسی اسٹیشن پر کسی انگریزی اخبار کے ایک منچلے وقائع نگار نے انھیں جالیا، اور سوال تحریک ترکِ موالات کی موجودہ حالت کے متعلق کر دیا۔ محمد علی نے جواب میں کہا کہ "تحریک کا حال تو وہ لوگ جانیں جو باہر ہیں، میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے لیے بعد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے گاندھی جی کے احکام کی متابعت ضروری سمجھتا ہوں۔ لکھنؤ سے اجمیر جاتے وقت ایک بڑے اسٹیشن پر جو انگریزی اخبار میں نے خریدا، اتفاق سے اس میں یہی مکالمہ درج تھا۔ مولانا عبدالباریؒ نے اسے پڑھوا کر سنا۔ ان کے ایک رفیق سفر و حضر جو اس وقت بھی ہمراہ تھے بول اٹھے کہ "بعد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے نام اپنے مرشد کا لینا تھا، یہ گاندھی جی کیا معنی"۔ مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ "مرشد کوئی ذاتی ہستی تو رکھتا نہیں وہ تو رسول ہی کا نائب ہوتا ہے۔ جب رسول کا نام لے دیا تو رسول کے نائب بھی اسی میں شامل ہو گئے۔ گاندھی جی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایک الگ و مستقل حیثیت رکھتے ہیں، نام انھیں کا لینا مناسب تھا"

......☆☆☆......

باب:16

1922-23

(''تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں'')

شعر سننے اور کہنے کا لپکا تو محمد علی کو شروع ہی سے تھا۔ اس ''ڈائری'' کا ایک پچھلا باب خود ان کے قلم سے ان کے بیان شاعری کے لیے وقف گزر چکا ہے۔ کچھ نہ کچھ شعر لڑکپن ہی سے نکال لینے لگے تھے۔ حضرت داغ کی صحبت سونے پر سہاگہ ہوگئی۔ کالج پہنچتے پہنچتے خاصے شاعر بن چکے تھے۔ قومی، ملی، سیاسی زندگی میں بڑھے تو فرصت عنقا۔ بقول شخصے بات کرنے کی بھی فرصت سے محروم۔ اب شعر گوئی کی مہلت قید یا نظر بندی ہی کے زمانہ میں ملتی۔ اور جوہر کی شاعری کے جوہر اسی وقت چمکتے۔ 16 کے زمانہ نظر بندی کی شاعری کا نمونہ خاصی تفصیل سے اسی پچھلے باب (8) میں درج ہو چکا ہے اور 18 کے دو ایک شعر شہیدانِ کلکتہ کی شان میں پہلے بھی نقل ہو چکے ہیں۔ دسمبر 19 کے اخیر میں تو چھوٹے ہی تھے کہ ستمبر 21 میں پھر گرفتار ہوگئے۔ اور اب کے نظر بند نہیں بلکہ باقاعدہ مقدمہ چلنے کے بعد جیل کے قیدی ہوئے۔ پورے دو برس بھی تو باہر نہیں رہنے پائے تھے۔ 22 کا غالباً وسط تھا کہ ان کی ایک نعتیہ غزل بیجاپور جیل کی چار دیواری اور پابندیاں توڑتی ہوئی پاسبانوں اور پہرہ داروں کی آنکھوں میں خاک جھونکتی ہوئی، کسی طرح فرنگی محل پہنچ گئی۔ اور وہیں سے مجھے ہاتھ لگی...... ایک مجھی پر موقوف نہیں، خدا جانے دست بدست، نقل در نقل ہوتے کتنی

پھیل گئی، کہاں کہاں پہنچ گئی، کن کن کی زبانوں پر چڑھ گئی!.....آخر دور طباعت سے قبل پوری پوری کتابیں بھی تو اسی طرح ہاتھوں ہاتھ پھیل جایا کرتی تھیں!

....

غزل کیا تھی، شاعر کے جذبات قلب کی ہو بہو ترجمان شیدائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کا عکس ایک شفاف آئینہ میں! قوالوں نے اسے گایا، شاعروں نے اس پر غزلیں کہیں، رسائل واخبارات اسے مدتوں شائع کرتے رہے، عجب نہیں، جو آپ بھی سن چکے ہوں۔ خیر آج قند مکرر کا لطف سہی۔ شعر پڑھنے سے قبل شاعر کا جیل کے اندر عالم تنہائی مستحضر کر لیجیے ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر لحظہ تشفی ہے، ہر آن تسلی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق وفاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

ایک بار پھر ذرا محمد علی کا سراپا آنکھوں کے سامنے لے آیئے۔ علی گڑھ اور آکسفورڈ کا گریجویٹ تمام تر صاحبیت اور نیچریت کی فضا میں پلا ہوا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ سوٹ بوٹ کا خوگر۔ ہر وقت انگریزی بولنا چالنا، لکھنا پڑھنا، انگریزی ہی میں سوچنا۔ ''صاحبوں'' ہی سے سارے تعلقات، کہ ایک دم کایا پلٹ ہوتی ہے۔ اب چہرہ پر پوری داڑھی ہے اور کتری ہوئی شرعی وضع کی لبیں۔ جسم پر کھدر کا کرتا اور ڈھیلی ڈھالی عبا۔ وضع اور صورت ٹھیٹھ مولویانہ۔ ہفتوں میں نہیں مہینوں سے اخبار کی صورت کو ترسا ہوا۔ آس پاس نہ کہیں ٹائمس (لندن) کا پتہ نہ اسٹیٹسمین (کلکتہ) کا ''دلجوئی''

اور ''مدارات'' ایسے بے بس و مظلوم امتی کی بھی اگر نہ ہوتی رہتی تو وہ غریب تو شاید سر پھوڑ کر اپنے کو ہلاک ہی کر ڈالتا!

....

یہ غزل خوب ہی پھیلی، گھر گھر گائی گئی، سنائی گئی، گنگنائی گئی۔ دوسری غزلوں کے بھی کوئی کوئی شعر کہنا چاہیے کہ الہامی ہی نکلے۔ یورپ کی جنگ عظیم مدت ہوئی ختم ہو چکی تھی، لیکن ترکوں کی جنگ یونان سے ابھی جاری تھی، اور خلافت کا مقدس ادارہ بہر حال ابھی تک قائم تھا۔ اور اس کے تحفظ و بقا کے لیے تو ہندوستان بھر میں محمد علی خلافت کمیٹیاں قائم کرا چکے تھے۔ مہینوں کے صبر آزما اور شدید حالات امید و بیم کے بعد بالآخر ترکوں کو یونان پر فتح حاصل ہوئی، اور مصطفیٰ کمال پاشا کی تلوار ولایت سمرنا پر قابض ہوگئی۔ محمد علی شہر کی آبادی سے دور، بیجاپور جیل کی بلند چار دیواری کے اندر مقید ہیں، اور اخبار کے نام سے تو انھیں کاغذ کا پرزہ بھی دیکھنے کو نصیب نہیں۔ ایک روز دور سے اللہ اکبر کے نعروں کی آواز سنتے ہیں، دل اندر سے گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں کی فتح کی خبر آئی ہے، اور مسلمان خوشی سے نعرے لگا رہے ہیں۔ اس شہادت قلب پر اعتبار کر کے جوش میں آ، معاً ایک پوری غزل کہہ ڈالتے ہیں۔ مگر دل میں یہ دھڑکا بھی لگا ہوا کہ کہیں قیاس غلط نہ نکلے۔ فراستِ ایمانی کہیے یا کشف، بہر حال بات سچ نکلی...... مطلع آپ بھی ملاحظہ کریں۔

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی
سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

بے شک قیدیٔ گوشہ نشین کی سن لی گئی تھی۔ اور دعا قبول ہو چکی تھی۔ مطلع کے بعد ہی فرماتے ہیں اور اپنے متن کی خود ہی شرح و تفسیر کر جاتے ہیں۔

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا تفسیر آج ہوگئی کیدی[1] متین کی

آگے اور کھلتے جاتے ہیں۔ دل میں تو اصلی تڑپ جزیرۃ العرب کی آزادی و خود مختاری کی فتح کو اس کا محض مقدمہ یا پیش خیمہ یقین کر کے یوں عرض نیاز کرتے ہیں

ہے نام مصطفےٰ کی یہ برکت کہ پھر خدا یوں جڑ جما رہا ہے محمدؐ کے دین کی

---

1. اشارہ ہے آیت کریمہ ''اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ'' کی جانب۔

تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کردیا	اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی
اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اس کے باب میں	کب ہوگی لا مکاں سے مشیت مکین کی
اس آستان پاک پہ گھسنا ہے چل کے سر	سجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبین کی
تینوں حرم ہیں اس کے جو ہے لاشریک لہ	ترکیب ہے درست یہی ایک تین کی

طویل غزل ساری اسی رنگ میں ہے۔

اور اسی کے چند روز بعد یہ ولولہ انگیز غزل بھی۔

آخر کو لے کے عرش سے فتح وظفر گئی	مظلوم کی دعا بھی کہیں بے اثر گئی!
عالم کا رنگ اور سے کچھ اور ہوگیا	ہم بے کسوں کی آہ عجب کام کرگئی!

اب کی جیل تھا مع اپنی تمام سختیوں کے۔ نظر بندی کی سہولتیں کوئی بھی نہ تھیں۔ جسم کا وزن گھٹ گیا۔ جسمانی وروحانی شدائد کے علاوہ بڑے بھیا، شوکت سے جدائی سوہان روح۔ وہ الگ لے جا کر راجکوٹ جیل میں بند کیے گئے تھے......شعر نہیں کہتے، آنسو پی پی کر آپ بیتی سناتے جاتے ہیں۔

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے	ہم نہ تھے ان کے آستانے کے 1
ایک ایک کرکے سب کے سب تنکے	ہوئے برباد آشیانے کے 2
کچھ دنوں گھومنا مقدر تھا	ساتھ ساتھ اپنے آب ودانے کے 3
دیکھیے اب یہ گردشِ تقدیر	کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے 4
پوچھتے کیا ہو بود وباش کا حال	ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

حسن ظرافت نے اس غم وحزن، انقباض وافسردگی میں بھی ساتھ نہ چھوڑا، اور شوخ نگاری اب بھی رفیق رہی۔ شیفتہ کی ایک غزل ہے۔

کم فہم ہیں تو کم ہیں پریشانیوں میں ہم	دانائیوں سے اچھے ہیں نادانیوں میں ہم

1 وطن (رامپور) میں قدم رکھنا ممنوع ہو چکا تھا

2 جب کوئی ہی نہ رہا تھا تو خانہ داری کا سارا ساز وسامان کہاں رکھتے۔ قیمتی سا قیمتی فرنیچر برباد اور تتر بتر ہو چکا تھا۔

3 اپنے مسلسل دوروں کی جانب اشارہ ہے۔ 4 مسلسل نظر بندی اور اسیری کا بیان ہے۔

اس پر غزل کہتے ہیں، اور قدم قدم پر شوخی و زندہ دلی کی پچکاریوں سے رنگ کھیلتے جاتے ہیں۔

کیوں شہر چھوڑ جا پھنسیں دہقانیوں میں ہم مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیابانیوں میں ہم

شوکت صاحب ماشاء اللہ بڑے قد آور، لحیم و شحیم تھے۔ جوہر نے کہیں سن گن پائی تھی کہ راجکوٹ جیل میں ان کا وزن بہت گھٹ گیا، اور وہ دبلے ہوگئے ہیں تو ان کی زبان نے کہہ ڈالا۔

شوکت یہ کہتے ہیں ''وہ تن و توش جب نہیں پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

ضلع علی گڑھ کے رئیسوں کا ایک مشہور و شریف خاندان شروانیوں کا ہے۔ اس کے اکابر سے بڑی سیاسی چشمک رہتی تھی۔ لیکن اسی خاندان میں بیرسٹر تصدق احمد خان ان کے ایک بڑے مخلص بھی تھے، ان کا تصور جما کر فرماتے ہیں۔

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم

ترکوں کی امداد کے لیے بعض پر جوش مسلمانوں کی تجویز تھی کہ ایک جیش بھرتی کر کے انگورہ (انقرہ) روانہ کی جائے۔ اس پر ایک اینگلو انڈین کرنل گڈنی نے کہا کہ ہم لوگ ایک جیش یونان کی حمایت میں بھرتی کریں گے۔ اس پر وقت کے ایک معلوم و معروف ''خان بہادر'' کی زبان کو یوں حرکت میں لاتے ہیں۔

شرط وفا یہی ہے تقاضائے دیں یہی گڈنی کے ساتھ جا ملیں یونانیوں میں ہم

ظرافت و مطائبہ کے حمام میں جب مخلی بالطبع ہو کر آتے تو نوبت کبھی کبھی عریانیوں کی بھی آ جاتی، اور سعدی اور جامی جیسے ثقات کی ہزل گوئی کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اسی غزل کے ایک شعر کے پہلے مصرعہ میں علی گڑھ کے مشہور خان بہادر کا نام ہے جو نو مسلم ہیں، اس لیے غیر مختون اور دوسرے مصرعہ کا خاتمہ ہے ''مسلمانیوں میں ہم''۔ یہ شعر نہ اس وقت چھپ سکا تھا اور نہ اب اس کے چھاپنے کی ہمت ہو رہی ہے۔

سردی کے موسم میں جیل میں جو کھانا ملتا، اسے بچا کر رکھ لیتے رات کے وقت لالٹین پر گرم کر کے کھاتے، اور اس کا نام حریرہ رکھتے۔ جے ہوئے اور ٹھنڈے حصہ کو ''زمہریرہ'' کہتے۔ کھانے کی مقدار ہوتی ہی کیا تھی لیکن فیاضی اور سیر چشمی کی شان یہ تھی کہ اس کھانے کو بھی تنہا نہ کھاتے، ساتھ کے قیدیوں کو شریک کر کے کھاتے۔

کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ خوشنما چھوٹی تقطیع پر عرض جوہر کے نام سے پہلے ہی 21 کے اخیر میں شائع کر چکے تھے۔ اور وہ مجموعہ ہاتھوں ہاتھ نکل بھی گیا تھا۔ اب جو یہ نیا ذخیرہ کلام کا اور اکٹھا ہو گیا تو 22 ہی میں مکتبہ جامعہ کو دوسرا اور مکمل ایڈیشن شائع کرنے کی سوجھی اور نیا ایڈیشن، پہلے سے نسبتاً ضخیم، مجموعۂ کلام جوہر کے نام سے 23 میں قبل اس کے کہ مولانا جیل سے باہر آئیں، چھپ کر شائع ہو گیا۔ کلام پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش اس قصباتی سے ہوئی۔ بڑے شوق کے ساتھ لپک کر پوری کی گئی۔ ''جوہر اور ان کی شاعری'' کے عنوان سے جو چند صفحات لکھے گئے، وہ ماہنامہ جامعہ میں بھی بطور مضمون کے نکلے، اور جگہ بھی خوب نقل ہوئے..... مولانا کی مقبولیت کے طفیل میں کچھ تھوڑی سی مقبولیت ان کے مقدمہ نگار کے نصیب میں بھی آ گئی ع

جان ڈالی ہے ترے نام نے افسانے میں!

......☆☆☆......

باب: 17

1:1923

(داغ جگر۔ رہائی۔ ''انبساط عید دیدن روئے تو'')

محمد علی کی زندگی ہی آزمائشوں کے لیے وقف تھی۔ اب کی بار ایک بڑی ہی کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ اولاد میں لڑکا تو کوئی تھا نہیں، لڑکیاں چار تھیں۔ چاروں بڑی دلاری، بڑی چہیتی۔ اور کیسے نہ ہوتیں، جو دوسروں کی اولاد کی لیے بیتاب ہو ہو جاتا تھا وہ خود اپنے کلیجہ کے ٹکڑوں کے پیچھے کیسا کچھ دیوانہ نہ رہتا! منجھلی صاحب زادی آمنہ ہی اور زیادہ عزیز تھیں۔ محمد علی کے تازہ امتحان کے لیے انتخاب ان ہی کا ہوا۔ جوان اور تین چار ہی سال کی بیاہی ہوئی تھیں۔ ادھر باپ بیجاپور جیل میں بند ہوئے، ادھر یہ بیمار پڑیں۔ مرض بالآخر دق تجویز ہوا! خبر پہنچی تو دل مسوس کر، کلیجہ تھام کر رہ گئے، باہر ہوتے تو دوا علاج کی دوڑ دھوپ میں زمین آسمان ایک کر دیتے۔ اس وقت اتنا بس بھی نہیں کہ ایک نظر آ کر دیکھ ہی لیں۔

ایک نالۂ موزوں میں اپنے پروردگار سے فریاد کی۔ پوری نظم اسی زمانہ میں روز نامہ خلافت (اس زمانہ کے خلافت) میں ''پیام مجلس'' کے عنوان سے نکل بھی گئی تھی۔ مخاطبت براہ راست مدقوق بیٹی سے ہے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں   تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا   جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ساتویں شعر میں کلیجہ پر پتھر رکھ کر لاڈلی اور نازوں کی پالی بیٹی کو مخاطب کرتے ہیں، لیکن نظریں شاید عرش والے مالک ومولیٰ ہی کی طرف اٹھی ہوئی ہیں:

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو   نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

دسویں شعر میں عبدیت پھر مقام تفویض وتوکل پر غالب آ گئی ہے...... بندہ اپنے مالک کے قدموں پر گراہوا، گڑگڑا رہا ہے ؎

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم   آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

آگے قصۂ یعقوب ویوسف علیہما السلام کی تلمیحات ہیں اور اس کے بعد چودھویں شعر میں پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں ؎

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملادے یارب   تو ہی کہہ دے تری رحمت کا یہ دستور نہیں

....

اگست 23 کی آخری تاریخیں تھیں، جب قید فرنگ سے رہائی ہوئی، بیجاپوری جیل سے چھپ چھپاتے جھانسی لائے گئے، اور یہاں اسٹیشن پر چھوڑ دیے گئے۔قوم کو سن گن مل ہی گئی تھی اور حیات صاحب...... وہی حسن محمد حیات صاحب (علیگ) پنجابی جو مدتوں مولانا کے سیکریٹری رہے تھے، اور اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار تھے...... پہلے ہی سے جھانسی اسٹیشن جا پہنچے تھے۔ ملک بھر میں ایک جشن مسرت وشادمانی برپا ہوگیا۔ گویا رام چندر جی مدتوں کے بن باس کے بعد اجودھیا پھر واپس آگئے!

ملک کی کیسی کایا پلٹ اس دو برس میں ہوگئی تھی۔ اورعلی برادران کے بعد گاندھی جی، مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر محمود، اور بیسیوں مخلص کارکنوں کی گرفتاری اور اسیری کے بعد فضا میں کیسا سناٹا اس سرے سے اس سرے تک چھا گیا تھا، اس کا اندازہ خود مولانا کے ایک مضمون سے کیجیے، جو کئی سال بعد جنوری 29 میں ہمدرد میں ان کے قلم سے نکلا تھا:

''ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہا سبھائی مہاراشٹر نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دے چکنے کے بعد بارددلی میں وہ

روش اختیار کی ، جسے ملک نے ہتھیار ڈال دینے کے مرادف سمجھا اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دیے گئے ۔ان کے قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لعل نہرو اور دیش بندھو داس آنجہانی آزاد ہوئے اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے کے جس کا یادش بخیراب بھی کلکتہ میں نام لیا گیا ہے، گیا میں سوراج کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا گیا، جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ پھر لطف یہ کہ ہندو مہا سبھائیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں جنھوں نے ان مذہبی تعصبات کی آگ کو بھڑکا دیا جنھیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے۔اور ان کے جواب میں مسلمانان پنجاب میں سے اسی عنصر نے تبلیغ و تنظیم کے نام سے وہ زبانی جمع خرچ دکھانا شروع کیا جو آج وطن پرستی اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے۔اس طرح ہمارا کیا کرایا کام اکارت گیا، اور جب مجھے جیل خانہ ہی میں اس کا احساس ہوا تو میں نے اس طرح اس کا اظہار کیا۔

یہ حالت ہوگئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

یہ تھی وہ روداد چمن جو دوسری گرفتاری سے رہائی پر میں نے آ کر سنی''۔

سیاسی دنیا میں مولانا کی شہرت کا شباب تھا۔عین اسی وقت دہلی میں کانگریس کا ایک خصوصی (اسپیشل) اجلاس منعقد ہوا مولانا ہی کی صدارت میں۔ ایک نئی زبردست پارٹی بنگال کے سی۔آر۔داس اور یو پی کے پنڈت موتی لعل نہرو کی رہبری میں سوراج پارٹی کے نام سے وجود میں آ چکی تھی ۔جس کا مقصد کونسلوں سے بے تعلقی ختم کر کے کونسلوں اسمبلیوں وغیرہ پر قبضہ کر لینا تھا۔اس کے مقابل دوسری جماعت ''نو چینجرز'' (تبدیلی نہ کرنے والوں) کے نام سے موسوم تھی۔ یہ لوگ راج گوپال اچاریہ (موجودہ گورنر جنرل ہند[1]) وغیرہ کی رہبری میں گاندھی جی کے قدم مسلک مقاطعہ کونسل پر قائم تھے۔محمد علی تھے تو اسی آخری جماعت کے ہم خیال لیکن بحیثیت صدر، فریقین کے درمیان مصالحت کو اہم مقدم سمجھے۔بہر حال جھانسی سے سیدھے دلی روانہ ہو گئے۔

دو دن، چار دن نہیں، دو برس کی طویل مفارقت کے بعد گھر اور گھر والوں سے ملاقات کا موقع نصیب ہو رہا تھا، اور پھر عزیز و محبوب جوان بیٹی دق کے مرض مہلک میں مبتلا عین فطرت

---

[1] 1948 میں۔

بشری (اور بشر بھی کون؟ محمد علی جیسا مہر ومحبت کا پتلا) کا تقاضا تھا کہ تیر کی طرح سید ھے اس بیمار بچی کے پہلو تک پہنچتے ،لیکن رخ بجائے ادھر کے دہلی کا کر دیا!...... یہ کوئی معمولی مجاہدہ نہ تھا لیکن ایسے ایسے مجاہدے تو اب محمد علی کی زندگی کا جزو بن چکے تھے ۔اور ملکی وملی خدمات کی دھن نے اب خانگی زندگی کے تقاضوں کے پورے ہونے کے لیے جگہ ہی کہاں باقی رکھی تھی۔

جھانسی دہلی کے اس سفر میں حیات صاحب نے جہاں اور بہت سی خبریں سنائیں وہاں یہ بھی کہہ دیا کہ کلام جوہر کا نیا ایڈیشن اضافہ کے بعد نکلا ہے اور اب کے مقدمہ عبدالماجد دریابادی سے لکھوایا گیا ہے۔مولانا کی زبان سے قدرتاً نکلا'' مولانا عبدالماجد بدایونی، ان ہی کا دیباچہ تو پہلے ایڈیشن پر بھی تھا'' ۔''جی نہیں'' حیات صاحب پھر گویا ہوئے ''بدایونی نہیں، ان کے ہمنام مولانا دریابادی!......اچھا ماجد میاں دریابادی'' مولانا نے حیرت سے فرمایا، اور حیرت کچھ بیجا تھی بھی نہیں۔

....

دل ملاقات، زیارت، دست بوسی، قدم بوسی، سب کے لیے بیتاب تھا، مہینوں سے بیتاب ہو رہا تھا۔محمد علی کی علمی عظمت، ان کی ادبی قابلیت کا اعتراف، ان کے دماغی کمالات کا احترام، دل میں ہمیشہ سے تھا۔ان سے دینی وروحانی عقیدت اب پیدا ہوئی تھی اور جب سے ان کی نعتیہ غزل (''تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں'') کان میں پڑی تھی، اس وقت سے تو عقیدت کا ایک بے پناہ طوفان سینہ میں جوش مار رہا تھا اور دل بار بار کہہ رہا تھا کہ مرشد بنانے کے قابل کوئی ہے۔تو یہی یہ شخص تو اس قابل ہے کہ بیعت اس کے ہاتھ پر کی جائے ۔دوست احباب سے ذکر آیا، تو کچھ نے تو ہاں میں ہاں ملائی۔لیکن ایک گروہ نے اسے حیرت کے کانوں سے سنا......رسمی مشائخ اور پیرزادوں کے ہاں جو لوازم سمجھے جاتے ہیں، وہ محمد علی غریب کے ہاں کہاں تھے اور کہاں سے ہو سکتے تھے ۔نہ ان کا قیام کسی ''درگاہ'' کے آستانہ پر، نہ وہ کوئی باضابطہ پیرزادہ، نہ کسی پیر فقیر کے سجادہ نشین، پھر آخر کیسے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جاسکتا تھا؟...... برسوں کے بعد جب حضرت تھانویؒ کے فیض صحبت سے بیعت کی حقیقت اور مرشد کے حقیقی اوصاف سمجھ میں آئے اور مرشد کا ترجمہ ''مصلح'' ذہن نشین ہوا، جب بھی جہاں تک شخصی اخلاص، تدین اور اللہ کے سوا ہر

شے سے بے خوفی کا تعلق ہے، محمد علی کی شخصیت پر نظر برابر اسی طرح جمی رہی۔

عین اسی اگست میں اپنی خانگی زندگی میں ایک واقعہ سخت قسم کا پیش آ گیا۔ اپنے ایک حقیقی چچیرے بھائی اور سگے بہنوئی، جو برتاؤ میں بالکل مثل حقیقی بھائی کے تھے، اور پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے، مرض دق میں چند ہفتہ بیمار رہ کر لکھنؤ وفات پا گئے۔ گوناگوں تعلقات کی بنا پر اس وفات کا صدمہ بہت ہی زائد ہوا۔ میری مالی کفالت بھی اس وقت تک ایک خاصی حد تک وہی مرحوم کرتے رہتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن محمد علی کی رہائش کی خوشخبری ایسی نہ تھی جو دل کو باغ باغ نہ کر دیتی۔ اس مسرت نے اس صدمہ کو بھی ایک حد تک دبا دیا، اور دل بے چین رہنے لگا کہ کس طرح اڑ کر محمد علی تک پہنچوں......روایتیں معتبر اور پیہم پہنچ رہی تھیں کہ جیل سے نور مجسم ہو کر نکلے ہیں۔ سمند شوق کے حق میں یہ تازیانہ تھا۔

لیکن لوگوں نے یہ بھی کہا، اور سچ کہا کہ دہلی میں بھلا محمد علی کو بات کرنے کی بھی فرصت کہاں ہوگی؟ یوں ہی کیا کم مشغول رہتے تھے، اور اب تو گاندھی جی قید میں ہیں، ان کا بار بھی ان ہی پر آ پڑا ہے۔ کانگریس کے اجلاس کے ابھی تین چار مہینہ ہیں تو کیا ہوا، نام تو ان ہی کا صدارت کے لیے تجویز ہو رہا ہے۔ اس وقت تو بالکل ہی گھرے ہوئے ہوں گے۔ لڑکی کو دیکھنے بھوالی پہاڑ پر آخر جلد ہی جائیں گے۔ اطمینان کی ملاقات پھر اگر کہیں ہو سکتی ہے تو وہیں، اس کے قبل اور کہیں نہیں۔

رائے معقول تھی، مانتے ہی اور صبر کرتے ہی بنی۔ مراسلت کو کون روک سکتا تھا۔ جواب آنے کا تو کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اور اس کا انتظار تھا ہی کس کو، مقصود تو خط لکھ کر اپنے ہی دل کو تسکین دے لینا تھی۔ قیس عامری کو لوگوں نے دیکھا کہ کاغذ، قلم روشنائی کے بغیر بادیۂ عرب کی ریت پر انگلیوں سے قلم کا کام لے رہا ہے۔ لوگوں نے کہا یہ کیا؟ دیوانہ نے جواب دیا ؎

گفت عشق نام لیلیٰ می کنم
خاطر خود را تسلی می دہم

......☆☆☆......

بشری (اور بشر بھی کون؟ محمد علی جیسا مہر و محبت کا پتلا) کا تقاضا تھا کہ تیر کی طرح سید ھے اس بیمار بچی کے پہلو تک پہنچتے، لیکن رخ بجائے ادھر کے وہلی کا کر دیا!...... یہ کوئی معمولی مجاہدہ نہ تھا لیکن ایسے ایسے مجاہدے تو اب محمد علی کی زندگی کا جزو بن چکے تھے۔ اور ملکی و ملی خدمات کی دھن نے اب خانگی زندگی کے تقاضوں کے پورے ہونے کے لیے جگہ ہی کہاں باقی رکھی تھی۔

جھانسی دہلی کے اس سفر میں حیات صاحب نے جہاں اور بہت سی خبریں سنائیں وہاں یہ بھی کہہ دیا کہ کلام جوہر کا نیا ایڈیشن اضافہ کے بعد نکلا ہے اور اب کے مقدمہ عبدالماجد دریابادی سے لکھوایا گیا ہے۔ مولانا کی زبان سے قدرتاً نکلا ''مولانا عبدالماجد بدایونی، ان ہی کا دیباچہ تو پہلے ایڈیشن پر بھی تھا''۔ ''جی نہیں'' حیات صاحب پھر گویا ہوئے ''بدایونی نہیں، ان کے ہمنام مولانا دریابادی!...... اچھا ماجد میاں دریابادی'' مولانا نے حیرت سے فرمایا، اور حیرت کچھ بیجا تھی بھی نہیں۔

....

دل ملاقات، زیارت، دست بوسی، قدم بوسی، سب کے لیے بیتاب تھا، مہینوں سے بیتاب ہو رہا تھا۔ محمد علی کی علمی عظمت، ان کی ادبی قابلیت کا اعتراف، ان کے دماغی کمالات کا احترام، دل میں ہمیشہ سے تھا۔ ان سے دینی و روحانی عقیدت اب پیدا ہوئی تھی اور جب سے ان کی نعتیہ غزل (''تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں'') کان میں پڑی تھی، اس وقت سے تو عقیدت کا ایک بے پناہ طوفان سینہ میں جوش مار رہا تھا اور دل بار بار کہہ رہا تھا کہ مرشد بنانے کے قابل کوئی ہے۔ تو بس یہ شخص تو اس قابل ہے کہ بیعت اس کے ہاتھ پر کی جائے۔ دوست احباب سے ذکر آیا، تو کچھ نے تو ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن ایک گروہ نے اسے حیرت کے کانوں سے سنا...... رسمی مشائخ اور پیرزادوں کے ہاں جو لوازم سمجھے جاتے ہیں، وہ محمد علی غریب کے ہاں کہاں تھے اور کہاں سے ہو سکتے تھے۔ نہ ان کا قیام کسی ''درگاہ'' کے آستانہ پر، نہ وہ کوئی باضابطہ پیرزادہ، نہ کسی پیر فقیر کے سجادہ نشین، پھر آخر کیسے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جا سکتا تھا؟...... برسوں کے بعد جب حضرت تھانویؒ کے فیض صحبت سے بیعت کی حقیقت اور مرشد کے حقیقی اوصاف سمجھ میں آئے اور مرشد کا ترجمہ ''مصلح'' ذہن نشین ہوا، جب بھی جہاں تک شخصی اخلاص، تدین اور اللہ کے سوا ہر

شے سے بے خوفی کا تعلق ہے، محمد علی کی شخصیت پر نظر برابر اسی طرح جمی رہی۔

عین اسی اگست میں اپنی خانگی زندگی میں ایک واقعہ سخت قسم کا پیش آ گیا۔ اپنے ایک حقیقی چچیرے بھائی اور سگے بہنوئی، جو برتاؤ میں بالکل مثل حقیقی بھائی کے تھے، اور پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے، مرض دق میں چند ہفتہ بیمار رہ کر لکھنؤ وفات پا گئے۔ گوناگوں تعلقات کی بنا پر اس وفات کا صدمہ بہت ہی زائد ہوا۔ میری مالی کفالت بھی اس وقت تک ایک خاصی حد تک وہی مرحوم کرتے رہتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن محمد علی کی رہائش کی خوشخبری ایسی نہ تھی جو دل کو باغ باغ نہ کر دیتی۔ اس مسرت نے اس صدمہ کو بھی ایک حد تک دبا دیا، اور دل بے چین رہنے لگا کہ کس طرح اڑ کر محمد علی تک پہنچوں...... روایتیں معتبر اور پیہم پہنچ رہی تھیں کہ جیل سے نور مجسم ہو کر نکلے ہیں۔ سمند شوق کے حق میں یہ تازیانہ تھا۔

لیکن لوگوں نے یہ بھی کہا، اور سچ کہا کہ دہلی میں بھلا محمد علی کو بات کرنے کی بھی فرصت کہاں ہوگی؟ یوں ہی کیا کم مشغول رہتے تھے، اور اب تو گاندھی جی قید میں ہیں، ان کا بار بھی ان ہی پر آ پڑا ہے۔ کانگریس کے اجلاس کے ابھی تین چار مہینہ ہیں تو کیا ہوا، نام تو ان ہی کا صدارت کے لیے تجویز ہو رہا ہے۔ اس وقت تو بالکل ہی گھرے ہوئے ہوں گے۔ لڑکی کو دیکھنے بھوالی پہاڑ پر آخر جلد ہی جائیں گے۔ اطمینان کی ملاقات پھر اگر کہیں ہو سکتی ہے تو وہیں، اس کے قبل اور کہیں نہیں۔

رائے معقول تھی، مانتے ہی اور صبر کرتے ہی بنی۔ مراسلت کو کون روک سکتا تھا۔ جواب آنے کا تو کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اور اس کا انتظار تھا ہی کس کو، مقصود تو خط لکھ کر اپنے ہی دل کو تسکین دے لینا تھی۔ قیس عامری کو لوگوں نے دیکھا کہ کاغذ، قلم روشنائی کے بغیر بادیۂ عرب کی ریت پر انگلیوں سے قلم کا کام لے رہا ہے۔ لوگوں نے کہا یہ کیا؟ دیوانہ نے جواب دیا ؎

گفت عشق نام لیلیٰ می کنم
خاطر خود را تسلی می دہم

......☆☆☆......

ضمیمہ باب:17

(قوالی)

مولوی حاجی مسعود علی ندوی صاحب (منیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ) میرے لڑکپن کے ساتھیوں میں ہیں۔ تحریک خلافت کے ممتاز کارکنوں میں رہ چکے ہیں۔ اس وقت تک علی برادران کے مخصوص مخلصین میں تھے۔ ستمبر 23 میں مولانا کی رہائی پر دہلی ان سے ملنے گئے۔ وہاں سے واپسی پر جو خط میرے نام لکھا، وہ اس قابل ہے کہ اس باب کے ضمیمہ کے طور پر تمام وکمال پڑھ لیا جائے:

اعظم گڑھ۔ 26 ستمبر 23

مکرمی.............................سلام مسنون

افسوس ہے کہ باوجود وعدے کے میں آپ کو دہلی سے خط نہ لکھ سکا۔ دوران قیام میں وقت ایسا نہیں ملا جس کو میں اطمینان سے خط لکھنے پر صرف کر سکتا۔ ایک معمولی بات تو یہی تھی کہ کم وبیش یہ مہمان ڈاکٹر صاحب [1] کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ بہر حال میں علی گڑھ سے حضرت جوہر کو بریلی تک پہنچا کر پرسوں واپس آیا۔ مفصل کیفیت میرے لیے لکھنا ناممکن ہے۔ جیل سے مجسم نور ہو کر وہ نکلے ہیں، بات بات پر خود رو دیتے ہیں اور بہتوں کو رلا دیتے ہیں۔ امید سے بہت زیادہ مطمئن ملاقات ہوئی۔ قوال نہ لے جانے کا سخت افسوس ہوا۔ دہلی میں کافی کوشش کی

1 یعنی ڈاکٹر انصاری صاحب۔

گئی لیکن کوئی قوال نہ مل سکا۔ حسن نظامی صاحب نے انتظام کیا تھا۔ لیکن عین وقت پر وہ سخت بیمار ہو گئے۔ میاں افضل کا میں نے کافی تذکرہ کیا[1]۔ جدید نظموں کا ایک تھیلا ساتھ آیا ہے۔ تین چار مرتبہ رات کو کھلا اور ایک بڑی تعداد سننے کو ملی، جامعہ میں چھپنے کے لیے دی گئی ہیں۔ آپ کا خط دیا، پڑھ کر بہت متاثر ہوئے۔ صرف ایک جملہ کہا کہ ''ایسے مرید اگر ملے تو پیر بننا پڑے گا[2]''۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں میں نے مفصل تذکرہ کیا۔ آپ کا خط برابر جیب میں رہا اور اکثر بوقت تذکرہ اس کا کچھ حصہ جیب سے باہر نکل آتا تھا۔ بھوالی سے مفصل جواب دیں گے۔ اطمینان کی ملاقات سوا بھوالی کے اور کسی دوسری جگہ دشوار ہے، وہاں البتہ پورا اطمینان وسکون ہے، وہ لکھنؤ بھی نہیں آئیں گے۔ بھوالی سے جس وقت اتریں گے پھر ہنگاموں میں شریک ہو جائیں گے۔ یہی کہتے بھی تھے کہ کاش بھوالی آتے تو بہت اطمینان سے ملاقات ہوتی۔

اب نہایت غیر معمولی حالت پیدا ہو گئی ہے، میں نے اس سے پورا لطف حاصل کیا۔ واپسی میں زبردستی علی گڑھ ٹھہرایا۔ اس کے بعد باوجود کوشش کے مجھ کو رہائی نہیں ملی اور بریلی کے قریب تک ساتھ جانا پڑا۔ بعض نہایت دلچسپ واقعات پیش آئے۔ مثلاً ایک جگہ میں نے چپکے سے بستر کھول کر بچھا دیا۔ جب یہ معلوم ہوا اس وقت جس محبت کا اظہار ہوا اس کا لطف ابھی تک میں لے رہا ہوں۔ میں تو اب حضرت جوہر کی روحانیت ومحبت کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں، میں اور کیا لکھوں۔

......☆☆☆......

---

1 اپنی زندگی کے اس دور میں سماع کا دلدادہ تھا۔ افضل حسین میرے خاص قوال کا نام تھا۔ انھیں میں نے مولانا کی غزلیں یاد کرادی تھی۔

2 اس وقت دل میں یہی ٹھن رہی تھی کہ بیعت حضرت جوہر کے ہاتھ پر کرلیجیے۔

باب:18

2:1923

(صدر کانگریس۔ میزبانی۔ تیمارداری)

ہوتے ہوتے شروع نومبر کی کوئی تاریخ آگئی، جب میں بھوالی روانہ ہوسکا۔ لکھنؤ سے بریلی اور بریلی سے چھوٹی لائن پر کاٹھ گودام۔ یہاں سے بھوالی کے لیے لاری ملی۔ وقت کوئی 11-10: بجے دن کا۔ اتفاق سے جمعہ کا دن تھا۔ راستہ میں ایک چھوٹی سی مسجد دکھائی دی۔ جمعہ کی نماز کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ شریک جماعت ہولیا۔ بھوالی مولانا کے قیام گاہ پر قریب 2: بجے کے پہنچا...... راستہ کے شوق واشتیاق کا کیا پوچھنا۔ کہنا چاہیے کہ مرید مرشد کی خدمت میں حاضر ہورہا تھا۔ اس سے قبل کی ساری ملاقاتیں ''دور جاہلیت'' کی تھی۔ پوری طرح پر تجدید اسلام کے بعد نیاز یہ پہلی بار حاصل ہورہا تھا اور خود محمد علی بھی مجاہدوں پر مجاہدے، اختیاری اور اضطراری، دونوں طرح کے کرکر کے، خوب ہی دل دھل چکے، نکھر چکے تھے۔ آمد کی اطلاع پہلے سے دے دی تھی۔

....

2: بج چکے تھے لیکن مولانا جمعہ پڑھ کر اب تک واپس نہیں آئے تھے۔ مسجد فاصلہ پر تھی، پھر پہاڑ کے راستے اور وہ بھی بالکل اجنبی۔ جانے کی ہمت نہ ہوئی، ورنہ جی بے اختیار ہورہا تھا کہ مسجد ہی جا پہنچوں۔ ایک ایک منٹ بھاری گزر رہا تھا۔ مولانا کے اور عزیز موجود تھے، وہ بیچارے اپنی

والی ہر طرح خاطر مدارات کرتے رہے...... ہوتے ہوتے 4: بجنے کو آ گئے۔ جب کہیں مولانا واپس آئے، اشتیاق میں دو ایک فرلانگ استقبال کے لیے بڑھ گیا تھا۔ دیکھا کہ تشریف لا رہے ہیں، چہرہ کی نورانیت کا اب کیا کہنا۔ لیکن تنہا نہیں ہیں، مسجد کے امام صاحب بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ اور ان سے مولانا کسی سرگرم مباحثہ میں منہمک ہیں۔ میری طرف سرے سے دیکھ ہی نہیں رہے ہیں۔ مسجد کے سلسلہ میں کوئی انتظام در پیش تھا۔ اور اسی کے باب میں حسب عادت اتنا جوش وانہاک تھا۔

بھوالی کوئی بڑا شہر نہیں، کوئی مرکزی حیثیت نہیں رکھتا۔ ایک دور افتادہ پہاڑی مقام ہے۔ مسلمانوں کی آبادی بھی کچھ واجبی سی۔ مسلمان نہ صاحب اثر وجاہت نہ تعداد ہی میں کسی شمار وقطار میں۔ لیکن محمد علی کے اخلاص کو ان چیزوں کی پرواہی کب تھی۔ چھوٹا یا بڑا کوئی سا بھی کام مسلمانوں کا ہو، بس ان کے جوش وانہاک کے لیے یہی کافی تھا کہ کام مسلمانوں کا ہے۔ شہر اور گاؤں سب ان کی نظر میں ایک...... جتنا میں ان کے ملنے کا مشتاق تھا، اسی قدر وہ خود بھی میرے مشتاق تھے لیکن بحث کے انہاک میں کیسی دوستی اور کس کی ملاقات۔ دس منٹ، بیس منٹ، خدا جانے کتنی دیر ہوگئی۔ میں منتظر کھڑا ہوں، اور وہ مجھے دیکھ چکنے کے بعد اسی سرگری کے ساتھ بحث میں جٹے ہوئے۔ جی بھر کر تقریر واستدلال سے فارغ ہو لیے جب جا کر میری طرف ملتفت ہوئے۔ اس وقت کے التفات کا نقشہ کیا بیان ہو! معلوم ہوتا تھا کہ محبت وشفقت کے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے، اور چشمہ ہے کہ ابلا پڑتا ہے!

....

کئی دن کی یکجائی اور لطف صحبت کا موقع پہلی بار ملا۔ محمد علی اپنی اولاد کے حق میں محض باپ نہ تھے، ماں سے بھی بڑھ کر تھے۔ جان کے برابر عزیز بیٹی کی تیمارداری، وقت پر دوا پلانا، پرہیز، غذا کھلانا، سب کچھ خود ہی کرتے تھے۔ جیل سے باہر آتے ہی قوم کا حکم ملا تھا کہ سب سے بڑا قومی منصب یعنی کانگریس کی صدارت سال آئندہ کے لیے قبول کریں۔ گاندھی جی جیل میں تھے۔ محمد علی اپنی شخصیت کے لحاظ سے یوں بھی اب سب سے بڑے سیاسی لیڈر کہے جاسکتے تھے، اور پھر اس صدارت نے تو انھیں ضابطہ سے بھی ملک کا سب سے بڑا سردار بنا دیا۔ ملنے والوں اور سیاسی

کارکنوں کی کمی بھوالی جیسے کوردہ میں بھی نہ تھی، پھر ڈاک کا انبار، تار برقیوں کا ہجوم۔ ان سب مصروفیتوں کے باوجود میزبانی اور مہمان نوازی کے جوش میں ذرا کمی نہیں...... اصل کوٹھی بھی خاصی وسیع تھی لیکن مکان کے مکینوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ میرے ٹھہرنے کا انتظام اس سے ذرا الگ ایک دوسری کوٹھی میں کیا گیا۔ لیکن بجز اس کے کہ رات گئے وہاں جا کر سو رہوں، اور سارا وقت یہی گذرتا، اور مولانا کی زندگی کے سارے شعبے نظر کے سامنے آتے رہتے۔ لاڈلی اور چہیتی جوان لڑکی دق میں مبتلا اور صاحب فراش ہے۔ دیکھتے دیکھتے ہاتھ سے جا رہی ہے۔ غمزدہ باپ نے پورے دو برس کے بعد اس کی شکل دیکھی ہے۔ باہر مردانہ میں بیٹھے باتیں کرتے کرتے بے قرار ہو کر دوا پلانے یا بیٹی کا دل بہلانے کو اندر اٹھ کر چلے جاتے ہیں، پھر کچھ ہی دیر بعد باہر آ جاتے ہیں، اور ملنے والوں کو، آنے جانے والوں کو، مسلمانوں ہی کو نہیں ان میں سے ہندوؤں کو بھی کھانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اور زبردستی کھینچ کھینچ کر دسترخوان پر بٹھا رہے ہیں۔ ہندو ملنے والوں میں ایک کانگریسی کارکن بابو شمبھوناتھ سیتاپوری کا نام خاص طور پر یاد آ رہا ہے۔ وہ خود بھی بالکل عزیزوں کی طرح بے تکلف تھے اور ان کے ہاں کی عورتیں بھی۔ اور ہندو احباب بھی تھے۔ حد اعتدال سے بڑھی ہوئی مسرفانہ مہمان نوازی کے منظر بعد کو تو اور بھی دیکھنے میں آئے، پہلا منظر یہیں دیکھا۔ مولانا اچھے کھانے کے خود بھی شوقین تھے۔ ہر لذیذ کھانا بڑی ہی رغبت سے کھاتے۔ کھانے پر ماش کی کھچڑی خوب گھی کے ساتھ اکثر ہوتی۔

....

مولانا کے سالے معظم علی صاحب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا جنھوں نے برادران کی قید کے زمانہ میں بمبئی میں رہ کر خلافت کمیٹی کے کام کو خوب سنبھالا تھا، اور عرصہ تک اس کے جنرل سیکریٹری رہے تھے، اور بعد کو رامپور اور اندور کی ریاستی ہائیکورٹ کے چیف جج ہو گئے تھے، وہ بھی یہیں مقیم تھے۔ اور مولانا کے دونوں داماد زاہد علی (بڑی لڑکی کے شوہر اور مولانا کے بھتیجے) اور محمود اللہ (اسی منجھلی بیمار لڑکی کے شوہر) بھی۔ کلام جوہر کا نیا ایڈیشن جو اسی قید کے زمانہ میں جامعہ کی طرف سے شائع ہوا تھا ابھی گزر چکا ہے کہ اس پر مقدمہ اسی نیازمند کا تھا۔ اس تقریب سے شعر و شاعری کے چرچے اکثر رہا کرتے۔ کبھی اپنا کلام اپنی زبان سے سناتے۔ اپنے اشعار کی ''شان نزول'' یا

پس منظر بتاتے جاتے، اور کبھی مجھ سے فرمائش کر دیتے کہ میں اپنی خرافات سناؤں۔ مگر اس کو تو میں ہمیشہ ٹال لے جاتا، اور الٹا جھگڑ جھگڑ ان ہی سے ان کی ''تنہائی کی راتوں میں خلوت کی ملاقاتوں'' کا حال پوچھا کرتا۔ مسجد بہت فاصلہ پر تھی۔ نمازیں گھر ہی پر مختصر جماعت کے ساتھ ہوا کرتیں۔ امامت بڑے ردوانکار کے بعد مولانا کو اپنے لیے منظور کرنی پڑی تھی۔ نماز کے اوقات میں دیر سویر کے تو کچھ ایسے پابند نہ تھے لیکن جب بھی پڑھتے، خوب جی لگا کر پڑھتے۔ بعض وقت دیکھنے والے بھی اس خشوع وخضوع سے متاثر ہو جاتے۔

سیاسی بحثیں قدرتاً سب سے زیادہ وقت لیتیں۔ وقت کا معرکتہ الآرا مسئلہ داخلۂ کونسل کا تھا۔ گاندھی جی یہ طے کر چکے تھے کہ اہل ملک کو سرکاری عدالتوں، اسکولوں کالجوں وغیرہ کی طرح کونسلوں سے بھی بالکل قطع تعلق کر لینا چاہیے (اور اسی لیے تحریک کا نام ترکِ موالات تھا) علی برادران اس فیصلہ کے پرجوش داعی تھے۔ غالباً پانچ سو علما کا متفقہ فتویٰ بھی اسی کی تائید میں تھا۔ لیکن دو تین سال کی زورازوری کے بعد جب کارکنوں کے قویٰ تھکنے لگے اور گاندھی جی ابھی جیل کے باہر ہی تھے، صرف علی برادران جیل میں تھے کہ خود اس مقاطعہ کونسل کے خلاف ایک سخت ردعمل شروع ہوا۔ اور سوراج پارٹی کے نام سے ایک مستقل پارٹی حمایت داخلہ کونسل کے حق میں بن گئی۔ اچھے اچھوں کے پیر اس رو میں اکھڑ گئے۔ اور بڑے بڑے پختہ ترک موالاتی دھارے کے رخ بہنے لگے۔ علی گڑھ کے تصدق احمد خاں شروانی اور عبدالمجید خواجہ، دونوں بڑے ہونہار اور کامیاب بیرسٹر، علی برادران کے خاص مخلصین میں تھے لیکن اب یہ بھی سوراج پارٹی کے ہم زبان تھے......ایک دن یہیں بھوالی میں ایک لمبا سا تار محمد علی کے نام موصول ہوا کہ '' آپ کے بیانات تصدق شروانی کے خلاف یہاں علی گڑھ کلب میں معاندین کے لیے بڑی مسرت کا باعث بن گئے۔ خدا کے لیے اس مفاہمت کا لحاظ رکھیے اور جو ابھی دہلی میں دونوں پارٹیوں کے درمیان ہو چکی ہے'' محمد علی یہ تار پڑھ کر آگ ہو گئے اور معاً جواب لکھا کہ

I have not compromised Islam

مطلب یہ تھا کہ مفاہمت احکام شریعت میں نہیں ہو سکتی، اور مقاطعۂ کونسل تو ایک حکم شرعی ہے۔ شام کو جب گفتگو اس موضوع پر (انگریزی میں) ہو رہی تھی تو معظم صاحب بولے ''خواجہ کو یہ

تار پڑھ کر مزہ آجائے گا'' محمد علی نے معاً جواب دیا''مزہ ابھی کیا آئے گا، مزہ تو شوکت کے چھوٹنے پر آئے گا''۔ مولانا شوکت علی ابھی تک نہیں چھوٹے تھے، اور مولانا محمد علی کا مطلب ہی تھا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ اس بارے میں سخت ہیں، ہرگز اپنے رفیقوں میں سے کسی کو بغاوت پر صبر وتحمل سے کام نہ لیں گے، اور ہر ایک کی پوری پوری خبر لیں گے۔

......☆☆☆......

باب:19

3:1923

(ہم سفری۔ پہلے مسلمان اور پہلے ہندستانی)

محمد علی کو بیسیوں کام پہاڑ سے اتر کر کرنے تھے۔ جلد ہی واپسی کی ٹھہری۔ بیماری اور زار ونزار بیٹی کے پاس اس کی ماں اور شوہر کو چھوڑ، خود لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے۔ ساتھ میں معظم صاحب اور بڑی لڑکی زہرہ اور ان کے شوہر زاہد علی خان بھی ہیں۔ یہ سارا قافلہ رامپور جا رہا ہے۔ بریلی تک ساتھ رہے گا۔ میں خوش کہ مجھے لکھنؤ تک رفاقت کا موقع ملے گا۔ میں عام طور پر سفر انٹر کلاس میں کرتا تھا، اس روز معیت کی حرص میں ٹکٹ سیکنڈ کلاس کا لیا، اور جب لے چکا تو مولانا کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''آپ معمولاً جس درجہ میں سفر کرتے ہوں، کیجیے۔ میری وجہ سے کوئی فرق نہ کیجیے، میں وہیں آجاؤں گا جہاں آپ ہوں گے''۔

بھوالی سے صبح ناشتہ کے بعد کاٹھ گودام اسٹیشن کے لیے روانہ ہوئے۔ لاری کرایہ پر صبح سویرے ہی سے آگئی تھی۔ میں اگلی سیٹ پر محمد علی کے بازو میں بیٹھا تھا۔ راستہ بھر خوب باتیں رہیں۔ ایک بار میں نے کہا کہ ''آپ کی تو مفصل لائف (سوانح عمری) مرتب ہونی چاہیے۔ آپ اپنے حالات کو لکھ کر دیجیے، یا کسی کو بولتے جایئے۔ خوب ہنسے اور بولے کہ ''لکھوانے کے لیے وقت کہاں سے نکال سکتا ہوں، بس کوئی صاحب ساتھ لگے رہیں، جو کچھ

دیکھیں یا سنیں نوٹ کرتے جائیں''۔ راستہ میں لوگ ، یہاں تک کہ پولیس کانسٹبل بھی اس سرکاری مجرم اور''باغی'' کو عظمت وعقیدت کے ساتھ دیکھتے ہوئے ملے۔

....

دوپہر کو اسٹیشن پہنچے۔زمانہ محمد علی کی مقبولیت ومرجعیت کے شباب کا تھا۔مسلمان تو مسلمان، ہندو عوام بھی گرویدہ وفریفتہ۔درشن یا زیارت کرنے والوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگ گیا۔زیادہ تر عوام، جاہل اوران پڑھ، محض دور سے نظر عقیدت واحترام سے دیکھتے رہنے والے قریب آنے کی جرأت نہ کرسکنے والے۔ مال واسباب ویٹنگ روم میں رکھ دیا گیا۔ہم لوگ کبھی اندر، کبھی باہر۔عین اس وقت معلوم ہوا کہ لاری والا جو کرایہ طلب کررہا ہے، وہ بہت زائد ہے۔لاری والے سے معاملہ زاہد صاحب نے طے کیا تھا۔مولانا کو غصہ کہاں تو پہلے لاری والے پر آرہا تھا، کہاں اب اس کا رخ زاہد صاحب کی طرف پھر گیا۔اور وہیں دن دوپہر کو بھرے مجمع کے سامنے مولانا نے اپنے اس جوان بھتیجے اور صاحب اولاد داماد کو اس بری طرح اور اس طرح گرج گرج کر ڈانٹنا شروع کیا ہے کہ یہ منظر بجائے خود ایک تماشہ بن گیا۔اور جو آنکھیں شانِ جمالی کے شوق واشتیاق میں کھلی ہوئی تھیں، ان کے سامنے یک بیک یہ نظارہ شانِ جلالی کا آ گیا!......کوئی اسے عیب سمجھے یا ہنر، میں تو اسے محمد علی کا ہنر ہی سمجھتا ہوں ان میں اگر ذرا سا بھی تصنع ہوتا، تو یقیناً اس مجمع عام کے سامنے یا تو اپنے غصہ کو پی جاتے یا پھر تنہائی میں جو کچھ چاہتے کہہ سن ڈالتے، لیکن یہاں تو تصنع کا سایہ بھی نہیں پڑا تھا۔زندگی کا ہر گوشہ آئینہ کی طرح واضح ، شفاف اور روشن تھا۔کبھی اس کی فکر ہی نہ کی، کہ معتقدین کیا خیال کریں گے۔اور بہت سے عقیدت مند ہاتھ سے نکل جائیں گے۔جو کچھ دل میں آ گئی ، بے جھجک کہہ اٹھے۔ جو کچھ سمجھ میں آ گیا، بے دھڑک کر گذرے۔مخلوق سے ڈرنا اور خلقت کے خیال کی پرواکرنا شاید کبھی جانا ہی نہیں۔

....

راستہ بھر کھاتے پیتے، اخبار خریدتے، ظہر،عصر،مغرب نمازیں پڑھتے پڑھاتے کچھ رات گئے بریلی اسٹیشن پہنچے اور یہیں نماز عشاء پڑھی گئی۔چھوٹی لائن کا سفر ختم ہوا۔اور یہاں سے بڑی لائن لکھنؤ کے لیے ملی۔مرادآباد کے قاضی عبدالغفار جو ایک زمانہ میں ہمدرد کے سب

ایڈیٹر رہ چکے تھے، اور اس وقت تک ان کا شمار مولانا کے مخلصین میں تھا، یہیں ملنے آ گئے تھے، داخلۂ کونسل کے فتنہ میں وہ بھی مبتلا تھے۔ پلیٹ فارم پر مولانا انھیں خوب خوب قائل کرتے رہے۔ مولانا کے سیکریٹری حیات صاحب یہیں سے شریک سفر ہوئے۔ کھانے کے لیے پلیٹ فارم پر ایک وسیع دستر خوان بچھا۔ اور مولانا نے میرے ملازم کو یہی نہیں کہ بڑا اصرار کر کے کھانے میں شریک کیا بلکہ بٹھایا بھی اپنے بالکل قریب ہی...... میرے لیے یہ منظر نیا بھی تھا اور سبق آموز بھی۔ آقا اور غلام کی مساوات سے متعلق خلفائے راشدینؓ کے کارنامے جو کچھ بھی رہے ہوں، کتابوں میں خادم ومخدوم، خدمتگار و مالک کے باہمی حقوق کے متعلق جو کچھ بھی پڑھا ہو، ان مادی آنکھوں سے، اس بیسویں صدی میں اس منظر کی توقع کس کو ہو سکتی تھی، اور وہ بھی کسی زاہد خلوت نشین کے ہاں نہیں، وقت کے نامور ترین سیاسی لیڈر کے ہاں!

....

لکھنؤ میں اب کی دعوتوں، ضیافتوں، ایڈریسوں کا سلسلہ تھا کہ برابر پھیلتا ہی چلا جاتا تھا۔ سہ پہر کو مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کی طرف سے ''چائے'' دی گئی اور ایڈریس پیش ہوا۔ جلسہ کی صدارت مولانا عبدالباریؒ کی تحریک پر اس نااہل کے حصہ میں آئی۔ محمد علی کے سامنے بولنے کی ہمت کیا ہوتی۔ اور کہتا بھی تو آخر کیا کہتا۔ صدارت اسی لیے بلا انکار قبول کر لی، کہ ایک اور موقع محمد علی کے ساتھ انتساب کا ہاتھ آیا جا رہا تھا۔ تقریر صرف مولانا ہی کی ہوئی۔ صدر تو گونگا تھا ہی، حاضرین بھی سب کے سب گم سم بنے رہے۔ معا بعد شہر کے دوسرے حصہ میں فرنگی محل سے کئی میل دور، میونسپل بورڈ کی طرف ایڈریس پیش ہوا۔ محمد علی صاحب اب کانگریس کے صدر منتخب تھے۔ اور ہر طرف ہاتھوں ہاتھ لیے جا رہے تھے..... شام کو بعد مغرب امین الدولہ پارک میں عظیم الشان پبلک جلسہ منعقد ہوا۔

لکھنؤ کے لیڈر، اور لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر، چودھری خلیق الزماں صدر جلسہ ہوئے۔ بی اماں مرحومہ بھی غالباً موجود تھیں۔ جلسہ میں ہندو بھی اچھی بڑی تعداد میں تھے۔ لیکن مسلمان تو اتنی بڑی تعداد میں عرصہ ہی کے بعد جمع ہوئے تھے۔ خلافت و ترک موالات کا جوش وخروش 22 میں ختم ہو چکا تھا، اور اب تو 23 قریب ختم تھا۔ سارے ملک میں شدھی اور سنگٹھن کی آگ بھڑک

چکی تھی، اور مسلمان ان کے مقابلہ میں تبلیغ و تنظیم کی انجمنیں قائم کر چکے تھے۔ خاص شہر لکھنؤ اور گردونواح میں تلخ و ناگوار باہمی قضیے پیش آ چکے تھے۔ ایک شریر قسم کے ہندو نے ہینڈ بل تقسیم کرنے شروع کر دیے کہ یہ محمد علی وہی جنھوں نے جامع مسجد علی گڑھ میں ایک تازہ تقریر میں کہا ہے کہ میں ایک فاجر و فاسق مسلمان کو بھی گاندھی جی پر ترجیح دیتا ہوں۔ ایسا شخص بھلا کانگریس کا صدر کیسے مانا جا سکتا ہے؟ اشتہار خاصہ اشتعال انگیز تھا۔ عین جلسہ میں کسی نے صدر جلسہ کو مخاطب کر کے یہی سوال بھی کر دیا۔ مولانا کی پرزور تقریر جاری تھی۔ پنڈت موتی لعل نہرو نے کوئی بیان داخلۂ کونسل کی حمایت ووکالت میں دیا تھا۔ اسی بیان کی دھجیاں مولانا ایک ایک کر کے اڑا رہے تھے کہ اس شخص نے یہ سوال کر دیا۔

....

احباب و مخلصین کچھ پریشان سے ہو گئے۔ بہتوں نے کہا کہ سوال بالکل بے محل ہے۔ خود صدر جلسہ نے سائل کو خاموش ہو جانے اور بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ لیکن ہزاروں کے اس مجمع میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو سوال سے مطلق نہ گھبرایا، وہ دل میں پورا اطمینان رکھے ہوئے تھا، اور وہ شخص خود محمد علی تھا!......صدر نے سائل سے پکار کر کہا ''آپ بیٹھ جائیے۔ میں سوال کی اجازت نہیں دیتا''۔ معاً محمد علی چمک کر بولے ''مگر میں اجازت دیتا ہوں، آپ اپنے سوال کا جواب لیجیے''۔ اور اس کے بعد یوں گویا ہوئے:

''علی گڑھ میں میں نے جو کچھ کہا اسے دہرانے کے لیے یہاں بھی تیار ہوں اور ہر جگہ۔ گاندھی جی اس وقت آزادیٔ ملک کے لیے جو خدمت انجام دے رہے ہیں ان کے لحاظ سے وہ اپنی نظیر نہیں رکھتے اور جہاں تک ان کی بیش بہا خدماتِ وطن کا تعلق ہے میں مہاتما جی کو اپنے ہی سے افضل نہیں، بلکہ اپنی والدہ سے بھی زیادہ قابل تعظیم اور اپنے پیرومرشد حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بھی بڑھ کر قابل احترام سمجھتا ہوں۔ لیکن ایک دوسری حیثیت اعتقاد وایمان کی ہے۔ میں عقیدتاً مسلمان ہوں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ عقیدۂ اسلام کو اور تمام عقائد سے کہیں بہتر و اعلیٰ تر سمجھتا ہوں اور اس لحاظ سے یعنی جہاں تک عقائد ایمانی کا تعلق ہے، میں اکیلے گاندھی جی ہی سے نہیں تمام ہندوؤں، تمام عیسائیوں، تمام غیر مسلموں کے مجموعہ سے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان، ہر بد

عمل سے بدعمل کلمہ گو کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اسلام کی افضلیت میرا جزو ایمان ہے۔ اگر آج میں خدانخواستہ اس کا قائل نہ رہوں تو پھر مسلمان رہنے کی بھی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ میری بات کوئی انوکھی بات نہیں۔ جس طرح میں اپنے عقیدہ کی افضلیت کا قائل ہوں، اسی طرح ہر مذہب والا اپنے عقیدہ کو افضل تسلیم کرتا ہے۔ کیا پنڈت مدن موہن مالویہ جی اپنے عقیدہ کو سب سے افضل خیال نہیں کرتے؟

یہ الفاظ آج کاغذ پر چھپے ہوئے وہ بھی اتنی مدت دراز کے بعد، ممکن ہے کہ کچھ زیادہ مؤثر نہ معلوم ہوں، لیکن جس وقت ہزاروں کے مجمع میں ایک زندہ شخصیت کی زبان سے، پورے جوش وخروش کے ساتھ، آواز کے مناسب حال اتار چڑھاؤ کے ساتھ ادا ہوئے ہیں، تو معلوم ہوتا تھا کہ بجلی کی ایک روسی دوڑ گئی ہے۔ دشمن سناٹے میں آگئے۔ دوستوں کے چہرے چمک اٹھے، خوب تالیاں بجیں، خوب تائید ومسرت کے نعرے بلند ہوئے...... یہ جرأت وہمت اللہ نے بس محمد علی ہی کو دی تھی کہ عین اجلاس کانگریس کے قرب میں، اس کا صدر منتخب ہو چکنے پر، ہزارہا کے مجمع عام میں ہندوؤں، پارسیوں، عیسائیوں کے سامنے اپنے اسلام اور اپنی اسلام پرستی کا اعلان اس صفائی، دلیری کے ساتھ کر دیا۔ ورنہ یہاں تو ایسے ایسے مسلمان بھی، اور عوام نہیں اچھے اچھے اونچے اور چوٹی کے معززین بلکہ طبقۂ علما میں شامل دیکھنے میں آئے ہیں، جنھوں نے کانگریس پارٹی میں، کانگریس کے جلسوں میں اور کانگریسی سرکار میں اپنی بات رکھنے کے لیے اپنی اسلامیت کو ذلیل وخوار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی!

......☆☆☆......

باب:20

4:1923

(خطبہ صدارت۔جلاوطنی)

اب کے محمد علی کا قیام لکھنؤ میں کئی دن رہا۔آئے بھی تو بہت عرصہ کے بعد تھے۔اپنا مشغلہ اس وقت سماع کا زوروں پر تھا۔یہ زندگی کا وہ دور ہے کہ بحمد اللہ از سر نو مسلمان ہوئے تو مجھے مدت ہو چکی ہے،لیکن غلبہ دل ودماغ پر ابھی تک اہل حال صوفیہ ومشائخ کا ہے۔ان ہی کی صحبتیں اور مجلسیں اور ان ہی کی کتابیں،ملفوظات وغیرہا۔آج شرکت اس عرس میں ہو رہی ہے،کل حاضری اس درگاہ پر ہو رہی ہے۔محمد علی بھی ان مشغلوں سے محتاط نہ تھے۔بلکہ اچھی قوالی کے تو عاشق تھے۔ایک روز صبح میں نے اپنی قیام گاہ لکھنؤ (خاتون منزل،احاطہ فقیر محمد خان) پر ناشتہ کی دعوت دی اور اچھے قوالوں کی ایک چوکی بھی بلا دی......مولانا جب تشریف لائے ہیں اور کمرہ میں داخل ہونے کو قدم رکھ رہے ہیں تو معا میرے اس ملازم پر نظر پڑی جسے ابھی بریلی اسٹیشن پر اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلا چکے تھے،پہچان کر بھرے مجمع میں اس سے بغل گیر ہو گئے۔وہ بیچارہ باغ باغ اور دوسرے لوگ دنگ وحیران۔

مولانا حاضرین میں سے بڑے چھوٹے ایک ایک سے ملے۔جن کو پہلے سے جانتے پہچانتے تھے ان سے بھی،اور جو ان کے لیے اجنبی محض تھے،ان سے بھی۔سب سے یکساں اخلاق

اور تپاک۔ مسلمانوں کو محمد علی (اور شوکت علی) ہی کی زندگی دیکھ کر یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ کوئی لیڈر صاحب (اور چوٹی کے لیڈر) عوام سے اتنا بے تکلف ہو سکتے، اتنا خلا ملا رکھ سکتے ہیں۔ ورنہ اب تک کسی لیڈر کے ہاں رسائی صرف خواص ہی کی ہو سکتی تھی۔ قوم کا کام تو صرف ان کی گاڑیاں کھینچنا، ان پر پھول برسانا، ان کے لیے جلوس نکالنا تھا...... خیر قوالی کی محفل کچھ دیر خوب گرم رہی۔ اور محمد علی خوب روتے رلاتے رہے، خاص کر نعتیہ مضامین پر۔

ایک لطیفہ یہ ہوا کہ عین سماع شروع ہونے کے وقت میری بڑی بچی جو اس وقت 4 سال کی تھی، محمد علی کے قریب سلام کر کے آبیٹھی۔ ان کو تو ہر بچہ بچی سے عشق ٹھہرا، چہ جائیکہ اپنے ایک نیازمند کی بچی سے۔ جھٹ اسے گود میں بٹھا، اسے کھیلانا شروع کر دیا۔ اس کے گلے سے اس کا دوپٹہ اتار اس کے سر پر پگڑی باندھنے لگے۔ میں سخت جز بز کہ عین سماع کے قوت یہ تفریح اور کھیل کیا معنی۔ یہ تو آداب محفل کے بالکل ہی خلاف ہے۔ اس وقت تو ساری توجہ التفات ادب واحترام کے ساتھ کلام ونغمہ کی طرف دینی چاہیے۔ میں تو اسی ادھیڑ بن اور انقباض خاطر میں، ادھر دیکھتا کیا ہوں کہ اس وقت ساتھ ہی محمد علی سماع کی طرف بھی پوری طرح متوجہ وملتفت، ہمہ تن متاثر بلکہ آنکھوں سے آنسوں جاری!...... درد وگداز کے لیے ہمہ وقت اتنی حاضر طبیعت کمتر ہی دیکھنے میں آئی ہے۔

....

دارالعلوم ندوہ کا کتب خانہ اس وقت تک خاتون منزل کے گویا پڑوس ہی میں تھا۔ میرے عزیز جوانمرگ دوست مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی مرحوم (استاد دارالعلوم) ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے تھے۔ طلبۂ ندوہ کی طرف سے ایک مختصر اور ہلکی دعوت چائے کی انھوں نے بھی کتب خانہ کی عمارت میں مرتب کر دی۔ دیر بہت ہو چکی تھی، دوپہر ہونے کو تھی اور چائے کا اب کوئی وقت رہا نہ تھا۔ پھر بھی میزبانوں کے اصرار سے مولانا کو دعوت قبول کرنی ہی پڑی۔ ادھر نگرامی مرحوم نے ایک مختصر تقریر اس مضمون کی کر دی کہ سیاسی تقریریں تو بہت سے موقعوں پر ہم سن لیں گے اس وقت تو ہم طلبۂ ندوہ یہ چاہتے ہیں کہ ''تنہائی کی راتوں'' میں ''خلوت کی ملاقاتیں'' جو آپ کے نصیب میں آئی ہیں، ان سے ہمیں بھی مستفید فرمایا جائے۔ نگرامی مرحوم

بڑے گہرے دیندار اور صالح نوجوان تھے۔ مولانا ان کی تقریر سے متاثر بھی ہوئے اور محظوظ بھی۔ لیکن اس فرمائش کے جواب میں فرمایا "میرے عزیز بھائی، تم بھی ایک شاعر کی بات کا اعتبار کر بیٹھے، شاعر تو اپنی خیالی دنیا میں کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔ اس سے ان چیزوں کا ثبوت علمی دنیا میں طلب کرنا تو بڑی زیادتی ہے"......اب اللہ جانے شاعری اس نعتیہ غزل میں زیادہ تھی یا اس نثری جواب میں!

خیر، یہ باتیں تو لطائف کے تحت میں بھی رکھی جاسکتی ہیں، باقی اصل حقیقت مجھ سے راز کے طور پر (اور یہ راز شاید آج پہلی ہی بار ظاہر ہو رہا ہے) میرے اصرار پر ایک بار وہیں بھوالی کے قیام میں یہ ارشاد ہوئی تھی کہ خواب میں زیارتیں تو نصیب میں نہ آئیں، البتہ ایک بار بیجاپور جیل میں دوپہر کے وقت نیم بیداری کی حالت میں ایک ہلکا اور دھندلا سا پرتوِ جمالِ محمدؐ آناً فاناً نظر آیا تھا......اللہ اکبر! جس جمال کی زیارت خواب میں بھی، اچھے اچھے خوش نصیب اپنے لیے خوش نصیبی سمجھیں، اس کے دیدار سے نیم بیداری ہی میں مشرف ہو جانا کوئی معمولی درجہ کی خوش بختی اور نصیبہ وری ہے!

....

قیدی جب جیل سے چھوٹتے ہیں تو سیدھے اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ اور غریب سے غریب قیدی بھی کوئی نہ کوئی اپنی جھونپڑی کہیں رکھتا ہے۔ محمد علی غریب کا گھر اب تھا کہاں؟ رام پور وطن تھا، وہاں ان کی پختہ حویلیاں تھیں، وہاں ان کا بچپن گذرا تھا، لڑکپن گزرا تھا، جوانی کا ایک حصہ گذرا تھا۔ گھر کے صحن میں یہ دوڑے تھے، کھیلے کودے تھے، گھر کے مکتب میں یہ پڑھنے بیٹھے تھے، وہیں شادی بیاہ ہوا تھا، دعوتیں، ضیافتیں، جلسے سب ان ہی کمروں میں ہوئے تھے۔ رامپور کے چپہ چپہ سے، گلی گلی سے محمد علی کا دل اٹکا ہوا تھا۔ اب وہاں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ "اسلامی ریاست" کے فرمانروا ہز ہائنس نواب حامد علی خان بہادر والیٔ رام پور کا فرمان قضا تو یہی تھا!......محمد علی ہی کے دردانگیز لفظوں میں ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے　　　ہم نہ تھے ان کے آستانے کے

گھر والوں پر کچھ بھی گزر جائے، بیوی، بچیاں، ماں، بہن، کوئی بھی بستر مرض پر کیا معنی

بستر مرگ پر بھی ہو، مجال نہ تھی کہ محمد علی اور شوکت علی رامپور اسٹیشن سے آگے شہر کی طرف قدم اٹھا سکیں۔ بیمار ہی کو جس طرح بن پڑتا لاد پھاند کر شہر سے اسٹیشن کے ویٹنگ روم تک لے آتے!......اللہ کے گھر کی خدمت کا عزم وحوصلہ رکھنے والے کو سزا اس دنیا میں یہ خوب ملی کہ خود اسی کو بے گھر بےدر کر دیا گیا۔

بیمار مدقوق لڑکی جب اسی نومبر ہی کے مہینہ میں پہاڑ سے حالتِ یاس میں واپس لائی گئی، تو یہی سوال اپنی مہیب صورت کے ساتھ منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے، کھڑا تھا کہ اس دکھیارے قافلہ کو لے کر آخر کہا جایا جائے......ناظرین آگے بڑھنے سے قبل ذرا اس صورت حال کا تصور، وضاحت کے ساتھ اپنے ذہن کے سامنے لے آئیں کہ خدانخواستہ اگر اس کا کوئی واقعہ ہم کو پیش آجائے تو کیا گزرے! اللہ کی شان کہ 7 کروڑ مسلمانوں کا مقبول ترین اور محبوب ترین لیڈر اور خود ملک ہندوستان کا بھی نامور لیڈر اور کانگریس کا صدر اس کے اوپر وطن کی سرزمین یوں تنگ۔

خیر جوں توں علی گڑھ پہنچے۔ جامعہ ملیہ ابھی تک علی گڑھ ہی میں تھی، دہلی منتقل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے احاطہ میں ایک بنگلہ لے کر رہنے لگے۔ اس خانہ بدوشی میں یہی ان کا وطن تھا۔ معاش کا سہارا ابھی کہیں سے بھی نہ تھا۔ نور نظر کی مہلک علالت سب پر مستزاد۔ بیچارہ کو قومی وملی مصروفیتوں سے مہلت اتنی بھی نہ ملتی کہ تیمارداری جی بھر کر کر سکیں۔ کہا کرتے تھے کہ قومی وملی مصائب نے میرے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل لیا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ساحروں کے سانپوں کو نگل گیا تھا!

....

کانگریس کی صدارت سر پر آگئی تھی۔ اور انھیں سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی۔ گاندھی جی کی اسیری کے باعث نگاہیں سب کی ان ہی کی طرف لگی ہوئی، دوسرے صدر نشین حضرت کا طریقہ یہ رہا تھا کہ خطبۂ صدارت ہفتوں نہیں، مہینوں پیشتر سے لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ فرصت واطمینان کے ساتھ لکھتے، مسودہ میں بار بار کانٹ چھانٹ کرتے، دوستوں، رفیقوں سے صلاح ومشورہ کرتے جاتے، یہاں ان میں سے کوئی شے نصیب نہ تھی۔ کانگریس کا اجلاس جنوبی ہند کے شہر کوکناڈا میں۔ یہ خود شمالی ہند کے شہر علی گڑھ میں۔ یہاں سے وہاں تک ریل کا راستہ بھی اس

زمانہ میں چار دن کا! ایڈریس کا مسودہ وسط دسمبر تک قطعاً تیار ہو جانا چاہیے تھا۔ کئی دن تو اس طویل و عریض ایڈریس کے چھپنے میں لگ جاتے۔ پھر اس انگریزی تقریر صدارت کا ترجمہ بھی اردو، ہندی، بنگلہ، کئی کئی زبانوں میں ہوتا تھا۔ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں تو یہ خدا خدا کر کے ایڈریس لکھنے بیٹھے۔ 6 دسمبر کو صبح مجھے یہ 5 دسمبر کا حکم نامہ تار پر ملا کہ:

''ایک ہفتہ کے لیے علی گڑھ فوراً آجایئے۔ خطبۂ صدارت کے اردو ترجمہ کے کام کے لیے آپ کی ضرورت ہے''۔

میں باوجود مولانا کی اس عقیدت واحترام کے بہر حال اپنا بھی ایک پروگرام رکھتا تھا، فوراً نقل وحرکت ممکن نہ ہوئی۔ عذر و معذرت لکھ بھیجی، تار سے بھی اور خط سے بھی۔ 11 دسمبر کو دوسرا تار موصول ہوا:

''کلام جوہر کا بھی جدید ایڈیشن زیر طبع ہے۔ اس کا مقدمہ ضروری ہے، مہربانی کر کے فوراً آیئے۔ کوئی حیلہ مسموع نہ ہوگا۔ میر محفوظ علی آگئے ہیں وہ بھی آپ کو بلا رہے ہیں۔ محمد علی''

میر محفوظ علی بی اے (ملائے بدایونی) کا نام پہلے کئی بار آچکا ہے۔ مولانا کے خصوصی مخلصین میں تھے۔ ہمدرد کے دور اول کے منیجر رہ چکے تھے۔ کامریڈ کے اجرا میں ان کے مشورہ کو بھی بڑا دخل تھا۔ اردو کے ادیب، ظریف، انشاء پرداز۔

......☆☆☆......

باب:21

1923-24

(میر محفوظ علی۔ خاتمۂ خلافت)

13 دسمبر کو شب میں لکھنؤ سے براہ بریلی علی گڑھ کے لیے روانہ ہوا۔ یہ گاڑی اتنی لیٹ گئی کہ بریلی جنکشن سے علی گڑھ کی گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ بہ صد خرابی 14 کو عشاء کے وقت علی گڑھ پہنچا۔ نور الرحمٰن جامی اسٹیشن پر پیشوائی کو آگئے تھے۔ میر محفوظ علی صاحب کے لیے ایک وسیع خیمہ الگ نصب تھا۔ اسی میں جگہ ملی۔ یہ ملائے بدایونی بھی بڑے چھپے رستم نکلے۔ دیکھنے میں ٹھیٹھ دنیادار، علی گڑھ کے گریجویٹ، ادھر پچھلی رات ہوئی کہ آپ چوروں کی طرح اٹھے، دبے پاؤں چلے، اور وسط دسمبر کی شدید سردی میں باہر جا کر وضو کر کے آئے، تہجد پڑھ رہے ہیں، اپنی والی بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ چوری پھر بھی کھل ہی گئی۔ میری نیند کھٹکے کی ہے، آنکھ کھل جاتی، اور لحاف کے اندر سے لیٹے لیٹے اس جواں ہمت سفید ریش کے اخفائے عبادت کے تماشے دیکھا کرتا۔ خاطر داریوں کی محمد علی کے ہاں کیا کمی۔ زبردستی کی مہمانداریاں جب بن بلائے ہوؤں کی ہوا کرتیں، تو میں تو نا خواندہ نہیں، خواندہ تھا، چائے اور ناشتہ اور کھانے کا ایک چکر تھا کہ صبح سے شروع ہو کر بڑی رات گئے تک جاری رہتا۔

خطبۂ صدارت معلوم ہوا کہ ابھی تک صرف نصف ہو پایا ہے!

صورت حال اتنے فقرہ سے سمجھ میں نہ آئی ہوگی، سمجھ لیجیے۔مولانا کو 24 کو کناڈا پہنچنا لازمی ،اور اس کے لیے علی گڑھ سے 20 کو شب میں براہ دہلی روانہ ہوجانا لازمی، اور یہاں 15 کی صبح تک تصحیح ونظر ثانی ہونا الگ رہا۔ مسودہ کی تکمیل تک ابھی 50 فیصدی باقی! طباعت اور پھر ترجموں کے مرحلوں کا ذکر ہی نہیں!......کوئی خطبۂ صدارت کانگریس کی ساری تاریخ میں اتنی پریشان خاطری اورابتری کے عالم میں کیوں لکھا گیا ہوگا۔''یک سر و ہزار سودا'' کی مثل پوری طرح صادق آرہی تھی۔ ابھی اندر سے لب مرگ محبوب وعزیز بیٹی کے بستر کے پاس سے اٹھ کر آئے ہیں آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں کہ ایڈریس لکھنا شروع کر دیا۔ اور جہاں سے چھوڑ کر گئے تھے وہیں سے آگے بولنے لگے۔ چند ہی منٹ ہور ہے ہوں گے کہ ایک مہمان صاحب وارد ہو گئے۔ آپ پنجاب کے صوبہ خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہیں۔ ایڈریس روک اب ان سے بحث ومباحثہ اہل پنجاب کی خطا کاریوں اور قصور واریوں پر شروع ہوگیا۔ وہ اٹھے ہی تھے کہ کسی شامت کے مارے نے اقبال کی شاعری کا ذکر چھیڑ دیا، اور اب یہی مستقل موضوع گفتگو بن گیا۔ اتنے میں اسی محبوب بیٹی کے دوا پلانے کا پھر وقت آ گیا۔

....

نشیب وفراز سے زندگی خالی کس کی ہوسکتی ہے۔ کچھ روز قبل کا ذکر ہے کہ مولانا کے مرشد مولانا فرنگی محلی کی زندگی میں ایک واقعہ ایسا پیش آگیا، جس کا تعلق تمام تر ان کی خانگی زندگی سے تھا اور ان کی سیاسی وقومی زندگی سے تعلق نہ تھا، پھر اس کا کوئی پہلو خلاف شریعت بھی نہ تھا۔ البتہ رسم ورواج سے ہٹا ہوا تھا۔ مخالفین کو ایک موضوع ہاتھ آگیا، لے اڑے۔ اور مولانا ہی کے ایک عزیز قریب کی (جو فرنگی محلی نہ تھے) روایتوں سے میں خود بھی متاثر ہوگیا تھا۔ بعض منچلوں نے تو کمال ہی کیا۔ لمبے لمبے گمنام خط مولانا فرنگی محلی سے بدظن کرنے کے لیے محمد علی ہی کو نہیں، پنڈت موتی لعل نہرو (اور خدا جانے اور کن کن سیاسی لیڈروں) کو لکھ بھیجے۔ پنڈت جی نے ذکر محمد علی سے کیا کہ آپ کے مرشد کی یہ کیا داستانیں لکھ لکھ کر آ رہی ہیں۔ مولانا اس پر ان کے سامنے بھی بہت ناخوش ہوئے۔ اور خود میرے سامنے بھی گمنام خطوط نویس کی خوب خبر لیا کیے۔ یاد نہیں پڑتا کہ یہ موضوع چھڑا کیسے۔ میں نے شروع کیا، یا خود مولانا نے بہر حال مولانا کی ناخوشی خوب یاد ہے۔

اور یہ بھی خوب یاد ہے کہ میں نے بھی دبی زبان ان الزامات کی تائید کرنی چاہی تھی، تو خود مجھ پر بھی ڈانٹ پڑی تھی۔ ایسے چلے ہوئے طریقوں سے جو قومی کارکنوں کو خواہ مخواہ بدنام کرنے اور ان پر گندگی اچھالنے کے لیے استعمال ہوتے رہتے ہیں، محمد علی سخت بیزار رہتے تھے۔

بمبئی کی طرف کے ایک زود نویس نوجوان، قوم کے پارسی، مسٹر ماسٹر انگریزی میں ایم اے، اس وقت مولانا کے گویا سکریٹری اور کاتب تھے۔ اصل میں جامعہ پریس کے منیجر تھے۔ اور بعد کو کامریڈ پریس کے بھی منیجر کچھ روز تک رہے۔ مولانا زبانی بولتے جاتے، یہ لکھتے جاتے۔ معاً بعد مسودہ ٹائپ ہو جاتا اور ہر ٹائپ شدہ صفحہ کی چار چار کاپیاں ہو کر مختلف مترجموں کو ترجمہ کے لیے دے دی جاتیں۔ دو ایک دن بعد یہ تجربہ بھی بہت زیادہ وقت لینے والا ثابت ہوا۔ اور مسودہ پہلے لکھ کر ٹائپ کرانے میں بڑی طوالت نکلی۔ اب تسوید کو درمیان سے ہٹا دیا گیا، اسٹینوگرافر اپنی مشین لے کر مولانا کے ہاں بیٹھ گئے اور اب الفاظ ادھر مولانا کی زبان سے ادا ہوتے، ادھر براہ راست مشین پر ٹائپ ہوتے جاتے۔ اور ٹائپ شدہ ورق فوراً پریس میں چھپنے کو چلے جاتے۔...... پھر چھپے ہوئے ایڈریس کی ضخامت انگریزی میں 22x28 کی تقطیع پر 134 صفحہ کی !...... کتاب کی کتاب اتنی ضخیم، بطور خطبۂ صدارت کبھی کیوں تیار ہوئی ہوگی! اور وہ بھی اس بھاگ دوڑ کے عالم میں !...... محمد علی غریب اپنے لیے تقدیر میں کچھ یہی لکھوا کر لائے تھے۔ ہر ہر کام اسی مضطربانہ عجلت کے ساتھ کرنا پڑتا۔ سکون واطمینان کے ساتھ پہلے مسودہ کریں، پھر اسے کانٹیں چھانٹیں، اس کی نظر ثانی واصلاح کریں، احباب خصوصی سے اس کے متعلق مشورہ کریں، یہ باتیں شاید ان کی کسی ایک تحریر کے بھی حصہ میں کبھی نہ آئیں۔ محمد علی آخر عاشق تھے، عشق کی شوریدگی زندگی کے ایک ایک شعبہ میں نمایاں!

ادھر مشغولی کا یہ عالم، اور وقت کا ایک ایک منٹ قیمتی، ادھر یہ کیسے ممکن کہ مہمان کی خاطر داریوں میں کوئی ذرا فرق پڑ جائے۔ اور خیر جو واقعی مہمان ہوں ان ہی تک یہ حوصلۂ میزبان محدود رہتا، جب بھی غنیمت تھا۔ یہاں تو یہ نظارہ بھی ان آنکھوں نے دیکھا کہ جامعہ کے استاد جو ماشاءاللہ اپنے اپنے گھر رکھتے ہیں، اپنی مستقل تنخواہیں رکھتے ہیں۔ وہ کہیں نماز میں یا ادھر ادھر دکھائی دیے اور اب مولانا انھیں پکار پکار کر بلا رہے ہیں اور زبردستی اپنے ساتھ دسترخوان پر

بٹھا رہے ہیں!......خدا جانے دوسروں کو کھلانے پلانے کے لیے اتنی وسعت دل میں کہاں سے آ گئی تھی۔ مہمان نواز اور سیر چشم مولانا شوکت علی بھی تھے لیکن اپنے حدود کے اندر، یہ بے تکان مہمان نوازی محمد علی ہی کا حصہ تھی۔

پریس کی مشینیں اب زور وشور سے حرکت میں آ ئیں۔اور چھپائی کا کام دن ہی دن نہیں آدھی آدھی رات تک ہوتا رہا۔ایڈریس کی لکھائی اور ٹائپ کرائی تو کہیں جا کر 20 کی شام کو ختم ہو پائی۔اور مولانا اسی شب کو غالباً ایک بجے روانہ ہو گئے۔ان کے لیے آخری ٹرین یہی تھی۔ ایڈریس چھپ کر اس وقت تک بھی نہ تیار ہو پایا۔دوسرے دن ایک خاص قاصد کے ہاتھ اس کی کاپیاں روانہ ہوئیں۔کانگریس کا عام اجلاس یہ غنیمت ہوا کہ 24 کو نہیں، 26 سے شروع ہونے والا تھا۔اس لیے اتنا موقع بھی مل گیا۔یہ سرگزشت تو اصل ایڈریس کی ہوئی۔باقی ترجمہ ظاہر ہے کہ ہم لوگ اس برق رفتاری سے کیوں کر کر سکتے تھے۔ترجمہ یوں بھی آسان نہ تھا۔ایک ایک فقرہ میں خدا معلوم کتنے کنایے، کتنی تلمیحات ہوتی تھیں۔اور پھر جا بجا مختلف علوم وفنون کی اصطلاحیں یہ عیب ہونا ہنر، بہر حال محمد علی کی تحریروں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا تھا بڑا دشوار کام۔اور پھر وقت کی تنگی نے تو اس وقت سب کے ہاتھ پیر پھلا رکھے اور حواس گم کر رکھے تھے۔یہ ٹھہری کہ جامعہ ہی کے چند ہونہار اور سینئر طلبہ کے درمیان ایڈریس کے مختلف اجزا تقسیم کر دیے گئے۔نظر ثانی اور اصلاح کا کام اس خاکسار اور میر محفوظ علی کے سر رہا۔اصل ترجمہ ان ہی بیچاروں نے کیا۔ہم لوگ نظر ثانی تک رہے، اور وہ بھی جی کھول کر نہ کر سکے......محمد علی نے بلایا ہم دونوں کو کس چاؤ کے ساتھ تھا۔ہم لوگ ادائے خدمت میں کس قدر قاصر رہے، اس کا رنج دل کو آج تک ہے۔

لڑکی بیچاری کی حالت اس وقت بھلا اس قابل تھی کہ ناز بردار اور عاشق زار باپ اسے چھوڑ اتنے دور دراز سفر پر روانہ ہو جائے۔لیکن قومی فریضہ کی ادائی کے سامنے بہر حال دل کو مارنا پڑا۔ اور محمد علی کی زندگی تو اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

....

24 میں جس طرح محمد علی صدر کانگریس ہو کر سارے ملک کے سردار منتخب ہوئے، اسی طرح

یہ سنہ ان کی زندگی میں عام الحزن یا سالِ غم کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ بڑے سے بڑے صدمے شاید اسی سال کے لیے اٹھ رہے تھے۔ جوان مدقوق بیٹی نے مارچ میں داغ مفارقت دیا۔ اور رونے والے باپ کے آنسو ابھی رواں ہی تھے کہ خبر آئی مصطفیٰ کمال نے ادارۂ خلافت اسلامیہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا! محمد علی کے دل و دماغ پر گویا بجلی گر پڑی۔ جس خلافت کے تحفظ کی خاطر برسوں سے اپنے جان و مال کی بازی لگائے ہوئے تھے، جس کی خاطر جیل کی سختیاں اٹھائیں۔ بے زر، بے گھر، بے در ہو کر رہے، تارک الوطن ہونا پڑا۔ جمع پونجی لٹا کر کھکھ ہو گئے۔ دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا، اس کا انجام دشمنوں اور یورپی قوموں کے ہاتھوں نہیں، ایک ترک اور اپنے کو مسلمان کہلانے والے کی ایک جنبش قلم سے دیکھ کر، محمد علی پر جو کچھ گذری اسے بس عالم الغیب ہی جان سکتا ہے، دشمنوں، خصوصاً انگریزی اخباروں کے طعنہ اور زہر خند اصل صدمہ پر مستزاد! حیرت اسی پر ہے کہ دیوانگی کی نوبت کیوں نہ آ گئی۔ اپریل میں محبوب و عزیز بھائی، مولانا شوکت علی دہلی میں علیل اور سخت علیل ہوئے۔ مہینوں صاحب فراش رہے۔ درمیان میں مایوسی ہو گئی۔ گاندھی جی بھی اسی اثناء میں جیل سے رہا ہو چکے تھے۔ (محمد علی ان کی رہائی کے لیے پورا زور لگا چکے تھے) اور صدر کانگریس کا ان سے بمبئی جا کر فوراً ملنا، اور تبادلۂ خیالات کرنا ازبس ضروری تھا۔ ادھر محمد علی بیچارہ فکروں میں مبتلا، اتنے ذاتی اور قومی حادثوں کے شکار۔ خلافت کمیٹیوں کا کام بدستور جاری، اور کانگریس کے بھی سارے ملک کے کاروبار کی نگرانی محمد علی ہی کے ذمہ!

وسط اپریل کا دہلی سے لکھا ہوا ایک خط محفوظ رہ گیا۔ اس سے ان کی اس وقت کی ذہنی اور دماغی الجھنوں پر کسی قلیل حد تک روشنی پڑے گی۔ آگے وہی ملاحظہ ہو۔

......☆☆☆......

باب:22

1:1924

سالِ غم

دہلی

14/اپریل 24

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ولا غالبَ الاّ اللہ

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

تعزیت نامہ 8 شعبان کا اسی زمانے میں ملا تھا، یا یوں کہیے کہ جب ایک ہفتہ بعد کلکتہ کی خلافت کانفرنس سے واپس ہوا تھا۔ آج 8 رمضان کو شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تاخیر کا سبب کیا لکھوں۔ قومی مصیبتوں نے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل لیا، جس طرح حضرت موسیٰ کے عصا نے ساحروں کے سانپوں کو نگل لیا تھا۔ بقول غالب:

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

11 مارچ کو آمنہ رخصت ہوگئیں۔ 15 ہی کو مسلم لیگ کے قضیہ نے کھینچ بلایا۔ 16 کو ڈاکٹر شوکت صاحب اور والدہ کو بوتھ باتھ کرلے آئے۔ والدہ تو آمنہ کی رخصتی کے وقت بے ہوش

تھیں۔شوکت صاحب کو حرارت تھی اور اسی شب سے صاحب فراش ہوئے تو آج تک صاحب فراش ہیں۔مسلم لیگ کے احیا کا بیڑا اٹھانے والے حضرات کی ہمدردی کی یہ حالت تھی کہ میں نے چاہا کہ اس کی کونسل کا وہ جلسہ جو ایک روز ماقبل کورم پورا نہ ہونے کے باعث نہ ہوسکا تھا، سہ پہر کو منعقد کر دیا جائے نہ کہ دوپہر کو جب کہ حکیم صاحب، ڈاکٹر صاحب اور ہم لوگ ان کو لینے اسٹیشن جارہے تھے اور ڈاکٹر عبدالرحمن ان کو ہمراہ لا رہے تھے۔مگر یہ درخواست نامنظور ہوئی۔مجبور ہو کر سب نے یہی فیصلہ کیا کہ شوکت صاحب کو ڈاکٹر عبدالرحمن ہی پر چھوڑا جائے اور احیائے مسلم لیگ کا مسئلہ حل کیا جائے۔ڈاکٹر انصاری صاحب کے ہاں سے ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ شوکت صاحب کی حرارت نارمل ہے۔ہم سب خوش ہوگئے اور میں نے ٹیلیفون کر دیا کہ اب ان کے حسب فرمائش میں کلکتہ خلافت کانفرنس میں شرکت کے لیے چلا جاؤں گا۔اور اپنے سکریٹری کو علی گڑھ بھیج دیا کہ میرا سامان لے کر ڈاک گاڑی میں مجھے مل جائیں۔لیکن بھوکا پیاسا چار بجے انصاری صاحب کے ہاں رائے سینا سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ حرارت حسب معمول (As Usual) تھی نہ کہ نارمل یعنی 103۔اب میں نے جانے سے انکار کر دیا مگر شوکت صاحب نے پھر بھی مجبور کیا اور بالآخر کلکتہ گیا۔وہاں کے لوگوں کے خیالات کی یکسوئی کی۔خلافت کمیٹی غریب مفلس ہورہی تھی۔ساڑھے نو ہزار روپیہ بڑی مشکل سے وصول کیا۔اگر ایک دن اور رہ جاتا تو شاید 3-4 ہزار اور مل جاتے۔مگر دہلی کی خبروں سے شبہ ہوا کہ شوکت صاحب کی طبیعت پھر بگڑی، دوڑا ہوا ایک دن کے لیے دہلی آیا مگر مرض کے پھر عود کر آنے کا شبہ صحیح نکلا۔اور ایک ہفتہ دہلی رہنا پڑا۔طبیعت تو پھر درست ہونے لگی تھی مگر پاسپورٹ نہ ملنے کے باعث تین چار دن خلافت کا کام کرنا پڑا۔اس طرح 15 مارچ کو نکلا۔کہیں ابتدائے اپریل میں پھر ''گھر'' یعنی علی گڑھ پہنچا۔عزیز آمنہ مرحومہ کی قبر تیار کرائی (یعنی اس قدر پختہ کہ ڈھل نہ جائے) رختِ سفر باندھا اور اس نیت سے ریل میں سوار ہونے کو 15 اپریل کو آیا کہ 16 اپریل کی شام کو بمبئی کی طرف چل دوں گا۔بال بچے ساتھ تھے۔اگر شوکت صاحب علیل نہ ہوگئے ہوتے تو برہما[1] جاتے۔میں بھی ہمراہ جاتا۔اپنی اہلیہ کو بمشکل تمام راضی کر لیا تھا کہ ہمارے ساتھ چلی چلیں۔کام میں ان سے مدد ملتی کیوں کہ وہ

---

[1] برما کا سفر خلافت کمیٹی کے لیے تحصیل زر کی غرض سے تھا۔

مستورات میں کامیابی سے کام کرتی ہیں لیکن یہ بھی غرض تھی کہ ان کا غم غلط ہوگا۔ دس مہینہ وہ اور غریب محمود اللہ ہمارا داماد مرحومہ کی تیارداری کرتے کرتے اب اس درجہ کو پہنچ گئے تھے کہ ان دونوں کا دھیان اس کی طرف سے ہٹانے کی سخت ضرورت تھی۔ خود غرضی بھی اس میں ضرور شامل تھی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ کوئی تنہائی میں میرے پاس بیٹھ کر چپکے چپکے رونے والا مل جائے۔ اب جب کہ برہما کا سفر ناممکن تھا۔ ان دونوں کو اور لڑکیوں کو بھی شوکت صاحب کے ہمراہ ماتھران لے جانے کا ارادہ کیا۔ ان کے Relapse نے مجبور کر دیا تھا کہ مع اہل و عیال کے پہلے خود ماتھران چلا جاؤں راستے میں مہاتما جی سے دو تین دن مسلسل تمام امور حاضرہ پر گفتگو کروں۔ جب شوکت صاحب کو افاقہ ہو جائے اور وہ اتنا لمبا سفر کرنے کے قابل ہوں تو ڈاکٹر انصاری صاحب اور زاہد انھیں ماتھران لے آئیں۔ علی گڑھ سے چلنے میں دو روز کی دیر جامعہ کے کاموں کے باعث ہوگئی تھی۔ اس لیے دہلی سے کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ اسٹیشن پر معظم صاحب نے I.D.T خرید کر کھولا تو تار دیکھا کہ پھر شوکت صاحب کو Relapse ہوا ہے یہاں آکر بھی یہی ارادہ تھا کہ اسٹیشن پر سامان چھوڑ دوں اور دوسرے ہی دن بمبئی روانہ ہو جاؤں مگر انصاری صاحب کے مکان پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اب کا Relapse سخت تر ہے۔ بخار 102 سے بڑھ گیا تھا۔ چار و ناچار رہنا پڑا۔ 10 تک حالت اس قدر خراب ہوگئی تھی کہ حرارت 104 سے متجاوز تھی۔ ہزار خیالات برے سے برے دل میں آتے تھے مگر میرے پروردگار نے رحم فرمایا۔ دوسرے ہی دن بخار کم ہونا شروع ہوگیا اور آج صبح کو حرارت نارمل تھی۔ مہاتما جی میرا انتظار کر رہے ہیں، مگر میری مجبوریوں کے باعث مجھے معذور سمجھتے ہیں۔ تاہم شوکت صاحب کا تقاضا ہے کہ جاؤ، ابھی جاؤ، چنانچہ کل شب کو روانگی کی نیت ہے۔

یہ میری پریشانیوں کی کتھا ہے مگر " وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ " نے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا۔ سوائے صبر، شکر کے کیا چارہ ہے، مگر چار و ناچار نہیں۔ طوعاً صبر و شکر کرتا ہوں۔ **اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ** بالکل صحیح ہے۔ مال تھا ہی نہیں اولاد تھی۔ کبھی کوئی لڑکا نہیں ہوا۔ مگر ان لڑکیوں نے زندگی کو اتنا پر لطف کر دیا تھا کہ مشکل ہی سے کبھی لڑکے کی خواہش دل میں آتی تھی اور اب تو خدا کا شکر ادا کیا کرتا تھا کہ کو لڑکا نہ دیا مگر جتنی اولادیں ہوئیں سب کو زندہ رکھا بڑا کرم کیا۔ اس موت سے صبر نہیں تو

شکر میں کمی ہو جانے کا بہت اندیشہ تھا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ مرحومہ میں کچھ تو میری شکل کی شباہت تھی اور زیادہ تر میری خصلت کی یہاں تک کہ میری برائیاں بھی اس میں موجود تھیں، اسی لیے وہ اور بھی عزیز تھی۔ خداوند کریم نے چنا بھی تو اسی کو، مگر اس کے مرتے وقت سب روتے تھے اور میں سب کو سمجھاتا تھا۔ البتہ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غم صرف اس دن کے لیے نہ تھا، بلکہ ساری عمر کا شریک ہو گیا ہے۔ کوئی چیز زندگی کو کھوکھلا کر گئی ہے۔ دعا کیجئے خداوند کریم رحم کرے والدہ کی علالت سخت نے جو اگر سخت نہ بھی ہو تب بھی اس عمر اور ضعیفی میں خطرناک ہوتی ہے، پریشان کر دیا تھا۔ شوکت صاحب کی خطرناک علالت نے اور پھر Relapse نے اور خاص کر اس پچھلے نہایت خطرناک Relapse نے رہے سہے حواس گم کر دیے تھے، لیکن خلافت کے اس قضیہ [1] نے دل کی وہ حالت کر دی ہے کہ اگر خداوند کریم کا فضل شامل حال نہ ہوا تو نہ معلوم میری کیا کیفیت ہو جائے۔ نہیں کہہ سکتا کہ جا کر کیا کر لوں گا۔ مگر پاسپورٹ نہ ملنے سے اپنی بے کسی اور بے بسی اور بھی پریشان کرتی ہے۔ اس قید سے دیکھیے کب خلاصی ملتی ہے۔

قید ہے قید غلامی، دو برس کی قید کیا
دیکھو کیا ہو خاتمہ، اس قید بے میعاد کا

اب رخصت ہوتا ہوں، مدتوں کے بعد آج خط لکھنے بیٹھا ہوں مگر آپ کو دو حرفی خط لکھا نہیں جاتا۔ ابھی درجنوں خط پڑے ہیں، جن کا جواب خود اپنے قلم سے دینا ہے۔

والسلام
آپ کا محبّ صادق
محمد علی

......☆☆☆......

[1] مراد وہی مصطفےٰ کمال پاشا کی خلافت شکنی ہے۔

باب:23

2:1924

(جنگل میں منگل۔ ''ہندو پرستی'')

صدمے ہوں یا مصائب، دنیا کے کاروبار بہر حال چلتے ہی رہتے ہیں۔محمد علی صدر کانگریس کے لیے کیوں کر ممکن تھا کہ غم منانے کو کسی گوشہ میں بیٹھ جاتے۔ نقل وحرکت، مسلسل دورے اور انتہائی مشغولی صدر کانگریس کے لیے لازمی ہیں۔محمد علی اس سے کیسے بچے رہ سکتے تھے۔اکیلے خط وکتابت ہی کا کام وقت گھیرے رکھنے کے لیے کافی تھا۔کانگریس کی طرف سے صدر کو سال بھر کے لیے ایک پرائیویٹ سکریٹری مل جانے کا دستور ہے۔مولانا نے ایک رام پوری نوجوان محمد بشیر نامی کو اس کام پر رکھا تھا۔پھر بھی ڈاک کا کام اتنا زائد تھا کہ نپٹائے نہ نپٹتا۔ہندو مسلم فسادات کو 21،20 میں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔24 کے شروع میں ان کی وبا پوری طرح پھوٹ چکی تھی اور جیل جاتے وقت محمد علی ملک کی جو فضا چھوڑ گئے تھے،اب اس کے بالکل برعکس تھی۔بات بات پر بدگمانی اور بے اعتماد۔ایک طرف شدھی اور سنگٹھن کا زور،دوسری طرف اس کے جواب میں تبلیغ وتنظیم۔بات شروع ہوئی سیاسیات سے اور پہنچ گئی دھرم اور ایمان تک۔اب سب کو گاندھی جی کے چھوٹنے کا انتظار تھا،دیکھیے مہاتما جی آ کر اس زہر کا کیا تریاق پیش کرتے ہیں۔گاندھی جی مارچ میں بالآخر چھوٹے،اور آخر مئی میں ان کا مفصل بیان ہندو مسلم اتحاد پر ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا

میں نکلا۔

محمد علی دورہ پر اس وقت لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور حسب معمول محل سرائے فرنگی محل میں مقیم تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اور میں ان کی خدمت میں حاضر۔ دو ایک صاحب اور بھی تھے کہ کہیں سے ینگ انڈیا آیا اور مولانا جو اس کے لیے ہمہ انتظار و اشتیاق تھے۔ جلدی جلدی اسے سب پڑھ گئے۔ مگر پڑھ کر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ تفصیل تو اب اتنے عرصہ کے بعد ذہن میں نہیں۔ اتنا یاد پڑتا ہے کہ گاندھی جی کے بعض ہندو مشیروں اور مقربانِ خاص پر مولانا بہت بگڑے۔ ان لوگوں سے یوں بھی کچھ زیادہ خوش نہیں رہا کرتے تھے۔ ہندو پبلک لیڈروں میں مولانا دل سے مداح و معترف صرف دو شخصوں کے تھے۔ ایک پنڈت جواہر لعل نہرو (نہ کہ ان کے والد ماجد پنڈت موتی لعل کے) دوسرے مدراسی صدر کانگریس سری نواس آینگر کے۔ باقی اکثر کو تو وہ کم فہم و کم عقل یا غالی یا متشدد سمجھتے تھے۔ اور بعض کو تو کھلم کھلا بد دیانت و غیر مخلص۔

....

جولائی کا مہینہ تھا کہ علی برادران پھر لکھنؤ آئے۔ اور اب کی لکھنؤ و نواحِ لکھنؤ میں گھومنے پھرنے کے لیے کئی دن کے لیے۔ اصلاً یہ دورہ مولانا شوکت علی کا تھا اور اس کا نام انھوں نے ''آم کا دورہ'' رکھا تھا، اور محمد علی کی حیثیت سے محض ذیلی و تبعی تھی۔ جوار میں قدیم شرفا کا ایک چھوٹا سا قصبہ بڑا گاؤں ہے۔ بارہ بنکی اسٹیشن سے کوئی 8 میل کے فاصلہ پر اور بانسہ، رسولی اور مسولی تو گویا اس کے بالکل پڑوسی ہی ہیں، زمینداری قدوائی حضرات کے قصبہ میں۔ اور یہ لوگ بڑے خوش انتظام و خوش مذاق، کھانے اور کھلانے دونوں کا سلیقہ خاص رکھنے والے، اور اپنی میز بانیوں کے لیے مشہور۔ خاندان کا ایک بڑا حصہ مولانا فرنگی محلی کا حلقہ بگوش اور نیاز مند خصوصی۔ ایک رئیس زادہ حاجی شیخ الطاف الرحمٰن اس خصوص میں اور سب سے آگے بڑھے ہوئے۔ ان ہی نے مولانا شوکت علی کی آم کی دعوت اس موسم میں کر دی تھی۔ برادران پہلے لکھنؤ آئے اور وہاں سے موٹر پر بڑے گاؤں۔ میرا ساتھ رہنا دونوں جگہ لازی ہی تھا۔ بڑے گاؤں میں 18،20 گھنٹہ کا وقت بڑے لطف اور دلچسپیوں کے ساتھ کٹا...... چھوٹے سے قصبہ میں شہر کی سی چہل پہل پیدا ہو گئی تھی۔ ''جنگل میں منگل'' کا نمونہ نظر آ گیا۔ بزرگ خاندان خان بہادر حاجی شیخ نثار الرحمٰن مرحوم (شیخ

شفیق الرحمٰن قدوائی جامعی 1 کے دادا) زندہ تھے، انھوں نے سیر چشمی اولوالعزمی، مہمانداری کا حق ادا کردیا۔ یہ پرانے زمانے کے آدمی اپنے نوعمر پوتے شفیق کی سیاسی آزادخیالیوں سے سخت ناخوش تھے، محمد علی نے صبح چلتے وقت ان سے خاص طور پر سفارش کرکے شفیق کے جرم معاف کرائے۔ علی برادران شام کے قریب پہنچ گئے تھے۔ رات کو پرتکلف دعوت اور قوالی رہی۔ صبح کو چائے اور پرتکلف ناشتہ کے بعد روانہ ہوئے۔ اور بجائے سیدھے لکھنؤ جانے کے مسولی اور بانسہ چلنے کی ٹھہری۔ سڑکیں اس وقت تک کچی تھیں۔ سواری بہیلوں کی تجویز ہوئی۔ اچھے سے اچھے بیل ان میں جتے۔ مسولی میں محمد علی کے عاشق صادق اور کامریڈ کے مشہور ظریف مضمون نگار، جوانمرگ شیخ ولایت علی بی اے، ایل ایل بی (علیگ 2) معروف بہ بمبوق کا مکان تھا اور یہیں مزار بھی۔ محمد علی کے لیے کیسے ممکن تھا کہ اتنے قریب آکر کے ان کی تربت پر فاتحہ پڑھنے نہ جاتے۔ وہ لوگ ادھر گئے، میں سیدھا بانسہ چلا آیا، جہاں اپنی قریب کی عزیزداری تھی۔ بانسہ میں سید شاہ عبدالرزاقؒ کی درگاہ بہت مشہور اور مرجع خلائق ہے۔ حضرات فرنگی محل وہاں کے خاص ارادت مندوں میں ہیں۔ علی برادران مسولی ہوکر وہاں بھی آئے اور صاحبِ سجادہ ممتاز میاں صاحبؒ کی خدمت میں نذر بھی پیش کی...... ''نذر'' یہ بیچارے کہاں سے پیش کرسکتے تھے۔ ان کے مرشد مولانا عبدالباریؒ نے یہ سمجھایا کہ درگاہوں کے آدابِ حاضری میں یہ نذرانہ کی پیشکش بھی داخل دستور ہے۔ اور خود ہی نقدی کی ایک معقول رقم دونوں بھائیوں کے ہاتھ میں دے بھی دی۔

....

محمد علی اس سال صدر کانگریس تھے۔ لکھنؤ سال میں تین چار بار آئے اور ہر بار پذیرائی بھی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ ایک بار شاید آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ بھی لکھنؤ میں رکھ دیا۔ ہندو لیڈر بکثرت آئے۔ سب کی دعوت اسی محل سرائے فرنگی محل میں مولانائے فرنگی محلی کی طرف سے بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی...... میں ہر دفعہ خبر پاکر دریاباد سے لکھنؤ آتا اور جب تک محمد علی رہتے موجود رہتا، دعوتیں ہوتیں، جلسے ہوتے، قوالی کی محفلیں ہوتیں۔ اپنی خلوت پسندی اور اکل

1 موجودہ وزیر تعلیمات صوبہ دہلی (1952)

2 موجودہ حکومت ہند کے وزیر ڈاک وتار شیخ رفیع محمد قدوائی کے یہ مرحوم حقیقی چچا تھے۔ (1949)

کھرے پن کو یہ چیزیں بہت بار معلوم ہوتیں، خاص کر قوالی کے ہوحق سے تو طبیعت بابار جھنجھلا اٹھتی اور کبھی کبھی اتنا خستہ وزار ہو جاتا کہ روٹھ کر ان محفلوں سے اٹھ آتا۔ محمد علی کی شخصیت میں وہ جاذبیت اور جادو تھا کہ یہ بیزاری کبھی بھی دیر تک نہ قائم رہنے پاتی۔

لیکن دعوتیں ہوں یا جلسے، قوالی یا آم خوری، خلافت اور کانگریس کا کام بھی ساتھ ساتھ جاری ہی رہتا، اور تفریح محض تفریح نہ رہتی۔ گاندھی جی کا بڑا زور سوت کاتنے اور چرخہ چلانے پر تھا۔ محمد علی چرخہ برابر ساتھ رکھتے اور سوت ایک مقدار معین میں کاتتے جاتے۔ لوگوں سے باتیں کرتے رہتے اور چرخہ چلتا رہتا...... کھانے پینے میں، ملنے ملانے میں، بات چیت میں، بعض وقت بہت دیر ہو جاتی، اور نماز وقت سے بے وقت ہونے لگتی۔ لیکن نماز چھوٹنے کبھی نہ پاتی۔ عشاء کی نماز بارہا آدھی آدھی رات گذر جانے پر پڑھتے، لیکن بہر حال پڑھ ضرور لیتے۔

ایک مرتبہ رات گئے نشست فرنگی محل ہی میں تھی، اور بالکل تخلیہ تھا۔ ذکر گاندھی جی کا نکلا اور میں نے ان کی روحانیت، تقدس اور مہاتمائیت سے متعلق اپنی عقیدت مندی کے تاثرات ظاہر کرنے شروع کیے۔ یقین تھا کہ مولانا ضرور اس کی تائید کریں گے۔ برعکس اس کے، اس کی تردید شروع ہوگئی، اور الٹی مجھ پر ڈانٹ پڑنے لگی۔ ''میں گاندھی جی کی نہ روحانیت کا قائل ہوں نہ ان کے کشف و کرامات کا۔ نہ ان کا شمار اولیاء اللہ میں کرتا ہوں۔ ان کا مذہب الگ میرا مذہب الگ۔ ہاں انھیں اپنا سیاسی سردار تسلیم کرتا ہوں۔ وہ ملک کے اس وقت سب سے بڑے اور مخلص لیڈر ہیں۔ انگریزی کی محکومی سے ہمیں نجات مل سکتی ہے تو ان ہی کے ذریعہ اور واسطہ سے۔ بس میری رفاقت واطاعت ان کے ساتھ اسی حد تک محدود ہے۔ یہ آپ کا محض غلو ہے، جو آپ انھیں مرتبہ ولایت پر رکھ رہے ہیں۔۔ جس طرح مذہب سے بیزاری میں آپ ایک سرے پر پہنچ گئے تھے اس طرح مذہب کے ماننے میں آپ دوسرے سرے پر پہنچے جاتے ہیں'' ......اس قسم کی تلقین، زجر و ملامت کے لہجہ میں کئی منٹ تک جاری رہی۔ اور یہ عین اس زمانہ میں جب کہ ایک اندھی اور بہری دنیا محمد علی کی ہندو نوازی کا ڈھول پیٹ رہی تھی اور محمد علی کی ''گاندھی پرستی'' کو اچھال رہی تھی! محمد علی مظلوم تو تھے ہی، لیکن ظالم ان کے حق میں سب سے بڑھ کر کوئی غیر نہیں، خود ان ہی کی قوم تھی!

باب:24

3:1924

(ہمدرد اور کامریڈ۔ نقشِ ثانی)

قیام اب تک علی گڑھ میں تھا۔ گویا یہی گھر تھا۔ اب دہلی منتقل ہوئے، اور کامریڈ اور ہمدرد کے دوبارہ اجرا کا ارادہ پختہ ہوا۔ فضا کا حال دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے اور اخبارات نکالنے کا قصد اسی خیال سے کیا کہ ان کے ذریعہ فضا درست کریں گے۔ ہندو مسلمان بات بات پر لڑ رہے تھے۔ اور قوتوں کا رخ بجائے حکومت سے مقابلہ کے خانہ جنگیوں کی طرف پھرا ہوا تھا۔ اگست ستمبر کا زمانہ ہوگا جب دہلی آگئے۔ اور وہی مکان پھر کرایہ پر لیا، جس میں دس برس پہلے رہا کرتے تھے۔ کوچۂ چیلان کا اجڑا ہوا نشیمن مدت کے بعد پھر آباد ہوا۔ مکان تھا بہت بڑا اور وسیع۔ نیچے کے حصے میں برقی پریس کی مشینیں اور پریس کا سارا کاروبار۔ کوٹھے پر منیجر، خزانچی اور عملہ وکتابت وغیرہ کے دفتر۔ صیغۂ ادارت کے بھی چھوٹے چھوٹے لیکن الگ الگ کمرے اور کامریڈ کے سب ایڈیٹر کا کمرہ تو بالکل ہی الگ۔ مختصر صحن، پاخانہ، غسل خانہ۔ دوسری طرف خود مولانا کا بڑا سا آفس اور ڈرائنگ روم۔ اسی طرف سے نیچے زنانہ مکان کا بھی راستہ۔ اوپر اور نیچے دونوں منزلوں میں دو تین فاضل کمرے، اچھے خاصے وسیع۔ مولانا کے عزیزوں اور مہمانوں کے لیے۔ کبھی کبھی پھر بھی اتنا ہجوم ہو جاتا کہ مکان کی وسعت ناکافی ہو جاتی۔ باہر

ایک اوسط درجہ کا احاطہ.....مکان کا موقع بھی برا نہ تھا۔ دریا گنج کا ڈاکخانہ قریب ہی، اور جامع مسجد بھی دہلی کے فاصلوں کے معیار سے قریب ہی۔ اسٹیشن بھی کچھ ایسا دور نہیں۔ ملا واحدی صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب اور راشد الخیری صاحب کے مکانات اسی محلہ میں۔

....

اخبار نکالتے وقت تجارتی پہلو نام کو بھی پیش نظر نہ تھا۔ مقصد تمام تر اصلاحی تھا۔ لیکن اب اخبار نکالنا آسان نہ تھا۔ 12 اور 24 میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ اس بارہ سال کی مدت میں، جنگ یورپ کے اثراتِ مابعد سے دنیا کی دنیا بدل چکی تھی۔

نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

پہلی چیز تو مصارف ہی کی زیادتی تھی۔ ہر شے پہلے سے کہیں زیادہ گراں ہوگئی تھی۔ کاغذ کی قیمت، کاتبوں کی اجرت، اسٹاف کی تنخواہ ہر شے کا معیار بلند ہو چکا تھا۔

پھر اس وقت محمد علی پوری طرح جوان تھے اور تندرست وتنومند، اکیلے سارا کام کر ڈالتے، جو کڑی پیش آتی جھیل ڈالتے۔ ہر طرح کی مشقت برداشت کرنے کو آمادہ۔ اب ایک تو سن کھسک آیا تھا۔ اور سن سے بھی کہیں بڑھ کر مصنف 6،5 سال کی نظر بندی اور دو برس کی اسیری، قومی مقاصد میں قدم قدم پر ناکامیاں اور مایوسیاں، خانگی اور ملی دونوں قسم کے صدمات ایک سے بڑھ کر ایک۔ سب پر مستزاد ذیابیطس کا مرض۔ ان سب نے مل ملا کر وقت سے کہیں قبل بوڑھا کر دیا تھا، کہا کرتے تھے کہ مردانہ قویٰ کے لحاظ سے 45 سال کی عمر میں میں 60 سال ہو چکا ہوں۔ محمد علی کے خلاف بغاوت وسرکشی کی ہوا آگے چل کر تو اور، اور بہت زائد تیز ہوئی۔ لیکن پھیلنا اور بھڑکنا اسی وقت سے شروع ہوگئی تھی۔ جنھیں 12 میں اس پر فخر تھا کہ محمد علی نے آج ان سے چوکی پر لوٹا رکھوایا، اور اپنی اس چاکری کو دوستوں کے مجمع میں فخر سے بیان کرتے تھے وہی 24 میں اب مد مقابل کی حیثیت سے سامنے خم ٹھونک ٹھونک کر آرہے تھے۔ اور گستاخیوں، دریدہ دہنیوں اور دلآزاریوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ کامریڈ کے سب ایڈیٹر راجہ غلام حسین اور کامریڈ کے صفحات کی رونق ''بہوق'' دونوں مدت ہوئی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ کامریڈ کے سابق منیجر بلکہ عقل کل عبدالرحمٰن صدیقی

روٹھ کر کلکتہ جا چکے اور اپنا الگ کاروبار جما چکے تھے۔ ہمدرد کے سابق منیجر میر محفوظ علی بدایونی گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ ہمدرد کے سب ایڈیٹر قاضی عبدالغفار مراد آبادی کی زندگی ایک نیا قالب بدل چکی تھی۔ اور دوسرے سب ایڈیٹر سید جالب دہلوی ہونے کے باوجود اب لکھنوی ہو چکے تھے اور ہمدم چھوڑ کر اب ہمدرد سے دوبارہ رشتہ جوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھے۔ ان سب اسباب نے مل جل کر ایک عجیب خلا کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔

اور ان سب سے بھی بڑھ کر خود محمد علی کی لیڈرانہ عدیم الفرصتی۔ اور ہر کمی کی تلافی تو کچھ نہ کچھ ممکن تھی، لیکن اس کمی کی تلافی کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ لیڈری اور ایڈیٹری دونوں کا ساتھ نبھنا ہے دشواری...... 12 میں محمد علی محض ایڈیٹر تھے، لیڈری حاصل کر لی۔ 24 میں لیڈر محمد علی نے ایڈیٹر کی کرسی پر از سر نو جمنا چاہا، ناکامی مقدر ہو چکی تھی۔

....

غرض جہاں تک ظاہر مصلحت سنجیوں کا تعلق ہے، اس وقت محمد علی کے اخبار نکالنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ لیکن اس جوش و اخلاص کے پتلے کو ان ظاہری مصلحت شناسیوں کے ہوش و حواس تھے ہی کب؟ وہاں تو ہر شے ''مشنری اسپرٹ'' (تبلیغی روح) کے ساتھ اور عبادت کے رنگ میں بنی۔ ایک ایک نقل و حرکت میں رنگ عبادت کا ہوتا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ کوشش اس کے نقش قدم پر چلنے کی ہوتی تھی۔ جس کو حکم یہ ملا تھا، اِنَّ صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. غرض نفع و نقصان، سود و زیاں سے بالکل قطع نظر کر کے اخبارات کی اسکیم طے پا گئی...... دوسرے مالکان اخبارات اتنے غیر کاروباری منصوبہ کو سمجھ ہی مشکل سے سکیں گے...... اور مجھے حکم ملا کہ ستمبر میں دہلی پہنچ جاؤں اور ہمدرد کا پہلا پرچہ اپنے سامنے نکلوانے کے بعد وطن واپس ہوں۔

اب پہلی بار سوال سرمایہ کا پیدا ہوا۔ مانا کہ پریس کی مشینیں پہلے کی موجود تھیں، اور کچھ اب منگا لی گئی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ مشین ہی تو سب کچھ نہیں، کاغذ کی قیمت، اسٹاف کی تنخواہوں کے لیے ہزاروں روپیہ ماہوار، مکان کا کرایہ وغیرہ وغیرہ، آخر ان سب کے لیے کیا سبیل تھی؟ اکبر الہ آبادی کا مشہور شعر رہ رہ کر یاد آ رہا تھا۔

کھلا دیواں میرا تو شورِ تحسیں بزم سے اٹھا
مگر سب ہو گئے خاموش جب مطلع کا بل آیا

اور اسی شعر سے رشتہ رکھنے والا ایک اور شعر بھی تو اسی حکیم شاعر کا ہے ۔

اٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یادِ خدا کریں گے
معاً مگر یہ خیال آیا ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے

اب اللہ جانے محمد علی نے کن کن دوستوں مخلصوں سے کن کن طریقوں سے، جوڑ بٹور کر کچھ روپیہ فراہم کیا۔ کراچی کے سیٹھ آنریبل حاجی عبداللہ ہارون کا نام اچھی طرح یاد ہے۔ اس وقت یہ مولانا کے خاص مخلصوں میں تھے۔ رقم آج 1948 کے معیار سے تو کچھ بڑی نہ تھی۔ ہزار ہی دو ہزار کی تھی، لیکن اس وقت اچھی خاصی تھی۔ کچھ دھندلا سا خیال بمبئی کے جوانمرگ سیٹھ عمر ثوبانی کے نام کا بھی آ رہا ہے۔ بڑی توقعات والی محمود آباد سے (جو راجہ سے اب مہاراجہ ہو چکے تھے) تھیں، پوری نہ ہوئیں۔ علی برادران کے پیرو مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی اکثر کاموں میں مالی امداد دیتے رہتے تھے۔ خیال نہیں آتا کہ اس میں بھی شریک ہوئے یا نہیں۔

....

میرے پاس حکم نامے شروع ستمبر ہی سے پہنچے شروع ہو گئے تھے کہ دہلی اڑ کر پہنچوں اور اسٹاف وغیرہ کے انتخاب میں مدد دوں۔ اپنے حسنِ ظن کی بنا پر محمد علی کامریڈ تک میرے مشورہ کو ضروری سمجھ رہے تھے، اور ہمدرد کے اسٹاف کا تقرر تو گویا موقوف ہی میرے مشورہ پر تھا...... ادھر سے بھی دونوں اخباروں کے لیے خریداروں کی چھوٹی موٹی فہرستیں ستمبر بلکہ شاید اگست ہی سے روانہ ہونی شروع ہو گئی تھیں۔

بشیر صاحب رامپوری (صدر کانگریس مولانا کے پرائیویٹ سیکریٹری) کا مکتوب مورخہ 6 ستمبر 24ء مضمون ذیل لے کر موصول ہوا۔

السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ کل مولانا صاحب کے نام موصول ہوا۔ ہر دو اصحاب کے نام ہمدرد

کامریڈ کی خریداری کے لیے درج کر لیے گئے ہیں۔

شکریہ

اس سے قبل کے ناموں کا بھی اندراج کیا جا چکا ہے۔

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ آپ تو پوچھ رہے ہیں کہ پرچوں کا اجرا کب ہوگا مگر خود تشریف نہیں لاتے۔ آپ جس قدر جلد یہاں تشریف لے آئیں اسی قدر جلد پرچے بھی نکلنا شروع ہو جائیں گے۔ آپ کی موجودگی کی یہاں دو خاص ضرورتیں ہیں۔ اولاً مولانا صاحب نے اب تک ہر دو اخباروں کے عملوں کے تقرر کی نسبت قطعی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ گو درخواستوں کا ایک دفتر ہے جو روزانہ چلا آتا ہے۔ مولانا صاحب آخری تقرر سے پیشتر آپ سے اس کے متعلق صلاح و مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ دوم یہ کہ اب تک مولانا صاحب کو ہر دو اخباروں کے لیے کوئی بھی ایسا آدمی نہیں مل سکا ہے جو ان کی قلمی امداد کر سکے۔ بالکل تن تنہا ہیں۔ اخبار چونکہ عنقریب نکلنے والے ہیں اس لیے مولانا صاحب کی خواہش ہے کہ آپ سے گفتگو کر کے کوئی دلچسپ سلسلۂ مضامین شروع کیا جائے۔ آپ مولانا صاحب سے وعدہ فرما چکے ہیں اور یہ ان کے ہاتھ بٹانے کا خاص وقت ہے۔ اس کام کے لیے ممکن ہو تو میر محفوظ علی صاحب کو بھی ساتھ لیتے آیئے۔

احمد آباد سے تو کل مشینیں آ گئی ہیں۔ کلکتہ سے لیتھو کی مشینیں بھی روانہ ہو چکی ہیں ایک دو یوم میں وہ بھی یہاں پہنچ جائیں گی۔ صرف مشینوں کا لگانا باقی ہے، دوسرے ہفتہ میں نہیں تو تیسرے ہفتہ ستمبر میں اخبار کے نکلنے میں کوئی شبہ ہی نہیں''۔

......☆☆☆......

باب:25

4:1924

(گاندھی جی کی مہمانی)

ایڈیٹوریل اسٹاف (عملۂ ادارت) کا سوال سرمایہ کے مسئلہ سے کچھ کم اہم نہ تھا۔ مولانا اس پر تلے ہوئے تھے کہ ان کی جیب پر بار جتنا بھی پڑ جائے۔ اسٹاف بہرحال بہتر سے بہتر ہی منتخب ہو۔ لیکن آہ کہ محمد علی کی بیسیوں دوسری آرزوؤں کی طرح اس آرزو کا بھی بالکل کیا معنی بڑی حد تک ہی پورا ہونا مقدر میں نہ تھا۔ کامریڈ کے لیے تو کہنا چاہیے کہ آخر تک بھی کوئی مددگار نہ ملا۔ درخواستیں جتنوں کی آتیں وہ مولانا کی نظر میں نہ جچتے۔ اور مولانا جنھیں لینا چاہتے وہ خود کسی نہ کسی معذوری سے آنہ سکتے۔ مولانا کی نظر پنجاب کے ملک عبدالقیوم بیرسٹرایٹ لا پر تھی، جو لندن سے "مسلم آؤٹ لک" نکال چکے تھے۔ مولانا ان کے مضامین سے بہت خوش تھے۔ لیکن ان کی امداد کبھی اس سے آگے نہ بڑھی کہ بس کبھی کبھی کامریڈ کے لیے کوئی مضمون بھیج دیتے۔ صوبہ برار کے مبین الرحمٰن بی اے، ایل ایل بی کے مضامین مولانا نے بمبئی کرانیکل میں پڑھے اور انھیں بہت پسند کیا۔ مدتوں ان سے مراسلت رہی اور برابر ان کی آمد کا انتظار رہا، بالآخر نہ آئے۔ اور اپنے صوبہ کی کونسل کے ممبر ہو گئے۔ سب سے زیادہ انتظار شعیب قریشی صاحب کا رہا (جن کی قسمت میں 6 سال کے بعد مولانا کا داماد ہونا لکھا تھا) علی گڑھ کے ایم اے، ایل ایل بی تھے۔ لندن میں

بیرسٹری پڑھے ہوئے۔ بڑے مخلص اور پر جوش۔ نیوایرا (لکھنؤ) کو مدت تک سنبھالے رہے۔ پھر گاندھی جی کی گرفتاری پر ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ کامریڈ کی سب ایڈیٹری کے ہر طرح اہل تھے۔ ان کے لیے سب کوششیں ہوئیں۔ ان کا دل نہ پسیجنا تھا نہ پسیجا۔ بمبئی 1 سے ایک صاحب کی درخواست آئی، بڑے ہی نیازمندانہ اور معتقدانہ لب ولہجہ میں (اس سلسلہ کی ہر مراسلت اور درخواست میری نظروں سے گذرنا لازمی تھی) مولانا نے ان ہی کو غنیمت سمجھا، بہت خوشی سے تو نہیں، لیکن بہر حال انھیں بلالیا۔ کچھ روز تو انھوں نے بھی اپنی درخواست کے انداز تحریک کو خوب نبھایا۔ اس کے بعد کامریڈ ہی سے علاحدہ نہیں ہوئے بلکہ مولانا کے بھی شدید ترین دشمن ہو گئے۔ اور انھیں اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اللہ انھیں معاف فرمائے۔ مولانا کے انتقال کے چند ہی روز بعد یہ عالم آخرت میں پہنچ گئے۔

ہمدرد کے لیے امیدواروں کی کمی نہ تھی۔ مگر وہی دقت یہاں بھی تھی۔ جنھیں ہمدرد چاہتا تھا وہ عنقا تھے۔ اور جو خود آنے کو تلے رہتے تھے ان کی میزبانی میں ہمدرد کو تامل تھا۔ مولانا کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ ہر درخواست کو پڑھ سکیں۔ ساری ذمہ داری اسی نیازمند کے سر تھی۔ جالب صاحب سے میں نے زبانی گفتگو کی۔ وہ حضرت اب لکھنؤ کے قطب بن چکے تھے۔ وطن کی کشش بھی ہٹنے پر آمادہ نہ کر سکی، زمیندار (لاہور) کے سالک صاحب سے بھی مراسلت رہی مگر بے نتیجہ۔ آخری قرعۂ انتخاب ان چھ صاحبوں کے نام پڑا:

(1) محمد فاروق صاحب دیوانہ گورکھپوری، ایم اے (علیگ) ہمدرد کے دور اول میں بھی رہ چکے تھے۔ (بعد کے مشہور مسلم لیگی ایم ایل اے)

(2) احتشام الدین صاحب دہلوی، ایم اے (علیگ) بعد کے ممتاز لغت نویس 2۔

(3) عارف ہسوی صاحب، پرانے نیشنلسٹ اور کانگریسی پرچوں میں کام کیے ہوئے 3۔

---

1 بعد کو بھوپال میں وزیر ہو گئے۔ اس وقت (1951 میں) پاکستان سے روس میں سفیر ہیں۔ اور عین ان سطور کی نظر ثانی کے وقت (مارچ 52 میں) معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ہائی کمشنر بن کر آرہے ہیں۔

2 اور اب مرحوم (1951)۔

3 مدت ہوئی انتقال کر چکے (1951)۔

(4) قاری عباس حسین صاحب دہلوی1، ہمدم وغیرہ میں کام کیے ہوئے۔ایک ماہنامہ تمدن بھی نکال چکے تھے۔

(5) محمد جعفری صاحب جامی مچھلی شہری، جامعہ کے ہونہار نوجوان، ہمدرد میں شروع سے آخر تک رہے۔ بعد کو اپنا روزنامہ ملت نکالا۔

(6) حسن ریاض صاحب بلندشہری۔(اپنا ایک ہفتہ وار نکال چکے تھے۔مدت کے بعد لکھنؤ سے روزنامہ ہمت اور پھر دہلی سے لیگی روزنامہ مشہور نکالا)۔

ان میں سے دو صاحبوں کا تقرر مولانا نے بالکل اپنی پسند سے فرمایا تھا......اردو کے کسی روزنامہ میں اس وقت تک نہ سب ایڈیٹروں اور مترجموں کی اتنی تعداد تھی،اور نہ قابلیت کے اعتبار سے اتنا بہتر اسٹاف کہیں اور جمع تھا۔غرض کچھ نہ ہونے پر بھی یہی ہمدرد کا اسٹاف کیفیت اور کمیت دونوں حیثیتوں سے اپنی نظیر آپ تھا۔

یہ بھی ٹھہری کہ مختلف مرکزی مقامات میں ہمدرد کے ''وقائع نگار خصوصی'' مقرر رہوں، چنانچہ لکھنؤ، بمبئی، علی گڑھ وغیرہ میں وقائع نگاروں کا تقرر ہوا۔اور مشاہیر اہل قلم سے درخواست کی گئی کہ سیاسی، علمی، ادبی، مذہبی عنوانات پر اپنے ماہرانہ وفاضلانہ مقالات سے وقتاً فوقتاً ناظرین ہمدرد کو مستفید کرتے رہیں......یہ ساری خدمات مولانا کی نیابت میں ان کا یہ نیازمند ہی انجام دیتا رہا۔

آہ انسانی دماغ کی خام خیالیاں، اور بشری آرزوؤں اور تمناؤں کی خام کاریاں کیا کیا امنگیں اور حوصلے اس وقت تھے! بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارا ہندوستان خصوصاً اسلامی ہندوستان اپنی مٹھی میں آیا جارہا ہے۔نیشنلزم اور اسلامیت کے جس رخ گھمانا چاہیں گے گھمادیں گے، جو بولی بلوانا چاہیں بلوادیں گے!

....

حاضری کا حکم مجھے وسط ستمبر کے لیے ملا تھا، پہنچا۔گاڑی اسٹیشن پر بعد مغرب پہنچتی تھی۔گھر

1 اب دونوں پاکستان میں ہیں (1951)۔

پہنچتے کچھ اور دیر لگی تو دیکھتا کیا ہوں کہ دروازہ پر کانگریسی والنٹیر وں کا پہرہ! زینہ پر چڑھنا چاہا تو فوراً مجھ سے پوچھ گچھ، سوال جواب شروع ہو گئے! آپ کون ہیں؟ کس کے پاس آئے ہیں؟ کیا کام ہے؟...... یا اللہ! یہ کیا! معلوم ہوا کہ گاندھی جی آئے ہوئے ہیں اور اب کی مولانا ہی کے مہمان ہیں۔ گاندھی جی باوجود اپنی مشہور عالم سادگی کے سفر مع حشم وخدم کے کرتے تھے۔ ساتھ میں پرائیویٹ سکریٹری (اس وقت مہادیوڈیسائی تھے) اور فلاں فلاں، پھر مہمانی کے بھی خاص خاص شرائط۔ اتنے بڑے قافلہ کا ٹھہرانا آسان نہ تھا۔ پھر مولانا کے مکان اور دفتر میں اتنی گنجائش ہی کہاں تھی۔ لیکن مولانا تو جہاں تک کسی کی بھی میزبانی اور مہمانداری کا تعلق ہے، ایثار اور بےنفسی کے پتلے تھے، چہ جائیکہ گاندھی جی کے لیے! وہ دہرا بڑا کمرہ جوان کا آفس بھی تھا اور ڈرائنگ روم بھی۔ اس میں انھوں نے گاندھی جی کو جگہ دے دی۔ اوران کے اسٹاف والوں کے لیے اپنا مہمانوں کا وسیع کمرہ بالکل خالی کر دیا۔ ڈرائنگ روم کی عمارت اب بھی وہی تھی جسے دس سال قبل 14 میں دیکھ گیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس وقت کمرہ مخملی کوچ، صوفے وغیرہ ''صاحبانہ'' فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اب اس سب کے بجائے فرش زمین پر صرف ایک سبز رنگ کی دبیز دری کا فرش تھا۔ اسی پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ آفس کے حصہ میں ایک بڑی سی میز، چند کرسیاں اور کتابوں کی دو تین الماریاں۔ غرض جس طرح بھی بن پڑا مولانا نے ان سب معزز مہمانوں کے لیے گنجائش نکالی۔ اب میں جو پہنچا، تو مولانا مجھے اپنے ذاتی کمرے میں لے گئے اور وہیں سلایا...... ہجوم کی کمی یوں بھی کب رہتی تھی، اور اب تو گاندھی جی کی ذات ہے، ایک میلہ سا لگا ہوا۔ مولانا ہر وقت مہمانداری میں مصروف، کامریڈ اور ہمدرد کے لیے بات کرنے کی فرصت ہی اب کسے؟ جس غرض کے لیے میری طلبی ہوئی تھی، وہ مقصد ہی فوت! خیر دنیا بہ امید قائم۔ آس یہ بندھی کہ دو چار دن میں یہ ریل پیل ختم ہو جائے گی، اور جب مولانا سے بہ اطمینان گفتگو کا موقع نکل سکے گا۔

مولانا کھانا عام طور سے وہی کھاتے تھے جو خوشحال شریف مسلمان گھرانوں میں کھایا جاتا تھا۔ قورمہ، اور کبھی قلیہ کبھی کباب، کبھی دو پیازہ۔ غرض گوشت کے کھانے دو ایک قسم کے تو ضرور ہی ہوتے تھے۔ اب کی کیا دیکھتا ہوں کہ گوشت کی ہر قسم یکسر غائب، ہندو سبزی خور مہمانوں کی

خاطر دستر خوان پر صرف سبزی ہی سبزی! گاندھی جی کے معمولات تو سب سے الگ اور نرالے ہی تھے، ان کے ساتھ کھانے کی شرکت کسی کو کیوں نصیب ہونے لگی تھی لیکن ان کے سکریٹری مہادیو ڈیسائی وغیرہ مولانا کے دستر خوان پر ہم لوگوں کے ساتھ ہی ہوتے۔ ان ہی کی رعایت سے مولانا نے خود بھی اتنے دنوں کے لیے گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ ایک آدھ وقت تو خیر نبھ گیا لیکن اس کے بعد تو مسلمان مہمانوں کی (اور ان میں مولانا کے اعزہ معظم صاحب وغیرہ سب شامل تھے) بری حالت ہوگئی۔ دستر خوان پر بیٹھتے ہی طبیعتوں پر جھنجلاہٹ غالب آجاتی اور عجب نہیں ہے دل ہی دل میں گاندھی جی پر کوسنے بھی پڑ جاتے ہوں! ......محمد علی کھانے اور اچھے کھانے کے بڑے ہی شوقین تھے۔ ان کے لیے یہ قورمہ اور قلیہ اور پلاؤ اور کباب سے پرہیز ایک شدید مجاہدہ سے کم نہ تھا۔ لیکن بہر حال وہ مجاہدوں کے خوگر ہوگئے تھے اور اس طعامی مجاہدہ کو ہنسی خوشی برداشت کر رہے تھے۔

دو دن گزرے اور تین دن گزرے، گاندھی جی کو اتنا قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے اور کبھی کیوں نصیب ہوتا۔ اس وقت مولانا کے طفیلیوں میں مفت مل رہا تھا لیکن مولانا سے کام یڈ اور ہمدرد پر گفتگو کا موقع نہ آج ملتا ہے نہ کل۔ نہ صبح کو نہ شام کو۔ مولانا وقت کے نظم وانضباط پر کہیں بھی قادر نہ تھے اور اس باب میں گاندھی جی کے بالکل برعکس واقع ہوئے تھے، وہاں تو جیسے ایک ایک سنٹ نپا تلا ہوا رہتا تھا۔ کھانے پینے، سونے جاگنے، غسل، ہوا خوری، ملاقات، ہر ہر چیز کے وقت بندھے ہوئے تھے۔ ویسے ہی یہاں ہر چیز میں بدنظمی تھی۔ کھانا نکل کر آ گیا، دستر خوان پر لگ گیا، پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور مولانا ہیں کہ اپنے کسی ملاقات سے گرما گرم مباحثہ میں مشغول ہیں۔ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ساتھیوں کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ راتوں کو بلا ضرورت شدید، گیارہ گیارہ، بارہ بارہ بجے تک جاگ رہے ہیں۔ کام کرنے پر مٹ گئے تو اب کھانا اور سونا سب غائب۔ روز مرہ یہی رہتا اور اصل مشغولیت کے ساتھ یہ بدنظمی بھی ہر کام میں شامل رہتی......دن ٹلتے چلے گئے اور مفصل گفتگو کا موقع نہ نکلنا تھا نہ نکلا۔

......☆☆☆......

باب:26

5:1924

(21 روزہ ''برت''۔ بی اماں کی وفات)

فرقہ وارانہ کشمکش زوروں پر تھی۔ ہر روز ملک کے مختلف حصوں سے خبریں ہندو مسلم فسادات اور خونریز بلووں کی آرہی تھیں (حالانکہ اس وقت کی خونریزیوں کو کوئی نسبت نہ رہی، ان ہولناک سفاکیوں سے جو 47 میں اسی سرزمین ہند پر اسی کے فرزندوں کے ہاتھوں واقع ہوئیں) کوہاٹ (صوبۂ سرحد) کا بلوہ خصوصیت کے ساتھ کشت وخون میں بڑھا ہوا رہا...... 18 ستمبر دوشنبہ کی سہ پہر کو حکیم اجمل خان صاحب کے مکان پر جامعہ ملیہ کی انتظامی کمیٹی کا جلسہ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں تھا۔ ہم سب لوگ وہیں تھے اور بعد مغرب وہاں سے چل ہی رہے تھے کہ ہمدرد پریس کے منیجر عبدالعلی خان رامپوری بھاگے ہوئے وہاں پہنچے۔ اور چپکے سے مولانا کے کان میں یہ خبر پہنچائی کہ ''گاندھی جی نے یک بیک 21 دن کے برت رکھنے (فاقہ کرنے) کا عزم کرلیا ہے''۔ دوشنبہ ان کی ہفتہ وار خاموشی کا دن تھا، اس لیے اپنا یہ عزم ایک پرچہ پر لکھ کر انھوں نے دے دیا تھا۔ خبر سنتے ہی سب سناٹے میں آگئے۔ اور مولانا پر تو جیسے بجلی ہی گر پڑی جلدی جلدی ہم لوگ گھر واپس پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب بھی ساتھ۔ کمرہ (مدیر کامریڈ وہمدرد کے ڈرائنگ روم) کا منظر اب دیکھنے کے قابل تھا۔ گاندھی جی کے مابعد کے برتوں نے تو بعد کو اس 21 روزہ برت کی کوئی خاص اہمیت باقی نہ رکھی۔ لیکن اس وقت تک یہی برت سب سے زیادہ عجیب وغریب

تھا اور اقدام خودکشی کے مرادف ۔ دوشنبہ کا دن تو اب ختم ہو چکا تھا لیکن گاندھی جی کی خاموشی کے پورے 24 گھنٹوں کے ختم ہونے میں ابھی کوئی گھنٹہ دو گھنٹہ کا وقت باقی تھا۔ گاندھی جی نے چار مختصر تحریریں انگریزی میں الگ الگ لکھ رکھی تھیں۔ ایک اپنی بیوی کے نام، دوسری انگریزوں کے نام، تیسری ہندو مسلمانوں کے نام اور چوتھی اپنے میزبان کے نام۔ اور وہ تحریریں ایک ایک کے ہاتھ میں گشت کر رہی تھیں۔

....

کمرہ کے صدر میں دیوار سے تکیہ لگائے، گاندھی جی بت بنے چپ چاپ بیٹھے ہوئے۔ ان کے داہنے پر حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری، بائیں پر پانیکر (ایڈیٹر "ہندوستان ٹائمس" [1] دہلی) جارج جوزف [2] (ایڈیٹر "انڈیپنڈنٹ" الہ آباد) سی ایس رانگا [3] آیر (ایم ایل اے) اور سامنے حسرت موہانی [4]، آصف علی بیرسٹر [5] اور خود مولانا، اور لوگ۔ مغموم و متاثر ہر شخص شاید بجز مولانا حسرت موہانی کے۔ حکیم صاحب تو بڑے سنجیدہ آدمی، ٹھنڈے دماغ کے تھے۔ دوسرے کمرے میں لے جا کر مجھ سے اور آصف علی صاحب سے گاندھی جی کے بیانات کا اردو ترجمہ سنا، اور سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ پھر وہیں واپس آ کر انھوں نے اور ڈاکٹر صاحب نے اور آصف علی صاحب سب ہی نے تو اپنی والی کوشش گاندھی جی کو اس رائے وعزم سے پھیرنے کی کی۔ وہاں تبدیلی کی گنجائش کہاں......سب سے زیادہ مضطرب اور پریشان، حیران اور صدمہ زدہ خود مولانا تھے۔ پہلے روئے، پھر بگڑے۔ گاندھی جی سے اس طرح لڑتے اور ڈانٹتے ہوئے انھیں اس کے قبل میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ جس شخص کا وہ انتہائی ادب واحترام کرتے تھے، اس پر وہ یوں گرج اور برس بھی سکتے ہیں! بار بار کہہ رہے تھے کہ "بغیر ہم سے صلاح

1 اس وقت ہندوستان کے سفیر چین میں ہیں (1951)

2 مدراسی عیسائی۔ عیسائیوں میں بڑے زبردست نیشلسٹ تھے۔ اب مدت ہوئی آنجہانی ہو چکے ہیں۔ ان کے بھائی پوتھن جوزف انگریزی کے بڑے نامور صحافی ہیں۔

3 مدراسی الاصل لیکن مدت سے لکھنؤ اور دہلی کے ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کے انگریزی سہ روز "ایڈوکیٹ" کے ایڈیٹر مدت تک رہے۔ اب آنجہانی۔

4 1951 میں مرحوم ہو چکے۔

5 موجودہ گورنر صوبہ اڑیسہ (51)

ومشورہ کیے اتنا اہم قدم آپ نے اٹھایا کیسے؟ دنیا کے سامنے تو یہ مشہور ہے کہ علی برادران کے مشورہ کے بغیر شاید سانس بھی نہیں لیتے۔ پھر ہم لوگوں سے بالکل راز رکھ کر اتنی سخت کارروائی کر گذرنا یہ ہمارے ساتھ بدعہدی اور دغابازی ہوئی یا نہیں؟ یہ تو دھوکا دینا ہوا، ہمیں بدنام کرنا ہوا، پھر اگر اتنا سخت مجاہدہ آپ نہ جھیل سکے اور آپ کی جان چلی گئی تو ساری ہندو قوم کا غصہ مسلمانوں ہی پر اترے گا کہ ایک مسلمان میزبان نے اپنے مہمان کو مرجانے دیا۔ اور اس طرح ہندو مسلم منافرت کی آگ بجھنے کے بجائے اور بھڑ کے گی''۔ گاندھی جی کی خاموشی کا وقت اس درمیان ختم ہو چکا تھا اور اب وہ مسکرا مسکرا کر ٹھنڈے اور مختصر جوابات دے رہے تھے۔ بولے کہ ''بہر حال اب تو خدا کے سامنے عہد کر چکا ہوں''۔ مولانا نے تڑپ کر جواب دیا کہ ''جو عہد ہمارے مشورہ کے بغیر کیا جائے تو وہ عہد ہی کب ہے؟ قسمیں تک جو ایسی جلد بازی میں اور بے سوچے سمجھے کھالی جاتی ہیں، قرآن نے جسے آپ بھی سچا اور خدائی کلام سمجھتے ہیں، ان کو ''لغو'' یا لایعنی قرار دیا ہے۔ اور ان کی پابندی لازمی نہیں رکھی ہے''۔ یہ کہہ کر قرآن مجید کی آیت سنائی "لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْ أَیْمَانِکُمْ" الخ۔ گاندھی جی اس پر بھی مسکرایا کیے۔ جب دیکھا کہ یہ نشانہ بھی خالی گیا تو بی اماں جو اس وقت تک زندہ تھیں، مگر آخری علالت میں بستر مرض پر پڑی ہوئی تھیں، ان کے پاس سے گاندھی جی کو پیام بھجوایا کہ ''تم مجھے اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہو، میرا حکم مانو، اور اپنے اس ارادہ سے باز آجاؤ۔ میں آنے کے ذرا بھی قابل ہوتی تو زنانہ مکان سے خود تمھارے پاس کوٹھے پر آتی ''۔ گاندھی جی نے جواب کہلوایا ''اگر میں اپنی سگی ماں کی اطاعت اس باب میں کرسکتا تو آپ کی بات بھی ضرور مان لیتا''...... مولانا سے گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔۔ اس کا ایک آخری اور پرزور ٹکڑا: ''کم از کم شوکت علی کا انتظار تو آپ کو کر ہی لینا تھا۔ آپ پبلک میں تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی کام آپ بغیر ان کے مشورہ کے نہیں کرتے، اور عمل یہ ہے!'' گاندھی جی اپنی اسی متین مسکراہٹ کے ساتھ: ''لیکن شوکت علی یقیناً میرے رائے کی تائید کریں گے۔ وہ سپاہی آدمی ہیں''۔ مولانا کے ترکش کا آخری تیر: ''سپاہی!! یہ کہیے کہ آپ ان کو اپنا غلام سمجھ رہے ہیں''۔

....

ایک بجے شب کو میں تو پڑ کر سو رہا۔ سنا مولانا ساڑھے 3: پر سوئے! اور یہ ان کے لیے کوئی

نئی بات تھی ہی نہیں۔ مولانا کی مصروفیت گاندھی جی کے آجانے سے یوں ہی کیا کم تھی، اب اس تازہ واقعہ سے تو کہیں زائد بڑھ گئی۔ دن رات گاندھی جی ہی کی دیکھ بھال اور ان کے لیے ہر قسم کے انتظامات۔ ٹرنک کال کر کے مولانا شوکت علی کو ٹیلیفون پر اطلاع بھی رات ہی رات پہنچادی گئی، اور دوسرے تیسرے دن وہ بھی آگئے۔ میرا قیام اب بیکار تھا۔ اخباری اسکیمیں کچھ روز کے لیے اب بالکل غتر بود۔ مولانا کو اب کسی وقت بات کرنے کی بھی فرصت نہیں۔ دو چار روز اور راستہ دیکھ کر میں نے تو وطن کا راستہ لیا۔ معظم صاحب اور لوگ بہت کچھ روکتے رہے کہ مہاتما کی برت شکنی کا منظر بھی دیکھ کر جانا۔ یہاں اتنی فرصت کہاں تھی۔ دریاباد آگیا، اور یہیں سے جو خدمت ہمدرد کی بن پڑی کرتا رہا۔ چلتے وقت مولانا نے پوچھا کہ ''اب کب آؤ گے؟'' یہاں تو طبیعت جلی ہوئی تھی۔ جواب میں عرض کیا کہ ''اب درمیان میں ہرگز نہیں آنے کا، آپ کے ہاں تو روز ایک نہ ایک مشغلہ نکلتا ہی رہتا ہے اب جب آپ پرچہ نکال لیں گے، اور انھیں وہاں پڑھ لوں گا جب ہی ادھر کا رخ کروں گا'' ...... 31 اکتوبر کو خدا خدا کر کے کامریڈ کا پہلا پرچہ نکلا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ آٹھ دن کے بعد 8 نومبر کی شام کو 9 کا پہلا پرچہ ہمدرد کا شائع ہوا۔ 12 سو پرچے خاص دہلی میں نکل گئے اور مانگ برابر جاری رہی۔ محمد علی کے نام کا سکہ اب دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔

عین اسی زمانہ میں بی اماں بیچاری کی علالت نے خطرناک صورت اختیار کرلی، محمد علی غریب سے تو نہ جی بھر کر تیمارداری ہی بن پڑتی اور نہ اطمینان و یکسوئی سے اخبارات ہی پر توجہ ہوسکتی۔ ہمدرد تو خیر اسٹاف والوں کے بھروسہ پر جوں توں نکلے جاتا۔ اصلی مصیبت کامریڈ کی تھی۔ اس میں کوئی بھی ہاتھ بٹانے والا نہ تھا۔ وسط نومبر میں شب جمعہ کو بی اماں رخصت ہوگئیں اور دنیا ایک ایسی متقی خاتون کے وجود سے محروم ہوگئی جس کی نماز فجر، سفروں کی کثرت اور رات کی تقریروں اور جلسوں کے باوجود، کہا جاتا ہے کہ پچاس سال کی مدت میں کبھی قضا نہیں ہوئی تھی! یہ وہی بیوہ تھی جسنے اپنی جوانی کے زمانہ میں حج کے موقع پر غلاف کعبہ پکڑ کر اپنی اولاد کے حق میں یہ دعا نہیں کی تھی کہ اسے بڑی بڑی دنیوی عزتیں اور مرتبے حاصل ہوں، بلکہ رب کعبہ سے عرض کیا تھا کہ ''اے پروردگار میری اولا کو دین کا سچا خادم اور پختہ مومن بنادے''۔ جنازہ ابھی گھروں میں رکھا ہوا تھا اور چہیتا اور ماں کا دلدادہ بیٹا کامریڈ کے لیے مضمون ہی لکھنے میں نہیں بلکہ پروف درست کرنے میں بھی مشغول تھا!

باب:27

6:1924

(صدر خلافت ''ہو رہے ہیں جور ہفت افلاک کے'')

پرچے نکلنے شروع ہو گئے۔ اور مجھے متواتر حکم نامے دہلی فوراً پہنچنے کے ملنے لگے۔ ایک خط تو اسٹاف کے کسی صاحب کا (جن کے دستخط آج پڑھے نہیں جا سکے) لکھا ہوا 11 اکتوبر ہی کو چلا تھا:

'' حسب ہدایت مولانا محمد علی صاحب 8 اکتوبر کے والا نامہ کی رسید عرض ہے۔ سید ہاشمی صاحب اور صدیق الزماں صاحب کا پتہ نوٹ کر لیا گیا۔ نمونہ کا پرچہ بھیجا جائے گا۔ اور کامریڈ کا وی پی ارسال ہوگا۔

انتظامات روزانہ مکمل ہوتے جاتے ہیں۔ مشینری تمام لگ گئی ہے۔ مشینوں کا درست ہو کر رواں ہونا باقی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ براہ کرم چند مضامین ابتدائی اشاعتوں کے لیے جس قدر ممکن ہو تیار کر دیں۔ پہلا پرچہ مشینری کے عنقریب رواں ہوتے ہی شائع ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ''۔

کام کی تو اپنے دل سے لگی ہوئی تھی۔ خریدار بنانے، مضمون لکھنے اور دوسروں سے لکھوانے، حیدآباد وغیرہ میں وقائع نگار مقرر کرانے میں برابر خط و کتابت میں لگا ہوا تھا۔ اوپر

کے خط میں سید ہاشمی کا ذکر ہے، یہ ہاشمی فرید آبادی ہیں۔انجمن ترقی اردو اور جامعہ عثمانیہ دونوں کے لیے تاریخ وسیرت وغیرہ کے عنوانات پر بہت کچھ لکھ ڈالنے والے، اس وقت حیدر آباد میں کسی عہدہ پر تھے[1]۔

جب نومبر بھی آ گیا اور میں نہ پہنچا بلکہ بجائے اپنے صرف خطوط بھیجتا رہا تو 11 نومبر کو ذیل کا مکتوب محمد جعفری صاحب کے قلم سے ملا۔ یہ جعفری جامعی نئے بھرتی ہو کر آئے تو تھے ہمدرد کے اسٹاف میں ایک جونیئر ممبر کی حیثیت سے، ترجمہ وغیرہ کے کام کے لیے لیکن اس وقت کام مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری کا کر رہے تھے: ''آپ کا مرسلہ لفافہ مولانا صاحب نے پڑھا۔ مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ میں جناب کی خدمت میں اس کا جواب لکھ دوں۔

مولانا آج کل بے انتہا مشغول ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کا دو دن کا آیا ہوا خط آج انھوں نے پڑھا۔ کامریڈ کا سارا کام خود کرتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک رات تو لازمی جاگتے ہیں۔ اور کم سے کم ڈیڑھ دن برابر لکھتے ہیں۔ الحمد للہ ہمدرد جاری ہو گیا۔ آپ کی خدمت میں بھی پہنچا ہوگا مولانا فرماتے ہیں کہ ''اب آپ براہ عنایت فوراً تشریف لائیے۔ آپ کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ چند دن ہمدرد میں کام کرنے والوں کو راہ پر لگا کر کامریڈ کا کام دیکھیے گا۔ اور پھر سارے ''بزنس[2]'' (ان ہی کا لفظ ہے) کے آپ مالک و ذمہ دار ہوں گے''۔ ہمدرد کے لیے 4،5، اسسٹنٹوں کے فاروق صاحب بھی گورکھپور سے آ گئے ہیں۔ وہ بھی آپ کے بلانے پر اصرار کر رہے ہیں۔ مولانا صاحب تو تار آپ کے یہاں بلانے کے لیے بھیجنے کو لکھا چکے تھے مگر فاروق صاحب نے منع کیا۔ اور آخر میں پھر مجھے ہدایت کی گئی کہ ذریعہ تحریر آپ کے بلانے کو لکھوں۔ مولانا نے فرمایا ہے کہ اگر آپ اب چلے آویں گے۔ تو آپ کے خطوط کے جواب دینے کے لیے کسی کو متعین کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی[3]۔ آپ ایک دفعہ آ جائیے اور تمام ولایتی ڈاک کو دیکھ لیجیے۔ جو جرائد و رسائل آپ کو پسند ہوں گے، ان کی فہرست دے دیجیے گا، اس کے بعد ہمیشہ آپ

---

[1] اس وقت (1952 میں) کراچی میں کل پاکستان انجمن ترقی اردو کے روح رواں ہیں۔

[2] Business یعنی کارخانہ یا کاروبار۔ [3] میں نے مولانا کو لکھا تھا کہ آپ کو اتنی کہاں فرصت، آپ میرے خطوط کے جواب کے لیے اسٹاف کے کسی صاحب کی ڈیوٹی لگا دیجیے۔

کی خدمت میں بھیجے جایا کریں گے''۔

میں نے اپنے خط میں عرض کیا تھا کہ ولایتی اخبارات اور رسالوں کا منگانا ازبس ضروری ہے۔کامریڈ کے لیے تو وہ بہرحال آئیں گے۔میرے پاس چلے آیا کریں تو میں ہمدرد میں بھی ان سے کام لوں۔بعض مضامین ترجمہ کے قابل ہوں گے، بعض تلخیص کے اور بعض نقد وتبصرہ کے قابل۔

....

چیف سب ایڈیٹر فاروق صاحب قرار پائے اور صحیح قرار پائے۔ ہمدرد کا دور اول دیکھے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں بھی خط لکھا اور اپنے متعدد مضامین بھی اشاعت کے لیے روانہ کر دیے۔ کچھ اپنے نام سے، کچھ فرضی ناموں سے (اس وقت تک فرضی ناموں سے لکھنے کا مذاق طبیعت میں قائم تھا) مضامین میں مذہبی رنگ غالب تھا اور اس میں نہ صرف اپنے بلکہ مولانا کے بھی مذاق طبیعت کی رعایت تھی۔ فاروق صاحب ابھی تک ''علی گڑھیت'' اور ''نیچریت'' کے اثر سے بالکل آزاد نہیں ہوئے تھے۔

بہرحال ان کا خط 20 نومبر کو حسب ذیل ملا:

''برادرم محترم السلام علیکم''

خط ملا، آمد کی خوشخبری جانفزا ہے۔خود میں جن حالات کے ہوتے ہوئے یہاں چلا آیا، انھیں سن کر غالبًا آپ بھی تھوڑا بار اپنے اوپر اٹھانا گوارا کریں گے۔ ہمدرد کی ذمہ داریوں کو خیال کر کے گھبرا اٹھتا ہوں۔ یہاں جو لوگ میرے ساتھ شریک ادارت ہیں وہ اگرچہ عام صحافت کا خاصہ تجربہ رکھتے ہیں۔مولانا محمد علی کے ادبی معیار اور ہمدرد کی گذشتہ روایات سے بیشتر بے خبر ہیں۔آپ کا عارضی طور پر آنا کم سے کم میرے لیے تو بے انتہا باعث تسکین ہوگا۔

آپ کی تحریروں میں آئندہ انشاءاللہ حسب ہدایت احتیاط کی جائے گی[1]۔

ایک عرض گستاخانہ بھی سن لیجیے۔ برائے خدا منقولیت میں اتنا بھی غلو نہ فرمائیں کہ ہمدرد کے صفحے صرف مدرسوں اور خانقاہوں کی درسیات میں شامل ہونے کے لائق رہ جائیں۔ یہی

1۔اب بالکل خیال نہیں آتا کہ یہ احتیاط کس چیز کے متعلق تھی (1952)۔

شکایت مجھے مولانا محمد علی صاحب سے بھی ہے۔ یہ نہ خیال فرمایئے گا کہ آپ لوگوں کے مولانا ہو جانے اور اپنے صرف حاجی رہ جانے پر رشک ہے۔

''خدا کے لیے آیئے اور جلد آیئے'' یہ مولانا محمد علی صاحب کے الفاظ ہیں، جن کا اعادہ کر رہا ہوں۔

محمد فاروق

''صرف حاجی رہ جانے'' میں تلمیح یہ ہے کہ ہمدرد میں ایک مستقل ظریفانہ کالم ملفوظات حاجی بغلول کے عنوان سے ہوتا تھا۔ اور یہ کالم عموماً فاروق صاحب ہی کے قلم سے نکلتا رہتا تھا۔ ہوتے ہوتے ہم لوگوں میں خود ان ہی کا نام ''حاجی صاحب'' پڑ گیا تھا۔

عارف ہنسوی کے بعد ایک آدھ خط مولانا کی طرف سے اسی درمیان میں آتے رہے۔ ہوتے ہوتے دسمبر کی شروع کی تاریخیں آگئیں۔ جب میں دہلی میں پہنچ پایا، کئی دن کے قیام کے ارادہ سے۔

....

وسط دسمبر کا زمانہ ہے۔ تاریخ غالباً 15۔ سردی اور پھر دہلی کی سردی۔ کامریڈ کو 19 کو نکلنا ہے۔ اور محمد علی کو بیلگام (علاقہ بمبئی) دیر سے دیر کرکے 18 کو روانہ ہو جانا ہے۔ اپنی صدارتِ کانگریس کا چارج گاندھی جی کو دینے، اور خود خلافت کانفرنس کا چارج لینے۔ ہوائی جہاز اس وقت کہاں تھے، تیز سے تیز ممکن سواری میل ٹرین تھی۔ کامریڈ کے لیے ایک سطر بھی ابھی تیار نہیں! ...... یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہ تھی۔ مدیر کامریڈ کی مصروفیتوں کا روزانہ یہی نقشہ رہتا تھا...... لیجیے 15 کا دن بھی تمام ہو گیا اور شام ہو گئی۔ کمپوزیٹر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور پریس کے منیجر صاحب اور ہیڈ پروف ریڈر دونوں بھنائے ہوئے ہیں کہ پرچہ وقت پر آخر کیسے نکل سکے گا۔ کمپوزیٹروں کو اجرت مفت کی مل رہی ہے، اور آخر وقت میں جب راتوں رات ان سے کام لیا جائے گا تو Over Time یا زائد اجرت خواہ مخواہ ہی دینی پڑے گی...... یہ قضیے بھی روز ہی رہتے تھے...... شام ہوئی، رات کے 9 بج گئے، ساڑھے 9 ہو گئے۔ دسمبر کی رات، معلوم ہوتا تھا آدھی رات ہو گئی۔ میں تو ادھر آرام سے سونے لیٹا۔ ادھر دیکھا کہ ذیابیطس کے

مریض اور کمزور محمد علی خوب گرم اونی جسٹر پہن پہنا دفتر کے کمرہ میں آبیٹھے۔ اور سکریٹری کی پکار ہوئی کہ ٹائپ رائٹر لے کر حاضر ہوں۔ اب محمد علی تھے، اور اس غریب رامپوری ٹائپسٹ سکریٹری کی جان۔

مضامین زبانی بولنے شروع کیے۔ دس بجے، گیارہ بج گئے، بارہ ہو گئے، شب بیدار ایڈیٹر پر آمد مضامین کی ہو رہی تھی، اور غریب سکریٹری پر نیند کی۔ بیچارہ کب تک جاگتا، کہیں اونگھ گیا۔ پس پھر کیا تھا، لگی غضب کی ڈانٹ پڑنے کہ ''شرم نہیں آتی مجھے دیکھ کہ بیمار ہوں، سن میں تم سے دوگنا ہوں، اتنی محنت کر رہا ہوں، تم تندرست ہو، جوان ہو، چند گھنٹہ بھی نہیں جاگ سکتے۔ چلو، ہٹو میں خود اپنے ہاتھ سے کرلوں گا، تمھاری مدد کا محتاج نہیں ہوں''۔ غرض وہ صاحب بیچارہ نکالے گئے۔ اسٹاف کے ایک دوسرے صاحب، جو اتفاق سے دفتر ہی کے ایک حصہ میں سو رہے تھے۔ یہ آواز سن کر جاگ پڑے تھے۔ وہ از راہِ انسانیت خود اٹھ کر آئے اور انھوں نے کام پورا کیا۔ صبح 5: ساڑھے 5: بجے میری آنکھ کھلی۔ نماز فجر میں ابھی دیر تھی، آسمان پر بالکل اندھیرا چھایا ہوا تھا، دیکھتا کیا ہوں کہ ایڈیٹر کا مریڈ کا کمرہ بجلی کے قمقمہ سے روشن۔ اور عین اسی وقت مولانا آفس کے کمرہ سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ راستہ میرے ہی کمرہ میں ہو کر تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ ''خیریت؟ ایسے ناوقت آفس کی طرف سے کہاں؟'' معلوم ہوا کہ ساری رات کام کر کے اب یہ اللہ کا بندہ اٹھا ہے! یہ شب بیداریاں، بد پرہیزیاں، بے اعتدالیاں، اچھے تندرست جوانوں کی صحت غارت کر دینے کو کافی تھیں، چہ جائیکہ ادھیڑ سن کا آدمی، فکروں، پریشانیوں سے دبا ہوا صدموں سے کچلا ہوا، بیماریوں سے لدا ہوا؟

واقعہ کوئی استثنائی نہیں۔ مثال محض نمونہ کے طور پر بیان ہوئی......اسلامی ہند کا یہ محبوب لیڈر آہستہ آہستہ لیکن قطعی طور پر خودکشی کی طرف قدم بڑھائے جا رہا تھا!

......☆☆☆......

باب:28

1:1925

(''امتحاں ہیں ایک مشتِ خاک کے'')

دسمبر کی سولھویں رات تو یوں گذری ہی تھی، سترھویں رات اور پھر اٹھارھویں رات بھی کچھ اسی طرح محمد علی کے حق میں دن بن کر گذری۔ انیسویں رات تھی، جب اول شب میں محمد علی بلگام کے لیے روانہ ہوئے۔ آخری پروف خود دیکھا کرتے تھے۔ موٹر اپنے پاس کہاں تھا، کسی کے ہاں سے منگوا لیا تھا۔ ریل کا وقت آگیا اور پروف ریڈری ختم نہ ہو پائی۔ موٹر پر بیٹھے، تو اسٹیشن تک دیکھتے گئے۔ ریل پر بیٹھے ہیں، جب بھی اس میں مصروف! لیجیے سیٹی ہوگئی اور گاڑی چلی! اب چلتی ہوئی گاڑی سے مولانا کاغذات پھینک رہے ہیں اور ان کے دفتر والے ریل کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے انھیں لے رہے ہیں!...... یہ تھی کامریڈ کے کام کی نوعیت اور مدیر کامریڈ کے طریق کار کا ایک نمونہ!

کامریڈ کا کام تھا اتنا کہ ایک اچھے قابل اور جید استعداد کے نائب ایڈیٹر کا پورا وقت مانگ رہا تھا۔ ملک بھر کی لیڈری، کانگریس میں شرکت، کانفرنسوں کی صدارت، جلسوں میں تقریریں، کمیٹیوں میں مباحثہ، یہ چیزیں تو خیر پھر بہت زائد اور بالکل الگ تھیں ہی، ہمدرد کی چیف ایڈیٹر تک جو اس سے ملتی جلتی ہی چیز تھی، وہ بھی کامریڈ کی ایڈیٹری کے ساتھ مل کر چلنا دشوار تھی۔ جتنی

ولایتی ڈاک آتی، خصوصاً اسلامی ممالک اور اسلامی مسائل سے متعلق ہر ہفتہ ولایت سے جس تعداد میں تراشے اور مختلف ولایتی اخبارات اور رسالوں کے آتے رہتے تھے، ان ہی کو پڑھنا، ان میں چھانٹ کر کامریڈ میں نقل یا نقد کے لیے انتخاب کرنا، یہی ایک کام ایسا تھا جو ہفتہ میں پورے دو دن کا وقت لے لیتا۔ پھر نوٹ لکھنا، مقالہ تیار کرنا، مراسلوں کی دیکھ بھال رکھنا، مراسلہ نگاروں سے مراسلت کرنا، پرنٹ کے آخری پروف دیکھنا، یہ سارا کام اتنا پھیلا دے کا تھا کہ ایک کیا معنی، اگر دو اچھے قابل مددگار ہوتے، جب جا کر انجام پا سکتا تھا...... مسلمانوں کی قسمت میں یہ کہاں تھا؟

....

محنت کا نمونہ آپ دیکھ چکے۔ اب ایک سرسری اندازہ مصارف کا لگاتے چلیے۔ 19 کا پرچہ تو جوں توں نکل گیا۔ اب 26 کے پرچہ کے لیے کیا ہو؟ اس کے لیے منقولات واقتباسات کا ذخیرہ تو خیر چھوڑ گیے تھے۔ کچھ جگہ ''مکتوب لندن'' سے بھر دی گئی اور کچھ گاندھی جی کے خطبہ صدارت سے۔ لیکن ایڈیٹوریل کے نام سے ایک آدھ کالم کیا معنی، ایک سطر بھی موجود نہیں! محمد علی کو بلگام پہنچ کر کانگریس اور خلافت دونوں کی سبجیکٹ کمیٹی، ورکنگ کمیٹی، اس کمیٹی، اس کمیٹی سے مہلت بھلا کہاں مل سکتی تھی۔ اب اسے ان کی کرامت کہیے یا اعجاز کہ 24 دسمبر کو خدا معلوم کہاں بیٹھ کر اور دن رات کے 24: گھنٹوں میں سے کون سا وقت نکال کر، عین ہنگاموں کے شباب میں ایک زبردست مقالہ سوا سات، ساڑھے سات کالم کا لکھ ڈالا!...... لیکن اب اسے بھیجیں تو کیسے بھیجیں؟ کہاں بلگام کہاں دہلی! حیرت کے کانوں سے سنیے اور ماننے کا دل چاہے یا نہ چاہے، بہر حال یقین بھی فرمالیجیے، کہ کامریڈ کے اسی مفلس وقلاش ایڈیٹر نے (جو ''قوم'' ہی کے بقول قومی چندہ کھاتا رہتا اور ہضم کرتا رہتا تھا!)...... اتنا طویل وعریض مضمون سارے کا سارا تار پر اپنے پرچہ کے لیے روانہ کیا!...... ستم پر ستم یہ کہ دو ڈھائی کالم کے قریب مضمون 24 کو روانگی سے رہ گیا، وہ 25 کو روانہ ہوا۔ 25 دسمبر کو بڑے دن (کرسمس) کی تعطیل، تارگھر، ڈاک خانہ، سب ہی کہیں ہوتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ 25 کو ان دو ڈھائی کالموں کے مضمون کی فیس ایکسپریس تار کی شرح سے دوگنی دینی پڑی!

ان شاہ خرچیوں کی ہمت اچھے اچھے سرمایہ دار اور روپیہ والے اخبار بھی مشکل ہی سے

کر پاتے۔ لیکن اس دیوانہ ملت کو جوش واخلاص کے پتلے کو، کام کی دھن میں خدمت ملی کے جنون میں جس طرح نہ اپنی صحت کی پروا تھی نہ اپنے آرام کی نہ اپنے وقت کی، اسی طرح اپنے پیسہ کی پروا بھی کب تھی؟......اس کی قوم کا کام تو صرف اعتراض کرنا، دل خراش، دل آزار، دل شکن نکتہ چینی کرنا، طنز وتعریض کرنا تھا۔ بجز آس پاس رہنے والوں کے اور کسی کو کیا علم کہ یہ مخلص خادم قوم وملت کے لیے روزانہ کس کس طرح اپنا خون جگر کرتا رہتا ہے۔

....

یہی زمانہ یعنی شروع جنوری 25 کا تھا جب لکھنؤ میں بعض قدیم دوستوں کی صلاح ومشورہ سے ایک اپنا مستقل ہفتہ وار نکالنے کی ٹھہری۔ نام عام فہم سچ قرار پایا۔ ایڈیٹری پر نام تین آدمیوں کے رہے۔ مولوی ظفر الملک علوی ایڈیٹر ''الناظر'' (جو سچ کے منیجر اور گویا ''مالک بھی تھے) اور مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی اور تیسرا یہ خاکسار۔ شروع شروع مولوی عبدالرزاق خان ندوی ملیح آبادی بھی (جو بعد کو کلکتہ جا کر کچھ سے کچھ ہوگئے) ہر مشورہ میں شریک بلکہ پیش پیش رہے۔ مولوی ظفر الملک تو چھ مہینہ کے بعد ایڈیٹری سے الگ ہو کر صرف منیجر رہ گئے، اور نگرامی مرحوم کوئی 13 مہینہ کے بعد عین جواں عمری میں رحلت فرما گئے۔ اور پرچہ کی باگ تمام تر میرے ہی ہاتھ میں آ گئی۔ بہر حال شروع میں یہ پرچہ بڑی حد تک میرا تھا۔ سچ اس وقت گاندھی جی اور علی برادران کے مسلک کی تقلید میں ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار اور برطانیہ کے خلاف ہر قسم کے ترک موالات کا نقیب تھا۔ مضامین کا بڑا حصہ ہمیشہ مذہبی رنگ کا ہوتا تھا۔ اخلاقی اور دینی اصلاح اس کے خاص مقاصد میں داخل تھی اور طرز تحریر میں شروع شروع ایک عرصہ تک کوشش اس کی رہی کہ گاندھی جی کے ینگ انڈیا کی تحریروں کی سادگی وسلاست کا نقش ثانی اردو میں پیش ہوتا رہے..... ''اردوئے معلیٰ'' کی مشق کچھ روز تک اس ''اردوئے مہند'' (کانگریسی اردو یا ہندیائی ہوئی اردو) کے آگے ملتوی رہی!

اپنا وقت جتنا سچ کے لیے صرف کرتا، اس سے کچھ زائد ہی ہمدرد کے لیے بھی نکالتا۔ اور دریاباد کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے جتنی بھی خدمت ممکن ہوتی، اپنی بساط کے لائق دونوں کی کرتا رہتا۔ ہمدرد کے لیے مستقل مضامین الگ لکھ کر بھیجتا رہتا، ہر پرچہ کے لیے قرآن مجید کی ایک آیت

مع تشریحی ترجمہ کے دیتا۔ اور سچ کے متعدد مضامین ہمدرد خود بھی اپنے ہاں نقل کرتا رہتا۔ فاروق صاحب عرصہ تک جمنے والے نہ تھے۔ ایک طویل مدت کے لیے وطن جا چکے تھے، اور اب ہمدرد کے شعبۂ ادارت میں سب سے سینئر اور با اختیار عارف ہنسوی تھے۔ ان ہی کے خط کبھی اپنی طرف سے اور کبھی مولانا کی طرف سے بکثرت موصول ہوتے رہتے۔ ہفتہ وار تو بہرحال اور کبھی اس سے بھی جلد جلد...... دو ایک خط ان کے ملاحظہ ہوں۔ ان سے ہمدرد اور ''ہمدردیات'' پر اچھی خاصی روشنی پڑے گی۔

20 جنوری 25 کا مکتوب:

''مضامین پہنچے۔ فاروق صاحب پھر آج کل گورکھپور گئے ہیں۔ جوش صاحب [1] کا مضمون ان ہی نے دیکھ کر دیا تھا اور انھیں افسوس ہے کہ ایک ایسا فقرہ رہ گیا جو نامناسب تھا، آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔

سچ سے ہندو مسلم اتحاد والا مضمون آج نقل ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ آج کل کام بہت کرنا پڑتا ہے اس لیے صرف چار آدمی ہیں'' [2]۔

....

افغانستان سے عین اسی زمانہ میں خبر آئی کہ دو ''احمدی'' (قادیانی) بہ الزام ارتداد سنگسار کر دیے گئے۔ ہندوستان کے بیشتر بلکہ تقریباً سب ہی علما نے اس کی بزور موافقت کی، اور حکومت افغانی کے اس طرزِ عمل کی تحسین و تصویب سے اردو کا سارا مسلم پریس گویا گونج اٹھا۔ مولانا محمد علی وجوب قتل مرتد کے قائل نہ تھے۔ اور ان کے دونوں اخبارات نے سب سے ہٹ کر کابل گورنمنٹ پر نکتہ چینی کی روش اختیار کی۔ اور مذہبی دلائل بھی قتل مرتد کے خلاف دینے شروع کیے...... میں خود اس وقت اس مسئلہ میں متردد و مذبذب تھا اور کوئی قطعی بات اپنے قلم سے لکھنا نہیں چاہتا تھا، اصلی

---

1 مراد جوش ملیح آبادی نہیں بلکہ سلطان حیدر (علیگ) بدایونی ہیں جو اس زمانے میں مجھ سے بہت ناخوش تھے۔

2 یہ ''صرف'' کا لفظ عارف صاحب کی زیادتی تھی، عام معمول اس زمانے میں اردو روزناموں میں صرف تین شخصوں کا تھا، ایک ایڈیٹر، ایک مددگار، ایک مترجم یا اڈیٹر اور دو مترجم۔ ہمدرد میں تو اس حال میں بھی علاوہ مولانا کے چار آدمی تھے۔

سوال اس وقت نہیں، بہت بعد کو خیال آیا کہ نفس قتل مرتد کے بجائے یہ رکھنا تھا کہ قادیانی اس معنی میں مرتد ہیں بھی جس معنی میں مرتد واجب القتل ٹھہر جاتا ہے۔ بہر حال اس وقت تو 12 فروری کو عارف صاحب نے یہ لکھا:

''مکتوب گرامی موصول ہوا۔ مضامین کی رسید عرض ہے۔ فاروق صاحب اب تک نہیں آئے اور نہ آخر مارچ تک آئیں گے۔ آج کل صرف چار آدمی ہیں۔ فاروق صاحب کی عدم موجودگی تکلیف دہ ہے۔

کابل میں پھر دو احمدی سنگسار کردیے گئے۔ قتل مرتد کے وجوب یا عدم وجوب کے متعلق ایک مدلل مضمون کی ضرورت ہے۔ اور آپ ہی سے درخواست کی جاسکتی ہے ہمدرد اس کے خلاف آواز بلند کررہا ہے۔ خدا معلوم آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ قتل مرتد کے قائل اور احمدیوں کو مرتد اور واجب القتل سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ کتاب وسنت کی بصیرت سے قتل مرتد کے خلاف نتیجہ پر پہنچیں، اور قادیانیوں کو بھی مرتد نہ تصور کرتے ہوں تو ضرور ایک مدلل مضمون ارقام فرمائیے۔

ہمدرد تو اس کے خلاف آواز اٹھا رہا ہے۔ باقی حالات بدستور۔ اشاعت نہیں بڑھ رہی ہے''۔

یہ سب سے آخر کا ذرا سا فقرہ بہت پرمعنی تھا۔ ''پھیکے'' مضامین ہمدرد میں بھلا کہاں، جن کی ہر طرف مانگ تھی نہ ''دل پسند'' خبریں، نہ بھڑکا دینے والی سرخیاں، نہ گرما گرم نوٹ۔ خود قتل مرتد کے مسئلہ میں مخالفانہ پہلو لینا مسلمانوں میں کب مقبول ہوسکتا تھا۔ یہی غنیمت ہے اس کی سزا میں ہمدرد کا بائیکاٹ (مقاطعہ) ہی فوراً شروع نہیں ہوگیا۔

دوسرا خط اسی سے متصل 19 فروری کا لکھا ہوا:

''جن صاحب کا خط آپ نے بھیجا تھا، ان کی نسبت مولانا فرماتے ہیں کہ وہ کام نہ دے سکیں گے اور سکھانا میرے لیے سخت دشوار ہے۔ اس وقت بھی دو ایسے آدمی ہیں جن سے بجائے مدد ملنے کے وقت ضائع ہوتا ہے۔

ارتداد کے متعلق مضامین 1 آپ نے دیکھے ہوں گے۔ یہ میرے لکھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں ٹھیک طور پر نہیں لکھ سکتا۔ ادھر ادھر سے لے کر کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ مولانا عبدالحی صاحب

1 مراد وہی قتل مرتد کے سلسلہ کے مضامین ہیں۔

[1] کو میں بھی لکھ رہا ہوں متعصب کی پروا اس معاملہ میں نہیں کی جا سکتی۔

''اخبار نویسی'' والا لیڈنگ آرٹیکل میرا ہی تھا۔ اور قریب قریب تمام ایڈیٹوریل میرا ہی ہوتا ہے۔ غلطیاں بہت رہ جاتی ہیں، اس کا سخت افسوس ہے۔ خطبہ والا مضمون لیڈ بنا دیا گیا[2]۔ غالباً کوئی اعتراض تو نہ ہوگا''۔

......☆☆☆......

---

[1] مراد مولوی خواجہ عبدالحی صاحب (فاضل دیوبند) استاد جامعہ ملیہ ہیں، ان سے توقع کی تھی کہ مسلک جمہور کے خلاف قتل مرتد کے مسئلہ میں ہمدرد کے ہمنوا ہوں گے۔

[2] سچ میں ''خطبۂ جمعہ کی زبان'' پر میرا مقالہ نکلا تھا۔ اس کو ہمدرد کو بھی لیڈ بنا دیا گیا ہے۔

باب:29

2:1925

(''دریاباد کی دریادلی'')

اب بڑی آسانی تھی۔ بڑے ہندوؤں یا انگریزوں کے لیے جو کچھ لکھوانا چاہتا، محمد علی کو ایک کارڈ میں لکھ دیتا یا جب دہلی جاتا تو زبانی کہہ آتا، اور کامریڈ میں، بہترین انداز کے ساتھ، اس پر نکل جاتا۔ دہلی اب جلد جلد آنا جانا رہتا ہی تھا۔ کوئی ہر تیسرے چوتھے مہینے۔ اور مولانا سے ان وقفوں کے درمیان لکھنؤ میں جو ملاقاتیں ہو جاتیں وہ ان کے علاوہ۔ سچ اور مدیر سچ دونوں کا ہمدرد سے گہرا تعلق بدستور قائم تھا، بلکہ تعلق روز افزوں۔ عارف صاحب شروع مارچ کے خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کا کارڈ مولانا کو دے دیا گیا۔ وہ کامریڈ میں اس کے متعلق لکھیں گے۔ اس کے بعد ہمدرد میں اس کو دیکھ کر لکھا جائے گا۔ غالباً گاندھی جی کو غلط فہمی ہوئی۔ وہ قرآن کے متعلق یہ سمجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے، اور اس میں غلطی کا امکان نہیں یا قرآن کا حرف حرف واجب التعمیل نہیں۔ خیر اس کے متعلق لکھا جائے گا[1]۔

میری ایک گذارش ہے، وہ یہ ہے کہ آج کل اسٹاف بہت کم ہے۔ صرف چار آدمی ہیں اور

1۔ اب مطلق یاد نہیں پڑتا کہ مولانا کو توجہ کس مسئلہ پر دلائی گئی تھی۔ باقی اتنا تو ظاہر ہے کہ اس کا تعلق گاندھی جی کی کسی مذہبی غلط فہمی سے تھا۔ 1952۔

سارا ایڈیٹوریل مجھی کو لکھنا پڑتا ہے۔ اور کسی کسی دن لکھا لکھایا ایڈیٹوریل ضائع کر دینا اور فوراً دوسرا لکھنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے اخبار میں دیر ہونے کے علاوہ مجھ کو بھی سخت اذیت ہوتی ہے، کیونکہ فوراً لکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس لیے گزارش ہے کہ تین چار ایسے مضامین جناب لکھ کر بھیج دیں جو غیر موقت ہوں اور اگر سال بھر بھی وہ شائع نہ کیے جائیں تو کوئی حرج نہ ہو۔ جیسا کہ آپ نے بیچ میں ابھی ایک مضمون لکھا تھا جس کو ہمدرد میں بھی نقل کیا گیا تھا۔ غالباً مسلمان اور خدا کی غلامی پر تھا۔ اگر اسی قسم کے دو چار مضمون محفوظ رہیں تو بہت اطمینان نصیب ہو جائے۔ جناب نے بہت دنوں سے ہمدرد کے لیے کچھ نہیں تحریر فرمایا''۔

....

قتل مرتد پر سلسلۂ بحث گرم تھا اور فرنگی محل، دیوبند، وغیرہ سارے طبقات علما کے مقابلہ میں ہمدرد ابھی تک جما ہوا تھا۔ ہمدرد کے مضمون تو خیر اوسط درجہ کے ہوتے تھے، لیکن خود مولانا کی قلم سے کامریڈ میں مضمون خوب نکلا تھا۔ مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ احادیث میں جس ارتداد کی سزا قتل آئی ہے، وہاں مجرد بدعقیدگی مقصود، بلکہ بدعقیدگی سے بغاوت مراد ہے، اور اس ضمن میں خود حدیث کے مرتبہ ومقام سے بحث بڑی دلچسپ تھی۔ بحث کے دوسرے جزو، یعنی آیا قادیانی (احمدی) مرتد ہیں یا نہیں، اس سے مولانا نے تعرض ہی نہیں کیا تھا۔ بہر حال اس انگریزی مقابلہ کے حسن انشا، زور استدلال اور حدیث فہمی کی داد میں نے مولانا کو بے اختیار لکھ بھیجی تھی۔ اس کے جواب میں عارف صاحب کا مکتوب مورخہ 19 مارچ:

''مولانا فرماتے ہیں کہ جو تعریف جناب نے فرمائی ہے میں اس کا مستحق نہیں ہوں، بلکہ میں نے تو جو مواد مجھ کو دوسرے سے ملا، بس اس کو ترتیب دے دیا۔ مجھے تو زیادہ تر امداد اپنے ہمنام مولوی محمد علی صاحب لاہوری سے ملی ہے[1]۔ مولانا صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ آپ براہ کرم قتل مرتد کے متعلق جس قدر احادیث واقوال اقوال ائمہ[2] ہیں وہ سب بھیج دیں۔ وہ اس مسئلہ کو ادھورا چھوڑنا نہیں چاہتے۔ مگر فی الحال ہمدرد میں اس پر بحث کا ارادہ ملتوی ہے۔ اس لیے آپ کا مضمون

[1] یہ اشارہ مولانا محمد علی لاہوری کی کتاب مقام حدیث کی طرف ہے، جس میں حجیت حدیث پر بڑی سلجھی ہوئی گفتگو ہوئی ہے۔
[2] ''ائمہ'' سے مراد اہل سنت کے ائمہ فقہ ہیں۔

اور دوسرے بزرگوں کے مضامین بھی روک لیے ہیں کہ جب پوری طرح اظہار خیال دوسرے لوگ کرلیں اس کے بعد ہمدرد اس کو شروع کرے۔

فاروق صاحب کا کوئی پتہ نہیں۔

میں نے کسی سابق عریضہ میں گزارش کی تھی کہ چند ایسے مضامین جو موقت نہ ہوں اور بلا قید زمانہ وموسم ہر ایک وقت کام دے سکیں مرحمت فرمایئے تاکہ وہ محفوظ صیغہ میں رکھے رہیں۔ اور اگر ضرورت اچانک پیش آجائے تو ان سے کام لیا جاسکے۔ بیچ کا گزشتہ پرچہ جس میں ہندو مسلم اتحاد کے متعلق دوسرا مضمون شائع ہوا ہے وہ مولانا کے پاس سے گم ہوگیا ہے، اس لیے براہ کرم بھجوادیجیے۔

عین یہی زمانہ تھا یعنی مارچ کا آخری ہفتہ (اور ماہ مبارک رمضان کی کوئی شروع کی تاریخ) کہ مجھے محسوس ایسا ہوا کہ قلب کے مرض کا دورہ کسی سخت قسم کا پڑا ہے۔ اور ایک صبح کو تو یہ معلوم ہوا کہ جیسے اب دل کی حرکت رکی سی جارہی ہے۔ محمد علی یہ چیز پا کر قدرتاً بہت متاثر ہوئے۔ اور انھیں گمان یہ گذرا کہ میں بعض مشائخ اور اہل طریق کی صحبت میں رہ کر اور ان کے ملفوظات وغیرہ سے متاثر ہو کر تقلیل غذا وغیرہ کچھ بہت زائد کرنے لگا ہوں، اور یہ اس کا اثر ہے...... عارف صاحب کا خط حسب ذیل آیا:

''آپ کی ناسازیٔ طبع کا حال معلوم کر کے سخت افسوس ہوا۔ واقع قلبی امراض میں اس قدر طوالت باعثِ تشویش ہے مگر خدا کے لیے دوا علاج کی جانب توجہ فرمایئے۔ دعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہے۔ مسلمان پر کچھ حق اس کے جسم کا بھی ہے، کل ہی میں نے بخاری شریف کتاب الصوم میں دیکھا ہے کہ اپنے بدن کا حق بھی مسلمان کو ادا کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ محنت اور شب بیداری کی کثرت وتطویل زیادتی مرض کا باعث ہے۔ مجھے تو جب سے جناب سے نیازمندی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ایک قسم کا فخر وغرور محسوس کرتا ہوں، اور اس حالت کو سن کر سخت تشویش پیدا ہوگئی ہے۔ خدائے تعالیٰ جلد صحت عطا فرمائے۔

جناب کا خط پڑھ کر مولانا سخت متاثر ہوئے۔ اور جواب لکھنے کے لیے انھوں نے خط رکھ لیا ہے۔ ان کی بھی یہ رائے ہے کہ اپنے جسم کا حق آپ کو ادا کرنا چاہیے۔ خدائے بزرگ وبرتر سے دعا ہے کہ جناب کو صحتِ کامل عطا فرمائے۔

ایک لطیفہ بھی اسی سلسلہ میں سن لیجیے۔ حالانکہ اس کے درج کرنے کا اصل موقع کئی ورق قبل

تھا...... 23 کے آخر میں مولانا کا مہمان ہو کر علی گڑھ پہنچا تو اگرچہ تقلیل غذا وغیرہ کے بعض معمولات کچھ تھوڑے بہت اس وقت جاری تھے، لیکن چائے کا غیر معمولی شوق بھی اس زمانہ میں تھا۔ پیالیوں پر پیالیاں، بلکہ چائے دان پر چائے دان خالی کر دیا کرتا تھا۔ سفر میں ایک مستقل سماور ساتھ رکھے ہوئے تھا۔ صبح کے ناشتہ پر مولانا کی نظر اس سفری سماور پر جو چائے سے لبالب تھا پڑی، معاً ہنس کر بولے "دیکھیے، شیطان بھی بڑا ذہین ہے، آخر اپنے لیے راستہ ڈھونڈ ہی لیا نہ۔ اب آپ تک اسی سماور کی ٹونٹی کے راستہ سے پہنچے گا"۔

....

محمد علی سے تعلقات تو اتنے تھے، اور لکھنؤ وہ بار بار آتے ہی رہتے۔ پر دریاباد تشریف لانے کی نوبت کبھی نہ آتی۔ میں ہی ہمیشہ چل کر لکھنؤ آ جایا کرتا تھا اور ایک خادم کو مخدوم کے لیے یہی کرنا چاہیے بھی تھا۔ لیکن محمد علی تو اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ چاکروں کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ خود ہی لکھنؤ آ کر کئی بار فرمایا کہ "دریاباد اب چلتا ہوں، اور اب کی ضرور چلوں گا"۔ میں بھی ہر مرتبہ معذرت کر دیتا اور یہ واقعہ عرض کر دیتا کہ "جی نہیں، میرا غریب خانہ آپ کے چلنے کے قابل نہیں۔ جب خود ہی بلاؤں گا، آئیے گا"...... واقعی ہر بار شرم ہی آ کر دامن گیر ہو جاتی تھی۔

جون میں خیال آیا کہ آخر پارسال علی برادران بڑے گاؤں کو مشرف کر چکے ہیں اب کی برسات میں "آموں کی دعوت" پھر رہے، اور اب کی باری دریاباد کی آئے، کچھ نذرانہ پیش کرنے کا بھی تہیہ کر لیا۔ خط و کتابت شروع کی۔ بڑے بھائی مولانا شوکت علی تو چندہ کی چاٹ میں چٹ سے راضی ہو گئے۔ اور نیم وعدہ محمد علی نے بھی کر لیا۔ مقصود تو ان ہی کو بلانا تھا، بڑے بھائی کو تو کچھ شرماشرمی ہی شریک کر لیا گیا تھا۔ لیکن کامریڈ واقعی محمد علی کے لیے زنجیر پا بنا ہوا تھا۔ عارف صاحب کے 22 جون کے خط میں ہے:

مضامین کا شکریہ۔ مولانا صاحب نے آموں کی دعوت کے متعلق صرف یہ جواب دیا ہے کہ کامریڈ کو کیا کروں۔ مولانا شوکت علی صاحب کب آ رہے ہیں۔ ان کی تاریخ آمد معلوم ہو تو پھر یاد دہانی کروں گا۔ مگر آثار ایسے نظر آتے ہیں کہ بقرعید سے پہلے یہاں سے نکلنا ناممکن ہوگا کیونکہ یہاں ان کا اس موقع پر رہنا ضروری ہوگا"۔

جولائی کا شاید دوسرا ہفتہ تھا، جب مولانا شوکت علی تنہا وارد دریاباد ہوئے۔ قصبہ میں استقبال خوب دھوم دھام سے ہوا۔ اور مجمع یہاں کی تاریخ میں بے نظیر رہا۔ جلوس، جلسہ، تقریریں سارے ہی لوازم پورے ہوئے۔ چندہ بھی قصبہ نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر دیا، ساڑھے سات سو کی رقم پیش کر دی جو 22 کے گرمجوشی کے نہیں، 25 کی ٹھنڈک کے موسم میں غیر معمولی رقم سمجھی گئی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن دل کی خوشی ادھوری ہی رہی۔ اس لیے کہ بالآخر آمادہ ہو جانے کے باوجود محمد علی عین وقت پر اپنی علالت کے باعث قابل سفر نہ ہو سکے.....آہ! اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اصلی خوشی تو ان ہی کے خیر مقدم کرنے کی تھی۔

ہمدرد میں ''دریاباد کی دریادلی'' کے عنوان سے ایک دلچسپ نوٹ بھی نکلا کہ دریاباد کے مسلمانوں نے تو یہ نذرانہ مولانا محمد علی کی خدمت کے لیے فراہم کیا تھا، مولانا شوکت علی خواہ مخواہ پہنچ گئے اور ساری تھیلی پر بلا تقسیم وشرکت خود قابض ہو گئے۔ شوکت صاحب نے اپنے اخبار خلافت میں اس کا جواب اسی انداز میں دیا.....دونوں بھائیوں کے اخباروں میں نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

عارف صاحب کے 12 جولائی والے خط میں ہے:

''دریاباد کی دریادلی کا جواب بھی مولانا شوکت علی کا لکھا ہوا نظر سے گزرا ہوگا''۔ محرم والا مضمون 8 اور 9 محرم کے ہمدرد میں لیڈنگ آرٹیکل کی صورت میں نکلے گا۔ [1] اس مضمون نے مجھ کو زحمت سے بچالیا۔ شوکت صاحب سے تھیلی کا تقاضا کیا گیا مگر آپ جانتے ہیں کہ روپیہ پر بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔ ایک نوٹ اس چھین جھپٹ پر بھی لکھا جائے گا۔

کل علی برادران امرتسر گئے۔ مولانا محمد علی کا باوجود ضعف ونقاہت کے یہ سفر کرنا اچھا نہیں مگر وہ نہ مانے''۔

کیسے مانتے۔ اطلاع انھیں یہ مل چکی تھی کہ ڈاکٹر کچلو وغیرہ اکابر پنجاب سب خلافت کمیٹی کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئے ہیں۔ اب صحت وغیرہ کا خیال کب مانع راہ بن سکتا تھا۔

---

[1] ہمدرد میں میرے بکثرت مضامین بغیر میرے نام کے نکلے ہیں، کبھی لیڈنگ آرٹیکل بن کر، کبھی مراسلات وغیرہ میں کسی فرضی نام سے

باب:30

3:1925

(ملت کی طرف سے ''قدردانی'')

اگست کا آخری ہفتہ تھا اور میں مولانا کے یہاں مقیم۔ خبر ملی کہ مولانا کی بڑی صاحبزادی (زہرہ بی، صاحبۂ زاہد علی خان) کا بچہ عارف رامپور میں سخت علیل ہے۔ مولانا کو اپنے بچوں بچیوں میں کون محبوب نہیں تھا، لیکن یہ پیارا نواسہ تو شاید سب ہی سے بڑھ کر عزیز و محبوب تھا۔ رامپور میں داخلہ ممنوع تھا۔ جاتے تو کیسے جاتے۔ تڑپ کر رہ گئے۔ معلوم ہوا ''ہز ہائنس نواب صاحب فرزند دل پذیر سلطنت انگلشیہ'' بمبئی میں ہیں۔ ان کی خدمت میں داخلہ کی اجازت کے لیے ایک لمبا اور موثر تار بمبئی لکھا۔ ابھی یہ تار جانے بھی نہیں پایا تھا کہ رامپور سے بچہ کی وفات کا تار آ گیا! اب محمد علی سارا کام کاج چھوڑ پہلی ٹرین سے رامپور روانہ ہوئے کہ اسٹیشن ہی پر بیٹھے بیٹھے دفن سے قبل لخت جگر کا ایک بار دیدار کرلیں گے اور گھر کہلا بھیجیں گے کہ معصوم کی میت کوئی میل کا چکر دے کر پہلے اسٹیشن لائیں۔ پہنچے تو معلوم ہوا کہ تدفین ہو چکی ہے! (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن)۔ اسٹیشن پر چند گھنٹے ٹھہر، اور رو دھو کر پہلی ٹرین سے دہلی واپس آ گئے...... مولانا کی روداد زندگی میں یہ ناکامی در ناکامی، حسرت در حسرت کی کوئی انوکھی اور نرالی مثال نہیں!

....

آتے ہی دوسرے دن پانی پت چلنے کی ٹھہری...... ان مسلسل سفروں کے بعد کامریڈ کا بس خدا ہی حافظ تھا...... بلووں، ہنگاموں کی ہوا تو چلی ہوئی تھی ہی، پانی پت میں (جو دہلی سے کوئی 55-50 میل کے فاصلہ پر ہوگا) یکم اگست کو قربانی گاؤ کے سلسلہ میں شدید ہنگامہ ہو چکا تھا، اور پانی پت کے مسلمان مصر ہوئے کہ مولانا اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ ایسے ایسے ہنگامے خدا معلوم کتنے مقامات پر ہو چکے تھے اور روزانہ ہوتے ہی رہتے تھے۔ کسی آل انڈیا لیڈر کے پاس اتنا وقت کہاں سے آسکتا تھا کہ ہر شہر اور قصبہ کے مقامی فساد اور بلووں سے اتنی دلچسپی لے۔ لیکن محمد علی کے ہاں مسلمانوں کا کوئی معاملہ چھوٹا معاملہ تھا ہی نہیں۔ کسی ادنیٰ سے مسلمان کو دنیا کے کسی گوشہ میں تکلیف پہنچ جائے، اور محمد علی اس کے لیے بے چین ہو رہے ہیں، مضطرب پھر رہے ہیں۔ ہر ہر واقعہ کی تحقیق کا اہتمام اس پر مستزاد۔ جب روداد کے ایک ایک جزئیہ کی خود پوری تنقیح نہ کرلیں دم نہ لیں اور بغیر ان سارے مراتب کو طے کیے اس موضوع پر لکھنا حرام سمجھیں ع

معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے!

رات دن اگر 24 گھنٹہ کے بجائے 48 گھنٹہ کے ہونے لگتے جب بھی اتنی فرصت کہاں سے ہاتھ آسکتی تھی۔ بات موٹی سی تھی لیکن محمد علی کے ہاں مسلمان کی تکلیف کے بعد عقل مصلحت سنج کیا ہر دور اندیشی غائب؛ پانی پت چلنے کے لیے بے قرار۔ کامریڈ ایک ہفتہ یوں ہی بچھڑا ہوا تھا، یہ رامپور سے آتے ہی دوسرے دن کامریڈ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کو ہمراہ لے کر پانی پت روانہ ہو گئے۔ رفاقت سفر کی سعادت مجھے بھی حاصل۔ چلنے لگے تو جیب میں دام نہیں۔ پانی پت کا فاصلہ ہی کیا لیکن کرایہ وہاں تک کے لیے بھی سیکنڈ کلاس کا تو خیر کیا نکلتا، تھرڈ کلاس کا بھی بس جوں توں ہی نکل پایا!...... یہ تھا 7،8 کروڑ مسلمانوں کا سب سے بڑا لیڈر ''چندہ کا لاکھوں روپیہ اڑا جانے والا'' لیڈر!

....

برسات کی گرمی اور امس، دوپہر کا وقت، تیسرے درجہ کی ایک کھچا کھچ بھری ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر عبدالمجید خواجہ مل گئے۔ دل نے کہا کہ شاید یہ ٹکٹ تھرڈ سے

سیکنڈ کا تبدیل کرا دیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے خواجہ خود بھی اس وقت تہی دست ہو رہے تھے۔ ''ترکِ موالات'' کے ماتحت بیرسٹری تو بہرحال چھوڑے ہی ہوئے تھے۔ خیر کوئی دو گھنٹہ میں پانی پت پہنچ گئے۔ ایک شکستہ حال سا تانگہ اسٹیشن پر ملا۔ اسی پر تینوں آدمی سوار ہو چلے...... لیڈر کا استقبال ہمیشہ جلوسوں اور نعروں میں موٹروں اور جوڑیوں ہی سے نہیں ہوتا۔ بازاروں سے ہوتے ہوئے پہلے شاہ بوعلی قلندر کے مزار پر حاضر ہوئے اور پھر مولوی حافظ لقاء اللہ صاحب کے ہاں آ کر ٹھہرے 1۔ عصر کے وقت سے مولانا کا گشت پیدل شروع ہوا۔ مسلمانوں کا ایک جم غفیر ساتھ، ہندو بھی جابجا شریک ہوتے گئے۔ پکے اور کچے راستوں کی خاک چھانتے اور خاک پھانکتے، پسینہ میں ہم سب لت پت، آگے آگے مولانا، قصبہ کی وہ سڑکیں، گلیاں، پگڈنڈیاں دیکھ رہے ہیں، جن کی بابت نزاع ہو چکی یا آئندہ احتمال نزاع تھا۔ اور سوالات کی بھرمار کرتے جاتے ہیں۔ میں قلم گھسنے کا عادی اور فلسفہ مشائی سے ناآشنا، مولانا سے سن میں 14 سال چھوٹا ہونے کے باوجود اس فوجی مارچ میں ان کا ساتھ دینے کی ہمت مردانہ کہاں سے لا سکتا تھا۔ میل آدھ میل کا معاملہ ہوتا تو نباہ بھی لے جاتا۔ غرض میں تو گھنٹہ بھر کے بعد شل ہو کر راستہ سے کٹ گیا اور ذیابیطس کے اس مریض کو جسے صاحب فراش رہے ہوئے بھی ابھی چند روز گزرے تھے، گھنٹوں اسی طرح مسلسل گشت کرتے رہنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔

خاصی رات گئے جب وہ واپس آئے ہیں تو قصبہ کے سربرآوردہ ہندو بھی ساتھ ساتھ۔ اور ان ہی میں روزنامہ تیج (دہلی) کے ڈائرکٹر شری جت دیش بندھو گپتا بھی 2، اور فلاں اور فلاں۔ یہ اب اگر مولانا کو چھوڑنا چاہتے بھی تو مولانا انھیں نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ جرح ایک ایک سے کر رہے ہیں۔ یہاں بھوک سے آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ ادھر میزبان صاحب ہیں کہ دعوت وضیافت کے انتظامات ہی سے چھٹی نہیں پا چکتے! ساڑھے 10: پر خدا خدا کر کے کھانا نصیب ہوا...... آپ کہتے ہوں گے کہ خیر 11: بجے رات کو تو محمد علی غریب کو دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد لیٹنے کو ملا ہوگا۔ جی یہ کہاں! لیٹ کر تو میں سویا۔ محمد علی اس وقت، جی ہاں اتنے

---

1 اس وقت تک میں انھیں ایک عام ملی خادم و کارکن سمجھتا تھا۔ ان کے بے پناہ اخلاص اور عمل دینی کا اندازہ کئی سال بعد ہوا۔ 2 ان کی وفات عین ان سطور کی نظر ثانی کے وقت کلکتہ میں ایک ہوائی حادثہ میں ہوئی (نومبر 1951)

ناوقت کسی حاکم سے (شاید ڈپٹی مجسٹریٹ سے) ملنے اور اسی معاملہ پر بحث وگفتگو کرنے پیدل روانہ ہوئے! کوئی ڈیڑھ بجے کا وقت ہوگا جب مجھے نیند میں کچھ آہٹ محسوس ہوئی۔ معلوم ہوا اب واپس تشریف لائے ہیں! ڈھائی بجے گاڑی دہلی کے لیے ملتی تھی اس کے لیے اسٹیشن روانہ ہو گئے اور مجھے سوتا چھوڑ گئے کہ اسے ایسے ناوقت اٹھنے میں تکلیف ہوگی! سبحان اللہ۔

''پانی پت کی جنگ چہارم'' کے عنوان سے کامریڈ میں جو مسلسل ودلچسپ مضمون کئی نمبروں میں نکلا، وہ اسی سفر کا ماحصل تھا۔ ادنیٰ لیڈروں اور پیشہ ور اخبار نویسوں کو چھوڑیے، یہ ارشاد ہو کہ جواہر لعل نہرو اور ''مہاتماجی'' تک کوئی ادنیٰ ''جزوی'' اور مقامی معاملات میں اتنی محنت شاقہ برداشت کرتے، اتنا تعب اٹھاتے اور اپنی صحت کی طرف سے یوں بے تکاں بے پروائی برتتے کسی نے دیکھا ہے؟

....

مستقل ولایتی اخبارات تو دفتر کامریڈ میں صرف چند ہی آتے ہیں۔ ڈیلی ہیرالڈ، آئرش انڈیپنڈنٹ وغیرہ۔ لیکن مسلم ملکوں اور مسلم مسئلوں سے متعلق تراشوں کا انبار مختلف رسالوں اور اخبارات سے ہر ہفتہ اتنا آجاتا کہ اسے تقسیم کیا جاتا تو کئی کئی اخباروں کے لیے کافی ہو جاتا۔ یہ تراشے انتخاب کے بعد کامریڈ میں بالالتزام شائع ہوتے رہتے۔ ایک مفصل ''مکتوب ترکی'' قسطنطنیہ سے، اور ایک ''مکتوب لندن'' لندن سے بھی ہر ہفتہ ہونے لگا۔ پھر جہادریف، مسائل مصر اور سیاسیات سوڈان، موصل عراق، شام، مراقش، اور بغاوت کردستان وغیرہ سے متعلق پر مغز وشگفتہ اور مفصل ومدلل اڈیٹوریل مقالات، ہر ہفتہ کامریڈ گویا عالم اسلامی اور اسلامیات کی ایک ننھی منی سی انسائیکلوپیڈیا ہوتا! مرتد کی سزائے قتل کے ضمن میں ایک بحث مقام حدیث کی آگئی[1]۔ یعنی شریعت میں احادیث کا کیا درجہ ہے۔ اس پر کامریڈ نے اتنی شستہ ومدلل بحث کی کہ پڑھ کر بےاختیار دل سے داد نکلی۔ اور اسی بےاختیاری کے عالم میں یہ خط شوق لکھ بھیجا کہ ''جی میں آتا ہے دہلی فوراً پہنچوں اور جن انگلیوں سے اتنا نفیس مقالہ نکلا ہے، انھیں آنکھوں اور ہونٹوں سے لگاؤں''...... سفر دہلی کے لیے ہمیشہ اسی طرح کے بہانے ملتے ہی رہتے

---

[1] اس کا ذکر ابھی چند صفحے اوپر گزر چکا ہے۔

تھے...... لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لعل نہرو، بپن چندر پال، یہ اس وقت کانگریس کے چوٹی کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ کامریڈ نے ان میں سے ایک ایک کی اس طرح خبر لی کہ کچھ ان غریبوں کا دل ہی جانتا ہوگا۔ گاندھی جی کے خلاف بغاوت اس وقت تک ان کے کمپ میں اچھی خاصی پھیل چکی تھی، اونچے ہندو لیڈروں میں سے سیاسی مرتد اکثر ہو چکے تھے۔ کوئی دل اور زبان دونوں سے اور کوئی محض دل سے۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ادھر کسی نے گاندھی جی پر حملہ کیا ادھر کامریڈ پوری بے جگری سے لڑنے اور جواب دینے کو آڈٹا۔ ہندو کہتے تھے کہ مہاتما جی علی برادران کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو گئے ہیں۔ یہ تو خیر، البتہ یہ ضرور صحیح تھا کہ محمد علی نے اپنے کو مسلمانوں میں بدنام کر کے اپنے جس طرح مدتوں گاندھی جی کی ذات میں فنا رکھا، اس کی نظیر آسان نہیں......اور تماشہ یہ کہ اصول دین اور عقائد مذہبی تو خیر بڑی چیز ہیں اصولِ اخلاق اور فلسفۂ عمل کی حد تک بھی محمد علی کبھی گاندھی جی کے معتقد نہ ہوئے۔ گاندھی جی کے محض خلوص نیت پر یقین اور ان کی سیاسی اصابتِ رائے پر اعتماد یہ سب کچھ ان سے کراتا رہا۔

......☆☆☆......

باب:31

1:1924-26

(کامریڈ۔کامریڈ کا خاتمہ۔تلاوتِ قرآن)

سیاسی مضامین کا جو کامریڈ میں حکومتِ ہند کے خلاف نکلتے رہتے سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے۔اپنے مذاق کو سب سے زیادہ پسند وہ مقالہ آیا جو 25 کے آخری پرچہ (18 دسمبر) میں An Undelivered Letter ("ایک مکتوب جو مکتوب الیہ کو نہ ملا") کے عنوان سے دس ضخیم کالموں میں نکلا ہے، یہ ایک انگریز آئی سی ایس افسر کی طرف سے خط ہندوستان سے ولایت میں اپنے کسی دوست کے نام ہے۔اور اس کے اندر بے تکلفانہ انداز میں وہ ساری چالیں اور گھاتیں کھول کر بیان کر دی ہیں جن سے کام لے کر تحریکِ ترکِ موالات وخلافت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔مکتوب بڑا ہی دلچسپ ہے، اور ٹھیک اسی لب ولہجہ میں جو ایک انگریز سویلین کا دوسرے سویلین کے نام کے خط میں ہوتا ہے۔دسمبر کی آخری تاریخ میں جب کانپور میں کانگریس اور خلافت دونوں کے سالانہ جلسے ہو رہے تھے، تو میں نے بڑھ کر بڑی گرمجوشی سے داد دی۔مولانا اس وقت تک کامریڈ سے بالکل بددل ہو چکے تھے (اور بددلی کا بڑا سبب یہ تھا کہ سال سوا سال کی تلاش وکوشش کے باوجود بھی کوئی نائب یا مددگار نہیں مل سکا تھا اور بند کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔میرے بار بار کے اصرار اور عرض ومعروض کرنے پر اس کا دوسرا نمبر نکالنے پر آمادہ ہو گئے۔اور

پرچہ 22 جنوری 26 کی تاریخ کا نکال کر جب بند کیا ہے تو اس نمبر میں مکتوب کا یہی دوسرا نمبر درج تھا اور ضخامت کا حال سنیے۔ مکتوب کا یہ دوسرا نمبر ضخامت میں پہلے سے بھی تقریباً دوگنا تھا یعنی وہ اگر دس کالم کا تھا تو یہ انیس کالم!...... اسی آخری نمبر میں جو پہلا ادارتی مقالہ 7 کالموں کا ہے، وہ کسی سیاسی یا نیم سیاسی موضوع پر نہیں بلکہ مولانا منورالدین دہلوی کی فقہی کتاب، کتاب الحج والزیارۃ پر تبصرہ ہے، جس کے ضمن میں تبصرہ خود فقہ اسلامی پر ہو گیا ہے! انگریزی کے سیاسی پرچہ میں، اس بیسویں صدی میں، اس نوعیت اور پھر اس ضخامت کا ''مولویانہ'' مقالہ لکھ ڈالنا محمد علی ہی کا حصہ تھا۔

....

کامریڈ کی مالی حالت، اس دور ثانی میں اچھی کبھی بھی نہ رہی۔ بس پرچہ لشتم پشتم کسی طرح چل گیا۔ ایک مہینہ میں اگر بڑا زور لگانے سے سو خریدار کہیں بڑھے، تو دوسرے مہینے سوا سو خریدار گھٹ بھی گئے۔ قوم کو اپنے اس پرچہ سے شکایتیں بھی عجب عجب پیدا ہوتی رہتیں۔ کوئی علم دوست بزرگ یہ کہتے کہ اب کامریڈ میں شیکسپیئر کے ڈراموں پر ویسے تبصرے نہیں نکلتے جیسے 11 میں کلکتہ والے کامریڈ میں نکلتے رہتے تھے۔ کوئی شوقین صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اب اس کے ''گپ'' کے کالموں میں وہ زندہ دلی نہیں ہوتی جو اس کے دور اول میں ہوا کرتی تھی۔ یہ تو خیر سب خوش خیالیاں تھیں، اصلی شکایت اور واقعی تکلیف وہ بات خریداروں کے لیے یہ تھی کہ وقت کی پابندی پرچہ سے نہ نبھ سکی۔ شروع میں چند ہفتہ تو معاملہ غنیمت رہا۔ پھر ناغہ ہو کر دو دو نمبر ساتھ نکلنے لگے اور آخر میں تو نوبت یہ آ گئی کہ چار چار، پانچ پانچ ہفتہ کا وقفہ ہونے لگا جس کے بعد 3،3،4،4 پرچے اکٹھے نکلتے! پرچہ معنوی حیثیت سے، بہتر سے بہتر سہی، پھر بھی اتنی بے ترتیبی کے بعد کب تک زندہ رہ سکتا تھا!...... ایسے خریدار جو اصل مضامین کی پرکھ رکھتے ہوں، اور دل سے داد دے سکیں، تعداد میں واجبی ہی سے ہوتے ہیں۔ بڑا گروہ تو بس یہی دیکھتا رہتا ہے کہ پرچہ کسی طرح اپنے وقت پر ہاتھ میں آ جائے۔

کامریڈ کے قدردان اسے بھی گوارا کر لیتے، اور پرچہ جس بے قاعدگی اور جتنے ناغوں کے ساتھ بھی نکلتا، بہر حال نکلے تو جاتا۔ مشیت سے اجازت اس کی بھی نہ ملی۔ بند کر دینے کا ارادہ

محمد علی نے تنگ آ کر بار بار کیا۔ ہر دفعہ بات کسی نہ کسی طرح ٹلتی گئی، زیادہ تر مولانا شوکت علی کے دم دلاسوں سے۔ کبھی کہتے ہیں میں ابھی شعیب کو سب ایڈیٹری پر بلائے دیتا ہوں، کبھی کہتے اتنے خریدار بمبئی سے بھیج رہا ہوں۔ پرچہ کے لیے وقت کی پابندی پر وہ بھی بہت زور دیتے لیکن عملاً اس کا انتظام کسی سے بھی نہ بن پڑتا۔ ''یک سر و ہزار سودا'' محمد علی اس کا مجسمہ ہو رہے تھے۔ مصروفیت کا کون سا جز وایسا نہیں تھا کہ جسے چھوڑتے یا جو انھیں چھوڑتا! کچھ دخل اس میں طبعی بدنظمی اور عدم ضبط کو تھا۔ 25 جون تو ں ختم ہوا۔ فروری 26 میں محمد علی سخت علیل ہوئے۔ ذیابیطس تو تھا ہی، اب جسم میں پھوڑے جا بجا نکل آئے اور بالکل صاحب فراش ہو کر پڑ گئے۔ میں نے دہلی جا کر دیکھا تو چلنا پھرنا الگ رہا، اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ کامریڈ چار ہفتوں سے قرض چلا آ رہا تھا۔ چار نمبروں کا مجموعہ ایک نمبر 22 جنوری کی تاریخ ڈال کر تو خیر کسی طرح نکال ہی دیا۔ اس کے بعد کا پرچہ نکلنا کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ پریس والوں، مشین مینوں، کمپوزیٹروں وغیرہ کے مطالبات مدت کے چڑھے ہوئے تھے، ان ہی کا چکانا اور بے باق کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ نئے مصارف کی گنجائش کہاں سے نکلتی!......اس طرح کوئی 15 مہینہ کی آب و تاب کے بعد یہ آفتاب صحافت غروب ہو گیا۔ اور اب کی مرتبہ اس کی تدفین انگریز حکومت کے جبر و تشدد کے ہاتھوں نہیں، خود اپنی قوم کی ناقدریوں کے ہاتھ ہوئی۔

کھلا دیواں مرا تو شورِ تحسیں بزم سے اٹھا
مگر سب ہو گئے خاموش جب مطلع کا بل آیا

محمد علی کا اصلی جوہر تحریر اردو کا نہیں، انگریزی انشاء کا میدان تھا۔ ساتھ ہی قوتِ استدلال غضب کی۔ بیان کی دلآویزی، زبان کی شگفتگی، دلائل کی قوت، بحث کے اطراف و جوانب کی جامعیت، سب مل ملا کر عجب سماں پیدا کر دیتے......کامریڈ جس دن بند ہوا ہے، حکام والا مقام کے علاوہ خود ہم چشم لیڈروں میں سے بھی خدا جانے کتنوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو گا کہ ایک بڑا کانٹا پہلو سے دور ہو گیا۔ وہ درّہٴ احتساب گم ہو گیا جو بڑے اور چھوٹے کے درمیان صرف انصاف کرنا جانتا تھا۔ کامریڈ نامی ایک اخبار بند نہیں ہوا، مظلوموں کا ایک فریادرس اور مسلمانوں کا ایک بڑا ترجمان دنیا سے اٹھ گیا۔

....

اَلاَ تُقَاتِلُوْنَ قَوْماً نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَؤُكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ.

تم ان لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنھوں نے اپنے عہد و پیمان توڑ ڈالے اور جو رسول کے جلاوطن کرنے پر کمر باندھ بیٹھے اور انھوں نے خود ہی پہلے تم سے چھیڑ کی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ ہی زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو (سورہ توبہ۔13)

دسمبر 24 تھا۔ دہلی میں ایک روز صبح کچھ دن چڑھے مولانا کے کمرہ میں یک بیک چلا گیا۔ دیکھا کلام مجید کی تلاوت بلند کر رہے ہیں۔ زیادہ زور سے نہیں مگر اتنی آواز سے کہ قریب کے بیٹھے ہوئے لوگ سن سکیں۔ کمرہ میں تنہائی تھی۔ وہ مسہری پر بیٹھے ہوئے قبلہ رخ انہاک کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ میں چپکے سے جا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ ایک مترجم حمائل ہاتھ میں تھی، اور سورۂ توبہ اس وقت زیر تلاوت تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ آیت آئی جو ابھی درج ہوئی۔ خشوع و خضوع کی کیفیت پہلے ہی نمایاں تھی اس آیت پر پہنچ کر جوش سے جھومنے لگے۔ آواز بلند تر ہوگئی۔ آخری ٹکڑے ''اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ'' کو بھرائی ہوائی آواز سے بار بار پڑھنا شروع کر دیا۔ تکرار کرتے جاتے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ زبان سے تو صرف الفاظ قرآنی کی تلاوت ہو رہی تھی، لیکن زبانِ حال سے صاف ایک مستقل اور بلیغ تفسیر ہو رہی تھی کہ ہم بھی کوئی مسلمان ہیں جو حکومت سے ڈر رہے ہیں، پولیس سے ڈر رہے ہیں، پریس سے ڈر رہے ہیں، قید و بند سے ڈر رہے ہیں، اس سے ڈر رہے ہیں، اس سے ڈر رہے ہیں، مسلمان کے لیے مخلوق بھی کوئی چیز ڈرنے اور خوف کھانے کی ہے؟ مسلمان کو ڈرنا تو صرف ایک اور اکیلے خالق ذوالجلال سے چاہیے نہ کہ اس کی مخلوق سے، اور مخلوق بھی کون؟ اس کی باغی، اس کی نافرمان، اس کی اطاعت و اطاعت سے خارج! یہ منظر اپنی نوعیت میں میرے لیے بالکل انوکھا نہ تھا۔ یوں تو محمد علی ہر سچے مومن کی طرح سارے ہی قرآن کے عاشق تھے لیکن جن آیات میں بیان توحید الٰہی کا ہوتا ہے یا جن میں تاکید جہاد ہوتی انھیں پڑھ کر یا سن کر تو وہ بے تاب ہی ہو جاتے تھے۔ قال کے بجائے حال طاری ہو جاتا، آنسو دھڑا دھڑ بہنے لگے، وَاِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ

تَرٰی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ کبھی کبھی ہاتھ پیر بھی پٹختے، اور جوش کیف سے جیسے بے خود ہو جاتے۔

ساتھ رہ کر نماز پڑھتے بھی بارہا دیکھا۔ وقت کی بے انضباطی جو زندگی کے سارے شعبوں میں چھائی ہوئی تھی، اس کے رنگ سے یہ شعبہ بھی خالی نہ تھا، نمازیں بارہا وقت سے بے وقت ہو جاتیں کبھی کسی عذر سے کبھی کسی عذر سے، لیکن ناغہ کبھی بھی نہ ہونے پاتا۔ فجر کی نمازیں دیر ہو جانے کا ایک مستقل عذر شرعی بھی موجود تھا۔ مرض کے باعث رات میں پیشاب کے لیے بار بار اٹھنا پڑتا۔ ایک تو یوں ہی رات کو دیر میں سوتے، پھر درمیان میں یہ بار بار اٹھنا قدرتاً صبح آنکھ کسی قدر دیر میں کھلتی۔ مولانا شوکت علی کو دیکھا کہ الٹی سیدھی جیسی بھی پڑھیں، نماز وقت ہی پر پڑھ لیتے۔ فجر کو آنکھ کبھی ان کی بھی دیر میں کھلتی (دیابیطس کے مریض وہ بھی تھے) تو جھٹ پٹ وضو کر نماز پڑھ ڈالتے۔ محمد علی کے ہاں یہ نہ تھا۔ استنجا، طہارت وغیرہ سب بڑی اطمینان سے کرتے۔ اکثر تو غسل بھی کرتے، اور بعد غسل سر کے بڑے بڑے بالوں اور داڑھی میں کنگھی بھی اسی طرح اطمینان سے۔ جب کہیں جا کر نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔ ظاہر ہے کہ سورج اس درمیان میں بلند ہو چکا ہوتا، نیت یقیناً قضا کی باندھتے لیکن پڑھتے اس خشوع وخضوع اور اطمینان کے ساتھ کہ ان کی ایک ''قضا'' نماز پر ہم ایسوں کی ''ادا'' نمازیں قربان کر دینے کے قابل تھیں۔ عارفؒ رومی کے الفاظ میں۔

گر نمازت فوت می شد آں زماں   می زدی از درد دل آہ وفغاں
آں تأسف وآں فغاں وآں نیاز   در گزشتی از دو صد رکعت نماز

......☆☆☆......

باب:32

2:1924-26

(ہمدرد۔ ہمدرد کا اسٹاف)

یہ تھا24 میں انگریزی کے ہفتہ وار کامریڈ کا ایڈیٹر، اردو کے روزنامہ ہمدرد کا چیف ایڈیٹر اور ملک کے سب سے بڑے اور پرقوت اور فعال سیاسی ادارہ انڈین نیشنل کانگریس کا صدر! بھلا اس صدی کے ایڈیٹروں اور ان سے بھی بڑھ کر لیڈروں کو نماز اور قرآن خوانی سے، اور وہ بھی اس شغف و انہاک کے ساتھ کیا واسطہ؟ اور ستم یہ کہ یہ قرآنیت اور اسلامیت ''لازی'' نہیں متعدی ہوکر رہی۔ ایڈیٹر کی ذات تک محدود نہ رہی، کامریڈ اور ہمدرد دونوں کے صفحات میں آئین صحافت کے خلاف ''جرنلزم'' کے دستور کے برعکس، برابر جلوہ گر ہوتی رہی۔ جو سر پھرا، کامریڈ میں قتل مرتد جیسے خالص مذہبی مسئلہ پر، بالکل منقولی حیثیت سے، تین تین نمبر اور بتیس بتیس کالم لکھ ڈالے، اور اردو کی ایک فقہی کتاب کے تبصرہ کے لیے ایڈیٹوریل کے سات سات کالم وقف کردے، اسے کیا حق تھا کہ باوجود اپنی مشہور و مسلم انگریزی انشاء پردازی کے، باوجود اپنی شہرۂ آفاق سیاست دانی کے بیسویں صدی میں انگریزی جرنلزم پر قبضہ جمائے رکھے؟......دھارے کے خلاف پیراک کی قسمت میں ہار کر اور تھک کر آخر ڈوبنا ہی تھا۔ کامریڈ نے سوا سال کی زندگی کے بعد آخری سانس لی۔ ہمدرد پر یہ قیامت آئی کہ اس میں بالالتزام روزانہ قرآنی ''حکمت و موعظت'' کے درس دیے

جانے لگے۔ دسمبر 24 میں جب میرا دہلی پہنچنا ہوا تو بڑے گلے شکووں کے ساتھ ارشاد ہوا کہ ''تم نے آنے میں اتنی دیر کی۔ تمھارے انتظار میں ہمدرد کا ایک مستقل عنوان اب تک رکا رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر روز بلاناغہ ہمدرد میں اڈیٹوریل صفحہ کے شروع میں کوئی آیت قرآنی مع اردو تشریح کے درج ہوتی رہے کہ جس مسلمان کے ہاتھ میں ہمدرد جائے وہ کم از کم ایک آیات تو مع تشریح کے تلاوت کرلیا کرے، اور غیر مسلموں کے سامنے بھی قرآن اس صورت میں مسلسل پہنچتا رہے۔ عنوان ''حکمت وموعظت'' رہے گا۔ کل سے اس کالم کو اپنے ہاتھ میں لو''۔

....

تعمیل ارشاد میں فخر و مسرت محسوس ہوئی۔ 10 دسمبر سے ہمدرد میں یہ عنوان مستقل ہوگیا۔ اور جب تک ہمدرد مارچ 29 میں بند نہ ہوگیا، برابر اس کے پرچہ میں کوئی نہ کوئی آیت مع تشریح نکلتی رہی۔ شروع شروع میں یہ خدمت اسی نیاز مند کے سپرد رہی۔ دہلی سے جب واپس آنے لگا تو آیتوں کا ایک ذخیرہ لکھ کر وہاں چھوڑے آیا تھا۔ پھر دریاباد سے بھی لکھ کر بھیجتا رہا۔ رفتہ رفتہ اسٹاف کے لوگ بھی اس کام میں منجھ گئے اور خود ہی یہ خدمت انجام دینے لگے۔ اردو میں اس وقت تک روزنامے بڑے بڑے مذہبی لوگ نکال چکے تھے۔ بلکہ علما کے بھی بعض مخصوص روزنامے نکل چکے تھے لیکن اس ''بدعت حسنہ'' کی ایجاد کا سہرا ایک علی گڑھ کے ''نیچری'' اور آکسفورڈ کے گریجویٹ ہی کے سر رہا۔ اور بعد کو پہلے دکن کے ایک روزنامہ اور پھر بمبئی اور لکھنؤ اور دہلی کے بعض روزناموں نے جس طرز کو اڑایا، اس کا نقش اول ہمدرد ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔

یہ محض نمونہ دکھا رہا ہوں، محمد علی کے غلبۂ مذہبیت کا۔ اور تو اور، خود اسٹاف کے ''روشن خیال'' ممبر اس مذہبی ''دیوانگی'' سے چیخ چیخ اٹھے۔ سارے روزنامے، ڈاک خانہ کی تعطیل کے باعث خود بھی اتوار کو چھٹی مناتے تھے۔ یہاں حکم یہ نافذ تھا کہ تعطیل سرکاری یوم تعطیل کے مطابق اتوار کو نہیں، بلکہ مسلمانوں کے یوم تعطیل جمعہ کو منائی جاتی رہے! اس سے کاروباری نقصانات اٹھانے پڑے۔ منیجر صاحب نے غل مچایا، اڈیٹوریل اسٹاف نے (اخباری اصطلاح میں) ''صدائے احتجاج'' بلند کی، مادی نقصانات کا احساس خود مولانا کو ہوا، یہ سب کچھ سہی، لیکن حکم اٹل رہا!

....

دہلی ایک تو جغرافیائی حیثیت سے بھی مرکزی مقام۔ یہ نہیں کہ کلکتہ یا بمبئی کی طرح ایک گوشہ میں ہو، پھر حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری اور سب سے بڑھ کر خود مولانا کی زبردست اور مرکزی شخصیتیں یہیں موجود۔ یہی وجہ تھی کہ خلافت کمیٹی کا صدر دفتر اگرچہ بمبئی میں تھا، لیکن مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے بمبئی سے کہیں زیادہ دہلی ہی میں ہوا کرتے۔ ہمدرد اور مولانا کی مستقل کشش تو تھی ہی، پھر ان جلسوں میں شرکت کی طلبی، غرض اب ہر دوسرے تیسرے مہینہ میرے پھیرے دہلی کے ہونے لگے۔ کبھی دو ہی ایک دن بعد لوٹ آتا اور کبھی متصل کئی کئی دن ٹھہر جاتا۔ مولانا کو قریب سے دیکھنے کے موقعے خوب خوب ملتے رہے...... خالص سونے کا ایک ڈلا تھا جتنا اسے پرکھا، تپایا، وہ نکھرتا ہی گیا۔

محمد علی کا مکان گویا سارے ہندوستان کا مرکز اعصاب تھا۔ ہر ہر گوشہ سے ایک ایک خبر وہاں پہنچتی، تار پر تار آتے رہتے، ٹیلیفون کی گھنٹی پر گھنٹی بجتی رہتی۔ اور آنے جانے والوں کا تانتا جو صبح سے شروع ہو جاتا تو بڑی رات گئے بھی مشکل ہی سے ختم ہو پاتا۔ یہ ڈاکٹر انصاری آرہے ہیں، وہ دہلی کے ہندو لیڈر لالہ شنکر چلے آرہے ہیں، آج لکھنؤ سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی تشریف لا رہے ہیں، کل حیدرآباد سے ہمایوں مرزا بیرسٹر وارد ہو رہے ہیں۔ ابھی فلاں ہندو لیڈر الہ آباد سے آرہے ہیں، ابھی فلاں مسلمان لیڈر بمبئی سے۔ اخباری نمائندوں، نامہ نگاروں، ایڈیٹروں کا تو شمار ہی نہیں۔ سیاسیات ہند کے کون سے مسئلے ایسے تھے جن پر یہاں دن رات بحث نہ ہوا کرتی۔ کانگریس کی ممبری کے لیے اس وقت ایک لازمی شرط چرخہ کاتنے کی تھی۔ محمد علی صدر کانگریس، دفتر میں بیٹھے چرخہ چلا رہے ہیں کہ مشہور سوامی شردھانند آ گئے، اب اسی حال میں ان پر تبلیغ اسلام ہو رہی ہے اور انگلیوں کے ساتھ ساتھ برابر زبان بھی جنبش میں ہے...... سیاسی تربیت اور واقفیت محمد علی کے ساتھ رہ کر چند روز میں جتنی حاصل ہو جاتی تھی، وہ بجائے خود ایک نعمت تھی اور واقفیت صرف سیاسیات ہندی سے متعلق نہیں بلکہ سیاسیات عالم سے بھی خصوصاً سیاسیات عالم اسلامی سے۔

....

ہمدرد جب نکلنا شروع ہوا ہے، سچ کا اس وقت تک وجود نہ تھا۔ اور جب اس کے ڈھائی تین

مہینہ پر بچ نکلا ہے، جب بھی کئی شریک عمل اور رفیق کار موجود تھے۔ مجھے وقت کم ہی دینا پڑتا تھا۔ اور ہمدرد کی خدمت کے لیے میں بڑی حد تک خالی تھا۔ لکھنؤ، علی گڑھ وغیرہ کے لیے وقائع نگار میں نے ہی ٹھہرائے تھے۔ بہت سے لکھنے والوں سے مراسلت کر کے مضامین حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ خود بھی شروع شروع کثرت سے مضامین لکھ کر دیے۔ زیادہ تر فرضی ناموں سے۔ کبھی کبھی ایڈیٹوریل بھی لکھے۔ ان میں مقالات اکثر اور نوٹ کمتر۔ اور ایک آدھ بار تو ایسا بھی ہوا کہ مضمون خود بخود مولانا کے نام سے شائع ہوا لیکن وہ لکھا ہوا اول سے آخر تک ان کے اسی نیاز مند کا تھا۔ لکھنؤ کے پنڈت کشن پرشاد کول کشمیری، سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر، لبرل پارٹی کے رکن رکین۔ سیاسیات و مذہبیات دونوں میں ہمدرد سے بعد المشرقین رکھتے تھے لیکن بہر حال تھے ایک سنجیدہ لکھنے والے۔ میری فرمائش پر ایک مفصل مضمون دو نمبروں میں ہمارا دین ہندو مسلم اتحاد پر لکھا۔ اس پر مفصل ایڈیٹوریل تبصرہ نگاری میرے ہی حصہ میں آئی۔ اسٹاف میں اول اول سب سے پیشتر فاروق صاحب تھے، انھیں مولانا کی ادا شناسیوں میں ملکہ حاصل تھا۔ یہ چلے گئے، تو افسری عارف ہنسوی صاحب کے حصہ میں آئی۔ یہ بھی مولانا کے مزاج شناس تھے اور مئی 1926 تک جب تک ان کا تعلق ہمدرد سے رہا، انھوں نے کام باوجود اپنے بعض سیاسی اور مذہبی اختلافات کے، بحیثیت مجموعی خوب نباہا۔ لیکن ساڑھے 4 سال کی مدت میں خدا معلوم کتنے نئے نئے لوگ آکر اسٹاف میں شامل ہوتے اور پھر چلے جاتے رہے (بعد کے آنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز نام ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کا ہے) سب اس درجہ کے محتاط تھے نہ اس درجہ کے مخلص بلکہ بعض صاحبوں نے تو زبانی اور تحریری بڑے بڑے دعوے مولانا سے محبت وعقیدت کے کیے۔ لیکن تجربہ سے چند ہی روز بعد معلوم ہو گیا کہ ساری محبت وعقیدت، مولانا کی ذات یا ان کے مسلک اور اصول سے نہیں بلکہ مولانا کے روپیہ سے تھی!

جامعہ کے متعدد ہونہار نوجوان آکر شریک ہوئے اور تجربہ وتربیت حاصل کر کے الگ الگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ جعفری صاحب (جو ہمدرد میں شروع سے آخر تک رہے اور اس وصف میں کوئی ان کا شریک نہیں) کے جوہر بعد کو کھلے۔ شروع شروع تو ان کی حیثیت محض ایک نوعمر کارآموز کی تھی۔ ایک بڑا کام اسٹاف والوں کی نگرانی تھی یعنی اس امر کی دیکھ بھال کی کوئی بات

ہمدرد کے معیار سے فروتر یا مولانا کے مسلک کے خلاف پرچہ میں نہ نکل جائے۔ مولانا نے بارہا یہ کیا کہ اسٹاف کے کسی سمجھدار ممبر کو بلا کر اپنا مافی الضمیر تفصیل کے ساتھ سمجھا دیا بلکہ کامریڈ میں اپنا لکھا ہوا مقالہ بھی انھیں پڑھوا دیا۔ پھر بھی ان صاحب نے ہمدرد میں جب مضمون لکھا تو مولانا کی عموماً شکایت ہی رہی، بلکہ کبھی کبھی تو وہ مضمون چھپنے ہی کے قابل نہیں قرار پایا۔ مولانا کا نام پرچہ پر ہمیشہ بحیثیت ایڈیٹر کے لکھا ہوا رہا لیکن بجز ان چند مضامین کے جوان کے نام ساتھ شائع ہوئے۔ 4، ساڑھے 4 سال کی طویل مدت میں نہ کبھی وہ ہمدرد کے لیے مضمون لکھ سکے اور نہ کبھی اس کا کوئی پرچہ ایڈٹ ہی کر سکے۔ صرف ہدایات دے دیتے تھے۔ کام دوسرے لوگ کرتے تھے اور اسی کام ہی کی نگرانی بڑی حد تک اس خادم سے متعلق تھی...... جہاں تک دہلی کے کام کی نگرانی دریاباد سے ممکن تھی۔

شروع ہی کا زمانہ تھا۔ اردو کے مشہور لکھنے والے سید سجاد حیدر ''یلدرم'' بی اے، جوان دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے رجسٹرار تھے، ترکی کی تازہ سیاحت سے واپس آئے تھے اور علی گڑھ میں طلبہ کے جلسہ میں اپنے مشاہدات سفر بیان کیے۔ دہلی کے ہندوستان ٹائمس نے (جس کی مسلم دشمنی اس وقت تک اتنی کھلی نہ تھی) تقریر کو اپنی خاص سرخیوں اور رنگ آمیزیوں کے ساتھ شائع کیا۔ اس پر ہمدرد کے اسٹاف کے ایک ممبر کو بے محل جوش آ گیا، اور ڈیڑھ کالم کا ایڈیٹوریل سید صاحب کے جواب میں چھاپ دیا جس میں بار باران کے ''وابستہ دولت برطانیہ'' ہونے پر چوٹ تھی۔ سید صاحب نے یہی نہیں کہ مولانا سے تعلقات بہت قدیم اور مخلصانہ تھے، بلکہ میں تو ان سے ہمدرد کے لیے مضمون بھی طلب کر چکا تھا۔ اور پھر ان کی اصل تقریر میں کوئی بات ایسی قابل گرفت تھی بھی نہیں۔ ہمدرد کا مضمون پڑھ کر مجھے سخت ندامت ہوئی۔ مولانا کو بھی مضمون ناپسند ہوا۔ بہر حال اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں نے نج کا معذرت نامہ سید صاحب کو لکھا۔

......☆☆☆......

باب:33

3:1924-26

(مطائباتِ ہمدرد، محاربات ہمدرد)

شروع 26 تھا ہمدرد میں گاندھی جی کے خودنوشت تجرباتِ زندگی کا مسلسل ترجمہ ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا سے نکل رہا تھا۔ گاندھی جی نے ایک جگہ اس میں ذکر بچپن میں اپنے چھپ کر گوشت کھانے اور پھر اس کے ترک کے عہد کر لینے کا کیا ہے۔ ہمدرد کا نوعمر جامعی مترجم جب اس مقام پر پہنچا تو قوسین کے اندر یہ عبارت بڑھادی کہ ''غالباً اچھا پکا ہوا نہ تھا، ورنہ اس آسانی سے نہ چھوٹتا'' مترجم کی نیت ظاہر ہے کہ کسی دل شکنی یا دلآزاری کی نہ تھی محض ایک خوش طبعی مقصود تھی، لیکن چیز تھی فی نفسہ بے موقع، کہ یہ ایک چوٹ گاندھی جی کے عقیدۂ ترکِ حیوانات پر تھی۔ اور جس فضا میں ہر چھوٹی سی چیز ہندو مسلم فساد کا باعث بن رہی تھی۔ یہ بے ضرر سا مزاح بھی بہت کچھ باعثِ ضرر بن سکتا تھا۔ ہم لوگ بات کو بالکل معمولی سمجھے۔ تیسرے دن خود مولانا کی نگاہ پرچہ پر پڑ گئی (روز کا روز انھیں اپنا بھی اخبار پڑھنے کو کہاں مل پاتا تھا؟) اور مترجم صاحب کی معاطلبی ہوئی۔ اور مولانا نے غریب کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بیچارہ کے آنسو نکل آئے۔ مضمون 2 فروری کے پرچہ میں نکلا تھا۔ 7 فروری کے پرچہ میں اڈیٹوریل میں مفصل معذرت نکلی...... یہ ایک نمونہ تھا ہمدرد کے معیارِ صحافت کا۔ بھلا اس کو ملک کی عام اخباری فضا سے کیا مناسبت تھی۔

یہاں تو تفنن و خوش طبعی کے معنی ہی دوسروں پر چوٹ کرنے اور کسی کے نسب پر یا وطن پر یا مذہب پر طنز و تعریض کرنے کے تھے اور ظریفانہ کالم تو رکھے ہی اس غرض سے جاتے تھے کہ اس حمام میں قدم رکھتے ہی پوری برہنگی کا مظاہرہ جائز ہو جائے!

ہمدرد غریب میں نہ کبھی ''سنسنی خیز'' سرخیاں دی گئیں، نہ ایسی خبریں شائع ہونے پائیں جو نوجوانوں کے جذبات کے لیے ہیجان انگیز ہوتیں۔ مالکِ ہمدرد کا حکم اور قطعی حکم تھا کہ بس معلومات ہی زیادہ سے زیادہ تعداد میں اور زیادہ سے زیادہ شستہ اور شریفانہ انداز میں ناظرین تک پہنچائی جائیں۔ اور ایڈیٹوریل اسٹاف اپنی بساط بھر اس حکم کی تعمیل کرتا۔ اخبار یہاں تجارت اور دکانداری کی کوئی قسم نہ تھی، تبلیغ و تلقین کی ایک شاخ تھی۔ پنجاب کے دو مشہور معاصروں زمیندار اور تنظیم میں ان کے مالکوں کے نام کا ''حضرت ظفر الملت والدین اور سیف الملت'' لکھے جانے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ ہمدرد نے اس وزن و قافیہ میں ایک بار بھی اپنے ہاں ''محمد الملت والدین'' کی ترکیب جائز نہ رکھی اور نہ کبھی ''حضرت'' کا لفظ اپنے پروپرائٹر کے لیے استعمال کیا۔ اور تو اور ''رئیس الاحرار'' کا لقب مولانا کے لیے عام ہو چکا تھا۔ سارے دوسرے اخبارات یہ بے تکلف لکھ رہے تھے لیکن جس اخبار نے یہ بھی کبھی مولانا کے لیے استعمال نہ کیا، وہ خود مولانا ہی کا ہمدرد تھا...... تاکید رہتی تھی کہ زیادہ تعظیمی الفاظ و القاب ہرگز ان کی ذات کے لیے نہ استعمال ہوں بس زیادہ سے زیادہ ''مولانا'' کی اجازت تھی۔

....

ہمدرد کوئی خشک اور واعظانہ رنگ کا پرچہ ہرگز نہ تھا۔ ادبیت اس میں چاشنی کی حد تک نہیں بلکہ اچھی خاصی نمایاں رہتی تھی۔ افسانے اس نے بارہا شائع کیے۔ ادبی تبصرے اس میں برابر نکلتے رہتے تھے، مہذب شوخیاں اس کے ایڈیٹوریل میں جھلکتی ہی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی کچھ دن کے لیے ظریفانہ کالم بھی اس نے اپنے ہاں کھولے، حاجی بغلول'' صاحب اس کے ''تجاہل عامیانہ'' کے کالموں کو وقتاً فوقتاً مشرف کرتے رہے۔ شعر و سخن کے چرچے بھی اس کے صفحات پر اکثر جاری رہے۔ بایں ہمہ مذاقِ عوام کی پیروی اس سے کبھی بھی نہ ہو سکی۔ بازاریت اور ابتذال، فحش و پھکڑ کی نقالی وہ نہ کر سکا۔ خشک وہ یقیناً نہ تھا لیکن ''چٹپٹا'' بھی وہ نہ بن سکا۔ بگڑے ہوئے ذائقے جس چٹپٹے پن کی

تلاش میں رہتے تھے۔اس جنس سے اس کا دامن ہمیشہ خالی ہی رہا۔اشتہارات تک میں اس نے احتیاط برتی۔شراب اور فحش کتابوں، فحش دواؤں کے اشتہارات تو خیر الگ رہے، سینما اور تھیٹر کے بھی اشتہارات اس نے کسی اجرت پر بھی نہ چھاپے...... بات کہنے کو معمولی ہی ہے، لیکن ایک روز نامہ کے بار مصارف اور ضروریاتِ زر کا اگر اندازہ ہو اور معاصرین اور ثقہ معاصرین کا تعامل عام پیش نظر رہے، جب شاید محمد علی کے اس مجاہدہ کی کچھ قدر ہو۔

26 کا ابھی شروع ہی تھا کہ بمبئی کا ایک لکھ پتی نوجوان مسلمان موٹر پر جاتا ہوا ایک بیسوا کے عشق کے سلسلہ میں مہاراجہ اندور کے اشارہ سے سرراہ قتل کردیا گیا۔قتل کا ہونا تھا کہ جیسے اخبارات کو منہ مانگی مراد مل گئی۔اکیلے بمبئی ہی کے نہیں، دہلی تک کے بڑے بڑے معزز و خوددار اخبارات، اردو ہی کے نہیں، انگریزی کے بھی، ہفتوں اسی داستان سے رنگین رہے۔تصویریں نکل رہی ہیں، کارٹون چھپ رہے ہیں، نظموں پر طبع آزمائی ہو رہی ہے، خبریں رنگ آمیزی کے ساتھ تصنیف ہو رہی ہیں، افتتاحیہ اور نوٹ سبھی کی بھرمار ہو رہی ہے۔ملک کے طول وعرض میں اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی، انگریزی اخبارات میں ایک ہمدرد ہی ایسا تھا کہ جس کے کان پر کہنا چاہیے کہ جوں تک نہ رینگی !......محمد علی تجارت کی دکان کھول کر نہیں بیٹھے تھے، اصلاح و ہدایت، وعظ و تلقین کا ایک منبر تلاش کرلیا تھا۔

....

معاصرین سے الجھنا ہمدرد نے کبھی اپنا شیوہ نہ رکھا۔مولانا کی تاکید تو اس باب میں تھی ہی، شروع شروع میں جو سینئر اسٹاف بہم پہنچا، وہ بھی اس بازاریت سے بیزار ہی رہا۔فاروق صاحب اور ان کے بعد عارف صاحب دونوں اس مذاق سے بیگانہ تھے۔بلکہ فاروق صاحب تو دوسرے سرے پر پہنچ گئے تھے یعنی اس احتیاط کے باوجود ایسے ایسے خوش ظرف معاصرین بھی، خصوصاً خاک پاک پنجاب میں موجود رہے، جو خواہ مخواہ بھی ہمدرد سے الجھتے رہتے۔اور جب کبھی ہمدرد کو چھیڑتے تو مخاطب براہ راست مولانا محمد علی کی ذات ہی کو بناتے! حالانکہ یہ سب خوب جانتے تھے کہ مولانا مضامین لکھنا الگ رہا، ہمدرد کو پوری پابندی کے ساتھ پڑھنے کی بھی مہلت نہیں رکھتے۔

خیر معاصرین کو نیش زنی کا معاملہ تو پھر غنیمت تھا۔ہمدرد کو اصلی مقابلہ حکومت انگریزی سے کرنا تھا۔ہندوستان کی آزادی اور ہندوستان سے بھی بڑھ کر ممالکِ اسلامیہ کی آزادی محمد علی

یہاں تو تفنن وخوش طبعی کے معنی ہی دوسروں پر چوٹ کرنے اور کسی کے نسب پر یا وطن پر یا مذہب پر طنز و تعریض کرنے کے تھے اور ظریفانہ کالم تو رکھے ہی اس غرض سے جاتے تھے کہ اس حمام میں قدم رکھتے ہی پوری برہنگی کا مظاہرہ جائز ہو جائے!

ہمدرد غریب میں نہ کبھی ''سنسنی خیز'' سرخیاں دی گئیں، نہ ایسی خبریں شائع ہونے پائیں جو نوجوانوں کے جذبات کے لیے ہیجان انگیز ہوتیں۔ مالکِ ہمدرد کا حکم اور قطعی حکم تھا کہ بس معلومات ہی زیادہ سے زیادہ تعداد میں اور زیادہ سے زیادہ شستہ اور شریفانہ انداز میں ناظرین تک پہنچائی جائیں۔ اور ایڈیٹوریل اسٹاف اپنی بساط بھر اس حکم کی تعمیل کرتا۔ اخبار یہاں تجارت اور دکانداری کی کوئی قسم نہ تھی، تبلیغ وتلقین کی ایک شاخ تھی۔ پنجاب کے دو مشہور معاصروں زمیندار اور تنظیم میں ان کے مالکوں کے نام کا ''حضرت ظفر الملت والدین اور سیف الملت'' لکھے جانے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ ہمدرد نے اس وزن وقافیہ میں ایک بار بھی اپنے ہاں ''محمد الملت والدین'' کی ترکیب جائز نہ رکھی اور نہ کبھی ''حضرت'' کا لفظ اپنے پروپرائٹر کے لیے استعمال کیا۔ اور تو اور ''رئیس الاحرار'' کا لقب مولانا کے لیے عام ہو چکا تھا۔ سارے دوسرے اخبارات یہ بے تکلف لکھ رہے تھے لیکن جس اخبار نے یہ بھی کبھی مولانا کے لیے استعمال نہ کیا، وہ خود مولانا ہی کا ہمدرد تھا..... تاکید رہتی تھی کہ زیادہ تعظیمی الفاظ والقاب ہرگز ان کی ذات کے لیے نہ استعمال ہوں بس زیادہ سے زیادہ ''مولانا'' کی اجازت تھی۔

....

ہمدرد کوئی خشک اور واعظانہ رنگ کا پرچہ ہرگز نہ تھا۔ ادبیت اس میں چاشنی کی حد تک نہیں بلکہ اچھی خاصی نمایاں رہتی تھی۔ افسانے اس نے بارہا شائع کیے۔ ادبی تبصرے اس میں برابر نکلتے رہتے تھے، مہذب شوخیاں اس کے ایڈیٹوریل میں جھلکتی ہی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی کچھ دن کے لیے ظریفانہ کالم بھی اس نے اپنے ہاں کھولے، حاجی بغلول'' صاحب اس کے ''تجاہل عامیانہ'' کے کالموں کو وقتاً فوقتاً مشرف کرتے رہے۔ شعر وسخن کے چرچے بھی اس کے صفحات پر اکثر جاری رہے۔ باایں ہمہ مذاقِ عوام کی پیروی اس سے کبھی بھی نہ ہو سکی۔ بازاریت اور ابتذال، فحش وپھکڑ کی نقالی وہ نہ کر سکا۔

خشک وہ یقیناً نہ تھا لیکن ''چٹپٹا'' بھی وہ نہ بن سکا۔ بگڑے ہوئے ذائقے جس چٹپٹے پن کی

تلاش میں رہتے تھے۔اس جنس سے اس کا دامن ہمیشہ خالی ہی رہا۔اشتہارات تک میں اس نے احتیاط برتی۔شراب اور فحش کتابوں، فحش دواؤں کے اشتہارات تو خیر الگ رہے، سنیما اور تھیٹر کے بھی اشتہارات اس نے کسی اجرت پر بھی نہ چھاپے...... بات کہنے کو معمولی ہی ہے، لیکن ایک روز نامہ کے بار مصارف اور ضروریاتِ زر کا اگر اندازہ ہو اور معاصرین اور ثقہ معاصرین کا تعامل عام پیش نظر رہے، جب شاید محمد علی کے اس مجاہدہ کی کچھ قدر ہو۔

26 کا ابھی شروع ہی تھا کہ بمبئی کا ایک لکھ پتی نوجوان مسلمان موٹر پر جاتا ہوا ایک بیسوا کے عشق کے سلسلہ میں مہاراجہ اندور کے اشارہ سے سرراہ قتل کردیا گیا۔قتل کا ہونا تھا کہ جیسے اخبارات کو منہ مانگی مراد مل گئی۔اکیلے بمبئی ہی کے نہیں، دہلی تک کے بڑے بڑے معزز وخوددار اخبارات، اردو ہی کے نہیں، انگریزی کے بھی، ہفتوں اسی داستان سے رنگین رہے۔تصویریں نکل رہی ہیں، کارٹون چھپ رہے ہیں، نظموں پر طبع آزمائی ہو رہی ہے، خبریں رنگ آمیزی کے ساتھ تصنیف ہو رہی ہیں، افتتاحیہ اور نوٹ سبھی کی بھرمار ہو رہی ہے۔ملک کے طول وعرض میں اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی، انگریزی اخبارات میں ایک ہمدرد ہی ایسا تھا کہ جس کے کان پر کہنا چاہیے کہ جوں تک نہ رینگی!..... محمد علی تجارت کی دکان کھول کر نہیں بیٹھے تھے، اصلاح وہدایت، وعظ وتلقین کا ایک منبر تلاش کرلیا تھا۔

....

معاصرین سے الجھنا ہمدرد نے کبھی اپنا شیوہ نہ رکھا۔مولانا کی تاکید تو اس باب میں تھی ہی، شروع شروع میں جو سینئر اسٹاف بہم پہنچا، وہ بھی اس بازاریت سے بیزار ہی رہا۔فاروق صاحب اوران کے بعد عارف صاحب دونوں اس مذاق سے بیگانہ تھے۔بلکہ فاروق صاحب تو دوسرے سرے پر پہنچ گئے تھے یعنی اس احتیاط کے باوجود ایسے ایسے خوش ظرف معاصرین بھی، خصوصاً خاک پاک پنجاب میں موجود رہے، جو خواہ مخواہ بھی ہمدرد سے الجھتے رہتے۔اور جب کبھی ہمدرد کو چھیڑتے تو مخاطب براہ راست مولانا محمد علی کی ذات ہی کو بناتے! حالانکہ یہ سب خوب جانتے تھے کہ مولانا مضامین لکھنا الگ رہا، ہمدرد کو پوری پابندی کے ساتھ پڑھنے کی بھی مہلت نہیں رکھتے۔

خیر معاصرین کو نیش زنی کا معاملہ تو پھر غنیمت تھا۔ہمدرد کو اصلی مقابلہ حکومت انگریزی سے کرنا تھا۔ہندوستان کی آزادی اور ہندوستان سے بھی بڑھ کر ممالکِ اسلامیہ کی آزادی محمد علی

کوعزیز تھی۔ ہمدرد اور کامریڈ دونوں کے اجرا سے ان کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ملتِ اسلامی کو اس نقطہ پر لاکر متحد کریں۔ جزوی معاملات میں اختلافات اور اندرونی نزاعات اس مقصد کے حق میں زہر تھے۔ اس لیے محمد علی کی انتہائی کوشش یہ رہتی کہ ہمدرد کبھی بھی اپنی قوت مسلمانوں کے اندرونی باہمی اختلافات میں پڑنے اور ایک فریق بن جانے میں منتشر نہ کرے۔ لیکن تقدیر کا نوشتہ بہر حال پورا ہو کر رہتا ہے، اور حالاتِ تکوینی پر کس کا قابو چلا ہے۔ محمد علی کو، ہمدرد کی چار ساڑھے چار سال کی زندگی میں بھی خدا معلوم کتنی بار اندرونی فتنوں کی طرف زور وقوت کے ساتھ متوجہ ہونا پڑا۔ اور ہمدرد کو اس میں قدرتاً پورا حصہ لینا پڑا۔ ان میں سے تین جنگیں خاص طور پر طویل اور تلخ رہیں۔ پہلی جنگ: شریفی سعودی جھگڑے کے سلسلہ میں، مجلس خدام الحرمین اور فرنگی محل اور سارے ''مشائخ وصوفیہ'' کے مقابلے میں رہی۔

دوسری جنگ: اس سلسلہ میں ٹھیک اسی کے برعکس زمیندار اور مولانا ظفر علی خان اور ساری جماعتِ اہلِ حدیث کے خلاف۔ تیسری جنگ: کا رخ دہلی کے مشہور عوامی نقیب خواجہ حسن نظامی [1] کے خلاف رہا۔ چوتھی جنگ ہمدرد کے بند ہونے کے بعد لڑی گئی۔ اور یہ جمعیۃ العلماء اور ''نیشنلسٹ'' مسلمانوں کے محاذ پر۔ ان جنگوں کے تذکرے اس ڈائری کے آئندہ صفحات میں انشاءاللہ اپنے اپنے مقام پر آئیں گے۔ ان میں سے پہلی جنگ جو 25 کی دوسری ششماہی میں چھڑی، اس کا ذکر نسبتاً سب سے زیادہ تفصیل سے آئے گا۔ اور یہ اس لیے کہ اس میں خود یہ ڈائری نویس بھی محمد علی کے ایک پرجوش لیفٹیننٹ کی حیثیت سے پوری طرح شریک تھا...... یہ جنگ محمد علی کے لیے شاید سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی بھی۔ محمد علی کی عمر لڑنے میں گذری۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ لڑائی کے شائق ہرگز نہ تھے، اور جنگ میں ابتدا کرنا کسی طرح نہیں چاہتے تھے۔ یہ ناگوار جنگوں میں ان کے لیے ناگوار ترین تھی۔ اس میں مقابلہ دشمنوں سے نہ تھا، دوستوں سے کرنا پڑا، ایسے دوستوں سے کرنا پڑا جو عزیزوں سے بڑھ کر عزیز تھے، اور مرید کو اپنے مرشد کے مقابلہ میں صف آرا ہو کر آنا پڑا...... تفصیل کے بغیر یہ ماجرا پڑھنے والوں کے لیے ایک معمہ رہے گا۔ اور اس خاص جنگ کی تفصیل اب موجود اور زندہ لوگوں میں اس ڈائری نویس سے بڑھ کر کوئی دوسرا کر نہیں سکتا۔

---

[1] خواجہ صاحب کی امتیازی حیثیتیں متعدد ہیں۔ مثلاً ان کا ایک صاحبِ طرز ادیب ہونا لیکن اس جنگ کا تعلق ان کی کسی اور حیثیت سے نہ تھا۔

باب:34

4:1925

(مرشد و مرید۔شرعی جمہوریت۔امید افزا حالات)

مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی مرحوم و مغفور اپنے زمانہ کے مشاہیر میں تھے۔ایک نامور اور خاندانی عالم، ایک مشہور اور خاندانی شیخ طریقت۔اور اب ملک بھر میں شہرت سالہا سال سے ان دونوں حیثیتوں سے بھی بڑھ کر بطور ایک قومی لیڈر اور سیاسی کارکن کے تھے۔کانگریس میں پیش پیش، گاندھی جی کے ہر مشورہ میں شریک، تحریک خلافت کے علمبردار خصوصی اور انجمن خدام کعبہ کے تو بانیوں میں سے تھے۔صاحب نفوذ و اثر اور صورتاً بھی بڑے وجیہہ و شکیل، ذاتی خوبیوں کو گنانے پر آیئے، تو بڑے مہمان نواز، بڑے فیاض، بڑے ملنسار، بڑے ذی مروت، جود و کرم کے پتلے، ہر شخص کے کام آنے والے۔اللہ کا دیا ہوا تھا بھی بہت کچھ''سخنے'' اور''قدمے'' کے علاوہ''درمے'' بھی سب کی مدد و خدمت کے لیے تیار۔عقائد اور رسوم وہی جو عام طور پر اس زمانہ کے مشائخ کے ہوتے ہیں۔درگاہوں اور مزاروں پر حاضری کے پابند۔اپنے ہاں بھی سال میں دو بار عرسوں کی محفلیں دھوم دھام سے کرنے والے۔علی برادران کے بعض عزیز شاید قبل سے بیعت میں داخل تھے، خود علی برادران کے ساتھ خدام کعبہ وغیرہ ابتدائی تحریکات کے زمانہ میں خوب خلا ملا ہو چکا تھا، ادھر خیال یہ تھا کہ مولویوں اور صوفیوں کی جماعت میں ایسا روشن خیال اور

ملت پرور دوسرا کہاں ملے گا۔ ادھر قول یہ تھا کہ نیچریوں اور انگریزی خوانوں کی جماعت میں اس حمیت دینی کی مثال ملنی ناممکن۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے عاشق زار۔ وہ ان پر فریفتہ وگرویدہ، یہ ان کے والا وشیدا۔ نظر بندی کا زمانہ ابھی شروع شروع کا تھا۔ برادران ابھی لینسڈ ون ہی میں تھے اور چھندواڑہ ہنوز منتقل نہیں ہوئے تھے [1] کہ ایک روز مولانائے فرنگی محلی یک بیک بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ اپنا ایک خواب بیان کر کے فرمایا "میرے ہاتھ پر بیعت کرلو، ورنہ معلوم نہیں کہاں جا پھنسو گے"۔ برادران نے چپکے سے ہاتھ بڑھا دیے اور سلسلۂ عالیہ قادریہ رزاقیہ میں داخل ہو گئے...... یہ ڈائری محمد علی سے متعلق ہے، ان کے مرشد سے متعلق نہیں، تاہم جو کچھ آگے آرہا ہے اس کے سمجھنے کے لیے ان سے بھی اس حد تک تعارف ناگزیر تھا۔

....

اگست 25 کا مہینہ ہے۔ وسط ماہ کی تاریخیں گزر چکی ہیں۔ محرم کا مہینہ ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ مولانائے فرنگی محلی آستانہ اجمیر پر حاضری دے کر لکھنؤ واپس ہوتے ہیں۔ دہلی چند گھنٹہ کے لیے اترتے ہیں۔ مع دو رفیقانِ سفر وحضر کے محمد علی سے ملنے آتے ہیں۔ دوپہر کا وقت، محمد علی کے ہاں تخلیہ کہاں، لیکن آج خلاف معمول اتفاق سے تخلیہ ہے۔ کامریڈ کے ایڈیٹر کے کمرہ کے اندر کل پانچ آدمی۔ مولانائے فرنگی محلی اور ان کے دونوں رفیق، چوتھے محمد علی اور پانچواں یہ ڈائری نویس۔ محرم کا زمانہ ابھی تازہ تھا۔ گفتگو تعزیہ داری اور بدعات محرم پر چلی۔ سچ اور مدیر سچ عین اسی زمانہ میں بہ سلسلۂ محرم بہت "نیک نام" ہو چکا تھا۔ اور اس کی "وہابیت" ایسے حلقوں میں جن کا تعلق مولانائے فرنگی محلی سے رفاقت سفر وحضر کا تھا، پوری طرح مسلم ہو چکی تھی۔ محمد علی نے بھی اس وقت کچھ ایسی ہی "وہابیانہ" باتیں شروع کر دیں، اور خود مولانا نے بھی بڑی حد تک موافقت فرمادی۔ بات میں بات نکلتی آئی۔ ذکر حضرت عثمانؓ کی شہادت کا چلا۔ مولاناؒ بہر حال ایک ممتاز فاضل تھے۔ کئی منٹ تک سیرت عثمانی پر ایک مفصل تقریر فرمائی۔ خلاصہ یہ تھا کہ "حضرتؓ کے مناقب وفضائل کا کیا پوچھنا، مجموعۂ کمالات ہی تھے۔ جس کے دل میں عثمانؓ کی محبت نہ ہو، اس کے ایمان میں فرق۔ لیکن حضرتؓ کے مزاج میں مروت بہت زائد تھی۔ حضرت علیؓ وغیرہ کے ساتھ

---

[1] یعنی غالباً 1915 کے اواخر میں۔

انتظامات میں اصلاح کا وعدہ فرمالیتے اوران پر دل سے عمل بھی کرنا چاہتے۔ مروان بیچ میں حائل ہو جاتا، اور کام بنتا ہوا بگاڑ دیتا۔ آپ سمجھتے سب کچھ تھے، لیکن بس وہی مروت کی افراط، اس کی اجازت نہ دیتی کہ رخنہ اندازوں کو راہ سے دور فرمادیں''..... محمد علی سکون اور سکون کے ساتھ پوری تقریر سنتے رہے۔ جب ختم ہوئی تو زور سے بول اٹھے ''حضرت وہی صورت آج بھی قائم ہے۔ عثمان غنیؓ کا حلم ومروت بھی آج موجود ہے، اوراس حلم ومروت سے فائدہ اٹھانے والے مروان بھی آج موجود ہیں''..... مولانائے فرنگی محلی بھی بڑے ذہین وزیرک اور نکتہ رس تھے۔ مرید کے اس فقرہ سے پورا لطف لیا۔ معاً سمجھ گئے کہ فقرہ کا رخ کس طرف ہے۔ پہلے مسکرائے پھر ہنسے اور پھر دیر تک لطف لے لے کر ہنستے رہے۔

....

ہمدرد، یاد ہوگا کہ نومبر 24 سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شریف حسین کو سالہا سال تک داد شقاوت دینے کے بعد بالآخر حجاز سے رخصت ہونا پڑا تھا، اور دنیائے اسلام اس کی اور اس کی اولاد کے مظالم سے پکار پکار کر پناہ مانگ رہی تھی۔ ہزار ہا بے گناہ مسلمانوں، حاجیوں اور حجازیوں کا خون اس کی گردن پر ثابت ہو چکا تھا۔ مظلوموں کے منہ سے بے اختیار اس کے حق میں بددعائیں نکل رہی تھیں۔ بیواؤں کے سینوں سے گرم گرم آہیں اس مظالم پر فریاد کر رہی تھیں۔ اور یتیم بچے بلک بلک کر اس کی سنگدلی کا افسانہ سنا رہے تھے۔ دست قدرت نے آخر کار والی نجد سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو انتقام کے لیے اس پر مسلط کر دیا تھا۔ فتوحات سلطانی کی خبریں برابر آرہی تھیں۔ اور مصر وشام، ہند وعرب سب کہیں کے مسلمانوں کے چہرے کھلے جارہے تھے کہ آخر کار تو فریادرس نے ہماری سنی، اور مظلوموں کی نصرت کی گھڑی آپہنچی۔ شریف اور خاندان شریف کی طرف سے مسلمانوں کے دل ایسے پکے ہوئے تھے کہ اسے نکالنے کے لیے کوئی بھی اٹھ کھڑا ہوتا تو مسلمانوں کے دل اسی کے ساتھ ہو جاتے۔ ادھر سونے پر سہاگہ، سلطان نے بار بار یہ اعلان کرنے اور بیانات دینے شروع کرائے کہ ''میں حجاز میں کوئی اپنی بادشاہت قائم کرنے نہیں آرہا ہوں، میں تو اس ارض پاک کو شریفیوں کے پنجۂ ظلم وستم سے نجات دلانے کو اٹھا ہوں۔ ذریات شریف کے نکل جانے کے بعد مسلمان جانیں اور ان کا کام۔ وہ جسے چاہیں اپنا حکمراں منتخب کرلیں

گئے''.....مسلمانوں کے دلوں میں اب سلطان کا گھر اور ہونا شروع ہوا۔ ساتھ ہی فتح مندیوں کی خبریں بھی روزانہ آنا شروع ہوگئیں۔ آج مکہ معظمہ پر قبضہ ہوگیا، کل طائف ہاتھ میں آ گیا۔ آج شریف علی (ولی عہد شریف حسین) جدہ میں محصور ہوگیا، کل اس کی فوج نے علاج بالمثل کے اصول پر عمل کر کے خود اس غدار سے غداری کر دی۔ ہر صبح یہی چرچے، ہر شام یہی خبریں۔

لیکن شریف کے تعلقات سرکار برطانیہ سے تو آخر ہوا خواہی و وفاداری ہی کے تھے اور پھر سلطان نجد آخر ''نجدی وہابی'' تھا۔ بدایوں ''شریف'' اپنی پوری قوت کے ساتھ شریف کی حمایت ونصرت میں سرگرم ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لاہور اور علی پور، اور بمبئی اور پھلواری، اور اجمیر اور کلیر، ہندوستان کے شمال وجنوب، شرق وغرب میں جہاں جہاں بھی ''خوش عقیدہ'' بزرگواروں کی بستیاں اور موروثی پیرزادوں کی عملداریاں تھیں، سب کہیں کے تاریک وقت حرکت میں آ گئے۔ اور خیر، ایکا ان سب ہی کا رہتا، جب بھی محمد علی کے نقطۂ نظر سے کچھ ایسا مضائقہ نہ تھا، غضب یہ تھا کہ ان سب کی کمک پر فرنگی محل کا زبردست مورچہ بھی تھا، جو بیک وقت شریعت کا بھی دارالافتا تھا اور طریقت کی بھی خانقاہ، اور سیاست کا بھی پلیٹ فارم!

....

دنیائے اسلام کی سیاست اور عالم اسلامی کی فلاح وبہبود دوسروں کے لیے چاہے مشغلۂ تفریح ہو، محمد علی نے یہ سودا نقد جان دے کر خریدا تھا۔ اسی ایک غم میں کیا کچھ نہیں جھیلنا پڑا تھا۔ عزت گنوائی، دولت گنوائی، صحت گنوائی۔ برسوں کی مدت نظر بندی میں کاٹی۔ جیل خانہ دو دو بار گئے، قید تنہائی اٹھائی، اللہ کے گھر کی حفاظت کی فکر کی تو خود اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ رام پور کی خاک کے ذرہ ذرہ سے محمد علی کا دل اٹکا ہوا تھا، اس سرزمین پر قدم رکھنا بھی اب محمد علی کے لیے جرم قرار پا گیا تھا۔ خدا معلوم کتنی راتیں جاگ جاگ کر، کتنے دن بے چینی سے کاٹ کاٹ کر، ہفتوں نہیں مہینوں بلکہ برسوں کے غور وفکر کے بعد محمد علی بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اصلاح حجاز اگر مقصود ہے تو آئندہ ہمیشہ کے لیے اس ارض پاک کو بادشاہ گردی سے نجات دلا دی جائے۔ یہ سارے فتنے بادشاہت اور ملکیت کے ہیں۔ اب یہ نہ ہونے پائے کہ آج شریف کا دور دورہ ہے تو ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابیں تلاش کر کر کے ان کے اوراق نذر آتش کیے جا رہے ہیں، کل نجدیوں کا تسلط ہوا تو

قبوں اور قبروں پر پھاوڑے چلنے لگے۔ پرسوں باگ حکومت یمن کے زیدیوں کے ہاتھ میں آئی تو شیخین رضی اللہ عنہما کی بے توقیری ہونے لگی۔ بس ایک شرعی جمہوریت، تمام مسلمانانِ عالم کے صلاح ومشورہ سے ساری دنیائے اسلام کی رائے وشوریٰ سے قائم ہوجائے اور روز روز کا یہ جھگڑا مٹے۔ سیاسی قوت واقتدار بھی جبھی ممکن ہے، جب اسے مرکزیت حاصل رہے۔ آج کسی کی نظر میں حکومتِ حجاز کی وقعت ہی کیا ہے۔ غریب سلطنت اتنی بڑی بھی تو نہیں کہ حیدرآباد تو خیر بڑی چیز ہے، میسور کی بھی برابری کرسکے۔ فرنگی سمجھتا ہے کہ جب جی چاہے گا، چٹکی سے مسل کر رکھ دوں گا۔ عالم اسلام کی جمہوریت قائم ہوجائے تو کسی کو آنکھ پھاڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ پڑے، اور شیر برطانیہ یا عقاب جرمنی، سب سمجھ لیں کہ اب مقابلہ تنہا حجاز سے نہیں کرنا ہے، بلکہ ایک ہی وقت میں مصر سے، یمن سے، عراق سے، شام سے، طرابلس سے، البانیہ سے، افغانستان سے، ایران سے، ترکی سے، جاوا سے، ساترا سے، بخارا سے، مسلم چین سے، مسلم ہندوستان سے، سب سے اور سب کہیں کرنا ہے...... محمد علی اسلامی ہند کے لیڈر اور زعیم مشرق کی آنکھ سوتے اور جاگتے برسوں سے یہ خواب شیریں دیکھتی رہی، اور رات کی نیندیں اور دن کی بیداریاں مدتوں اس آرزو کی پرورش پر قربان ہوتی رہیں۔ زبان اسی کی دعائیں کرتے کرتے تھکی جارہی تھی۔ سلطان نجد کے اعلانات سے پہلی بار خواب کی تعبیر پوری ہوتی نظر آئی۔ دل باغ باغ ہوگیا اور جی نہال۔ ترکوں کی تنسیخ خلافت کا گہرا زخم دل پر ابھی تازہ تھا، جوان اور لاڈلی بیٹی کا داغ جگر پر تازہ تر تھا، محمد علی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے غیب سے نزولِ مرہم کا سامان ہونے لگا۔ خلافت کمیٹی کی طرف سے شام میں وفد حجاز بھجوایا۔ اس کے ذریعہ سے سلطان کے پاس زبانی پیام کہلایا۔ خلافت کمیٹی میں بار بار تجویزیں پاس کرائیں۔ الگ سے سلطان کے پاس تار بھیجے، ہر تان اسی شرعی جمہوریت پر آکر ٹوٹتی ......خود سلطان نے اپنی تقریروں میں، اعلانات میں، خطوط میں، ایک بار نہیں، بار بار اور ڈھکے مندے اشاروں میں نہیں، ہانک پکار کر وعدہ کیا کہ مجھے ملک گیری کی ہوس نہیں، میں حجاز پر حکومت اپنی نہیں شریعت مطہرہ کی قائم کرانا چاہتا ہوں۔ ظالموں کے وجود سے اس خطۂ پاک کو پاک کرنے کو اٹھا ہوں، آئندہ حکومت کے لیے خود مسلمان جسے چاہیں منتخب کریں۔

......☆☆☆......

باب:35

5:1925

(وہابیت۔ مدینہ منوّرہ پر "گولہ باری")

محمد علی کی ان بلند خیالیوں تک کس کا دماغ پہنچتا؟ ان دور اندیشیوں اور مصلحت سنجیوں کو کون سمجھتا؟ اور کون ان کی قدر کرتا؟ کس نے ان مسائل پر اتنی دماغ سوزی کی تھی۔ کون ان مسائل کی ادھیڑ بن میں اس طرح خون جگر کھا کھا کر رہا تھا؟ ادھر سلطانِ نجد کی پیش قدمیوں اور فتح مندیوں کی خبریں آنی شروع ہوئیں کہ ادھر شامت کے مارے ہندی مسلمانوں میں دو اکھاڑے قائم ہوگئے۔ اور سب وشتم سے گزر کر نوبت "رفع یدین" تک آ گئی۔ ایک صف میں سلطان کے دوست تھے مگر نادان، دوسرے فریق میں سلطان کے دشمن تھے مگر دانا وہ بھی نہیں، دوستوں ہی کی طرح نادان۔ اصل مسئلہ کو بھول بھال اور اصلی تنقیح کو چھوڑ چھاڑ بحث "عقائد" کی شروع ہوگئی۔ اور "تبدع" و "توھب" کا وہ زبردست دیو، جو سویا کبھی بھی نہ تھا، درمیان میں ذرا اونگھنے لگا تھا، نئے سرے سے چونک کر، پوری قوت کے ساتھ ہر طرف دوڑنے دھوپنے، چیخنے چنگھاڑنے لگا۔ ادھر سعودیوں کی فتح سے خوش ہو ہو کر اہل حدیثوں نے، غیر مقلدوں نے کتاب وسنت کی پیروی کا دعویٰ رکھنے والوں نے نعرے لگائے کہ اب کیا ہے، پالا مارلیا ہے، یہ کمبخت بدعتی اور گور پرست اب تو آخر نیچا دیکھ کر رہے، ادھر شریفیوں کی شکست سے ملول ومغموم ہو کر بریلویوں، علی پوریوں نے

''سنی حنفیوں'' نے شورغم وواویلا بلند کیا، کہ ہائے یہ کیا غضب ہوا جارہا، ان ناشدنی وہابیوں کا بھی یہ منہ اور یہ حوصلہ ہوا کہ مکہ اور مدینہ پر اپنا علم نصب کرنے کا خواب دیکھنے لگیں...... ''مشائخ'' اور پیرزادے، درگاہوں کے سجادے اور مزارات کے مجاور، سب ہڑ بڑا کے اٹھ بیٹھے کہ یہ ہمارا دشمن ازلی کہاں سے نکل پڑا۔ شریف آل رسول تھا۔ یہ اس کے مقابلہ میں آیا ہے، یہ مردود ہے، وہابی ہے، جہنم کا کندہ ہے، کانا دجال ہے، شیطان ہے، یہ اگر جیتا تو ہم کو جیتا نہیں چھوڑنے کا!

....

مولانائے فرنگی محلی لکھنؤ میں، محمد علی دہلی میں، دونوں کی ٹکٹکی برابر مطلع حجاز پر لگی ہوئی۔ ایک کی نگاہ میں مقابر مسلمین کا احترام، دوسرے کے پیش نظر مصالح عالم اسلام۔ مقصود دونوں کا خدمت دین۔ لیکن اپنی اپنی بصیرت اور اپنا اپنا مقام۔ اجتہاد میں غلطیاں بڑے بڑے کاملین سے ہوئی ہیں۔ پہلی صدی کے اکابر سے ہوئی ہیں، تو چودھویں صدی کے علماو مشائخ بیچاروں پر زیادہ گرفت کیوں کیجیے، اور انھیں طعن واعتراض کا ہدف کیوں بنائے رکھیے۔ ادھر مولانا فرنگی محلی کی سمجھ میں یہ نہ آتا کہ محمد علی خوش عقیدہ صوفی اور حنفی ہوکر وہابیہ اور نجدیہ کی حمایت کیسے کرنے لگا، اور غیر مقلدین کا شریک حال کیوں کر بن گیا۔ ادھر محمد علی کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر کہ مولانائے فرنگی محلی انگریزی تسلط سے اس قدر بیزار اور مرکز اسلام کی آزادی کے لیے اس قدر بے قرار ہوکر اس فریق کے شریک کار کس طرح ہوتے جارہے ہیں جو ارض پاک میں فرنگی حکومت کو مداخلت کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ اپنی طرف دنگ، وہ اپنی طرف حیران۔ پہلے آپس میں بڑی مفصل و موثر مراسلت رہی۔ اس کے بعد وسط اگست میں مولانا لکھنؤ سے اجمیر جاتے ہوئے دہلی میں اترے اور محمد علی سے مل کر گھنٹوں زبانی گفتگو کی۔ یہ سب کچھ ہولیا۔ اس پر بھی مشیت کے ہاتھ کا لکھا ہوا کہیں مٹتا ہے؟...... تاریخ ایک چھوٹے پیمانے پر دور عثمان غنیؓ اور دور علی مرتضیٰؓ کو دہرا رہی تھی۔

غلط فہمیاں بجائے گھٹنے کے بڑھتی ہی گئیں۔ ایک گتھی اگر سلجھی تھی تو اس کی جگہ دو اور پیدا ہو جاتی تھیں۔ جو دل جڑے ہوئے تھے، ان میں روز بروز درازیں ہی پڑتی چلی گئیں۔ اور درمیانی لوگ طرح طرح کی دراندازیوں میں مصروف۔ مولانائے فرنگی محلی نے کہا مصالحت یوں ہوسکتی ہے کہ جو مسجدیں نجدیوں کے ہاتھوں مسمار ہوئیں ہیں، سلطان اس انہدام پر اظہار ملامت کریں

اور جو قبے گرائے جا چکے ہیں، انھیں اپنے صرفہ سے از سر نو تعمیر کرادیں، یا کم از کم دوسروں کو اس کی اجازت دیں۔ محمد علی کا کہنا یہ تھا کہ خیر ان مطالبات کے پیش کر دینے میں تو مضائقہ نہیں، لیکن یہ مسئلہ عالم اسلامی ہی کی کانفرنس کے طے کرنے کا، جس میں ہر فرقہ کے علما شریک ہوں۔ مولانائے فرنگی محلی کے یہ مطالبات اخباروں میں نکلے، لیکن لکھنے والے نے تمہید میں یہ جڑ دیا کہ مولانا محمد علی کو بھی ان مطالبات سے اتفاق ہے...... حضرت عثمان غنیؓ کے خطوط میں مروان کی ''اصلاحوں'' کی یاد، تاریخ کی مدد سے تازہ کر لیجیے!

یہ تحریر اور تو اور خود ہمدرد میں بجنسہ نکل گئی۔ محمد علی نے اپنے اس ''اتفاق رائے'' کو جب پڑھا تو بڑی تکلیف قلب محسوس کی۔ دوسرے ہی دن اپنے نام کے ساتھ مفصل تردید مگر اتنے ہی جزو کی، ہمدرد میں چھپوائی۔ یہ مضمون اگرچہ محمد علی کے نام سے ہے، لیکن اب اس راز کے افشا میں کوئی مضائقہ نہیں کہ لکھا ہوا تھا ان کے اشارہ کے مطابق اور ان کی اصلاح و ترمیم کے بعد ان کے اسی نیاز مند ڈائری نویس کا۔ ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ ادھر یک بیک 23 اگست کو لندن سے چلا ہوا وہ مشہور و معروف تار آ گیا جس میں مسجد نبوی پر نجدیوں کی گولہ باری کی خبر درج تھی۔ اس تار کا شائع ہونا تھا کہ گویا سرزمین ہند پر ایک بھونچال آ گیا، آگ پر مٹی کا تیل پڑ گیا، اور شعلے لپک لپک کر آسمان سے باتیں کرنے لگے!

....

23 اگست 25۔ میں دہلی میں کئی روز سے ہوں۔ ریف اور حجاز دونوں جگہ کی خبریں روزانہ جاذب توجہ بنی ہوئی ہیں۔ ریف کی خبریں بڑی امیدوں کے ساتھ اور حجاز کی خبریں ترددو اندیشہ کے ساتھ ہر روز پڑھی جارہی ہیں۔ محمد علی اپنی بڑی صاحبزادی زہرہ بی کے چھوٹے بچے عارف کی وفات کی خبر پا کر مع بیگم صاحبہ رامپور گئے ہوئے ہیں۔ نہیں، یہ فقرہ غلط لکھا گیا، رامپور شہر کی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت ہی کہاں تھی۔ رامپور نہیں، صرف رامپور اسٹیشن گئے ہوئے ہیں۔ دوپہر کا وقت ہے، کامریڈ کے ایڈیٹوریل کمرہ میں کھانا کھا رہا ہوں کہ ہمدرد کے چیف سب ایڈیٹر عارف ہنسوی صاحب کمرہ میں داخل ہوتے ہیں اور حسرت ویاس کے ساتھ ہاتھ پٹخ کر کہتے ہیں ''کہ نجدی آخر اپنی ہٹ پوری کر کے رہے، مدینہ پر گولہ باری کی خبر آ گئی۔ ہم یہاں ان کی

بات بناتے رہے اور وہ ظالم آخر اپنی والی حرکت کر گزرے [1]"۔

میں حیران و ششدر، منہ کا نوالہ منہ میں اور ہاتھ کا ہاتھ میں، عارف صاحب کا منہ دیکھنے لگتا ہوں، "کیا واقعی خبر آ گئی" عارف صاحب جل کر جواب دیتے ہیں "ہاں ہاں صاحب کہہ تو رہا ہوں۔ رائٹر کا تار ہے، صاف صاف بمبارڈمنٹ کی اطلاع ہے"۔ جھٹ پٹ ہاتھ دھو دھلا عارف صاحب کے ساتھ میں اس کمرہ میں آتا ہوں جہاں ہمدرد کا ایڈیٹوریل اسٹاف کام کر رہا تھا، اور جی ہی جی میں دعائیں کرتا آیا کہ خدا کرے یہ بات ہی جھوٹ نکلے۔ عارف صاحب انگریزی جانتے نہیں، خدا کرے تار کا مطلب غلط سمجھے ہوں...... بے بس بندہ بھی اضطراب و اضطرار میں کیسے کیسے بودے سہاروں کی طرف دوڑتا رہتا ہے!

دفتر میں تار میز پر رکھا تھا، خود پڑھا۔ اور دل جس چیز کو ماننا کسی طرح نہیں چاہتا تھا، اسے ماننا پڑا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس تار کو کیا کیا جائے۔ کسی نے کہا اسے شائع ہی نہ کیا جائے۔ دوسروں نے کہا اس سے نتیجہ؟ تار رائٹر کا ہے، بہرحال انگریزی اور سب ہی اخبارات میں پہنچا ہوگا اکیلے ہمدرد کے نہ چھاپنے سے خبر تو چھپنے سے رہی۔ پھر ہمدرد اپنے سر مزید جرم اخفائے خبر کا کیوں لے...... مولانا موجود نہیں، ہدایت و رہنمائی کس سے حاصل کی جائے؟ حیص بیص، قیل و قال، بالآخر طے پایا کہ تار اخبار میں دے تو بہرحال دیا جائے لیکن نمایاں نہ کیا جائے۔ اور عنوان ایسا دیا جائے جس سے خبر کی اصلیت ہی مشتبہ ہو جائے۔ یعنی "حملۂ مدینہ منورہ کے متعلق انگریزی بیان" تار لندن سے آیا تھا اس لیے یہ عنوان بالکل مطابق واقعہ تھا۔ اور تار کے ترجمہ کے ساتھ یہ نوٹ بڑھا دیا جائے کہ مسلمان ابھی اس خبر کی تصدیق کا انتظار کریں اور فوراً کوئی اشتعال نہ قبول کریں۔ سینئر مترجم ڈاکٹر سعید احمد بریلوی تھے، ان ہی نے یہ سب کچھ کیا۔

......☆☆......

---

[1] اردو روزناموں میں اس وقت تک رات کو کام کرنے کا رواج نہ تھا۔ تار دن ہی میں موصول ہوتے اور سہ پہر تک پرچہ مرتب ہو کر پریس کو دے دیا جاتا، شام کو شائع ہو جاتا۔

باب:36

6:1925

(ادھر تحقیق واحتیاط۔ادھر ہڑبونگ)

24 اگست 25 مولانا شب کی ٹرین سے بہت رات گئے واپس آ گئے تھے۔صبح سویرے ہی (دفتر ابھی کہاں کھلا تھا، اور اتنے سویرے ایڈیٹوریل صیغہ کا کوئی رکن حاضر بھی کیسے ہوسکتا تھا) سب سے پہلی بات جو مجھ سے ارشاد فرمائی، وہ یہ سوال تھا ریف کی کیا کیا خبریں آئیں؟......ریف میں غازی عبد الکریم اسپین کے مقابلہ میں جہاد کررہے تھے، اور اس وقت تک برابر کامیابیاں حاصل کررہے تھے۔خبریں سن سن کر خوش سب ہی مسلمان ہورہے تھے، لیکن محمد علی کے دل کی خوشی کا کیا کہنا۔خدا معلوم صبح تک کا انتظار ان سے کیسے کیا گیا۔رات ہی میں مجھے اٹھا کر کیوں نہ خبریں دریافت کیں، یا اسی وقت اخبار پڑھنا کیوں نہ شروع کردیا!

جواب میں میں نے عرض کیا کہ ”جی، ریف کی تو ایسی کوئی خاص خبر نہیں، البتہ مدینہ منورہ کے متعلق خبر آئی ہے کہ نجدیوں نے مسجد نبوی پر گولہ باری کردی۔ چھوٹتے ہی، بلا ایک لحہ کے توقف کے غصہ کے ساتھ بولے ”جھوٹ ہے جھوٹ۔ ہمدرد میں کہیں چھاپ تو نہیں دیا؟“ میں جی میں لرز گیا کہ بس اب ڈانٹ پڑ کررہی۔ جی کڑا کر کے جواب دیا کہ ”رائٹر کا تار ہے۔سب ہی اخباروں میں آیا ہوگا نہ کیوں کر چھاپا جاتا، البتہ خبر ان احتیاط کے ساتھ دی گئی ہے“ احتیاط کی

تفصیل بیان کی، بولے ''خیر،غنیمت ہے''۔ پھر سکون وسنجیدگی کے ساتھ فرمایا ''ان خبروں کے چھاپنے میں بڑی احتیاط رکھنی چاہیے، ہر طرح کی جھوٹی خبریں آئیں گی تاکہ مسلمان آپس میں خوب لڑیں''...... عارف صاحب کی بھی ایک عمر اخبار نویسی میں گزر چکی تھی اور اپنے خیال میں وہ خبروں کے شعبہ میں مرتبہ ماہر کار رکھتے تھے، لیکن یہاں تک نگاہ تو صرف محمد علی کو پہنچ سکتی تھی، یہ جھلک اس فراست ایمانی کی تھی، جس کا نقشہ ان الفاظ میں دکھایا گیا ہے:

وَاِذَا جَآءَ هُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْبِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ.

انھیں جب کوئی خبر امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو اسے خوب پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنے میں سے صاحبانِ امر کی طرف پہنچا دیتے تو جو ان میں سے بات کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں وہ اسے سمجھ لیتے۔ (نساء آیت 83)

....

وہی دن، وہی تاریخ۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کھانا ہو چکا تھا یا ہو رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ معلوم ہوا کہ ٹرنک کال ہے اور دفتر کے چپراسی نے آ کر کہا کہ ٹیلیفون لکھنؤ سے بول رہا ہے، اور وہ صاحب خود سرکار سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ محمد علی خود اٹھ کر فون پر گئے لکھنؤ سے چودھری خلیق الزماں بول رہے تھے۔ چودھری صاحب یوپی کے لیڈروں میں سے تھے۔ 21 میں جیل کی ہوا کھائے ہوئے، اور تحریک خلافت کے سلسلہ میں نام پائے ہوئے۔ لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر اور اس وقت تک محمد علی کے ایک مخلص نائب۔ انھوں نے اپنی کوٹھی واقع خیالی گنج سے کہا ''مولوی عنایت اللہ صاحب فرنگی محل سے مولانا عبد الباری صاحب کے بھیجے ہوئے ابھی آئے ہیں۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں، کہتے ہیں، کل کے تار کے بعد اب خاموشی ناممکن ہے۔ مدینہ منورہ کی گولہ باری پر مسلمان کسی طرح ضبط نہیں کر سکتے۔ لکھنؤ میں ایک بڑا جلسہ کرنے والے ہیں۔ مجھ سے شرکت کے لیے کہا۔ میں نے کہا کہ مولانا محمد علی کا مشورہ سب پر مقدم ہے۔ سلطان ابن سعود کا اگر یہ جرم ثابت ہو جائے تو پھر کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ مولوی صاحب یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کے جواب کے منتظر ہیں۔ جو کچھ فرمائیے ان سے کہہ دوں''۔...... یہ مولوی مفتی

عنایت اللہ صاحب علاوہ مولانا عبدالباریؒ کے عزیز قریب اور شاگرد اور مسترشد ہونے کے، خود بھی ایک صاحب علم ونظر فقیہ اور مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل کے صدر تھے۔

محمد علی نے جواب میں کہا کہ ''بیشک جو بھی کارروائی ہو، متفقہ ہونا چاہیے۔ لیکن مجھے تو ابھی تک خبر ہی پر یقین نہیں۔ سب سے مقدم خبر کی تحقیق ہے۔ تار لندن سے آیا ہے۔ اس میں بھی حوالہ بیت المقدس کے نامعلوم ذرائع کا ہے۔ تحقیق کی بہترین صورت یہ ہے کہ مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی سے بیت المقدس مسلم سپریم کونسل (مجلس اعلیٰ) کے نام جوابی تار دے۔ یہ سپریم کونسل بھی انگریزوں ہی کے زیر اثر ہے اور شریف کا بیٹا عبداللہ بھی وہاں موجود ہے۔ تاہم مفتی امین الحسینی سے مجھے امید ہے کہ وہ ضرور صحیح اور سچی خبر دیں گے۔ یہاں جو کچھ بھی کیا جائے اس تحقیق کے بعد نہ کہ اس کے قبل۔ اور اس میں زیادہ دیر بھی نہ لگے گی، ایک ہی دو روز لگیں گے۔ مولانا سے میری طرف سے بہت زور دے کر یہ کہہ دو کہ خدا کے لیے تھوڑے سے صبر وضبط سے کام لیں۔ جوش کو بے محل نہ صرف ہونا چاہیے۔ شوکت کو ابھی بمبئی ٹیلیفون کریں، میں ابھی انھیں بھی ٹیلیفون کر چکا ہوں (یا کر رہا ہوں)''۔ یہ آخری فقرہ اتنے عرصہ کے بعد خوب یاد نہیں۔ ''کر چکا ہوں'' کہا تھا یا ''کر رہا ہوں''۔ بہر حال کہا جو کچھ ہو بمبئی ان کا فون کرنا اچھی طرح یاد ہے۔ خود ہی ٹیلیفون پر کھڑے ہو کر دیر تک شوکت صاحب کو بیت المقدس جوابی تار دینے کی ہدایتیں کرتے رہے۔ خیال غالب یہی ہے کہ بمبئی کو وہ ٹرنک کال پہلے ہی کر چکے تھے، اس کے بعد لکھنؤ والا فون آیا۔ بیت المقدس کے مفتی اعظم شیخ امین الحسینی (جو آخر 48 میں اس ڈائری کے نقش ثانی کی تحریر کے وقت ماشاءاللہ ہر طرح صحیح وسلامت اور خدماتِ ملی میں مصروف ہیں[1]) انھیں پورا اعتماد تھا...... آج اتنے عرصہ کے بعد ٹھنڈے دل سے دیکھیے تو یہی روش سب سے زیادہ سلجھی ہوئی اور عقل و دیانت کے مطابق نظر آئے گی۔ لیکن اس وقت جوش و ہیجان کے عالم میں یہ ہوشمندانہ کارروائی قابل صد ملامت ٹھہری، اور محمد علی کی طویل فرد جرم میں ایک اہم عنوان قرار پائی۔

....

اصل تار جس پر یہ ساری قیامت برپا ہو رہی تھی، اس کا لفظی ترجمہ یہ تھا:

---

1 بلکہ ماشاءاللہ اس مسودہ کی نظر ثانی کے وقت شروع 1954 میں بھی۔

''لندن 23 اگست۔ بیت المقدس کا ایک تار مظہر ہے کہ معتبر ذرائع سے علم ہوا ہے کہ نجدیوں نے مدینہ پر حملہ کر دیا۔ اور دو روز ہوئے کہ گولہ باری شروع ہو گئی، جس کے نتیجہ کے طور پر اس مسجد اعظم کے جس میں پیمبر کا مزار ہے، گنبدوں کو بہت نقصان پہنچا ہے''۔ (رائٹر)

خلافت کمیٹی کا پہلا وفد حجاز، جس میں مولوی محمد شفیع داؤدی (ایڈوکیٹ صوبۂ بہار) مولانا محمد عرفان، مولانا عبد الحلیم صدیقی اور قمر احمد صاحب غازی پوری، بی اے (ایڈیٹر روزنامۂ خلافت، بمبئی) وغیرہ شامل تھے، ابھی سلطان ابن سعود سے مل کر واپس آیا تھا اور اسے سلطان اطمینان دلا چکے تھے کہ ہدم عمارات متبرکہ کے جو واقعات مکہ معظمہ میں ان کی غیر حاضری اور لاعلمی میں پیش آ چکے تھے، ان کا اعادہ مدینہ میں ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ اس اطمینانی اطلاع کے بعد یوں بھی یہ تار قابل اطمینان نہ تھا، پھر اس کا اس چکر کے راستہ سے آنا اسے اور بھی مشتبہ بنا رہا تھا۔ اس سب کے علاوہ تار کا بین السطور خود یہ کہہ رہا تھا کہ نجدی فوج کے حملہ کا اصل ہدف شہر مدینہ ہے، جہاں ''شریف زادہ'' امیر علی بن حسین کی فوجیں تھیں، نہ کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ مسجد کے قبوں کو گزند اگر پہنچا ہے تو ضمناً اور گویا محض بے احتیاطی سے پہنچ گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گزند پہنچنے بلکہ اس پر حملہ ہونے سے بھی یہ تار یکسر خاموش تھا۔ لیکن اندھا دھند جوش کا بھلا ہو کہ ہر طرف شور یہی مچ گیا کہ وہابیوں نے روضۂ رسول پر حملہ کر دیا اور گنبد سبز پر گولہ باری شروع کر دی!...... ہندوستان کی ساری آبادیوں میں جہاں جہاں بھی ''خوش عقیدگی'' کی حکومت تھی، پیرزادوں کی کوئی بستی تھی، ''مشائخ'' کا کچھ بھی اثر تھا، بس ایک ہیجان اور غضبنا کی کی رو دوڑ گئی کہ مردود وہابیوں نے گستاخی کی حد اور بے ادبی کی انتہا کر دی! بمبئی، کراچی، مرادآباد، لکھنؤ، لاہور، بدایوں وغیرہ جو جو شریفی مرکز تھے، سب کہیں بڑے بڑے ''جنگی'' جلسے ہونے لگے اور جلسے ہنگاموں کی شکل پکڑنے لگے۔ لکھنؤ کے شریفی جلسہ میں مولوی عبد الرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم نے کچھ بولنا چاہا تو مع اپنے رفیقوں کے پٹتے پٹتے بچے۔ بمبئی کا ماجرا اس سے بڑھ کر رہا۔ کراچی میں مولانا ظفر علی خان لاہوری کی ''خبر لے لی گئی''۔ بدایوں 'شریف' نے سرکار برطانیہ سے مداخلت کی درخواست کھلم کھلا کر دی اور حنفی، وہابی، یا سنی، وہابی کی جنگ کا میدان سالہا سال سرد رہنے کے بعد تازہ جوش و خروش کے ساتھ از سر نو گرم ہو گیا!...... یہ ڈائری محمد علی کی

ذات وصفات سے متعلق ہے۔کوئی شریفی، سعودی محاربہ کی تاریخ نہیں ۔ان اوراق میں اس جنگ کی تفصیلات کے منتظر نہ رہیے۔ڈائری میں اس جنگ کا ذکر تو صرف اس حد تک آئے گا جہاں تک اس کا تعلق محمد علی سے ہے، اور اس کے بھی صرف وہ حصے جو ڈائری نویس کے ذاتی علم میں ہیں۔

......☆☆☆......

گئی۔شریفی پارٹی کی بن آئی، منہ مانگی مراد ملی۔ پروپیگنڈہ دل کھول کر اور جی بھر کر ہوا۔تحریر،تقریر، جلسہ،جلوس،نظم،نثر،اشتہار،پوسٹر،سارے ہی حربے نکل پڑے۔لکھنؤ کا روزانہ پریس (تین ہی اخبار اس وقت مسلمانوں کے تھے) کہنا چاہیے کہ اسی جماعت کی مٹھی میں تھا۔ انتوں کی حمایت کافی نہ سمجھ کر ایک اور مستقل روزنامہ اسی مقصد سے نکالا گیا۔سید جالب صاحب اپنی ذات اور خیالات کے اعتبار سے فرنگی محل کے معتقد اور ہم مسلک تھے لیکن ایک تو طبعاً مرنجا مرنج قسم کے تھے اور متانت اور سلاست روی ان کے قلم کا خاص جوہر تھی، پھر یہ بھی تھا کہ ان کے پرچہ کے ڈائرکٹروں میں اودھ کے نامور ایڈووکیٹ حاجی محمد نسیم صاحب اور لکھنؤ کے مسلم لیڈر چودھری خلیق الزماں جیسے ''سعودی'' حضرات بھی تھے۔اس لیے ہمدم تو مخالفتِ ابن سعود میں حدود سے آگے نہیں بڑھا۔ باقی عام مقرروں کی آتش بیانیاں، اخبار والوں کی شوریدہ نگاریاں، شیعہ تعلق داروں کی زرپاشیاں، ماتمی انجمنوں کی کارگزاریاں، ان سب نے مل کر لکھنؤ کی فضا ایسی تیار کردی تھی کہ ادھر کسی نے کلمۂ حق زبان سے نکالا ادھر معاً اس پر ''وہابی'' ہونے کا فتویٰ لگ گیا۔ ہمدرد کے وقائع نگار لکھنؤ فرنگی محل ہی کے ایک اہل قلم تھے۔اب ان کے اس تعلق کے برقرار رہنے کا کیا امکان رہ گیا تھا۔

....

ہمدرد کی روش اس موقع پر بھی قابل داد رہی۔قبوں کی حمایت ومخالفت میں اس نے دودو سنجیدہ مقالے، دونوں فریقوں کے لے کر اس بحث ہی کو ختم کردیا۔قبوں کی حمایت میں لکھنے والے مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ اور مولانا مفتی محمد عنایت اللہ فرنگی محلی تھے۔اور مخالفت کرنے والے مولانا خواجہ عبدالحی (استاد تفسیر جامعہ ملیہ) اور یہ نیازمند ڈائری نویس۔ ہمدرد سلطان ابن سعود کی سیاسی پالیسی کی حمایت کرتا رہا،لیکن ان کے مذہبی عقائد کی ہمنوائی کبھی بھی نہ کی۔شدید سے شدید اشتعال کے وقت،بجز ایک استثنائی موقع کے (جب بمبئی میں ایک مسجد میں مولانا شوکت علی پر لکڑی سے حملہ ہوا ہے،اور پھر اس ایک موقع کے لیے بھی بعد کو اس نے معذرت شائع کی) اس نے اپنی متانت وسنجیدگی کی روش کبھی بھی نہ چھوڑی اور اپنے کو برابر سنبھالے رکھا۔ذاتیات وشخصیات کے بجائے صرف اصول ومسائل سے بحث کی اور فرنگی محل،خصوصاً مولانا عبدالباری کے ذاتی احترام کا تو ہمیشہ لحاظ رکھا۔عارف صاحب (ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر) کو مالک ہمدرد اور فرنگی محل کے باہمی

تعلقات کا علم تھا، قدرتاً فرنگی محل کے معاملہ میں بچ ہی بچ کر لکھتے۔ لیکن ہیجان جذبات کے وقت حدود کا لحاظ رکھتا ہی کون ہے۔ میدان جنگ میں سب سے پہلے کام آ جانے والے تو حق وانصاف ہی ہوتے ہیں! ہمدرد غریب کو اس احتیاط وتقویٰ کا انعام یہ ملا کہ الٹے اس کے بائیکاٹ (مقاطعہ) کی تبلیغ وتلقین ''خوش عقیدہ'' حلقوں میں شروع ہو گئی۔

....

قرآن کے مخلوق وغیر مخلوق ہونے کی بحث، صدیاں گزر چکنے کے بعد، آج ہم کو آپ کو کیسی بے روح اور بے حاصل سی معلوم ہو رہی ہے لیکن اسی ''نزاع لفظی'' کے پیچھے ایک وقت میں کیا کچھ نہیں ہو چکا ہے۔ اور کیسی کیسی عزیز اور بیش بہا جانیں اپنے ایمان کے تحفظ کے لیے اس پر نثار نہیں ہو چکی ہیں؟ پھر اسی طرح جبر یہ وقدریہ کے منازعات اور بیسیوں دوسرے کلامی محاربات جن سے قدیم فرقوں کی تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ اور خیر، یہ تو صدیوں قبل کی اور ہندوستان کے باہر کی باتیں ہیں۔ ''آمین بالجھر'' اور ''رفع یدین'' اور اسی قبیل کے بیسیوں دوسرے فقہی جزدیات کی خاطر تو ابھی ایک آدھ نسل قبل اور اسی ہندوستان کے اندر کیسا کچھ خون خرابہ نہیں ہو چکا ہے؟ اور پھر مسئلہ میلاد نبویؐ اور مسئلہ قیام میلاد اور مسئلہ علم غیب رسولؐ اور مسئلہ امکان خلف وعد! العظمۃ للہ۔ آج آپ جتنا چاہیں یہ کہہ کہہ کر اپنا دل خوش کر لیں کہ بھلا یہ بھی کوئی ایسے اہم اور مہتم بالشان مسئلے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ابھی کل تک کس درجہ ان کی اہمیت دلوں میں جاگزیں تھی۔ گویا یہی عین معیار کفر وایمان تھے۔ مباحثہ، مناظرہ، مشاتمہ، مجادلہ، مشاغبہ، یہاں تک کہ مباہلہ بلکہ کہیں کہیں مقاتلہ تک کی نوبت ان ہی مباحث کے صدقہ میں آ چکی تھی۔ اور جس وقت تک ان کی گرما گرمی رہی کون ایسا تھا جو اپنے کو اس سیلاب کی زد میں آنے سے بچا سکا تھا؟

بس بعینہٖ یہی کیفیت 1925 کے نصف آخر اور 1344ھ کے نصف اول میں مسئلہ قبور وقباب میں آپ کے اسی ہندوستان میں، اسی لکھنؤ اور اسی دہلی، اسی اودھ اور اسی پنجاب، اسی دکن اور اسی بہار میں ان آنکھوں نے دیکھی۔ رائٹر کی اصل حکایت، جس پر یہ سارے قصے قضیے چل پڑے تھے، وہ تو درمیان میں غتر بود ہو کر رہ گئی، اور ہر مجمع میں، ہر محفل میں، ہر گھر میں بحث یہ چھڑ گئی کہ قبور کو پختہ کرنا اور پھر ان پر قبہ یا گنبد بنوانا جائز ہے یا ناجائز؟ مستحسن ہے یا حرام؟ اور بنے

ہوئے گنبدوں کے باقی رکھنے نہ رکھنے کے باب میں کیا احکام ہیں؟ فرنگی محل کے عالم اور ندوہ کے فاضل، دیوبند کے فقیہ اور جامعہ ملیہ کے استاد، سچ کا ایڈیٹر اور بدایوں و پھلواری کے خانقاہ نشین جنھیں دیکھیے اسی بحث میں الجھے ہوئے اور ایک دوسرے سے گتھے ہوئے۔ آج ایک فریق کا مضمون نکلا تو کل دوسرے فریق کی طرف سے اس کا جواب۔ آج ایک نے پمفلٹ لکھا، کل دوسرے نے اس کا رد شائع کیا۔ نوبت زبانی تو تو میں میں سے گزر کر کہیں کہیں ہاتھا پائی بلکہ فوجداری کی آ گئی۔ گھر گھر اختلاف وشقاق کی آگ دوڑ گئی۔ باپ شریفی ہے تو بیٹا سعودی، ایک بھائی قبہ شکن ہیں تو دوسرے قبہ نواز۔ بیوی "بدعتی" ہیں تو میاں "وہابی"......محمد علی کو اپنی ذات سے ان بحثوں میں بہت ہی کم دلچسپی تھی۔ وہ انھیں فروع ہی نہیں، فروع درفروع کے درجہ میں رکھتے تھے۔ رجحان طبع اگر کچھ تھا تو عقائد فرنگی محلی ہی کی جانب نہ کہ عقائد سعودیہ نجدیہ کی جانب۔ کہا کرتے تھے کہ "بلند و پختہ قبور کو اسلام نے پسند یقیناً نہیں کیا ہے لیکن ان کی تعمیر کی کوئی قطعی ممانعت یا بنے ہوئے مزارات کے ڈھا دینے کا کوئی صاف حکم بھی ابھی تک میرے علم میں نہیں۔ جس دن آ جائے گا میں خود ہی ہاتھ میں پھاوڑے لے کر تعمیل ارشاد کو بڑھوں گا"۔

ہمدرد میں میرا ایک مفصل مضمون دو نمبروں میں مسلک فرنگی محل کے رد میں اور مشاہد ومزارات کے عدم جواز میں نکلا۔ محمد علی نے اس رائے اور عقیدہ سے کچھ زیادہ اتفاق نہ کیا۔ وہ جو اس وقت سلطان ابن سعود کی تائید کر رہے تھے، اس میں سلطان کے مذہبی عقائد کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ ان کی تائید اس وقت تمام تر اس خیال کے ماتحت تھی کہ اب ارض حجاز کو ملوکیت واستبداد کے عذاب سے ہمیشہ کے لیے نجات ملی جا رہی ہے اور جمہوریہ شرعی کی بنیاد خلافتِ راشدہ کے نمونہ پر قائم ہوئی جاتی ہے۔ اس پر جتنی "بدنامی" ان کی قسمت میں تھی، ہو کر رہی، جذبات کے ہیجان وتلاطم میں کسے تحقیق کی فرصت اور کس کو صداقت کی پروا؟ محمد علی کی وہابیت اور بدعقیدگی کی تشہیر کے لیے بس اس قدر کافی تھا کہ کسی پہلو سے اور کسی بنا پر سہی، بہر حال وہ ہیں تو سلطان ابن سعود کے حامی وہمدرد۔ غریب کی حنفیت اور قادریت، بیعت اور مزارات پر حاضری، عرسوں میں شرکت اور قوالی کی محفلیں، کوئی چیز بھی آڑے نہ آئی اور گلی گلی، گھر گھر ڈھنڈورا پٹ گیا کہ محمد علی وہابی ہیں وہابی، بلکہ وہابیوں کے سردار اور نجدیوں موذیوں کے گرو گھنٹال۔

باب(38)
1925(8)

(بزم اور پھر رزم)

خلافت کمیٹی نام کے لیے اب بھی زندہ تھی۔ حقیقتاً اس کی زندگی ایک آدھ سال پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اودھ میں بھی ایک مستقل صوبہ خلافت کمیٹی تھی۔ یہ نیازمند، بے عمل و پست ہمت، اس کے دورِ عروج میں تو اس سے چھٹکا چھٹکا پھرا، اب محمد علی کی مروت اور ان کی تعمیل ارشاد میں مجبوراً اس میں شرکت کرنا پڑی، اور کچھ عملی حصہ لینا پڑا، یا لوگوں نے کوئی ذمہ داری کا عہدہ بھی سر منڈھ دیا۔ اس کی تفصیلات تو اب یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ اس نئی اور اہم ذمہ داری کے سر آپڑنے پر اسی جولائی کے مہینہ میں محمد علی کو خط لکھا کہ "اپنی قسمت کو کیا کہیے کہ یہ فرض اپنے حصہ میں آیا تو اب جبکہ فضا بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہے، اور کوئی ولولۂ عمل کہیں باقی ہی نہیں رہا۔

ہر کس خمے کشیدہ در مجلس وصالش

چوں دور خسر و آمد جام وسبو نمانده!

دریاباد کے لیے دعوت بھی اس خط میں تھی کہ تشریف لایئے تو آم کھایئے، اور میرے تربیت دیے ہوئے قوالوں کی زبان سے اپنا کلام سنیے۔ جواب عارف صاحب کے قلم سے آیا، اور اسی خط میں ہمدرد کے بعض اور پہلوؤں پر بھی روشنی موجود ہے:

مولانائے محترم ۔عدم فرصت اور کچھ ناسازی طبع کی وجہ سے اس عرصہ میں خط نہیں لکھ سکا جعفری صاحب سے لکھواتا رہا۔

اب تک جس قدر بھی ایڈیٹوریل مضامین ہمدرد میں شائع ہوئے وہ سب میرے ہی قلم سے نکلے ہیں، البتہ اب تین روز سے ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے مضامین لیڈنگ آرٹیکل کی صورت میں شائع ہورہے ہیں اور مراقش کے متعلق مسلسل ان ہی کے قلم سے کامریڈ کے مضامین اردو قالب میں ڈھال کر شائع کیے جائیں گے۔ یہ بزرگ ایک سب اسسٹنٹ سرجن ہیں جو شاہجہاں پور میں پریکٹس کرتے تھے۔''ضرورت'' کے عنوان سے جو اشتہار ہمدرد میں نکلتا رہا ہے، اس کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کی بھی درخواست آئی تھی۔ اور منجملہ بہت سے لوگوں کے ڈاکٹر صاحب کے نام قرعۂ انتخاب نکلا۔مضامین سے ان کی قابلیت کا اندازہ آپ کو ہوجائے گا۔آدمی ذہین اور ادبی مذاق کے ہیں۔

مولانا نے آپ کے خط کے جواب میں فرمایا کہ بڑے زور سے ''ہاں'' لکھ دو، اور فرمایا خواہ کچھ ہو مگر آم اور قوالی نہیں چھوڑی جاسکتی مگر مولانا، یہ تنہا مولانا کو دعوت دینے کے کیا معنٰی، آخر آم اور قوالی سے تو اور لوگوں کو بھی ذوق ہے۔

''چوں دور خسرو آمد'' کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں کہ کام کا تو وقت یہی ہے۔اس وقت تو ایک سیلاب تھا، اور سب ہی اس میں بہے چلے جارہے تھے۔اب کام کرنا عزیمت کا ثبوت ہے۔''پرزور مقابلہ'' کا دوسرا نمبر سچ سے نقل کردیا گیا۔مگر یہ کیا ستم ہے کہ سچ جس وقت سے نکلا ہے، ہماری قسمت میں صرف اس کے مضامین نقل کرنا ہی رہ گیا ہے''۔

یہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید بریلوی میرے ایک مرحوم بھائی، سن میں مجھ سے بہت بڑے کے، ہم سبق تھے اور اس لیے میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ بلکہ میرے لیے ایک حد تک قابل احترام بھی تھے۔مناسبت انھیں اپنے فن سے بڑھ کر شعر و ادب سے تھی۔مولانا نے جب ان کا تقرر کیا تو مجھ سے فرمایا کہ ''میں ان کی قابلیت سے تو کم، ان کی ادبیت سے زیادہ متاثر ہوا''......اب ہمدرد میں عارف صاحب کے بعد سب سے سینئر یہی تھے۔اور عارف صاحب جب چلے گئے تو یہی انچارج ایڈیٹر ہوگئے۔مولانا انھیں اپنے کامریڈ کے مضامین پڑھنے کو بتادیتے اور

پھر انھیں اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لیے ان کو مزید ہدایات زبانی بھی دیر تک دیا کرتے۔

....

یہ ذرا سا جملہ معترضہ آ گیا تھا۔ اب پھر وہی داستان جنگ ملاحظہ ہو۔ قلم اور زبان کے محارب زور وشور سے جاری ہیں۔ ہمدرد پہلے تو زوروں سے لکھتا رہا مگر اب کچھ سرد سا ہو گیا۔ محمد علی تو اپنے اسی اونچے سیاسی تخیل پر قائم اور آویزش کو تمام تر عالم اسلامی کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ میں خود اتنی بلندی پر ساتھ دے کر اسی عام ''فرقہ وارانہ'' پستی کی سطح پر ہوں اور ہمدرد میں قبور وقباب پر لکھ رہا ہوں۔ محمد علی غریب اس حرب عقائد سے بیزار اب تک اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کم از کم ان کے مرشد تو سنبھل جائیں اور ہندوستان میں اس خواہ مخواہ کی کشمکش کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ خوب جانتے تھے کہ فرنگی محل میں مولانا کے گرد وپیش بڑے بڑے غالی موجود ہیں اس لیے اس کا بھی اہتمام رکھے ہوئے تھے کہ ان کی نج کی سعی اصلاح میں یہ حضرات دخل نہ دینے پائیں بلکہ انھیں اس مراسلت کی سن گن بھی نہ ملے۔

عارف صاحب کا ایک مکتوب ستمبر کا ملاحظہ ہو۔ اس سے بہت سے مسائل متعلقہ صاف ہو جائیں گے:

''مولانائے محترم! السلام علیکم

آپ کے دوگرامی نامے رجسٹرڈ موصول ہوئے۔ مضمون کا پہلا حصہ چھپ چکا ہے۔ باوجود کوشش کے ممکن ہے کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں۔ دوسرا آج شائع ہو رہا ہے مگر صفحہ اول پر نہ جا سکا، اس لیے کہ وہ چھپ چکا تھا۔ اب اس سلسلہ کو میں بند کرتا ہوں، آپ کے جواب میں مضامین آنے شروع ہو گئے ہیں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ لکھنؤ و بدایوں وغیرہ میں زور شور سے جواب کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس لیے آج ایک نوٹ کے ذریعہ کچھ عرصہ کے لیے اس سلسلہ کو بند کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔

آپ کا پہلا خط جس وقت آیا مولانا شملہ میں تھے۔ وہاں سے آئے تو اندر زنان خانہ میں بیٹھ کر کام کرتے رہے اور کل پھر پٹنہ چلے گئے، اس لیے ان امور پر گفتگو نہیں کر سکا جن کا جناب نے ذکر فرمایا تھا۔

مولانا عبدالباری صاحب کو جو خط مولانا محمد علی نے لکھا تھا اس کی اطلاع میں نے آپ کو مولانا کے علم و اجازت کے بغیر کی تھی اس لیے میں وہ خط طلب نہیں کر سکا۔ مبادا مجھ سے جواب طلب کرتے کہ کیوں تم نے اطلاع دی۔ یہ خوف مجھے یوں پیدا ہوا کہ مولانا نے اپنے خط میں لکھ دیا تھا کہ اس کو پڑھ کر چاک کر ڈالیے گا اور کسی کو دکھایئے گا نہیں۔ اس کے جواب میں فرنگی محل سے دو خط خاص مولوی صاحب کے قلم کے موصول ہوئے ہیں۔ انھوں نے بھی یہی تاکید محمد علی صاحب کو کی ہے۔ تاہم ارادہ تھا کہ میں اس طرح ذکر کروں کہ آپ کو کسی ذریعہ سے اس خط کا حال معلوم ہو گیا ہے اس لیے آپ نے ایک خط میں اس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ اس کی نوبت آئے وہ اس خط کو مع مولانا عبدالباری کے دونوں خطوں کو لے کر پٹنہ چلے گئے، تا کہ وہاں شوکت صاحب کو دکھلائیں۔ واپسی پر اگر آپ فرمائیں تو ان سے لے کر بھجوانے کی کوشش کروں۔

ایڈیٹوریل مضامین میں جو تغیر آپ نے محسوس کیا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس مسئلہ نے خود میرے اندر ایک جوش پیدا کر دیا تھا اور حریفوں کو جو باطل پر تھے شکست دینے کا جذبہ کام کر رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انگریزوں کی دشمنی کام کر رہی تھی جن کا ہاتھ اس فتنہ کی پشت پر ہے۔ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ میں اب بھی اچھا اور زوردار لکھ سکتا ہوں مگر اس وقت جب میرے دل میں کوئی کیفیت پیدا ہو۔ اگر یہ فتنہ نہ رہتا اور کمزوری کے آثار مخالف کیمپ میں نہ پیدا ہو جاتے تو شاید عرصہ تک قلم میں زور باقی رہتا۔ لیکن الحمدللہ کہ تمام مخالف سمتوں میں اضمحلال و کمزوری کے آثار و علائم پیدا ہو گئے ہیں۔ اور چند روز میں یہ فتنہ بالکل دب جائے گا۔ کہ لکھنؤ میں اس کو ابھارنے کی کوشش کی جائے گی مگر زندگی کا حال معلوم۔ اصل یہ ہے کہ نیک نیتی کا فریق مخالف کے ہاں فقدان ہے۔ زیادہ تر علی برادران کی رقابت کام کر رہی ہے البتہ حسرت موہانی کا افسوس ہے۔

محمد علی ''پارٹی'' کی لیڈری کے لیے خلق ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ پارٹی چاہے سیاسی ہو یا مذہبی اور نہ انھیں ایسی محدود اور تنگ قسم کی لیڈری سے کچھ دلچسپی تھی۔ مذہب ہو یا سیاست، وہ ہر مسئلہ کو ''رہبر ملت'' کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی اور اس پر عالمی نقطۂ نظر سے نظر کرنے کے خوگر تھے۔

ہمدرد میں مضامین و مراسلات برابر میرے اشاروں پر جا رہے تھے، مخالفت کا مرکز مولانائے فرنگی محلی کو بنائے ہوئے۔ استدلال ہم لوگوں کا یہ تھا کہ اُدھر سے شریفی پریس جب سب کا سب محمد علی کو اپنے طعن و طنز کا ہدف بنائے ہوئے ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہم مولانائے فرنگی محلی کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ ہمدرد کا اسٹاف اپنا ہم خیال تھا اور خوشی سے ایسے مراحل، وقائع وغیرہ لے رہا تھا۔ لیکن خود محمد علی کی نظر جب بھی پڑ جاتی بس اسٹاف والوں کی خیر نہ تھی۔ مجھ حقیر کا لحاظ اس میں شبہ نہیں کہ محمد علی بہت کرتے تھے، کرم و شفقت میرے حال پر بے نہایت رکھتے تھے لیکن اصول کے معاملہ میں، حق و انصاف کے معاملہ میں، محمد علی کسی کی مروّت یا رعایت کرنا جانتے ہی نہ تھے،...... عارف صاحب 12 اکتوبر کو خط کیا لکھتے ہیں رورو کر اپنا حال زار سناتے ہیں:

''مولانائے محترم۔ مولانا محمد علی صاحب نے سخت تاکید کردی ہے کہ اب آئندہ سے مولانا عبدالباری صاحب کے متعلق ایک حرف نہ لکھا جائے۔ خیر، میں اتنی پابندی تو نہیں کر رہا ہوں، مگر جناب والا نے ''فرنگی اور فرنگی محلی'' کے عنوان سے جو مضمون بھیجا ہے، مجبوراً پروف پر سے اسے چیک کروا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے معذور و مجبور سمجھ کر معاف فرمائیں گے۔ میں فرنگی محل کے متعلق آپ سے زیادہ متشدد ہوں اور اسی میلان طبع اور خیالات ذاتی کا اثر تھا کہ اس قدر کثرت سے فرنگی محل کے خلاف ہمدرد میں لکھا گیا۔ مولانا نے پہلے بھی مجھ کو منع کیا تھا مگر اب سختی سے منع کر دیا ہے۔ لہٰذا مجبوری ہے۔

مولانا شوکت علی اس کے حق میں تھے کہ فرنگی محل کی خبر لی جاتی رہے مگر مولانا محمد علی صاحب اس سے زیادہ جتنا ہو گیا پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ مولانا ایک سادہ لوح آدمی ہیں اور جو پاس رہتا ہے اس کا ان پر قبضہ ہو جاتا ہے۔

میں نے ''وقائع لکھنؤ'' بغیر پڑھے ہوئے لکھنے کے لیے دے دیا تھا، ورنہ میں فوراً آپ سے صورت حال عرض کرتا اور پھر آپ سے مشورہ کرتا۔ لیجیے زاہد علی صاحب[1] نے ابھی پروف مولانا

---

[1] مولانا محمد علی کے بھتیجے اور بڑے داماد۔ اس وقت ہمدرد کے منیجر تھے۔

کو دکھلا دیا اور انھوں نے باز پرس کرلی اور خود اس حصہ پر سیاہی پھیرنے کا حکم دے دیا۔ یہ خط لکھنے کے دوران میں ہوا ہے۔

امید ہے کہ آپ میری صحیح پوزیشن کو سمجھ لیں گے اور مجھ سے ناراض نہ ہوں گے۔ آج شیخ عبدالعلی بھیاروی[1] کا بھی مراسلہ آیا ہے، جس میں احد حسین والے[2] معاملہ پر روشنی ڈالی، یعنی یہی معاملہ جس پر آپ نے بھی لکھا تھا اس تحریر کو مولانا کو دکھلانے کے لیے جارہا ہوں، اگر اجازت دیں گے تو شائع کردوں گا، نہیں تو نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں اب زیادہ لکھنؤ کانفرنس کا ذکر کرنا اس کو اہمیت دینا ہے۔

خادم عارف ہنسوی

عبدالعلی میاں کے مراسلہ کی اشاعت کی اجازت دے دی ہے مگر مع ایک نوٹ کے، جو کل شائع ہوگا''۔

محمد علی کا غیظ وغضب، آتش بیانی اور تیز زبانی تو دنیا میں خوب اچھلیں۔ کمتر لوگ ہوں گے جنھوں نے محمد علی کی اس شرافت قلب کو جانا یا اس عالی ظرفی کو پہچانا...... مسلسل حملوں اور اشتعال انگیزیوں کے درمیان اپنے مقام عدل اور نقطۂ اعتدال پر قدم جمائے رکھنا، کام ہم عوام کا نہیں، خاص اہل اللہ کا ہے۔

......☆☆☆......

---

1 مولانا فرنگی محلی کے ایک عزیز قریب جو اس وقت اپنے ان بزرگ کے شدید مخالف تھے۔

2 ٹینس کے مشہور کھلاڑی۔ اس وقت خلافت کے خاص کارکن تھے۔ شریفیوں کی کانفرنس (لکھنؤ) میں شرکت کے لیے گئے تھے۔

باب:39

9:1925

(پیراور مرید کی آویزش)

ارض حجاز پوری کی پوری سلطان ابن سعود کے قبضہ میں آ چکی، لیکن ہندوستان کے ایک بڑے حصہ میں اس تسلط کے خلاف بغاوت اب تک جاری۔ ستمبر کا سارا مہینہ ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں کی کشمکش میں گزرا۔ جہاں دیکھیے یہی آویزش، جدھر آنکھ اٹھائیے یہی چپقلش، لکھنؤ، فرنگی محل کی پرقوت سرپرستی کے بل پر، ابن سعود کے دشمنوں کا ایک زبردست مرکز۔ پوسٹر، پمفلٹ مضامین ومقالات، کارٹون، تمسخر آمیز ہجویہ نظمیں، ماتمی انجمنوں کی آہ وبکا، ماتمی جلوس اور جھنڈے، گرماگرم تقریریں، پرجوش جلسے، ایک مستقل ادارہ ''خدام الحرمین'' کا قیام، ایک نام کی آل انڈیا کانفرنس وغیرہا۔ غوغائیوں کی بڑی تعداد کے ساتھ چند مخلصین کی شرکت سونے پر سہاگہ کا کام کرگئی۔ سالار لشکر مولانا عبدالباری فرنگی محلی، میمنہ اور میسرہ پر حسرت موہانی اور شیخ مشیر حسین قدوائی 1، عقب میں شیعہ امرا و تعلق دار، خصوصاً راجہ صاحب سلیم پور اور راجہ نواب علی خان، خلافت والے غریب کہاں تک ظلم وستم سہتے اور آخر کب تک نہ بولتے! مولوی ظفر الملک

---

1 گدیہ (ضلع بارہ بنکی) کے تعلق دار و بیرسٹر، بڑے پرجوش مسلمان، انگریزی میں چھوٹی بڑی متعدد تبلیغی کتابوں کے مصنف۔ اب مرحوم (1952)

علوی اٹھے اور چودھری خلیق الزماں نے بھی ایک لمبی انگڑائی لی۔ طے یہ پایا کہ باطل کے سارے رسی کے سانپوں کے نگل جانے کے لیے عصائے حق کا اژدھا کافی ہے۔نظر سب کی محمد علی ہی پر پڑی۔

اتفاق سے عین اسی زمانہ میں 18 اکتوبر کو سیتاپور میں صوبہ کی پولیٹیکل کانفرنس کا اجلاس مولانا شوکت علی کی صدارت میں تھا۔گاندھی جی بھی اس میں بولنے والے تھے اور محمد علی بھی۔ (اس وقت بغیر اس مقدس ''تثلیث'' کے اجتماع کا کوئی اہم کام ہو ہی کہاں سکتا تھا)۔صلاح یہ ٹھہری کہ واپسی میں 20 اکتوبر کو محمد علی لکھنؤ میں چند گھنٹہ کے لیے اتر پڑیں اور ایک تقریر کر دیں جس سے ساری غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں اور غلط گمانیوں کے بادل چھٹ کے رہ جائیں۔ یہ نیازمند اس سفارت پر سیتاپور گیا۔دو چار گھنٹے علی برادران کے ساتھ بسر کیے۔مزیدار کھانے ان کے ساتھ کھائے۔اس سے زائد مزیدار باتیں ان کی سنیں اور بات پکی کر کے شام کو واپس آ گیا۔

تاریخ موعود آئی، اور تاریخ کے ساتھ ہی محمد علی وارد لکھنؤ ہوئے.....مرید کا کام تو شیخ کی اطاعت حمایت ونصرت ہی ہر حال میں سمجھا گیا ہے۔ارشاد بیعت کی ساری تاریخ میں یہ واقعہ شاید اپنی نظیر آپ ہی ہو کہ مرید اپنے شیخ کی مخالفت کرنے علی الاعلان اور پرزور مخالفت کرنے دور دراز کا سفر اختیار کر کے، اپنا وقت اور اپنا پیسہ خرچ کر کے آ رہا ہے! بیعت، ارادت، محبت عقیدت کی بنیاد جس طرح حق واخلاص پر تھی، مخالفت، تردید، تغلیط کی بنیاد بھی حق واخلاص پر رہی۔محبت اگر اللہ کے لیے تھی، تو اس علی گڑھ کے نیچری اور آکسفورڈ کے گریجویٹ نے، اس چودھویں صدی ہجری میں اپنی مثال سے یہ دکھا دیا کہ مخالفت بھی اللہ ہی کے لیے ہو سکتی ہے!.....حب فی اللہ کے بعد بغض فی اللہ کی یہ کیسی قابل رشک تفسیر رہی!

لکھنؤ کی منزل تو ابھی بعد کی تھی۔امتحان کی گھڑی اس سے قبل سیتاپور ہی میں آ گئی[1]۔ بعد مغرب وہاں کی جامع مسجد میں پرزور تقریر اسی مسئلہ حجاز پر کر رہے تھے کہ حاضرین میں سے کوئی صاحب بول اٹھے کہ ''آپ کے مرشد کا مسلک تو اس کے خلاف ہے، پھر یہ مرشد سے مخالفت کیسی؟ محمد علی نے تقریر کی اس رو اور روانی میں بغیر ایک لمحہ کا خلل ڈالے جواب دیا ''میں نے مرشد

1۔ سیتاپور معتقدین ومریدین فرنگی محل کا ایک خاص مرکز تھا۔

اسی لیے انھیں بنایا تھا کہ جن معاملات میں مجھے ہدایت کی ضرورت ہوگی وہ مجھے حق کی راہ دکھائیں گے لیکن اس خاص مسئلہ میں تو وہ خود میری رہنمائی کے محتاج ہیں، ان کی اعانت کرنا میرا فرض ہے" مرشد کو مرشد کے مرتبہ پر اور اللہ کو اللہ کے مرتبہ پر رکھنے کی ایسی خالص ایمانی مثالیں میرے علم میں متعدد نہ اس کے قبل آئی تھیں، نہ اس کے بعد ہی آئیں!

....

مرید اپنے مرشد کا محض مطیع ہی نہ تھا، دوست ومحب بھی تھا، عاشق وشیدائی بھی تھا، ممنون کرم بھی رہا کرتا تھا۔ پارٹی نے اب کی بڑی بے ڈھب ایک شرط یہ لگادی تھی کہ لکھنؤ میں قیام اس بار محل سرائے فرنگی محل میں نہیں بلکہ چودھری خلیق الزماں کے ہاں ہو، ورنہ تعلقات کی اتنی کشیدگی کی حالت میں اپنے لوگوں میں سے فرنگی محل جانا کون گوارا کرے گا؟ سالہا سال کا معمول ٹوٹا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس دل سے محمد علی نے اب کی فرنگی محل چھوڑ کر خلیق صاحب کی مہمانی قبول کی۔ یہ محض اتفاق کہیے یا کچھ اور کہ مولانائے فرنگی محلی بھی اس تاریخ کو لکھنؤ سے باہر تھے، ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور، حیدرآباد میں۔ صبح ہوئی کہ خلیق صاحب کی کوٹھی (واقع خیالی گنج) میں محمد علی کے گرد مجمع ہوگیا۔ پرانے مخلصوں اور معتقدوں، خلافت کے کارکنوں کے ساتھ ساتھ بعض نئے حواری بھی!...... محمد علی کی محبت وارادت میں نہیں، فرنگی محل کی ضد اور عناد پر! حب علی میں نہیں بغض معاویہ پر!

ادھر محمد علی خود فرنگی محل جانے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔ پارٹی کا حکم اس حد تک تو بہر حال نہیں مان سکتے تھے کہ فرنگی محل سے کوئی تعلق ہی نہ رکھیں۔ پارٹی کا کوئی شخص کیوں ہمراہ جانے لگا تھا۔ بس یہی ڈائری نویس جو پارٹی بھر میں سب سے زیادہ ٹھنڈے مزاج کا سمجھا جاتا تھا اور جس کے تعلقات اس وقت تک بھی فرنگی محل سے بدستور نیاز مندانہ تھے، ہمراہ ہوا۔ خلیق صاحب کے موٹر پر محمد علی فرنگی محل کے لیے دوپہر سے کچھ قبل روانہ ہوئے۔ مکین کے بجائے زیارت صرف مکان کی ہوئی۔ مولانا کے صاحبزادے جو اب ماشاء اللہ جمال میاں کے نام سے مشہور ہیں، اس وقت بالکل بچہ تھے، اور کسی شمار قطار میں نہ تھے۔ البتہ مولانا کے دوسرے سن وار اعزہ مولوی سلامت اللہ صاحب، مولانا مفتی محمد عنایت اللہ وغیرہم بڑھ کر ملے۔ حسرت موہانی بھی

یہیں مل گئے۔ عجب نہیں جو کمک کے لیے بلا رکھے گئے ہوں۔

فرنگی محل کی میز بانی اور مہمانی نوازی مشہور ہے۔ دوپہر کا کھانا یہیں ہوا لیکن دسترخوان ہی پر گرم گرم اور لذیذ کھانوں کے ساتھ گفتگو بھی گرما گرم اور ذرا بدمزہ شروع ہوگئی۔ محمد علی بجز اپنے مرشد کے اور کسی سے اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہی نہ تھے۔ لیکن سوالات شروع ہوگئے اور جواب انھیں بادل ناخواستہ دینے پڑے۔ چلتے چلتے بات بڑھنے لگی اور جب رخصت ہوکر فرنگی محل کے بل پر، پولیس چوکی کے سامنے، موٹر پر سوار ہونے لگے تو فریقین کا لہجہ اتنا بلند ہو چکا تھا کہ راہ گیروں کا ایک خاصہ مجمع گویا تماشا دیکھنے ہی کے لیے ہوگیا۔ اور اس کم ہمت کو ہمت کر کے مولانا عنایت اللہ صاحب کے منہ پر ہاتھ رکھ دینا، اور ادب کے ساتھ عرض کرنا پڑا کہ ''مولانا یہ چوراہا ہے چوراہا'' ...... یہ سارے جزویات جذبات کی شدت اور زبان کی حدت کا نمونہ دکھانے کو قلمبند ہورہے ہیں..... محمد علی کی طرف سے بڑی گرفت اس لکھنؤ والے بڑے جلسے کے اشتہار کی اشتعال انگیزی اور مبالغہ آمیزی پر تھی جس کا کوئی جواب فریق ثانی کے پاس نہ تھے۔

......☆☆☆......

باب:40

10:1925

(میدانِ جنگ کا ایک منظر)

جلسہ کے اصلی کرتا دھرتا مولوی ظفر الملک علوی تھے۔ ان ہی نے سارے انتظامات کرر کھے تھے لیکن عین وقت پر پیر میں زخم آ گیا تھا اور اس ''عذر لنگ'' پر گھر کے اندر معتکف تھے۔ کہیں آنے جانے کے قابل نہ تھے۔ محمد علی فرنگی محل سے اٹھ ان ہی کے ہاں آئے۔ یہ دفتر النا ظر وہ جو اس وقت وکٹوریہ اسٹریٹ پر فرنگی محل سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر تھا۔ یہیں ان کے ملاحظہ میں لکھنؤ کے وہ اخبارات خصوصاً ''پنچ'' اخبارات لائے گئے۔ جنھوں نے مزاح وظرافت کو آڑ بنا کر تہذیب، شرافت، وانسانیت کا اپنے ہاتھ سے گویا گلا گھونٹ دیا تھا...... کلکتہ اور بمبئی میں جس طرح سالسٹر بڑے بڑے بیرسٹروں کو مقدمہ کے کاغذات دکھا دکھا کر پیروی کے لیے تیار کرتے ہیں، کچھ ایسی منزل میں اس وقت مولوی حاجی ظفر الملک تھے۔ انھیں خود تو جلسہ میں جانا نہ تھا البتہ محمد علی کو ہر طرح لیس کر دینا تھا۔

یہاں سے چل کر محمد علی قیصر باغ راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں آئے، جواب مہاراجہ ہو چکے تھے، اور اس وقت یو۔ پی گورنمنٹ کے ہوم ممبر بھی تھے۔ در پردہ ان کی بھی ہمدردیاں مخالفین ابن سعود ہی کے ساتھ تھیں، لیکن بہر حال یہ کھلے ہوئے معاند نہ تھے اور شیعہ رئیسوں میں سب سے

غنیمت تھے۔ محمد علی سے جس طرح ہمیشہ ملتے آئے تھے، اب کی بھی ملے۔ محمد علی کا معمول ہمیشہ سے ان کی ملاقات کا تھا اور اس میں ان کے سرکاری عہدہ نے بھی فرق نہ پڑنے دیا۔ نہ ان کی طرف سے نہ محمد علی کی طرف سے۔ آج کے ہونے والے جلسہ کا بھی ذکر رہا۔ مہاراجہ نے رات کے کھانے پر بھی مدعو کر دیا۔ باتوں باتوں (میں ذکر شیخ مشیر حسین قدوائی کا آ گیا، جو اتفاق سے اس وقت محمد علی کے بالکل مخالف کیمپ میں تھے۔ مہاراجہ نے ان کا ایک اعتراض (تمام تر لغو) محمد علی کی پبلک زندگی سے متعلق نقل کر کے ان کا یہ قول بھی دہرایا کہ ''اگر یہ غلط ہے تو محمد علی حلف سے اس کا انکار کر دیں'' ۔ محمد علی نے برجستہ ایک الزامی جواب شیخ صاحب کی خانگی زندگی کے متعلق مہاراجہ کے کان میں دیا اور کہا کہ اگر یہ غلط ہے تو مشیر حسین حلف سے اس کا انکار کر دیں'' ۔ جواب تھا بڑا دلچسپ، لیکن استاعریاں کہ صفحہ اور کاغذ پر اس کے لانے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ مہاراجہ تھے بڑے نستعلیق، مہذب اور شائستہ۔ ایسا غیر متوقع جواب سن کر اور کچھ نہ بن پڑی بجز اس کے کہ زور سے لاحول ولاقوۃ پڑھ دیں..... محمد علی بے حد برجستہ گو اور حاضر جواب تھے، چپ رہنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن کمتر لوگوں کو علم ہوگا کہ وقت آنے پر ہزل گوئی اور فحاشی یا پھکڑ کسی بات میں چوکنے والے نہ تھے۔ افسوس کہ ان کے متعلق یہ علم، صرف علم سینہ ہی رہے گا، علم سفینہ نہ بن سکے گا۔

....

جلسہ کا مقام، عمارت رفاہ عام کلب کا عقبی صحن تھا۔ اس وقت تک علاوہ امین الدولہ پارک کے پبلک جلسے یہاں بھی ہوتے رہتے تھے۔ وقت وہی سہ پہر بعد عصر کا، جو لکھنؤ کے پبلک جلسوں کے لیے اس وقت عام وقت تھا۔ جلسہ کے داعیوں میں شہر کے معززین، شرفا اور ہر طبقہ کے نمائندوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ یہ ڈائری نویس سایہ کی طرح محمد علی کے ساتھ ساتھ۔ جس وقت ہم لوگ جلسہ گاہ میں پہنچے ہیں، بہت بڑا مجمع پہلے سے پہنچ چکا تھا۔ موٹر برساتی میں رکا اور ہم لوگ اتفاق سے عمارت کے ہال کے اندر سے ہو کر گذرے۔ دیکھا کہ حال کے اندر تماشائیوں کی نظر سے مخفی ومستور، راجہ صاحب سلیم پور اور راجہ نواب علی خان بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ مجھ کو حیرت ہوگئی کہ یہ حضرات یہاں کہاں۔ سرسری صاحب سلامت ہوئی۔ ادھر ذہن ہی نہ گیا کہ اگر جلسہ میں شرکت ہی کھلے خزانہ انھیں منظور ہوتی تو بجائے صحن میں ہونے کے، ہال کے

اندران کا ''قیام'' کیوں ہوتا۔

صدارت کے لیے انتخاب چودھری خلیق الزماں صاحب کا ہوا اور جلسہ شروع ہوا۔ ایک عرب سیاح توفیق شریف اس زمانہ میں آئے ہوئے تھے۔ پہلے انھوں نے عربی میں ایک تقریر کی اور اس کے ایک ایک فقرہ کا ترجمہ مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم کرتے گئے۔ اتنے میں مغرب کا وقت آ گیا اور نماز اسی صحن میں بہت بڑی جماعت کے ساتھ ہوئی! سب سے پہلے بہت دور سے فرنگی محل کے ایک مرید خاص کی طرف سے ایک سوال کی آواز اور اس آواز پر معاً دوسری آواز، اور تیسری آواز۔ پھر ایک ساتھ بیسیوں آوازیں! گویا ایک کورس تھا جو بجائے نغمہ و ترنم کے، شور و غوغا کی لے میں بلند ہو رہا تھا۔ اب سوالات موقوف تھے، اور ان کے بجائے صرف یہ مطالبہ اور یہ نعرہ کہ ''ہم نہیں سنیں گے، نہیں سنیں گے'' حلق کی پوری قوت اور چیخ کی انتہائی بلندی کے ساتھ فضا میں قائم! صدر مجلس بار بار نظم قائم رکھنے کی ہدایت اور خاموش ہونے کی تلقین فرما رہے ہیں، چمکار کر بھی اور کھڑک کر بھی لیکن جو محمد علی سے بغاوت پر تل کر آئے تھے، وہ خلیق الزماں غریب کو کیا خاطر میں لاتے؟ غوغائیوں کی تعداد کچھ ایسی بڑی نہ تھی، سوڈیڑھ سو ہوں گے لیکن صحن کے مختلف حصوں میں بڑی ترکیب اور استادی کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے اور جلسہ کو درہم برہم کر دینے کے لیے بالکل کافی بلکہ کافی سے زائد تھے۔ بعض ماتمی انجمنوں کے ارکان پیش پیش دکھائی دیے اور ان شیعہ رئیسوں کی تشریف آوری کے معنی اب بالکل روشن تھے!

....

سینکڑوں ہزاروں عام حاضرین دنگ وحیران، متحیر و پریشان کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! اندھیرا تو ہو ہی چلا تھا کہ اتنے میں ایک بڑا سا ڈھیلا تخت صدارت کے سامنے آ کر گرا۔ عین اس جگہ میں بیٹھا ہوا تھا اور حسرت موہانی کے ایک ندیم خاص بھی۔ ڈھیلا گرتے ہی ایک شور برپا ہوا ''لینا'' ''پکڑنا'' ''یہ کس کی حرکت ہے'' ''جانے نہ پائے'' ایک ملیح آبادی سرخ ریش خاں صاحب (ایک مشہور ملیح آبادی کے والد ماجد) ڈنڈا لے کر یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ ''یہ بدمعاش یوں نہ مانیں گے''۔ میں نے ان کے ہاتھ پکڑ کر اور اپنے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ ''خدا کے لیے کہیں ڈنڈا نہ چلا بیٹھیے گا''......غضب ہو جائے گا۔ بولے کہ نہیں شہر کا مجمع ہے یہ یوں ہی ٹھیک ہو سکتا ہے۔

حلقہ فرنگی محل کے ایک خاصل متوسل کھدر پوش اور اس وقت تک مولانا شوکت علی سے تعلق خاص رکھنے والے دکھائی دیے کہ ہر طرف گھوم پھر کر گویا اس لشکر کی کمان کرر ہے ہیں۔محمد علی نے چلا چلا کر درود شریف پڑھا اور دوسروں سے پڑھوایا لیکن اثر کس پر ہوتا؟ جب خود آل محمد کی خطابت میدان کربلا میں امت کے لیے بے اثر رہی تو آل محمد کا محض نام کب ہمیشہ اور ہر جماعت پر اثر کر سکتا ہے؟ جالب صاحب (ایڈیٹر ہمدم) بھی تخت صدارت کے قریب ہی تھے اور سب کے ساتھ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔محمد علی نے ان کا نام لے کر پکارا اور پوچھا ''جالب صاحب آپ میری تقریر سننا چاہتے ہیں یا نہیں؟'' بولے ''کیوں نہیں، ضرور سنوں گا''۔''اچھا تو پھر باقاعدہ بیٹھ جایئے''۔لیکن ایک جالب بیچارہ کی شرافت اور باقاعدگی سے کیا ہوتا تھا۔گیس کے ہنڈے بجھائے جانے لگے، اور پوری کیفیت ہڑبونگ کی پیدا ہوگئی۔ایک افراتفری کا عالم، نفسی نفسی پڑ گئی۔اندھیرے میں یہ اس پر گرتا وہ اسے دھکیلتا۔حکومت اس وقت نہ عقل کی نہ نقل کی، نہ شریعت کی نہ شرافت کی، صرف شرارت اور ننگے پن کی تھی......عارف رومی نے مثنوی میں ایک جگہ کہا ہے کہ ایک شخص جب سننا نہ چاہے تو سو سنانے والوں کا ناطقہ بند کر سکتا ہے۔

یک کس نامستمع زستیز ورد
صد کس گوینده را عاجز کند

اور پھر جب غوغائیوں کی تعداد ایک دو نہیں بیسیوں اور پچاسوں ہوں تو ظاہر ہے کہ انھیں سنانا کس کے بس میں ہے؟

....

5 منٹ، 10 منٹ، 12 منٹ۔صدر صاحب بھی آخر کب تک صبر و انتظار کرتے؟ کچھ دیر اور موقع دینے کے بعد جلسہ برخاست کر دیا۔ع

بات رہ جاتی ہے اور وقت گذر جاتا ہے!

اللہ کی شان کہ مسلمانانِ ہند کے سب سے بڑے لیڈر کے ساتھ یہ سلوک، غیروں کا نہیں خود مسلمانوں کا دیکھنے میں آیا! اور وہ بھی کہاں مسلمانوں کے خاص شہر اور مسلم تہذیب و شائستگی کے

مرکز لکھنؤ میں! کہاں ہزاروں کا مجمع محض محمد علی کا نام سن کر تقریر کے شوق واشتیاق میں آیا تھا اور کہاں چند شریروں کی جسارت نے نوبت یہ پہنچادی۔ محمد علی جلسہ گاہ سے چلے اور اب کی پھر اسی ہال کے اندر سے گزرے۔ مخلصوں اور معتقدوں کا اب کی ایک ہجوم ہمراہ تھا۔ بعض کا اصرار ہوا کہ جلسہ اب منعقد ہو، شورہ پشت عنصر چلا گیا، اس لیے مشتاقوں کا اشتیاق اب پورا کیا جائے۔ میری شامت کہ ان لوگوں کے کہنے سے یہی بات میں نے محمد علی کے کانوں تک پہنچادی۔ اسی بھرے مجمع میں میرے اوپر وہ زبردست ڈانٹ پڑی کہ اسے آج تک نہیں بھولا ہوں......محمد علی کے غصہ میں تمام تر آمد ہی آمد ہوتی تھی۔ تصنع و آورد کی ہر آمیزش سے خالی۔ اتنی مصلحت بینی کی گنجائش ہی کہاں ہوتی تھی کہ یہ جگہ خلوت کی ہے یا جلوت کی! مجرم پر محض عتاب ہی ہورہا ہے یا اس کی تفضیح بھی ہوتی جارہی ہے۔

ایک طرف یہ ہورہا تھا دوسری طرف وہی کھدر پوش ''آنریری'' فرنگی محلی جو غوغائیوں کی کمان کرتے ہوئے دیکھے گئے تھے، اب یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ ''محمد علی صاحب اور جاکر ٹھہریں خلیق الزماں کے ہاں!'' یہ گویا اقرار اس امر کا تھا کہ اصل مخالفت خود محمد علی سے نہیں بلکہ ضد وکد جو کچھ ہے وہ ان کے لکھنوی رفیقوں اور ہمدردوں سے ہے۔ غوغائی سرداروں نے ایک عارضی وقتی ہنگامی فتح حاصل کر کے مستقل بدنامی اپنے لیے حاصل کرلی۔ شہر میں گلی گلی، گھر گھر ان پر نفریں ہونے لگی اور تو اور خود انھیں کے ہم خیالوں میں جو لوگ سنجیدہ، شریف المزاج اور خوش فہم تھے، جیسے حسرت موہانی، سید جالب وغیرہم، انھوں نے بھی اس طریقہ کو ناپسند کیا اور روزنامہ ہمدم نے تو اعلانیہ اس سے اپنی بیزاری ظاہر کی۔ ساری شریف پبلک کے سامنے اب یہ سوال آگیا کہ مخالفت کا یہی طریقہ اگر چل نکلا تو آئندہ پبلک جلسوں کا کیا حشر ہوگا؟ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جس کسی نے بھی کرایہ پر دس بیس لفنگوں کو جمع کرلیا، وہ جس مقرر کو چاہے گا بولنے سے روک دے گا۔

......☆☆☆......

باب:41

11:1925

(دو مستقل کیمپ۔قبّی ولاقبّی)

ڈھائی ہفتہ کی مدت ہی کیا ہوتی ہے، بات کہتے گزر گئی۔8 نومبر کے لیے دوسرا جلسۂ عام قرار پایا۔ اور اب کی جلسہ کا مقام بجائے رفاہ عام کے کھلے میدان کے، ممتاز یتیم خانہ اسلامیہ (واقع باغ گونگے نواب) کی عمارت تجویز ہوئی جو باوجود لق ودق ہونے کے بہرحال ایک محدود ومقید عمارت تھی بے قید میدان نہیں۔ جلسہ کے داعیوں میں اب کی پہلے سے بھی کہیں زائد لوگ شامل ہوئے کوئی 90 آدمیوں کے دستخط اعلان پر تھے۔ ان میں وکیل، بیرسٹر، رئیس، تاجر، عالم، دکاندار، پیشہ ور اور برادریوں کے چودھری، ہر طبقہ کے نمائندے پوری طرح پر تھے۔ اوراب کی محمد علی کے ساتھ مولانا شوکت علی اور جمیعۃ العلماء دہلی کے دو مشہور مقرر عالموں کو بھی بلایا گیا۔ مولوی حاجی ظفر الملک اپنا حجرۂ اعتکاف چھوڑ کر باہر نکلے اوراب کی انتظامات گویا تمام تر ان ہی کے ہاتھ میں رہے۔ ادھر مولانا عبدالباری صاحب بھی سفر سے واپس آ چکے تھے اور فرنگی محل ہی میں مقیم تھے۔ اخباری جنگ اور تحریری جنگ بدستور بلکہ چہار چند جوش وسرگرمی کے ساتھ جاری۔ لکھنؤ کا مقامی پریس تقریباً سارے کا سارا فرنگی محل کا ہمنوا، لیکن باہر کے اخبارات زمیندار (لاہور) خلافت (بمبئی) مدینہ (بجنور) تنظیم (امرتسر) وغیرہ اکثر ہمدرد محمد علی کے ساتھ۔ ادھر

سے اگر اخباری مضامین و مقالات بکثرت نکلتے تو ادھر سے (خصوصاً فرنگی محل اور پھلواری سے) ان کے جواب میں پمفلٹ اور رسالے شائع ہوتے، ادھر خلافت کمیٹی جیسا ز بردست ادارہ موجود تھا، جو لاکھ لٹ جانے پر بھی بہت منظم تھا ادھر بھی اس کے جواب میں ایک نیا ادارہ انجمن خدام الحرمین کے نام سے عالم وجود میں آ چکا تھا، اور اس کے کارکنوں کا نیا جوش و ولولہ قدرتاً بہت بڑھا ہوا تھا۔

اصل نزاع جہاں سے شروع ہوئی تھی یعنی نجدیوں کے روضۂ مبارک پر حملہ کرنے کی روایت، کہ یہ روایت اب سب کے نزدیک ضعیف کیا باطل و موضوع ثابت ہو چکی تھی، اور یہ مسئلہ ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اب نہ اس پر بحث تھی نہ اس کا کوئی تذکرہ...... جب جذبات بھڑک اٹھتے ہیں تو لوگ اصل حقائق اور نفس مسائل کی طرف سے ایسے ہی غافل و بے پروا ہو جاتے ہیں...... بلکہ اب سارا زور اور ساری گرماگری وہابیت اور خوش عقیدگی کی باہمی اور قدیم جنگ میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف یہ اصرار کہ قبوں اور پختہ قبروں کا نام ونشان ہی دنیا میں نہ رہنا چاہیے اور جو ہمت والا یہ کر گزرا وہی مجاہد ہے، غازی ہے، سچا متبع سنت ہے اور دوسری طرف یہ غلو کہ جس نے قبوں کو ہاتھ لگایا، اس گستاخ و بے ادب کے ملعون ہونے میں کیا شک۔ وہ رسولؐ اور آلِ رسول کا کھلا ہوا دشمن اور اسلام کا مجرم و باغی ہے۔ دوڈھائی مہینہ کے اندر جس کثرت سے اشتہاروں، اعلانوں، مضمونوں، رسالوں، پمفلٹوں کا انبار اس موضوع پر فریقین کے پر جوش اہل قلم کی طرف سے لگ گیا، انھیں کوئی یکجا کرے تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائیں......اور جب ہر فریق کے جذبات اس حد تک مشتعل ہو جائیں اور ہر گروہ ان ہی بحثوں کو دین کا بنیادی مسئلہ بنا لے، تو ظاہر ہے کہ فریق مخالف اور اس کے پیشواؤں اور سرداروں کے لیے کسی نرمی و رواداری کی گنجائش اس کے قلب میں کہاں نکل سکتی ہے۔

....

گویا ''مقلد'' و ''غیر مقلد'' کے وزن پر اب مسلم ہندوستان ''قبی'' و ''لاقبی'' کے دو مخالف کیمپوں میں بٹ چکا تھا۔ قبہ شکنی اور قبہ نوازی کے اس ہنگامہ و غلغلہ میں ادھر ادھر ڈگمگائے بغیر جادۂ مستقیم پر گنتی کے جن چند لوگوں کے قدم ثابت و استوار رہے، ان کے سردار و پیشوا محمد علی

تھے۔ محمد علی اس ''حرب عقائد'' سے بے تعلق وماورا اس سارے قضیہ کو اس سے کہیں بلند تر زاویۂ نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سلطان ابن سعود کے دوست، ہمدرد وہوا خواہ اس وقت بیشک تھے مگر صرف اس بنا پر کہ ان کے خیالوں میں اب سلطان کے ذریعہ سے جزیرۃ العرب اغیار کے خطرہ ودستبرد سے محفوظ ہو رہا تھا اور اب ارض حرم میں صحیح و آزاد 'اسلامی'' یعنی عالم اسلام کی مشترک حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ قبے رہیں یا گریں، بہرحال محمد علی کی نظر میں سلطان نجد کی حیثیت ارض حرم کو شریفی مظالم سے نجات دلانے والے محسن کی تھی۔ اور امید یہ تھی ارض حجاز پر کسی ایک نسل یا خاندان کو موروثی ملوکیت کے بجائے اسلامی جمہوریت قائم ہوگی۔ محمد علی کو جزویات کلامیہ وفقیہ میں پڑنے کی فرصت کہاں تھی۔ ان کے پیش نظر تو اتنا عظیم الشان کام تھا کہ جس کی نظیر ہی خلفائے راشدین کے بعد کہیں نہیں ملتی۔ وہ محض ان ہی توقعات اور امیدوں کے سہارے سلطان کے ہمدرد وحامی تھے اور باوجود ذاتی طور پر قبہ نوازی کی جانب میلان رکھنے کے قبہ نوازوں کی اس ہنگامہ آرائی کو اپنے مقاصد عالی کے حق میں سخت مضر سمجھ رہے تھے۔ اور دل سے چاہ رہے تھے کہ کسی طرح ہندوستان میں یہ شور فرو ہو اور سلطان کی بجائے مخالفت ومزاحمت کے ہندوستان سے تائید وامداد حاصل ہو......ان باریکیوں اور بلند خیالیوں تک نظر کس کی پہنچی؟ نتیجہ قدرتاً یہ نکلا کہ ادھر ہندوستان کے سارے قبہ شکن خوش ہوئے کہ محمد علی جیسی زبردست شخصیت کی تائید ہاتھ آ گئی۔ ادھر ملک بھر کے قبہ نواز اسی درجہ میں ناخوش وناراض بھی کہ راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ، راستہ کا سب سے بھاری پتھر یہی محمد علی کی ذات ہے۔ اگر اسے گرا دیا گیا تو بس بیڑا پار ہے۔ ان چند ہفتوں کے اندر جتنے کارٹون محمد علی کے نکل گئے، جتنی ہجویہ نظمیں ان کے متعلق چھپیں، جتنی گالیاں اور کوسنے ان پر پڑے، ان کے سہنے اور برداشت کرنے کے لیے بھی محمد علی ہی کا جگر درکار تھا۔

....

مثنوی کے شروع ہی میں ایک شعر ہے ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من   وز درون من نجست اسرار من

اب اس کا مصداق ہندوستان کے طول وعرض میں محمد علی سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ دوست

دشمن دونوں کا منطقی استدلال یہ تھا کہ:

سلطان ابن سعود وہابی اور قبہ شکن ہیں۔

محمد علی سلطان کے دوست و ہمدرد ہیں۔

اس لیے محمد علی بھی وہابی اور قبہ شکن ہیں۔

تحریک خارجیت نے جو ایک طرح کی ''انارکزم'' (لاحکومتی) کے مرادف ہے، جب خلافت کے دور رابع میں جنم لینا شروع کیا تو اتفاق سے مسند خلافت پر حضرت علیؓ فائز تھے، اور اس لیے خارجیت درحقیقت ہر بشری حکومت کے خلاف ایک بغاوت تھی اور اپنی نافہمی سے قرآن کو ہر انسانی حکومت کا مطلق صورت میں مخالف سمجھ رہی تھی، اس کی بغاوت کا رخ قدرتاً اس وقت امیرالمومنین حضرت علیؓ کی جانب ہوگیا۔ اس سے لوگوں میں یہ خیال چل پڑا کہ خارجیت کوئی تحریک شیعیت کے مقابل اور بالذات حضرت علیؓ کی مخالفت میں تھی۔ اور عوام تو عوام خواص تک اب تک اس خیال میں پڑے ہوئے ہیں کہ خارجیت اور شیعیت ہم سطح تحریکیں، ایک دوسرے کے مقابل، اور ذات علیؓ کی مطلق دشمنی اور مطلق دوستی کے مرادف ہیں!

'' کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا!

اس وقت خلیفہ اگر اتفاق سے بجائے حضرت علیؓ کے حضرت عمرؓ یا حضرت ابوبکرؓ ہوتے تو خارجی یقیناً ان کے بھی اسی درجہ میں دشمن ہوتے اس لیے کہ انھیں اپنے اصول وعقائد کے لحاظ سے مخالفت ان میں سے کسی کی متعین شخصیت سے نہیں بلکہ نفس امارت وامامت وحاکیت انسانی سے تھی، خواہ وہ حکمران ان کے سامنے زید، عمر، بکر، کوئی بھی انسان ہوتا..... ٹھیک اسی حال میں اس وقت محمد علی تھے۔ وہ ہر اس مسلمان کے حامی وہمدرد ہوجاتے (بغیر اس کے جزویات عقائد کے اندر گھسے ہوئے) جو ارض حجاز کو غیر مسلم اور فرنگی اثرات سے آزاد کرتا، خواہ وہ مسلمان ''مقلد'' ہوتا یا ''غیر مقلد'' خارجی ہوتا یا شیعی، زیدی، ہوتا یا حنبلی ''وہابی'' ہوتا یا ''بدعتی''۔ یہی بات انھوں نے سلطان ابن سعود میں پائی تھی اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ سلطان حنبلی تھے، قبہ شکن تھے، ابن عبدالوہاب کے ہم مشرب تھے۔ محمد علی کو ان کی حنبلیت، وہابیت، قبہ شکنی، ان چیزوں سے کیا غرض اور کیا بحث تھی۔

باب:42

12:1925

(حب علیؓ کم، معاویہؓ زیادہ)

فرنگی محل کے دور متاخرین میں ایک جامع شریعت وطریقت، عالم باعمل وسالک بے بدل مولانا ابوالحیا محمد نعیم (التوفی 1912) قدس اللہ سرہ گزرے ہیں۔ ان کے ایک مسترشد روایت کرتے تھے کہ حضرت نے جب میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو فرمایا کہ میاں اگر حق تعالیٰ نے اپنے فضل ورحمت سے میری مغفرت کردی تو وعدہ کرتا ہوں کہ اس وقت تمھیں یاد رکھوں گا۔ اب تم بھی اسی طرح کا اقرار مجھ سے کرو کہ حق تعالیٰ کے ہاں اگر تمھیں مقبول ثابت ہوئے تو تم بھی مجھ کو بھول نہ جاؤ گے۔ معاہدۂ بیعت تو طرفین سے ہوتا ہے۔ پیر ومرید دونوں میں سے جس کسی کا نصیب یاوری کر جائے وہ دوسرے کو اپنے ساتھ گھسیٹے"۔ پیر ومرید کے سلسلہ میں عام عقیدہ دلوں میں جما ہوا یہ ہے کہ حقوق سارے کے سارے مرشد ہی کو حاصل رہتے ہیں اور فرائض کا بار سارے کا سارا مرید کے ذمہ رہتا ہے۔ مولانا کے ارشاد نے اس کے برعکس یہ حقیقت واضح کردی کہ کچھ حقوق مرید کے بھی ہوتے ہیں اور دونوں پر ایک دوسرے کی ہواخواہی واجب ہوتی ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ کا فضل وکمال کسی تعارف کا محتاج نہیں اپنے مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے عاشق زار بھی تھے۔ مرشد نے مکہ معظمہ سے اپنی تازہ تصنیف "فیصلہ ہفت

مسئلہ'' کے دوسو نسخے ان کے پاس گنگوہ روانہ فرمائے۔ مولانا نے بجائے اس کے کہ مرشد کی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور سر اور آنکھوں پر جگہ دیتے۔ تعظیم وتکریم یہ کی کہ انھیں ہاتھ تک نہ لگایا بلکہ ایک روایت تو یہاں تک ہے کہ ان سے حمام گرم کرایا! یہ اس لیے کہ مولانا کی رائے میں حضرت حاجی صاحب کی تحقیق ان مسائل میں صحیح نہ تھی، اور رسالہ کی اشاعت مصالح امت کے حق میں مضر تھی۔ مرشد اور مرید کے تعلقات اس واقعہ کے بعد بھی ایک طرف سے شفقت وکرم کے اور دوسری طرف سے والہانہ عقیدت کے بدستور قائم رہے۔

ماضی قریب کے دو مسلم الثبوت بزرگوں کی حکایتوں سے نتیجہ یہ نکلا کہ عوام افراط عقیدت اور غلوئے خوش عقیدگی میں جو کچھ بھی سمجھتے رہیں، محققین نے مرید کا بھی ضمیر ایک زندہ ضمیر تسلیم کیا ہے، اور مرشد کے وجود میں ضم ہوئے بغیر بھی، اس کی مقبولیت کا امکان تو بہر حال مانا ہے...... اور پھر عین دور حاضر میں حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ نے جس جس طرح مرشد کے مطاع ومقتدا ہونے پر قیدیں لگائی ہیں، اور اس کی اطاعت وتقلید کو واجب جن جن حدود کے اندر رکھا ہے، اس کا تعلق تو صرف ان کے رسائل ومقالات کے دیکھنے سے ہے۔

....

محمد علی کے دامن پر خوش عقیدہ گروہ کی طرف سے ایک بہت بڑا داغ مرشد کی مخالفت کا عائد کیا جاتا ہے۔ اور اچھوں اچھوں کی زبان پر یہ فقرہ آ جاتا ہے کہ ''وہ کچھ بھی سہی، شیخ کی مخالفت آئین طریقت میں کفر سے کم نہیں''۔ حالانکہ یہ اختلاف جو کچھ بھی تھا، سلوک وطریقت کے کسی باطنی معاملہ میں تو کیا، شریعت ظاہری کے بھی کسی مسئلہ میں نہ تھا۔ اور تصادم افکار کا تعلق عقائد سے ذرہ بھر بھی نہ تھا۔ **محمد علی** کا کہنا یہ تھا کہ سیاسیات حجاز بلکہ سیاسیات عالم اسلامی کے سمجھنے میں اس وقت مولانا عبدالباری صاحب کو شدید غلط فہمی ہو رہی ہے۔ وہ غلط اطلاعات پر اعتماد کر کے سلطان کو مآثر مسلمین کا دشمن سمجھ بیٹھے ہیں اور اس لیے اس کی مخالفت پر تل گئے ہیں۔ حالانکہ سلطان ایک مبشر ہے، حجاز کی ملکیت سے اور فرنگی اثرات سے نجات دلانے والا ہے، جمہوریت وشورائیت کی بنیاد قائم کر کے خلافت راشدہ کی روح کو تازہ کرنے والا ہے...... ان کی سیتاپور والی تقریر کا اقتباس ابھی چند صفحے اوپر درج ہو چکا ہے کہ جب کسی

نے دوران تقریر میں سوال کر دیا کہ آپ تو ہمیں ابن سعود کی طرف بلا رہے ہیں، اور آپ کے شیخ ابن سعود کو نکلوا رہے ہیں۔ مرشد و مرید میں یہ مخالفت کیسی؟ تو محمد علی نے برجستہ جواب دیا:

''یہ مخالفت نہیں ہے۔ رائے وبصیرت کا اختلاف ہے۔ جن معاملات میں مجھے ہدایت ورہنمائی کی ضرورت تھی وہ میری دستگیری کر رہے ہیں۔ جس مسئلہ میں خود انھیں صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے، میرا فرض ہے کہ میں ان کی اعانت کروں''۔

بات بالکل صاف وواضح تھی۔ لیکن دنیا اتنی نیک، دمصلح جو، معقولیت پسند کب رہی ہے؟ یہاں تو لوگوں کو مزہ لڑائی کا تماشہ دیکھنے میں ہمیشہ آیا ہے۔ جب امیر المومنین علی مرتضیٰؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے درمیان لگائی بجھائی کرنے والوں، نفاق ڈلوانے والوں کی کمی نہ تھی، تو چودھویں صدی کے محمد علی اور ان کے مرشد کس شمار وقطار میں تھے......ادھر ہر وقت یہ کہہ کہہ کر ابھارا جاتا، اکسایا جاتا رہتا تھا کہ ''دیکھیے یہ آپ کے مرید ہیں۔ مرید ہو کر شیخ سے یہ بغاوت، گستاخی، نافرمانی۔ ان کی مریدی باقی کب رہی؟ مریدی سے ان کے عاق ہونے کا اعلان کیجیے۔ ایسے بے ادب وہابی نیچری کو اپنے حلقہ میں رکھنے سے نتیجہ کیا؟ اور ادھر بار بار یہ صلاحیں اور یہ کمیٹیاں ہوتی رہتی تھیں کہ جو کچھ بھی ہو جائے، اب محمد علی کو مولوی عبدالباری سے ہرگز ملنے اور ایک نہ ہونے دیا جائے۔ اور یہ ڈائری نویس چونکہ محمد علی کے ہاں کا خاص مقرب اور منہ لگا سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کے اوپر دباؤ خاص طور سے اس کے لیے پڑتے رہتے تھے اور یہ دباؤ ڈالنے والے ہوتے کون تھے؟ کوئی باہر کے اور بیگانے نہیں، آپس ہی کے اسی جوار اور اپنی برادری ہی کے لوگ جو کسی نہ کسی وجہ سے مولانائے فرنگی محلی سے ملال رکھتے تھے...... ہر کینہ اور بغض کے نکالنے کا یہ موقع ''خداداد'' ہاتھ آ گیا تھا۔

....

ہمیشہ کے بیگانے اور اجنبی جنھیں نہ محمد علی کی ذات سے کبھی عقیدت رہی نہ ان کے اخبارات یا تحریکات سے کوئی دلچسپی یا تعلق رہا، اس وقت جسم پر ہمدردی کا لبادہ پہن اور چہرہ پر عقیدت کا نقاب ڈال، محمد علی کے پاس آتے اور بے تکلفی کی جرأت کے ساتھ جھٹ سے سوال کر بیٹھتے کہ ''یہ فرمایئے اب فسخ بیعت کا اعلان کب ہوگا؟ ہم تو اس دن کے منتظر ہیں۔ ہم لوگ اس ذلت کو اب

مزید برداشت نہیں کر سکتے''......ملیح آباد کے ایک جواں عمر اجنبی نے ، چودھری خلیق الزماں کے مکان پر آ کر محمد علی کو ایک کمرہ میں تنہا پا کر اور مجھے اپنا ہمدرد گمان کر کے میرے سامنے جھٹ سے یہ سوال کر دیا۔ محمد علی نے بالکل روکھے ہو کر جواب دیا:

''یہ معاملہ بالکل میری ذات کا ہے۔ آپ کو کسی قومی معاملہ پر گفتگو کرنا ہو تو کیجیے''۔ ادھر اگر محمد علی پر جی کھول کر تبصرے ہو رہے تھے، آوازے کسے جا رہے تھے، کارٹون بن رہے تھے، ہجویں کہیں جا رہی تھیں تو ادھر ''سعودی'' پریس میں بھی مولانائے فرنگی محل کی بھی توہین و تضحیک کا کوئی دقیقہ اٹھ نہیں رہا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے ایک عزیز قریب نے جو کسی خانگی رنجش کی بنا پر مولانا سے سخت بیزار تھے، پارٹی کے مشورہ سے (اور اس مشورہ پر آج بہ صد حسرت و ندامت اعتراف ہے کہ آخری صاد کرنے والا یہ ڈائری نویس ہی تھا، مولانائے فرنگی محلی کی روح کو معاف فرمائے) فرنگی محل کا ''کچا چٹھا'' ایک لمبے چوڑے اشتہار کی صورت میں چھاپ کر تقسیم کرنا شروع کر دیا...... یہ چٹھا ''سچا'' خدا جانے کس حد تک تھا، لیکن ''کچا'' تھا۔

ان ذاتی قصوں اور فضیحتوں سے بلند اور مستثنیٰ صرف ایک ذات تھی اور وہ خود محمد علی کی تھی۔ اپنی ''پارٹی'' کے جوش و خروش کو ہمیشہ ٹھنڈا کرتے رہتے اور ہمدرد پر اس باب میں جتنی کڑی نظر رکھتے اس کا تذکرہ ابھی چار نمبر قبل آ چکا ہے۔

......☆☆☆......

باب:43

13:1925

(خطرناک جلسہ)

8 نومبر اتوار کا دن تھا کہ محمد علی دس بجے دن کو وارد لکھنؤ ہوئے۔ میں حسب معمول محمد علی کی پیشوائی کے لیے دو ایک روز قبل دریاباد سے چل کر لکھنؤ آ گیا تھا، بلکہ محمد علی کو لینے ٹرین سے سندیلہ اسٹیشن تک چلا بھی گیا تھا۔ اتفاق کہ محمد علی بجائے ادھر سے آنے کے، کانپور کی طرف سے آئے۔ بہر حال اسٹیشن سے موٹر پر ان کے ساتھ رہا۔ اسی ٹرین سے جمعیۃ العلما کے بھیجے ہوئے مولانا عبد الحلیم صدیقی اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی اترے۔ مولانا شوکت علی صاحب عارف صاحب کے ساتھ بمبئی کی طرف سے دو گھنٹہ قبل وارد ہو چکے تھے۔ فرنگی محل کے مقابلہ کا اصل مورچہ (یا ہیڈ کوارٹرز) چودھری خلیق الزماں کے مکان پر تھا۔ اب کی بھی علی برادران وہیں اترے۔ جذبات کا ہیجان اتنے زور پر تھا کہ ابھی کل تک جو مخلص دوست، رفیق کار و شریک عمل تھے وہ آج ایک دوسرے کی صورت سے بیزار، بلکہ ایک دوسرے کی عزت و آبرو کے خواہاں تھے۔ یہ دو ڈھائی ہفتہ کا وقفہ جو ملا تھا، یہ

صلح تھی اک مہلت سامان جنگ

اس میں جذبات دھیمے پڑنے کے بجائے اور بھڑک چکے تھے اور نفرت و عداوت کے شعلے

بلند سے بلند تر ہو چکے تھے۔ ادھر یہ ٹھن چکی تھی کہ (بہ زبان مولوی ظفر الملک) جو کچھ بھی ہو فرنگی محل
کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہنا ہے۔ ادھر یہ ضد سما گئی تھی کہ (ایک جوشیلے فرنگی محلی کی زبان میں)
دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے "یہ شہر کے نوے وہابیوں" کا طلب کیا ہوا جلسہ کامیاب نہ ہونے پائے گا۔
داعیان جلسہ نے پچھلے جلسہ کی ناکامی سے ہوشیار ہو کر اب کی ہر طرح کی خوب مضبوطیاں کر لی تھیں
اور سب کے سرخیل اور نگران اعلیٰ مولوی ظفر الملک علوی تھے...... مخالفین جلسہ کی ریشہ دوانیوں کا نمبر
ان سے بھی بڑھا ہوا رہا اور سب جانتے ہیں کہ کسی جلسہ میں نظم قائم رکھنے کے مقابلہ میں اس میں
بدنظمی، برہمی وہلڑ پیدا کر دینا کتنا آسان ہوتا ہے۔

لکھنؤ پہنچتے ہی یہ سننے میں آیا تھا کہ تخریبیے اب کی پچھلے جلسہ کی طرح صرف حلق وحنجرہ اور
آواز ہی کی قوت سے نہیں بلکہ ہاتھ پیر، لاٹھی اور ڈنڈے کی بھی قوت سے پوری طرح کام لیں
گے اور جنھوں نے حجاز میں قبے توڑے، ان کے ہمدردوں کے سروں اور کھوپڑیوں کے قبے لکھنؤ
میں توڑ کر اپنے دست وبازو کی رستمی کا ثبوت دیں گے۔ یہ خبر بھی کان میں پڑی کہ سلیم پور اور
اکبر پور کے شیعہ تعلقہ داروں (راجہ احمد علی خان اور راجہ نواب علی خان) کے ساتھ اب کی گدیہ کے
سنی تعلقہ دار (شیخ مشیر حسین قدوائی) کا بھی ساز ہو گیا ہے اور اسی اتحاد ثلاثہ نے جلسہ کو درہم برہم
کرنے کا دیہات سے اپنی رعایا کو طلب فرمایا ہے۔

....

بعض خبریں ان سے بھی بڑھ چڑھ کر وحشت ناک سنیں۔ دل نہ اس وقت ان کے یقین
کرنے پر آمادہ تھا اور نہ اس وقت ان کے بیان کرنے پر۔ موٹر پر جب محمد علی کے ساتھ بیٹھا تو اسٹیشن
سے مکان تک یہ مفصل رپورٹ ان کے گوش گزار کر دی۔ لیکن اللہ رے ظرف! ہراس واندیشہ پیدا
ہونا کیا معنی، اطمینان قلب کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ یہاں بیان کرتے دل ہولا جاتا ہے، وہاں
خود اپنے کو خطرہ کی زد میں سن کر ذرا بھی تغیر نہ ہوا! موٹر کے رکتے رکتے میں نے آخری اپیل التجا کے
لہجہ میں کی "مولانا! آج آپ کے جوش کا نہیں، آپ کے تدبر کا امتحان ہے۔ تقریر جوشیلی نہیں،
حکیمانہ، مدبرانہ ہو"۔ جواب میں محمد علی صرف مسکرا دیے جیسے یہ کہہ رہے ہوں کہ "ایاز قدر خود
بشناس۔ لقمان کو حکمت سکھانے چلے ہو"...... سچ ہے اللہ جسے بڑا بناتا ہے اس کا ظرف، تحمل، حوصلہ

بھی بہت بڑا کردیتا ہے۔

فرنگی محل حاضری کی وضعداری میں اب کی بھی محمد علی نے فرق نہ آنے دیا۔ پچھلی بار جب ان کے شیخ موجود نہ تھے، جب تو انھوں نے معمول میں ناغہ ہونے نہیں دیا، تو اب کی تو شیخ موجود تھے۔ اب کی کیسے نہ جاتے۔ اب کی میں بھی ہمراہ نہیں گیا اور میرے سوا کوئی اور تو جاسکتا ہی نہ تھا۔ بالکل تنہا گئے اور ملاقات تخلیہ کی رہی۔ محمد علی تو رقیق القلب تھے ہی، ان کے مرشد بھی رونے رلانے میں کچھ کم نہ تھے جذبات سے بہت جلد متاثر بلکہ مغلوب ہوجاتے۔ بچھڑے ہوئے مرید کو ایک بار پھر اپنے آستانہ پر دیکھ، گلے سے لپٹ گئے اور لپٹ کر رونے لگے۔ ایک صاحب نے مشہور یہ کردیا کہ دونوں مل کر خوب روئے۔ محمد علی نے مجھ سے اس کی پرزور تردید کی اور تصریح کے ساتھ کہا کہ ''اس وقت تو وہی روتے تھے میرے ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا''۔

....

آج کا دن لرزہ خیز افواہوں اور رعشہ انگیز دھمکیوں کا دن تھا، افواہیں طرح طرح کی سننے میں آرہی تھیں۔ مار پیٹ کی افواہیں اور دھمکیاں یہ مل رہی تھیں کہ آج شہر کے ''وہابیوں'' اور ''سعودیوں'' کی خیر نہیں۔ ملیح آباد کے جنگ آزما و پرجوش خطہ کے کچھ جوان چودھری صاحب اور ظفر الملک صاحب کی کمان میں ہیں، ان سے مقابلہ کے لیے دیہات سے لٹھ بند سپاہی بلوائے گئے ہیں اور اودھ کے تعلقہ داروں نے اپنی اپنی رعایا کی فوج بھرتی کر بلائی ہے...... ممکن ہے اور ممکن کیسا اب کہتا ہوں کہ یقیناً ایسی ہی خبریں ہم لوگوں کو تیاریوں سے متعلق ادھر بھی پہنچ رہی ہوں گی لیکن میرے علم میں تو بہر حال اسی فریق کی جارحانہ اور سفا کانہ تیاریوں کی خبریں آتی رہیں۔

مولوی عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم ہماری جماعت میں بڑے نیک اور معصوم صفت جوان صالح تھے۔ ان بیچارے نے روزہ رکھ لیا کہ اگر نوبت شہادت کی آگئی تو حالتِ صوم میں شہید ہونے کا اجر مزید ہے۔ جلسہ کا وقت بعد عصر تھا۔ میں بعد ظہر اپنے ہاں سے کھانا کھا کر خلیق صاحب کے ہاں آگیا۔ خوب یاد ہے کہ کھانا کھاتا جاتا تھا اور خیال کرتا جاتا تھا کہ کیا عجب جو یہ زندگی کا آخری کھانا ہو...... روایتیں ایسی ہی ہولناک کان میں پڑ چکی تھیں...... جلسہ اور جلسہ گاہ دونوں کے انچارج مولوی ظفر الملک صاحب تھے۔ انھوں نے از راہ احتیاط اپنے فریق میں منادی کرادی تھی کہ

کوئی شخص لاٹھی لے کر جلسہ میں میں نہ آئے کہ اس سے خواہ مخواہ دوسرے فریق کو اشتعال ہوگا۔ مگر مخالفین کا بیان ہے کہ لاٹھیوں کی ایک تعداد پہلے ہی سے جلسہ میں چھپا کر جمع کر لی گئی تھی۔ واللہ اعلم۔ بہرحال دو پہر ہی سے نہتوں اور لٹھ بندوں دونوں کا جماؤ شروع ہو گیا۔ جلسہ گاہ کا دروازہ ابھی بند ہی تھا اور جلسہ کے داعیوں اور منتظموں سے اکا دکا ہی کوئی پہنچا ہوگا کہ مخالفین نے باہر سے گویا پورا محاصرہ کر لیا اور جابجا اپنے مورچے قائم کر لیے...... سر پھٹول کی یہ تیاریاں مسلمان کی مسلمان کے مقابلہ میں ہو رہی تھیں۔

خلیق صاحب کے ہاں خبریں منٹ منٹ پر پہنچ رہی تھیں۔ میں خود تو گھبرا گیا اور میری ہی طرح کے دوسرے کمزور دل و ہمت والے بھی۔ لیکن علی برادران اور ان کے میزبان خلیق صاحب کے نہ چہرہ پر شکن نہ کسی انداز و گفتار میں کوئی خوف و ہراس۔ بلکہ خلیق صاحب نے تو ایک مرتبہ جوش میں آ کر اپنے ایک ملیح آبادی لیفٹیننٹ کو بزن بول دینے کا حکم بھی دے دیا۔ محمد علی بیٹھے ہوئے بہ اطمینان باتیں کر رہے ہیں اور اس کے منتظر کہ کسی طرح جلسہ کا وقت آئے اور جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوں۔

......☆☆☆......

باب:44

14:1925

(عثمانؓ، علیؓ کے نقش قدم پر)

وقت خدا خدا کر کے آیا۔ جلسہ گاہ کی عمارت، ممتاز دار الیتامیٰ کچھ ایسی دور نہ تھی۔ چار فرلانگ کے فاصلہ پر تھی۔ علی برادران سواری پر روانہ کیے گئے۔ اور پیچھے پیچھے ہم لوگ، یعنی جمعیتی مولوی صاحبان چودھری خلیق الزماں اور یہ ڈائری نویس، دوسرے راستہ سے جلسہ گاہ پہنچے تو ایک عجیب ہی منظر دیکھنے میں آیا کانوں جو خبریں سنی تھیں وہ تو عجیب تھیں ہی، آنکھوں سے جو باتیں دیکھنے میں آئیں وہ عجیب تر نکلیں۔ دیہات کے نیچ ذات کے ہندو، پاسی وغیرہ کی قسم کے، سینہ پر نئی اور نوخیز انجمن خدام الحرمین کا بلا، خادم الحرمین لگائے ہوئے اور ان کا ایک جم غفیر لاٹھیاں لیے ہوئے جلسہ گاہ کے اردگرد گھیرا ڈالے ہوئے ہے......ایسے عجیب وغریب خادم الحرمین ہم نے آپ نے کیا معنی چشم پیر فلک نے بھی کبھی کیوں دیکھے ہوں گے!......اور ان ہی کے درمیان جا بجا حلقۂ فرنگی محل کے متوسلین چھٹکے ہوئے۔ یہیں ایک خالص فرنگی محلی صاحب کو دیکھا، چلا چلا کر وعظ فرما رہے ہیں کہ یہ مردود وہابی گستاخ و بے ادب ہیں، روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں۔ ہمارے شاہ مینا صاحبؒ کا مزار کھود ڈالنے کی فکر میں ہیں، وقس علیٰ ہذا۔ کیسی تحقیق شرعی اور اور کہاں کا استدلال عقلی، پروپیگنڈا اور صرف پروپیگنڈا۔ شاہ مینا صاحبؒ کا مزار لکھنؤ کے بچہ بچہ کی آنکھ میں

سرمۂ عقیدت بنا ہوا تھا۔ اس کا نام بڑے موقع سے لایا گیا۔ یہ صاحب اس نیاز مند کے خاص الخاص کرم فرما تھے۔ نظر سے نظر ملی، علیک سلیک ہوئی، دل نے محسوس کیا کہ ادھر نگاہیں جھکی ہوئی ہیں، اٹھ نہیں رہیں ہیں۔

پھاٹک پر ایک غل، ہنگامہ، شور، پکار، ہڑبونگ اور چپقلش۔ ہر شخص دوسرے پر پلا پڑتا ہے دروازہ میں میں ہی سب سے پہلے داخل ہو جاؤں۔ دروازہ کے تنگ زینہ پر ہجوم کا وہ ریلا کہ دبلا پتلا آدمی تو اب کچلا! علی برادران سواری پر تھے، چند سنٹ قبل پہنچ چکے تھے۔ ان کا داخلہ دیکھنے میں آیا نہیں کہ کس شان سے ہوا۔ سننے میں یہ آیا کہ لٹھ بند ''خدام الحرمین'' انھیں دیکھ کر خود ہی ان کی شوکت و وجاہت سے مرعوب ہو گئے اور بجائے روک ٹوک کے، بے اختیار ''محمد علی، شوکت علی کی جے'' پکارنے لگے! اپنی آنکھوں دیکھی بات یہ ہے کہ خلیق صاحب کے لیے بھیڑ خود بخود چھٹتی گئی اور راستہ خود نکلتا آیا۔ اس سے قیاس یہی ہوتا ہے کہ علی برادران ان کا استقبال ان کی شان کے شایان ہی ہوا ہوگا۔ میں جب داخل ہونے لگا تو دیکھا کہ اپنی جماعت کے ایک صاحب وہاں پر کھڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے معاً مجھے ہاتھ سے کھینچ کر اندر لے لیا!...... یہ تحقیق کبھی نہ ہو سکی کہ گنوار دیہاتیوں بلکہ پاسیوں تک کو خدام الحرمین بنا ڈالنے کی اپچ میں آیا مولانا فرنگی محلی کی اجازت بھی شریک تھی یا یوں ہی بالا بالا یار لوگوں نے یہ کارروائی کر ڈالی تھی۔ کم از کم اس نیاز مند کو تو مولانا کے ساتھ یہ سوءظن قائم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اور محمد علی کو تو یقین تھا کہ مولانا ہرگز اسے روا نہیں رکھ سکتے تھے۔

....

تاریخوں میں جب یہ پڑھا تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مروان اور فلاں فلاں جعلی کارروائیاں حضرت کے نام سے کر گزرے اور لوگوں نے انتقام حضرت سے لیا یا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے وقت مالک اشتر اور فلاں فلاں افراد ہوا خواہی میں خود خلیفہ کی نافرمانی کر بیٹھے، اور بار بار حدود سے باہر نکل نکل گئے۔ تو وہ لوگ کچھ بہت عجیب سے معلوم ہوتے اور یہ باتیں دل میں پوری طرح اترتی بھی نہ تھیں۔ قدرت نے اس موقع پر ان تاریخی اور نفسیاتی حقائق کا ایک چھوٹے سے پیمانہ پر مشاہدہ کرا دیا اور عملاً یہ سبق دے دیا کہ نفرت بشری کے تلونات

ہر دور ہر عصر میں اپنے اپنے ظرف و ماحول کے ماتحت یکساں ہی رہے ہیں۔ عجب عجب کارردائیاں ادھر سے بھی ہوتی رہتیں اور ادھر سے بھی۔ مقصد تمام تر یہ ہوتا کہ اشتعال برابر بڑھتا رہے اور اختلاف کی آگ کسی طرح بجھنے نہ پائے۔ اپنے فریق کی کارگزاریوں کا علم ذرا تفصیلی ہے اور چشم دید۔ فریق ثانی کی حرکتوں کا علم اجمالی ہے اور وہ بھی زیادہ تر سماعی..... بس گنتی کے چند افراد ایسے تھے جو شخصیتوں اور پارٹیوں سے نظر قطع کیے ہوئے محض اصول کی خاطر، اخلاص کے ساتھ محمد علی کے جھنڈے کے نیچے تھے۔ اوران چند میں ایک ممتاز اور اپنے کو گمنام و بے نشان رکھنے کی کوشش کے باوجود ممتاز ہستی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مرید و مسترشد و مرد جواں مرگ جوان صالح مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی کی تھی۔

باہر کے بے دردوں کو کیا خبر کہ محمد علی کے دل وجگر پر اس وقت کیا گزر رہی تھی۔ پیرومرشد سے جنگ، اور پھر کیسا مرشد جس کے ساتھ روحانی تعلقات کے پہلو بہ پہلو، محبت کے، دوستی کے سالہاسال کی رفاقت وشرکت عمل کے، بھائی چارہ کے مادی تعلقات بھی گہرے اور شدید تھے! جنگ آسان نہ تھی۔ محمد علی جیسے شیر دل کے لیے بھی آسان نہ تھی۔ خدا معلوم کس کس طرح دل میں گھٹ گھٹ کر رہتے ہوں گے۔ پچھلے جلسہ کے موقع پر جو (اکتوبر میں رفاہ عام میں ہوا تھا اور ناکام ونا تمام رہا تھا) تو خیر مولانائے فرنگی محلی لکھنؤ سے باہر ہزار ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلہ پر تھے، اور محمد علی کے پاس اپنا دل سمجھانے کے لیے یہ عذر کافی تھا لیکن اب کی تو بات یوں بھی نہیں بن رہی تھی آج تو مولانا بہ نفس نفیس موجود تھے۔ آج ان ہی کے شہر میں ان ہی کے مریدوں کی سپہ سالاری میں عین ان ہی کی انجمن (خدام الحرمین کے صدر مولانا ہی تھے) کی طرف سے یہ استقبال محمد علی کا ہو رہا تھا!..... محمد علی یہ حیرت انگیز تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلاتے؟ سنی کو ان سنی بارہا کر چکے تھے، اب دیکھی کو ان دیکھی کیسے بنا لیتے؟

....

1919 کا ذکر ہے، جب علی برادران قید فرنگ میں تھے کہ دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کا ریلا زور وشور سے آیا۔ ہندو مسلمان دونوں ایک ہی میدان میں سنگینوں اور گولیوں کا نشانہ بنائے جا چکے تھے۔ اسی ہیجان اتحاد کے وقت جامع مسجد میں ایک جلسہ ہوا اس میں آریہ سماجیوں کے مشہور لیڈر

سوامی شردھانند نے مسجد کے منبر پر کھڑے ہوکر تقریر کی۔ جلسہ کے بعد باہر کے مسلمانوں نے لے دے شروع کی کہ مسجد کے اندر ہندو کیسے گھسا اور گھسا تو خیر گھسا، مسجد کے منبر پر بھی چڑھ گیا؟ اس اعتراض میں پیش پیش فرنگی محل تھا۔ ہمدم مرحوم کی پرانی فائلیں اس کی گواہی دیں گی۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ 1925 میں بھی فرنگی محل، نیچ ہندوؤں اور پاسیوں کو کھلے خزانے، ہانکے پکارے ''خادم الحرمین'' بنا رہا یا بتا رہا تھا! گویا 19 میں اگر اونچی ذات کے معزز ہندو بھی مسلمانوں کی اجازت کے بعد مسجد میں داخل ہونے کے قابل نہ تھے تو 25 میں نیچی ذات کے ادنیٰ ہندو، مکہ و مدینہ کی خدمت کے قابل ہو گئے تھے......ضد اور غصہ میں انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے!

بہر حال ان ہی لاٹھیوں اور لٹھ بندوں کو چیرتے اور ان کے درمیان گھستے چلتے، ہم لوگ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ مولانائے فرنگی محلی خود تشریف فرما نہ تھے، باقی ان کے خاندان کے دوسرے ذمہ دار حضرات نیز ان کی پارٹی کے اکابر سب موجود۔ مجمع موافقین ومخالفین کو ملا کر عظیم الشان۔ علی برادران ڈائس پر جا کر بیٹھ گئے تو مولوی ظفر الملک صاحب نے بحیثیت داعی جلسہ پکار کر کہا کہ ''ہم لوگ جلسہ کرنے کو تیار ہیں اور میں داعیان جلسہ کی طرف سے حفظ امن کا ذمہ لیتا ہوں۔ اب فریق مخالف کے لیڈر مولانا حسرت موہانی اور شیخ مشیر حسین قدوائی سامنے آ کر اسی طرح کا وعدہ کریں اور اعلان کریں کہ ''ان کے فریق کی طرف سے نقض امن نہ ہوگا'' دونوں صاحب اس پر صاف نکل گئے اور یہ عجیب قسم کا احساس ذمہ داری تھا لگے کہنے کہ ''ہم کوئی ذمہ داری نہیں لیتے''۔ مولوی ظفر الملک نے جب یہ قبول کرالیا تو پھر پکار کر کہا کہ ''دیکھ لیجئے، ایک فریق فساد پر آمادہ ہوکر آیا ہے اور اس کے لیڈر قیام امن کی طرف سے کانوں پر ہاتھ دھر رہے ہیں تو اب میں اعلان کرتا ہوں کہ جلسہ ملتوی کیا جاتا ہے، آپ لوگ پرامن طور پر منتشر ہو جائیں''......جلسہ برخاست ہو گیا لیکن پبلک نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ پچھلے جلسہ کی طرح اب کی بھی فساد پر تل کر کون آیا تھا اور عامۂ مسلمین کے دلوں میں شورش پسندوں کی طرف سے بیزاری ونفرت کی جو لہر دوڑ گئی اس کا دور کرنا اب کسی کے بس کی بات نہ رہی۔ ''پاسیانہ'' خدمتِ حرمین کا دوبارہ مظاہرہ اب شہر لکھنؤ میں ممکن نہ رہا۔

......☆☆☆......

باب:45

15:1925

(ذاتیات وقومیات۔مقام عدل)

محمد علی کی فراست غضب کی تھی اور کام کرنے کا جذبہ بے پناہ۔آج کا رنگ دیکھ کر سمجھ گئے کہ اصلی ضد اور کد جو کچھ ہے وہ مقامی کارکنوں سے ہے، نہ کہ خود ان سے۔شوکت صاحب کی قوت عمل کچھ ان سے بھی بڑھ کر تیز تھی گھر پہنچتے پہنچتے یہ فیصلہ کر لیا کہ جلسہ کل ہی پھر ہو، اور اب کی جلسہ کے طلب کرنے والے لکھنؤ کے کارکنانِ خلافت نہیں بلکہ خود مولانا شوکت علی ہوں اور صدر جلسہ بھی اپنی پارٹی کا کوئی شخص نہ بنایا جائے جو دوسروں کی نظر میں معتوب وبدنام ہو، بلکہ کوئی غیر جانب دار شخص ہو۔میں جلسہ کے بعد جلسہ گاہ کے باہر اور امین الدولہ پارک میں لوگوں سے ملنے ملانے، پبلک کے خیالات وتاثرات کا اندازہ کرنے کو ٹھہر گیا تھا......میری چھوٹی موٹی ''لیڈری'' پر کہیں غالب میری ''ایڈیٹری'' اور صحافت رہتی تھی......کیا خبر تھی کہ خلیق صاحب کے ہاں آناً فاناً یہ فیصلے ہو جائیں گے۔بعد مغرب دن بھر کا تھکا ماندہ سیدھا اپنے گھر جا رہا تھا کہ راستہ میں محض اتفاق سے ایک صاحب مطبع مل گئے۔کل کے جلسہ کا اشتہار چھاپنے بھاگا بھاگ چلے جا رہے تھے، ان سے مسودہ لے کر پڑھا۔مقام جلسہ وہیں باغ امین الدولہ میں ممتاز بیرسٹر مرحوم کا لق ودق مکان۔ بالکل ٹھیک، داعی جلسہ مولانا شوکت علی، یہ بھی ہر طرح مناسب لیکن صدر جلسہ؟ حیرت کی آنکھوں

سے دیکھا، اور استعجاب کی عینک سے پڑھا کہ یہ گمنام! اور یہ انتخاب بھی گویا ایسا یقینی بلکہ الہامی کہ خود اس صدر کی منظوری اور اس سے پوچھ گچھ کی بھی کچھ ضرورت نہیں! شوکت صاحب کے احکام وفرامین ایسے ہی نادر ہوا کرتے تھے۔

یہ گمنام، گمنام ہی تھا، اور یہ سچ ہے کہ خلیق صاحب یا ظفر الملک صاحب کا سا "بدنام" نہ تھا۔ تاہم کہاں اتنے اہم جلسہ کی صدارت کا بارگراں اور کہاں اپنا دوش ناتواں! وہ تو کہیے کہ بڑی خیر یہی ہوئی کہ خبر اشتہار چھپنے سے قبل ہی ہوگئی ورنہ عین وقت پر تو کچھ بھی بنائے نہ بن پڑتی۔ جوں توں ان صاحب مطبع کو روکا کہ یہ اشتہار فی الفور نہ چھاپ دیجیے گا اور دوڑا ہوا شوکت صاحب کے پاس پہنچا کہ "ایسا غضب نہ کیجیے، ایک ادنیٰ سپاہی کو دفعتاً سالار لشکر کے مرتبہ پر تو نہ پہنچا دیجیے، خدمت ہی لینا ہے تو کوئی چھوٹی موٹی ڈیوٹی لگا دیجیے، انشاءاللہ اس سے سرتابی نہ ہوگی"۔ بارے شوکت صاحب کو رحم آ گیا۔ حکم ہوا کوئی اور نام پیش کرو۔ سید ظہور احمد ایڈوکیٹ، لکھنؤ کے ایک بڑے پرانے قومی کارکن تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ ان کا نام معاً ذہن میں آ گیا۔ پیش ہوا اور شوکت صاحب کی بارگاہ میں منظور ہو گیا۔ غرض بات کی بات میں دوسری شام کا جلسہ طے پا گیا اور اشتہارات رات میں چھپ چھپا گئے۔

....

9 نومبر کی صبح ہوئی اور راجہ نواب علی خان مع مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کے......ان راجہ صاحب کی افسرانہ اور خود مختارانہ حیثیت اور ان مولانا کی دبی ہوئی اور ماتحتانہ ہیئت اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی 1......علی برادران سے ملنے خلیق صاحب کی کوٹھی پر آئے۔ خلاصۂ گفتگو یہ تھا کہ "ہمیں اختلاف آپ سے نہیں، ہم تو صرف یہ دکھانا چاہتے تھے کہ آپ کے لکھنوی دوست ہم لوگوں کو نکال کر لکھنؤ میں جلسہ نہیں کر سکتے 2۔ اب جلسہ مولانا شوکت علی صاحب طلب کر رہے ہیں، وہ شوق سے کریں، ہم اس میں خلل انداز نہ ہوں گے بلکہ وہ جلسہ تو بعد مغرب ہے ہم اپنا ایک جلسہ وکٹوریہ پارک میں بعد ظہر کیے دیتے ہیں، آپ وہاں آ کر تقریر فرمائیں۔ ہم سب آپ کی تقریر سنیں گے"۔ شوکت صاحب جواب میں بولے "آپ لوگوں کو میرا معمول تو معلوم ہے میں

---

1 بقول شخصے۔ 2 غیر اس بزم میں مختار بنے بیٹھے ہیں۔ ہم الگ چور گنہگار بنے بیٹھے ہیں

مخالفین کے جلسہ میں جاتا ہی نہیں، اس سے بدمزگی اور بڑھتی ہے"۔ معاً محمد علی نے لقمہ دیا "مگر میرا یہ معمول نہیں میں تو مخالفین ہی کے جلسہ میں شوق سے جاتا ہوں کہ مخالفین کے درمیان تبلیغ کروں۔ یہ عین سنت رسولؐ ہے۔ حضورؐ اپنا پیام ابوجہل کو سناتے تھے، ابوبکرؓ کو اس کی حاجت نہ تھی...... کیا ظرف تھا" خود بین وخرد پرست" محمد علی کا! محمد علی نے معتقدین سے واہ واہ حاصل کرنے والی تقریر میرے علم تو کبھی کی ہی نہیں۔ ولولہ انھیں جب پیدا ہوتا تو منکروں پر تبلیغ کا، گمراہوں کو راہ راست پر لانے ہی کا ہوتا اور اپنے حق پر ہونے کا اس درجہ اعتماد ووثوق رہتا تھا کہ مخالفین کے ہجوم وکثرت سے کبھی گھبرائے ہی نہیں۔ کہا کرتے تھے کہ پبلک سے ڈرنا کیا معنی، جس کے دل میں پبلک کا خوف بیٹھا ہوا ہے اور جو پبلک سے بدگمان ہے اس کی جمہوریت جھوٹی جمہوریت ہے اور وہ لیڈری کا کسی طرح اہل نہیں۔

ادھر وہ لوگ اٹھ کر گئے، اِدھر محمد علی پر لے دے ہونے لگی، خود اپنی پارٹی والوں کی طرف سے۔ سب سے زیادہ برسا خلیق صاحب نے شروع کیا کہ ان لوگوں کے جلسہ میں آپ کا جانا ہماری شدید توہین کرنا ہے...... محمد علی بہت بڑی پارٹی اپنے ساتھ رکھنے کے باوجود بھی اکیلے ہی تھے! وہ جس بلند سطح پر تھے، وہ نہ مخالفین کی سمجھ میں آتی نہ موافقین کی۔ گھوم پھر کے سوال ان سب کی نظر میں وہی ذاتی توہین وتحقیر کا تھا۔ محمد علی لاکھ لاکھ اپنے زاویۂ نظر کی توضیح کر رہے ہیں، پارٹی والے کب سمجھنے پر آمادہ تھے۔ اتنے میں خبر معلوم ہوئی کہ راجہ نواب علی خاں صاحب نے اعلان جلسۂ عام کیا ہے۔ مفر کا یہ موقع قدرت نے محمد علی کو دے دیا۔ محمد علی نے خط لکھ بھیجا کہ "میرا وعدہ آپ کے جلسہ میں، مخالفین کے جلسہ میں، خدام الحرمین کے جلسہ میں آنے کا تھا۔ آپ نے اسے جلسۂ عام بنا دیا۔ میں آپ کے طلب کیے ہوئے جلسۂ عام میں آنے سے معذور ہوں"...... چلیے بڑی خیر ہوگئی۔ خلیق صاحب اور ان کی پارٹی کے آنسو بجھ گئے اور بات رہ گئی۔

....

صبح کا وقت ہے اور غالباً وہی صبح، میں خلیق صاحب کے یہاں بیٹھا ہوا ہوں کہ بالا خانہ پر ایک فرنگی محلی صاحبزادہ آئے اور ہاتھ میں ایک روزنامچہ کے اوراق لیے ہوئے۔ صاحبزادہ خود بھی اپنے خاندان سے باغی اور مولانا عبدالباریؒ کے شدید مخالف، اور جن مرحوم بزرگ کی آخری

عمر کا روز نامچہ لائے ہیں وہ بھی اس زمانہ میں مولانا کے شدید مخالف ہو چکے تھے۔ روز نامہ کے سفینہ میں وہی سب کچھ درج تھا جو ''گھر کے بھیدی'' کے سینہ میں خانگی رنجشوں اور عداوتوں کے بعد بھرا رہا کرتا ہے اور پھر روز نامچہ کی نقل وقل نہیں، بجنسہ روز نامہ، ان مرحوم کے دست خاص کا لکھا ہوا...... نعمت غیر مترقبہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہاتھ آسکتی تھی؟ وہ صاحبزادہ چاہتے تو منہ مانگے دام بھی اس پارٹی والوں سے وصول کر لیتے۔ مخالفوں کے سردار کی مخالفت کے لیے اس سے بہتر مصالحہ اور کہاں سے ہاتھ لگ سکتا تھا! کوئی ایک آدھ حربہ نہیں پورے کا پورا میگزین ہاتھ آ رہا تھا۔ کون حریف اس موقع کو چھوڑتا؟ دنیا میں جنگ اور مناظرہ اور پارٹی بازی کے وقت جو ذہنیت ساری دنیا کی ہو جاتی ہے، اس معیار سے دیکھیے تو کون اتنے بڑے شکار کو ہاتھ سے جانے دیتا؟ بڑے بڑے لیڈر اور ایڈیٹر، اور اچھے اچھے مولوی اور مشائخ ایسے موقع پر کیا کیا کرتے ہیں، لوگ لپک لپک کر بڑھے اور لگے ان صاحبزادہ کو حلقہ میں لے مزہ لے لے کر، روز نامچہ کو پڑھنے۔ کوئی بیٹھا اور کوئی کھڑے ہی کھڑے...... سارے مجمع میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو مجمع سے ہٹا ہوا، پہلے تو اس ''تماشہ'' کو دور سے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھا، قریب آیا اور شوق و مسرت کے بجائے ناگواری کے لہجہ میں بولا ''یہ کیا واہیات ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے قومی معاملات میں ہے، ذاتیات اور خانگی نزاعات کی راہ نہیں کھل گئی ہے''۔

اس شخص کو آپ نے پہچانا؟ یہ محمد علی تھا۔ وہی محمد علی جس کے غصہ ور دزود اشتعال ہونے، جنگجو و جنگ پسند ہونے کی داستانیں اور حکایتیں خدا جانے آپ کتنی سن چکے ہوں گے! انسان کا اصلی ظرف، مخالفت اور شدید مخالفت ہی کے وقت کھلتا ہے۔ جب تک دوستی و موافقت ہے، ہر عیب ہنر ہے۔ ادھر مخالفت شروع ہوئی، ادھر ہر ہنر عیب بن گیا۔ اور پھر ہمارے اخبار نویس تو شدید مخالفت کے بغیر بھی ایسی ایسی خانگی دستاویزوں کی ٹوہ میں رہا کرتے ہیں۔ انھیں تو خدا ایسے مواقع دے! اپنی مخالفت کا کمال ہی اسے سمجھتے ہیں کہ آج اسے ننگا کر دیا۔ کل اس کی پگڑی اچھال دی، پرسوں تیری اور میری رسوائیاں مزے لے لے کر چھاپ ڈالیں۔

......☆☆☆......

باب:46

16:1928

(ڈائری نویس پرڈانٹ۔عالی ظرف محمد علی)

''فرنگی محل کا کچا چٹھا'' دوسرے کے علاوہ اس ڈائری نویس ہی کی سازش سے ہزاروں کی تعداد میں طبع ہوکر گھر گھر شائع ہو رہا ہے۔باہر کے اکثر اخبارات میں نکل چکا ہے لیکن خود محمد علی کے اخبار ہمدرد میں اب تک نہیں نکلا۔خیر لکھنؤ کا پریس تو اپنے ہاتھ میں تھا نہیں، اس کی طرف تو صبر تھا لیکن یہ ہمدرد میں نہ نکلنے کے کیا معنی؟ کہیں اور چھپتا نہ چھپتا ہمدرد میں تو اسے سب سے پہلے نکلنا تھا۔عارف صاحب (ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر) لکھنؤ میں محمد علی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں۔صبح کوئی 10، 11 کا وقت ہوگا کہ خلیق صاحب کی کوٹھی پر ''چٹھے'' نویس صاحب ملے۔فریادو داد خواہی کے لہجہ میں مجھ سے بولے کہ ہمدرد میں چھپنے کے لیے میں نے عارف صاحب کو دیا تھا۔عارف صاحب نے لکھا کہ مولانا کی اجازت لے لوں۔مولانا نے اجازت نہ دی اب آپ کہیے''۔ میں نے دل میں کہا یہ نہ چھپنے کی خوب رہی۔یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ جنگ میں غنیم کے گولے تو ہمارے سروں پرآ کر دھڑا دھڑ گر رہے ہیں اور ہم ہیں کہ اپنی سب سے بڑی توپ کے دہانے پر مہر لگائے ہوئے ہیں!......عوام کی نظر میں یہ ساری جنگ بجز فرنگی محل اور محمد علی کی جنگ کے اور تھی کیا؟ اور ''خواص'' اس باب میں کب ''عوام''

سے ممتاز تھے؟

جی کڑا کر کے محمد علی سے عرض کی۔ کہنے کی دیر تھی کہ ایک زبردست ڈانٹ پڑی، وہ بھی تنہائی میں نہیں، پارٹی والوں کے بھرے مجمع میں! گرجتی ہوئی آواز میں اس قسم کے فقرے ہوا میں گونجے ''ہرگز نہیں چھپ سکتا''، ''میرے اخبار میں اور ایسی لغو چیزیں''، ''یہ ہرگز صحیح اور شریفانہ صحافت نہیں''، ''یہ طریقے چنتامنی ایڈیٹر لیڈر کو مبارک ہوں''۔ ''یہ آپ نے چنتامنی کا طریقہ کہاں سے سیکھ لیا'' یہ کہا اور ''چٹھا'' میرے ہاتھ سے لے کر سب کے سامنے پرزہ پرزہ کر ڈالا!...... میں لاکھ معتقد اور شیدائی سہی بہرحال ایک زندہ نفس رکھتا تھا۔ اور نفس ایک مجمع کے سامنے اپنی خواری کب برداشت کر سکتا ہے؟ اس توہین کی تاب نہ آئی۔ لیکن کرتا کیا دل ہی دل میں جھنجھلاتا اور غصہ کرتا رہا کہ محمد علی کا دوست بھی خراب اور دشمن تو خراب ہی ہے۔ یہی مزاج ہے، جبھی تو کوئی ان کا دوست باقی نہیں رہا۔ یہاں تو ان کے واسطے مٹے جا رہے ہیں اور یہ ہیں کہ دوسرے کی عزت کا خیال کریں نہ جذبات کا۔

کچھ دیر روٹھا ہوا ان سے الگ بیٹھا رہا۔ اتنے میں کھانے کا وقت آ گیا۔ سب اٹھے میں چپ بیٹھا رہا۔ خود ہی بولے ''اٹھو کھانا بچھ گیا''۔ میں نے کہا ''مجھے بھوک نہیں''۔ اٹھ کر پاس آئے، گلے سے لپٹا لیا اور بولے ''واہ بس اتنے میں خفا ہو گئے''۔ لوٹے میں پانی لے کھڑے ہو گئے کہ میں خود ہاتھ دھلاتا ہوں۔ تم نہ کھاؤ گے تو میں بھی نہ کھاؤں گا۔ طبیعت جز بز تو ہوئی لیکن پھر وہی کہ آخر کرتا کیا، اپنی ہار ماننی ہی پڑی...... کوئی ڈائری خواں کہیں یہ نہ فرمانے لگیں کہ چھوٹے چھوٹے واقعات میں رکھا کیا ہے لیکن یہی روزمرہ کے واقعات ہی تو ہر شخصیت کے ناپنے کا اصل پیمانہ ہوتے ہیں۔ سیرت پر، کردار پر، باطن پر، سرشت و جبلت پر روشنی اگر ان واقعات سے بھی نہ پڑے گی تو آخر اور کہاں سے واقعات لائے جائیں گے؟

9 کی شام خدا خدا کر کے آئی۔ جلسہ گاہ پر سارے رضاکاروں کا پہرہ بہت قبل سے تھا۔ لاٹھیاں اور چھڑیاں سب سے باہر رکھوالی جاتی تھیں۔ آنے والوں میں موافقین ہی اکیلے نہ تھے، مخالفین بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ بعد مغرب مجمع خوب کھچا کھچ ہو گیا اور جلسہ کی کارروائی امن و اطمینان سے شروع ہوئی۔ پہلے ایک گھنٹہ کے قریب مولانا شوکت علی

بولے اور پھر کوئی ڈیڑھ پونے دو گھنٹہ محمد علی۔ تقریر تھی کیا؟ کیا اپنے اوپر جو مسلسل دلآزار حملے دو ڈھائی مہینوں سے جاری تھے، ان کا کوئی جواب؟ حریفوں پر کوئی جوابی حملہ؟ قبہ نوازی کی تردید میں، قبہ شکنی کی حمایت؟ ابن سعود کے مناقب وفضائل؟ ''وہابیت'' کی حوصلہ افزائی؟ فرنگی محل پر چوٹیں؟ لوگ کہتے اور صحیح کہتے ہیں کہ محمد علی جذبات کے پتلے تھے۔ لیکن وہ محض جذباتی ہرگز ہرگز نہ تھے۔ عقلی واستدلالی بھی اسی قدر رتھے جتنے جذباتی۔ جب جذبات کا دریا موجزن ہوتا تو بے شک سب کچھ اپنے ساتھ بہالے جاتا لیکن جب استدلال پر آتے تو منطقی گرفتیں، وہ رنگ دکھاتیں کہ اچھے اچھے وکیلوں اور بیرسٹروں کو نیچا دیکھنا پڑتا...... آج کی تقریر تمام تر ٹھوس، مدلل، سنجیدہ معقول تھی۔ گو خشک تو ان کی کوئی تقریر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بس جمعیۃ خلافت اور مسئلہ حجاز میں اس کی روش ومسلک کی تائید میں ایک مفصل ومکمل بیان تھا۔ شروع سے ایک ایک واقعہ گنا کر اور اس کے جزئیات کی تفصیل میں جا کر حاضرین سے اس قسم کے سوالات کرتے جاتے کہ اب بتایئے واقعات حجاز پر پردہ کون ڈالنا چاہتا ہے، آیا خلافت کمیٹی جس نے مدتوں قبل دسمبر 24 میں اپنا خاص وفد تحقیق حال کے لیے روانہ کر دیا تھا یا شریف علی بن حسین، جس نے جدہ سے آگے ہی اس وفد کو نہ بڑھنے دیا؟ اسی طرح ایک ایک چیز کو دہرا کر آخر میں پوچھا کہ کوئی ایک بھی بات ایسی بتایئے جو خلافت کمیٹی کے کرنے کی تھی اور وہ اس سے قاصر رہی یا ایک بھی ایسی بات جو اسے نہ کرنا چاہیے تھا اور اس نے کر ڈالی؟...... سارے مجمع پر کامل سکوت چھایا ہوا۔ فرنگی محلی حاضرین جلسہ بھی سب اس پُر احترام وپُر عظمت سکوت میں شریک۔ کسی کو کوئی تلخی نہ اپنے عقائد کے خلاف محسوس ہوئی نہ اپنی ذات کے خلاف، نہ اپنے خاندان کے خلاف۔ آخر میں جناب حسرت موہانی کھڑے ہوئے اور فرمایا ''مجھے دونوں بھائیوں کی تقریر سے کامل اتفاق ہے''۔

یہ تھی اس ''وہابی'' اور ''قبہ شکن'' محمد علی کی وہ ہولناک ومہیب تقریر جسے لکھنؤ کے ذات شریف ''شریفی'' حضرات خدا معلوم کن کن غیر شریفانہ طریقوں سے لکھنؤ میں روک رہے تھے! محمد علی اتنا وقت بھی کن مشکلوں سے نکال کر آئے تھے، دوسرے ہی دن دہلی واپس ہو گئے۔ لکھنؤ میں جلسے اس کے بعد بھی برابر دو دن اور ہوتے رہے، فضا ہموار ہو چکی تھی، اب

تقریر کرنا کیا دشوار تھا۔ مولانا شوکت علی اور جمعیۃ العلما کے دونوں مولوی صاحبان کی تقریریں ہوتی رہیں، محمد علی کے ڈائری نویس کو ان سے تعلق نہیں۔

....

بڑا فرق محمد علی اور ہم لوگوں میں یہ تھا کہ ہماری نظریں چھوٹے چھوٹے مسائل تک محدود، ان ہی میں الجھ کر رہ جاتیں اور ان ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتیں۔ ان ہی جزئیات پر ہمارے ہاں پارٹیاں اور پھر پارٹیوں کے اندر پارٹیاں بن جاتیں۔ محمد علی کی نظر کہیں زیادہ عمیق اور کہیں زیادہ وسیع، ان جزئیات سے بالاتر رہتی، یہی سبب ہے کہ وہ نہ خود کوئی پارٹی بنا سکے اور نہ کسی بنی بنائی پارٹی میں عرصہ تک نباہ سکے۔ ہر شخص انھیں اپنی پارٹی میں کھینچنے کا آرزومند۔ ہر پارٹی اس کوہ پیکر کو اپنے میں ملا لینے پر حریص۔ لیکن وہ خود ہر پارٹی سے، اور قومی معاملات میں ہر دوستی سے بلندتر۔ حق کا طالب اور حق کا ساتھی تھا۔ جس چیز کو اس نے حق سمجھ لیا، بس اسے دانت سے پکڑ لیا چاہے اس میں سب ہی کا ساتھ چھوڑ دینا پڑے۔ حق کے معاملہ میں پروانہ کسی دوست کی کی نہ بزرگ کی، نہ خود کی نہ اپنے کسی محسن کی، نہ اپنے مرشد کی۔ لیکن حدود کا لحاظ اس کے باوجود بھی ...... اب خود اس موقع سے بڑھ کر اور کون سی جگہ لغزش قدم کی ہو سکتی تھی بڑے بڑے متین اور ضبط رکھنے والے بھی ایسے موقعوں پر بے قابو ہو جاتے ہیں۔ یہ ظرف محمد علی ہی کا تھا کہ اس حال میں بھی حدود کو ملحوظ رکھا اور اپنی ذات سے ایک بات بھی ایسی نہ ہونے دی جس پر ان وقتی جذبات کے ٹھنڈے پڑ جانے پر اور برسوں کی مدت گزر جانے کے بعد آج ان کے کسی نیازمند کو آنکھیں نیچی کرنی پڑیں...... لکھنؤ کا معرکۃ الآرا جلسہ ختم ہو گیا لیکن وہ قضیۂ اختلاف کہاں ختم ہوا۔ مسلمانوں کی قسمت ایسی تھی۔ ابھی تو اس قضیہ کو ہفتوں نہیں مہینوں چلنا تھا بلکہ ایک معنیٰ میں تو برسوں اور ایک بڑے محترم بزرگ اور لیڈر کی جان بھی اسی قضیہ کی نذر ہونی تھی۔

دہلی اس کے بعد اور اس کے قبل اس زمانہ میں جب بھی ہوا یہی قصے اور قضیے وہاں بھی پھیلے ہوئے پائے۔ ایک جمعہ میں محمد علی کی تقریر بھی اسی موضوع پر جامع مسجد میں سنی۔ حسب معمول شگفتہ و دلآویز، مؤثر، مدلل۔ تقریر کا ایک خاص اسلوب (ٹیکنیک) محمد علی نے یہ ایجاد

کیا تھا کہ مخاطبین سے برابر سوال پر سوال کرتے جاتے اور ان سے ہر سوال کا جواب لیتے جاتے ......اسی جلسہ میں کسی نے دور بیٹھے ہوئے غصہ سے پکار کر کہا تھا کہ یہ بھی خبر ہے اس بحث میں شامی نے کیا لکھا ہے۔ محمد علی نے غصہ کے جواب میں مسکرا کر کہا کہ ''مجھے [1] نہ شامی سے بحث نہ نجدی سے میرے لیے تو کتاب اللہ کافی اور اس کے بعد سنت رسولؐ، جس دن مجھ پر ان نصوص سے قبوں اور پختہ قبروں کی حرمت ثابت ہوگئی میں گلابی وہابی نہیں پورا وہابی بن جاؤں گا اور اپنے ہاتھ میں ان کے کھودنے اور گرانے کے لیے پھاوڑے لے لوں گا'' اسی تقریر یا کسی اور تقریر میں کہ وہ بھی بہر حال جامع مسجد ہی کی تھی، اس نامہ سیاہ کا تعارف کرایا کہ یہ سچ کے ایڈیٹر ہیں جن کا مقولہ ہے ''الحق مر'' (سچی بات کڑوی ہی ہوتی ہے) اور اس کے ساتھ ایک دوسرے ایڈیٹر بھی ہیں مولوی ظفر الملک علوی ان کا مقولہ ہے ''الحق مر'' (سچی بات کڑوی ہوتی ہے)

......☆☆☆......

---

[1] فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار کی مستند وضخیم شرح ردالمحتار ابن عابدین شامی کے قلم سے، عرف عام میں اس کا لقب شامی یا فتاوائے شامیہ ہے۔

باب: 47

17:1925

(نئی اودھ خلافت کمیٹی)

نومبر پورا گزر چکا اور دسمبر کا بھی بڑا حصہ ختم ہو گیا۔ قلم اور زبان کی جنگ ابھی اسی تیزی اور تندی سے قائم۔ ابھی لاہور سے ٹیلیفون محمد علی کے پاس چلا آ رہا ہے کہ فوراً آیئے اور سب کام چھوڑ کر آیئے۔ یہاں کے جلسہ میں قبہ نوازوں کے مقابلہ میں آ کر تقریر کیجیے، ابھی ایسی ہی طلبی پٹنہ سے تار پر ہو رہی ہے۔ ایک سر دو ہزار سودا۔ ایک انار وصد بیمار۔ ایک وقت میں کہاں کہاں پہنچتے۔ قوم نے جیسے طے کر لیا تھا کہ کلکتہ ہو یا بمبئی، لکھنؤ ہو یا دہلی، ہر درد کے درمان محمد علی ہی ہیں، کہیں بھی کوئی ضرورت پیش آئے اور وہی دوڑے ہوئے پہنچیں...... 24 دسمبر 25 شام کا وقت ہے۔ کانپور میں کانگریس اور خلافت کانفرنس دونوں کے سالانہ اجلاس ہو رہے ہیں۔ دونوں کیمپ ملا کر ایک پورا نیا شہر آباد ہو گیا ہے۔ ہزار ہا ہزار کا مجمع، خیموں کا یہاں سے وہاں تک ایک جنگل ہی جنگل۔ ایک پختہ عمارت میں نئے صدر خلافت کمیٹی مولانا ابوالکلام آزاد اور بعض دوسرے اکابر ٹھہرائے گئے ہیں۔ اسی کے ایک کمرہ میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ ہو رہا ہے اور سب سے زیادہ معرکتہ الآرا مسئلہ مجلس کے سامنے زور شور سے یہ چھڑا ہوا ہے کہ صوبہ اودھ کی دو خلافت کمیٹیوں میں سے جائز اور مستند کس کمیٹی کو ٹھہرایا جائے اور کس کے نمائندے مرکزی مجلس میں قبول کیے جائیں...... لیکن یہ دو

صوبہ کمیٹیاں کیسی؟

فرنگی محل کی سرگرمیاں "پاسبانہ" خدمت حرمین کے مظاہرہ کے بعد کچھ ختم تھوڑے ہی ہوگئی تھیں۔ سعودی شریفی جنگ اسی ہماہمی کے ساتھ ہندوستان میں جاری تھی، اور قبہ نوازی وقبہ شکنی دونوں کے مورچہ اسی شدت وجدت کے ساتھ گولہ باری اور آتش فشانی میں مصروف۔ تحریریں، تقریریں، مناظرے اور مناظرہ کے چیلنج، پوسٹر، اشتہارات، پمفلٹ، تردید پمفلٹ، جواب وجواب الجواب کا سلسلہ اسی شدومد سے قائم۔ صوبہ اودھ کی جو صوبہ کمیٹی شروع سے چلی آرہی تھی، اس کے صدر و ناظم دونوں فرنگی محلی ہی تھے۔ اور دونوں اپنے مسلک کی اشاعت میں جوش کے ساتھ لگے ہوئے۔ اب یہ عجب ستم ظریفی تھی ادھر آل انڈیا مرکزی جمعیت خلافت تو سلطان ابن سعود کی حامی وہمدرد، اور ادھر اس کی صوبائی شاخ کے ذمہ دار ارکان سلطان کی مخالفت میں سرگرم، اور خود جمعیت مرکزی سے بغاوت پر کمربستہ! مولوی ظفر الملک صاحب ایسے موقع پر کب چوک جانے والے تھے۔ قواعد وضوابط سے پوری طرح لیس اور آئین وقانون سے مسلح، انھوں نے نومبر ہی میں جھٹ ایک دوسری اودھ خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھ دی تھی، اور اخبارات میں اس کا اعلان قبل سے کراکر، بارہ بنکی میں اس کی ضابطہ سے تشکیل بھی کردی تھی۔ روح رواں تو وہ خود اور چودھری خلیق الزماں تھے، نام کے لیے صدارت اس ڈائری نویس کے ذمہ ڈال دی گئی۔ ادھر وہ قدیم خلافت کمیٹی بہرحال موجود تھی۔ مرکزی کمیٹی کے سامنے سب سے پہلا اور اہم مسئلہ یہی پیش ہوا کہ صوبۂ اودھ کی ذمہ دار اور حقیقی کمیٹی وہ کس کو تسلیم کرے۔

....

مولانا شوکت علی نے بحیثیت ناظم مجلس مرکزی تحریک پیش کی کہ قدیم اودھ کمیٹی کا الحاق توڑ کر مرکزی سے الحاق جدید اودھ کمیٹی کا منظور کیا جائے۔ بحث شروع ہوئی۔ ہم لوگ یعنی جدید کمیٹی کے ارکان ابھی کہاں بار پاسکتے تھے، ایک بغلی کمرہ میں بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ جلسہ میں قدیم کمیٹی کے صدر صاحب اور ناظم صاحب، بس دو صاحب یہ، اور تیسرے حسرت موہانی اور چوتھے ایک صوبۂ متوسط کے (کہ ان دونوں صاحبوں کا فرنگی محل سے رشتۂ ارادت بھی تھا) بس ان چار صاحبوں کو چھوڑ کر جلسہ کا جلسہ شوکت صاحب کی تائید میں تھا۔ ڈاکٹر سید محمود، مولوی عبدالقادر

قصوری ''غازی'' عبدالرحمٰن امرتسری، مفتی کفایت اللہ صاحب، سیٹھ یعقوب حسن مدراسی، مولانا داؤدغزنوی امرتسری، آصف علی صاحب بیرسٹر دہلوی، قمراحمد صاحب علیگ (ایڈیٹر ''خلافت'') عارف صاب ہنسوی وغیرہ بکثرت حضرات نے اپنی تقریروں میں یہی کہا.....اب آج 48، 49 میں کوئی کیسے بتائے اور سمجھائے کہ 25 میں ان ناموں کا کیا وزن تھا اور کتنی اہمیت تھی؟......اور مولوی ظفر الملک اور چودھری خلیق الزماں نے جدید کمیٹی کے نمائندوں کی حیثیت سے جلسہ کے سامنے جا کر مؤثر د مدلل بیانات دیے...... جلسے کی کارروائی دلچسپ سہی لیکن جو ڈائری صرف محمد علی سے متعلق ہے وہ اس تفصیل کی متحمل کہاں سے ہوسکتی ہے؟

سب کو اشتیاق و انتظار محمد علی کی تقریر کا۔ توقع کیا معنی، یقین تھا کہ محمد علی کی تقریر بڑی گرما گرم اور پرزور ہوگی اور قدیم کمیٹی والوں کا تارتار الگ کر کے رکھ دے گی۔ لیجیے، تقریر شروع ہوئی، اور سب کے کان لگ گئے کہ مخالفین میں سے ایک ایک کی قلعی کھل کر رہتی ہے۔ لیکن یہ کیا؟ دو منٹ، چار منٹ، پانچ منٹ تقریر کے ہوگئے، اور نہ آتش بیانی نہ شعلہ افشانی۔ نہ اس پر اصرار کہ ان ''دشمنوں'' کو فوراً نکال دیا جائے نہ اس کا مطالبہ کا کہ ان ''دوستوں'' کو فوراً لے لیا جائے، ایک معتدل سی تقریر، جذبات کو بھڑکانے کے بجائے دھیمی کرنے والی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیمی کمیٹی کا الحاق توڑنا لازمی نہیں۔ اگر کوئی صورت اصلاح حال کی نکل آئے تو ان لوگوں کی ممبری بھی بدستور قائم رہ سکتی ہے''۔ ہمارے فریق کے اہل غلو (اور غلو سے کس فریق کا کون فرد خالی تھا) دنگ وحیران کہ لیجیے جن کے واسطے یہ سب کچھ کیا گیا تھا اور خود ہی اتنے بجھے ہوئے نکلے......اتنے ''چست'' گواہوں کے ہوتے ہوئے کوئی مدعی اتنا ''سست'' کہیں کا ہے کو ثابت ہوا ہوگا؟

قدیم کمیٹی کی قسمت کا جو فیصلہ ہونا تھا وہ تو بالآخر ہو کر رہا لیکن محمد علی کے یہ الفاظ اپنے جوش مخالفت میں ہم لوگوں کے دل میں بار بار کھٹکتے رہے کہ ''الحاق توڑ دینا صحیح طریق عمل نہیں، آئینی کارروائی یہ تھی کہ ان لوگوں کو خود کمیٹی کے اندر (Out Vote) کیا جاتا، یعنی ووٹوں کی اکثریت سے شکست دی جاتی''۔ اس اشتعال و ہیجان کے عالم میں عدل وضابطہ کو اتنا ملحوظ رکھتے تو ان آنکھوں نے محمد علی ہی کو دیکھا۔ ورنہ دنیا تو اس سے کہیں ہلکے موقع پر بھی، بس ہر ممکن طریقہ سے مخالف کو شکست دے دینا ہی جانتی ہے۔

محمد علی مجلس مرکزی کے سامنے تقریر کر رہے تھے کہ اثنائے تقریر میں کہیں یہ فقرہ ان کی زبان سے نکلا کہ "یہ خلافت کمیٹی کا کام قوم کا کام ہے، ملت کی خدمت ہے کوئی موروثی گدی نشینی نہیں ہے جو لوگ اس کے کام کے لیے تیار و مستعد ہوں، وہی اس میں رہیں۔ باقی جو مادہ فاسد اس میں گھس آیا ہے، اسے خارج ہی ہو جانا چاہیے"۔

یہ فقرہ سننا تھا کہ محمد علی کے ایک مرشد زادہ [1]، قدیم اودھ کمیٹی کے صدر، تڑپ کر اٹھے اور سر جلسہ یہ کہتے ہوئے کہ "آپ ہمیں مادہ فاسد کہتے ہیں ہم آپ کو پیکر باطل سمجھتے ہیں" مع اپنے ایک کھدر پوش متوسل خاندانی کے جو اکتوبر کے جلسہ لکھنؤ کے توڑنے میں بہت پیش پیش تھے، باہر چلے گئے۔

یہ لکھنؤ نہ تھا، کانپور تھا اور مجمع خاندانی معتقدین کا نہ تھا، جلسہ مرکزی خلافت کا تھا۔ ارکان کی بہت بڑی تعداد فرنگی محل کی طرف سے بھری بیٹھی تھی۔ کتنوں کے چہرے غصہ سے تمتما اٹھے، کتنوں نے چاہا کہ فوراً ایک ملامت کا ووٹ پاس کرا دیں اور یہ تو سب ہی سمجھے کہ اب فرنگی محل کی خیر نہیں، محمد علی کی زبان پشتہا پشت کی خبر لے ڈالے گی...... لیکن ہوا کیا؟ محمد علی کی زبان سے صرف یہ فقرہ تو غصہ کے تیوروں سے ادا ہوا کہ "آپ بچے ہیں" بچے ہیں اور اس دوحرفی جواب کے بعد تقریر اسی اعتدال و توازن کے ساتھ جوں کی توں جاری! یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ کوئی ناگوار و اشتعال انگیز واقعہ پیش بھی آیا ہے۔ محمد علی کے "غصہ کرنے" کے واقعات آپ نے بہت سے سنے ہوں گے اور وہ صحیح بھی ہوں گے۔ بہتر ہوگا کہ "غصہ سہنے" کی بھی اس مثال کو اپنی یادداشت میں ٹانک لیجیے۔ محمد علی تو خیر واقعی غصہ ور تھے، کوئی حلیم سا حلیم انسان بھی ہوتا تو اس موقع پر کیا کرتا؟ کیا محمد علی سے زیادہ کسی حلم و تحمل کا ثبوت دیتا؟

جلسہ کے بعد اور جلسہ کے باہر جدید و قدیم اودھ خلافت کمیٹیوں کے ارکان میں باہم اکثر زور آزمائی ہوتی رہی۔ اور قدیم کمیٹی چونکہ کمزور تھی اپنی کمزوری کے نتائج بھی اسے برداشت کرنے پڑے۔ لیکن محمد علی کو ایک بار بھی ان آویزشوں میں الجھتے کم سے کم ان آنکھوں نے تو نہیں دیکھا۔

......☆☆☆......

---

[1] ان سے مراد جمال صاحب نہیں جو اس وقت بالکل بچے تھے۔

باب:48

18:1925

(خلافت کانفرنس۔ مسلم لیگ)

یہ نیاز مند کانپور 22 دسمبر کی شام ہی کو پہنچ گیا تھا۔ صوبہ خلافت کمیٹی کا صدر تھا، اور وہ بھی نیا نیا۔ خوب خوب خاطریں ہوئیں اور بجائے خادم کے مخدوم بنا رہا۔ دوسرے دن صبح محمد علی آ گئے۔ چند ہی روز قبل کامریڈ میں ان کے قلم سے ایک بڑا لمبا مضمون، گویا ہندوستان سے ایک انگریزی سویلین کا مکتوب کسی دوسرے سویلین کے نام جو انگلستان میں ہے، نکلا تھا (اس مضمون کا ذکر اسی ڈائری کے باب 31 میں کامریڈ کے ذیل میں آ چکا ہے)۔ یہ مضمون محمد علی کے بہترین مقالات میں شمار کیے جانے کے قابل ہے اور یہ تو پہلے ہی عرض ہو چکا ہے کہ محمد علی اصلی اہل قلم انگریزی کے تھے نہ کہ اردو کے۔ ساری مشق ان کی انگریزی انشاپردازی کی تھی۔ زبان اور خیالات دونوں کا پورا لطف بس ان کی انگریزی تحریر پڑھنے میں تھا۔ ملنے کے ساتھ اس مضمون کو میں نے دل کھول کر داد دی۔ محمد علی چاہے اسے تحسین ناشناس ہی سمجھے ہوں تاہم میری دلدہی کے خیال سے تو بہر حال اپنے کو مسرور و مطمئن ہی ظاہر کیا۔

زنانہ ان کے ہمراہ بھی تھا اور میرے بھی۔ خود جس خیمہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، اسی سے

متصل ایک خیمہ مجھے بھی مل گیا تھا۔ محمد علی بے حد مشغول تھے کانگریس کی صدارت کو ابھی ایک سال ہی تو گزرا تھا۔ کانگریس والے بے طرح چمٹے ہوئے تھے اور خلافت کے تو سب ہی کچھ وہ تھے۔ وہی مرتبہ حاصل جو بارات میں نوشہ کو حاصل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ خدا معلوم اور کتنی چھوٹی بڑی کانفرنسیں ہو رہی تھیں۔ بہتوں کے کارکن انھیں گھیرے ہوئے۔ خیمہ متصل نہ ہوتا تو مجھے تو باریابی بھی مشکل سے نصیب ہوتی مگر اس قرب و ہمسائیگی نے مشکل آسان کر دی۔ ہر وقت کے خلا ملا کا موقع حاصل۔ کانگریس کا اجلاس مسز نائیڈو کی صدارت میں بڑے معرکہ کا اجلاس تھا، ہزارہا کا مجمع۔ میرے پاس کانگریس کے لیے ٹکٹ تو ایک کی جگہ دو موجود تھے۔ ایک ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے (ڈیلی گیٹ منتخب ہونا دشوار 25 میں بھی تھا مگر نہ اس شدت سے دشوار جتنا کہ بعد کو ہو گیا) دوسرا پریس ٹکٹ بحیثیت سچ کے ایڈیٹر کے تھا لیکن ان دو ٹکٹوں کے باوجود ہوا یہ کہ صوبہ متحدہ کے ڈیلی گیٹوں کے لیے جو جگہ پنڈال میں رکھی گئی تھی وہ ڈائس سے بہت دور تھی۔ ایسی کہ وہاں تک مقرر کی آواز پہنچنی مشکل تھی۔ (25 میں لاؤڈ اسپیکروں کا یہ رواج کہاں تھا؟) اتنی دور بیٹھنے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔ رہا پریس ٹکٹ تو پریس رپورٹروں کے لیے جگہ بیشک اچھی تھی لیکن یہاں تقریباً سب وہی لوگ تھے جو اپنے اپنے روزناموں کے لیے پنسل یا فاؤنٹین پن ہاتھ میں لیے بیٹھے برابر رپورٹیں لکھ رہے تھے۔ سچ کے ناکارہ ایڈیٹر کو ان کے درمیان خالی ہاتھ بیٹھتے کچھ اچھا معلوم نہ ہوا۔ طبیعت اسی شش و پنج میں تھی کہ محمد علی اپنے خیمہ میں آتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ سابق صدر کانگریس تھے، اس حیثیت سے متعدد اعزازی ٹکٹ ان کی خدمت میں نذر کیے گئے تھے۔ آتے ہی ایک ٹکٹ بغیر میری طلب کے میرے سامنے کر دیا اور اب میں ڈائس نشین تھا...... "کم خرچ بالانشین" تھا، یہاں "بالانشینی" کم خرچی کے ساتھ نہیں بالکل بلا خرچ، مفت ہاتھ آ گئی!

دوستوں کو ساتھ لیے بغیر کسی جلسہ میں، دعوت میں، تماشہ میں، وعظ میں، لکچر میں تنہا جانا محمد علی کے مذہب میں گویا گناہ تھا۔ اور جس طرح وہ کھانا بغیر دو چار شخصوں کو دستر خوان پر ساتھ بٹھائے تنہا نہیں کھا سکتے تھے اسی طرح جس چیز سے بھی انھیں لطف آ رہا ہو اس سے دوستوں کو محروم رکھنا وہ جانتے ہی نہ تھے اور فرمائش اور تقاضا کا انتظار نہ کرتے، خود دوڑ دوڑ کر بلاتے اور گھسیٹ گھسیٹ کر لاتے...... جس کا معمول دنیا میں زندگی بھر یہ رہا، کیا وہ جنت میں اپنے دوستوں کو ساتھ

لائے بغیر ان کی پروا کیے بغیر، داخل ہو جانا گوارا کرلے گا؟

....

خلافت کمیٹی کا ایک وفد جس کے ارکان مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد عرفان اور شعیب قریشی صاحب تھے، آخر اکتوبر میں حجاز روانہ ہوا تھا۔ کانپور میں آخر دسمبر میں خلافت کے جلسے ہو رہے تھے اور عین اس وقت شاید مرکزی کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا کہ وفد حجاز کا ایک طویل تار موصول ہوا کہ سلطان نجد کا قبضہ مدینہ پر ہو گیا ہے اور شریفی فوجیں بھاگ نکلیں۔ یہ خبر ظاہر ہے کہ ہم سب کے لیے کتنی مسرت انگیز تھی لیکن ساتھ ہی کوئی ایسی اطلاع بھی پہنچی (اتنے روز کے بعد اب تفصیل ذہن میں نہیں کہ کس ذریعہ سے) کہ سلطان نجد خود شاہ حجاز ہو جانا چاہتے ہیں، اور شعیب قریشی اور مولانا عرفان کی مخالفت کے باوجود مولانا ظفر علی خان سلطان کی ہمنوائی پر آمادہ ہیں۔ سقوط مدینہ کی خبر سے مسرت وشادمانی کی جو لہر دوڑ جانی چاہیے تھی اسے خبر کے اس جز نے اداسی سے بدل دیا۔ لیکن یہ اداسی زیادہ تر محض محمد علی کی اداسی کا عکس تھی، ورنہ ہم عوام کی سمجھ میں آیا بھی نہیں کہ آخر اس میں حزن وتاسف کی کیا بات ہے۔ تقریباً ہم سب کے سب ایک آدھ فرد کو مستثنیٰ کر کے بس اس قدر چاہتے تھے کہ فتح سلطان کو حاصل ہو اور شریفی حکومت وتسلط کے اعادہ کا امکان باقی نہ رہے۔ سلطان کے عقائد سے اکثر افراد کو اتفاق تھا، فتح سلطان کی تائید کی اصلی اور قوی بنیاد بھی ہم عقیدگی تھی۔ محمد علی کی افسردگی آج دیکھ کر پہلی بار محسوس ہوا کہ محمد علی جو سلطان کی تائید کر رہے تھے اس سے مقصود سلطان کی ذات یا ان کے عقائد کی تائید نہ تھی بلکہ اس کی بنیاد صرف یہ تھی کہ ان کے خیال میں سلطان ملکیت وشخصیت کی بدعت کو مٹا کر جمہوری وشورائی حکومت قائم کرنے والے ہیں۔ اور ارض حجاز کی خدمت کا موقع اپنے ساتھ سارے عالم اسلامی کو دینے والے ہیں۔ آج دھکا اس توقع کو پہنچ رہا تھا، آج یہ امید ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا صدمہ محمد علی کو نہ ہوتا تو اور کس کو ہوتا؟

علی گڑھ کی جوبلی کا بھی عین یہی زمانہ تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے اپنی مسلسل علالت وضعف کے باوجود علی گڑھ کالج کی 50 سالہ سالگرہ کا جشن بڑی دھوم دھام سے منانے کا تہیہ کیا تھا۔ اور وہ جشن اسی زمانہ میں ہو رہا تھا۔ یونیورسٹی کا نووکیشن وغیرہ کے علاوہ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی وہیں تھا۔ محمد علی سے بڑھ کر علی گڑھ کا شیدائی اور کون

رہ چکا تھا، لیکن ساتھ ہی اس وقت سب سے زیادہ ان ہی کا دل بھی علی گڑھ کی طرف سے ٹوٹا ہوا تھا۔ چند سال قبل کا زمانہ ہوتا تو جوبلی میں وہی سب سے پیش پیش ہوتے۔ اس وقت علی گڑھ کی طرف رخ کرتے ان کا دل دکھتا تھا۔ کالج کے درودیوار انھیں محبوب تھے۔ خاک علی گڑھ کے ذرہ ذرہ سے انھیں شیفتگی تھی۔ گھر کے مالک کی اولاد پر اگر گھر کا دروازہ بند ہوجائے تو وہ اولاد کیسی تڑپ تڑپ کر رہے گی۔ بس یہی حال محمد علی کا تھا۔ لیکن ادائے فرض کا احساس ان کے ہاں بہرحال ہر شے پر غالب تھا۔ مسلم لیگ پر مختلف دور گزرے ہیں، اس وقت اس پر بڑے بڑے خیرخواہان سرکار برطانیہ، فلاں ''سر'' (نائٹ) اور فلاں ''خان بہادر'' اور فلاں ''سی آئی ای'' قابض تھے، اور اس اجلاس میں مسلمانوں کے نام سے بڑے اہم فیصلے صادر کیے جانے والے تھے۔ اکثر کا خیال یہ تھا کہ محمد علی اس وقت کانگریس میں پھنسے ہوئے ہیں اب کی انھیں کہاں فرصت کہ کانگریس چھوڑ چھاڑ کر کانپور سے علی گڑھ دوڑے آئیں۔ اچھا ہے وہ غائب ہی رہیں، یہاں جو جی چاہے گا پاس کرالیا جائے گا...... وقت کے وقت لوگوں نے محمد علی کو توجہ دلائی کہ آپ مسلم لیگ میں نہ شریک ہوئے تو بڑا غضب ہوجائے گا۔ میں تو جلسۂ خلافت کو ختم کر، اور کانگریس کے بھی دو ایک جلسوں میں شرکت کر کرا، کانپور سے سیدھا علی گڑھ جوبلی کے باقی پروگرام میں شریک ہونے روانہ ہوگیا۔ محمد علی دو ایک وقت بعد خدا جانے کن کن مشکلوں سے اپنا پیچھا چھڑا علی گڑھ پہنچے۔

آدھی رات کا وقت تھا اور رات آخر دسمبر کی، کڑاکے کی سردی رکھنے والی۔ مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سید محمود اور کئی صاحب ساتھ تھے۔ مشہور بیرسٹر عبدالمجید خواجہ کے ہاں میں ٹھہرا ہوا تھا، اور ان کا مکان مہمان سرا بنا ہوا تھا۔ وہیں یہ قافلہ بھی آیا اور سب کو سوتے سے جگایا۔ سیاسی مجلسوں میں اس ڈائری نویس کو زیادہ دلچسپی کبھی بھی نہیں رہی۔ خلافت کمیٹی کی صورت ایک استثنائی تھی۔ مسلم لیگ کا نہ کبھی ممبر رہا نہ کسی جلسہ میں تماشائی کی حیثیت ہی سے شریک ہوا۔ محمد علی مع اپنے دو چار ''احرار [1]'' رفیقوں کے جاتے تھے۔ واپسی پر ان ہی کی زبانی حالات سن

[1] خلافت کمیٹی کے ضعیف، مضمحل ہوجانے کے بعد اس وقت (یعنی 1925، 1926، میں) سیاسیات کے میدان میں فعال جماعت، مسلم لیگ کے مدمقابل ''جمعیۃ احرار'' ہی کے نام سے زندہ تھی۔

لیتا تھا۔ چشم دید منظر صرف ایک ہے۔ جلسہ کے اندر نہیں، جلسہ کے باہر۔ محمد علی، خواجہ صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ رات زیادہ آچکی ہے دوسرے دن جلسہ صبح ہی سے ہے۔ ریزولیوشن اسی وقت تیار کر لینے ہیں۔ احرار کی ساری پارٹی کا اصرار ہے کہ فلاں مسئلہ پر کل ایک لمبی تحریک پیش ہو۔ جس کے لیے ضرورت بھی لمبی تیاری کی تھی۔ محمد علی نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی صاحب مسودہ تو تیار کریں، پھر کانٹ چھانٹ میں کرلوں گا۔ کمرہ میں خاموشی رہی۔ پھر یہ کہا ''اچھا میں بولتا جاتا ہوں کوئی صاحب لکھتے جائیں''۔ کمرہ میں سناٹا اب بھی بدستور چھایا رہا۔ آخر میں بمشکل الہ آباد کے ایک نوجوان بیرسٹر قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھے کہ محمد علی کے املا کیے ہوئے الفاظ لکھتے جائیں۔ اور لوگ تو جا جا کر سور ہے محمد علی غریب نے خدا معلوم کب تک جاگ کر کام ختم کیا یہ نظارہ اپنی نوعیت میں انوکھا نہ تھا۔ کتنے ہی حضرات ایسے تھے جو نام اپنی پارٹی کا چاہتے تھے لیکن کام سارا محمد علی ہی سے لینا چاہتے تھے۔ اور محمد علی کی ذات گویا ایک مشین تھی، جس کو نہ آرام کی ضرورت اور نہ جس کو کبھی کوئی معذوری پیش آسکتی تھی۔

......☆☆☆......

باب:49

1:1926

(ظرف کا امتحان۔ اشتعال انگیزیاں)

شریفی سعودی جنگ شروع اگست 25 میں ہوئی تھی۔ اب جنوری 26 آ گیا، سرزمین حجاز پر تو کہنا چاہیے کہ اب ختم ہی ہو چکی تھی لیکن ہندوستان کی سرزمین پر اسی شدت اور اسی حدت، اسی جوش اور اسی سرگرمی کے ساتھ قائم، تیغ و تفنگ کے بجائے زبان و قلم سے جنگ کے پہلو جیبیوں اور اطراف در جنوں تھے، لیکن اب ایک عرصہ سے سارے نزاعات سمٹ سمٹا کر صرف دو شخصیتوں کے دامن کے نیچے آ گئے تھے۔ ایک طرف مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور دوسری طرف مولانا محمد علی۔ دنیا جس جنگ کا تماشا مزہ لے لے کر دیکھ رہی تھی وہ یہی ''پیر و مرید'' کی جنگ تھی۔ محمد علی سے جس کسی کو دل کا بخار نکالنا ہوتا جھٹ فرنگی محلی لشکر میں شریک ہو جاتا۔ فرنگی محل کے درپے جو کوئی بھی ہوتا معاً محمد علی کے جھنڈے کے نیچے آ کھڑا ہوتا۔ لیکن یہ خیال دنیا والوں کا تھا ممکن ہے فرنگی محلیوں کا ہو، خود محمد علی نے اب تک ایک دن کے لیے بھی نہ جنگ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا نہ مولانائے فرنگی محلی کو اپنے حریف مقابل کی حیثیت سے دیکھا، اور نہ اپنے کو اپنے مرشد سے آمادۂ جنگ پایا...... محمد علی کا نقطۂ نظر ہی بالکل دوسرا تھا۔ تصریح کئی بار گزر چکی دہرائی کہاں تک جائے؟

پانچ مہینے کی مدت میں کیسے کیسے انقلاب ہو گئے۔ کتنے اچھے دل برے ہو کر رہے۔ کتنے

جڑے دل ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ دوست دشمن بن گئے اور کتنے بھائی بھائیوں کی عزت کے خواہاں ہو گئے۔ لیکن خود محمد علی کی زبان پر اب تک اپنے پیر و مرشد کے معاملہ میں مہر لگی ہوئی۔ لوگ چھیڑتے، گدگداتے، ہنستے کہ اب تو مرید کسی طرح مشتعل ہو کر بپھرے، محمد علی کی زبان فرنگی محل پر کھلے، اور محمد علی کا قلم اپنے مرشد پر اٹھے۔ لیکن محمد علی نے اپنی بیسیوں تقریروں (اور ان سے کم لیکن پھر بھی بہت) تحریروں میں ایک لفظ بھی ایسا نہ آنے دیا جس سے مولانا کی توہین نکلتی ہو۔ ہمدرد میں، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کبھی اتفاق سے جب دوسروں کے قلم سے (اور ان دوسروں میں خود یہ ڈائری نویس بھی شامل ہے اور عارف صاحب چیف سب ایڈیٹر بھی) کوئی چیز اس قسم کی نکل جاتی تو علم ہونے پر محمد علی سخت ناخوش ہوتے۔ زبانی گفتگوؤں میں بھی اپنا ذاتی تجربہ تو یہی ہے کہ جب کبھی فرنگی محل کی بدزبانیوں یا زیادتیوں کی شکایت شروع کی گئی تو معاً محمد علی یہ جرح کرنے لگے کہ یہ الفاظ کس کے ہیں؟ خود مولانا کے ہیں؟ آپ نے اپنے کانوں سے ان ہی کی زبان سے سنے ہیں؟ اور جب ان سوالات کا جواب اثبات میں نہ دیا جا سکتا، تو فرماتے کہ ''بس مجھے پروا نہیں۔ کوئی کچھ بھی کہا کرے میرا معاملہ تو صرف مولانا سے ہے، کسی اور سے نہیں''......ہم لوگ پارٹی والے جب آپس میں بیٹھتے تو کہتے کہ شوکت صاحب کی طرف سے تو اب اطمینان ہے، وہ تو فرنگی محل کو خوب پہچان گئے ہیں، اب نہیں بدلنے کے، لیکن ان حضرت (محمد علی) کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ جس وقت بھی پھر اِدھر ڈھل جائیں، ان سے کچھ بعید نہیں''۔

....

بارہ بنکی کے ضلع میں دریاباد کے پڑوس میں ایک مشہور قصبہ ردولی ہے۔ یہاں سلسلہ صابریہ چشتیہ کے ایک مشہور بزرگ مخدوم شاہ احمد عبدالحقؒ کی درگاہ ایک مشہور و معروف درگاہ ہے۔ وسط جمادی الثانی میں عرس کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ زائرین، شائقین دور دور سے آتے ہیں اور فرنگی محلی خاندان کی یہ شاخ مولانا عبدالباری صاحب والی تو اپنی حاضری لازمی سمجھتی ہے۔ اس سال عرس دسمبر 25 کی بالکل آخری تاریخوں میں آ کر پڑا۔ عارف صاحب کانپور تک تو کانگریس و خلافت کے جلسوں کے لیے آ ہی چکے تھے، وہاں سے اٹھے تو سیدھے ردولی پہنچے۔ سماع و قوالی کے بڑے ہی شائق تھے۔ یہاں فرنگی محلی جماعت سے مڈبھیڑ ہوئی، جس

میں خود مولانا بھی شامل تھے۔ یہاں کیا کیا گزری اس کا پورا حال تو اللہ ہی کو معلوم، البتہ عارف صاحب جب دفتر ہمدرد واپس پہنچے ہیں تو فرنگی محل، اور خصوصاً مولانائے فرنگی محلی کی شکایتوں کا طومار زبان پر بھی تھا اور قلم پر بھی۔ ہمدرد میں ان کے قلم سے اور ایک فرضی نام سے لکھی ہوئی بڑی مفصل رپورٹ 7، 8، کالموں میں دو نمبروں میں شائع ہوئی جس میں یہ تصریحات موجود تھیں:

''......فرنگی محلیوں نے یہاں آکر کذب وافترا کا ایک جال بچھادیا......فرنگی محلیوں کی شرکت کو شرکت عرس پر محمول نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ اس دفعہ تو مولانا عبدالباری، علی برادارن اور خلافت کمیٹی کے خلاف جہاد کرنے میں زیادہ ترسرگرم رہے اور جس قدر آپ سے ہوسکا مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے خلاف خود آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے زہر اگلا اور پروپیگنڈہ کیا......مولانا عبدالباری صاحب مع دوقد وائی اور بہت سے فرنگی محلیوں کے جس وقت سے ردولی تشریف لائے اس وقت سے لے کر واپسی تک اسی جدوجہد اور سعی وکوشش میں مصروف رہے کہ خلافت کمیٹی اور اس کے جملہ ارکان کو عموماً اور علی برادران کو خصوصیت کے ساتھ طرح طرح کے غلط اور جھوٹے الزامات لگا کر بدنام کریں چنانچہ کذب وافترا کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا، جو برادران محترم کو نہ صرف وہابی بلکہ ملحد و کافر مشہور کرنے میں فروگزاشت کیا گیا......علی برادران کی نسبت کذب وافترا کا وہ طوفان بپا کیا گیا کہ الامان والحفیظ۔ اب تو علی برادران فرنگی محل کے دائرے اسلام سے بھی قریب قریب خارج ہیں یعنی اب شریفی وسعودی مسئلہ نہیں رہا بلکہ راوی معتبر کے بیان کے مطابق، بقول مولانا عبدالباری کے الحاد واسلام کا مقابلہ درپیش ہے۔ یعنی خلافت کمیٹی اور علی برادران الحاد پھیلا رہے ہیں، اور فرنگی محل اپنے ناتواں بازوؤں سے اس کا مقابلہ کررہا ہے......صرف زبانی پروپیگنڈا نہیں کیا گیا بلکہ ٹریکٹ، پمفلٹ اور ہینڈبل وغیرہ بھی کثیر تعداد میں تقسیم کیے گئے۔

عارف صاحب دہلی جنوری کے پہلے ہفتہ میں پہنچے۔ مضمون کے دونوں نمبر 12 و 13 جنوری کے ہمدرد میں نکلے۔ پارٹی والے (اور ان ہی میں یہ ڈائری نویس بھی تھا) پڑھ پڑھ کر پھڑک اٹھے۔ اور عارف صاحب کے ''قلم توہب رقم'' کی داد دل کھول کر دی (مضمون عارف صاحب کے نام سے نہ تھا صرف ''ازقلم توہب رقم'' تھا۔ عارف صاحب کے نام کا راز خود

محمد علی نے دوسرے ہی دن طشت از بام کر دیا تھا) لیکن محمد علی کے دل پر کیا بیت کر رہی؟...... کسی مرید کی ارادت وعقیدت پر اس سے سخت بار کبھی کیوں پڑا ہوگا؟ کسی دوست کی دوستی کی اتنی سخت آزمائش کبھی کا ہے کو ہوئی ہوگی؟ مولانا عبد الباری پیر ومرشد بھی تھے، اور نہایت عزیز دوست ومحبوب بھی۔ برسوں کی دوستی، سالہا سال کی محبت، مدتوں کی عقیدت، ایک عمر کا خلوص، سب کا خاتمہ ایک ساتھ ہو رہا تھا! سارے رشتے دم کے دم میں ٹوٹ رہے تھے! کون سا دل اتنے کڑے امتحان کو آسانی سے برداشت کر سکتا ہے اور پھر محمد علی جو محبت کا پتلا اور سرتاپا دل ہی دل تھا!

مولانا کو چھوڑنا تنہا ایک شخص کو چھوڑنا نہ تھا۔ ایک ہی وقت میں دینی مربی کو چھوڑنا تھا، دنیوی محسن کو چھوڑنا تھا، بہترین رفیق کار کو چھوڑنا تھا، مخلص ترین مشیر کو چھوڑنا تھا، محبوب ترین عزیز کو چھوڑنا تھا، عزیز ترین بھائی کو چھوڑنا تھا اور ان سب کو ایک ہی وقت میں چھوڑنا تھا جسم کا جان کو چھوڑنا تھا...... اس شب میں محمد علی کو نیند کیسے آئی ہوگی؟ اس دن محمد علی سے کھایا پیا کیسے گیا ہوگا؟ محمد علی نے کبھی ایک غزل کہی تھی جس کا ہر شعر مزے دار ہے۔ کہا تھا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

اس شاعری کا امتحان اب واقعات کی دنیا میں تھا۔ مرید نے مرشد کا دامن خود مرشد ہی کی فرمائش پر، اللہ کے لیے پکڑا تھا۔ آج وہی دامن اللہ ہی کے لیے ہاتھ سے چھوٹ بھی رہا تھا...... ایمان کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو دنیا کی کوئی سی بھی قوت محمد علی کو فرنگی محل سے چھڑا سکتی تھی؟

پھر عارف صاحب محمد علی کی نظر میں کوئی لاغی اور واہی راوی نہ تھے۔ ہمدرد کے سرگرم کارکن اور ذمہ دار رکن تھے۔ مالک ہمدرد کی ہوا خواہی میں بہتوں سے آگے، اور کم از کم اس وقت تک تو محمد علی کے ایک خاص معتمد علیہ تھے۔ جب وہ اپنی چشم دید شہادت جزم ووثوق کے ساتھ پیش کر رہے ہیں تو محمد علی کیسے نہ اس پر اعتبار کرتے اور کہاں تک اسے جھٹلاتے؟ خصوصاً جب کہ سارے قرائن وقیاسات اور پہلے کی سنی ہوئی حکایات وروایات اس کی عین تائید میں ہوں؟...... مہینوں کا اہتمام ضبط ختم ہوا۔ مدتوں کی وضع احتیاط رخصت ہوئی۔ اور عارف صاحب کے مضمون کا پہلا نمبر نکلتے ہی دوسرے دن خود محمد علی کے قلم سے ہمدرد میں تقریباً 5 کالموں کا مضمون ''تقاضائے وفا'' کے عنوان سے نکل گیا۔

باب:50

2:1926

(دوبدو۔کی کڑی آزمائش)

''میں نے اب تک کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب رہا کہ باوجود فرنگی محلی سرگرمیوں کے ہم لوگ اور تمام کام چھوڑ کر فرنگی محل سے بحث ومباحثہ میں منہمک نہ ہوجائیں''۔

مقابلہ شروع یوں ہوا۔لیکن ناگواری اور یاس کی حالت میں بھی اعتدال واقتصاد کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا۔آگے چل کر کہتے ہیں:

''عارف صاحب غلطی پر ہیں،اگر وہ اس پروپیگنڈا کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی رائے میں تمام کام چھوڑ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔عارف صاحب میں ہمیشہ مجھے احساس تناسب کی کمی محسوس ہوئی ہے،اور یہی وہ وجہ ہے کہ ہم ردولی شریف کے عرس کے پروپیگنڈے سے انھیں اس قدر متاثر پاتے ہیں''۔

اجمیر کا ''آل انڈیا'' عرس،عرس ردولی کے دوڈھائی ہفتہ بعد ہونے والا تھا۔عارف صاحب نے خبردی تھی کہ فرنگی محل اصل تیاریاں وہاں مقابلے کے لیے کررہا ہے اور وہاں ردولی سے بھی کہیں بڑھ کر اور کہیں زیادہ زبردست پروپیگنڈا ہوگا۔اس لیے اہل خلافت کو وہاں پہنچنا بہت ضروری۔اس پر محمد علی لکھتے ہیں اور وہی یہ لکھ سکتے ہیں:

''اجمیر شریف کے عرس میں شرکت میں اپنے لیے باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں۔ اور اگر اس آستانہ گرامی سے فیض حاصل نہ بھی ہوتا، جب بھی جہاں اتنے مسلمان جمع ہوں پہنچنا ہم جیسے خادمانِ ملت کے لیے یوں بھی بساضروری ہے۔ لیکن ہم نہ بھی حاضر ہو سکے (اور خوف یہ ہے کہ میں تو اس بار شاید محروم ہی رہوں) تب بھی خداوند کریم نے جس طرح اچانک ردولی شریف میں کذب وافترا کے تار عنکبوت کو پارہ پارہ کرنے کا سامان فراہم فرمادیا ہے، اسی طرح اجمیر میں بھی وہی مسبب الاسباب اس کا سامان فراہم فرمادے گا۔ بیت عنکبوت سب گھروں سے زیادہ کمزور ہے۔ اس کی شکست وریخت اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں''۔

بڑا اعتراض عوام (اور ان ہی میں بہت سے خواص بھی شامل تھے) کی نظر میں نقض عہد ''بیعت'' (بیعت اصلاحی) آ کر پڑ رہا تھا۔ اب کے جواب میں یہ لکھنے کے بعد کہ اسلام وخلافت ہی کے لیے ہم انگریزوں سے لڑے، جن میں پل کر ہم جواں ہوئے تھے۔ شریف سے لڑے، ترکوں سے لڑنے کو تیار ہوگئے، ہندوؤں سے لڑنے کو تیار ہیں، آخر میں لکھتے ہیں:

''اسلام وخلافت ہی کے لیے ہم نے علمائے ہند اور صوفیائے ہند سے رشتہ جوڑا تھا، اور کبھی نکث عہد کے ہم مرتکب نہیں ہوئے۔ لیکن اسلام وخلافت ہی کے لیے ہم ایک بار نہیں ہزار بار ان سے اپنے رشتہ کو توڑ دیں گے، اور صرف اسی خدا سے رشتہ جوڑے رہیں گے جس سے عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی ہم نے سوال ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُم'' کے جواب میں بلیٰ کہہ کر رشتہ جوڑ لیا تھا...... ہم اپنے پیرو مرشد کے پاس فنا فی الشیخ ہونے کی غرض سے نہیں گئے تھے، بلکہ فنا فی اللہ ہونے کی غرض سے۔ اور ہمارے لیے وہ پرانا طریقہ آج بھی موجود ہے کہ ''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللہِ وَالْیَوْمِ الآخِرِ''۔

معیار کی اس بلندی تک عام مخالفین وموافقین کیا پہنچتے۔ پارٹی والے، ادھر کے ہوں یا ادھر کے، روح کی ان گہرائیوں کو کیا پہچانتے...... اہل نظر خود دیکھ لیں کہ روح عارف صاحب کے مضمون کی کیا تھی اور سوختہ دل، تفتہ جگر محمد علی کے مضمون کی کیا۔

موسیا! آدابِ دانان دیگر اند سوختہ جاں در دانان دیگر اند

دنیا جو چاہے سمجھا کرے، جو چاہے کہتی رہے، بہر حال خود محمد علی اپنی زبان سے یہ

صدائے حق لگاتے رہے۔

'' جو کوئی ہم پر نکث عہد کا الزام لگائے، وہ میرے اس عہد کو یاد رکھے جس کو بحالت نظر بندی میں نے اپنی سب سے پہلی غزل میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

عہد اول کو بھی اچھا ہے جو پورا کردو

تم وفادار ہو تھوڑی سی وفااور سہی

اور اگر اسی زمانہ کے میرے اس شعر پر بھی نظر رہے تو برا نہیں۔

سرکش نہیں، باغی نہیں، غدار نہیں ہم

پر ہم پہ تقاضائے وفا اور ہی کچھ ہے

یہ تقاضائے وفا صرف انگریزی حکومت ہی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ ہر غیر اللہ کے مقابلہ میں ہے۔ میں نے آج تک ایک لفظ بھی مولانا عبدالباری صاحب کے خلاف نہیں لکھا اور جو کچھ مولانا صاحب کے متعلق سنا تھا کہ وہ ہمارے خلاف کہتے اور کرتے ہیں اسے کبھی باور نہیں کیا تھا، مگر......

اس ''مگر'' کے بعد فرنگی محل اور خدام الحرمین پارٹی کی چند حرکتوں کی تصریح ہے، اور اس کے بعد ''یہ وہ چیزیں تھیں جن کے بعد میں مجبور ہو کر فیصلہ کیا کہ انتظار کروں اور دیکھوں کہ مولانا صاحب جو خدام الحرمین کے صدر اور فرنگی محلی حضرات کے بزرگ ......ان کے افعالِ قبیحہ پر اظہار بیزاری فرماتے ہیں۔ یہی نہیں کہ اظہار بیزاری اب تک نہیں فرمائی گئی بلکہ......''

اس ''بلکہ'' کے بعد مزید جرائم کی تصریح ہے، یہاں تک کہ::

''اب عارف صاحب تحریر کرتے ہیں کہ رودولی شریف میں جو پروپیگنڈا کیا گیا اس میں مولانا صاحب خود بہ نفس نفیس شریک تھے''۔

محمد علی کے سینہ میں بھی آخر گوشت پوست ہی کا دل تھا، پتھر کا ٹکڑا نہ تھا۔ پیانہ صبر کیا اب بھی نہ چھلکتا؟......آگے جو کچھ لکھا ہے، روشنائی سے نہیں، خونِ دل سے لکھا ہے۔ طیش وغضب سے بگڑ کر نہیں، حزن وشکستگی سے گھٹ گھٹ کر:

''بحمد للہ میں مولانا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پیشتر بھی مسلمان تھا، آج بھی مسلمان ہوں اور انشاء اللہ ہمیشہ مسلمان رہوں گا۔ جب آٹھ برس علی گڑھ اور چار برس آکسفورڈ

میں رہ مجھ میں کفر والحاد نے سرایت نہ کی تو اب جب کہ اسلام کی خاطر میں نے علی گڑھ سے بھی منہ موڑا، اور آکسفورڈ پر بھی لات ماردی، کیا خداوند کریم مجھے کفر والحاد کی طرف لے جائے گا۔ اب موت روز قریب تر معلوم ہوتی ہے، اب تو یہی دعا ہے کہ زندگی عبادات و ریاضات میں صرف نہ ہوئی مگر موت اس آخری عبادت و ریاضت میں نصیب ہو جس کا نام شہادت ہے اور میرا شعر سچا ثابت ہو۔

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ.

(اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے دین دونیا میں تو ہی ولی ہے، مجھے اسلام پر موت دے اور صلحا میں مجھے شامل فرما)

مجھے فقط تیری خوشنودی منظور ہے۔

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

مجھ سے سب بیزار ہو جائیں مگر تو اور تیرا رسولؐ بیزار نہ ہو۔ کسی سے بھی نکث عہد ہو، مگر تجھ سے اور تیرے رسولؐ سے نہ ہو۔ دنیا بھر کی بیعتیں فسخ ہو جائیں مگر وہ بیعت فسخ نہ ہو جو سب سے پہلی بیعت ہے...... خداوند میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تجھ سے راضی ہوں اور تیرے رسولؐ پاک سے اور تیرے قرآن سے اور تیرے رسولؐ کی سنت سے۔ اے کاش تو اور تیرا رسولؐ بھی مجھ سے راضی ہو جائیں۔ اگر تیری اور تیرے رسولؐ کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو پھر کیا ہے۔ تب تو تیرا حشر ہوگا اور میں ہوں گا اور میرا یہ شعر میرا طغرائے امتیاز ہوگا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

محمد علی کو دشمن تو دشمن، دوستوں اور محبوں نے بھی زود رنج اور مغلوب الغضب کہا ہے۔ زود رنجوں اور غصہ وروں کے یہی تیور، یہی شان، یہی زبان ہوتی ہے؟ کسی کی بدزبانی

نے ''مردود الطریقت'' بھی کہہ دیا تھا۔ ''مردودوں'' کی جبین عقیدت ایسی ہی نالاں ہوتی ہے؟ حالات وحوادث تکوینی تو وہ چیزیں ہیں جنھوں نے ام المومنین صدیقہؓ اور امیر المومنین مرتضیٰ تک کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا کر کے چھوڑا، پھر محمد علی اور ان کے مرشد کی کیا بساط تھی...... لیکن کیا امیر المومنین جب ام المومنین سے مقابلہ کے لیے نکلے ہیں تو کیا ان کا دل اسے کوئی خوش آئند مشغلہ یا تفریح سمجھ رہا تھا؟ کیا طبع گرامی پر شدید گرانی نہیں محسوس ہو رہی تھی؟ محمد علی کے قلب کی حالت اس وقت کی کون بتائے؟ کون بتا سکتا ہے؟

مرید کو چھوڑیئے، مرشد کا سینہ بھی بہر حال خالی نہ تھا۔ یہ تو شاید وہ موقع تھا کہ بے حس و بے جان پتھر تک میں حرکت پیدا ہو جاتی، تو پھر یہ تو ایک مومن کا قلب، ایک صاحب دل کا دل، ایک صاحب طریق کا سینہ تھا۔ اثر کیسے نہ ہوتا؟ اثر ہوا۔ مگر وہ بات اسی سطر میں اور اسی لحہ میں کہنے کی نہیں، اس وقت تو ظاہری آنکھوں کو یہ نظر آیا کہ اثر محمد علی کی تحریر کا نہیں، عارف صاحب کے مضمون کا پڑا۔ فریقین میں ضدیں بڑھیں، جوش انتقام بھڑکا اور مقابلہ کی تیاریاں اس عظیم الشان پیمانہ پر شروع ہوئیں کہ گویا آخری اور فیصلہ کن ہی معرکہ ہو کر رہے گا۔ اب تک آویزش سپاہیوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ اب سورماؤں کے سورما، دونوں سپہ سالار، خود تلوار سونت سونت کر، ایک دوسرے کے مقابلہ کو بڑھے، ایک عظیم الشان، ہولناک اور زلزلہ افگن تصادم اب ہوا اور جب ہوا۔ ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کے ہجوم میں کوئی خوف سے لرز رہا ہے، کوئی شوق ومسرت سے مست ہو رہا ہے، لیکن منتظر سب کے سب، نگاہیں سب کی جمی ہوئی، کان سب کے کھڑے ہوئے......ادھر بندے ان سرگرمیوں میں غرق، ادھر تقدیر ایک دوسرے ہی کھیل، دردناک اور عبرت انگیز کھیل میں مصروف!

......☆☆☆......

باب:51

3:1926

(مرشد کی آخری گھڑیاں۔وصال)

7 جنوری 1926 یکشنبہ، رجب 44ھ کی غالبًا دوسری رات تھی۔ یہ ڈائری نویس لکھنؤ میں تھا اور اپنے ہاں عشاء کی نماز اول وقت پڑھ ہی رہا تھا کہ معلوم ہوا مولانا فرنگی محلی پر سہ پہر کے وقت یک بیک فالج کا زبردست حملہ ہوا اور مولانا اس وقت سے بیہوش ہیں...... مولانا کسرتی جسم کے آدمی تھے، توانا وتنومند۔ صحت بہت اچھی تھی، کھلتا ہوا رنگ اور عمر بھی پچاس سال کے اندر!...... راوی خود ایک طبیب حاذق تھے، مولانا کی حالت دیکھے ہوئے چلے آرہے تھے، فرمایا کہ حملہ بہت شدید قسم کا ہے، اور زندگی کے لیے اچھا خاصہ خطرناک!

آہ، انسان ضعیف البنیان اور اس کی تدبیریں اور ارادے! کیا کیا تجویزیں ہو رہی ہیں، کیسے کیسے منصوبے بندھ رہے تھے، اور یہ ہو کیا گیا!...... عارف صاحب کا مضمون اپنا کام کر چکا تھا، وہ کام جو اب تک کسی کے بنائے بھی نہیں بن آیا تھا، نہ چودھری خلیق الزماں کے بنائے نہ ظفر الملک علوی کے، نہ عبدالرزاق ملیح آبادی کے نہ عبدالماجد دریابادی کے۔ مولانائے فرنگی محلی سے محمد علی کو باغی و برگشتہ کرنے کی کوشش اور تدبیریں اب تک محمد علی کے خدا جانے کتنے نیاز مند اور رفیق کر چکے تھے، بعض حب علی کی بنا پر اور زیادہ تر بغض معاویہ کی بنا پر۔ کوئی محمد علی

سے فرط اخلاص و نیاز کی بنا پر، اور کوئی محض فرنگی محل کی ضد اور عداوت پر۔ لکھنؤ ان تحریکی کوششوں کا مرکز تھا اور اپنے جوار ہی کے حضرات ان کوششوں میں سرگرم۔ یہ ڈائری نویس بھی (اللہ اسے معاف کرے) ان کارروائیوں میں بڑی حد تک تو نہیں لیکن کسی درجہ میں بہر حال شریک و معین۔ محمد علی کے تعلقات محبت (''محبت'' نہ کہ عقیدت) مولانائے فرنگی محلی سے اس درجہ محکم واستوار تھے کہ کسی کی کچھ نہ چلتی...... عمر میں بالکل پہلی بار اب یہ اتفاق ہوا کہ گوشت ناخن سے جدا ہوا۔ دوست کا دل دوست سے، عزیز کا دل عزیز سے، مسترشد کا دل مرشد سے ہٹا۔ اور دل کی ٹیسیں لفظ و عبارت کا جامہ پہن کر ہمدرد کے صفحات پر نمودار ہوئیں۔ یہ کامیابی اور کارگزاری کچھ تھوڑی تھی؟ یاروں کی دیرینہ تمنا برآئی۔ عارف صاحب کو داد بھی ملی اور مبارکباد بھی، زبانی بھی اور اخباری مضمون میں بھی۔

....

حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجریؒ کا عرس اجمیر میں 6 رجب کو ہوتا ہے اور جس طرح حضرت کا مرتبہ خواجۂ خواجگان کا سمجھا جاتا ہے، اس عرس کو بھی عرس الاعراس کہنا چاہیے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا عرس شاید یہی ہے۔ معتقدین کے ہجوم عظیم زائرین کی ریل پیل، خوش عقیدگی کی حکومت، مشائخ اور پیرزادے ملک کے گوشہ گوشہ سے اکٹھا۔ علی برادران اور خلافت کمیٹی پر یورش کا موقع اس سے بہتر اور کہاں مل سکتا تھا۔ ردولی کے عرس کو اور عارف صاحب کے مضمون کو ابھی دن ہی کے ہوئے تھے۔ غصہ تازہ، جوش بے اندازہ، زخم ہرا۔ ٹھہری یہ کہ خدام الحرمین کا جلسہ عظیم الشان پیمانہ پر وہیں ہو، اور لکھنؤ اور دہلی اور بمبئی اور لاہور سب کہیں کا جمع شدہ بخار وہیں دل کھول کر نکالا جائے اور یلغار اس زور کی کی جائے کہ ان ''مردود وہابیوں'' کا نام ونشان بھی نہ رہ جائے...... اصل منصوبے تو جو کچھ بندھے ہوں گے ان کا پورا اور صحیح علم تو ان ہی حضرات کو ہو سکتا ہے البتہ کچھ اڑی پڑی خبریں ادھر کی اس کیمپ میں بھی آجاتی تھیں اور یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ ''صوفیانِ باصفا و مرشدانِ بے ریا'' نے ایکا کر کے اب کی یہ تہیہ کر لیا ہے کہ اپنی جان لڑا دیں گے، اور ناہنجاروں وہابیوں کا قلع قمع کیے بغیر دم نہ لیں گے۔ ان بدبختوں کا سردار و پیشوا محمد علی ہے، اسے زیر کر لیا تو بس فتح ہی فتح ہے۔ اسے

گرالیا تو پھر مقابلہ پر کون کھڑا رہ سکتا ہے؟

عرس کی اصل تاریخ 6 رجب تھی۔ مولانائے فرنگی محلی کا مقدمۃ الجیش کئی دن قبل روانہ ہو چکا تھا۔ مولانا بہ نفس نفیس 3 کی شام کو روانہ ہونے والے تھے کہ یک بیک سہ پہر کو یہ واقعہ فالج کا پیش آ گیا! آج کا دن خاص مشغولیت، تیاری اور اہتمام کا دن تھا۔ خادم الحرمین کی انتظامی کمیٹی کا جلسہ کئی گھنٹہ تک زور وشور سے ہو رہا تھا۔ مولانا اس کے خادم الخدام یا صدر تھے۔ حسرت موہانی سے بھی خاص مشورے ہو رہے تھے...... محمد علی سے مقابلہ آسان نہ تھا۔ شریفی فوج نے اپنے سب سے بڑے جنرل کی زندگی ہی کو داؤ پر لگا دیا! مولانا کے کان خوب ہی بھر دیے گئے تھے کہ ذرا دیکھیے تو محمد علی کی گستاخیاں مرید ہو کر شیخ سے یہ زبان درازیاں! ایسا بے ادب ہرگز کسی رو رعایت کا مستحق نہیں۔ خدا کے لیے اٹھیے اور اس ''بے دین'' و ''لامذہب'' کو ایسا سبق دیجیے کہ دنیا کو عبرت ہو کر رہے۔

....

لکھنؤ میں دوا علاج میں کونسی کسر اٹھ رہ سکتی تھی؟ بہتر سے بہتر طبیب اور نامور سے نامور ڈاکٹر جمع ہو گئے، مولانا کی خدمت اپنے لیے باعث سعادت و موجبِ نجات سمجھنے والے اور کچھ ایسے بھی سرتا سر مولانا کے ممنونِ کرم و بندۂ احسان تھے۔ مولانا کا مزاج اس قسم کا تھا کہ شفقت وکرم کا برتاؤ مرید وغیر مرید، معتقد وغیر معتقد، مخلص وغیر مخلص سب کے ساتھ یکساں رکھتے تھے۔ درفیض سب کے لیے کھلا ہوا، جود وسخا کے لیے قید نہ زمان کی نہ مکان کی۔ شام تک اچھے اچھے معالجین کا مجمع لگ گیا، وہ نازک مزاج ماہرین فن جو دوسروں کے لیے گرانقدر فیس پر بھی قدم مشکل ہی سے باہر نکالتے، یہاں بے بلائے خود ہی حاضر۔ زبانِ حال پر دعویٰ کہ۔

ہر یکے ازما مسیح عالم ست
ہر الم رادر کف ماہر ہم ست

سب نے مل کر جان لڑا دی، تیمارداری کے سامان بہتر سے بہتر موجود، عزیزوں، مخلصوں، مریدوں نے نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ بانسہ، بڑا گاؤں، سترکھ، پیار وغیرہ کے اخلاص مندوں کا نمبر فرنگی محل کے خاص عزیزوں سے بھی کچھ بڑا ہوا۔ غرض مادی تدبیریں ایک

سے بڑھ کر ایک جتنی بھی ممکن ہوئیں، سب عمل میں آ کر رہیں اور علاج اس معرکہ کا ہوا کہ اچھے اچھے رئیسوں امیروں کا بھی اس سے بڑھ کر نہ ہوسکتا تھا۔ لیکن ؎

ہر چہ کردند از علاج واز دوا
گشت رنج افزوں وحاجت ناروا

یہ فالج، طبی اصطلاحی فالج تھا کب؟......اور جو مرض تھا وہ کسی ڈاکٹر، یونانی معالج کے بس کا تھا ہی کہاں؟ ؎

بے خبر بودند از راز دروں
استعیذ اللہ مما یفترون

نبض اور قارورہ کی دیکھ بھال کرنے والے روح کی تپک کا علاج کیا کرتے، اور تھرمامیٹر کی ڈگریاں ناپنے والے دل کی کسک کو کیا پہچانتے؟ ؎

رنجش از صفرا او از سودا نبود
بوئے ہر ہیزم پدید آمد زدود

تن کی رنجوری کو سب نے دیکھا۔ دل پر جو گزر گئی تھی، اس سے باخبر کوئی نہ ہوا۔ اوپر کے زخم پر مرہم رکھنے سب دوڑے، اندر کے ناسور کا پتہ بھی کسی کو نہ چلا۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ

تن خوش است واو گرفتار دل ست

اس آزار کا درد کس کو؟ اس تڑپ کی خبر کسے؟ اس بیماری کی مثال ظاہر کی کس بیماری سے دی جائے؟ اور اس کی دوا اپنے دیس کی کس قرابادین اور ''صاحب'' کی ولایت کی کس فارما کوپیا میں تلاش کی جائے؟ ؎

نیست بیماری چو بیماریٔ دل
عاشقی پیداست از زاریٔ دل

عشق ہمیشہ لیلیٰ ومجنوں، شیریں وفرہاد، نل دمن ہی کے درمیان نہیں ہوتا شمس تبریزی اور جلال الدین رومی کی داستانِ عشق بھی آخر اسی دنیا کی سماعت میں آچکی ہے۔

....

عارف صاحب کے مضمون کا اثر سب نے دیکھا۔ محمد علی کا مضمون خونِ دل کی روشنائی اور سوزِ جگر کے قلم سے لکھا ہوا بھی آخر اسی ہمدرد میں چھپا۔ اور عارف صاحب کے مضمون سے کہیں زیادہ پڑھا گیا تھا، اس کا اثر کسی نے نہ دیکھا! پارٹی کا نام لے کر جو وار ہوا اس تلوار کی چمک سب نے دیکھی، اللہ کے نام کی گونج میں جو پھانس دل میں چبھی، گھسی، رگ جاں میں اتری، روح کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہوئی، اس پر نظر کسی کی نہ گئی۔ خدام الحرمین کے صدر کے جسم کو، زبان کو، قلم کو، سرگرم عمل سب نے پایا۔ محمد علی کے مرشد کی روح کی حرکت میں آتے، غیرت کھاتے، بیخود ہوتے کسی نے نہ دیکھا...... محمد علی کا مضمون، کوئی معمولی سطحی مضمون تھا؟ ''تقاضائے وفا'' کا تقاضا کوئی معمولی، رسمی تقاضا تھا؟ ایمان واسلام کی پکار کوئی معمولی پکار تھی؟ مضمون کی عبارتیں ابھی ایک ہی نمبر اوپر نقل ہو چکی ہیں، دل والے آج بھی پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ ان کا نتیجہ کیا نکلنے والا تھا؟ یہ پکار کیا تھی؟ پکارنے والا کون تھا؟ اور پکارا کس کو گیا تھا؟ واسطہ کس کے نام کا دلایا گیا تھا؟ مضمون 13 جنوری کے اخبار میں دہلی میں شائع ہوا، مولانا پر فالج 17 کو لکھنؤ میں گرا۔ حیرت فالج گرنے پر نہ کیجیے۔ حیرت اس پر کیجیے کہ فوراً کیوں نہ گرا، اور یہ تین چار دن کا وقفہ درمیان میں کیسے پڑ گیا؟

مولانا کا قلب کیا بالکل بے حس تھا؟ آخر ایک صاحب ایمان کا قلب تھا، ایک صاحب ارشاد کا قلب تھا، محمد علی ہی کے شیخ کا قلب تھا، روحانی رہنما کا قلب تھا۔ مولانا صاحبِ سماع تھے اور صاحبِ سوز وگداز۔ پیشہ ور قوالوں کی زبان سے کسی کا نام سن سن کر بار رہا اپنا ملبوس اور اپنا پیرہن اور اپنا عمامہ اتار چکے تھے۔ آج اسی ہیبت والے اور عظمت والے کا نام ایک اخلاص کے پتلے، سرفروش وجانباز سے سنا تھا۔ کیا جامۂ ہستی اتار پھینکنے میں اب بھی رکتے اور جھجکتے؟ محمد علی کے حلقوں سے آواز تو وہ نکلی تھی جو پتھر کو پگھلا دیتی، فولاد کو گلا دیتی، چٹان کو ہلا دیتی۔ کیا اپنے ہی مرشد کے قلب پر اتنا بھی اثر نہ کرتی؟ فرنگی محلی کے یہ آخری دور کا شیخ طریقت بزرگانِ سلسلہ کے نام پر خدا جانے کیا کچھ لٹا چکا تھا، اللہ کا نام سن کیا نقد جان کی نذر دینے میں بخل کرتا رہ جاتا؟ کیا اس کی روح خشیت سے خدانخواستہ بالکل خالی اور اس کا سینہ انابت سے بالکل بےنور تھا؟ روح تھرتھرائی، جان کپکپائی، اور ناسوتیوں نے اپنی محدود زبان میں ایک اصطلاح

فالج کی گڑھ لی۔ یہ فالج 80-70 گھنٹہ کے بعد کیوں گرا۔ حق تو یہ تھا کہ عین اسی وقت قلب ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ اسی لحہ جگر پانی پانی ہو کر بہہ جاتا۔ آنکھیں اس تحریر کے بعد کوئی دوسری تحریر نہ دیکھتیں، کان اس آواز کے بعد پھر کوئی آواز نہ سنتے۔

شمس تبریز کی قسمت میں کہا جاتا ہے کہ اپنے عاشق زار مرید و طالب جلال الدین رومی کے ایک فرزند کی تلوار سے جام شہادت پینا لکھا تھا، محمد علی کے مرشد اپنے نصیب میں محمد علی کے قلم سے اپنا شہید ہونا لکھا کر لائے تھے۔ وہ حکایت کتابوں میں پڑھی، یہ ماجرا اپنی آنکھ سے دیکھنے میں آیا...... عاشقوں کی موت وشہادت کے بھی آہ! کتنے ڈھنگ اور کتنے آہنگ ہیں! کہیں غیروں کی تلوار، کہیں اپنوں کا پیار اور شہادت زار الفت میں بلانے کے کتنے حیلے اور کتنے بہانے ہیں اور بلانے والے کے چہرہ کے کتنے نقاب!

عشق معشوقاں نہاں ست وستیر — عشق عاشق باد صد طبل ونفیر
عشق معشوقاں دو رخ افروختہ — عشق عاشق جانِ او را سوختہ
کہربا عشاق بہ شکل بے نیاز — گاہ می کوشد دراں راہ دراز
عقل حیراں کایں عجب اوراکشید — باکشش زاں سوبدیں جانب رسید!

......☆☆☆......

باب:52

4:1926

از پیکرت بساط صفائے خیال یافت
اصل تو از قرآن تو بتواں شناختن

انتقال 19 اور 20 جنوری (سہ شنبہ و چہارشنبہ) کی درمیانی شب میں ہوگیا۔ محمد علی غریب تین سو میل دور دہلی میں بیٹھے ہوئے، کچھ خبر نہیں کہ لکھنؤ میں آناً فاناً کیا قیامت گزر گئی۔ لکھنؤ سے انھیں خبر کون کرتا؟ کس کو کیا پڑی تھی؟ کرتا تو یہی ڈائری نویس کرتا۔ مخالفت کے عین شباب میں اس وقت اس فرض کا احساس کہاں؟ محمد علی کو شدید و خطرناک علالت کی اطلاع سب سے پہلے چہارشنبہ کو قریب دوپہر کے، سید جالب مرحوم کے روزنامہ ہمدم سے ہوئی۔ اسی وقت لکھنؤ تار دیا، پھر ٹرنک کال کر کے لکھنؤ کے مشہور کارخانہ دار میر احمد حسین کے ہاں ٹیلیفون پر خیریت دریافت کی۔ جواب میں انتقال کی خبر پہنچی! اناللہ...... جو لوگ محمد علی کی حساس طبیعت اور بے پناہ جذبہ شرافت سے واقف ہیں، وہی اس ناگہانی اطلاع پر ان کے غم و صدمہ کا اندازہ کر سکتے تھے۔ پیر و مرشد اور بہترین رفیق دوست کی وفات کی خبر بالکل ملی اور اب نہ کوئی گنجائش مصالحت کی باقی رہی اور نہ کوئی موقع آخری خدمت گزاری کا!
اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ محمد علی کس طرح تڑپ تڑپ کر اور کیسا کیسا تلملا کر رہے ہوں گے!

پہلی ٹرین سے مع اپنی بیگم صاحبہ کے روانہ ہو گئے اور لکھنؤ 21 جنوری پنجشنبہ صبح تڑکے پہنچ گئے۔ تدفین 20 کی دوپہر کو خاندانی قبرستان باغ ملا انوار میں ہو چکی تھی اور اس دھوم دھام اور اس

اژدہام کے ساتھ کہ لکھنؤ کی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے۔ اسٹیشن سے سیدھے قبرستان پہنچے اور مٹی کے ڈھیر سے (سنگ مرمر کا مزار تو بہت بعد کو بنا، اس وقت کچھ مٹی کا ڈھیر ہی تھا) لپٹ کر بے اختیار رونے لگے۔

بہ جنازہ گر نہ آئی بہ مزار خواہی آمد

مصرعہ شاعری کی خالی دنیا میں نہیں، واقعات کی عملی دنیا میں ایکٹ ہو رہا تھا!......اس وقت کی مصوری کون کر سکتا ہے؟ کن لفظوں میں کی جا سکتی ہے؟ دل ایک دن قبل ہی سے رو رہا تھا، اس وقت آنکھوں سے بھی چشمے ابل پڑے۔ آہ! جو قلب سرتاپا درد تھا، یکسر سوز و گداز تھا، اجنبیوں اور بیگانوں کے لیے بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا تھا، اس وقت اپنے محبوب ترین دوست کی قبر پر کھڑا تھا، اپنے مرشد کے مزار پر حاضر تھا! جذبات میں جتنا بھی تلاطم ہوتا سب بجا تھا۔ خدا جانے دل میں کتنے ارمان ہوں گے، کیا کیا آرزوئیں ہوں گی، کیسے کچھ گلے شکوے بھرے ہوں گے، کیسے کیسے راز و نیاز سینہ سے لب پر آنے کو مچل رہے ہوں گے، کتنی ہدایتیں لینی تھیں، کتنے مشورے دینے تھے۔ آہ! کہ یہ سب اب ہمیشہ کے لیے سینہ کے صندوق میں بند کے بند رہ گئے! جیتے رہتے تو کبھی محبوب صفت مرشد روٹھ جاتے، عاشق زار مرید منا لیتا۔ کبھی مرید ناز کرتا، شیخ فرط شفقت سے گلے لگا لیتے۔ یاالہ العالمین! یہ سب بات کہتے۔ پلک جھپکتے، خواب و خیال بن گیا!...... بلا وہم و گمان، بالکل دفعتاً اور اچانک۔

لکھنؤ والوں کو کچھ نوٹس مل گیا تھا۔ تین دن تو بہر حال بیماری کی دیکھ بھال، اتار چڑھاؤ میں لگ گئے۔ محمد علی بیچارہ کو تو گویا بس وہی ایک خبر یک بیک پہنچی، جس کے بعد پھر کوئی خبر نہیں رہ جاتی۔ محمد علی جذبات و محبت کا پتلا۔ حیرت ہے کہ اتنا ضبط بھی کیوں کر کر سکا صرف رونے اور لپٹنے پر کفایت کیسے کی۔ بے ہوش ہو کر گر کیوں نہ پڑا!! کلیجہ پاش پاش کیوں نہ ہو گیا!......

کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهَارُ.

جو کچھ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے غبار تھا اسے ہم دور کر دیں گے اور ان کے محلوں کے نیچے دریا جاری ہوں گے۔ (الاعراف:50)

قرآن مجید میں ایک جگہ تذکرہ اہل جنت کا ہے، آیت وہیں کی ہے۔ آیت سے بالکل ظاہر ہے کہ جنھیں جنت میں بڑے بڑے درجے نصیب ہوں گے ان میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے جو دنیا میں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔ دنیا میں ایک دوسرے کی طرف سے اپنے سینہ میں رنج وکدورت رکھتے تھے..... گویا یہ باہمی فصل وتفرقہ، کدورت ورنجش نہ لازمی طور پر ان کے کمالات روحانی وفضائل اخلاقی کے منافی ہے اور نہ انعاماتِ جنت کے۔ اور تفسیروں میں قتادہؒ تابعی کے واسطہ سے یہ روایت حضرت علی مرتضیٰؓ کی زبان سے نقل ہوئی کہ یہ آیت میرے اور طلحہؓ وزبیرؓ وغیرہم کے حق میں ہے..... اللہ اللہ! ہم ضعفائے امت کی رعایت رب کریم کو کس درجہ ملحوظ ہے اور ہماری تسکین ودل دہی کے سامان قدم قدم پر کس طرح بہم پہنچا دیے گئے ہیں۔ جب صحابیانِ رسولؐ اور ان میں بھی چیدہ وبرگزیدہ، عشرۂ مبشرہ تک اس آیت کے تحت میں آجاتے ہیں، تو چودھویں صدی ہجری کے صالحین وابرار کے لیے کیوں کڑھا جائے اور ان کے آپس کے اختلافات کتنے ہی شدید ہوں، لیکن بہرحال اگر اخلاص وحسن نیت کے ساتھ ہیں اور نتیجہ محض اختلاف فہم وبصیرت کا ہے، تو ان کے لیے درجۂ قرب ووصال سے محرومی کا اندیشہ ہی کیوں کیا جائے؟

مرشد ومرید کی جنگ ختم ہوئی حبیب ومحبوب میں وصال ہوکر رہا، ع

درمیانِ جان وجانان ماجرائے رفت رفت

صلح ہوئی لیکن سنگ مزار کے اوپر!

نزع میں لائے دلآرام کو

عید ہوئی ذوق دلے شام کو

شاعر نے روئے دلآرام کا دیکھنا حالت ''نزع'' میں بیان کیا ہے، یہاں معاملہ ''نزع'' میں نہیں، نزع کے بعد کا ہوکر رہا۔

....

کچی تربت پر فاتحہ پڑھ کر فرنگی محل آئے۔ یہاں کے فاتحوں میں شریک ہوئے۔ مولانا کے صاحبزادے تو اس وقت بالکل بچہ تھے، بھتیجے اور داماد قطب میاں صاحب کی باضابطہ جانشینی ہوئی۔ محمد علی بھی اس تقریب میں شریک رہے۔ اپنی طرف سے اور اپنے بھائی (شوکت علی) کی طرف

سے نذر پیش کی۔ ایک ایک سے ادائے تعزیت کی۔ ایک فرنگی محلی عزیز سے یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے کانوں سے سنا:

''لوگ کہتے ہیں کہ مولانا میں یہ کمزوری تھی اور وہ کمزوری تھی، میں کہتا ہوں کہ ان کمزوریوں کے باوجود بھی تو اتنی خوبیاں کسی اور میں دکھاؤ''۔

غم والم کے شدتِ تاثر میں یہ توازن مقام قائم رکھنا محمد علی ہی کا کام تھا!

پارٹی والے جب ملنے آئے تو ایک ایک کو سمجھایا کہ بس اب جنگ ختم ہوئی، پچھلی باتوں پر خاک ڈالو۔ جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ اب قطب میاں مستحق ہمدردی ہیں، ان کے ساتھ مل جل کر کام کرو، انھیں اپناؤ...... کسی نے یہ سن کر سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کہا اور کسی نے صرف سَمِعْنَا.

کسی نے صرف ظاہر کے کانوں سے سنا، اور کسی نے دل کے کانوں سے بھی۔

....

ڈائری نویس کا قلم ورق پر ورق سیاہ کرتا چلا گیا، اور اب جا کر شریفی سعودی جنگ کے صرف ایک رخ کا خاتمہ ہوا، وہ بھی جہاں تک محمد علی کی زندگی کا تعلق تھا، اور ان کی بھی صرف وہ زندگی جو براہِ راست میرے علم میں آتی رہی۔ حساب لگایئے تو 23 اگست سے 21 جنوری تک کل پانچ ہی مہینے تو ہوتے ہیں یہ روداد زندگی گویا کل 5 مہینے کی تھی! محمد علی کی تو ساری زندگی ہی مجموعۂ محاربات ہے۔ آج اس سے لڑائی، کل اس سے لڑائی۔ گورنمنٹ برطانیہ سے جنگ مسلم لیگ سے جنگ، کانگریس سے جنگ، خواجہ حسن نظامی سے جنگ، ڈاکٹر انصاری جیسے عزیز ترین دوست سے جنگ، ''یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے'' کی عملی تصویر۔ لیکن اتنی تفصیل کیا معنی، اس کی آدھی بلکہ چوتھائی تفصیل کی بھی توقع آئندہ کسی جنگ سے متعلق نہ رکھیے۔ کچھ تو اس لیے کہ یہی ایک جنگ ایسی تھی جس میں محمد علی کے ایک وفادار لیفٹنٹ کی حیثیت سے میں براہ راست شروع سے آخر تک شریک رہا۔ کسی اور جنگ میں شرکت رہی بھی تو بالواسطہ اور یا مقدار و حجم میں بہت کم۔ اور کچھ اس لیے بھی کہ اس معرکہ آرائی کی تفصیل سے محمد علی کی سیرت کے ہر پہلو پر روشنی پڑ گئی اور ان کا جوہر شرافت ہر طرح نمایاں ہو گیا۔ اب آگے ضرور کسی مزید منقبت سرائی کی نہیں...... ''ڈائری'' یوں ہی اپنے حدود ایجاز واختصار سے قدم باہر نکال کر ''حیات'' یا ''سوانح عمری'' کا بسط واطناب اختیار کرتی جا رہی ہے۔

باب:53

5:1926

(نیا دھچکا۔ خلافت کمیٹی کا مسلک)

"قاہرہ۔ 10 جنوری جدہ کا ایک تار مظہر ہے کہ ابن سعود نے حجاز کے بادشاہ ہونے کا مکہ معظمہ میں اعلان کر دیا ہے"۔

رائٹر کا یہ ذرا سا تار 13 جنوری 1926 کو ہندوستان کے سارے روزناموں میں ایک معمولی خبر کی طرح شائع ہوا۔ محمد علی کے لیے بم کے گولے سے کم نہ تھا۔ ایک مصیبت عظمیٰ کا پیام تھا۔ کیسے نہ ہوتا؟ آخر دسمبر میں کانپور میں ان کا دل سلطان کی طرف سے جو کھٹک گیا تھا، وہ اندیشے پورے ہو کر آج سامنے آ گئے! ان کی تو ایک عمر ملکیت کے خلاف جہاد کرنے میں گزر چکی تھی اور حجاز میں بادشاہت کا استیصال اور اس کے بجائے خلافت راشدہ کے نمونہ پر ایک جمہوریہ شرعیہ کا قیام ان کی رائے میں عالم اسلام کی آئے دن کی مصیبتوں کا واحد علاج تھا۔ سالہا سال کے غور و فکر کے بعد انھیں سودواؤں کی ایک دوا بس یہی نظر آئی تھی۔ استیصال ملکیت سے ان کی یہ مراد تھی کہ حجاز میں بادشاہت کسی قسم کی بھی نہ رہنے پائے بلکہ مراد صرف اس قدر تھی کہ آئندہ وہاں جو حکمران ہو، وہ اپنی ذاتی اہلیت اور شخصی صلاحیت کی بنا پر چنا جائے، اور اس اہلیت و صلاحیت کی جانچ عالم اسلام کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہو۔ یہ نہ ہو کہ چونکہ فلاں شخص فلاں خاندان کا ہے، یا پچھلے

فرماں روا کا فرزند اکبر ہے، اس لیے وراثتاً وہی حکمران بھی ہو جائے۔ خلافت راشدہ کا نام جو بار بار لیتے تھے، اس سے بھی مقصود اسی حقیقت کا اظہار تھا کہ وہاں حکمرانی نہ کسی خاندان کے ساتھ مخصوص تھی اور نہ وراثتاً باپ سے بیٹے کو منتقل ہو جاتی تھی۔

اسی ملکیت کی جڑ کاٹنے کی وہ کیسی کیسی سعی اب تک خلافت کمیٹی کے ذریعہ سے کر چکے تھے۔ خود سلطان ابن سعود کی زبان سے بار بار اس کے وعدے لے چکے تھے۔ ترکوں کے الغائے خلافت کے بعد بس اسی توقع پر جی رہے تھے اور سلطان کے ان ہی وعدوں پر بھروسہ کر کے خدا جانے اپنے کتنے پرانے رفیقوں، دوستوں، عزیزوں سے لڑائی مول لے چکے تھے۔ اب جو یہ خبر یک بیک ہر وعدہ اور ہر توقع کے خلاف آئی تو گویا زمین پیروں کے نیچے سے نکل گئی۔ دوسروں نے اس خبر کو عام خبروں کو طرح معمولی طور پر چھاپ دیا۔ اب جو سلطان کے ہم مسلک و ہم عقیدہ تھے وہ مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ ہمدرد نے جب یہ خبر چھاپی تو سیاہ ماتمی جدول کے اندر اور دو کالمی جلی عنوان۔

ایک نہایت اندوہناک خبر کے تحت اور خبر کے معابعد یہ نوٹ بھی درج تھا کہ ''ہم اس خبر بد کو جس نے ہمارے قلب کو سخت ترین صدمہ پہنچایا ہے اسی طرح شائع کرتے ہیں جس طرح کہ رائٹر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہے''۔ اور اس کے بعد کی عبارت نوٹ میں بہت جلی خط میں کر دی گئی تھی کہ ''ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہیے کہ خداوند کریم کی کارسازی پر بھروسہ رکھیں، اس سے مایوس نہ ہوں۔ جو کچھ کیا جائے، سوچ سمجھ کر کیا جائے نہ کہ حالت اضطراب و سرگردانی میں''۔

جو لوگ محمد علی کے اصل مسلک کو سمجھ چکے تھے، انھیں ہمدرد کا یہ رویہ بالکل قدرتی اور صحیح نظر آیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس مسلک کو سمجھ جانے والے تھے ہی کتنے؟

....

ہندوستان کے مسلمان، اپنے عقائد کے لحاظ سے دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک سلطان کے دوست، دوسرے سلطان کے دشمن۔ ایک وہ جو سلطان کے ہم عقیدہ تھے۔ ان کے نزدیک سلطان، سلطان اسلام تھا، مرد مجاہد تھا، غازی تھا مروان حق میں سے تھا، دین حقیقی کا محافظ و مجدد تھا، اور بدعت شکن کہ صدیوں کے مشرکانہ رسوم کو مٹا دیا۔ دوسرے وہ جو عقائد میں سلطان

کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ابن سعود وہابی تھا، ضال تھا، مضل تھا، سوگمراہوں کا ایک گمراہ تھا، کانا دجال تھا اور اس کا یہ جرم نا قابل معافی اور نا قابل تلافی تھا کہ اس نے مزارات مقدسہ کے قبے گرادیے تھے، قبور صالحین کی بےحرمتی کرڈالی تھی، قبہ شکن تھا، گور کن تھا، دشمن رسول وآل رسول تھا...... ہندوستان کے 8-7 کروڑ مسلمان کی آبادی کا جزو اعظم ان ہی دوغالی گروہوں کے درمیان تقسیم۔

محمد علی مع ایک مختصر جماعت علما کے (اور جمیعت علماء کا بھی اس وقت تک یہی مسلک تھا) ان دونوں گروہوں کے فقہی وکلامی، یا زیادہ صحیح طور پر 'فرقہ وارانہ' غلو سے بالاتر تھے۔ وہاں تو دھن ہی دوسری تھی۔ اپنی ذات سے حنفی تھے، صوفی تھے لیکن آنکھیں دیکھ رہی تھیں، اور دل رو رہا تھا کہ اسلام پر وقت کون سا آ کر پڑا ہے۔ جب حملہ عین قلب وجگر اور دماغ پر ہو رہا ہو، تو پیر کے ناخنوں کے بچانے کی فکر کون کرے گا، اور سر کے بالوں کی حفاظت کی پروا کیسے رہے گی۔ کفر والحاد کی گولیاں تو بلا تفریق وامتیاز ''وہابی'' و ''بدعتی'' ہر کلمہ گو کے سینہ پر آ کر یکساں پڑ رہی تھیں۔ اور کبھی یہ پوچھتی بھی نہ تھیں کہ ان میں ابوحنیفہؒ کا ماننے والا کون ہے اور ابن تیمیہ کا نام لیوا کون؟ معتزلی کون کہلاتا ہے، اور اپنی اشعریت پر ناز کس کو ہے؟ معراج جسمانی کے قائل کون کون ہیں اور اس کے منکر کون کون ؟ محرم میں غم امام میں سینہ کوبی کون کرتا ہے اور گیارھویں ''بڑے پیر صاحب'' کے نام کی نیاز کون دلاتا ہے؟ اندرونی اختلافات ونزاعات جو کچھ بھی ہو، فقہی وکلامی موشگافیاں، جزئیات کی جو جو شکلیں بھی دے چکے ہوں، وہاں تو محض مسلمان کا نام کافی تھا۔ جو زبان اپنے کو کلمہ گو کہے اور مردم شماری کے رجسٹر میں اپنے کو مسلمان لکھائے۔ ''فلک پیر'' کی طرح فرنگیت کا بت بے پیر تو بس اسی کا دشمن تھا، اور محمد علی اسی کا دلسوز خادم اور غمخوار ہوا خواہ۔ دل میں درد تھا تو بس اسلام کے کلمہ کا، اور تڑپ تھی تو اس کی کہ اغیار کے دستبرد سے کسی طرح محفوظ ہو کر سارا عالم اسلامی متحد ہو اور منکروں کے مقابلہ میں اللہ کا نام لینے والوں کا، اور ''لامحمد یوں'' کے مقابلہ میں محمد یوں کا ایک متحدہ محاذ قائم ہو جائے۔ جس نے اس اتحاد پر ضرب لگائی، بس محمد علی اس کے دشمن، شریف حسین کا اصل قصور یہی تھا کہ اس نے عین وقت پر خلیفۃ المسلمین سے غداری کر کے قبائے خلافت چاک چاک کردی۔ مصطفےٰ کمال کی

جوانمردی سپہ گری سب مسلم، لیکن اس کے اس جرم کو محمد علی آخر دم تک معاف نہ کیا کہ اسی سفاک نے منصب خلافت توڑ کر ہمیشہ کے لیے مرکزیتِ اسلام پر ضرب کاری لگا دی!......جس کے خیالات یہ ہوں، جو رہتا اور جیتا اور سانس لیتا اس عالم میں ہو، وہ نجدیوں کی رو رعایت کیوں کرنے لگا تھا، اور ابن سعود کی مروت میں کیسے آ کر رہتا!

....

خلافت کمیٹی محمد علی کی تحریک پر ڈیڑھ سال پہلے اپنا نقطۂ نظر سلطان ابن سعود کے سامنے یوں واضح کر چکی تھی:

''ہندستانی مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حجاز پر جو تمام دنیا سے اسلام کا مرجع ہے کوئی بادشاہ یا سلطان حکومت نہیں کر سکتا بلکہ وہاں ایک ایسی جمہوریت قائم کرنی چاہیے جو غیر مسلم اغیار کے اثر سے بالکل پاک ہو۔ ہر مسلمان کو یہ اصول مدنظر رکھنا چاہیے تا کہ جنگ و خونریزی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ ہندستانی مسلمانوں کی یہ رائے ہے کہ اس وقت اراکین حجاز کی ایک عارضی جمہوری حکومت قائم ہو جائے اور مستقل حکومت کا فیصلہ اسلامی کانفرنس پر چھوڑا جائے۔ اس لیے کہ دنیائے اسلام کو امیر کا تقرر نا قابل قبول ہے''۔

خلافت کی جس مجلس عاملہ نے یہ تجویز پاس کر کے سلطان کی خدمت میں بھیجی تھی اس میں محمد علی کے علاوہ مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر کچلو اور شعیب قریشی شامل تھے۔ ان سب کے اتفاق رائے سے 15 اکتوبر 24 کو دہلی میں یہ تجویز منظور ہوئی، اور 17 اکتوبر کو تار پر روانہ ہوئی۔ 24 اکتوبر کو اس کا جواب بھی تار پر مولانا شوکت علی کو وصول ہو گیا تھا:

''آپ کا تار پہنچا۔ آپ کے اور مسلمانان ہند کے صحیح خیالات کا شکریہ۔ جب تک حسین یا اس کے خاندان کا کوئی فرد مکہ معظمہ میں حکومت کرتا رہے گا اس وقت تک پبلک کو امن و صلح میسر نہیں ہو سکتی؟ جو کچھ واقع ہوا اس کا ذمہ دار صرف حسین ہے، جس کے افعال سے اب مکہ معظمہ کو آزادی مل گئی۔ آخری فیصلہ دنیائے اسلام کے ہاتھ میں ہے''۔

محمد علی کیا اب بھی مطمئن نہ ہوتے؟ دل خوش کہ دیرینہ آرزو کے بر آنے کی گھڑی قریب

آ گئی۔ طبیعت مسرور کہ خوش آئند خواب کی تعبیر پوری ہونے کو آئی......23 نومبر 24 کو نجد کے قاضی القضاۃ عبداللہ بن بلیہد کا روانہ کیا ہوا ایک طویل تار موصول ہوا جس میں یہ تھا کہ سلطان نے نجد سے مکہ روانہ ہوتے وقت حسب ذیل تقریر کی:

''میں مکہ معظمہ پر قبضہ کرنے نہیں جا رہا ہوں، بلکہ وہاں کے باشندوں کو مظالم اور نا قابل برداشت ٹیکسوں کی مصیبت سے نجات دلانے جا رہا ہوں......اب مکہ معظمہ میں بجز شریعت کوئی سلطان نہ ہوگا...... چونکہ مکہ معظمہ سے جملہ مسلمانانِ ہند عالم کا تعلق ہے، اس لیے وہاں کی پالیسی ابنائے اسلام کی مرضی کے مطابق ہوگی، ہم جملہ نمائندگانِ عالم اسلام کی کانفرنس مکہ معظمہ میں منعقد کریں گے، اور ہر اس مسئلہ پر ان کی رائے لی جائے گی، جس کی بدولت بیت اللہ گناہوں اور ذاتی اغراض کی تحریک سے پاک رہے......حجاز ہر شخص اور ہر نیک بندہ کے لیے کھلا رہے گا''۔

اس نے گویا اور مہر تصدیق لگا دی۔ درمیان میں سلطان کے جو بیان اس سلسلہ میں آئے یا شائع ہوئے وہ سب اسی کے موید۔ یہاں تک کہ دسمبر 24 میں جو دعوت نامہ سلطان کی طرف سے موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے جمعیت خلافت اور جمعیت علماء کے اکابر کے نام آیا، اس نے تو شک واشتباہ کی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔ طویل دعوت نامہ کے درمیان یہ عبارتیں بھی تھیں:

''میں اس خدائے برتر کی قسم کھا کر جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہتا ہوں کہ میرا مقصد حجاز پر تسلط یا حکومت کرنا نہیں ہے۔ حجاز میرے ہاتھ میں اس وقت تک ایک امانت ہے جب تک اہل حجاز خود اپنے میں سے ایسے حاکم کا انتخاب نہ کرلیں جو عالم اسلامی کی بات ماننے والا ہو، اور ان اقوام اسلامی اور طبقات ملی کے زیر نگرانی رہے، جنھوں نے اپنی غیرت وحمیتِ دینی کا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے، مثلاً مسلمانانِ ہند......''۔

ہمارا وہ مطمح نظر جس کا عالم اسلامی سے ہم نے وعدہ کیا ہے، اور جس کے لیے ہم شمشیر بکف رہیں گے مجملاً حسب ذیل ہے:

(1) حجاز کی حکومت حجازیوں کا حق ہے لیکن عالم اسلامی کے جو حقوق حجاز سے متعلق ہیں ان کے لحاظ سے حجاز تمام عالم اسلامی کا ہے۔

(2) ہم ایک استفتاء عام عنقریب جاری کریں گے جس میں حاکم حجاز کے انتخاب اور عالم

اسلام کی نگرانی کے متعلق استفتاء ہوگا۔اس کے لیے وقت کی تعیین بعد میں کی جائے گی، اور پھر ہم اس امانت حجاز کو ان اصول کے ماتحت اس حاکم کے سپرد کردیں گے"۔

......☆☆☆......

باب:54

6:1926

(خبر صاعقہ اثر)

محمد علی کیا اب اعتماد نہ کرتے؟ کیا اتنی تصریحات کے بعد بھی غیر مطمئن رہتے؟ اس وقت کے لیے تو یہ کہہ لیجیے کہ جذبات میں تلاطم تھا، آج اتنا زمانہ گزرنے کے بعد وقت کے اتنے فاصلہ کے بعد بھی ان اعلانات، ان بیانات کو پڑھ کر فیصلہ کیجیے کہ محمد علی کا اعتماد کیا کسی سادہ دلی کا، عجلت پسندی کا، بے احتیاطی کا، زود اعتقادی کا، نتیجہ تھا؟......ابھی کل ایک ہی ہفتہ تو ہوا، جب محمد علی نے یہ تار خلافت کمیٹی (زیر صدارت مولانا ابوالکلام) کی طرف سے سلطان کو دلوایا تھا:

''خلافت کانفرنس کا یہ سالانہ اجلاس (منعقدہ کانپور) آپ کو مدینہ منورہ اور جدہ میں پرامن داخلہ پر مبارکباد دیتا ہے۔......تطہیر حجاز کا شکریہ ادا کرتا ہے......ہم موتمر کی شرکت کے لیے تیار ہیں۔ براہ کرم مطلع فرمایئے، کہ اب کی حج کا موسم اس کے لیے موزوں ہوگا۔ ہم اپنے اس ریزولیوشن پر قائم ہیں جو اکتوبر 24 میں آپ کو بھیجا گیا تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اپنے ربیع الآخر کے مکتوب میں اس سے اتفاق کیا ہے''۔

یہ تار 4 جنوری 26 کو روانہ ہوا تھا۔ 11 جنوری کو سلطان کے اعلان بادشاہت کا وہ تار

آ گیا جو پچھلے باب کے آغاز میں درج ہو چکا ہے!.....کل ایک ہفتہ کے اندر یہ انقلاب روزگار!

گویا کہ دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ!

ہا! چاہا کیا تھا، ہوا کیا! سوچا کیا تھا، نتیجہ کیا نکلا! مانگا کیا تھا، ملا کیا!...... دعائیں دنوں کو رد رو کر اور راتوں کو گڑگڑا گڑگڑا کر کیا تھیں، اور وہ قبول کس طرح ہوئیں! الٹ ہی دی گئیں!

دعائیں اس کے قبل بھی، محمد علی کی قبول ہی کون سی ہوئی تھیں؟ بغداد کے لیے، سارے عراق کے لیے، بیت المقدس کے لیے، سارے فلسطین کے لیے، شام کے لیے، ریف کے لیے، ہندوستان کے لیے، ان سب کی آزادی اور تسلط اغیار سے نجات کے لیے دعائیں کون سی اٹھا رکھی تھیں؟ خشوع وخضوع میں، تفرع والحاد میں اپنی والی کوئی کسر اٹھا رکھی تھی؟......اپنے نصیب میں کسی بھی دعا کی مقبولیت لکھا کر لائے تھے؟

....

اسرار تکوینی کی اتھاہ سمندر کی گہرائیوں کو کوئی ناپ سکا ہے؟ حکمت کاملہ کے دفتر بے پایاں کی شرح بڑے بڑے دانایانِ راز ومحرمانِ اسرار بھی کر سکے ہیں؟ حکیم مطلق کے کاروبار کی تھاہ کوئی بھی پا سکا ہے؟ یعقوبؑ بن اسحاقؑ خود پیمبر برحق، پیمبر زادہ پیمبر کے باپ، پیمبر کے پوتے، ہر سمت وجہت سے پیمبری ماحول سے گھرے ہوئے، چہیتوں کے چہیتے، پھر کیا انھیں غم دل بند میں برسوں رلایا، تڑپایا، کلپایا نہیں گیا؟ یوسف بن یعقوبؑ، شاہ بھی تھے اور شاہزادے بھی، حسن وجمال کے پتلے، محبوبوں کے محبوب پھر کیا کنویں میں دھکیلے نہیں گئے۔ کنویں کی تہ میں، تہہ بہ تہہ تاریکیوں میں ایک مدت تک پڑے نہیں رہے؟ غلام ہو کر نہیں بکے؟ مشرک کی غلامی میں مدتوں نہیں رہے؟ جیل میں چوروں، قزاقوں اور خونیوں کے ساتھ بند نہیں کیے گئے۔ نوحؑ اور ابراہیمؑ، موسیٰ اور عیسیٰؑ، یونس اور ایوبؑ، سرداروں کے سردار، مخدوموں کے مخدوم، ان سب کی آزمائشیں کیا کیا نہیں ہوئیں؟ ابتلا کے کیسے کیسے سخت دورانِ پرگزر کر نہیں رہے؟ ان کی دعائیں، دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اور اخلاص وعبودیت میں ڈوبی ہوئی دعائیں، کتنی اور کیسی کیسی، پلٹ کر نہیں رکھ دی گئیں؟......عجائب کاروبار ہیں، اور عجیب سے عجیب تر اسرار! جہاں معاملات بڑوں بڑوں کے ساتھ یہ ہوں، وہاں چھوٹوں کا ذکر ہی کیا؟ اور جہاں آفتاب وماہتاب

ماند پڑے جا رہے ہوں وہاں شمع کافوری یا موم بتی زبان اپنی بے رونقی اور پھیکے پن پر کھولے تو کیا کھولے!

مارا پر دریم دشمن و ما ای کشیم دوست
کس را رسد نہ چوں و چرا در قضائے ما

کہیں عوام تک کی یہ دلد ہی کہ
اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ.
مجھے پکارے جاؤ، مجھ سے دعا کیے جاؤ، میں سب ہی کی سنتا رہتا ہوں۔
اور کہیں خواص بلکہ اخص خواص کو اس ادب کی تعلیم کہ
فَلاَ تَسْئَلْنِّ مَالَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ اِنِّی اَعِظُکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ
اس چیز کی درخواست بھی ہم سے نہ کرو، جس کی تم کو صحیح خبر نہیں، میں تمھیں نصیحت کیے دیتا ہوں کہ ایسی درخواست کرکے ناواقفوں میں نہ شامل ہو جاؤ۔
کسی کو بشارت یوں دی جاتی ہے کہ

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد یزداں مراد متقیں

گفت حق گو فاسقی و اہل صنم — چوں مرا خواندی اجابت ہا کنم
شاد باش و فارغ و ایمن کہ من — آں کنم با تو کہ باراں در چمن

اور کسی کو ہدایت یوں کی جاتی ہے کہ۔

حق بفرماید نہ از خواری اوست — عین تاخیر عطا یاری اوست
نالہ مومن ہمی داریم دوست — گو تضرع کن کہ ایں اعزاز اوست
خوش ہمی آید مرا آواز او — واں خدایا گفتن وآں راز او

محمد علی کے دل پر خبر پا کر کیا گزری ہوگی۔ امیدوں کا سارا قلعہ یک بیک دھم سے زمین پر گرتا ہوا دیکھ قلب پر بجلی سی گر پڑی ہوگی! جس کی حمایت میں بڑے بڑے پرانے دوستوں،

رفیقوں سے لڑ پڑے تھے، حسرت موہانی کا، مولانا عبدالماجد قادری بدایونی کا، فرنگی محل کا، ساتھ چھوڑنا پڑا تھا، جس کی خاطر اپنے پیرومرشد تک سے جنگ پر آمادہ ہوجانا پڑا تھا، یہ وار اس کے ہاتھ سے ہوا!......قدرت کی نیرنگیاں اور شگوفہ کاریاں دیکھیے کہ عین جس وقت محمد علی اپنے مرشد سے جنگ پر آمادہ ہوئے، اسی وقت ان پر غیبی گولہ آ کر گرا! ان کا خون دل کی روشنائی سے لکھا ہوا مضمون ''تقاضائے وفا'' 13 جنوری کے ہمدرد (ص 3 اور 5) میں نکلا اور ٹھیک اسی تاریخ کے پرچہ میں نہ ایک دن آگے نہ ایک دن پیچھے، ص 5 پر یہ ابن سعود کی اعلان ملکیت والی خبر موجود!

فطرت مسکرا رہی تھی کہ یہ بے خبر بندہ اعلان جنگ کس سے کر رہا ہے اور واقعتاً جنگ کرنی کس سے پڑے گی! اپنا حریف و مدمقابل اس وقت سمجھ کسے رہا ہے اور واقعی نکلے گا کون؟

ہمدرد میں خبر کے گرد سیاہ چوکھٹا سب نے دیکھا۔ ہمدرد کے مالک اور چیف ایڈیٹر کے صفحۂ قلب پر غم والم، حزن و یاس کے سیاہ بادل جو چھا کر رہے، ان کے دیکھنے اور پھر دوسروں کو دکھانے کے لیے کوئی آلہ کہاں سے لایا جائے؟

ہمدرد کا کام محض خبر دے دینا نہ تھا، رہنمائی کرنا بھی تھا۔ رہنما کا قلب مضطرب کہ خبر دینے کے ساتھ ہی رہنمائی کا بھی حق پورا پورا ادا کر دیا جائے۔ لیکن دماغ بیدار و خبردار کہ مجالس کے آئین وضوابط کے حدود سے قدم باہر نہ نکلیں۔ خبر کے ساتھ جو نوٹ نکلا اس کی عبارت ابھی ختم کہاں ہوں، یہ بھی تو تھی:

''ہمیں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد صدر خلافت کمیٹی کی اجازت کا انتظار ہے جوں ہی اجازت آئی، انشاءاللہ ہمدرد اور دیگر قومی اخبارات میں وہ تمام اطلاعیں شائع کر دی جائیں گی جو اب تک دفتر خلافت کو موصول ہوئی ہیں جس سے ہر شخص سمجھ لے گا کہ بحمد للہ خلافت کمیٹی بغیر کسی تذبذب یا تزلزل کے برابر اسی مسلک پر قائم ہے، جو اس نے غور و فکر کے بعد 15 اکتوبر 24 کو اس مسئلہ پر اپنا مسلک قرار دیا تھا''۔

مشہور تھا کہ محمد علی اور مولانا ابوالکلام میں صفائی نہیں، ان بن کے چرچے ایک ایک کی زبان پر تھے۔ اس شہرت کی صحت وعدم صحت سے یہاں بحث نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ محمد علی

شدید تاثر کی حالت میں بھی آئین وضابطہ کے حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ زبان سے الفاظ کی جگہ شعلے ہی نکل رہے ہوں، آئین وضابطہ کے خلاف بہر حال نہیں جاتے تھے۔ کانپور خلافت کانفرنس کے موقع پر یاد ہوگا کہ انتہائی اشتعال کے موقع پر بھی وہ مجلس مرکزی سے قدیم اودھ خلافت کمیٹی کا الحاق توڑوانے کے حق میں نہ تھے، بلکہ محض ووٹوں کی کثرت سے ان خطا کاروں کو شکست دینا چاہتے تھے۔ وہی صورت اس وقت بھی پیش آئی۔ جدہ کی اس خبر سے حددرجہ مضطرب تھے۔ چاہتے تھے کہ دل کھول کر سب کچھ ہمدرد میں لکھ ڈالیں اور ہمدرد، خلافت کمیٹی کا نہیں، ان کا اپنا اخبار تھا، اس میں وہ لکھ ڈالنے پر پوری طرح آزاد تھے۔ پھر بھی تقاضائے احتیاط اس درجہ کا تھا کہ اپنے اخبار کے لیے بھی دل پر جبر کر کے صدر خلافت کمیٹی کی اجازت کا انتظار کرتے رہے۔

......☆☆☆......

باب:55

7:1926

(پھر میدانِ رزم۔ ''پنجابی ٹولی'')

1926 مہینہ فروری کا یا مارچ کا ہے۔ اور محمد علی سے ''غیر مقلد'' مقلدین ابن سعود کی مخالفت خوب زوروں پر ہے۔ اخباروں میں سب سے پیش پیش مولانا ظفر علی خاں کا روزنامہ زمیندار ہے۔ اس کے ایڈیٹر مہر صاحب ہیں۔ دہلی میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر ہو رہا ہے۔ میں حسب معمول دریاباد سے چل کر حاضر ہوا ہوں۔ محمد علی آج کل بیمار اور زیادہ بیمار ہیں۔ لیکن اس ضعف و علالت شدید کے باوجود اپنے کو جلسہ میں کسی طرح لے آئے ہیں، اور ایک کوچ پر لیٹے ہوئے ہیں۔ جلسہ میں کوئی تجویز پیش ہوئی اور بڑی گرما گرم بحث کے بعد، صدر (مولانا ابوالکلام) نے ووٹ لینے کا حکم دیا۔ ''پنجابی ٹولی'' (یہ لقب محمد علی کا ہی کا دیا ہوا تھا) نے فیصلہ سے ناراض ہو کر ''واک آؤٹ'' (بطور احتجاج جلسہ چھوڑ دینا) کرنا چاہا۔ سب سے پہلے خود مولانا ظفر علی خاں اٹھے اور پھر ان کے صاحبزادے اختر علی خاں اور پھر زمیندار کے نفس ناطقہ مہر صاحب۔ ادھر ان تینوں صاحبوں کا اٹھنا تھا کہ ادھر بیمار و ناتواں محمد علی بھی جھٹ اپنے کوچ پر اٹھ بیٹھے اور بے ساختہ بولے:

''غضب ہوا، باپ بیٹے، روح القدس تینوں سے خفا ہو گئے''۔

یہ ایک نمونہ ہے محمد علی کی برجستگی اور حاضر دماغی کا۔ غصہ میں بھرے ہوئے ہوں، رنج میں ڈوبے ہوئے ضعیف و مضمحل ہوں، غرض یہ کہ کچھ بھی ہو، اور کسی حال میں ہوں، ذہانت ساتھ نہ چھوڑتی اور بذلہ سنجی منہ نہ موڑتی......غصہ کی حالت میں عقلیں ماند پڑ جاتی ساری دنیا کی دیکھیں، محمد علی کی ذہانت ایسے موقع پر اور چمک جاتی۔ اور برجستہ وہ سوجھ آ جاتی جو دوسروں کو غور وفکر کے بعد بھی نہ سوجھ پڑتی۔

زمیندار ابھی تک مسئلہ حجاز میں ہمدرد کا سب سے بڑا حلیف تھا، اب وہی سب سے بڑا حریف بن گیا۔ ہمدرد کے لیے تو خیر، لیکن مالک ہمدرد، یعنی ذات محمد علی کے لیے توہین، تحقیر، تعریض کا کوئی دقیقہ اس میں اٹھ نہ رہا......مخالفت کے جوش و ہیجان میں حدود کا خیال رہتا ہی کس کو ہے؟

....

خلافت کمیٹی محمد علی کی رہنمائی میں اب تک اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم تھی۔ اسے نہ وہابی حنفی قضیہ سے دلچسپی، نہ قبہ نوازی و قبہ شکنی سے سروکار۔ اس کے پیش نظر تو صرف یہ مقصد اعظم تھا کہ حجاز کس طرح بے گانوں کے تسلط سے آزاد ہو کر سارے اسلامی فرقوں کے لیے کھلا ہوا رہے۔ کسی خاص نسل و خاندان کی ذاتی یا موروثی ملکیت اسی لیے اسے بری طرح کھٹک رہی تھی۔ اور اس کے خلاف وہ سلطان سے عہد و پیمان لے چکی تھی۔ سلطان کے اعلانِ ملکیت کے بعد وسط جنوری میں ان کے نام حسب ذیل تار مولانا ابوالکلام صدر جمعیت خلافت کی طرف سے روانہ ہوا:

''ہم حیران ہیں کہ اخبارات اہل حجاز کے آپ کو بادشاہ منتخب کرنے اور نیز آپ کے اس کو قبول کر لینے کی خبریں شائع کر رہے ہیں۔ ہم متوقع تھے کہ حکومت حجاز کے مستقبل کا فیصلہ آنے والی موتمر کے ذریعہ سے ہوگا جس کو آپ نے مدعو کیا ہے۔ ہم ان غیر متوقع واقعات کے متعلق، جس نے فکر پیدا کر دی ہے، مستند اطلاع کا تشویش کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں''۔

لب ولہجہ اس سے زیادہ نرم بلکہ مؤدبانہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن زبان کی نرمی کہیں حقائق کی سختی کو، اور عبارت کی شیرینی کہیں واقعات کی تلخی کو بدل سکتی ہے؟ کس ملک نے آج تک دلائل کی قوت کے سامنے اپنے لشکر جرار کو بے ہتھیار کر دیا ہے؟ کس فرماں روا نے تاریخ کے طول وعرض

میں کہیں بھی بے قوت انجمنوں اور محض کاغذی اور زبانی زور رکھنے والی کمیٹیوں کے ڈر سے تخت وتاج سے دستبرداری کی ہے؟ فطرت بشری کبھی اتنی متواضع وخاکسار ثابت ہوئی ہے؟ ......سلطان نے حجاز میں کیا کچھ کیا یا نہ کیا، اس سے اس ڈائری کو کوئی واسطہ نہیں۔ یہاں تو ذکر صرف اس کا ہے کہ محمد علی پر اثر ان حالات کا کیا کیا پڑتا رہا۔

محمد علی ابھی کل تک چونکہ سلطان کے حامی وہمدرد تھے اس لیے "وہابی" تھے، قبہ شکن تھے، بے ادب تھے، گستاخ تھے، آستانوں اور درگاہوں کے اکھاڑ پھینکنے والے تھے، اور آج چونکہ سلطان پر معترض ونکتہ چیں تھے، اس لیے وہی محمد علی یک بیک "بدعتی" تھے، قبہ نواز تھے، گور پرست تھے، شرک کے حامی ومددگار تھے اور تطہیر حجاز کے دشمن!۔

تو کہے گبر مجھے، گبر مسلماں مجھ کو!

یا یوں کہہ لیجیے۔

از مذہب من گبر ومسلماں گلہ دارد!
وز پنجۂ من چاک گریباں گلہ دارد!

سلطان کی موافقت ومخالفت دونوں میں ہندوستان کے بے شمار مسلمانوں نے حصہ لیا۔ اچھے اچھے اکابر وقت ومشاہیر عصر اول سے آخر تک یا سعودی رہے یا شریفی، لیکن یہ امتیاز محمد علی ہی کے حصہ میں آیا کہ فتنہ کے پہلے ہلے میں ان ہی کو سب نے وہابیوں کا سالار قرار دیا اور اب ہنگامہ دوسرے دور میں بھی بدعت پسندوں کے سب بڑے سرغنہ وہی قرار پائے!...... یہ صلہ تھا اس عالم میں اس کا جس نے حق کا معیار بجائے اشخاص ورجال کے مسلک اور اصول کو قرار دیا تھا۔ محمد علی اپنے ساتھیوں اور اپنی "پارٹی" کی اس کایا پلٹ پر بجائے مضطرب ہونے کے سکون واطمینان کے ساتھ فرمایا کرتے کہ:

"کل جو لوگ ذات ابن سعود کے ساتھ تھے وہ آج بھی ابن سعود۔ کے ساتھ ہی ہیں، اور کل جو حق کے ساتھ تھے، وہ بحمد للہ آج بھی حق ہی کے ساتھ ہیں"۔

....

دن اور تاریخ تو اب یاد نہیں، مہینہ بھی خوب ذہن میں نہیں۔ 26 کی پہلی سہ ماہی شاید ختم

ہو رہی تھی جب خلافت کی مجلس مرکزی اور مجلس عاملہ دونوں کے جلسے دہلی میں ہوئے۔ مخالفت کا ہنگامہ عین شباب پر تھا۔ جلسہ سے ایک ہی دو روز قبل ہمدرد میں ایک مضمون خود محمد علی کے قلم سے پنجابی ''سعودیوں'' کے جواب میں نکلا تھا۔ مضمون میں اتفاق سے ایک ضرب المثل ایسی آ گئی تھی، جس سے مولانا ظفر علی خاں کے نام نہاد نسب پر (یعنی اس نسب پر جو مخالفین میں ان کا مشہور تھا) صاف تعریض نکل سکتی تھی۔ جلسہ کل صبح کو تھا، میں شام کو دہلی پہنچ گیا تھا۔ محمد علی کئی کئی بیماریوں میں مبتلا اور صاحب فراش۔ مسہری پر لیٹے ہوئے، میں پاس جا کر بیٹھ گیا۔ دو ہی چار باتوں کے بعد اس مضمون کا ذکر چھیڑ کے میں نے کہا کہ ''خیر اور تو سب ٹھیک تھا لیکن فلاں فقرہ سے تو صاف زد ظفر علی خاں کے نسب پر جا کر پڑتی ہے''۔ حیرت سے بولے ''یہ کیسے؟ اردو کی عام مثل ہے۔ اس میں تعریض کیسی؟'' میں نے مختصر تشریح کی۔ گھبرا گئے اور ایک شریف مسلمان کی شان سے بولے ''مجھے واللہ اس تلمیح کا آج تک علم نہ تھا آپ کی زبان سے پہلی بار سن رہا ہوں'' پھر حسرت وتاسف کے لہجہ میں کہا کہ ''اب کیا ہو سکتا ہے؟ مضمون تو چھپ چکا، معذرت چھاپوں تو بات اور زیادہ کھلتی ہے اور جواب تک میری طرح ناواقف تھے، وہ بھی واقف ہو جائیں گے''...... یہ تھی ''ضدی'' محمد علی کی حق پسندی اور شرافت گستری۔ اپنی غلطی واضح ہو جانے پر ایک بار بھی میں نے محمد علی کو بات کی پچ کرتے اور معذرت میں تامل کرتے نہیں دیکھا۔ پوری کشادہ دلی کے ساتھ ایک ایک سے عذر خواہی پر تیار ہو جاتے ہیں اور یہی وصف ان کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم ومغفور میں بھی تھا۔

دوسرے دن شام کو مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا۔ پانچ سات ارکان کی ایک مختصری کمیٹی۔ صدر جلسہ پنجاب کے ایک نامور اہل حدیث مولوی عبدالقادر صاحب قصوری (ان کی یہ ''اہل حدیثیت'' ذہن میں رکھیے) تذکرہ کمیٹی میں اسی مضمون کا آ گیا۔ موصوف نے محمد علی کی ہوا خواہی کے لہجہ میں کہا کہ ''زمیندار کی بدزبانیاں مسلم، لیکن آپ بھی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ابھی اسی مضمون کے فلاں فقرہ کا آخر کیا مطلب تھا'' محمد علی بولے ''مجھے اس تلمیح کی مطلق خبر اس وقت تک نہ تھی، یہ تو کل شام کو عبدالماجد دریابادی نے آ کر بتایا۔ میں یہ قرآن مجید کی قسم کھا کر کہتا ہوں''۔ قصوری صاحب بڑے دیندار اور ذی علم تھے، بات کاٹ کر کہا ''لیکن خود قرآن کی قسم کھانا بھی تو جائز نہیں''۔ محمد علی بجلی کی

سرعت کے ساتھ چمک کر بولے ’’اچھا حدیث کی قسم سہی‘‘......یہ فقرہ کیوں کسی اور کو سوجھنے لگا تھا! کوئی مسکرا دیا، کوئی ہنس پڑا، لطف سب نے لیا! ایسے ایسے لطیفے اور چٹکلے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، خدا جانے کتنے گویا محمد علی کی جیب میں پڑے رہتے تھے۔

......☆☆☆......

باب:56

8:1926

(دیوانۂ خلافت۔ "غیر مقلد غیر مقلدین ابنِ سعود")

عملی سیاسیات سے میں علی العموم کنارہ کش ہی رہا ہوں۔ 24 کے آخر تک میں کسی سیاسی کمیٹی کا ممبر نہ تھا۔ محض ایک تماشائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ 25 میں محمد علی ہی کی رفاقت اور کشش کھینچ کر اس حلقہ کے اندر لائی۔ شرکت کی تبلیغ زبانی گفتگوؤں میں بارہا کرتے رہے تھے۔ اکتوبر 25 میں مرکزی خلافت کمیٹی کا ممبر منتخب ہوا۔ خلافت کمیٹی کا عروج اس وقت تک ختم ہو چکا تھا۔ اس پر بھی مرکزی ممبری ایک بڑے اعزاز کی چیز تھی۔ نومبر 25 میں لکھنؤ کے کارکنان خلافت، خصوصاً چودھری خلیق الزماں نے یک بیک صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹی کی صدارت کا بار سر پر رکھ دیا۔ مرکزی صدر اس وقت تک حکیم اجمل خاں صاحب تھے۔ اواخر دسمبر 25 میں ان کے جانشین مولانا ابوالکلام ہوئے۔ 26 میں مرکزی خلافت کے جلسے متعدد ہوئے۔ اکثر دہلی میں اور ایک آدھ لکھنؤ میں۔ صدر دفتر بمبئی میں تھا اور مولانا شوکت علی جنرل سکریٹری تھے۔ لیکن جلسوں کے لیے سہولت کے خیال سے کوئی مرکزی مقام ہی اختیار کیا جاتا تھا۔ تقریباً ہر جلسہ میں شرکت کا اتفاق ہوا اور اس پرقوت اور اسلامی ہند کے عظیم الشان ادارہ کی کارفرمائیوں کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔

محمد علی کی حیثیت ضابطہ سے بس ایک ممبر کی تھی ۔ نہ صدر تھے، نہ سکریٹری نہ اور کچھ۔ لیکن عملاً ساری مجلس کی رہنمائی کی باگ، دیکھنے میں آیا کہ ان ہی کے ہاتھ میں تھی ۔ اصول میں بھی، فروع میں بھی ۔ یعنی جمعیت کا مسلک عموی (پالیسی) بھی وہی مقرر کرتے تھے، اور پھر اس کے بڑے جزویات بھی ان ہی کے چلائے ہوئے چلتے تھے ۔ یہ نہیں وہ اوروں کی سنتے نہ ہوں اور یہ تو اور بھی نہیں کہ لوگ ان کے سوا کسی اور کی سنتے نہ ہوں، یا ممبر صاحبان سب اپنی اپنی سناتے نہ ہوں، بلکہ سب سر جھکائے چپکے سے ان کی ہر بات کو مان لیتے، یا کم از کم یہ کہ ادب واحترام کے ساتھ سن ہی لیتے تھے ۔ جی نہیں، یہ کہاں؟ اس کے بالکل برعکس اور توقع اور اندازہ کے برخلاف، ان آنکھوں نے تو یہ دیکھا کہ ان کی مخالفت بات بات پر ہو رہی ہے اور ان کی راہ میں رکاوٹ قدم قدم پر پیش کی جا رہی ہے ۔ لیکن اب ان کی زبردست قوتِ استدلال کا کرشمہ سمجھیے، یا ان کی حق گوئی ودیانت کا ثمرہ کہیے ۔ یا ان کی وجاہت وشخصیت کا اثر قرار دیجیے بہر حال ہوتا بالآخر عموماً وہی تھا جو ان کی رائے ہوتی اور رہنمائی تقریباً ہر موقع پر ان ہی کی صحیح قرار پاتی...... جمعیت خلافت کا روح رواں، عرف عام میں شوکت علی کو سمجھا جاتا تھا اور یہ ایک حد تک صحیح بھی تھا ۔ ضابطہ سے سکریٹری بھی وہی تھے لیکن اسی 26 میں مرکزی کے جلسے ایسے بھی ہوئے ہیں جن میں شرکت تک سے مولانا شوکت علی معذور تھے (ایک بار تو ہندوستان کے باہر برما اسی خلافت ہی کے کام سے گئے ہوئے تھے) اور اس سے جلسہ میں کوئی خاص فرق محسوس ہی نہ ہونے پایا ۔ برخلاف اس کے محمد علی کے بغیر مرکزی کا کوئی جلسہ قابل عمل تو کیا ہوتا، قابل تصور بھی مشکل سے ہی تھا! بغیر ان کے محفل سونی، جلسہ میں سناٹا۔ ادھر وہ آئے اور ادھر جیسے جلسہ میں جان پڑ گئی اور اداسی اور افسردگی کی جگہ رونق، تازگی، شگفتگی اور چہل پہل نے لے لی ۔ زبان پر قابو دل کے جذبات نے باقی ہی کب رہنے دیا تھا ۔ جو کچھ جس کے متعلق دل میں ہوتا، سب بے دھڑک، بے جھجک زبان پر لے آتے اور اس میں لحاظ نہ دوسرے کے جذبات کا رکھتے نہ اپنے وقار کا، وقت ایسے موقع پر سب سے بڑھ کر غریب صدر جلسہ کو پیش آتی تھی ۔ نہ یہ ہمت کہ محمد علی کو بولنے سے روکے نہ اس کی سکت کہ جو کچھ محمد علی چاہیں، وہ انھیں کہہ لینے دے ۔

یہ اثر و اقتدار خود بخود یا زبردستی نہیں پیدا ہو گیا تھا۔ محمد علی تحریک خلافت کے پیچھے، اس کے نظام مجلس کے پیچھے، اپنے کو فنا بھی تو کیے ہوئے تھے۔ کانپور کے جلسہ عام میں دیکھا، لکھنؤ کے جلسہ عام میں دیکھا اور دہلی، کانپور، لکھنؤ کے مرکزی جلسوں میں بار ہا دیکھا کہ فلاں اور فلاں لیڈر صاحبان، اور حد یہ ہے کہ خود صدر صاحب اچھے خاصے ہٹے کٹے، اپنے کمرہ میں یا اپنے خیمہ میں خوش گپیاں فرما رہے ہیں اور چند قدم اٹھ کر جلسہ میں تشریف نہیں لا رہے ہیں! خیالی علالتوں کا بنا بنایا عذر ایسے موقع پر خوب کام دے جاتا تھا..... محمد علی غریب کے لیے ایسی کوئی صورت ممکن ہی نہ تھی۔ خود بیمار ہوں، محبوب ترین عزیز یا عزیزہ بیمار ہو، جلسہ کا وقت شدید سردی میں آدھی رات کا ہو، سخت گرمی میں ٹھیک دوپہر کا ہو، بہر حال جلسہ میں پہنچ ہی جاتے بیماری میں صاحب فراش ہو گئے تو جلسہ یا تو گھر ہی پر طلب کر لیا یا پھر جلسہ گاہ تک کسی طرح گرتے پڑتے پہنچ، کوچ پر لیٹ گئے۔ پیسہ پاس نہ ہوا تو کہیں سے قرض دام کر کے ریل کا کرایہ دیا لیکن پہنچے ضرور، اور غیر حاضری نہ ہونے دی..... اتنی فنائیت، یہ اخلاص مندی کہیں بالا بالا جا سکتی تھی؟ اس کا اثر دوسروں پر کیسے نہ پڑتا۔ موافقین کو چھوڑیے مخالفین تک اس سے غیر متاثر نہ رہتے۔

....

فرنگی محل اب ساتھ تھا۔ گو مولانا عبدالباریؒ کے اٹھ جانے کے بعد اب فرنگی محل خود ایک جسد بے روح تھا۔ مولانا عبدالماجد قادری بدایونی، حسرت موہانی اور بہت سے بچھڑے ہوئے دوست اب پھر آ ملے تھے لیکن اس کے مقابلہ میں خدا جانے کتنے اور جڑے ہوئے دل اب ادھر سے ٹوٹ بھی چکے تھے۔ اسلامی ہند قضیۂ نجد و حجاز کو اب تک حرب عقائد کا ذریعہ بنائے ہوئے تھا۔ محمد علی نے لاکھ سمجھایا ملکیت و جمہوریت کی بحث کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی۔ بس گھوم پھر کر وہی وہابیت اور ہدف مزارات کا قصہ۔ محمد علی نے سلطان کا ساتھ یہ سمجھ کر دیا تھا کہ وہ جمہوریۂ اسلامی قائم کریں گے اور اب جو ساتھ چھوڑا وہ اس لیے کہ وہ توقع باطل ثابت ہوئی۔ پہلے ہندوستان کے اہل حدیث خوش ہوئے تھے اور مشائخ ناراض۔ اب مشائخ کی خوشی کی باری اور اہل حدیث کی خفگی کی۔ اس وقت خفگی میں سب سے پیش پیش پنجاب

تھا۔ مرکزی کے جلسوں میں ارکان پنجاب خاصی بڑی تعداد میں متحد و متفق ہو کر آتے، اور بزم میں جلوہ اچھا خاصہ میدان رزم کا نظر آ جاتا۔

ایک روز جلسۂ مرکزی سے قبل شام کو دہلی پہنچا۔ محمد علی پلنگ پر لیٹے ہوئے بیماری سے کراہ رہے تھے۔ پنجاب کے مشہور مولوی ظفر علی خاں صاحب کے رویہ سے شدید بیزاری کا اظہار تلخ و تند لہجہ میں ہمدرد میں کر چکے تھے۔ میری ہمت تنہا عرض کرنے کی تو پڑتی بھی نہ، میں نے ڈاکٹر سید محمود [1] اور مولانا محمد عرفان [2] اور مولانا حسین احمد صاحب کو پہلے سے ہموار کر کے انھیں اپنے ساتھ لے لیا اور ان کی تائید کے ساتھ ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ ''اتنی سختی مناسب نہیں، جبکہ آپ کی تحریک خلافت خود ہی اتنی سست پڑ چکی ہے اور لوگ خود ہی ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں۔'' محمد علی ان سب کے خلوص کے قائل تھے اور مولانا حسین احمد صاحب کے تو اس وقت تک معتقد ہی تھے لیکن اب ان کا جوش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے تو جواب کچھ یوں ہی سا سرسری دیا لیکن مولانا پر ابل ہی پڑے، لیٹے سے اٹھ بیٹھے اور چمک کر بولے:

''مولانا آپ نائب رسول ہو کر مجھے مشورہ نرمی یا مداہنت کا دے رہے ہیں! میں مداہنت برتوں قوم کے غداروں کے ساتھ؟ کیا آپ ہی نے اپنے وعظوں میں بارہا حضرت عمرؓ کا یہ اسوۂ حسنہ بیان نہیں فرمایا ہے کہ انھوں نے عین معرکۂ جہاد و قتال میں مسلمانوں کے سب سے بڑے سپہ سالار خالد بن ولیدؓ صحابی رسول کو ایک دم سے معزول کر دیا؟ آپ کے اصول پر تو خلیفہ ثانی کی بھی یہ سختی اور بیجا سختی تھی۔ میں مرتے مرتے مر جاؤں گا لیکن کسی کو کسی مصلحت سے بھی قومی غداری پر معاف نہیں کروں گا۔ سب میرا ساتھ آج چھوڑ دیں، میں نے کام ساتھیوں کے بھروسہ پر نہیں اللہ کے بھروسہ پر شروع کیا تھا۔ اسے منظور ہو گا تو وہ نئے ساتھی پیدا کر دے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں وقتی مصلحت سے مداہنت برتنے لگوں۔ جسم کا جو عضو فاسد ہو جائے، اسے کاٹ ہی ڈالنا چاہیے۔

1 موجودہ وزیر صوبہ بہار۔ اس وقت تک تحریک خلافت کے صف اوّل کے لیڈروں میں تھے (جنوری 1952)

2 ان کا نام بھی ان صفحات میں بار بار آ رہا ہے۔ محمد علی کے مخلص ترین رفیقوں میں تھے۔ ہزارہ (صوبہ سرحد) کے باشندہ۔ اس وقت جمعیۃ العلماء (دہلی) کے رکن رکین اور غالباً سکریٹری تھے۔ بعد کو بمبئی منتقل ہوئے اور مرکزی خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہوئے۔ اب مدت ہوئی مرحوم ہو چکے ہیں۔

یہ آوازۂ حق سن، سب دم بخود ہو گئے...... یہاں اس حکایت کے نقل کرنے سے مقصود یہ نہیں کہ محمد علی کی رائے خواہ مخواہ صحیح وصائب ہی تھی۔ مقصود صرف ان کی حرارت ایمانی اور جذبۂ دینی کو دکھانا ہے۔ ظفر علی خان بھی علی گڑھ ہی کے گریجویٹ تھے اور مولانا شوکت علی کے ہم سبق۔ محمد علی کا ان کا پرانا یارانہ، محمد علی انھیں عزیز ہی نہیں اپنے بڑے بھائی کی جگہ پر سمجھتے تھے لیکن یہاں معاملہ مفاد ملت وفلاح امت کا آیا۔ محمد علی نے آنکھیں ہر ذاتی دوستی ومروت کی طرف سے پھیر لیں جس چیز کو انھوں نے حق سمجھ لیا بس اس کے آگے کوئی نہ ان کا دوست تھا نہ عزیز...... جو شخص اس غم اور ان فکروں میں ہر وقت گھلتا رہتا ہو، وہ جی کب تک سکتا تھا؟ خلاف توقع اور حیرت انگیز اس کا جلد مر جانا نہیں بلکہ اتنے دنوں تک جیتا رہنا تھا!

باب: 57

9:1926

(سیرت کے اصلی جوہر)

ایک روز دو پہر کا کھانا ہو رہا تھا۔ دستر خوان پر کئی عالم و فاضل اور متعدد بزرگانِ ملت، سب اس وقت تک محمد علی کے مخلص اور بے تکلف جمع تھے۔ اور ایسا اجتماع محمد علی کے دستر خوان کے لیے کچھ انوکھا نہ تھا۔ مسئلہ تصویر کشی اور فوٹو گرافی کا چھڑا۔ محمد علی مسائل فقہ میں حنفی تھے لیکن ''مقلد'' ہونے کے باوجود حق اجتہاد اپنے لیے اور ہر مسلمان کے لیے بھی محفوظ رکھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ:

''کسی ماہر خصوصی (اسپیشلسٹ) کے قائل و معتقد ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اسے محفوظ عن الخطا سمجھ لیا جائے۔ اور اس کے ہر ہر جزئیہ پر یکساں ایمان لانا لازم رہے۔ یہ تقلید تقلید جامد ہے۔ امام ابو حنیفہؒ بیشک بہت بڑے فاضل، بہت بڑے مجتہد، بڑے زیرک و دانا، عاقل و فہیم تھے لیکن باوجود اس کے ہوسکتا ہے کہ جہاں ہزار میں سے 999 مسائل میں ان ہی کا اجتہاد صحیح ہوگا، وہاں ہزار ویں مسئلہ میں مجھ جیسے عامی کا۔ معصوم و غیر خاطی ہونا تو صرف رسول کی شان ہے''۔

خیر معاملہ اس عقیدہ ہی تک رہتا تو غنیمت تھا لیکن محمد علی عمل میں بھی متعدد مسائل میں اپنی

ذاتی تحقیق و اجتہاد پر کار بند تھے۔ اور ان ہی میں سے ایک مسئلہ تصویر کا بھی تھا۔ تصویروں کے بڑے شائق تھے، اور شائق ہی نہیں، نقاد و مبصر بھی تھے۔ ''آرٹ'' کی اس شاخ (مصوری ونقاشی) پر ایسی مبصرانہ تنقید کرتے کہ اچھے اچھے ماہرین فن پھڑک اٹھتے۔ سب کمروں میں تصویریں لگا رکھی تھیں۔ بعض بڑی بڑی قیمتی بھی۔ اور ڈرائنگ روم تو پورا نگارخانہ ہی تھا۔ یہاں تک کہ انگریزی مذاق کے ماتحت بعض تصویریں نیم عریاں بھی...... محمد علی کے تذکرہ میں یہ کبھی نہ بھولیے کہ وہ اتنے جوش دینی اور جذبۂ ایمانی کے باوجود بہر حال تھے علی گڑھ اور آکسفورڈ کے گریجویٹ، اور سالہا سال کی مدت دونوں جگہ گزارے ہوئے......
''صاحبانہ'' مذاق کے دوسرے لوگ ایسی تصویریں اپنے نج کے کمرہ (خواب گاہ یا بیڈ روم) میں لگاتے ہیں۔ محمد علی کے ہاں چرانے چھپانے کا گزر کہاں۔ راز داری و اخفا کی تو کوئی مد ہی ان کے ہاں نہ تھی۔ عیب و ہنر جو شے بھی تھی، کھلے خزانہ اور علانیہ رہتی۔ یہ تصویریں بھی ان کے دفتر کے کمرہ اور ڈرائنگ روم میں لگی رہتیں۔ اور ان پر ہر آئند و روند کی نظر پڑتی رہتی۔ تصویروں کے اس فاحشانہ پہلو پر جب کبھی میں کچھ عرض کرتا تو محمد علی برابر یہ کہہ کر میری زبان بند کر دینے کی کوشش کرتے کہ:

''یہ تصویر بھی کیا کسی بیسوا یا ایکٹرس کی ہیں؟ یہ تو فلاں فلاں تاریخی شخصیتوں کی ہیں۔ فلاں تصویر فلاں اہم موقع کی ہے۔ ہرگز ان میں جذبات شہوانی کے بھڑکانے کا کوئی پہلو نہیں۔ یہ تو آرٹ (فنکاری) کے بہترین نمونے ہیں''۔

....

دہلی میرا جب جانا ہوتا تو ایک آدھ جھڑپ اسی مسئلہ تصاویر پر ہو جاتی۔ فقہاء کے دلائل اور اصول فقہ کے باقاعدہ مطالعہ تو انھیں کبھی ملا نہ تھا لیکن میرے ''تقلیدی'' معروضات کے جواب میں اپنی ذہانت کے زور سے کچھ نہ کچھ ''اجتہادات'' کر دیتے اور حدیث جب میں کوئی پیش کرتا تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کر دیتے۔ غرض میری ایک نہ مانتے۔ اور ان کا یہ معاملہ تنہا مجھ عامی ہی کے ساتھ نہ تھا، جن لوگوں کے علم وفضل کے وہ قائل و معترف تھے مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی، ان کے ساتھ بھی یہی حال تھا...... ہاں تو جس روز دسترخوان پر یہ منتخب

مجمع جمع تھا میں نے چھیڑ کر یہی مسئلہ نکالا۔ گفتگو بڑھی۔

محمد علی کیا چپ ہونے والے تھے۔ سب سے مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک ایک کو جواب دے رہے تھے۔ بازی ہرتی ہوئی دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ:

''اچھا جائز ناجائز کی بحث چھوڑیے، مباح وحرام کو جانے دیجیے، اس پہلو کو لیجیے کہ جن لوگوں کی آپ دل سے عزت وحرمت کرتے ہیں انھیں آپ کے اس عمل سے تکلیف اور ناگواری ہوتی ہے۔ بس ان کے رفع اذیت ہی کے خیال سے اسے ترک کر دیجیے۔ بولے''اتنی خاطر تو بس مجھے ان مولانا (حسین احمد صاحب) کی عزیز ہے''۔ ان سے نہایت درجہ محبت ویگانگت اس وقت تک تھی۔ کراچی حوالات اور جیل میں ان کا ساتھ 21 میں رہ چکا تھا۔ ان کی زندگی سے بہت متاثر تھے۔ میں نے عرض کیا کہ ''اچھا، مولانا ہی کی خاطر سے''۔ فرمایا

''ہاں منظور۔ لیکن وہ بھی اپنی زبان سے یہی کہہ دیں۔ فقہی دلائل وغیرہ نہ پیش کریں، وہ مجھے معلوم ہیں۔ میں جوابات دینا شروع کر دوں گا۔ بس صرف اتنا کہہ دیں کہ میری خاطر سے انھیں اتار دو''۔

مولانا کو اس کار خیر یا کلمۂ خیر میں کیا تامل ہوسکتا تھا۔ زبان سے وہی فقرہ فرما دیا۔ اور بیسیوں تصویریں، صدہا نہیں شاید ہزار ہا کی مجموعی قیمت کی کیسی کیسی نفیس وشاندار اسی آن کمرہ کی دیواروں سے اتر گئیں۔ یہ نہ پوچھیے کہ کس دل سے محمد علی نے ان کے اتارنے کا حکم دیا۔ اور اس میں کتنا شدید مجاہدہ ان کے نفس کو کرنا پڑا۔ لیکن بہر حال تھے قول کے پکے، زبان دے چکے تھے، جو کہا تھا پورا کر دکھایا۔

....

خط وکتابت محمد علی سے پابندی کے ساتھ جاری نہ تھی۔ خط ان کے دلچسپ اور پر مغز سب ہوتے۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ لیکن آتے ہی بہت کم۔ پابندی کے ساتھ جواب دینا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ وقت ہی اتنا بیچارہ کو کب نصیب ہوتا۔ مختصر لکھنے کی عادت نہیں، مفصل لکھنے کی فرصت نہیں، بس اسی میں خطوط کے جوابات ٹلتے رہتے۔ فروری 26 میں کئی باتیں اکٹھی ہوگئی تھیں، خط لکھنا گزیر ہوگیا...... ہندستانی اکیڈمی کے نام سے ایک نیا ادارہ صوبہ حکومت کی سرپرستی

میں نیا نیا کھل رہا تھا۔ ارکان اردو اور ہندی دونوں کے اچھے اچھے لکھنے والے منتخب ہو رہے تھے۔ ایک سوال تو اس کے متعلق کرنا تھا کہ اس سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ کی ممبری قبول کرنے کے باب میں آپ کا کیا حکم ہے؟ اگر میں نے انکار کیا تو کوئی گورنمنٹی آدمی منتخب ہو جائے گا، جگہ تو بہرحال خالی رہے گی نہیں۔ دوسرے اودھ خلافت کمیٹی کے بارے میں لکھنا تھا کہ اب تک اس کی سب چیزیں فرنگی محل کے قبضہ میں ہیں، ان حضرات کو لکھیے کہ ہم لوگوں (جدید عہدے داروں) کے حوالہ کر دیں۔ تیسرے ہمدرد کے اسٹاف کے ایک نوجوان کے لیے عرض کرنا تھا کہ حکیم اجمل خاں کے ذریعہ سے انھیں یورپ جانے کے لیے حیدرآباد سے سرکاری وظیفہ دلوا دیجیے...... خط گیا اور جواب مولانا کے بھانجے عثمان علی خان جنرل مینجر ہمدرد ہمدرد پریس کے ہاتھ لکھا ہوا موصول ہوا:

''13 فروری 26 کوچۂ چیلان، دہلی

محترم مولانا صاحب! السلام علیکم

گرامی نامہ ماموں صاحب قبلہ کے نام موصول ہوا۔ 11 فروری سے صاحب فراش ہیں، بخار رہتا ہے، ہلکا ہو جاتا ہے مگر اترتا بالکل نہیں۔ اپنے آپ خط لکھنے سے معذور ہیں اس لیے میں ماموں صاحب کی جانب سے لکھتا ہوں۔

(1) دنیا میں اگر کوئی چیز ہے جو انسان کو اس کے مصداق بنائے تو وہ اصول پرستی ہے۔ ہم نے بہت سی چیزیں اسی اصول پرستی کی وجہ سے چھوڑ دیں۔ یہ چیزیں ہمارے لیے Temptations[1] ہیں۔ ان ہی سے ہم کو بچنا ہے۔

ان ہی کو چھوڑ کر ہم نے دیگر معاملات میں نااہلوں کو جگہ لینے دی۔ پھر اگر آج نااہل مسلط ہو جائیں گے تو کیا ہے۔ بالکل شراب کی سی حالت ہے نفع سے زیادہ مضرت اس میں ہے۔ لہٰذا کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ یہ میری صرف رائے ہے۔ ''حکم'' صرف خدا کے لیے زیبا ہے۔

(2) خلافت کمیٹی کے متعلق قطب میاں کو خط جا رہا ہے۔

(3) '' کے متعلق میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ حریص زیادہ ہیں۔ جس منزل پر آپ کو وہ پہنچانا

---

1. ترغیبات۔ فتنہ یا جال ''ہم'' سے مراد اس سیاق میں خادمان خلافت و تارکین موالات ہیں۔

چاہتے ہیں اس کی اہلیت بالکل نہیں۔ صرف خواہش سے کام نہیں چل سکتا۔ حکیم صاحب کا حیدرآباد میں کوئی اثر نہیں البتہ اگر میں مجبور کروں تو ضرور لکھ دیں گے۔ مگر میرے لیے یہ ایک قسم کا جھوٹ بولنا ہوگا جسے میں جائز نہیں رکھتا۔ اب تک جو مواقع آئے، میں نے ان کو کچھ ترقی کرتے نہیں پایا۔ اب تک مزاج میں لڑکپن ہے۔ کامن سنس [1] بالکل نہیں ہے جس سے کچھ کام لیں۔ مواد جمع کر دیا جائے جب بھی اخذ نہیں کرتے۔ شام کے متعلق ان کو ٹکٹکو دیے تھے، تمام پوائنٹس بتلا دیے تھے مگر جب مضمون لکھ کر لائے تو کچھ بھی نہ تھا۔ چنانچہ خود ایک مضمون لکھ کر بتا دیا کہ اس نہج پر لکھو، مگر پھر بھی اب تک مکمل مضمون نہ دے سکے، دو مرتبہ مضامین پھیر چکا۔ اب اس تیسری مرتبہ لائے تو میں بیماری کے سبب نہ دیکھ سکا۔ آج کسی وقت دیکھوں گا، بشرطیکہ بقیہ مضمون انھوں نے دے دیا۔ میں ان کی ترقی کا خواہاں ہوں اور دل سے، مگر آپ جانتے ہیں کہ جرنلزم (صحافت) کے لیے صرف قلم ہی درکار نہیں اس لیے جو باتیں درکار ہیں وہ آپ پر بخوبی روشن ہیں۔ اس لیے کہ آپ خود بھی اس خارستان کے بادیہ پیما ہیں۔ دعا کیجیے کہ خدا ہم سبھوں کو صراط مستقیم پر قائم رکھے۔

محمد علی

......☆☆☆......

1. عقل سلیم

باب:58

10:1926

(حج اور وفد خلافت)

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے اس زمانہ میں جلد جلد ہوتے رہتے، اور اپنی شرکت بھی ان میں برابر ہوتی رہتی۔ مسئلہ حجاز کل دوسرے مسئلوں پر غالب رہتا۔ ارکان کی تقسیم سلطان ابن سعود کے عقائد کی موافقت یا مخالفت کی بنا پر گویا دو مخالف کیمپوں میں ہو چکی تھی۔ جو ارکان عقیدتاً قبہ نواز و بدعات دوست تھے، ان میں سے کچھ تو اب باقاعدہ الگ ہو چکے تھے، اور کچھ عملاً کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ جو عقیدتاً قبہ شکن تھے، اب ان ہی کا دور دورہ تھا۔ اور وہ زور و قوت کے ساتھ جلسوں میں شریک ہو رہے تھے۔ ان کی سرداری و علمبرداری کا شرف خاک پنجاب کے حصہ میں آیا۔ محمد علی کی زبان پر ان حضرات کے لیے ایک دلچسپ نام "غیر مقلد مقلدین ابن سعود" تھا۔ اسی لقب سے انھیں اکثر اپنی تحریروں تقریروں میں یاد کیا کرتے۔ اس گروہ کا کہنا یہ تھا کہ سلطان سے بہتر حکمران حجاز کو اور کون مل سکتا ہے۔ اس قدر متبع شریعت، ایسا متمسک بالکتاب والسنۃ، ایسا قامع بدعات! محمد علی کا جواب ہمیشہ ہوتا تھا، اور ان کے اس دعویٰ کی تردید کسی کے کیے نہ ہو پاتی تھی کہ "تمھارا قامع بدعات خود ہی سب سے بڑی بدعت میں مبتلا ہے اور وہ بدعت ملکیت یا بادشاہت کی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی اور معروف بدعتوں کو مٹاتا ہے جن کا بدعت ہونا ہی

اکثر صورتوں میں مختلف فیہ ہے لیکن جو بدعت بالکل مسلم اور ان سب سے کہیں بڑھی ہوئی ہے تو شوریٰ اور جمہوریت بغیر شخصی و نسلی حکومت قاہرہ، اسے وہ زندہ کیے ہوئے ہے۔ حجاز سارے عالم اسلامی کا ہے اور اس کی خدمت کا حقدار صرف وہی ہے جو سارے عالم اسلامی کے مشورہ و انتخاب سے ملت اسلامی کے نائب و نمائندہ کی حیثیت سے تخت نشین ہو، اور فرقہ وارانہ غلو سے خالی الذہن ہو کر سارے عالم اسلامی کے لیے یکساں سہولتیں بہم پہنچائے۔ اس کے خلاف کرنا خلفائے راشدین کی سنت سے تمسک کرنا نہیں بلکہ قیصر و کسریٰ کے طریقوں کی پیروی کرنا ہے۔

....

بیت اللہ و روضۂ رسولؐ کی حاضری کی جو تڑپ محمد علی کے دل میں تھی، اسے یا تو وہ خود جانتے تھے یا دلوں کے بھیدوں کا جاننے والا۔ لیکن بظاہر یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس ذوق وشوق، اس عشق و محبت، اس سوز و گداز کے باوجود یہ شیدائے اسلام و عاشق رسولؐ ابھی تک حج وزیارت کی طرف سے غافل تھا۔ 23 میں جب جیل سے چھوٹنے کے بعد بھوالی پہاڑ پر اپنی بیمار لڑکی کو لیے ہوئے پڑے تھے، تو اس وقت ایک موقع پر میں نے کھل کر عرض کیا کہ حضرت کیا حج وزیارت کا ارادہ ابھی نہیں؟ جواب ایک حسرت ناک لہجہ میں اور آہ سرد کے ساتھ یہ ملا تھا کہ ''کیا جاؤں! کچھ تو وہاں کے لیے کام کرلوں، جب جاؤں۔ ابھی کیا منہ لے کر جاؤں۔ خانۂ خدا اور آرام گاہ رسولؐ پر اغیار کا قبضہ! ذرا انھیں آزاد کرالوں، جب جانے کا کچھ لطف بھی ہے''۔ آزادیِ حجاز کا جنوں ایک عمر کا جنوں رہا!

''تطہیر'' حجاز کی خبریں اب حد تواتر کو پہنچ چکی تھیں۔ اخبارات میں روزانہ سرخیاں اسی کی ہوتی تھیں۔ کم از کم برطانیہ کے حلیف شریفیوں کی حکومت تو اب حجاز سے اٹھ ہی چکی تھی۔ اپریل 26 میں محمد علی حج کا تہیہ کر بیٹھے اور ہمدرد میں اس کا اعلان بھی کر دیا۔ وسط اپریل میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ دہلی میں ہوا اور محمد علی ہی کے مکان پر۔ اس نے موتمر اسلامی کے لیے جس کی دعوت سلطان کی طرف سے اب کی حج کے موقع کے لیے موصول ہو چکی تھی۔ اپنا ایک نمائندہ محمد علی کو بھی منتخب کیا۔ موتمر نے خلافت کمیٹی سے کل چار نمائندے طلب کیے تھے۔ جلسہ میں نام متعدد اشخاص کے پیش ہوئے لیکن آخر میں جب رائے شماری ہوئی تو کامیابوں میں شوکت علی اور

مولانا سید سلیمان ندوی اور شعیب قریشی کے ساتھ ایک نام محمد علی کا بھی تھا۔ ارکان مجلس میں سے حاضر غالباً 45 سے زائد نہ تھے۔ پنجاب کے 14، 15 ممبر محمد علی کی شدید مخالفت میں متفق ومتحد۔ اس لیے خیال یہ ہورہا تھا کہ محمد علی کا انتخاب شاید ہی ہو سکے لیکن انتخاب نہ صرف یہ ہوا بلکہ بڑی اکثریت کے ساتھ ہوا۔ اور محمد علی نے اپنے اور اپنے بھائی کی طرف سے سرجلسہ اعلان کیا کہ چونکہ ہم لوگ حج فرض ادا کرنے جارہے ہیں اس لیے نمائندگی موتمر اسلامی کے لیے اپنے سفر حجاز کے مصارف کا بار خلافت کمیٹی پر نہ ڈالیں گے، اور اپنے ہی مصارف سے جائیں گے۔ یہ تھا وہ محمد علی جسے بعض خوش ظرف معاصرین نے پیسہ کا حریص بھی قرار دیا تھا۔

....

اولوالعزمی محمد علی کی سرشت میں تھی۔ (دوسرے لوگ اسے اسراف سے تعبیر کرتے تھے) حج وزیارت کو چلے تو تنہا نہیں، بیوی کو بھی ہمراہ لیا۔ اپنی بیگم سے محمد علی کو نہایت درجہ محبت تھی۔ پہلے سے بھی قریب کی عزیزہ تھیں اور محبت شادی کے قبل ہی پیدا ہو چکی تھی۔ (خدانخواستہ کسی ناجائز معنی میں نہیں) جوانی بھر عشق کی سی کیفیت رہی۔ سن اترنے پر محمد علی کہا کرتے تھا کہ "قبل از وقت ناکارہ سا ہو گیا ہوں، لیکن بیوی کی محبت بجائے گھٹنے کے اور بڑھ گئی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ کوئی بھی سفر انھیں ساتھ لیے بغیر نہ کروں"۔ بہر حال انھیں بھی ساتھ لیا، اور دہرے مصارف گوارا کیے۔ خود اپنے ہی مصارف کے لیے خدا معلوم کیا سبیل سوچی تھی، چہ جائیکہ یہ دہرے اخراجات..... عطیے اور نذرانے، کم از کم نقد کی شکل میں محمد علی اپنے محبوں اور مخلصوں سے بھی، بڑی مشکل سے قبول کرتے تھے۔ اس موقع پر ایک آدھ عالی ہمت مخلص نے اختلاف مسلک کے باوجود نقدی سے کچھ خدمت کی اور ایک حقیری رقم کا نذرانہ اس نامہ سیاہ نے بھی پیش کیا جسے شرف قبول بخشا گیا۔ 10 رمئی کو یہ گرامی نامہ خود محمد علی کے ہاتھ نہیں بلکہ منور علی خاں صاحب رامپوری (جو مولانا کے بزرگ عزیز ہونے کے علاوہ دفتر ہمدردی کے خزانچی بھی تھے) کے ہاتھ کا لکھا ہوا وصول ہوا:

دہلی 8 مئی 26

برادرم　　　　　　　　　　　　　　السلام علیکم

احمد آباد گیا ہوا تھا، پرسوں آیا ہوں۔ آپ کا خط اور......روپیہ ملے۔ مرض کی حالت میں اب پہلے سے فرق ہے مگر تنہا ہوں، ہر طرح کا کام خود ہی کر رہا ہوں۔ سفر حج کی فکر علاحدہ، گھر کی فکریں جداگانہ۔ آپ کی محبت کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ 10 مئی کو ارادۂ روانگی ہے۔ اللہ تعالیٰ بخیر پہنچائے۔ آپ کا نام میں نے یادداشت میں لکھا لیا ہے، خانۂ کعبہ میں ضرور دعا کروں گا اور مدینہ پاک میں سلام عرض کردوں گا۔ بیگم صاحبہ کو بھی ہمراہ لیے جاتا ہوں، بچیاں یہاں رہیں گی۔ زیادہ سلام۔

محمد علی

جہاز روانہ ہوا اور اسی جہاز پر خلافت کمیٹی کے پورے وفد کے علاوہ جمعیت علماء کے ارکان وفد بھی تھے۔ قرنطینۂ کامران کے قریب پہنچ کر محمد علی نے خط لکھا، خاصہ مفصل، آگے ملاحظہ ہو۔ تاریخ اندر تو درج نہیں لفافہ کی مہر پر 24 درج ہے۔

......☆☆☆......

ضمیمہ باب: 57

فاضل گرامی مولانا سید سلیمان ندوی، رئیس وفد خلافت نے مسئلہ آثار ومقابر پر مسلک جمعیت خلافت کی اتنی بہتر ترجمانی صحیح نقطۂ نظر سے بھی فرمادی تھی کہ ان کی تقریر کا مختصر خلاصہ جو دستیاب ہوسکا، اسے اس نمبر کا ضمیمہ بنا دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مولانا سید سلیمان صاحب نے مسئلہ مقابر و آثار پر ایک پر زور تقریر کی اور آیات واحادیث، تاریخ وسیر کے حوالہ سے اپنے مدعا کو ثابت کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم یہاں مجلس خلافت کی طرف سے تین باتیں لے کر آئے ہیں۔ اول یہ کہ کتاب وسنت کے ساتھ ان امور میں وسعت دینی چاہیے جس میں خود صحابہ کرام اور تابعین متفق تھے۔ مقرر نے اس کی متعدد مثالیں احادیث اور عمل صحابہ سے پیش کیں۔ اور پھر کہا کہ دوسری چیز یہ ہے کہ کتاب وسنت کے اتباع کا سب سے پہلا نمونہ خود حکومت کو ہونا چاہیے۔ یعنی خلیفہ کا انتخاب شرعی ہو اور وراثت سے پاک ہو۔ تیسری چیز مقابر اور آثار، اور ان دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ مسئلہ مقابر کی نسبت بناعلی القبور اور تجصیص القبور وغیرہ کی ممانعت آئی ہے۔ گویا ایک مختصر فریق کے نزدیک اس کے معنی کچھ اور ہوں۔ اسی بنا پر اگر سلطان تمام دنیائے اسلام کے فیصلہ کا انتظار کرتے تو یقیناً کوئی نقصان نہ تھا، اور اس طرح ذمہ داری بجائے ان کی ذات یا اہل نجد کے تمام دنیا پر بٹ جاتی۔ آثار سے مراد وہ مقامات ہیں جن کو انبیاء یا صحابہ کی طرف کسی حیثیت سے نسبت

ہے۔قرآن اور حدیث اور آثار سلف میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ان آثار پر عمارتوں کے بنانے یا مسجد بنانے سے منع کرتی ہو۔ بلکہ قرآن پاک، احادیث، سیر اور آثار میں ایسے آثار کا ذکر ہے۔اسی بنا پر ان عمارتوں کو منہدم کر دینا شدت اور غلو کے سوا کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔ہم کو معلوم ہے کہ جاہل مسلمان وہاں بعض غیر شرعی اعمال کرتے ہیں۔ان اعمال سے روکنا چاہیے تھا یا بعض عمارتیں غیر شرعی طور پر یا غیر مستند طور پر بنائی گئی تھیں تو ان کی تصحیح کی جاتی۔مثلاً مولد نبی صلی اللہ علیہ وسلم (جائے پیدائش حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کی موجودہ شکل یقیناً صحیح نہ تھی، مگر زمانہ سلف میں اس کی شکل مسجد کی تھی جس میں نماز پڑھی جاتی تھی مگر موجودہ شکل حقیقی مولد کے کمرہ کی بنائی گئی تھی جو صحیح و مستند تھی۔ اس لیے درست کر دینی چاہیے تھی اور غلاف، کٹہرا، سنگ مرمر کی سل وغیرہ ہٹائی جا سکتی تھیں مگر نفس عمارت کو توڑ ڈالنا شدت اور غلو کی انتہا ہے۔ مقام ابراہیم، صفا ومروہ، چاہ زمزم وغیرہ تمام آثار ابراہیمی ہیں، کیا ان کو بھی منہدم کر دیا جائے گا؟

......☆☆☆......

باب:59

11:1926

(مکتوب حجاز۔ ناکام مراجعت)

جہاز ''اکبر'' قرنطینۂ کامران۔ بحر احمر (لفافہ کی مہر پر) 24 مئی 26

پیارے ماجد میاں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جتنی خوشی اپنے اس سفر کی ہے، اسی قدر افسوس آپ کی شرکت نہ ہونے کی ہے۔ یہ در بارہ وہ ہے کہ باوجودیکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اپنے مرحوم بھائی کے شریک نہ ہونے کا افسوس تھا، وہ خود ہر بار حاضری سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہاں ایک حد تک خودغرضی جائز ہے مگر یقین جانیے کہ آپ کے اور میرے دوست قاسم حسین 1 اور تیسرے دوست مسعود علی صاحب ندوی 2 اور مستورات میں بیگم صاحبہ انصاری 3 کے شریک نہ ہونے کا سخت قلق ہے۔ سفر خوب لطف سے ہوا۔ میری اہلیہ کو دو تین دن قے آئی اور گھسن تو سب

---

1 قاسم صاحب بدایونی (علیگ) محمد علی کے خاص مخلصوں میں تھے۔ شاید ساتھ پڑھے ہوئے بھی تھے۔ پہلے یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ 16 میں محمد علی کی دوستی کے سلسلہ میں معتوب ہوئے۔ اس پر استعفیٰ دے کر حیدرآباد چلے گئے۔ آخر میں محمد علی کے ہم مرض ہوئے یعنی ذیابطیس میں مبتلا۔ اور محمد علی کے انتقال کے چند ہی مہینہ بعد خود بھی راہی ملک بقا ہوئے۔

2 مولوی حاجی مسعود علی ندوی منیجر دارالمصنفین (اعظم گڑھ)۔ 3 ڈاکٹر انصاری (دہلی والے) کی بیگم صاحبہ۔

عورتوں کو چار پانچ دن رہی مگر مرد اکثر اچھی طرح رہے اور ہم لوگ تو خوب مزے سے کھاتے اور پیتے اور چلتے پھرتے تھے۔ عدن سے گزرنے سے ایک دو دن پہلے یہ سمندر میں مطلق جوش نہ رہا تھا۔ جوش تو پہلے بھی نہ تھا مگر بعض لوگوں کو ناگوار گزری تھی لیکن جب ہوا بند ہوئی تو سب گرمی کے شاکی تھے اور ایک شب تو بہت تکلیف رہی۔

میں نے پہلی بار سمندر کا سفر ساڑھے 19 برس کی عمر میں کیا تھا۔ 11 جون کو مانسون شروع ہوئی۔ 19 کو میں نے ساحل ہند چھوڑا۔ طغیانی کا زور تھا۔ جو کیفیت شروع کے 5 دن رہی تھی اس سے اندازہ کر سکتا ہوں کہ اوروں پر کیا گزرتی ہوگی لیکن حج کا شوق وہ شوق کہ ایسی تکلیف پر بھی لوگ گلہ سنجی سے محترز رہتے ہیں۔ میرے کاربنکل کو چلنے سے پہلے آرام ہو گیا تھا مگر ریل کے سفر میں ایک اور نکل آیا۔ پھر بھی جہاز کا ایک چکر تو روز ہو جاتا تھا۔ اگر اس سے نجات مل گئی ہوتی اور بیوی کی تسلی و تشفی لازمی نہ ہوتی تو میں زیادہ وقت تھرڈ کلاس ہی میں گزارتا۔ کمپنی تو مفت لے جانا چاہتی تھی مگر میں نے کہہ دیا کہ اس سفر کو بلا خرچ کیے ہوئے اختیار نہ کرنا چاہیے۔ اور تھرڈ کلاس میں سب کے ساتھ جانے ہی کی نیت تھی۔ اور اتنا ہی روپیہ پاس تھا، تاہم کمپنی نے تھرڈ ہی کے ٹکٹ سے فرسٹ میں ٹھہرایا۔ جمعیت علماء کو بھی سیکنڈ میں ٹھہرایا۔ شوکت صاحب کو کپتان نے اپنے پاس ایک خاص کیبن دیا جس میں وہ اور بہن رہتے ہیں[1]۔ مگر افسروں کا سارا ڈک (Deck) تھرڈ کلاس والوں سے اتنا بھرا رہتا ہے کہ خود افسروں کو بعض وقت راستہ تک نہیں ملتا۔ افسر بہت خلیق اور بامروت ہیں۔ بالخصوص کپتان جو ایک نیک اور سیدھا آدمی ہے۔ میری اہلیہ اور بہن اور ان سے ملنے والی عورتوں کو کپتان نے اپنا آدھا ڈک دے رکھا ہے۔ اپنے غسل خانہ میں خود اس لیے کم جاتا کہ مستورات ادھر بیٹھتی ہیں، ان کو نقاب نہ ڈالنا پڑے۔ پرسوں رات مجھے سوجھی کے اہل ہند غیر ہندی مسافروں کی دعوت کریں۔ بالخصوص بخاریوں کی جو باوجود گندے اور پسینے کے باعث سخت بدبودار اونی اور روئی بھرے کپڑے پہنے نیک اور سیدھے سادے لوگ ہیں۔ کوئی پانچ سو روپیہ صرف تیس چالیس آدمیوں سے وصول ہو گیا۔

---

1 مولانا کی ہمشیرہ بھی اس سفر حج میں ہمراہ تھیں۔

کل یہاں کامران میں قرنطینہ والوں کی دیگیں لے کر سامان منگا کر کھانا پکوایا گیا۔رات پون بجے خود کھانا کھایا اورکوئی دو بجے سونے کو لیٹا، بہت کھانا بچ رہا اور جنس بھی۔ بنگالی ''بھوکے'' مشہور ہیں، رات ثبوت مل گیا۔ باوجود سوائے ایک خاتون کے چندہ مطلق نہ دینے کے ناخواندہ مہمان بن کر آ گئے تھے۔ بڑی مشکل سے انھیں ٹالا تھا۔اب سب کی رائے تھی کہ ان کو کھلوا دیا جائے۔سخت ندیدے اور حریص اور اس معاملہ میں بے حیا ہیں۔لوٹ مچا رکھی تھی۔ خیر ضیف اللہ ہیں جب اللہ ان کو مہمان بناتا ہے تو ہم کیوں ناک بھوں چڑھائیں اس سے بھی فارغ ہوئے اب کے دن کے گیارہ بج رہے ہیں، جہاز پر واپس جا رہے ہیں۔کوئی بارہ بجے تک لنگر اٹھ جائے گا۔ انشاء اللہ پھر شام کو احرام باندھا جائے گا۔ اور '' لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ'' کی صدائیں بلند کی جائیں گی اس وقت آپ پھر یاد آئیں گے اور خوشی کے ساتھ قلق بھی ہوگا۔ مگر اب شوق کی بے قراری بڑھ جائے گی۔ دیکھیے کیا کیفیت قلب پر طاری ہوتی ہے۔اب تک تو اور مسافروں کی دیکھ بھال سے فرصت نہ رہی کہ دھیان اسی میزبان کی طرف کیا جائے جس کے مہمان ہو کر ہم جا رہے ہیں۔دعا کیجیے کہ عمرہ، حج اور زیارت روضۂ اقدس نصیب ہوں اور قبول ہوں۔(آمین)

یہاں ان عربوں سے جو ملازم ہیں، خوب مزے دار باتیں ہوئیں۔عرب اور باشندگان عرب کی محبت دل میں اور بڑھ رہی ہے۔خدا جلد اس قوم کا اور اسلام کا احیا کرے۔سب کو سلام شوق خصوصاً ظفر الملک کو کہہ دیجیے کہ دیکھو بھائی ہمارے پیچھے نہایت احتیاط سے کام کرنا، قوم کو سنبھالنا اب آپ لوگوں کا کام ہے۔

بچوں کو پیار، گھر میں سلام شوق میری اہلیہ کا سلام بھی قبول فرمایئے اور گھر میں پہنچا دیجیے۔

والسلام

آپ کا پیارا بھائی

محمد علی

وفد مئی میں روانہ ہوا تھا۔ اگست میں واپس آ گیا۔ ارض حجاز میں محمد علی کو جو کچھ دیکھنا پڑا، خدا جانے ان سے دیکھا کیوں کر گیا۔ ہر طرف ملکیت کی قہر مانی، ہر سمت نجدیت کی کرختگی، قبریں مسمار، دل غمگین، جمہوریت معدوم، شورائیت بے نشان۔ بہت کچھ چیخے، چلائے اور جلسوں میں گرجے بھرے روئے (تفصیلات کا اس ذاتی ڈائری سے کوئی تعلق نہیں) اثر کچھ نہ ہوا۔ مرکز اسلام اور اس طرح بالواسطہ سارے عالم اسلامی کی اصلاح حال کا آخری سہارا اسی موتمر سے وابستہ تھا، اس کا یہ حشر ہوا۔ دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ ایک مرتبہ سخت غش آیا اور آثار بالکل فالج کے سے طاری ہونے لگے اتنی شدید اور دل شکن مایوسیوں کے بعد زندہ سلامت واپس آ جانا بس ایک کرشمۂ قدرت ہی تھا......لوٹ کر آئے تو نہایت درجہ خستہ و مغموم، شکستہ دل وملول۔

......☆☆☆......

باب:60

12:1926

(ہمدرد۔ کامریڈ کامرحوم)

عارف صاحب گو انگریزی سے ناواقف تھے، لیکن تھے کام میں خوب منجھے ہوئے اور ہمدرد کے لیے بہت مفید۔ کام کرتے کرتے مشاقی آہی جاتی ہے۔ عقائد اور مذہبی مسلک میں البتہ مولانا سے مختلف تھے۔ مولانا کی سی دینی پختگی اور ایمانی جوش کی توقع عملہ کے رکن سے کی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ فروری 26 کے تیسرے ہفتہ میں مجھے دفعتاً خبر پہنچی کہ عارف صاحب ہمدرد سے الگ ہوگئے۔ میں نے اپنے تعلقات کے اعتماد پر معاً خط لکھا کہ ''یہ غضب عارف صاحب آپ نے کیا کیا۔ کوئی ناگواری صورت پیدا ہوئی تھی تو کم از کم مجھ سے تو مشورہ کرلیا ہوتا''۔ جواب 2 مارچ کا لکھا ہوا آیا۔ ان کے اور مولانا اور ہمدرد کے تعلقات پر پوری روشنی ڈالنے والا۔ اس لیے تمام وکمال درج ہوتا ہے:

''مولانائے محترم۔ وعلیکم السلام

جواب میں تاخیر ہوئی۔ اس کی وجہ آشفتہ خاطری تھی جو آج بھی مسلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ بیشک آپ کو شکوہ ہونا چاہیے کہ اتنا اہم معاملہ اور میں نے کسی سے مشاورت نہیں کی مگر مولانا یہ واقعہ بالکل فوری ہوا۔ اور مقامی احباب میں سے بھی کسی شخص سے

گفتگو اور مشورہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہاں تک کہ رفقائے کار سے بھی میں نے ذکر نہیں کیا، بلکہ دوسرے دن ان سے ذکر آیا۔

واقعہ یوں ہوا کہ مولانا نے ایک مضمون لکھنے کے لیے زبانی ہدایات دیں۔ میں نے مضمون لکھا اور دکھایا۔ حسب معمول پھر اس میں ترمیم واضافہ کا حکم ہوا جو کیا گیا۔ مگر پھر جب کاپی ان کے پاس گئی تو مزید حک واضافہ کیا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کاپی پریس میں دیر میں جاسکی۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ بالکل غیر متوقع طریقہ پر ایک عتاب نامہ نازل ہوا جس میں بے توجہی، عدم احساسِ فرائض اور تن آسانی کے الزامات کا مورد ٹھہرایا گیا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اس کا بھی اظہار تھا کہ میں انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے پہلے ہی سے اخبار کے لیے بیکار سا ہوں۔ گو مفت کی مجھے تنخواہ دی جاتی ہے اور محض میری پرورش منظور ہے۔ اس وقت وہ تحریر میرے پاس نہیں جب آپ تشریف لائیں گے تو دکھاؤں گا۔ بہرحال وہ ایسی تحریر تھی کہ اس کے بعد میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں مستعفی ہو جاؤں۔ چنانچہ تمام الزامات تسلیم کر کے نہایت نرم اور مؤدبانہ الفاظ میں میں نے اس مضمون کا استعفیٰ بھیج دیا کہ جب آپ مناسب سمجھیں اور آپ کے حالات اجازت دیں مجھ کو سبکدوش کر دیجیے۔ اس تحریر کا آج تک کوئی جواب نہیں آیا اور چونکہ مولانا کی صحت اچھی نہیں ہے اس لیے میں نے دوبارہ یاددہانی بھی نہیں کی کہ اس حالت میں ان کو پریشانی میں مبتلا کرنا مقتضائے انسانیت وشرافت کے خلاف ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرا اصرار ایسے وقت میں کہ پہلے ہی سے اسٹاف کم ہے اور متواتر دو مہینہ کے اشتہار کے باوجود نہیں ملا۔ مولانا کے لیے کسی قدر ضرور تکلیف کا باعث ہوگا۔ اور میں ذرہ برابر تکلیف دینی معصیت سمجھتا ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ اب میں بالکل برداشتہ خاطر ہو گیا ہوں اور اس برتاؤ اور سلوک کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے۔ میں دفتر والوں کی طرف سے پہلے سے شاکی تھا مگر کبھی اس کا خیال نہیں کیا اور یہ سمجھتا رہا کہ میرا معاملہ تو مولانا کے ساتھ ہے۔ وہ مجھ سے مطمئن ہیں، یہ کافی ہے لیکن مولانا کی اس تحریر نے میرے حواس مختل کر دیے اور میں ہر وقت یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری حیثیت اس دفتر میں ایک ملازم کی سی ہے اور وہ بھی غیر محفوظ۔ حالانکہ اب تک میں اپنے آپ کو ہمدرد کا اور ہمدرد کو اپنا سمجھتا تھا۔

میں آج آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ آج سے کئی ماہ قبل ڈاکٹر کچلو نے مجھے تنظیم اخبار[1] میں پونے دوسو روپیہ تنخواہ پر علاوہ مکان کے بلایا تھا اور کئی طرف سے مجھ پر زور ڈالا گیا، مگر میں نے لکھ دیا تھا کہ میں اول تو آپ کی پالیسی سے متفق نہیں اور اگر میری خاطر سے آپ اس میں کچھ تغیر کرنے کے لیے تیار بھی ہوں (جس کا اشارہ خط میں موجود تھا) تو میں ہمدرد کو اور محمد علی صاحب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کا علم میرے رفقا کو ہے، کیوں کہ بعض رفیقوں کو میں نے تنظیم کے بلاوے کا خط دکھادیا تھا۔ یہ اس حالت میں میں نے کیا تھا کہ موجودہ تنخواہ میں میرا کسی طرح گزارہ نہیں ہوتا اور برابر مقروض ہوتا چلا جاتا ہوں مگر کبھی تنخواہ کے متعلق ایک حرف میں نے نہیں کہا۔ اس لیے کہ ہمدرد کی جب پہلے ہی سے حالت مخدوش ہے تو میں کس منہ سے اضافہ کا مطالبہ کروں۔

بہر حال اب میں شوکت صاحب کا انتظار کررہا ہوں کہ وہ آجائیں تو پھر از سرنو میں اس کو چھیڑوں اور یکسوئی حاصل کرلوں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو تنخواہ مجھے ہمدرد سے ملتی ہے اور وہ بھی دوسرے مہینہ، اتنی رقم تو میں آزادرہ کر اور اس سے بہت کم وقت صرف کر کے گھر پر پیدا کرسکتا ہوں۔ اس وقت بھی مجھے دو تین ماہوار و ہفتہ وار رسائل و اخبارات کام دینے کے لیے تیار ہیں جن سے سو سے زائد وصول ہوں گے اور یہ سب کام مشکل سے پندرہ روز کا میرے کرنے کا ہوگا۔

یہ ہیں حالات مفصل داستان زبانی سنیے گا۔

آپ کا خادم
عارف ہنسوی

....

26 بھی سال غم ہونے کی حیثیت سے محمد علی کے 24 سے کچھ کم نہ تھا......اور سال مسرت ان کی ساری پبلک زندگی میں تھا ہی کون سا سال......سال شروع ہوتے ہی پہلے حجاز سے ان

---

[1] 24 میں جب تحریک خلافت کو تنزل ہونے لگا تو مسلمانوں میں (خصوصاً صوبہ پنجاب میں) تبلیغ و تنظیم کے نام سے دو تحریکیں بڑے زور وشور سے اٹھی تھیں تنظیم کا مرکز امرتسر تھا اور اس کے کرتا دھرتا ڈاکٹر سیف الدین کچلو (بیرسٹر) تھے۔ ان کے روزنامہ کا نام بھی 'تنظیم' تھا۔

کے لیے نہایت درجہ دل شکن خبریں (بہ سلسلۂ اعلان ملکیت ابن سعود) آنا شروع ہوئیں، پھر مرشد اور محبوب مرشد کا انتقال ہوا۔ فروری میں ہمدرد سے عارف صاحب جو اس وقت تک پرچہ کے روح رواں تھے، رخصت ہوئے۔ فروری میں خود بھی سخت بیمار پڑے۔ کئی ہفتہ صاحب فراش رہے۔ اپریل تک یہ سلسلہ چلا۔ پھر مئی میں حجاز جاکر جون و جولائی میں سرزمین حجاز میں اپنی آنکھوں سے ملکیت کے بڑے تکلیف دہ نظارے دیکھے۔ اور اگست میں جب ہندوستان واپس آئے، اس وقت سے لے کر برابر ہندی سعودیوں سے جنگ وجدال ہی میں مصروف رہے۔ خلافت کمیٹی کے اندر بھی اور باہر بھی، اور عین اسی زمانہ میں ایک بڑی ہی شدید اور طویل جنگ دہلی کے مشہور صاحب اثر اہل قلم اور صوفی خواجہ حسن نظامی سے بھی چھڑ گئی...... یہ نظارہ بھی کتنا حسرت انگیز تھا کہ جس کا کام غیروں سے، بیگانوں سے، دشمنانانِ اسلام سے جہاد کرنا تھا، اس کے بیش قیمت وقت اور قوت کا کتنا بڑا حصہ اپنوں ہی سے مقابلہ کرنے میں صرف ہو رہا تھا۔

کامریڈ کا بند ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ جنھوں نے کامریڈ کا زمانہ دیکھا نہیں ہے اب انھیں کیا بتایا جائے کہ کامریڈ کیا چیز تھی، اور کن الفاظ میں سمجھایا جائے کہ اس کے نکلتے رہنے کے کیا معنی تھے۔ اور اس کے بند ہو جانے کے کیا معنی ہوئے۔ اس ڈائری کے نمبر (30) میں کامریڈ کے خاتمہ کا ذکر آچکا ہے۔ آج دو چار سطریں اور سہی۔ 14، 15 سال قبل یعنی 1911، و1912 میں کامریڈ کی زندگی گویا سارے مسلمانانِ ہند کی تعلیم یافتہ جماعت کی زندگی تھی۔ ایک روح تھی جو ساری قوم کو زندہ رکھے ہوئے تھی۔ علم و ادب، سیاسیات و اصلاح معاشرت، زبان وانشا پردازی، حریت وجمہوریت، شوخی وظرافت، ہنسی دل لگی، سب ہی کے نمونے، اس کے صفحات میں درج، ہر سامان اس میں موجود۔ اس وقت کامریڈ ''مسٹر'' محمد علی کا تھا۔ اب محمد علی ''مولانا'' ہو چکے تھے [1] جیل ہو آئے تھے۔ برسوں کی نظربندی اٹھا چکے تھے۔ سوٹ بوٹ، ہیٹ کے بجائے اب کھدر پوش تھے۔ کلام مجید کے نیم حافظ ہو چکے تھے۔ صاحب ریش تھے۔ اس وقت 30، 32 سال کے تومند جوان تھے اب 45 سے اوپر ادھیڑ سن کے ہو چکے تھے۔ جوان چہیتی بیٹی کی موت، ناز بردار وفرشتہ سیرت ماں کی موت، کامریڈ کے مقالہ نگار

[1] آئندہ نسلوں میں اس فرق کو سمجھنے والے اور اس تفریق سے لطف اٹھانے والے بھی کتنے رہ جائیں گے۔

خصوصی ولایت علی (بمبوق) کی موت، سب ایڈیٹر غلام حسین کی موت، شکست خلافت کا جانکاہ غم، غازی عبدالکریم ریفی کی اسیری کا الم، سلطان ابن سعود کے نقض عہد کا صدمہ، ایک نہیں متعدد رفیقوں کی بے وفائیوں کا داغ۔ قومی صدمہ ایک سے بڑھ کر ایک۔ مالی پریشانیاں پیہم وشدید، جسم کو گھلا دینے والا مرض ذیابیطس، تو وہ اگلا سا ہنسوڑ پن بھلا اب کہاں سے لا سکتے تھے۔

پھر بھی کامریڈ ایک زندہ اور زندگی بخش قلم کا پرچہ تھا۔ جب تک خود زندہ رہا خدا معلوم کتنوں کو زندگی بخشتا رہا۔ ناغہ کر جانے کا معمول تو عین اوج وشباب کے زمانہ میں بھی تھا اور اب تو ناغوں کی حد ہی نہ رہی تھی۔ قدر دان پھر بھی چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ جسے ایک دفعہ چسکا پڑ گیا، بس اس کا ہفتہ اور عشرہ اور مہینہ انتظار ہی کرتے گزرتا۔ 22 جنوری کی تاریخ کا پرچہ جب 18 دسمبر کے بعد شروع فروری میں نکلا تو اس وقت کون جان سکتا تھا، کس کو یہ علم غیب حاصل تھا کہ کامریڈ کی زندگی کی یہ بالکل آخری سانس ہے۔ اور اس نمبر کے بعد اس کا کوئی نمبر دیکھنے میں نہ آئے گا!......رہے نام اللہ کا۔ انسان ضعیف البنیان کی کسی چیز میں ثبات وبقا ہے؟ آج یہ ایک محض قصہ ماضی اور داستان پارینہ۔ اس وقت یہ قصہ کہانی نہ تھا۔

کامریڈ ایک زبردست متحرک، زندہ وفعال قوت تھا۔ دنیا کو بھول جاتے دیر ہی کیا لگتی ہے۔

فلک مصروف ہے پیہم نیا نقشہ بچھانے میں
زمیں کو دیر کیا گزرے ہوؤں کو بھول جانے میں

......☆☆☆......

باب:61

13:1926

("ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا")

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے جلد جلد ہوتے اور عموماً دہلی ہی میں۔ زیادہ تر محمد علی کے ہاں اور کبھی کبھی حکیم صاحب کے ہاں۔ میں اکتوبر 25 میں نیا نیا ممبر مرکزی کمیٹی کا بنا تھا۔ کچھ تو تازہ جوش وشوق اور کچھ محمد علی کی ذاتی کشش، ہر بار ساڑھے 3 سو میل کے فاصلہ سے دوڑ کر دریاباد سے دہلی آتا۔ محمد علی کام سے پسے ہوئے، مخالفوں سے گھرے ہوئے، قلب رنجور، جسم محنت سے چور چور، میری حاضری سے باغ باغ ہوجاتے اور کچھ دیر کے لیے گویا چھٹی منانے لگتے......ایک مرتبہ غالباً 25 کا دسمبر تھا، جو میں آیا۔ رات کو پہنچا۔ دوسرے دن محمد علی نے دن بھر کی چھٹی اپنے دفتر سے لے لی۔ میر دتفریح کو ترسے ہوئے تھے، کسی سے موٹر مانگ (غالباً ڈاکٹر انصاری سے مانگی) اپنی برقع پوش بیگم صاحبہ اور مجھ کو اور مولانا عرفان کو ساتھ لے، شہر کے باہر نکل گئے۔ پہلے درگاہ حضرت نظام الدینؒ اور پھر قطب صاحبؒ کے ہاں کچھ وقت گزارا۔ ناشتہ کچھ ساتھ تھا، کچھ وہاں خرید کر کھایا پیا۔ مزارات پر فاتحہ پڑھی، مسجد میں نمازیں پڑھیں۔ لوگ ہر جگہ گھیر لیتے تھے۔ یہ بھی مجاوروں سے اور سب سے گھل مل کر باتیں کرتے۔

محمد علی کے ملنے والے سینکڑوں نہیں، ہزار در ہزار تھے اور دور بیٹھے ہوئے عقیدت منداور

شیدائی تو لاکھوں تھے لیکن سابقہ اور تعلق کے بعد مخلص اور راز دار ہو جانے والے دوست بہت ہی کم تھے اور آخر آخر تو شاید دو ہی چار رہ گئے تھے۔ بہر حال ان چند میں ایک مولانا محمد عرفان تھے۔ صوبۂ سرحد کے رہنے والے لیکن اب تو دہلی ہی کے ہو گئے تھے۔ جمعیت علماء کے عہدے دار تھے۔ محمد علی نے ان سے تنہائی میں خود جمعیت اور اس کے بعض اونچے عہدے داروں سے متعلق جس طرح کھل کر باتیں کیں، اس کی تو مجھے توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی...... بیگم صاحبہ کی معیت و رفاقت کچھ نئی نہ تھی۔ میاں بیوی میں میل محبت شروع ہی سے بہت تھا۔ آخر عمر میں تو کہنا چاہیے کہ عشق کی کیفیت تھی۔ عشق ایسا نہیں جس میں سوزش اور شورش ہو اور جو تمام تر جوانی کے قویٰ کی پیداوار ہوتا ہے، بلکہ ایسا عشق جس میں ٹھنڈک اور سکون ہوتا ہے اور عربی میں اس کے لیے لفظ ''انس'' ہے۔ محمد علی کہا کرتے تھے اب بغیر انھیں ساتھ لیے مجھ سے کہیں جایا نہیں جاتا۔ جوں جوں سن بڑھتا جاتا ہے۔ خواہش نفس عنقا ہوتی جاتی ہے اور بیوی کے ساتھ خالص محبت بڑھتی جاتی ہے۔ اور قرآن مجید میں جو آیا ہے کہ بیوی سے تمھیں تسکین خاطر حاصل ہو گی، اس کے معنی اب جا کر سمجھ میں آئے ہیں''۔

بیگم محمد علی رہیں ہمیشہ برقع میں اور پورے شرم ولحاظ کے ساتھ۔ چہرہ نقاب سے چھپا ہوا۔ لیکن رہتیں ہر جلسہ میں، ہر سفر میں، ہر مجمع میں، خلافت کانفرنس میں، برابر ساتھ اور جلسوں کی کارروائیوں میں بھی تھوڑا بہت حصہ لے لیا کرتیں۔ عورتوں کے مجمع میں تقریریں بھی کبھی کبھی کر دیتیں اور دو ایک بار مردوں کے جلسوں میں بھی بول دیں...... تجدد کے رو میں بہی ہوئی ''روشن خیال'' بیویاں کاش بی اماں مرحومہ، مولانا کی والدہ ماجدہ اور ان امجدی بیگم صاحبہ کی مثالوں سے سبق لیتیں کہ قومی کاموں کے لیے بے حیائی کیا معنی، بے پردگی بھی ہرگز لازمی نہیں۔ آئین حجاب کی پابندیوں کے ساتھ بھی سارے قومی کام بے تکلف انجام پاتے رہتے۔

محمد علی کی مہمان داری بھی قابل دید تھی۔ میں جب کبھی مہمان ہوتا، خاطر داریوں کو حدِ اسراف تک پہنچا دیتے، کھانے ضرورت سے بھی زائد ہوتے، میری حیثیت سے بھی زائد، اور ان کی جیب کی گنجائش سے بھی زائد۔ حق گوئی وحق نگاری میں تو محمد علی اپنی نظیر آپ تھے ہی، مہمان نواز اور سیر چشم بھی اس درجہ کے کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ کھانا اکیلے کھانا تو جانتے ہی نہ

تھے، اور پھر کھانا بھی ''نانِ جویں'' اور ''نمکِ طعام'' نہیں، دسترخوان اچھا خاصہ چھوٹے موٹے رئیس کا معلوم ہوتا تھا۔ اچھے سے اچھے سالن، قورمہ، قلیہ، کباب کی متعدد پلیٹیں، طرح طرح کے لذیذ و پرتکلف نمکین اور میٹھے کھانے، کبھی مرغ کبھی مچھلی، خشک میوے، تازہ پھل، خود کھاتے اور دوسروں کو زبردستی کر کر کے کھلاتے۔ اس سب کے باوجود 25 میں جب مولانا شوکت علی نے خود ہی یا ان کی تحریک سے ''دوشنبہ فنڈ'' کھولا، اور یہ قرار دیا کہ ہفتہ میں ایک، دوشنبہ کو مسلمان اپنا کھانا صرف چٹنی روٹی رکھیں اور اس روز کھانے کے خرچ میں جو کچھ بچت ہو، اسے جمع کر کر کے ہر مہینہ یا ہر تیسرے مہینہ خلافت فنڈ کی نذر کرتے رہیں تو محمد علی نے اس قاعدہ پر سختی سے عمل شروع کر دیا۔ کہاں تو روزمرہ شوقینی کا یہ عالم تھا اور کہاں دوشنبہ کے دن واقعی دسترخوان کی حد تک زاہد خشک بن جاتے......دوشنبہ کے دن انکے ہاں کا منظر دیکھنے کے قابل ہوتا۔ داماد، بھتیجے، بھانجے، دفتر کے منشی، یہ وہ کھانے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد روزمرہ کے ان کے دسترخوان پر ہوتی۔ آج کوئی صاحب بیماری کا بہانہ کر کے، کوئی صاحب کوئی اور عذر تراش کے، غرض سب ان کے دسترخوان سے کھسک جاتے اور ان سے چھپ کر الگ الگ اپنے روزمرہ کے کھانوں کا انتظام کر لیتے۔ محمد علی اکیلے بیچارہ اپنے عہد کی پابندی کرتے اور یہ کوئی معمولی مجاہدہ نہ تھا۔

کھانے میں بے احتیاط و بد پرہیز تھے لیکن آخر میں ذیابیطس سے معذور ہو کر مٹھائی وغیرہ سے ایک حد تک پرہیز کرنے لگے تھے۔ مہمانوں کو پرہیزی کھانے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے لیے وہی شیر مال اور ''مرغن'' غذائیں بدستور۔ جاڑوں میں ماش کی کھچڑی ضرور آتی، بہ افراط گھی کے ساتھ۔ میں جب جاتا، ہر مرتبہ اصرار کر کر کے وقت سے زیادہ روکنے کی کوشش کرتے۔ چلتے وقت ہمیشہ ایک معرکہ پیش آتا۔ ہنسی خوشی کبھی رخصت نہ کرتے۔ ایک دفعہ تو ان کی نظر بچا کر بھاگ کر آنا پڑا تھا۔ میری ٹوپی اور عینک حضرت نے قرق کر لی، سمجھے یہ تھے کہ بغیر ان کے سفر کیسے کر سکوں گا۔ مجھ ضدی کے لیے یہ چیزیں بھی روک نہ بن سکیں۔ جب دوبارہ ملنا ہوا (غالباً لکھنؤ میں) تو لگے معذرت کرنے کہ ''تمھیں عینک کے بغیر سخت تکلیف ہوئی ہوگی''۔ ایک بار عاجز آ کر میں نے یہ ٹھان لی کہ اب ان کے ہاں ٹھہرا ہی نہ کروں گا، ہر دفعہ مورچہ بندی کون کرے۔ پھر جو دہلی جانا ہوا تو اسٹیشن سے سیدھا خلافت کمیٹی کے دفتر گیا۔ مولوی لقاء اللہ صاحب عثمانی

پانی پت شہر کمیٹی کے سکریٹری تھے، ان سے کہا کہ "اب کی آپ کا مہمان ہوں، آخر جلسۂ خلافت ہی کے لیے تو آیا ہوں"۔ وہ بیچارہ تبری وتحاشی کے ساتھ بولے "میری مجال ہے جو ٹھہراسکوں، مولانا محمد علی تو مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے" ہارکر اور پچھتا کر پھر وہیں آنا پڑا۔ بہت بگڑے "مجھ سے بھاگنا چاہتے تھے"......اپنے سے چھوٹوں اور نیاز مندوں کے ساتھ اس شفقت ومحبت وتعلق خاطر کی مثالیں اب کہاں دیکھنے میں آئیں گی۔ محمد علی گاندھی جی نہ طبعًا تھے، نہ عقیدتًا ان کے مسلک عدم تشدد اور اہنسا کے قائل۔ تشدد کے قائل بھی تھے اور اس پر عامل بھی۔ متشدد غصہ میں بھی تھے اور محبت میں بھی۔ اور خدا گواہ ہے کہ اس "متشددانہ عدم تشدد" میں کیسی حلاوت کیسی دلآویزی، کیسی محبوبیت تھی!

....

ڈائری 31 اور شروع 32 کی لکھی ہوئی اس مقام پر ختم ہوگئی، نظرثانی کے وقت 16، 17، سال بعد بہت کچھ بڑھایا اور کچھ گھٹایا۔ کہیں کہیں ادل بدل کی۔ بحیثیت مجموئی اتنے حصہ کا حجم سمجھنا چاہیے کہ پہلے سے ڈیوڑھا بلکہ دونا ہوگیا۔ پھر بھی نقش اول تو وہی پرانا تھا، جب واقعات حافظہ میں تازہ تھے اور محمد علی کو دنیا سے اٹھے ہوئے سال ہی ڈیڑھ سال ہوا تھا۔ اب آگے سے ڈائری کے اوراق بالکل "نوتصنیف" ہیں......اب 1948 میں نہ شوکت علی زندہ نہ بیگم محمد علی، نہ مولانا کے مخلص دوست مولانا عرفان اور نہ قاسم بدایونی۔ نئے ملک "بھارت" کی فضا بھی ہر مومن کے لیے اتنی ناسازگار اور ماحول بھی اتنا نازک کہ بات پر داں زبان کٹتی ہے

اور جی یہی کہنے کو چاہتا ہے کہ ع

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

......☆☆☆......

باب:62

14:1926

(مجلس کی خلافت کی جھلکیاں)

اگست کی کوئی تاریخ تھی۔ جب معلوم ہوا، محمد علی بعد حج پہلی بار لکھنؤ آرہے ہیں۔ دوڑا ہوا لکھنؤ پہنچا......ایک بار اس سے قبل اخبارات میں یہ پڑھ کر کہ کراچی جہاز فلاں تاریخ کو پہنچے گا، اور اس کے حساب سے وہ فلاں دن دہلی آجائیں گے، فرطِ شوق میں دہلی بھی جاچکا تھا۔ رات بھر کے سفر کے بعد دہلی پہنچا تھا کہ اسٹیشن ہی پر ہمدرد خرید کر اور اس میں یہ خبر پڑھ کر کہ مولانا کراچی میں رک گئے ہیں، معاً پہلی ہی ٹرین سے واپس ہوگیا۔ اور دن بھر کے سفر کے بعد آدھی رات کو دریاباد واپس پہنچا تھا......محمد علی میں کشش یوں ہی میرے لیے کیا کم تھی اور اب کی تو وہ حاجی وزائر ہوکر اور سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر واپس آرہے تھے۔ بیوی علیل اور زیادہ علیل تھیں۔ انھیں چھوڑ پچھلی رات کو لکھنؤ چلا اور دہلی کی ٹرین آنے سے قبل صبح تڑکے لکھنؤ پہنچ گیا۔ اب کی معانقہ حاجی محمد علی سے اور زیادہ طویل اور گرما گرم رہا۔ اسٹیشن سے محمد علی حسب دستور فرنگی محل چلے۔ وہیں ناشتہ ہوا اور راستہ بھر خوب باتیں رہیں۔ ناشتہ کے بعد 9، ساڑھے 9 پر قیصر باغ مہاراجہ محمود آباد کے ہاں آئے۔ مہاراجہ سر علی محمد خاں کی ذات بھی عجب مرکزیت و جاذبیت رکھے ہوئے تھی۔ بڑے ہمدرد ملت، بڑے فیاض، انتہائی مہمان نواز لیکن بہر حال ایک رئیس اور راجہ

اور مذہباً شیعہ۔ اس وقت تک شاید یو پی گورنمنٹ کے ہوم ممبر بھی تھے۔ مسئلہ حجاز میں چند ماہ قبل تک تو محمد علی کے مسلک کے اچھے خاصے مخالف اور فرنگی محل و خدام الحرمین کے ہمنوا تھے۔ اور اب بھی پوری طرح محمد علی کے ہم مسلک نہ تھے۔ البتہ ذاتی تعلقات محمد علی سے بہت قدیم تھے۔ مدتوں کا مریڈ کی امداد بھی کرتے رہے تھے۔

....

اب راجہ صاحب کا ڈرائنگ روم تھا اور محمد علی۔ سیاسیات حجاز و عالم اسلامی پر جو گفتگو انھوں نے شروع کی، دلچسپ بھی اور بصیرت افروز بھی وہ جلد کیوں ختم ہونے پر آتی۔ اب یاد بھی کسے۔ صرف ایک دو فقرہ نہ بھولنے والا لوح حافظہ پر نقش رہ گیا۔ محمد علی ذکر سلطان اور اہل نجد کی تنگ ذہنیت اور عدم مسالمت کا کر رہے تھے۔ اس میں بولے کہ:

''میں نے ابن سعود سے کہا کہ حرم مکہ پر حق ہر کلمہ گو اور اہل قبلہ کا یکساں ہے۔ یہ حق تنہا آپ کے فرقہ بلکہ محض اہل سنت کا بھی نہیں۔ یہاں تو اہل ضلالت کو بھی اپنے اپنے طریق پر عبادت کا حق حاصل ہے۔ شیعوں کو میں ضلالت پر سمجھتا ہوں، لیکن انھیں بھی یہاں آکر اپنے طریق پر حج و زیارت کے رسوم ادا کرنے کی آزادی حاصل ہونا چاہیے''۔

شیعہ رئیس سے خود اسی کے مکان پر گفتگو میں شیعیت کو صراحت کے ساتھ ''ضلالت'' کہہ ڈالنا، یہ حق گوئی اور صاف بیانی محمد علی ہی کا حصہ تھی۔ سامنا لندن میں (وفد خلافت کے موقع پر) برطانیہ کے باجبروں وزیر اعظم لائڈ جارج کا ہو تو، مکہ معظمہ میں سلطان ابن سعود کا ہو تو، ہندوستان میں کسی رئیس کا، کسی حاکم کا، کسی عزیز قریب کا، کسی مخلص دوست کا، کسی محترم لیڈر کا ہو تو، وہ کسی حال میں دل میں آئی ہوئی زبان پر لانے سے نہ چوکتے، اور جو کچھ بھی اندر ہوتا اسے باہر لانے سے نہ رکتے۔ اس ایک زبان نے خدا معلوم کتنوں سے انھیں لڑا دیا، کتنوں کو ان کا دشمن بنا دیا۔ لوگوں سے اچھی خاصی دوستانہ باتیں خوش مزاجی اور لطائف و ظرائف کے ساتھ کرتے ہوتے، ہنستے جاتے، ہنساتے جاتے کہ یک بیک جنگ بھی شروع ہو جاتی! یہ منظر ایک دفعہ کا نہیں، بارہا دیکھا ہوا ہے...... ایک حدیث نبویؐ میں حضرت عمرؓ کے فضائل میں ایک جگہ آیا ہے کہ حق گوئی کی عادت نے عمرؓ کا کوئی دوست باقی نہ رکھا۔ اس کی عملی تصدیق ایک چھوٹے پیانہ

پر محمد علی کی زندگی سے ہو جاتی تھی!

....

باتیں راجہ صاحب کے کمرہ میں اسی انہماک کے ساتھ ہو رہی تھیں کہ ایک خبر دینے والے کی اطلاع پر میں باہر نکل آیا۔ دیکھا تو اپنا پرانا ملازم ورفیق ہاتھ میں تار لیے کھڑا ہے۔ تار دریاباد سے تھا۔ ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ بیوی کو بیمار اور زیادہ بیمار چھوڑ کر محض محمد علی کے شوق زیارت میں لکھنؤ چلا آیا تھا۔ تار میں یہ تھا کہ ان کی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی ہے۔ غش پر غش آرہے ہیں۔ زمین پیروں کے نیچے سے سرکتی معلوم ہوئی "پائے رفتن نہ جائے ماندن" کا صحیح موقع۔ نہ دل کو یہ گوارا کہ محمد علی کو چھوڑ کر چلا جاؤں اور نہ یہی بن پڑتا کہ محبوب بیوی کو اس حال میں اتنی دور پڑا رہنے دوں۔ محمد علی نے تار پر نظر کی، اور معاً بولے "آپ ہرگز نہ رکیے، فوراً روانہ ہو جائیے اللہ بیچاری کو جلد شفادے، یہاں ہم سب لوگ دعا کریں گے"...... میں خود بھی شاید اس سے زیادہ بیتاب نہ ہوا ہوں جتنا بے قرار محمد علی ہو گئے۔ ہمدردی، محبت، غمگساری کا تو یہ شخص پتلا تھا۔ قطب میاں صاحب فرنگی محلی (محمد علی کے میزبان) پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے، ان بیچارہ نے فوراً اپنا موٹر پیش کر دیا اور میں اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا۔ اور اپنے عقیدہ میں تو اسے ایک بڑی حد تک محمد علی ہی کی مخلصانہ دعاؤں کا اثر سمجھتا ہوں کہ بیوی کی جان بچ گئی اور چند روز بعد صحت حاصل ہو گئی۔

....

ستمبر میں خلافت مرکزی کمیٹی کا جلسہ حسب معمول دہلی میں ہوا اور یہ جلسہ بڑے معرکہ کا تھا۔ محمد علی کی مخالفت پر بزرگان پنجاب تیار ہو کر آئے تھے اور خبر گرم تھی کہ اب کی جلسہ میں محمد علی کے پرزہ اڑا کر رکھ دیے جائیں گے......اب خلافت کا کون سا جلسہ معرکے کا نہیں ہوتا تھا؟ اور کس میں یہ خبریں گرم نہیں ہوتی تھیں؟ جلسہ میں پنجاب کے ایک معزز رکن خلافت نے جو ایک اہل حدیث عالم دین کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے تھے، سوال کیا کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اب کی زمانہ حج میں مولانا محمد علی نے صحن حرم میں بیٹھ کر سلطان ابن سعود کو گالیاں دیں (یا برا بھلا کہا)؟ سوال سن کر جلسہ بھر کے کان کھڑے ہو گئے اور محمد علی کے ہمدرد وہواخواہ دل میں فکر مند ہو گئے کہ

دیکھئے اب کیا جواب ان سے بن پڑتا ہے۔ مگر محمد علی بغیر کسی فکر واندیشہ کے شائبہ کے برجستہ بولے کہ ''جی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطان ابن سعود کو گالیاں صحن حرم میں نہ میں نے بیٹھ کر دیں نہ لیٹ کر، نہ کھڑے ہو کر نہ اور کسی وضع و ہیئت سے''! اس جواب کا وا ہونا تھا کہ محفل میں قہقہہ پڑ گیا اور معترض صاحب بیچارہ بجھ سے گئے۔

چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ پر بھی لوہے لگ جاتے تھے۔ ایک مستقل پارٹی تل کر آئی کہ محمد علی کی مخالفت قدم قدم پر کرے گی اور یہی ہوا کرتا۔ بے بات کی بات پیدا ہو جاتی، نزاع لفظی شروع ہو جاتی اور پھر نوبت سخت سے سخت ذاتی حملوں کی آنے لگتی۔ یہ حقیقت انتہائی دردانگیز تھی، کہ جو وقت مفاد ملی کے ٹھوس اور تعمیری کاموں میں صرف ہونا تھا، اس کا بڑا حصہ اس آپس ہی کے سب وشتم، طنز وتعریض کی نذر ہو جاتا...... یہ اور بات ہے کہ تقریباً ہر معرکہ میں آخری بات مولانا اور ان کے مخلصوں اور رفیقوں ہی کی غالب رہتی اور عموماً فیصلہ وہی ہوتا جو مولانا کے مدنظر ہوتا۔

....

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں عموماً اس کے صرف ممبر ہی شریک ہوتے۔ لیکن کوئی خاص ممانعت باہر کے لوگوں کے لیے نہ تھی۔ اس لیے کبھی کبھی کچھ غیر لوگ بھی تماشائی کی حیثیت سے آبیٹھتے۔ آج کے جلسہ میں ممبروں کو ایک دوسرے کی زبان سے اپنی تفضیح کے سننے کا اور زیادہ خیال تھا۔ اس لیے دل سب کا یہی چاہتا تھا کہ آج کی محفل اغیار سے بالکل خالی ہو لیکن خود یہ کہنے کے لیے بھی ذرا ہمت کی ضرورت تھی۔ جو ممبر کہتا اس کی بدنامی رکھی ہوئی تھی۔ ایسی ایسی بدنامیوں کی پروا محمد علی کو کب تھی۔ وہی جلسہ سے اٹھ کر گئے اور وزیٹر حضرات سے کہا کہ ''آپ لوگ براہ کرم باہر تشریف رکھیں، ہم لوگ آج کے جلسہ میں کسی غیر کی موجودگی نہیں چاہتے''۔ بیٹھے ہوؤں سے کوئی اٹھ جانے کو کہے تو طبعاً یہ چیز گراں ہی گزرتی ہے، چہ جائیکہ ہم لوگوں کو جو تکلیف کے عادی ہیں اور ایسی فرمائش کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اتفاق سے دو کھدر پوش سب سے قریب بیٹھے ہوئے تھے اور وہی براہ راست اس حکم کی زد میں آئے۔ ان میں سے ایک صاحب جامعی تھے اور مولانا سے قرب وتخصیص کا تعلق رکھنے والے۔ قدرتاً ان پر اس حکم کی تعمیل گراں

گزری اور قریب تھا کہ چہرہ کے آثار انقباض احتجاج کی کوئی عملی شکل اختیار کریں کہ معاً ان کے رفیق نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، اور بڑی خندہ بنی کے ساتھ انھیں لیے باہر چلے گئے......ان رفیق صاحب کے چہرہ پر عجیب قسم کی نورانیت برس رہی تھی، داڑھی کے بالوں کے سیاہ ہونے کے باوجود نورانیت ۔(نورانیت سفیدی کے مرادف نہیں) ''نورانیت'' کا لفظ بے محل و مبالغہ آمیز معلوم ہو رہا ہو تو جانے دیجیے، شرافت رکھیے۔ خوب سفید براق کھدر کی شیروانی پہنے ہوئے چہرہ پر نوعمری کے باوجود خاصی اور خوشنما داڑھی۔ دبلے پتلے، کسی قدر کشیدہ قامت، بشرہ پر ذہانت، متانت، انکسار و خودداری کے آثار بیک وقت نمایاں۔ میرے باہر نکلتے ہی ان سے تعارف ہوا۔ معلوم ہوا جامعہ کے نامزد شدہ پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ایم اے، پی ایچ ڈی ہیں۔ جرمنی سے ڈگری لے کر ابھی ابھی واپس آئے ہیں۔ جو شخص آگے چل کر ملک و ملت میں بڑائی اور بڑی بڑائی حاصل کرنے والا تھا، اس میں بڑائی کی صلاحیتیں اس وقت سے نمایاں تھیں......کیا حرج ہے اگر اس ڈائری کے اوراق میں محمد علی ہی کے ضمن اور ذیل میں محمد علی والوں سے بھی بے تکلف ہو چلے!

باب:63

15:1926

(حربِ عقائد کا تماشہ)

محمد علی کی زندگی ہی مخالفتوں میں کٹتی تھی۔ آج اس سے جنگ کل اس سے جنگ، سن جوں جوں بڑھتا گیا، مخالفتوں کا ہجوم بھی ترقی کرتا رہا۔ 26 میں یہ مخالفتیں پورے شباب پر پہنچ گئیں۔ سلطان ابن سعود والی حجاز سے حجاز کے معاملہ میں مولانا کو اختلاف ہوا اور سلطان چونکہ اتفاق سے حنبلی تھے، یعنی عقائد وفقہیات میں بڑی حد تک اہل حدیث کے ہم مذہب، اس لیے ہندستان کے اہل حدیث نے سلطان کے مخالف کو اہل حدیث کا مخالف سمجھ لیا۔ اور اب صورت یہ ہوئی کہ ہندوستان کے سارے اہل حدیث محمد علی کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھنے لگے..... گویا محمد علی بھی کوئی زبردست ''بریلوی'' یا کسی حزب الاحناف کے صدر یا مقلدوں کے کوئی امام ومقتدا تھے! حالانکہ اس غریب کو مذہبیات کے جزوی اختلافات کی طرف توجہ کی بھی کہاں فرصت تھی! لیکن یہ الزام ان پر تھپ گیا تھا اور اب خود ان ہی کے الفاظ میں تمام ''غیر مقلد مقلدین ابن سعود'' ان پر ہر طرف سے نرغہ کیے ہوئے تھے۔ اخبارات ان کے مخالف، جلسوں میں ان کی مخالفت، فتوے ان کے خلاف نکل رہے ہیں۔ اس مخالفت کی سیاسی امامت پنجاب کے مولوی ظفر علی خاں صاحب کے ہاتھ میں، جو خود بھی کوئی پیشہ ور مولوی نہیں بلکہ علی گڑھ ہی کے اولڈ بوائے اور گریجویٹ اور

مولانا شوکت علی کے ہم سبق تھے۔لاہور کا کثیر الاشاعت روزنامہ زمیندار ان ہی کا تھا، اور وہ ہمدرد کو حریف سمجھ کر ہر وقت اسے نیچا دکھانے کی فکر میں۔اب ہمہ وقت ظفر علی خاں کی آویزش محمد علی سے۔ ہر محفل میں یہی تذکرے ہر جلسہ میں یہی چرچے...... پچھلے نمبروں میں ان معرکہ آرائیوں کے کچھ ہلکے سے نمونے تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔اب زیادہ سن کر اور دیکھ کر کیا کیجیے گا۔

....

ادھر کے غالیوں کے جواب میں ادھر بھی اہل غلو کی کمی نہ تھی۔اور بیسیوں جوابی انجمنیں ادھر بھی قائم ہو چکی تھیں۔لکھنؤ کی انجمن خدام الحرمین نے ایک بڑا سا استفتاء مرتب کر کے فتویٰ یہاں تک دے دیا تھا کہ جب حالات ایسے پر خطر اور ناخوشگوار ہو جائیں جیسے کہ سعودی حکومت نے کر رکھے ہیں تو حج کے لیے سفر کر کے جانا بھی درست نہیں رہے گا اور جن پر حج واجب ہو چکا وہ اپنے فریضہ کو اصلاح حال کے وقت کے لیے ملتوی کر سکتے ہیں......فرنگی محل کے مشہور عالم مولانا عبدالباری صاحبؒ شروع سال میں انتقال کر چکے تھے، اس لیے اب غالیوں کو قابو میں رکھنے والی کوئی شخصیت رہی بھی نہ تھی۔جو جس کے قلم نے چاہا بے تکان لکھ ڈالا۔بڑوں کے اٹھ جانے سے چھوٹوں کی یہ حالت ہو ہی جاتی ہے...... محمد علی ہرگز اس حد تک نہیں گئے تھے۔ان کا کہنا صرف یہ تھا کہ اگر سعودی حکومت نے اپنی زیادتیوں کی اصلاح نہ کی اور ہر کوشش ناکام رہی تو بطور آخری چارۂ کار کے ایک حربہ یہی ہے عالم اسلامی کو التواء حج کا مشورہ دیا جائے اور اس طرح حکومت سعودیہ پر معاشی بار اور مالی دباؤ ڈال کر انھیں راہ راست پر لایا جائے۔لیکن عام مخلوق احتمال اور وقوع کے ان باریک فرق کو کیا سمجھتی اور کون چاہتا تھا کہ وہ سمجھے، ایک شور مچ گیا کہ محمد علی حج کو روک رہے ہیں! اب فتووں کی دیر تھی، جو حج سے روکے وہ "یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" کا مصداق ہے اور اس کے گنہگار نہیں، کافر ہونے میں کیا شبہ تھا! محمد علی اسلام پر مر مٹنے والا اور دین کی خاطر زندہ رہنے والا، اب مرتد تھا، خارج از ملت تھا، بیگانۂ اسلام تھا۔

اس کشمکش اور چپقلش سے مولانا کے نیاز مند بھی کب بچ سکتے تھے، اور پھر یہ نیاز مند خصوصی جو اتفاق سے اودھ خلافت کمیٹی کا صدر بھی تھا۔مولوی ظفر الملک علوی (اللہ ان کی مغفرت فرمائے) بھی ان ہی لوگوں میں تھے جو حمایت ابن سعود میں غلو رکھتے تھے اور ہماری خلافت کمیٹی

کے خاص رکن بھی تھے۔ ان کی آویزش ناگزیر سی ہوگئی اور پھر سچ (صدق کا پرانا نام) کے مہتمم اور عقل کل بھی وہی تھے، مجھ سا عافیت پسند بھلا جھگڑوں، بکھیڑوں کا کہاں عادی۔ جی میں یہی آیا کہ سچ کی ایڈیٹری اور خلافت کمیٹی کی صدارت دونوں ہی سے استعفیٰ داخل کر دیا جائے۔ اکتوبر کے آخری ہفتوں میں مولانا کو خط لکھا کہ ان دونوں باتوں کی اجازت مرحمت ہو۔ اور مسئلہ التوائے حج میں بھی اپنے مسلک کی ذرا وضاحت فرمادی جائے۔ ہمدرد کے اسٹاف کے ایک صاحب کے ہاتھ 4 نومبر کا لکھا ہوا خط موصول ہوا۔ اس میں یہ الفاظ تھے:

(1) التوائے حج کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ حال میں ہمدرد میں جو آرٹیکل لکھا گیا ہے اس کے بعد غالباً ان سوالات کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر اب بھی اس مضمون میں کوئی بات رہ گئی ہو تو آپ اور سوالات لکھیں، ان کا جواب دے دیا جائے گا۔

(2) ادھر خلافت کمیٹی کے استعفیٰ پر بہت ناراض ہوئے۔ فرماتے ہیں کہ یہ وقت نہیں کہ آپ اس طرح علاحدہ ہو جائیں۔ مخلصین کو ''دل شکن'' اور ''حوصلہ فرسا'' تجربات ہوتے ہی رہتے ہیں، تو پھر کیا ان سے گھبرا کر کام چھوڑ دیا جائے؟

(3) مولانا نے سچ کے بند کرنے کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی اور اسی مذاقیہ لہجہ میں ذکر فرمایا جو گزشتہ مرتبہ مرکزی کمیٹی کے جلسہ سے واپسی کے وقت تھا۔

(4) مولانا آج کانپور جا رہے ہیں، 8 نومبر کو واپس آجائیں گے۔

کانپور میں اس وقت سالانہ جلسہ ندوۃ العلماء کا تھا۔ مجلس ندوۃ کا شمار اس وقت تک ملک کی مشہور مجلسوں میں تھا، اور گو اس کی شہرت کا شباب مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا، پھر بھی اس کے نام میں خاصی کشش تھی۔ اور گمنامی سے تو یہ ادارہ اب بھی بہت دور تھا۔ سالانہ جلسہ اسی کا تھا، اور کانپور کے نامی گرامی تاجر چرم حافظ محمد حلیم نے بڑی اولوالعزمی کے ساتھ سب کی مہمانداری کا انتظام کیا تھا۔ جلسۂ ندوہ کی صدارت ایک بڑے امتیاز کی چیز سمجھی جاتی تھی اور اس سال کا انتخاب قرعہ دہلی کے طبیب نامور اور وقت کے مشہور سیاسی لیڈر حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب کے نام پڑا تھا۔ مولاناؒ کی شرکت کے بغیر اس وقت مسلمانوں کا ہر جلسہ سونا اور بیکار تھا۔ بڑے اصرار سے مولانا کی طلبی ہوئی اور مولانا کچھ اپنے اس طبعی تقاضا سے کہ مسلمانوں کے ہر ادارہ، ہر

مجمع تک تبلیغ وپیام رسانی کا موقع بہرحال مل جائے، اور کچھ دوستوں کی مروت سے بھی مجبور ہو کر کہ ''آزردن دل دوستاں جہل است وکفارۂ یمین سہل'' اپنے سوکام حرج کر کے بہرحال دہلی سے کانپور آئے، اور جلسہ میں تقریر کی اور حسب معمول جلسہ پر چھائے رہے۔

مدعو مولوی ظفر علی خاں بھی تھے۔ اور پبلک کو شوق ان کے اور مولانا کے مقابلہ کے دیکھنے کا..... قوم میں ''تماشا پسندی'' کا ذوق اس قدر رچا ہوا ہے کہ مرغ بازی کی سیر نہ کی، اور بٹیروں کی پالی نہ دیکھیں، لیڈروں کی ٹکر کا تماشہ دیکھ لیا..... جدھر دیکھیے یہی سرگوشیاں کہ ''اب کیا ہوگا، ادھر مولانا آگئے، ادھر ظفر علی خاں بھی تو آرہے ہیں''۔ ندوہ کے جلسہ کو ظاہر ہے کہ سلطان ابن سعود کی مخالفت یا موافقت سے نفیاً اثباتاً کوئی تعلق نہ تھا لیکن ہم لوگوں کے دماغوں کی رسائی اصولی بحثوں تک کہاں۔ یہاں تو مزہ بس اسی میں آرہا تھا کہ دو مشہور شخصیتوں کی آپس میں ٹکر ہو اور ہر عامی کو اس پر رائے زنی کا موقع ملے!

مولوی ظفر علی خاں صاحب ہی تک بات رہتی جب بھی غنیمت تھا۔ حرب عقائد تو وہ بلا ہے، اور اپنے جزویات عقائد میں غلو کا فتنہ تو وہ ابتلاء عظیم کہ جو لوگ اب تک مولانا کے خاص مخلصین میں سے تھے لیکن ساتھ ہی عقائد میں ہم زبان سلطان کے تھے، وہ تک بھی اب مولانا سے برگشتہ ہو گئے تھے، اور ان ہی مخلصین میں سے دارالمصنفین اعظم گڑھ کے بعض ندوی اکابر بھی تھے۔ مجھ جیسے نیاز مند طرفین کے لیے بڑا سخت وقت یہ تھا۔ سچ بھی چونکہ اپنے نرم انداز میں مولانا کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہ حضرات خود سچ اور مدیر سچ سے بھی بدگمان ہو چکے تھے۔ ان اکابر سے اور مولانا سے آج عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی اور خیال تھا کہ شکایتوں کا دفتر کھلے گا، اور نوبت خاصی تلخیوں کی آجائے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہاں تک نوبت نہ آنے پائی اور معاملہ معمولی گلے شکووں پر ختم ہو گیا..... مولوی ظفر علی خاں صاحب کی آمد تو یاد نہیں پڑتی۔ مولانا نے بعد ظہر کے جلسہ میں تقریر کی۔ حسب معمول پرزور اور دلچسپ، اور تقریر کے بعد لکھنؤ کے لیے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ یہ خاکسار بھی ہمرکاب ہوا۔ مولانا کو چلتے چلاتے عموماً دیر ہو ہی جاتی تھی کچھ ایسی ہی صورت آج بھی پیش آئی اور جب بھاگا بھاگ اسٹیشن پہنچے ہیں تو گاڑی آئے ہوئے کچھ دیر ہو چکی تھی اور انجن پانی لے رہا تھا۔

باب:64

16:1926

(زندہ دلی کا کرشمہ۔نئی فتنہ سامانیاں)

شروع نومبر کا سہ پہر، وقت آخر عصر کا، کانپور کا لق و دق اسٹیشن۔ جی آئی پی کا جھانسی لکھنؤ میل چھوٹنے کو ہے، کہ دو شخص موٹر پر بھاگا بھاگ اسٹیشن پہنچتے ہیں اور جھٹ پٹ ٹکٹ لے لو اور اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنٹیر دں (رضا کاروں) کی مدد سے درجہ میں پھینک پھانک ایک سیکنڈ کلاس میں جا داخل ہوتے ہیں۔ دو انگریز بمبئی سے بیٹھے چلے آرہے ہیں۔ دونوں نو وارد ٹھیٹھ ہندستانی اسلامی لباس میں ملبوس۔ کھدر پوش، عبا پوش، داڑھیاں رکھائے ہوئے، ایک جو مخدوم تھا وجیہ اور جامہ زیب، دوسرا جو کچھ خادم سا تھا، کریہہ المنظر اور بد قطع۔ دونوں صاحب بہادران نو واردوں کا کینڈا دیکھ کچھ ہنسے کچھ مسکرائے۔ عجب نہیں جو یہ سمجھے ہوں کہ سیکنڈ کلاس بلا ٹکٹ گھس آئے ہیں، یا ریل کے بابو شاہی روزہ مرہ میں ''ود آؤٹ''(with out) والے ہیں۔ خوش قطع نو وارد نے اس برتھ پر قبضہ جما لیا جس پر ''صاحب'' پہلے سے جمے ہوئے تھے۔ گاڑی چلی اور گنگا کا پل بات کہتے آ گیا۔ ادھر پہیوں سے گھڑ گھڑ کی آواز نکلی ادھر صاحب بہادر دونوں دیسی آدمیوں کی طرف دیکھ، چھیڑ کی ادا سے مسکرائے اور منہ بنا کر بولے(so this is mother Ganges) یہی گنگا مائی ہیں! طنز کا زور لفظ (Mother) پر تھا، اور طنز ہندو

عقیدہ پر تھا، جو"صاحب" کے خیال میں عام ہندستانی عقیدہ تھا۔ پاس کا کھدر پوش معاً چائے کی پیالی منہ سے ہٹا اور انگریزی زبان میں، انگریزی کے لب ولہجہ میں بولا "اچھا تو آپ سے یہ رشتہ ہے! مرد آدمی یہ دریا کو مائی اور موسی، اماں اور خالہ کہنا کیا معنی؟" یہ تڑاق سا جواب دیا "صاحب" سناٹے میں آ گئے...... یہ تڑپڑ جواب دینے والا محمد علی تھا اور اس کا ساتھی کہیے یا "تابع مہمل" کہیے یہ ڈائری نویس۔

....

"صاحب" بیچارہ کو یہی گمان نہ تھا کہ چہرہ پر داڑھی اور سر پر پٹے رکھائے ہوئے اور جسم پر ڈھیلی ڈھالی عبا پہنے ہوئے ہندستانی کچھ انگریزی جانتا ہوگا، چہ جائیکہ اتنی انگریزی کہ ایسا شستہ اور برجستہ جواب دے سکے! کچھ دیر غوطہ میں رہے، پھر ادھر سے منہ پھیر، اپنے ہم جنس رفیق سفر سے گفتگو کرنے لگے۔ اتفاق سے موضوع گفتگو تھا کرکٹ۔ ولایت سے مشہور ٹیم ایم سی سی نئی نئی ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ دونوں صاحب بہادر لگے آپس میں گفتگو کرنے کہ فلاں کھلاڑی ایسا ہے اور فلاں ایسا۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ محمد علی سے نہ رہا گیا۔ بول اٹھے "دخل در معقولات معاف۔ آپ رائے زنی میں بڑی زیادتی کر رہے ہیں"۔ اور لگے تفصیل وتشریح کرنے کہ فلاں میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں یہ خرابی ہے۔ ہوتے ہوتے تبصرہ نفس کرکٹ پر شروع ہو گیا۔ اور گویا انگلستانی کرکٹ کی تاریخ بیان ہونے لگی، فلاں سنہ میں گیند پھینکنے کا انداز یہ تھا اور فلاں زمانہ میں بیٹ مارنے کا یہ۔ فلاں شہر کی زمین پر گیند یوں گدا کھاتا ہے اور فلاں شہر کی زمین پر یوں۔ بولنے والا اب گفتگو یوں کر رہا تھا، یہ کہیے کہ کرکٹ کے فن پر کوئی انسائیکلوپیڈیا کا آرٹیکل فرفر سنا رہا تھا۔ صاحب بہادر حیرت سے دم بخود کہ یہ عبا قبا والا ملا تو کرکٹ بازوں کا بھی استاد نکلا! ایک مرتبہ گھبرا کے بولے "آپ کو بڑی معلومات کرکٹ کے متعلق ہیں" انھوں نے کہا "ایک مجھی کو کیا، ہر علی گڑھی کو ایسی ہی معلومات ہوتی ہیں۔ اچھا تو آپ علی گڑھ کے پڑھے ہیں، کپتان رہے ہوں گے؟" جی نہیں، میں تو معمولی کھلاڑی تھا، کپتان بڑے بھیا (Big Brother) تھے۔ یہ Big brother کی اصطلاح مولانا شوکت علی کے لیے محمد علی ہی کی چلائی ہوئی تھی اور سارا انگریزی پریس اس سے واقف ہو چکا تھا۔ صاحب نے اپنے نزدیک بڑی پہیلی بوجھی اور پکار اٹھے:

You talk like Muhammad Ali.

''یہ تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں!'' یہ جھٹ سے بولے

I am Muhammad Ali.

''زبان کیسی، خود ہی محمد علی ہوں''۔ صاحب کی حیرت اب دیکھنے کے قابل تھی۔ آنکھیں پھاڑے اور نظر اسی کھدر پوش کے چہرہ پر جمائے ہوئے بولے ارے وہی محمد علی، جو مشہور علی برادران میں سے ہیں''۔ انھوں نے چمک کر جواب دیا

Yes, the younger and more sharp tounged of the two

''جی ہاں وہی جو دونوں میں چھوٹا اور زیادہ زبان دراز ہے''۔

....

صاحب کو اب کی اپنی حیرت کے دور کرنے میں دیر سیکنڈوں کی نہیں، منٹوں کی لگی، بے چین اور بے قرار، پہلو پر پہلو بدل رہے ہیں۔ اور ٹکٹکی ہے کہ محمد علی کے چہرہ کی طرف لگی ہوئی۔ محمد علی نے یہ جو دیکھا تو صاحب بہادر کو اور چھیڑنا شروع کر دیا۔ بولے ''یہ میرا نام سن کر اتنی گھبراہٹ کیوں؟ کیا یہ خیال ہے کہ علی برادران جہاں کسی انگریز کو دیکھ پاتے ہیں تو بس اس پر جھپٹ پڑتے ہیں؟ تو اطمینان رکھیے اطمینان، دیکھ لیجیے (ہاتھ دکھا کر) یہ میرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں۔ حملہ وملہ کا تو خیال بھی دل میں نہ لائیے''۔ صاحب کے ہاتھ میں ٹائمس آف انڈیا کا پرچہ تھا، بمبئی کا یہ مشہور انگریزی روزنامہ (Sheppard) نام ایک انگریز کی ایڈیٹری میں مولانا کا خاص طور پر مخالف تھا اور روز کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑتا رہتا تھا۔ اسے محمد علی کی طرف بڑھا کر بولے ''اچھا ان الزامات کا کیا جواب جو یہ روز آپ پر لگاتا رہتا ہے''۔ محمد علی نے پرچہ کو تو چھوا نہیں بولے ''اسے آپ ہی پڑھیے، میں پرچہ کو نہیں پرچہ کے ایڈیٹر کو خوب پڑھ چکا ہوں۔ یہ آکسفورڈ میں میرے زمانہ میں تھا۔ مجھ سے پیچھے، آتا جاتا، اس کو اس وقت بھی کچھ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ (بھیڑیوں کے) گلے تو آپ نے بھی بغیر گلہ بان کے دیکھے ہوں گے لیکن گلہ کے بغیر گلہ بان کا نادر وجود ان ہی حضرت کا ہے''...... یہ سارا لطیفہ تھا (Sheppard) اور Sheppard کی

تجنیس لفظی پر!..... گفتگو اس کے بعد آکسفورڈ پر چلی، پھر عام انگریزی معاشرت، خصوصاً نسوانی بے حجابی پر، یہاں تک کہ لکھنؤ اسٹیشن آ گیا۔

محمد علی تبلیغ سے کسی وقت بھی چوک جانے والے نہ تھے۔ کچھ نہ سہی، اس انگریز کے سامنے انگلستان کی معاشرتی زندگی ہی کے مکروہ پہلو پیش کر دیے۔

....

26 ختم ہو رہا تھا اور دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں، اور محمد علی کانگریس میں شرکت کے لیے گوہاٹی (آسام) گئے ہوئے تھے۔ کہ دہلی میں مشہور آریہ سماج لیڈر شردھانند جی کو ایک پر جوش و دیندار مسلمان قاضی عبدالرشید نامی نے قتل کر دیا۔ شدھی کی تحریک اور مسلمانوں کو مرتد بنانے میں یہ سوامی جی بہت آگے آگے تھے، مسلمان ان سے جلے ہوئے اور ان کے خلاف بھرے ہوئے تھے، یہاں تک کہ ایک نے ان پر ہاتھ صاف کر ہی دیا۔ شردھانند جی کی حیثیت ایک مذہبی پیشوا کی ہی نہ تھی، وقت کے نامور سیاسی لیڈر بھی تھے۔ انتقام کی آگ جو ہندوؤں میں عموماً اور آریہ سماجیوں میں خصوصاً بھڑکی، اس سے معلوم یہی ہونے لگا کہ اب کسی چوٹی کے مسلمان لیڈر کی بھی جان گئے بغیر نہ رہے گی۔ اب مسلم لیڈر تھا کون، جسے چھوٹے بڑے سب غیر مسلم بھی مسلم لیڈر سمجھ رہے ہوں؟ اس کا جواب کچھ مشکل نہ تھا۔ ہر شخص نے محمد علی ہی کو سمجھا اور ایک دو دن نہیں، ہفتوں یہی دھڑکا محمد علی کے سارے نیازمندوں کو لگا رہا کہ دکھا چاہیے کہ ان کی شہادت کی خبر کب آ جاتی ہے۔ جب خاصی مدت گزر لی، تب اطمینان ہوا..... دسمبر یا جنوری تھا، جب خلافت کی مرکزی کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کے جلسے ہوئے اور یہ طے پایا کہ خلافت کا آئندہ سالانہ اجلاس لکھنؤ میں آخر فروری میں منعقد کیا جائے، انتظامات کی ذمہ داری، کیا بحیثیت صدر اودھ خلافت کمیٹی اور کیا بحیثیت صدر مجلس استقبالیہ، اسی ڈائری نویس کے سر پڑی۔ اور اپنے مذاق طبیعت کے بالکل برعکس ان انتظامی ذمہ داریوں کو منظور کرنا پڑا، زیادہ تر محمد علی ہی کی خاطر سے اور ان ہی کی مروت میں! اپنے دنیا کے دوستوں، رفیقوں، بزرگوں میں اس وقت محبوب ترین ہستی اگر تھی تو محمد علی ہی کی تھی۔

.....☆☆☆.....

باب:65

17:1926

(از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارد)

1926 آخری سہ ماہی کی کوئی تاریخ۔ مولانا آج سہ پہر کو دہلی سے لکھنؤ آرہے ہیں۔ حسب دستور دریاباد سے چل کر لکھنؤ اسٹیشن پر ان کے استقبال کو حاضر۔ گاڑی سے اترتے ہی بھرے پلیٹ فارم پر مجھ پر برس پڑے۔ "کیوں صاحب، یہ بیچ میں ایسے مضمون آنے لگے جو مجھے اور حسن نظامی کو ایک درجہ پر رکھ رہے ہیں"...... خفگی کے پورے الفاظ سننے سے قبل اصل قصہ تو سن لیجیے۔ عین جس وقت ظفر علی خاں صاحب اور پنجاب خلافت پارٹی اور ہندوستان کے اہل حدیث کے نرغہ میں مولانا گھرے ہوئے تھے، کہ دوسری جنگ پوری شد و مد اور انتہائی تلخی اور تندی کے ساتھ دہلی کے مشہور و معروف خواجہ حسن نظامی سے چھڑ گئی۔ خواجہ صاحب کے ہاں سے بہت معقول اجرتی کام ہمدرد پریس کو ملتا رہتا تھا۔ مولانا کو اپنے جوش حق گوئی میں مالی نقصانات کی پرواہی کب ہوتی تھی۔ اس جذبۂ حق گوئی کے آگے تو وہ اپنا سب کچھ نثار کر دینے کو جیسے ہر وقت تلے بیٹھے رہتے تھے۔ محمد علی کے ہاں جوش اور جوش غضب بہت تھا۔ لیکن وہ بہر حال اپنے کو معین حدود کے اندر مقید کیے ہوئے تھے۔ فریق مقابل قیود و حدود سے ہر طرح آزاد تھا۔ علاوہ اور رسالوں اور پرچوں کے ایک مستقل روزنامہ خواجہ صاحب نے "غریبوں کا اخبار" کے نام سے محمد علی کی مخالفت میں نکال دیا اور چند روز تک خوب

اس میں روزانہ ایک نئی پھلجڑی چھٹراتے رہے۔ مثلاً کبھی یہ کہ میں دہلوی ہوں خالص دہلوی اور یہ محمد علی رامپوری ہیں، بیرونی ہیں، آفاقی ہیں۔ میں سید ہوں اور فلاں فلاں بزرگ میرے اجداد میں ہیں، محمد علی کا نسب نامہ اس کے مقابلہ میں بالکل مجہول ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور دنیا کی شاید کوئی بڑی سے بڑی معصیت ایسی نہ ہو جس کا انتساب مولانا کی جانب نہ کیا گیا ہو۔

....

سچ (صدق کا نقش اول) میری ادارت میں شروع 25 سے نکل رہا تھا۔ اس کی بچی باتوں کے ذیل میں اس وقت کسی ہفتہ یہ لکھ دیا گیا تھا کہ مسلمان لیڈروں کے درمیان باہمی جنگ کب تک جاری رہے گی؟ اور ایک دوسرے کی کمزوریوں سے قطع نظر کرنا اور آپس میں رواداری، فراخ دلی کا برتاؤ کرنا آخر کب آئے گا؟ ملت کی یکجہتی کے لیے لازم ہے کہ اختلاف خیال و مسلک کے باوجود سب مسلم اکابر آپس میں متحد عمل ہوں، اور ایک دوسرے پر گندگی اچھالنا چھوڑیں۔ خواجہ صاحب کے حلقہ میں ایک بڑے مخلص و سنجیدہ شخص واحدی صاحب تھے۔ انھوں نے اس کا مصالحانہ مضمون کو الگ ایک ورق پر چھاپ کر دہلی میں اس کی بکثرت اشاعت کی۔ خواجہ حسن نظامی کا نام بھی لکھنے والے کے ذہن میں لکھتے وقت نہ تھا لیکن دہلی کی فضا میں اس کا تعلق اسی ''عمل ختم خواجگی'' سے سمجھا گیا۔ اور خیال یہ پھیلایا گیا کہ سچ نے نرم، شستہ اور مہذب انداز میں ہمدرد و صاحب ہمدرد کو ٹوکا ہے...... خفگی اسی سلسلہ میں تھی۔ اور اب وہ ڈانٹ پوری کی پوری بھی سن لیجیے، جو مدیر سچ پر، روز روشن میں لکھنؤ اسٹیشن کے بھرے پلیٹ فارم پر پڑ رہی تھی:

''یہ آپ بھی ان ہی لوگوں میں ہو لیے۔ جو آج تک حضرت علیؓ اور معاویہؓ میں فرق نہ کر سکے یہ ٹھیک خوارج کی ذہنیت ہے، جنھوں نے کبھی تحقیق کی زحمت گوارا نہ کی کہ حق پر کون اور ناحق پر کون۔ آپ نے بھی ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنا شروع کر دیا۔ محض صلح کرو، صلح کرو، صلح کرو کی رٹ لگا دی یہ نہ دیکھا کہ کون کس پر کتنی زیادتی کر رہا ہے۔ مجھے اگر آپ ناحق پر پاتے ہیں تو ضرور ٹوکیے، کھلے اور صاف لفظوں میں ٹوکیے، لیکن پہلے تحقیق کیجیے، میرا جرم بتایئے۔ یہ کیا کہ سب کو ایک درجہ پر رکھ دیا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی تحریر سے وہ گروہ کتنا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ آپ کی نیت جو کچھ بھی ہو، بہر حال آپ نے ایک حربہ تو اپنے سیدھے پن سے ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ لوگ وہ اشتہار

ایک ایک کو دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لو، بچ تک نے محمد علی کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آپ سے ہرگز اس کی توقع نہ تھی''۔

....

محمد علی سے اب ایک عالم کی جنگ تھی۔ حکومت کے باغیوں میں تو وہ تھے ہی، اور یہ جنگ مستقل تھی۔ ہندو لیڈر بھی اب ان سے پھٹے پھٹے نظر آتے تھے۔ مالویہ جی وغیرہ اور لبرل پارٹی کے لیڈروں کا ذکر ہی نہیں، پنڈت موتی لعل نہرو تک سے اب صفائی نہیں رہی تھی۔ ایک مدراس کے سری نواس آینگر سے بس اخلاص کے تعلقات باقی رہ گئے تھے۔ محمد علی کہتے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے پر ایک وہی آمادہ ہے۔ مسلمانوں کے اندر سلطان ابن سعود کے سارے ہمدرد وبخالف۔ اور اب آخری اور حدود سے تجاوز کر جانے والی اجازت مخالفت خواجہ صاحب کی پارٹی کی طرف سے...... چند عنوانات محض نمونے کے طور پر اس عدالت کی لگائی ہوئی فرد جرم کے سنیے گا!

(1) ایک فرضی اور تمام تر گڑھی ہوئی تصویر جس میں پنڈت مدن موہن مالویہ کے آگے ''رامپوری'' محمد علی کو سجدہ کرتے دکھایا گیا تھا!

(2) ایک یہ گندہ اتہام کہ ''رامپوری'' محمد علی اپنے غسل خانہ کو روضۂ رسولؐ (یا مسجد نبویؐ) سے زیادہ پاک وصاف کہتے ہیں۔

(3) یہ دعویٰ بڑے شد ومد اور اہتمام کے ساتھ کہ ''رامپوری'' محمد علی چندہ کی بڑی بڑی رقمیں کھا گئے ہیں۔

(4) یہ الزام بڑے وثوق اور جزم کے ساتھ کہ ''رامپوری'' محمد علی ہندو کانگریس سے تنخواہ پا رہے ہیں!

محمد علی ایڈیٹر اور جرنلسٹ (صحافی) جس پایہ کے بھی ہوں، ضرور نہ تھا کہ ہر شاطرانہ پروپیگنڈہ کے بعد مد مقابل بن سکیں۔ ہفتوں نہیں مہینوں ان کی ہر ممکن سے ممکن اور زیادہ سے زیادہ تفضیح کا سامان دھڑلے سے جاری رہا اور کوئی دقیقہ برسرعام ان کے ساتھ تمسخر واستہزا کا اٹھ نہ رہا...... داستان بڑی تلخ لیکن ساتھ ہی بڑی عبرت انگیز اور بصیرت آموز بھی ہے۔ جی میں بار بار آتا ہے کہ اس کی تفصیلات آئندہ نسلوں کے لیے کچھ تو اور درج کردی جائیں لیکن ایک بار پھر اس

حقیقت کو ذہن کے سامنے تازہ کر لیجیے کہ یہ محمد علی کی کوئی سوانح حیات نہیں۔ یہ تو صرف ان نقوش وتاثرات کا مجموعہ ہے جو ڈائری نویس کے ذاتی علم میں پیش آتے رہے اور اس قضیہ سے ڈائری نویس کا تعلق تو بس اتنا ہی ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ صاحب کو نج کا خط لکھا اور دو مرتبہ بیچ میں نوٹ دیے۔ نوٹوں پر اصل مبحث پر کوئی رائے نہیں ظاہر کی گئی تھی۔ نرم اور مصالحانہ انداز میں خواجہ صاحب سے صرف یہ گزارش کی گئی تھی:

تمھیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

ذرا اپنے انداز بیان کو دیکھیے اور خدا کے لیے سوچیے کہ آپ کس ہستی پر اترتے آتے ہیں۔ ان نیاز مندانہ معروضات کا اثر الٹا پڑا اور میرا شمار بھی خواجہ صاحب نے اپنے باغیوں میں کر لیا!

....

مولانا کے ہاں بھی جوابات کی کیا کمی تھی۔ ادھر کی پھبتی کا جواب ادھر بھی پھبتی ہی دیا جاتا۔ مولانا محمد علی اگر اب ''رامپوری کلال'' تھے تو خواجہ حسن نظامی بھی اب ''علی حسن غیاث پوری'' تھے۔ خواجہ صاحب نے ذہانت کا سارا زور صرف کر کے لکھا کہ محمد علی رامپوری کی بات سنتا کون ہے؟ مولانا کب چوکنے والے تھے جواب اسی ردیف وقافیہ میں دیا، بولے کہ ''خواہر زادگی کی بو نہ گئی۔ چندا ماموں ہی یاد رہا۔ چندا لبّا کہہ کر پکارا ہوتا تو بات بھی تھی''۔

اہل حدیث جہاں کہیں بھی تھے، پنجاب میں ہوں یا بنگال میں، مولانا سے کد جاری رکھے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان غریب کو تقلید وعدم تقلید کے مناقشوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مرکزی خلافت کمیٹی کا ہر جلسہ بجائے بزم کے ایک رزم گاہ کا منظر پیش کرتا۔ اور وقت وقوت کا بیشتر حصہ ان ہی باہمی الجھاؤوں کی نذر ہو جاتا۔ لکھنؤ میں جو میٹنگ 26 کی آخری سہ ماہی میں ہوئی، اس میں علاوہ پنجابی نمائندوں کے کلکتہ کے ممبر بھی آئے اور اتفاق سے یہ بھی اہل حدیث تھے۔ مولانا نے کہا کہ اب مقابلہ پر پنجابی ٹولی کے ساتھ بنگالی ٹولہ بھی آ گیا۔ لکھنؤ کی میٹنگ بڑی ہی پُر شور ثابت ہوئی۔ ایک وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب زبان سے گزر کر نوبت ہاتھ پیر کی آ جائے گی۔ اشتعال کا باعث جو فقرہ ہوا، وہ منسوب مولانا شوکت علی کی جانب تھا، لیکن آئی گئی مولانا محمد علی کے سر ہوئی۔ غصہ سے بھرے ہوئے پنجابی ممبروں نے انتقام کی لپیٹ میں مولانا محمد علی کو ہی لیا۔ میں خود بھی بڑا

غصہ ور ہوں لیکن اس خاص موقع پر اللہ نے مدد فرمائی۔ میرے ہوش وحواس درست رہے۔ ایک جوان عمر پنجابی ممبر صاحب کے پیروں پر گر کر ہاتھ جوڑ جوڑ کر انھیں کسی طرح ٹھنڈا کیا۔ خواجہ حسن نظامی یا ان کی پارٹی کو ان کمیٹیوں سے کوئی تعلق نہ تھا اس لیے ان جلسوں پر تو ان کا کوئی اثر تھا نہیں، البتہ ان کمیٹیوں سے باہر اور اخبار میں محمد علی کو ان کے حملوں کو بھی جواب دیتے رہنا پڑتا تھا۔ عجب لطیفہ تھا، کہ ایک ہی وقت میں ایک طرف تو محمد علی اس لیے بدنام ہو رہے تھے کہ وہ سلطان ابن سعود کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس لیے ''اینٹی وہابی'' ہیں۔ بدعتی ہیں، اہل توحید وسنت کے مخالف ہیں، گور پرست ہیں، وقس علی ہذا۔ اور دوسری طرف اسی زور وشور سے یہ پروپیگنڈہ جاری تھا کہ محمد علی بزرگوں کے منکر ہیں۔ مزارات اولیا کے دشمن ہیں، وہابی ہیں، قبہ شکن ہیں!

از مذہب من گبر ومسلمان گلہ دارد!

خواجہ صاحب کے مقابلہ میں محمد علی جو ''علاج بالمثل'' کر رہے تھے اس سے ہم نیاز مند جزبز ہو رہے تھے لیکن کہنے کی ہمت کس میں تھی۔ اتفاق سے ایک روز اسی خلافت کمیٹی کے شب کے اجلاس میں چودھری خلیق الزماں آ گئے۔ اب تحریک خلافت سے ان کی عملی دلچسپیاں بہت کم ہو گئی تھیں، لیکن بہرحال مرکزی کمیٹی کے ممبر اب بھی تھے۔ اور محمد علی کے ہم پایہ تو نہیں تاہم ایک چھوٹے لیڈر تو یہ اس وقت بھی تھے اور محمد علی کے مخلصوں میں اب تک تھے۔ انھوں نے کہا ہیں کہہ لوں گا، اور کہہ بھی گزرے۔ اس وقت کے مکالمہ کا دھندلا سا نقش آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔

چودھری صاحب: یہ آپ حسن نظامی کو کیوں جواب دیے چلے جاتے ہیں۔ آپ اپنی پوزیشن کا خیال کیجیے۔

مولانا: پوزیشن کیسی؟ تمھیں پبلک کے مذاق کا اندازہ نہیں۔ جواب نہ دیا جائے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ بات سچی ہے۔ اور عوام میں زہر برابر پھیلتا جاتا ہے۔

چ: میں تو بازاری لوگوں کا مقابلہ کبھی نہ کرتا کوئی اگر مجھے نخاس کے چوراہا پر گالی دے تو کیا میں بھی گالی دینے لگوں؟

م: تم مقابلہ اس لیے نہ کرتے کہ تمھیں کرنا نہیں آتا۔ میں تو کر سکتا ہوں۔ میں نخاس کے چوراہا ہی پر اس زبان میں جواب دوں گا۔

......کوئی اور اس سے جو چاہے نتیجہ نکالے۔ میرے دل پر تو محمد علی کی سچائی ہی کا نقش اور گہرا ہوا۔ ڈپلومیسی اور تصنع کے فن سے کسی درجہ میں بھی آشنا نہ تھے۔ اچھا یا برا جو کچھ بھی دل میں ہوتا، بس ٹھیک وہی زبان پر بھی آتا۔

......☆☆☆......

باب:66

1:1927

(خلافت کمیٹی کا آخری سنبھالا)

خلافت والوں بیچاروں کو اب پوچھتا کون تھا۔ سارا جوش وخروش 21، و23 میں ختم ہو چکا تھا۔ بچا کھچا اثر 24، و 25 تک ساتھ دیتا رہا، اب نہ کہیں خلافت کانفرنس ہوتی تھی، نہ کہیں خلافت کے ممبر ہی باقی رہ گئے تھے۔ ایک خواب شیریں تھا، جسے دیکھنے کے بعد مسلمان عرصہ ہوا اسے بھلا ہی چکے تھے۔ شوکت علی غریب بمبئی میں مرکزی خلافت کمیٹی کو سینہ سے چمٹائے بیٹھے تھے...... برسوں کے بعد، اسی طرح بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر مد کے بعد جزر، اور عروج کے بعد زوال وشکست کی مثال 47 میں آل انڈیا مسلم لیگ کی شکست وریخت میں دوبارہ نظر آئی...... بہر حال آخر 26 میں مرکزی خلافت کمیٹی نے طے کیا کہ خلافت کانفرنس کا اجلاس ایک بار پھر ہو، اور اب کی اس کے ضمیمہ کے طور پر موتمر عالم اسلامی کا اجلاس بھی رکھا جائے۔ خلافت کے صدر، کراچی کے سیٹھ عبد اللہ ہارون طے پائے اور موتمر کے صدر حکیم اجمل خاں۔ مقام اجلاس کے لیے قرعۂ انتخاب لکھنؤ کے نام پر پڑا۔ اور تاریخیں آخر فروری کی قرار پائیں۔ جلسہ گاہ کے لیے سٹی اسٹیشن کے سامنے بلند باغ روڈ اور جگت نرائن روڈ کے جنکشن پر رفاہ عام کلب کے نام سے جو عظیم الشان عمارت ہے، اس کا انتخاب ہوا۔ شہر میں اشتہار تقسیم کرنے کے لیے ہمارے والنٹیر وں

(رضا کاروں) کی ٹولی جب اکوں پر اور پیدل باجہ بجاتی ہوئی نکلی۔تو مجھے وزیر گنج کی ایک بڑھیا کا فقرہ نہیں بھولتا۔سڑک پر یہ مختصر سا جلوس دیکھ، پکار کر بولی ''اے لو، خلافت پھر نکلی''!.....عوام کے دل سے اس کا تصور تک مٹ چکا تھا۔اب جو نام سنا، تو جیسے بھولا ہوا خواب یک بیک پھر یاد پڑ گیا۔

....

یاد ہوگا کہ اودھ خلافت کمیٹی کا صدر یہ خاکسار ہی تھا۔اب جو یہ کانفرنس کا ڈول پڑا، اور اس کی استقبالی کمیٹی بنی، یاروں نے اس استقبالیہ کی صدارت بھی اسی خاکسار کے سر منڈھ دی۔وہی پہلی ہی صدارت میرے لیے مذاق طبیعت کے کب موافق تھی۔ یہ تو دوسری تو سرتا سر ایک عملی اور انتظامی قسم کی خدمت تھی ہر وقت کی دوڑ دھوپ کی طالب۔اور سب سے بڑھ کر چندہ وصول کرنے کی مہم! اس پر اپنے تجربے قلمبند کرنے بیٹھوں تو خود ایک مستقل مقالہ تیار ہو جائے۔بہر حال میں نے یہ ساری ذمہ داریاں اپنے مذاق کے خلاف جو قبول کیں، تو اس کی تہ میں زیادہ تر دخل اسی جذبہ کو تھا کہ محمد علی کی خوشی اسی میں ہے۔محمد علی ضابطہ سے مرشد نہ تھے لیکن ان کی رضا جوئی اپنے کو ایسی ہی مقصود و مطلوب رہتی جیسی مریدوں کو اپنے مرشد کی ہوتی ہے۔محمد علی آئے، حسب دستور بیگم محمد علی ہمراہ تھیں.....مہمانوں کا قیام اب کی باغ گونگے نواب میں مرحوم ممتاز حسین بیرسٹر کی لق و دق کوٹھی میں رکھا گیا۔اور یہیں مرکزی کمیٹی کے جلسے بھی ہوتے رہے۔مولانا بھی یہیں رہے۔یہاں سے رفاہ عام کا فاصلہ قریب کے راستہ بھی ایک میل سے اوپر ہے۔مہمانوں کو اتنی دور سواریوں پر وقت سے پہنچانا، مہمانداری کی عام ذمہ داریوں پر ایک اور اضافہ تھا۔خیر کام تو سارے کے سارے دوسرے ہی لوگ انجام دیتے رہے، جن میں سے چند کے نام شکر گزاری کے ساتھ آج تک یاد ہیں۔مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی مرحوم، شیخ سعید الرحمٰن قدوائی، بیرسٹر معین الدین انصاری (سکریٹری استقبالی کمیٹی) جو بعد کو رام پور ہائی کورٹ کے جج اور پھر چیف جسٹس ہو گئے تھے [1]، سید ذاکر علی جو بعد کو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر آگرہ سے صوبہ اسمبلی کے ممبر ہوئے۔مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی (سکریٹری خلافت کمیٹی دہلی) جو بعد کو مدتوں حیدرآباد میں

---

[1] ان سطور کی نظر ثانی کے وقت (جنوری 1952) میں اناؤ میں سیشن جج ہیں۔

شبینہ مدرسوں کا کام کرتے رہے، منشی محمود علی (ہڈی والے) اور سب سے بڑھ کر خود مولانا شوکت علی۔ لیکن نیک نامی ضابطہ کی صدارت کی بنا پر خواہ مخواہ اپنے حصہ میں آ گئی۔ مولانا شوکت علی چندہ وصول کرنے کی گویا مشین تھے، اور اس فن میں لاثانی۔ بڑے لوگوں کے ہاں جہاں جہاں گئے یہ خاکسار بھی ''تابع مہمل'' کی طرح ساتھ لگا رہا۔ فطرت بشری کے تجربے خوب خوب حاصل ہوتے رہے۔

....

محمد علی کو اپنی بیوی کے ساتھ بڑی ہی محبت تھی۔ اپنی ماں، اپنے بھائی، اپنی بچیاں، کس کے ساتھ انھیں محبت کم تھی؟ ہر سفر میں بیگم محمد علی کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے اور اب کی تو لکھنؤ میں قیام کئی دن کا تھا۔ اب کی تو بہر حال ساتھ آتیں ہی۔ آئیں اور فرنگی محل میں اتریں، جہاں ان کی مہمانداری پردہ کے انتہائی اہتمام کے ساتھ بڑی اولوالعزمی کے ساتھ ہوتی رہتی۔ لکھنؤ میں اب ان کی آمد و رفت بھی مختلف گھرانوں میں رہی۔ ہم لوگوں کا جو مکان لکھنؤ میں ہے (خاتون منزل مرزا حیدر، مرزا روڈ پر، قبر ماموں بھانجے کے قریب) وہاں میری والدہ ماجدہ[1] سے ملنے آئیں (بیوی سے ملاقاتیں تو خلافت کانفرنس کے عین جلسہ میں ہو چکی تھیں، جہاں پردہ کا پورا انتظام تھا) اور ان سے مل کر اپنی خوشدامن بی اماں مرحومہ کو یاد کیا کیں۔ محمد علی خود سب مہمانوں کے ساتھ باغ گونگے نواب میں مقیم تھے۔ ایک روز دوپہر کو جب اجلاس کانفرنس میں دوپہر کی چھٹی ہوئی تو بیگم صاحبہ بھی بجائے فرنگی محل جانے کے یہیں آ گئیں۔ وہ منظر آج تک نظر کے سامنے پھر رہا ہے، جاڑوں میں دوپہر کے وقت ایک خیمہ کے اندر، جس کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، محمد علی تو تھک کر اور چور ہو کر فرش زمین پر لیٹے ہوئے ہیں اور ان کے متصل یہ برقہ پوش بیگم صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ "لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا" کی زندہ تفسیر، ازدواجی لطف، محبت، غمگساری و رفاقت کا جیتا جاگتا نمونہ..... لوگ اپنے لیڈروں کی زندگی کو صرف ان کی پبلک زندگی کے جلسوں، جلوسوں، تقریروں، نعروں تک محدود رکھتے ہیں، اور شاید یہ سمجھتے ہیں کہ ان بڑوں کے پہلو میں دل ہوتا ہی نہیں ہے۔ کسی اور بڑے کا حال جو کچھ ہو، لیکن محمد علی تو اپنے آقا سردار کی سچی پیروی میں ایک شفیق بھائی،

---

[1] وفات اپریل 1941 میں پائی۔

ایک سعید فرزند، ایک نرم دل پڑوسی، ایک محبت کرنے والے باپ، ایک محبت کرنے والے شوہر تھے۔ ذکر یہ بیچ میں ان کی شخصی اور خانگی زندگی کا آ گیا۔ اور پھر اسی خلافت کانفرنس کے مجمع اور بھرے ہوئے جلسہ کی طرف واپس آیئے۔

....

بارات کے دولہا اب کی بھی یہی دونوں بھائی رہے۔ تحریک خلافت کا اب دم واپسیں تھا۔ خلافت خود بھی اب مصطفٰے کمال کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں خلافت کمیٹی کی زندہ لاش کا سہارا یہی دونوں بھائی تھے۔ اتفاق سے نہ خلافت کانفرنس کے صدر منتخب آ سکے اور نہ موتمر عالم اسلامی کے صدر منتخب۔ سیٹھ صاحب کی قائم مقامی بہار کے مولوی حاجی محمد شفیع داؤدی مظفر پوری نے کی۔ یہ علی برادران ہی کی طرح ایک بڑے پر جوش دیندار مسلمان تھے۔ ایک زمانہ میں اپنے صوبہ کے نامور ایڈوکیٹ تھے۔ اب وہ کامیاب وکالت چھوڑ چھاڑ، نیم فقیرانہ لباس اختیار کر کے اپنے کو خلافت کمیٹی اور دوسری ملی تحریکوں کے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔ اور علی برادران کے خاص الخاص مخلصوں میں تھے [1]۔ حکیم صاحب کی جانشینی ڈاکٹر انصاری صاحب کے حصہ میں آئی۔ ڈاکٹر صاحب پر نیشنلزم کا رنگ بہت گہرا چڑھ گیا تھا اور اسی نسبت سے اب ان کو علی برادران کے ساتھ خلوص بھی اس درجہ کا باقی نہیں رہا تھا۔ جو کسی زمانہ میں تھا...... ڈاکٹر انصاری کو قومیات وسیاسیات کے میدان میں لانے والے 13 میں ان کی قیادت میں طبی مشن ترکی بھجوانے والے محمد علی تھے۔ لیکن سیاسیات میں کون پچھلی رفاقتوں کو اتنا یاد رکھتا ہے؟ خلافت کے جلسے دو ڈھائی دن زور شور سے رہے، اور ایک دن موتمر کا بھی جلسہ رہا۔ رنگ محمد علی کے سامنے کسی کا بھی نہیں جمتا تھا۔ دونوں صدر محترم بھی محمد علی کے آگے پھیکے ہی رہے۔ خلافت کے جلسہ میں کچھ ہندو حضرات بھی اس خاکسار کی دعوت پر شریک ہوئے۔ ایک نام پنڈت کشن پرشاد کول (ممبر سرونٹس آف انڈیا وایڈیٹر ''ہندستانی'') کا اب تک یاد ہے۔ ان کو شریک دیکھ کر میں نے مولانا سے عرض کیا کہ '' آج تقریر مذہبی سے زیادہ سیاسی رہے، جلسہ میں کچھ ایسے لوگ شریک ہیں جو آپ کے صرف مذہبی جوش کے قائل ہیں۔ مجھے یہ دکھانا ہے کہ آپ سیاسی تقریریں بھی کس معیار

---

1 انتقال غالباً 1946 میں فرمایا۔

کی کر سکتے ہیں''۔اس فرمائش پر خوب ہنسے،اور بولے''خوب خوب فرمائشیں آتی رہتی ہیں۔ایک صاحب یہ کہتے ہیں کہ محمد علی مذہب کیا جانیں ایک سیاسی آدمی ہیں۔دوسرے صاحب یہ فرماتے ہیں کہ یہ مذہبی قسم کے ملا آدمی ہیں،سیاست سے انھیں کیا واسطہ۔اب میں کس کس کو خوش کیا کروں؟''بہر حال تقریریں حسب توقع سب سے زیادہ پرزور اور پرمغز اور جاندار محمد علی کی رہیں۔

وہ تقریریں اور اس وقت کی تجویزیں،تحریکیں اب حافظہ میں کہاں۔اگر ہوں بھی تو آج کی دنیا کو ان سے دلچسپی ہی کیا۔وہ دور اپنی زندگی،اپنے تمام جزویات کے ساتھ ختم ہو چکا تھا۔اب ذیل میں اپنا پورا خطبۂ صدارت مجلس استقبالیہ درج کیے دیتا ہوں۔اس سے ایک اجمالی نقشہ اس وقت کی سیاست کا،اس وقت کے مسائل کا،نظر کے سامنے آجائے گا......خطبہ کے پڑھتے وقت اور اس کے خاتمہ پر لوگوں نے حوصلہ افزائی کے خیال سے داد خوب دل کھول کھول کر دی۔لیکن سب سے بڑی اور سب سے قیمتی داد یہ تھی کہ ایڈریس کے خاتمہ پر معاً محمد علی نے لپک کر گلے لگایا۔اور پیشانی پر بوسہ دے دے کر داد کے بڑے فیاضانہ الفاظ صرف کر ڈالے۔

......☆☆☆......

ضمیمہ باب:66

(باز گو از نجد و زیارانِ نجد)

خطبۂ صدارت مجلس استقبالی جو 26 فروری 1927 کو لکھنؤ (عمارت رفاہ عام) کے چودھویں اجلاس آل انڈیا خلافت کانفرنس میں پڑھا گیا۔

قوم اور ملک کے خدمت گزارو! دین وملت کے سرفروش سپاہیو! دور دراز سے زحمتِ سفر اٹھا کر آنے والے جلیل القدر مہمانو! [1]

ایک نامور مگر اجڑے ہوئے شہر کے باشندوں کی طرف سے، اپنے تہی مایہ اور بے مقدرت میزبانوں کی جانب سے، ایک بے بضاعت اور نااہل فرد کی زبان سے تحیۃ وسلام اور برکت ورحمت کی دعاؤں کا تحفہ قبول کرو!

جس سرزمین پر ہم سب اس وقت جمع ہیں اس کی قسمت بھی قسام ازل نے کچھ عجیب رکھی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی پرقوت حکومت سینکڑوں برس تک قائم رہی۔ لیکن لکھنؤ کو دارالسلطنت بننا کب نصیب ہوا؟ اس وقت جب کہ خود سلطنت میں انتشار واختلال پوری طرح پیدا ہو چکا تھا، مسلمانوں کی مرکزیت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور بابر واکبر، شاہ جہاں واورنگ زیب کے محض افسانے رہ گئے تھے، ملک ہند میں مسلمانوں کے علوم اور شعر وادب کا نقارہ صدیوں تک بجتا رہا، لیکن فرنگی محل کے علم وفضل اور لکھنؤ کی شاعری کا آفتاب کب چمکا؟ اس وقت جب کہ خود

[1] جلسہ میں نمائندے دہلی، پنجاب، بہار اور مدراس تک کے موجود تھے۔

مسلمان کے علم وادب کا آفتاب ہندوستان میں لب بام آچکا تھا۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس کے اجلاس سالہا سال سے ملک کے مختلف گوشوں میں ہو رہے ہیں، کلکتہ، بمبئی، دہلی وغیرہ کا ذکر نہیں۔ بلگام کوکناڈا جیسے دور افتادہ مقامات تک یہ فخر حاصل کر چکے لیکن اب تک اس شرف سے اگر کوئی محروم رہا تھا تو یہی شہر لکھنؤ تھا[1]۔ آج جب یہ سعادت اس کی قسمت میں آرہی ہے تو ہر شخص خود دیکھ رہا ہے کہ روز عید کی شام کے آثار نمایاں ہیں، سرور شب کے اتار کا وقت ہے اور اہل بزم تھک تھکا کر انگڑائیوں پر انگڑائیاں لے رہے ہیں! خیر یہ اپنا اپنا ظرف ہے اور اپنا اپنا نصیب! کسی کو شب کے بناؤ سنگار دیکھنا مبارک اور کسی کے نصیب میں سحر کی بگڑی اداؤں کا آنا مبارک۔

ہر کسے خمے کشیدہ در مجلس وصالش

چوں دور خسرو آمد جام وسبو نمانده!

لیکن ساقی سے بدگمانی کی مجال نہیں۔ طبیعت میں کیف اور قلب میں ذوق اگر موجود ہے تو بڑے سے بڑا خم اور چھوٹے سے چھوٹا جام سب برابر ہیں۔

یہ پہلو لکھنؤ کی بدقسمتی کا تھا، لیکن خوش قسمتی کا پہلو لیجیے تو انجمن خدام کعبہ جسے خلافت کمیٹی کا نقش اول کہنا چاہیے اسی سرزمین پر گنتی کے چند آدمیوں اور برائے نام سرمایہ کے ساتھ قائم ہوئی تھی اور اسی کے کارناموں نے آج سے چودہ پندرہ سال قبل ملک کے طول وعرض میں غلغلہ ڈال دیا تھا۔ پھر 1919 میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے جو عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی تھی اور جس نے خلافت کمیٹی کی باضابطہ بنیاد رکھی تھی وہ نہ صرف اسی شہر میں بلکہ ٹھیک اسی عمارت[2] کے اندر منعقد ہوئی تھی۔ اس کے بعد 1921 میں جناب مولانا محمد علی صاحب کے زیر صدارت اودھ خلافت کانفرنس کا جو اجتماع عظیم ہوا تھا وہ بھی اس شہر میں اسی عمارت کے احاطہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس بنا پر صوبہ اودھ کا اجڑا ہوا دارالسلطنت اگر آل انڈیا خلافت کانفرنس اور جمعیۃ الخلافۃ کے وطن ہونے کا فخر اپنے لیے حاصل کرنا چاہے تو شاید یہ فخر فخر بیجا نہ ہو۔ چودھویں رات کا چاند بدر

1 لکھنؤ میں خلافت کے اور جلسے تو اس سے پیشتر بارہا ہو چکے تھے۔ "آل انڈیا کانفرنس" کے انعقاد کا اس شہر میں یہ پہلا موقع تھا۔

2 عمارت موسوم بہ رفاہ عام کلب وجلسہ تہذیب لائبریری، سٹی اسٹیشن کے مقابل۔

کامل ہوتا ہے، خدائے پاک ہماری کانفرنس کے اس چودھویں اجلاس کو بھی ماہ شب چہاردہم کا حسن و جمال، نور کمال نصیب کرے اور وہ جمال و کمال جو مستقل طور پر ہمیشہ کے لیے اسے ماہ شب چہارم دہم بنائے رہے۔

لکھنؤ کی پچھلی خدمات کے سلسلہ میں اودھ کی اس ممتاز ہستی کا نام بھی حسرت و ماتم کے ساتھ آنا ناگزیر ہے جو خلافت کانفرنس کانپور کے اجلاس کے چند ہی روز کے بعد عالم عنصری سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔ یعنی مرحوم و مغفور مولانا عبدالباریؒ فرنگی محلی 1۔ ان کے قومی کارنامے آج کسی یاددہانی کے محتاج نہیں۔ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ان کی ذات ایک مرکز کا مرتبہ رکھتی تھی آج اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے کو اپنے شہر میں پروان چڑھتے دیکھ کر کس قدر مسرور ہوتے اور ان کی ذات گرامی سے ارکان مجلس استقبالیہ کو آج ہر قسم کی کس درجہ اعانت ملتی! کارساز حقیقی کے لطف و کرم سے کیا عجب ہے کہ اس وقت بھی اس کے فرشتہ خدائی لاسلکی (وائرلیس) کی مدد سے ان کی روح کی آنکھوں اور کانوں کو یہ سب کچھ دکھا اور یہ سب کچھ سنا رہے ہوں۔ خدائے آمرزگار ٹھنڈی رکھے اس خدام دین کی تربت کو اور رحمتیں نازل کرے اس کی روح پر!

بزرگو، دوستو اور عزیزو! آج مختلف سمتوں سے یہ صدائیں بلند ہو رہی ہیں کہ "اب خلافت کمیٹی کی ضرورت کیا باقی رہی؟ اور اگر چہ ضرورت ہو بھی تو کیا یہ ضرور ہے کہ اس کو اسی نام کے ساتھ باقی رکھا جائے؟" حیران ہوں کہ ان سوالات کا کیا جواب دوں! اس سے بڑھ کر حیرانی یہ ہے کہ یہ سوالات کسی مسلمان کے دل میں پیدا کیوں کر ہوئے؟ جس انسان کو خلافت سے عار آتا ہے درحقیقت اسے خود اپنے وجود سے عار آنا چاہیے کہ انسان کی حیثیت اس کائنات ارض میں بجز خلیفہ کے اور کچھ نہیں۔ اور یہ کسی فقیہ کا فتویٰ نہیں، کسی مؤرخ کی رائے نہیں، کسی بشر کا قول نہیں بلکہ اس وقت جب نہ آدم علیہ السلام کا وجود تھا اور نہ بنی آدم کا، نہ بشر کا نہ ابوالبشر کا۔ اس وقت سب کے پیدا کرنے والے، سب کو نیست سے ہست کرنے والے نے صاف صریح اور غیر مشتبہ الفاظ میں ارشاد فرما دیا تھا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ "اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً".

---

1 مولانا محمد علی کے مرشد، مشاہیر وقت میں ممتاز۔

یہ نہیں ارشاد ہوتا کہ انسان کو حاکم پیدا کیا جائے گا۔ عالم پیدا کیا جائے گا، شاعر پیدا کیا جائے گا، فقیہ پیدا کیا جائے گا، مجاہد پیدا کیا جائے گا بلکہ اور صرف یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اسے روئے زمین کا خلیفہ بنا کر پیدا کیا جائے گا۔ انسانوں کے مختلف طبقے اور گروہ شروع سے قائم ہیں اور آخر تک قائم رہیں گے، کوئی شاہ ہوگا کوئی گدا، کوئی امیر ہوگا اور کوئی مریض، کوئی بڑا ہوگا کوئی چھوٹا، یہ سارے اختلافات ہوتے ہوئے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے، لیکن منصب خلافت سے دستبرداری کسی لمحہ اور کسی آن ممکن نہیں۔ ہر انسان اول میں خلیفہ ہے اور آخر میں بھی۔ جسد خاکی میں جس وقت روح داخل ہوتی ہے اپنے ہمراہ منصب خلافت لے کر داخل ہوتی ہے اور جب تک خود روح نہ نکل جائے کوئی قوت اس منصب سے انسان کو بے دخل نہیں کر سکتی۔ یہ لقب ہندوستان کی مرکزی خلافت کمیٹی کا گڑھا ہوا نہیں، مولانا شوکت علی کا ایجاد کیا ہوا نہیں، بلکہ اس بڑی سرکار کا بخشا ہوا ہے جس کے یہاں سے ہمیں خود جامہ انسانیت اور خلعت وجود عطا ہوا ہے۔ طبیعتیں اگر اس خطاب سے اکتا گئی ہوں تو اس خطاب کی واپسی اسی سرکار میں کرنی چاہیے جہاں سے یہ مرحمت ہوا تھا۔

خلافت اس وسیع معنی میں انسانیت کے ہم معنی ہے لیکن محدود و مخصوص مفہوم میں اس کا اطلاق خاص محل نعمت پر ہوتا ہے، قرآن پاک کی آیات کریمہ میں استخلاف، خلفا خلائف وغیرہ کا استعمال ایسے ہی مواقع مدح پر ہوا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نبی جلیل القدر حضرت داؤد علیہ السلام کو جو نبوت کے حلہ نورانی کے ساتھ ہی حکومت کے خلعت مادی سے بھی سرفراز تھے اور نظام حکومت منشائے ربانی کے مطابق قائم کیے ہوئے تھے، خطاب کر کے ارشاد فرماتا ہے (یَادَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ) اے داؤد ہم نے تمھیں روئے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا! اللہ اکبر! مرتبہ خلافت کی بلندی دیکھنا! منصب نبوت پر سرفرازی کے بعد ہی خلعتِ امتیاز ملتا ہے تو خلافت کا!

اس بڑی خلافت کو انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد جن بزرگوں نے زندہ رکھا اور جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک نیز جمہور امت کے متفقہ فیصلہ کے مطابق افضل ترین بشر گزرے ہیں، ان کے لیے سب سے بڑا تعظیمی لفظ جو استعمال ہو سکتا ہے وہ ''خلیفۃ الرسول''

اور بعد ختم نبوت جو سب سے بڑا مرتبہ کسی باخدا انسان کو مل سکتا تھا اس کا نام شریعت کی زبان میں خلافت ہی ہے۔ ہم اہل سنت اس سب سے بڑی فضیلت میں چار ہستیاں شریک سمجھتے ہیں۔ ان چاروں کو خلفاء راشدینؓ کہتے ہیں۔ فرقہ شیعہ کے نزدیک اس کے حقدار صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے لیکن وہ بھی سب سے زیادہ زور ان کی ''خلافت بلافصل'' ہی پر دیتا ہے۔

ایک طرف یہ خصوصیات ہیں، تصریحات ہیں، کتاب اللہ ہے، سنت انبیاء کرام ہے، اسوۂ صحابہ ہے، اور دوسری طرف لے دے کے یہ دلیل ہے کہ چونکہ ''ترکوں نے اپنے سر خلافت کی ذمہ داریاں لینے سے انکار کر دیا ہے اس لیے سرے سے تحریک خلافت ہی کو فنا کر دینا چاہیے''۔ گویا اگر کل ترک خدانخواستہ اپنے دین سے مرتد ہو جائیں تو ہم سب کے ارتداد کے لیے بھی یہ دلیل کافی ہو جائے گی کہ جب اتنی بڑی محافظ اسلام قوم نے اپنا دین بدل دیا تو ہم کب تک اس کے دین کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اب دونوں پہلو آپ کے سامنے ہیں اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ دونوں میں سے جو پہلو زیادہ قوی، زیادہ معقول اور زیادہ تشفی بخش معلوم ہو، انتخاب کرے۔

پوچھا جاتا ہے اور طنز و بیدردی کے لہجے میں پوچھا جاتا ہے کہ اب تک خلافت کمیٹی نے کام کیا کیا ہے؟ یہ سوال ہم سے کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب ہم دیں؟ اس کا جواب اگر لینا ہے تو انگریزی عدالتوں کے در و دیوار سے پوچھو، پولیس کے رجسٹروں سے پوچھو، جیل خانوں کے دروازوں اور پھاٹکوں سے پوچھو، لوہے کی بنی ہوئی ہتھکڑیوں سے اور ڈاکوؤں اور خونیوں کے سروں میں پڑنے والی بھاری بھاری بیڑیوں سے پوچھو، اس کا جواب مصر سے لو، فلسطین سے لو، حجاز سے لو، ترکی سے لو، افغانستان سے لو، جاوا سے لو، ہر آزاد اور نیم آزاد اسلامی ملک سے لو، ساری دنیائے اسلام سے لو اور اس پر بھی تشفی نہ ہو تو اللہ کے پاک فرشتوں کی زبان سے سنو اور انھیں آپس میں یہ چرچا کرتے ہوئے سنو کہ جب آزمائش کا وقت آیا اور جب خلافت اسلامیہ کے لیے خطرہ کی گھڑی آئی، جب اسلام کے پیام پر، اس کی شریعت کے احترام پر، اپنے مال لٹا دینے والے، اپنی عزتیں اور شہرتیں قربان کر دینے والے، اپنا عیش و آرام نثار کر دینے والے، اپنی دنیا تاراج و برباد کرنے دینے والے، اپنی جانوں کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھ رکھ کر لبیک کہنے والے بیڑیاں پہننے کے شوق میں، طوق و زنجیر کے ذوق میں، ننگے اور بھوکے رہنے کے اشتیاق میں، پھانسی کے

تختہ پر چڑھنے کی تمنا میں، سینہ پر گولیاں کھانے کی طلب میں، میدان میں اپنی تڑپتی ہوئی لاشوں کو بے گور و کفن چھوڑ کر جانے کے ارمان میں جو خاک کے پتلے سب سے پہلے آگے بڑھے، وہ غلام ہندوستان کے غلام مسلمان، وہ مجبور ہندوستان کے مجبور امتیان رسول، وہ اسی ظلمت کدہ کے بسنے والے خدمت گزاران خلافت ہی تھے! زودفراموش انسان، حیلہ باز انسان اور صبر و انتظار سے گھبرا جانے والا انسان ممکن ہے ان واقعات کو آج بھول جائے یا قصداً بھلا دے لیکن اوراق لیل و نہار پر، روئے زمین کے ذرات پر، صحیفۂ کائنات کے ایک ایک صفحہ پر جس وقت تک ابراہیم خلیل علیہ الصلوۃ والسلام کی فداکاری، ابراہیم ذبیح علیہ الصلوۃ والسلام کی قربانی اور حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے ذوق شہادت کے واقعات ثبت ہیں، اس وقت تک ان ناموس سرداروں کے ادنیٰ سپاہیوں، خلافت اسلامیہ کے خدمت گزاروں اور تحریک خلافت کے علمبرداروں کی حقیر و ناچیز کوششوں کا نقش بھی صفحۂ ہستی سے مٹ نہیں سکتا! انسان اگر آج بھلانا چاہتا ہے تو بھلا دے لیکن وہ علیم وخبیر، وہ لطیف و بصیر، جس کی ذات سہو ونسیان سے منزہ ہے اور جو انسانی نگاہوں سے اوجھل، پتھروں کے اندر رہنے والے کیڑوں تک کی خبر گیری کرتا رہتا ہے، اپنے عاجز و درماندہ، بے کس و بے بس بندوں کی اس فداکاری کو بھول نہیں سکتا اور انکیلئے اسی کا یاد رکھنا بس ہے۔

بزرگو اور عزیزو! خلافت کمیٹی کو اپنی بساط و مقدرت کے موافق آج خلافت راشدہ کی جانشینی کرنا ہے، اس لیے اس کے پھیلاؤ میں ساری دنیا آ جاتی ہے۔ ہندوستان بھی اور ہندوستان کے باہر بھی۔ لیکن اس کا اصلی اور مرکزی تعلق قدرتاً اسلام کے مرکز ارضی سے ہے۔ اس ارض فلک مرتبہ سے جس پر اللہ کے سب سے اچھے اور سب سے سچے بندہ کے نقش قدم ثبت ہیں، اس رشک عرش سرزمین سے جو تیئیس سال تک خدا معلوم کن کن قابل بیان اور نا قابل بیان تجلیات کی جلوہ گاہ رہی ہے۔ اس خطہ پاک سے جو آج بھی اللہ کے سب سے زیادہ پیارے اور چہیتے، سب سے زیادہ دلارے اور لاڈلے کی آخری آرام گاہ ہے، وہاں کی ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت ہماری سب سے بڑی سعادت اور اس کے مرکز کے ساتھ ہمارا خفیف سا لگاؤ بھی ہماری سب سے بڑی عبادت ہے۔ وہاں کے حالات کی معمولی ناخوشگواری سن کر بھی ہمارا دل اگر قابو میں نہ رہے، ہمارے ہوش وحواس اگر درست نہ رہیں، فرط اضطرار اور اضطراب سے اگر ہم بیخود ہو جائیں تو خدارا ہم پر

بے عقلی و بے دانشی کا الزام نہ لگائیے اور اگر لگائیے بھی تو کم از کم ہم سے یہ توقع نہ رکھیے کہ اس الزام کے دفاع کرنے کے لیے ہم اپنے اس قدرتی اور قلبی تعلق میں ایک ذرہ برابر بھی کمی نہ آنے دیں گے۔ ہندوستان پر اگر کوئی مصیبت آئی تو وہ یقیناً ہماری مصیبت ہوگی۔ ترکی و مصر، افغانستان و مراقش میں ہمارے بھائیوں کو کوئی دکھ پہنچا تو وہ دکھ بھی عین ہمارا دکھ ہوگا، لیکن خدانخواستہ اگر اس مرکز اسلام، قبلہ دین، مرکز ایمان کو ادنیٰ سا بھی گزند پہنچا تو یہ ہمارے جسم کا صدمہ نہ ہوگا بلکہ خطرہ ہوگا ہماری جان کا، پامالی ہوگی ہماری روح کی، حملہ ہوگا ہمارے ایمان، سینکڑوں ہندوستان اور ہزارہا افغانستان، صدہا مصر اور بے شمار ترکی قربان ہیں، اس ارض پاک کے چپہ چپہ پر نثار ہیں اس دیار حبیب کے ذرہ ذرہ! کارلائل کا شمار اگر یہ کہہ کر بھی کہ "برطانوی قوم کو برطانیہ کی سلطنت چھن جانا قبول ہے لیکن شیکسپیئر سے دستبردار ہو جانا قبول نہیں" داناؤں میں باقی رہ سکتا ہے تو ایک مسلمان بھی ارض حجاز کے متعلق اس والہانہ عقیدت کو بیان کرنے سے نادانوں کے زمرہ میں نہیں آجاتا۔ لیکن اگر یہ نادانی ہے تو اس نادانی پر ہزار دانائیاں قربان اور اگر جنون ہے تو اس جنون پر ہزاروں خردمندیاں تصدق! اللہ سے بصد عجز وتضرع دعا ہے کہ وہ ہماری اس نادانی، بے عقلی اور جنون کو بجائے دور کرنے کے اور ترقی دیتا رہے ۔

من لذت درد تو بہ درماں نہ فروشم
دشوار بدست آید وارزاں نہ فروشم

آج اس ارض نور کے مطلع پر ملکیت و استبداد کا جو سیاہ بادل چھایا ہوا ہے اس کو جائز و مناسب تدبیروں سے دور کرنا اور سرزمین قبلہ کو پھر تمام اہل قبلہ کے سپرد کر دینا خادمانِ خلافت کا پہلا اور سب سے بڑا فرض ہونا چاہیے۔ یہ جائز اور مناسب تدبیریں کیا اور کیوں کر اختیار کی جائیں اس کا فیصلہ کرنا قوم کے اہل حل وعقد کا فرض ہے۔ ان طریقوں کے اختیار کرنے میں اختلاف رائے وخیال کی پوری گنجائش ہے۔ لیکن نفس اس فریضہ کی اہمیت سے انکار یا اس میں تردد وتامل تصور میں نہیں آتا کہ کلمہ گویانِ اسلام کا کوئی بھی فرقہ کرسکتا ہے! کہا جاتا ہے کہ "اصلاح مفاسد کے لیے صرف حجاز کا کیوں انتخاب کیا جاتا ہے، بے شمار مفاسد اور ممالک اسلامیہ میں بھی تو آخر موجود ہیں"۔

میرے بھائیو اور بزرگو! کاش ان الفاظ کو زبان سے نکالنے سے قبل ان کے معنی کو سوچ لیا جاتا! جسم کے کسی حصہ میں پھانس لگ جائے تو تکلیف واذیت کس کو نہ محسوس ہوگی لیکن اگر خوانخواستہ قلب میں نشتر گھسا جارہا ہے تو کیا اس غریب اور بدنصیب سے یہ سوال کیا جائے گا اور اس کے جواب پر اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ ہاتھ پیر کی پھانسوں کو چھوڑ کر قلب کے نشتر سے کیوں اس قدر بے قرار ہوا جارہا ہے! محبت وعقیدت ہم کو دنیا کے ہر نیک اور خدا پرست انسان سے ہے، خواہ وہ کسی زمانہ اور کسی قوم کا ہو کہ اسلام کی یہی تعلیم ہے لیکن قلب کو جو تعلق جگر گوشہ عبداللہ اور نور بصر آمنہ (روحی فداہ) کے ساتھ ہے وہ کسی بزرگ، کسی ولی، کسی نبی کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ کیا قیامت ہے کہ ہم کو مشورہ یہ دیا جارہا ہے کہ حجاز کے مفاسد موجودہ کو ان کی حالت پر چھوڑ دو اور اس وقت تک انتظار کرتے رہو جب تک سارے عالم اسلام کی اصلاح نہ ہو جائے۔

دوستو اور عزیزو! ان گزارشات اور معروضات کا یہ مطلب نہیں کہ حجاز کی موجودہ حکومت کے خلاف فوراً اعلان جنگ کردیا جائے وہ حکومت تو بہر حال مسلمان ہے فوری اعلان جنگ تو ہم کافر اور غاصب حکومتوں تک کے خلاف نہیں کرتے۔ فریضہ ہمیشہ بطور نصب العین (آئیڈیل) کے ہوتا ہے اور اس نصب العین کے حصول کے ذرائع کا دارومدار ہمیشہ اپنی صلاحیت اور استعداد اور حالات گردوپیش کی موافقت اور عدم موافقت پر ہوتا ہے۔ مقصد گزارش صرف اس قدر ہے کہ اس فریضہ کو بطور نصب العین کے سامنے رکھ کر تمام امور متعلقہ پر سنجیدگی دخلوص اور محبت برادرانہ کے ساتھ غور کر کے فیصلہ متفقہ یا بڑی اکثریت کے ساتھ صادر ہو۔ اس پر پوری قوت ودیانت کے ساتھ عمل کیا جائے۔ خدا کے فضل سے موتمر کا ایک بہت مؤثر آلہ ہمارے ہاتھ میں آ گیا ہے، اس سے پورا فائدہ نہ اٹھانا ایک بہترین خداداد موقع کو ہاتھ سے ضائع کردینا ہوگا!

ارض حجاز کی اس خدمت کے ساتھ ہی ساتھ خود اپنے وطن میں کام کرنے کے نہایت وسیع میدان موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ''خلافت کمیٹی کو اب باہر کا خیال چھوڑ کر گھر کی خبر لینا چاہیے اور سارا کام اب ہندوستان ہی میں کرنا چاہیے''۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ دونوں کام ایک دوسرے کے منافی کیوں قرار دے لیے گئے ہیں! کیا حقوق اللہ اور حقوق العباد ایک دوسرے کے منافی ہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص اللہ کے لیے نمازیں بھی پڑھتا رہے، روزہ بھی رکھتا رہے اور

ساتھ ہی ساتھ اپنے کنبہ والوں، اپنے ہمسایوں کی خدمت بھی کرتا رہے، اور یہ دونوں قسم کے کام اسی چوبیس گھنٹہ والے دن رات کے اندر ہی انجام پاتے رہیں؟ توفیق الٰہی اگر یاوری کرے اور ہم خلوص نیک و نفسی کے ساتھ تھوڑی سی ہمت بھی اپنے اندر اور پیدا کرلیں تو یہ مشکل کیا ہے کہ ایک طرف موتمر کے ذریعہ سے ہم خدمت حجاز میں بھی لگے رہیں اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف اپنے ملک میں، اپنی تعلیمی، تنظیمی، معاشرتی، سیاسی، دینی ہر قسم کی کوششوں کو بھی جاری رکھیں۔ ہر ہر مقام پر لڑکوں کی صحیح تعلیم وتربیت کا انتظام کرتے رہیں، بے روزگاروں کو روزگار سے لگاتے رہیں، دوکانیں کھلوائیں، چرخہ اور کھدر کی ترویج کرتے رہیں، اپنے ہم قوموں کو مختلف حرفوں اور پیشوں کی جانب مائل کریں، شریفوں کے دماغ سے محنت اور چھوٹی قسم کی دکانداری کے ذلیل سمجھنے کا خیال نکلوائیں۔ ہر ہر بستی کے مسلمانوں کی مردم شماری کرکے معذوروں اور اپاہجوں کو مالی امداد دیتے رہیں اور کاہلوں کو کسی کام سے لگائیں۔ اس قسم کے تعمیری کام سینکڑوں کی تعداد میں ہندوستان کے اندر کرنے کے موجود ہیں۔ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا ان سب سے اہم ہے۔ ہندوستان کے 32 کروڑ باشندوں کا ایک غلام کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہنے کا واقعہ ہمیشہ تاریخ عالم کے نادر واقعات میں درج رہے گا، لیکن اس سے بڑھ کر حیرت انگیز اور شرمناک یاد اس واقعہ کی رہے گی کہ ان 32 کروڑ میں سے 7 کروڑ وہ نفوس تھے جن کا دین وایمان یہ تھا کہ (اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ) حکومت بجز خدا کے اور کسی کی نہیں۔ جس کی کتاب مبین میں صاف صاف ہدایت یہ موجود تھی کہ (وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ) جو خدائی قانون کو چھوڑ کر کسی اور قانون کو مانتے اور اس کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں وہ کافر ہو جاتے ہیں اور جنھیں شروع سے بتادیا جاتا ہے کہ (وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَھَا) اللہ کی رسی مضبوط تھامنے کے لیے اللہ سے اپنا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کے لیے لازمی ہے کہ خدا پر ایمان رکھنے کے ساتھ غیر خدائی حکومتوں سے سرکشی، طاغوتی سلطنتوں سے بغاوت اور شیطانی قوتوں سے یکسر بیزاری اختیار کرلی جائے۔

ملک میں آج بہت سی انجمنیں مفید مقاصد واغراض کے ساتھ قائم ہیں۔ جمعیت خلافت ان

میں سے کسی کی بھی رقیب، حریف نہیں۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ غیر مسلموں کی بھی ہر مفید وکارگزار انجمن کی جانب اتحاد واشتراک کا ہاتھ بڑھانے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔ عبرت کا مقام ہے کہ وہ مسلم جو دنیا میں دوسروں کی رہنمائی اور رہبری کے لیے آیا تھا، جس کا مقصد آفرینش یہ تھا کہ بھٹکی ہوئی دنیا کو اپنی روشنی میں چلائے آج وہ اس کو غنیمت سمجھ رہا ہے کہ دوسروں کے دوش بدوش کام کر سکے! اسے تو وہ بصارت وبصیرت عنایت کی گئی کہ وہ دنیا کو راہ دکھائے۔ آج وہ خود دوسروں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کا سہارا ڈھونڈ رہا ہے! کاش آج آزادی کی جنگ نیز اپنی قوم کی شیرازہ بندی میں ہم دوسروں کے لیے چراغ ہدایت ثابت ہوں۔

لیکن یہ ساری تعمیری وتخریبی، ملکی وسیاسی، تعلیمی وتنظیمی کوششیں اسی وقت اور صرف اسی وقت بارآور ہو سکتی ہیں۔ جب پہلے ہم خود شخصاً وجماعتاً مسلمان بن جائیں۔ نماز باجماعت جو ہمارے تمام امراض کا علاج وحید تھی اس کی طرف سے ہم یکسر غافل وبے پروا ہیں اور پھر چاہتے یہ ہیں کہ کسی طرح ہماری بگڑی بن جائے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ مصلحین کا ذکر ہے اور وہاں عمل میں ان کی شناخت ارشاد ہوئی ہے (وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ) کہ وہ نماز باجماعت پابندی سے ادا کرتے ہیں، وقت نہیں ہے ورنہ نماز باجماعت کے فضائل ومصالح، قومی واجتماعی نقطۂ نظر سے ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کیے جاتے۔ باقی اگر ذاتی رائے دریافت کی جائے تو جی یہ چاہتا ہے کہ خلافت کمیٹی کی ممبری کی شرط ہی نماز باجماعت رکھ دی جائے۔ یعنی آئندہ سے ارکان صرف وہی مسلمان ہو سکیں جو نماز باجماعت کے پابند ہوں۔ آج سینکڑوں اسکیمیں اور تجویزیں قوم کے سامنے پیش ہیں، لیکن اگر آج سے ہر مسلمان مرد نماز باجماعت کا عہد کر لے اور ہر مسلمان عورت چرخہ کو اپنے لیے لازمی سمجھ لے اور کم از کم تجربہ ہی کے طور پر دو برس اس پر عمل رہے تو خدائے قادر وتوانا کے فضل وکرم پر اعتماد کر کے دعوے کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اس دو برس کی مدت میں اسلامی ہند کی کایا کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ یہ نماز باجماعت ہی ہمارے دلوں میں اتحاد پیدا کر سکتی ہے جس کے فقدان نے آج ہر قسم کی ابتری اور بدنظمی پیدا کر رکھی ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جزوی اختلاف رائے وعقیدہ ایک مہتم بالشان مخالفت بن جاتا ہے۔

کام کرنے والوں کی کثرت وفراوانی پہلے بھی نہ تھی، لیکن اب تو یکسر قحط ہوگیا ہے۔ کام اپنی جگہ پر بدستور، لیکن کام کرنے والے عنقا، ہر شخص دوسرے پر معترض، ہر فریق دوسرے سے بدگمان، جو بچے کھچے اللہ کے بندے ابھی تک کام میں لگے ہوئے، خدا ان کی ہمت میں برکت وترقی دے۔ بڑے بڑے کام ہمیشہ قلیل ومختصر سی جماعتوں ہی نے انجام دیے ہیں۔ تعداد کی کثرت اور سامان کی زیادتی خدا سے اعتماد ہٹا کر تعداد وسامان پر کر دیتی ہے، اسی لیے اس کا انجام اکثر ناکامی پر ہوتا ہے۔ میدان بدر میں تین سو مومنین صادقین نے اس فوج پر فتح پائی ہے جو تعداد میں ان کی تین گنی اور سامان جنگ کے لحاظ سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ ایران اور روما اپنے زمانہ کی متمدن ترین اور زبردست ترین سلطنتیں تھیں، مسلمانوں نے جب انھیں فتح کیا ہے تو اپنی تعداد، سامان جنگ، قواعد دانی، کسی اعتبار سے بھی ان کے ہمسر نہ تھے صرف قوت ایمانی میں ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ آپ بھی اپنے دل میں یہی قوت ایمانی پیدا کر کے دیکھیے اور پھر ہمیشہ کے لیے دوسروں کی کثرت تعداد وغیرہ کے خوف سے امن ہو جائے گا۔ حضرت جوہر جو یہیں آپ کے سامنے تشریف فرما ہیں انھوں نے کیا خوب فرمایا ہے۔

تو طیر ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور
بیچارگی پر اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ

جس خدائے قدوس وتوانا نے ایک مشت پر میں یہ قوت دے دی تھی کہ وہ ایک زبردست بادشاہ کی زبردست فوج کو دم کے دم میں ملیامیٹ کر دے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ آج ہم ناتوانوں اور بیکسوں کے ذریعہ سے اپنے بڑے سے بڑے کام لے! اور دنیا کی بڑی بڑی گردن کش قوموں کا سر غرور ہمارے ہی دست ناتواں سے نیچا کر کے چھوڑے۔

محترم بزرگو! اس طویل سمع خراشی کو ختم کر کے اب آپ سے ان کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کے لیے جو مہمانداری کے سلسلہ میں یقیناً ہوئی ہیں، آپ ہی کے الطاف کریمانہ کو آپ کے سامنے شفیع بناتا ہوں۔ اپنی ذات کے متعلق مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ آپ حضرات کی خدمت گزاری کی سرے سے اہلیت وصلاحیت ہی مجھ میں نہ تھی اور نہ ہے۔ زمانہ کی نیرنگی اور عبرت اندوزی کا یہ بھی ایک نمونہ ہے کہ مجلس استقبالیہ کی صدارت جیسی اہم اور جلیل القدر خدمت

کے لیے قرعۂ انتخاب مجھ جیسے نا اہل شخص پر پڑا۔ آج جو کچھ بھی آپ دیکھتے ہیں یہ سب دفتری مرکزی کے کارکنوں اور مجلس استقبالیہ کے بعض مستعد کارگزاروں کی محنت وسعی کا نتیجہ ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ. اے دلوں کو پھیر دینے والے پروردگار! تو نے عرب کے شدید کینہ پرور نفاق پسند سینوں میں ایمان کی حلاوت اور دین کی لذت ڈال کر سب کو ایک کر دیا تھا۔ تو نے اوس وخزرج کی لڑائیوں کی آگ کو جو پشتہا پشت سے بھڑکتی چلی آرہی تھی محبت اسلام کے پانی سے دم کے دم فرو کر دیا تھا تو آج بھی وہی ہے جو سدا سے تھا، آج اپنے نام کا کلمہ پڑھنے والوں کو توفیق دے کہ خلوص ومحبت کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کر تیرے دین کی خدمت پر آمادہ ہو جائیں! ان کے سینوں کو نفاق سے پاک کردے اور ان کے دماغوں اور عقلوں سے مادی قوتوں اور طاغوتی حکومتوں کی مرعوبیت اور ہیبت دور کردے!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

......☆☆☆......

باب:67

2:1927

(جوش کے ساتھ ہوش۔جنون کے ساتھ تدبر)

قانون فوجداری کی مشہور ومعروف کتاب ''ضابطۂ تعزیرات ہند'' کھولیے تو دفعہ 295 الف آپ کو حسب ذیل الفاظ میں ملے گی:

''جو کوئی جان بوجھ کر اور بدنیتی سے ملک معظم کی رعایا کے کسی طبقہ کے مذہبی احساسات کو الفاظ کے ذریعہ سے زبانی ہوں یا تحریری، یا نقوش مرئی کے ذریعہ سے ٹھیس پہنچانے کی غرض سے اس کے مذہب یا مذہبی معتقدات کی توہین کرے گا یا توہین کرنے کی کوشش کرے گا، وہ دو سال کی سزائے قید کا خواہ وہ قید کسی قسم کی ہو، یا جرمانہ یا دونوں (سزاؤں) کا مستوجب ہوگا''۔

آپ کہیں گے کہ محمد علی کی زندگی، خصوصاً اس کے متعلق ڈائری کو آخر تعزیرات ہند سے کیا تعلق؟...... تعلق ہے اور ابھی چند سطروں میں ظاہر ہوا جاتا ہے۔

27 ابھی چل ہی رہا تھا کہ پنجاب کے کسی بدزبان، بے لگام آریہ سماجی نے ایک کتاب نہایت گستاخانہ بلکہ ''پاجیانہ'' ذات رسالت مآبؐ سے متعلق لکھ ماری۔ دو ایک اور کتابیں اسی زمانہ میں ایسی ہی اشتعال انگیز اور صبر آزما اس موضوع پر نکل چکی تھیں۔ مسلمان اب غصہ سے بھبوکا اور بالکل بپھرے ہوئے تھے۔ اتفاق وقت کہ اس گندی کتاب کے متعلق مقدمہ جب

پنجاب ہائی کورٹ میں گیا تو دوسرے ججوں کی رائے جو کچھ بھی رہی ہو جسٹس دلیپ سنگھ نے اپنے فیصلہ میں یہ لکھ دیا کہ کتاب کی عبارتیں کیسی ہی ناخوشگوار ہوں بہر حال کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر رہی ہیں اور اس لیے حدود قانون کے اندر ہیں۔ اس فیصلہ کا شائع ہونا تھا کہ پنجاب ہی میں نہیں سارے اسلامی ہند میں ایک آگ لگ گئی، اور جسٹس دلیپ سنگ چونکہ نام سے ہندو یا سکھ معلوم ہو رہے تھے (حالانکہ واقعتاً مسیحی تھے) اس لیے قوم کے سارے غصہ کا مرکز ومحور ان ہی کی ذات کو بننا پڑا...... سارے مسلمان جوش سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اخبارات خصوصاً پنجاب کے اخبارات، ایک سے بڑھ کر ایک تیز مضمون لکھ رہے تھے، تقریریں شعلہ برسا رہی تھیں لیکن خاموش تھے تو ایک مولانا! ساکت تھا تو ان ہی کا اخبار ہمدرد۔

....

ان کا سکوت معاصرین کو انتہائی بے محل نظر آیا۔ اور جن کے سینوں میں رقابت کی آگ مدت سے دبی ہوئی تھی، انھیں تو کھل کھیلنے کا جیسے خداداد موقع ہاتھ آ گیا...... یاد کر لیجیے کہ کتنی پارٹیاں کسی نہ کسی سبب سے مولانا سے جلی ہوئی بیٹھی تھیں۔ خواجہ حسن نظامی اور ان کے ساتھ کے سارے ''خوش عقیدہ'' صوفیہ ومشائخ، مولوی ظفر علی خان صاحب اور ان کے ساتھ سارے اہل حدیث اور غالی ''غیر مقلدین''۔ سرکاری انگریزی کے وفادار وخیر خواہ سارے ''خان بہادر'' رئیس اور امیر وغیرہا...... اب سب کے سب مل کو ٹوٹ پڑے اور ہر طرف سے شور بلند ہو گیا کہ ''دیکھ لی محمد علی کی ہندو پرستی، ناموس رسولؐ پر اتنا بڑا حملہ ہو گیا اور ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بولیں کیسے، ہندو کانگریس سے تنخواہ پا رہے ہیں۔ گاندھی جی اور موتی لعل نہرو اور پنڈت مدن موہن مالویہ اور سیٹھ برلا کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں نا! وقس علیٰ ہذا

محمد علی انتہائی جوشیلے ہونے کے باوجود بہر حال ہوش بھی ذمہ دار ترین لیڈر کا رکھتے تھے اور اپنا کام ہر تیز دھارے کے ساتھ بہنا نہیں، بلکہ عوام کو سیدھی راہ دکھانا، ملت کی صحیح رہنمائی کرنا جانتے تھے۔ ہفتوں بلکہ شاید مہینوں تک صبر وتحمل کے ساتھ گالیاں کھانے، آوازے سننے کے بعد بالآخر بولے، اور وہ بول بولے جسے سب کو سننا، سب کو ماننا پڑا اور بالآخر اسی کے آگے جھکنا پڑا۔ جون کی 27 تھی جب مولانا کا پہلا مضمون اس مبحث پر ہمدرد میں نکلا، اور پھر

10 اگست کو۔ اور بھی ان کے مضامین نکلے ہوں گے لیکن اس ڈائری کو تعلق ان کے مضامین سے نہیں، اس کا تعلق تو ان کی زندگی سے متعلق ڈائری نگار کے صرف ذاتی مشاہدات سے ہے۔

....

جولائی کی 15 تھی لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ کے مسلمانوں نے ایک بڑا ہی زبردست احتجاجی جلسہ لکھنؤ میں کیا اور صدارت کے لیے مولانا کو دہلی سے بلایا۔ اتنا بڑا اور پُرشوکت جلسہ مسلمانوں کا لکھنؤ میں کمتر ہی ہوا ہوگا۔ تحفظ ناموس رسولؐ کے نام میں کشش ہی ایسی تھی۔ شیعہ سنیوں میں چلی ہوئی تھی لیکن آج کلمہ کی وحدت نے سب کو گلے ملا دیا تھا۔ نقیب اہل سنت النجم کے مدیر اور شیعہ کانفرنس کے سکریٹری دونوں صدر محترم کے پہلو میں ایک ہی تخت پر بیٹھے ہوئے۔ امیر، غریب، عوام، خواص، وہابی، بدعتی، اہل قرآن، سب کے سب آج صرف کلمہ گو تھے اور ناموس رسولؐ کے محافظ۔ تحریک خلافت کے عین شباب کے زمانہ کی طرح آج چھوٹا اور بڑا مسلمان ہی ہر طرف سے ابلا پڑ رہا تھا...... یہ دریابادی، محمد علی کی آمد پر، حسب معمول لکھنؤ پہلے سے آ گیا اور پیشوائی کے لیے اسٹیشن پر موجود تھا بھی۔

جلسہ بعد عصر رفاہ عام حال کے عقبی میدان میں ہوا، اس وقت تک پبلک جلسے عموماً وہیں ہوا کرتے تھے، امین الدولہ پارک کا نام بطور جلسہ گاہ کے اب دو ہی چار سال سے آنا شروع ہوا تھا، عبرت اور بصیرت کی آنکھ یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ابھی دو برس پہلے مسئلہ حجاز پر محمد علی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تھے اور شور وغل کر کے انھیں بولنے ہی سے روک دیا گیا تھا اور کہاں اب اس عقیدت و محبت کے ساتھ سب کی نظروں کے مرکز وہی بنے ہوئے ہیں، اور ان کے ایک ایک فقرہ پر تحسین کے نعرے بلند ہو رہے ہیں!

مولوی ظفر الملک علوی (ایڈیٹر الناظر مرحوم) بڑے پر جوش لوگوں میں تھے۔ کہنا چاہیے کہ جوش مجسم تھے۔ شروع میں تقریر ان ہی کی ہوئی، اور اس نے مجمع میں ہلچل سی ڈال دی۔ مجمع اشتعال پذیر پہلے ہی سے تھا، اب یہی معلوم ہوتا تھا کہ جما جمایا جلسہ اکھڑ جائے گا اور مجمع خود قانون کو ہاتھ میں لے کر کچھ نہ کچھ کر ہی گزرے گا۔ لیکن واہ رے محمد علی۔ جلسہ کو اب سنبھالنا ان ہی کا کام تھا۔ آج کی تقریر نرم و گرم، جوش ہوش کا ایک عجیب دلچسپ اور اثر آفریں مجموعہ تھا۔ پہلے تو

انہوں نے جلسہ کو خوب گرمایا اور پھر ٹھنڈا بھی خوب ہی کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا:

''ایسی کتابیں اور مضامین یقیناً ہر مسلمان کا خون کھولا دینے کے لیے کافی ہیں۔ جتنا بھی جوش و خروش آپ میں پیدا ہو، سب بجا ہے لیکن اصل کوشش فتنہ کے سر چشمہ کو بند کرنے کی ہونی چاہیے نہ کہ فلاں جج کو ہٹا دینے کی۔ قصور قاضی کا نہیں، قصور خود قانون کا ہے۔ میں کوئی وکیل نہیں، بیرسٹر نہیں، قانون میں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ بار بار ملزم کی حیثیت سے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو ہو کر سیکھا ہے۔ تو مجھ عامی کا پُر زور مشورہ یہی ہے کہ آئندہ سد باب فتنہ کے لیے قانون ہی کو بدلوایئے۔ اور تعزیرات ہند میں ایک مستقل دفعہ بڑھوا کر توہین بانیان مذاہب کو جرم قرار دیجئے۔ اب تک یہ کوئی مستقل جرم ہی آپ کے ملکی قانون میں نہیں۔ رعایا کے فرقوں کی دلآ زاری کے تحت میں لا کر بعض عدالتیں ایسے مجرموں کو سزا دے دیتی ہیں لیکن یہ تو حاکم کی رائے ہوئی، کوئی مستقل قانون تو نہ ہوا۔ میں اسمبلی کا ممبر نہیں، دفعہ کا مسودہ میں تیار کیے دیتا ہوں، کوئی ممبر صاحب اس میں مناسب لفظی ترمیم کر کے اسے اسمبلی میں پیش کریں اور منظور کرائیں تاکہ ہمارے آقا و ہادیؐ اور ان کے ساتھ تمام دوسرے مذہبوں کے محترم بانیوں کی بھی شخصیتیں بدزبان و بے لگام لکھنے والوں کے حملہ سے محفوظ رہیں۔ علمی رنگ میں کسی مذہب پر یا تاریخی حیثیت سے کسی مذہب کے بانی پر سنجیدہ تنقید کرنا بالکل دوسری شئے ہے، اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے لیکن جو طعن و تعریض، توہین اور سب و شتم جو کسی مذہب کے بھی پیمبروں یا دوسرے بزرگانِ دین کے حق میں ہو آج سے اسے ہندوستان کے قانون میں قطعی جرم قرار دیا جانا چاہیے''۔

یہ تقریر محمد علی کی صحیح اور تاریخی رہنمائی کی ایک مثال تھی، شروع شروع اقبالؒ تک اس کے موئید نہ تھے۔ رفتہ رفتہ سارا ملک تائید کرنے لگا۔ اور کہاں تو قوم ایک بہت ہی محدود اور شخصی مقصد (جسٹس کنور دلیپ سنگھ کے ہٹائے جانے) کے پیچھے مٹی ہوئی تھی کہاں اس بلند اور اصولی مقصد کو اس نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ کامریڈ تو بند ہی ہو چکا تھا، اب لے دے کے ہمدرد ہی تھا جس کی اشاعت خود ہی بہت محدود تھی، اور اشاعت زائد ہوتی بھی کیسے، محمد علی کی تاکید شدید رہتی تھی کہ ''اخباری سنسنی خیزی'' سے ہمدرد اپنا دامن برابر بچائے رکھے۔ بہر حال کچھ اس کے سہارے اور کچھ زبانی تقریروں سے، اللہ نے برکت یہ دے دی کہ یہی تحریک مقبول ہو گئی اور چند ہفتوں کے

اندر ایک ممبر نے اسمبلی میں تعزیرات ہند کی دفعہ 295 میں اضافہ کر کے۔دفعہ 295 الف کے نام سے یہ دفعہ بھی منظور کرا دی جس کے الفاظ تک اصلاً محمد علی ہی کے مرتب کیے ہوئے ہیں۔اور یہ دفعہ جب تک بھی ملک کے قانون میں موجود رہے گی اس کا اجران کے نامۂ عمل میں ثبت ہوتا رہے گا...... خدمتِ دین وملت کے جو مستقل کام محمد علی اپنی مختصری زندگی میں انجام دے گئے یہ اس کی کوئی منفرد مثال نہیں۔چھوٹی بڑی خدا جانے کتنی ان کی مخلصانہ خدمتیں اسی نوعیت کی ہیں، کاش کسی کو بھی ان کی مفصل سیرت نگاری کی توفیق ہو جاتی! اور اب کیا ہوگی، دیکھتے ہی دیکھتے ان کے جانے والے بھی کتنے اٹھ گئے اور ان کی یاد بھی کتنے دلوں سے مٹ گئی! ع

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

اور ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

لیکن یہ سب بھی صرف ظاہر کے اعتبار سے ہے، ورنہ حقیقت کے لحاظ سے تو ہر متنفس کے اعمال کا خدائی نامۂ اعمال ہی میں درج ہونا بس کرتا ہے۔

......☆☆☆......

باب:68

3:1927

(بیباکی،شوخی،فراخ دلی)

اسی 27 کا جون یا جولائی ہے،اور محمد علی لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔شہر کے ایک معزز گھرانے میں تقریب ہے۔مولوی عبدالغنی پنشنر ڈسٹرکٹ وسیشن جج ہیں[1] تو پنجابی،مگر لکھنؤ کے ہو چکے ہیں۔ان ہی کی تیسری لڑکی کی شادی،مشہور اسلامی مشنری خواجہ کمال الدین، احمدی لاہوری (ووکنگ مشن والے) کے لڑکے کے ساتھ ہے۔اور بارات لاہور سے آئی ہوئی ہے۔محمد علی کے تعلقات دلہن کے گھرانے سے بڑے پرانے اور گہرے ہیں۔بڑی لڑکی کے شوہر حسن محمد حیات ہیں۔محمد علی کے رفیق قدیم اور ان کے 20 والے یورپی وفد خلافت کے سکریٹری۔محمد علی اسی خصوصیت سے وہاں وقت سے بہت پہلے پہنچ گئے ہیں۔اور حیات صاحب کے بچوں اور بچیوں سے کھیل رہے ہیں......ایک بار پھر یاد کر لیجیے کہ مولانا بچوں اور بچیوں کے ساتھ کھیلنے کے حریص تھے......بعد مغرب بزم عقد آراستہ ہوئی۔عین اس زمانہ میں مصر کی ایک بڑی ''روشن خیال'' خاتون ہندوستان آئی ہوئی تھیں اور اس وقت لکھنؤ کے اونچے حلقوں میں شمع بزم بنی ہوئی تھیں، کیسے ممکن تھا کہ یہ جلسہ ان سے محروم رہتا۔اودھ چیف کورٹ کے ایک مشہور جج (غالباً اس وقت

---

[1] اودھ چیف کورٹ کے چیف جج اور الہ آباد ہائی کورٹ کے جج جسٹس حسن بٹ کے ماموں اور خسر اور اب مرحوم۔(1951)

چیف جسٹس) معزز ترین مہمان تھے۔ ان ہی کے پہلو میں اپنے برہنہ بازوؤں اور گوری پنڈلیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ خواجہ صاحب ایجاب وقبول سے قبل تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور سورۂ نساء کی جو آیتیں نکاح کے خطبۂ مسنون کا جزو ہیں، انھیں پڑھ کر ان کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ فرنگی تہذیب کی بے اعتدالیوں اور بے حیائیوں کا ذکر یوں بھی لانا ضروری تھا اور پھر اب تو سامنے فرنگیت کا ایک مجسم نمونہ بھی موجود تھا، تقریر کا رخ ابھی یورپی مشاہدات کی طرف مڑا ہی تھا کہ ان چیف جسٹس صاحب نے اپنے عہدہ ومرتبہ کی بڑائی سے فائدہ اٹھا کر اور عام آداب محفل کو ٹھکرا کر، مقرر سے ارشاد فرمایا ''بس ان حملوں کو ختم کیجیے۔ یورپ کی زندگی کا تجربہ رکھنے والے دوسرے بھی ہیں''...... خواجہ صاحب ایک مشہور مقرر، مبلغ ومناظر ہی نہ تھے اس محفل میں تو سدھی کی اور نوشہ کے باپ کی حیثیت سے بھی ہر لحاظ اور احترام کے مستحق تھے۔ کوئی دوسرا انھیں یوں ٹوکنے کی جرأت کرتا تو شاید اس کا منہ نوچ لیا جاتا اور عجب نہیں جو صاحب خانہ اسے اپنی ذاتی توہین سمجھ کر ایسے مہمان کو محفل ہی میں موجود رہنے کی تکلیف نہ دیتے۔ لیکن یہاں معاملہ اودھ کے سب سے بڑے عدالتی حاکم کا تھا۔ حاضر الوقت وکیلوں، بیرسٹروں، منصفوں، سب ججوں میں سے کسی کی مجال تھی جو ''ہوں'' بھی کر سکے!

جسٹس موصوف کے فقرہ کی گونج ابھی فضا میں ختم ہوئی تھی کہ بجلی کی سی تیزی سے ایک آواز بلند ہوئی! ''اور آپ کے ان یورپی تجربوں میں شریک رہنے والا اور ان کا گواہ کوئی اور بھی ہے''۔ آواز صدر محفل سے نہیں، دور سے ایک گوشہ سے آئی تھی، معاً سینکڑوں گردنیں ادھر مڑ گئیں، صدہا آنکھیں ادھر اٹھ گئیں کہ ایسا بیباک اور سر پھرا ہو کون سکتا ہے!...... دیکھنے والوں نے دیکھا تو یہ لقمہ دینے والا، داڑھی رکھائے ہوئے اور کھدری عبا پہنے ہوئے آکسفورڈ کا گریجویٹ محمد علی تھا! محمد علی، نوشہ کا تخت اور صدر مجلس کا صوفے اور کوچ چھوڑ عام حاضرین میں ملے جلے کھڑے ہوئے تھے اور وہیں سے یہ فقرہ بول اٹھے تھے...... جاننے والوں پر یہ روشن تھا کہ اس وقت کے جسٹس صاحب 1913 میں لکھنؤ کے ایک ایڈوکیٹ اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری تھے اور اسی سکریٹری کی حیثیت سے ان ہی محمد علی ایڈیٹر کامریڈ کی رفاقت میں بسلسلہ ہنگامہ مسجد کانپور [1] دفعتاً لندن روانہ

---

[1] اس مسجد کا ہلکا سا ذکر باب 4 پیرا (1) میں آچکا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو آگے کا باب 73۔ قریب وسط۔

ہو گئے تھے اور وہاں ان کی زندگی کا کوئی سا بھی گوشہ محمد علی سے مخفی نہیں رہا تھا۔ تلمیح بہت بلیغ اور معنی خیز تھی۔ لیکن بجز اس کے کہ اس تلخ گھونٹ کو خاموشی سے اتار لیا جائے۔ کوئی اور چارہ ہی کیا تھا؟

محمد علی کے لیے جلوت وخلوت یکساں تھی اور جہاں تک مذہب واخلاق کی نصرت وحمایت کا تعلق تھا، وہ ان کے لیے ہر جگہ ہر وقت شمشیر برہنہ ہی تھے۔

....

یہی محفل عقد جمی ہوئی ہے۔ مخصوص معززین صدر میں صوفوں اور کوچوں پر بیٹھے ہوئے ہیں باقی ادھر ادھر ٹھٹ لگائے کھڑے ہوئے ہیں۔ ان ہی میں علی گڑھ کے اولڈ بوائے ایک ڈپٹی صاحب بھی ہیں جو غالباً اس وقت لکھنؤ میں مجسٹریٹ ہیں۔ خواجہ صاحب کی تقریر ہو رہی ہے اور لوگ سننے میں منہمک ہیں۔ اتنے میں ایک صاحب دبے پاؤں ان مجسٹریٹ صاحب تک ان کی پشت کی طرف سے پہنچتے ہیں اور سر پر ایک چپت جما دیتے ہیں! ڈپٹی صاحب، شہر کے حاکم اور پھر اتفاق سے خان صاحب بھی۔ قدرتاً دنگ اور حیران، غصہ سے بھرے ہوئے منہ پھیر کر دیکھنے لگے کہ بھری محفل میں ایسی حرکت ناشائستہ کر کون سکتا ہے...... دیکھتے کیا ہیں کہ یہ حضرت پیشوائے ملک وقوم، صدر کانگریس صدر خلافت مولانا محمد علی ہیں!

محمد علی کے زمانہ میں یہ صاحب بھی علی گڑھ میں تھے، گو ان سے جونیئر، وہی بے تکلفی، یگانگت محمد علی کی طرف سے آج تک قائم تھی۔ حالانکہ اب سالہا سال سے ان سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا بلکہ اس وقت تو محمد علی بہر حال سرکار برطانیہ کے مجرم ہی تھے اور اور ڈپٹی صاحب حاکم شہر...... تصنع وتکلف محمد علی جانتے ہی نہ تھے جس کسی سے ان سے راہ ورسم زندگی کے کسی دور میں بھی ہو گیا بس وہ اپنی طرف سے اسے آخر دم تک نباہنے کو تیار۔ اور اس میں نہ وہ اپنے مرتبہ کو دیکھیں نہ اس کے مرتبہ کو۔ ہاں، بجز اس صورت کے کہ وہ کوئی دینی، ملی، قومی جرم کر کے انھیں ناخوش کر دے۔ بس پھر تو وہ اس کی شکل تک سے بیزار ہو جاتے اور اس سے بات تک کرنے کے روادار نہ رہتے۔

....

محمد علی کے لیے کوئی سال اب صدموں اور سخت صدموں سے خالی نہیں جاتا تھا۔ ناموس رسولؐ پر بعض گندہ ذہنوں کی طرف سے حملے ہوتے رہتے تھے، ان کا اثر قلب پر ان سے بڑھ کر

لینے والا اور کون تھا۔ پھر اپنی ہی قوم کی طرف سے شدید مخالفت اور مسلسل بغاوت۔ اس پر مستزاد روز افزوں ہندو مسلم مناقشات اور اندرون ملک قومی انتشار۔ گاندھی جی اور علی برادران کی کوششیں برابر ناکام ہوتی جارہی تھیں۔ ایک رخنہ کو بند کرتے تھے، تو چار رخنے دوسرے پیدا ہوجاتے تھے۔ اور سال کے خاتمہ پر دلی کے مشہور و معروف طبیب اعظم اور خادم خلق حکیم اجمل خان کی یک بیک موت نے تو محمد علی کا دل ہی بجھا دیا۔ حکیم صاحب نے عمر کل 60،62 سال کی پائی اور موت اتفاق سے خاص محمد علی کے وطن رامپور ہی میں ہوئی۔ گو وہ وطن ایسا تھا کہ اس سے بحکم ہز ہائنس نواب حامد علی خاں، والیٔ رامپور اب علی برادران مدت سے جلاوطن تھے، اور سخت سے سخت خانگی ضرورت کے وقت بھی اس سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔

یہ سب سیاسی اور ذاتی فکریں اور پریشانیاں تو تھیں ہی، گھلا دینے والا ایک بڑا غم یہ تھا کہ ان کا نقیب و ترجمان ہمدرد مالی اعتبار سے برابر گرتا جارہا تھا، اور اسی نسبت سے محمد علی کی مالی حالت بھی روز بروز زبوں تر ہوتی جارہی تھی۔ دہلی ہر دفعہ جاکر یہی تاسف انگیز منظر دیکھنا پڑتا تھا کہ خرچ سب وہی، وہی حوصلہ مندیاں، وہی مہمان داریاں اور آمدنی جو کل تھی آج اتنی بھی نہیں۔ عادت موٹر پر سوار ہونے کی تھی، وہ اب کہاں نصیب۔ نماز جمعہ کے لیے التزام جامع مسجد کی کیے ہوئے تھے وہاں کے لیے تانگہ ہی سے کام لیتے تھے [1]۔ اور کبھی جب تانگہ کا بھی کرایہ جیب میں نہ ہو، تو پیدل ہی چل کھڑے ہوتے۔ ایک روز شام کو ڈاکٹر انصاری کے ہاں جانا تھا، پیدل ہی گئے پیدل ہی آئے۔ راستہ میں کہیں میری زبان سے نکل گیا کہ ''کیا عرض کروں، میں تو دہلی بار بار آنے کے لیے تیار رہتا ہوں، آپ کو کبھی دوبارہ حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اگر ریلوے کمپنی کہیں اپنی معتقد ہوتی تو یہ مسئلہ بھی حل تھا''۔ معاً ان کا ذہن دوسری طرف منتقل ہوگیا۔ بولے کہ ''دفتر ہمدرد بڑی خوشی سے مصارف آمد و رفت پیش کردیا کرے گا''۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، فوراً بات بدلی۔ یہاں لکھنے سے مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ محمد علی مفلسی میں بھی ہمت وہی رکھتے تھے۔ خود اچھا کھانا یقیناً چاہتے تھے لیکن اس سے بھی مقدم دوسروں کو کھلانا رکھتے۔

---

1 اور ستم یہ کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر فقیروں اور فقیرنیوں کا غول جمع رہتا، انھیں دینے کے لیے جیب میں دو چار روپیہ کی ریزگاری ضرور رکھتے۔

باب:69

1:1928

(غیروں کی محفل میں۔تنگ دستی)

27 کا آخر تھا کہ لکھنؤ میں سکھوں کے ہاں کوئی بڑی تقریب ہوئی جس میں شرکت کے لیے اس وقت کے بڑے بڑے سکھ لیڈر لکھنؤ آئے۔ایک دن اعلان ہوا کہ شام کو چراغ جلے، گنگا پرشاد میموریل ہال میں پبلک جلسہ میں سردار منگل سنگھ اور بابا کھڑک سنگھ تقریریں کریں گے۔منگل سنگھ اس وقت کانگریس میں بہت پیش پیش تھے، غالباً ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی۔بابا کھڑک سنگھ کا اثر واقتدار کانگریسی حلقہ کے علاوہ بھی بہت تھا اور اس وقت چوٹی کے سکھ لیڈر شاید یہی کہے جاسکتے تھے۔اتفاق سے مولانا بھی اسی دن لکھنؤ آگئے اور وہ کانگریس کے تازہ سابق صدر تھے۔کیسے ممکن تھا کہ جلسہ میں مدعو نہ کیے جاتے۔جلسہ ایک مسلمان (اس وقت کے نیک نام اور بعد کے ''بدنام'') مقامی لیڈر چودھری خلیق الزماں کی صدارت میں شروع ہوا......47،46 کے دور خونیں سے قبل خالص سکھوں کے جلسے بھی مسلمان کی صدارت میں ہوسکتے تھے، اور چودھری صاحب اس وقت ہندو مسلم دونوں کے لیڈر تھے......اور ڈائس پر مولانا بھی دونوں سکھ لیڈروں کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔پہلے سردار منگل سنگھ بولے۔اور وقت کی سیاست کی ترجمانی کرتے رہے اور پھر بابا کھڑک سنگھ کھڑے ہوئے۔چہرہ پر درویشانہ

اشراقیت کی جھلک۔تقریر شروع کی تو سیاست سے کہیں زیادہ مذہب اور روحانیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔کہیں شیخ سعدی کے اشعار، اور کہیں دوسرے مسلمان صوفیوں کے حوالہ۔ان کی تقریر جاری تھی کہ صدر جلسہ کو کہیں اور جانے کی ضرورت پیش آ گئی۔میری طرف اشارہ کیا اور ڈائس پر بلایا۔میں سمجھا کہ کوئی ضروری بات کہنا ہوگی۔پہنچا تو جھٹ اپنی کرسی خالی کر کے مجھے بٹھادیا، اور کان میں چپکے سے یہ کہتے ہوئے چل کھڑے ہوئے کہ ''میری جگہ تم ہی اب صدارت کرلو، مجھے جانا ہے''۔انکار و گفتگو کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔اب یہ خاکسار تھا اور کرسی صدارت۔کھڑک سنگھ کا درویشانہ وعظ کچھ دیر بعد ختم ہوا، اور مولانا کی باری آئی۔

....

محمد علی کی تقریر مذہب اور سیاست کا ''آمیزہ'' تو ہمیشہ ہوتی تھی اور پھر آج تو جلسہ کہنا چاہیے کہ غیر مسلموں ہی کا تھا۔آج سے بڑھ کر تبلیغ کا موقع اور کب ملتا۔پوری تقریر اب کہاں یاد ایک ذرا سا ٹکڑا حافظہ میں رہ گیا۔خرمن کا اندازہ ان ہی چند دانوں سے کیجیے:

''میرا مذہب عدل کا مذہب ہے۔میں تو اپنے مذہب کے لحاظ سے کسی پر ظلم زیادتی دیکھ ہی نہیں سکتا۔مسلمان کے ساتھ مسلمان کے خلوص کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو ناانصافی سے روکیں، عدل و خوش خلقی کی تلقین و تبلیغ کرتے رہیں'' My country, right or worng'' (حق ہو یا ناحق، بہر حال ہمیں تو اپنے وطن کا ساتھ دینا ہے) یہ اور جس کسی کا بھی اصول ہو، مسلمان کا یہ مسلک نہیں ہو سکتا۔ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا:

''اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِماً اَوْ مَظْلُوْمًا''

ترجمہ: اپنے بھائی کی مدد کرو، وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔

''صحابہؓ نے عرض کیا، کہ حضرت مظلوم بھائی کی مدد تو سمجھ میں آ گئی، وہ تو بے شک ہمارا فرض ہے لیکن ظالم مسلمان کی مدد سمجھ میں نہ آئی۔وہ اگر ظالم ہے تو کیا اس کے ظلم پر ہم اعانت کریں؟ ارشاد ہوا کہ ظلم پر اعانت ہر گز نہیں۔ظالم بھائی کی مدد یہی ہے کہ اسے ظلم سے روکو، باز رکھو۔یہی اس کے ساتھ سچی دوستی اور یہی اس کی حقیقی خیر خواہی ہے۔تو حضرات میرا کام تو

اللہ کی سرزمین کو عدل سے بھر دینا ہے۔ میرا مذہب ساری دنیا کے لیے رحمت ہے۔ مسلمان تو دنیا میں اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ عدل کی حکومت پھیلائے''۔

یہ تقریر کانگریس کے سابق صدر کی تھی! ......10،8، قبل عین نظر بندی کے زمانہ میں ریل پر دوران سفر میں محمد علی نے اپنے اس نیاز مند سے جوش وخروش کے لہجہ میں کہا تھا کہ اب دھن ہے تو اس کی کہ نظر بندی سے چھوٹوں تو یورپ پہنچوں اور وہاں گلی گلی اسلام کی تبلیغ کرتا پھروں [1] دیوانہ۔ اپنی وہی صدا اب لگا تا پھر رہا تھا!

....

28 کی پہلی سہ ماہی تھی کہ سرکار برطانیہ نے ہندوستان کی آئینی آزادیوں کی تحقیق اور ہندوستانیوں میں خود مختاری کی جانچ کے لیے ایک کمیشن سرجان سائمن کی صدارت میں بڑی دھوم دھام سے ہندوستان بھیجا۔ یہاں مخالفت بھی اس کی اسی زور شور سے ہوئی اور شہر شہر ''سائمن گو بیک'' (سائمن واپس جاؤ) کے کرخت نعرے، سیاہ جھنڈیوں کے جلوس کے ساتھ لگنے لگے۔ لیکن مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی جماعت برادرانِ وطن کی تنگ نظری سے تنگ آ کر، اس کمیشن کے ساتھ اتحاد کو تیار ہو گئی۔ لکھنؤ میں ایک پبلک جلسہ ایک سہ پہر کو امین الدولہ پارک میں کمیشن کی مخالفت و مقاطعہ کے لیے منعقد ہوا۔ اتفاق سے محمد علی بھی لکھنؤ میں موجود تھے، اور مولانا ابوالکلام اور حسرت موہانی بھی۔ جلسہ میں ان تینوں کا موجود ہونا لازمی۔ خبر یہ گرم تھی کہ مسلمانوں کا ایک بڑا جتھا، شہر کے ایک ذی اثر عوامی لیڈر (مولوی حکیم وزیر حسن مرحوم [2]) کی قیادت میں آئے گا اور جلسہ میں آ کر بولنے والوں کا ناطقہ بند کرے گا۔ مشہور یہ تھا کہ حسرت موہانی بھی اسی گروہ کے پشت پناہ ہیں۔ فضا ہو بھی ایسی چکی تھی کہ ہندوؤں کے مسلسل متعصبانہ طرزِ عمل کے باعث مسلم عوام کے دل ان سے ہٹ چکے تھے۔ اور اب وہ کسی جدوجہد میں بھی ان سے اشتراک نہیں چاہتے تھے۔ خیر وہ لوگ آئے، اور اب منظر قابل دید تھا

---

[1] ملاحظہ ہو باب (11) پیرا (1)

[2] ایک زبردست و پرجوش عوامی لیڈر تھے۔ پاکستان بنتے ہی کراچی منتقل ہو گئے۔ اور چند ہی ماہ بعد وہیں انتقال فرمایا۔

اس جتھے کے منہ لگنا اپنی عزت و وقار بلکہ اپنے جسم و جان سب کو خطرہ میں ڈالنے کے مرادف تھا۔ اس لیے اب کسی بڑی سے بڑی شہرت رکھنے والے مسلم لیڈر میں تقریر کرنے کی ہمت کہاں تھی۔ یہ ہمت صرف محمد علی نے کی۔ کھڑے ہوئے اور کچھ دیر بولنے کے بعد سوال حسرت موہانی سے کیا:

''حسرت صاحب، آپ کمیشن کے ساتھ موافقت کے حق میں ہیں یا مخالفت کے؟''

''جی میں نہ موافق ہوں نہ مخالف''۔

''اچھا، تو یہ کہیے کہ آپ نہ ''کوآپریشن'' کرنا چاہتے ہیں نہ ''نان کوآپریشن۔ بلکہ صرف آپریشن چاہتے ہیں''۔

جلسہ اس پر خوب ہنسا اور خوب کھلکھلا کر ہنسا۔ اس کے بعد مولانا مخالفین کے لیڈر حکیم صاحب سے مخاطب ہوئے اور ذیل کے فقرے سب نے سنے:

''حکیم صاحب۔ آپ میری تقریر سن چکے، اب بھی آپ ان لوگوں کے رویہ کو پسند کرتے ہیں جو آپ کے ساتھ آئے ہیں! اگر نہیں، تو ابھی اور یہیں ان لوگوں کے سامنے امر بالمعروف کیجیے''۔

حکیم صاحب بیچارہ کو اب تقریر کرتے ہی بنی، کمیشن کی موافقت میں نہیں، مخالفت میں!

''مخالفین کی کثرت وشوکت سے محمد علی مرعوب ومتاثر ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ''تبلیغ کا حق تو ابوجہل کے سامنے تقریر کرنے سے ادا ہوتا ہے، ابوبکر صدیقؓ کو کوئی کیا تبلیغ کرے گا''۔

....

محمد علی کی مالی اور خانگی پریشانیاں اب حد کمال کو پہنچ رہی تھیں۔ قرضہ سے لدے ہوئے تھے۔ ہمدرد سے زیر باری اور بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مخلصوں اور نیازمندوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ مارچ و اپریل میں پیہم نیاز نامے میں نے ان ہی مسائل سے متعلق لکھے۔ ایک خط میں یہ لکھا کہ دل کو ڈھارس دیے رہیے۔ اپنی طرف سے تقویٰ الٰہی پر قائم رہیے، کشادگی رزق کی بالکل غیر متوقع سمتوں سے بشارت بلکہ وعدہ تک موجود ہے۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللہَ یَجْعَلْ لَہٗ مَخْرَجاً وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ. ایک خط میں یہ لکھا کہ شوقینی کے ساتھ تو نہیں البتہ بالکل سادہ اور کفایت شعارانہ زندگی کھدر Scale کے مطابق یعنی ساری زندگی کو کھدری لباس کے پیمانہ پر لاکر یہ بتایئے کہ گزر بسر کتنے ماہوار میں ہو سکے گی تاکہ ہم نیاز مند کچھ اس کی فکر کر کے دیکھیں۔ ایک خط میں یہ لکھا کہ ہمدرد اگر بند ہی کر دینے کا تہیہ آپ فرما چکے ہیں، تو پھر اور کیا کرتے رہنے کا ارادہ ہے؟ مختلف انگریزی ولایتی پرچوں میں اگر مہینہ میں آپ چند ہی مضامین لکھ دیا کریں تو بہ آسانی معقول معاوضہ حاصل ہو سکتا ہے۔ آخر سینٹ نہال سنگھ [1] وغیرہ کا یہی ذریعہ معاش ہے۔ ایک خط میں یہ بھی عرض کر دیا کہ خود آپ کی مالی حالت تو ظاہر ہی ہے، شوکت صاحب کا خدا معلوم کیا حال ہے، عجب نہیں جو آپ سے تو بہتر ہی ہو۔ وقس علی ہذا۔

شروع اپریل کی کوئی تاریخ تھی، اور ڈاکٹر سید محمود [2] (سابق سکریٹری مرکزی خلافت کمیٹی جو اب بھی علی برادران کے خاص مخلصوں میں تھے) بھی کسی تقریب سے لکھنؤ آئے ہوئے۔ محل سرائے فرنگی محل میں ہم دونوں قطب میاں صاحب کے ہاں یکجا ہوئے۔ اور ہم تینوں کی زبان پر بیک وقت یہی مسئلہ محمد علی کی معاشیات کا آیا۔ تینوں یکساں مخلص اور اس وقت تک محمد علی کی محبت وعقیدت میں غرق...... قطب میاں کے لیے یاد کر لیجیے کہ علی برادران ان کے شیخ ومرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے یہ بھتیجے اور داماد اور جانشین تھے۔ مولاناؒ کے صاحبزادہ جمال میاں صاحب (جو آگے چل کر ایم ایل اے اور مالک وایڈیٹر ہمدم ہوئے) اس وقت تک بہت چھوٹے تھے اور اس لیے اس وقت مولانا کے جانشین اور خلیفہ قطب میاں صاحب ہی بلاشرکت غیرے تھے...... دیر کی رد وقدح کے بعد آخر یہ طے پایا کہ محمد علی کے خوش حال مداحوں اور معتقدوں میں سے 10، اور 12 ایسے لوگ انتخاب کر لیے جائیں جو ہر حال میں نذرانہ پیش کرتے رہنا اپنا فریضۂ اخلاص سمجھیں، اور سیاسیات کے اتار چڑھاؤ سے غیر متاثر رہ کر اپنا تعلق محمد علی کی ذات سے وابستہ رکھیں، اور نذرانہ فی کس کم از کم 25 روپیہ ماہوار

---

[1] اپنے زمانہ کے ایک مشہور انگریزی مضمون نگار کا نام، ہندستانی عیسائی تھے۔

[2] موجودہ وزیر صوبہ بہار۔ (جنوری 1952)

تجویز ہوا۔ گویا اس طرح کاغذ پر 250 یا 300 ماہوار کی آمدنی کا انتظام کرلیا گیا۔ اور تلاش واقعیت کی دنیا میں ان دس بارہ ناموں کی شروع ہوئی۔ قطب میاں اور ڈاکٹر محمود یہ دونوں تو خود تھے ہی، باقی 13 نام اور خیال میں رکھ لیے گئے۔ عبدالمجید خواجہ، تصدق احمد خان شیروانی، نواب محمد اسمٰعیل خاں، شاہ مصطفیٰ احمد ردولوی، سیٹھ عبداللہ ہارون وغیرہم، کہ ان میں سے کٹ چھنٹ کر 10، 12 نام تو بہرحال یقینی نکل آئیں گے۔ ڈاکٹر محمود صاحب کو اخلاص خصوصی شوکت علی کی ذات سے تھا، انھوں نے زور دیا کہ ان کی معاش کا بھی انتظام ضروری ہے۔ رقم کی میزان اس لیے دوگنی کرنی پڑی۔ خطوط زیادہ تر اس خاکسار ہی نے لکھے۔ کراچی کے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون کا جواب بڑی مستعدی سے اور ہمت افزا آیا۔ حسن اتفاق سے ایک اس طرح کے خط کا مسودہ اتنے دنوں کے بعد ہمیں ان سطروں کی تحریر کے وقت اپنے کاغذات میں محفوظ نکل آیا۔ باب کے آخر میں بطور ضمیمہ کے ملاحظہ فرمائیے۔ خط کے مکتوب الیہ کا نام اب پوری طرح ذہن میں نہیں۔ عجب نہیں جو قاسم حسن بدایونی مرحوم ہوں، جو یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے، اور علی برادران ہی کے محبت کے جرم میں سرکاری ملازمت سے علاحدہ کردیے گئے تھے، حیدرآباد چلے گئے تھے اور وہاں کسی عہدہ پر مامور تھے۔ سیٹھ صاحب مرحوم کا جواب بھی محفوظ رہ گیا۔ ضمیمہ میں وہ بھی ملاحظہ ہو۔

......☆☆☆......

ضمیمہ

(1)

دفتر صدر اودھ خلافت کمیٹی　　　　15 اپریل 28

دریاباد۔ بارہ بنکی

مخدوم و مکرم۔　　　　السلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ غالباً مجھ سے واقف ہی نہ ہوں گے لیکن آپ سے مجھے مولانا محمد علی نے ناواقف نہیں رکھا ہے۔ آپ کے ان کے جو گہرے مخلصانہ تعلقات ہیں، ان ہی نے اس نیاز نامہ کی تحریر کی مجھے جرأت دلائی ہے۔

مولانا کی مالی حالت جس قدر زبوں و ابتر ہو رہی ہے اس کا حال آپ کو شاید مجھ سے بھی زیادہ معلوم ہو۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس کا علاج کیا ہے؟ اگر حیدرآباد، بھوپال، یا کم از کم محمود آباد ہی سے کسی معقول وظیفہ کی توقع ہوتی تو پھر کوئی دقت ہی نہ تھی۔ لیکن مسلمان قوم کی قسمت ایسی کہاں۔ اب اگر کچھ کرنا ہے تو ہم ہی غریبوں اور تہی دستوں کو کرنا ہے اور اس میں بھی ہر شخص کو نہیں بلکہ پورا اعتماد اور کامل خلوص رکھنے والے معدودے چند ہی افراد کو شریک کرنا ہے۔

مالویہ جی کو سنا ہے کہ ان کی قوم 5 ہزار ماہوار پیش کر کے ہر طرف سے بے فکر کیے ہوئے ہے۔ اتنی بڑی رقم تو ہمارے لیے خواب وخیال ہے۔ ہم اگر 5، 6 سو ماہوار کا بھی انتظام کر لے جائیں تو بڑی بات ہے۔ تجویز یہ ہے کہ 600 سو ماہوار کا انتظام ہم چند نیاز مند آپس میں

کرلیں اور ایک سال کی رقم ڈاکٹر انصاری صاحب یا دہلی کے کسی اور معتبر شخص کے پاس جمع کرادیں۔

کراچی کے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب نے سو روپیہ ماہوار کا عطیہ منظور کرلیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود (بیرسٹر چھپرا) اور قطب میاں (فرنگی محل) اپنی اپنی حسب حیثیت پوری شرکت کریں گے۔ دونوں صاحب بخوشی وعدہ فرما چکے ہیں۔ میرٹھ کے نواب محمد اسماعیل خان صاحب کو آج ہی خط لکھ رہا ہوں۔ عبدالمجید خواجہ اور تصدق احمد خاں شیروانی 1 سے اسی ہفتہ انشاء اللہ الہ آباد میں مل کر زبانی کہنا ہے۔ میری ذاتی رائے تو صرف مولانا محمد علی صاحب کے لیے اس انتظام کی تھی لیکن ڈاکٹر محمود صاحب کا اصرار ہے کہ ''بڑے بھائی'' کو بھی ضرور شامل رکھا جائے اور اس لیے رقم دونی رکھنی پڑی۔ ضرورت واہمیت پر آپ کو کچھ لکھنا میرے لیے قطعی غیر ضروری ہے آپ بطور خود جو کچھ بھی شرکت فرما سکتے ہوں اس کے علاوہ حیدر آباد کے کسی اور صاحب کو بھی اگر شریک کر سکتے ہوں تو براہ کرم ضرور اس سے بھی مطلع فرمائیں آپ کے جواب کا انتظار ڈاک کی واپسی سے رہے گا خدا کرے یہ نیاز نامہ آپ کو ٹھیک پہنچ جائے اس لیے کہ آپ کے صحیح پتہ کا بھی مجھے علم نہیں۔

والسلام۔ عبدالماجد

(2)

جواب مکتوب از حاجی عبداللہ ہارون صاحب

میپر روڈ، کراچی .... بہ ملاحظہ اقدس مولانا عبدالماجد دریابادی

12 اپریل 28

محترمی۔ السلام علیکم

گرامی نامہ مؤرخہ 7 اپریل موصول ہو کر کاشفِ حالات ہوا۔

میں نے مبلغ ایک ہزار روپیہ جو مولانا محمد علی کی خدمت میں بھیجا تھا، افسوس ہے کہ انھوں نے اس کا اعلان اخبار میں بھی کر دیا۔ میں نے ہمدرد کا وہ پرچہ ابھی تک نہیں دیکھا ہے۔ آپ کے خط سے یہ معلوم ہوا۔ بہر حال مجھے اس قسم کا اعلان بہت ناپسند ہے۔ میرے جو تعلقات علی برادران

---

1 یہ دونوں صاحب اس وقت الہ آباد کے نامور بیرسٹر تھے۔

سے ہیں، وہ اس طرح کے نہیں کہ اخبارات میں اس حقیر رقم کا اعلان کیا جاتا۔

آپ نے جو تجویز پیش فرمائی ہے وہ بہت مناسب ہے۔علی برادران کے دوست واحباب کا حلقہ اس قدر وسیع ہے کہ ہر ایک کچھ تھوڑی سی رقم بھی ان کے ذاتی اخراجات کے لیے مستقل طور پر مقرر کرنے پر آمادہ ہو جائے تو ان کی نہایت آسانی سے ذاتی اخراجات کی طرف سے بے فکری رہ سکتی ہے۔

علی برادران نے جس ایثار اور قربانیوں کے ساتھ مسلمانوں اور اسلام کی خدمت کی ہے، وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں وہ اگر چہ اپنے مقاصد اور امیدوں میں کامیاب نہیں ہوئے تاہم ان کی حق گوئی اور اسلام پرستی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اور مستقبل میں ان کی مساعی کو ضرور سراہا جائے گا۔

میں دو سال تک مبلغ ایک سو روپیہ ماہوار دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ رہا خزانچی 1 ہونا تو بہتر ہو کہ آپ دہلی میں کسی کو مقرر فرمادیں۔ میں دور دراز جگہ پر رہتا ہوں اور اس کے علاوہ مجھ پر اس قسم کی اور بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔

ہمدرد کے متعلق میں نے دہلی میں مولانا سے باتیں کی تھیں۔ موجودہ فضا میں ہمدرد کا چلنا دشوار 2 ہے۔ ہندوؤں کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کو اس طرف سے بہت بدگمان کر دیا ہے۔ اور وہ موجودہ حالت میں ہمدرد کی پوری قدر و قیمت نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں مولانا تو ہمدرد کو بند کر دیں اور اپنے خیالات دوسرے اخبارات میں شائع کرتے رہیں، یا ہمدرد کو ہفتہ وار کر دیں۔ اور اس میں اپنے مضامین لکھا کریں۔ اس طرح سے ان کے خیالات کی اشاعت ہوتی رہے گی۔ اگر فضا بدلی اور حالات موافق نظر آئے تو اس کو پھر ترقی دی جا سکتی ہے۔

مولانا کی صحت پر ہمدرد کے خسارہ کی وجہ سے برا اثر پڑ رہا ہے اور ایک آدمی اتنے افکار برداشت نہیں کر سکتا۔

---

1 ابتدائی تجویز سیٹھ صاحب کے خزانچی بنائے جانے کی تھی۔

2 مولانا اب تک ہندوؤں کی طرف سے مایوس نہیں ہوئے تھے، اور ہمدرد برابر ہندو مسلم اتحاد کی پالیسی کی علم برداری کر رہا تھا۔ مسلمانوں کی عام پبلک اس مسلک سے اکتا چکی تھی۔

مولانا جیسے قومی کام کرنے والے آدمی کو جسے دن رات کانفرنسوں اور جلسوں سے فرصت نہ ملتی ہو، روزانہ اخبار کا بوجھ اپنے سر پر لینا ہی نہیں چاہیے تھا، اور نہ وہ تجارتی اصولوں پر اخبار کو چلا سکتے ہیں۔ اپنے خیالات کی اشاعت ضروری سمجھتے ہیں [1] تو ہفتہ وار اخبار سے یہ غرض پوری ہوسکتی ہے۔

مولانا کے ذاتی اخراجات کا اہتمام نہایت آسانی سے ہوسکتا ہے۔ آپ نے اس کام کو شروع کیا ہے، خدا اسے پورا کرے۔ والسلام

نیاز مند

حاجی عبداللہ ہارون

......☆☆☆......

1۔ یہ فقرہ انداز اور قرینہ سے لکھ دیا گیا، اصل خط کا کاغذ بہت بوسیدہ ہوگیا ہے، اور یہاں کے کئی لفظ اڑ گئے ہیں۔

باب:70

2:1928

(''الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا'')

ضمیمہ تو درمیان میں حائل ہوگیا تھا، اب اصل سرگزشت پھر ملاحظہ ہو، اور پہلے میرے عریضوں کا جواب مولانا کے قلم سے:

24اپریل1928 ہمدرد، کوچۂ چیلان، دہلی

برادرم محترم ومکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مدتوں سے آپ کے محبت نامے سینے کی جیب میں دل کے قریب ہی ڈالے ہوئے پھرتا ہوں تاکہ ذرا وقت ملے اور جواب تحریر کروں، مگر اب تک موقع نہ مل سکا۔ جس طرح رامپور گیا۔ جس طرح خلافِ توقع واپس آیا اور جس طرح دو والیانِ ریاست[1] کے درمیان کم از کم عارضی طور پر ناچاقی کا سبب بنا اس کی داستان طولانی ہے۔ اگر گھر میں طبیعت درست ہوگئی[2]، اور آپ ایک

---

[1] یعنی نواب صاحب رامپور اور مہاراجہ الور۔

[2] مکتوب الیہ کے گھر میں اس وقت ذرا زیادہ علیل تھیں اور لکھنؤ میں زیرِ علاج۔

ہی دو دن کے لیے آسکیں تو تشریف لائیں اور اس داستان کو سنیں اور "مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجاً وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ" کی تفسیر و تعبیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ جن باتوں کا جواب آپ مانگتے ہیں وہ بھی آپ کے تشریف لانے پر ہی دیا جاسکتا ہے۔ میں نے برادرم ظفر الملک صاحب سے عرض کر دیا تھا کہ میرے ذاتی مصارف اس سے زیادہ نہ ہوں گے جو جیل خانہ میں تھے۔ جس طرح وہاں گزر تا تھا یہاں بھی گزر کروں گا۔

اور میری بیوی بیچاری مجھ سے کم کھاتی ہے، اس لیے اس کے واسطے بھی یہی اسکیل کافی ہوگی لیکن میں اس اسکیل پر اسی وقت رہنا شروع کروں گا جب ہمدرد کو بند کر دوں گا۔ میری صحت میرے بال بچوں کی صحت بالکل خراب ہے۔ میں اب مالی تفکرات سے بالکل بچنا چاہتا ہوں۔ تا کہ کچھ عرصہ تک آرام کر سکوں۔ گوشہ نشینی کو حرام سمجھتا ہوں۔ مگر اب قدمے اور قلمے مدد کرنے کے لیے سامان فراہم نہیں۔ جس قدر ہو سکے گا سخنے ہی مدد کروں گا۔ درمے مدد کرنے کے قابل پہلے بھی نہ تھا جس قدر تھا کرتا تھا جس قدر اب بھی رہوں گا کروں گا۔ میں اس فکر میں ہوں کہ کیا کام کر کے ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار تین گھنٹے محنت کر کے معاوضہ کے طور پر کما سکوں۔ "ہمدرد" کی ایڈیٹری اب نہ کروں گا۔ میں مضمون لکھ کر ہی اگر روٹی کماتا یعنی اس کی تجارت کرتا تو انگریزی اخبارات کم نہیں ہیں مگر مجھے ایڈیٹری کرنا نہیں ہے۔ تبلیغ مد نظر تھی [1]۔ مگر لوگ بظاہر سننا نہیں چاہتے چند دنوں کے لیے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ جب انھیں تجربہ سے معلوم ہوگا کہ جس طرح ہمارے علی گڑھ چھوڑ دینے سے ان کو فائدہ نہیں پہنچا، اسی طرح ہمدرد کے بند ہو جانے سے بھی کوئی خاص فائدہ مرتب نہ ہوگا۔ تب وہ شاید پھر ہماری طرف متوجہ ہوں۔ میں ملت اسلامیہ کا بیحد مشکور ہوں۔ اب تک کامریڈ و ہمدرد پریس کے ڈینچرز کا روپیہ سوائے ایک دو کے کسی نے نہیں مانگا حالانکہ میں ان کے نزدیک ایک چوتھے درجے کے ڈپٹی کلکٹر کی تنخواہ کا بھی مستحق ہوں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ شوکت صاحب کی مالی حالت بھی وہی ہے لیکن ان کو ہمدرد کی طرح خلافت اپنے صرف سے شائع نہیں کرنا پڑتا۔ دوسرے ان کی بیوی نہیں۔ ایک لڑکی

---

[1] جنھوں نے محمد علی کی اس روح کو نہ جانا، انھوں نے محمد علی کو کچھ بھی نہ پہنچانا۔

کے پورے مصارف ادا کرنے پڑتے ہیں (گو شادی اس کی بھی ہوگئی ہے) اور ایک لڑکے کے 1۔ زاہد 2 خود تنخواہ پاتا ہے۔ دوسری لڑکی کی شادی عثمان 3 سے ہوگئی ہے۔ البتہ کچھ رقم ماہوار اسے بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ خود کھدر اسکیل پر رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کا بیمہ غالباً دس ہزار روپیہ کا ہوا تھا۔ وہ رقم غالباً ابھی ملی ہے۔ رام پور میں ان کی ایک بنگلیہ ہے جس کے باغ کی کوئی چار سو روپے سالانہ کی آمدنی ہو جاتی ہے، میرا کوئی گھر نہیں نہ کسی باغ کی آمدنی ہے۔ میری حالت اگر ہمدرد سے اب کچھ نہ ملے تو ان سے کسی قدر خراب تر ہے ورنہ یقیناً اس میں بھی وہ ''بڑے بھائی'' ہی تھے۔ میں قرض لے رہا تھا اور کھا رہا تھا۔ وہ اس ''فاقہ مستی'' سے بچے ہوئے تھے۔ آپ کے لڑکے کی ولادت سے جس قدر جی خوش ہوا تھا اسی قدر اس امانت کے چھن جانے سے صدمہ 4 ہوا اور آپ سے کہیں زیادہ بہن سے ہمدردی ہے 5۔ میری بیوی بچے سب اس غم میں شریک ہیں۔ بہن تک اس پیغام کو پہنچا دیجیے۔ میرے کوئی لڑکا نہیں ہوا مگر کوئی لڑکی بھی مری نہیں، الا ماشاء اللہ۔ صرف آمنہ نے داغ جدائی دیا 6۔ البتہ زہرا 7 کا دوسرا لڑکا جو نہایت ہی خوش اور ہنس مکھ تھا، 7 ماہ کی عمر میں رخصت ہو گیا 8۔ اس کا اسی طرح صدمہ ہوا جس طرح خود اپنے لڑکے کے اس عمر میں گزر جانے کا ہوتا ہے۔ پھر بھی سمجھتا ہوں کہ خداوند کریم نے مجھ پر بہت رحم فرمایا۔

حمیدہ 9 کا نکاح شروع جنوری میں ہو رہا تھا، مگر کچھ تو حکیم صاحب 10 رحمہ اللہ کی وفات

---

1 عابد علی خان مولانا شوکت علی کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ۔ انجینئرنگ کی تعلیم پائی اب شاید کسی کارخانہ میں ہیں

2 زاہد علی خان مولانا شوکت علی کے بڑے صاحبزادہ اور مولانا محمد علی کے داماد۔ بمبئی میں روزنامہ خلافت اور خلافت پریس کو اب تک وہی چلا رہے ہیں۔ (1952)۔ 3 علی برادران کے بھانجے عثمان علی خاں۔

4 شروع رمضان 1346ھ (اپریل 28) میں اس بچہ کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی تھی، اور آخر رمضان میں وہیں جاتا رہا تھا۔

5 یعنی بچہ کی ماں، سولانا بجائے بھابھی کے ان سے بہن ہی کا رشتہ لیتے ہیں۔ لڑکا مسلسل کئی لڑکیوں کے بعد ہوا تھا اس لیے اس کے مرنے کا صدمہ بھی ماں کو بہت زائد ہوا تھا۔

6 1924 کے حالات میں یہ ذکر آچکا ہے۔ 7 مولانا صاحب کی سب سے بڑی صاحبزادی۔

8 عارف نام، اس کا ذکر بھی کئی باب قبل گزر چکا ہے۔ 9 حمیدہ بی، مولانا کی تیسری صاحبزادی۔

10 یعنی حکیم اجمل خاں مرحوم (متوفی دسمبر 1927)

حسرت آیات کچھ ماجد [1] کی پریشانیوں نے دیر لگائی۔ اب دو تین دن میں ہو ہی رہا تھا کہ ایسے شخص کی طرف سے ایما ہوا کہ نومبر میں کرو۔ میں خود شریک ہونا چاہتا ہوں۔ بار بار کہا کہ اس کی ماں سخت پریشان ہوگی اور حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ سامان کیا ہے خود اس کی ماں نے اپنی 20 روپے ماہوار کی آمدنی میں سے کیا ہے جو 21 برس سے جمع ہو رہی تھی۔ اب تک صرف حج میں کام آئی تھی یا اب کام آئی ہے اور وہ ڈرتی ہیں کہ کہیں خانگی مصارف میں ان کی یہ قلیل پونجی بھی نہ اٹھ جائیں لیکن برابر اصرار ہے۔ شوکت صاحب کے آنے پر اس کا فیصلہ ہوگا اور اس سے ایک اہم تر فیصلہ بھی جس کے لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی تشریف لائیں [1]۔ عجب کشش و پیچ میں گرفتار ہوں۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔

دعا گو اور آپ سے کہیں زیادہ محتاج دعا

محمد علی

قطب میاں صاحب اور ظفر الملک صاحب کو بھی خط سنا دیجیے گا قطب میاں کے عنایت نامے کا جواب جلد دوں گا۔

......☆☆☆......

---

[1] یعنی ماجد علی خاں رام پوری مولانا کے ہونے والے داماد۔

[2] مولانا ذیابیطس میں سخت علیل تھے۔ اتفاق کی بات کہ مہاراجہ الور دہلی میں ایک ایٹ ہوم میں مولانا سے مل کر ان پر خاص طور پر مہربان ہو گئے تھے۔ اور اپنے علاج کے لیے مولانا کو یورپ بھیجنے پر اصرار کر رہے تھے۔ مولانا اس امداد کو قبول کرنے میں بہت پس و پیش کر رہے تھے۔ آخر میں فیصلہ ڈاکٹر انصاری اور مولانا شوکت علی کے مشورہ پر اٹھ رہا تھا۔

باب:71

3:1928

(''رزق تو برتو، زتو عاشق تر است''۔صاحبزادی کی شادی)

مہاراجہ الوراس وقت ایک عجیب وغریب انسان تھے، بڑے قابل، فاضل، اپنے ہندو علوم کے علاوہ اردو، فارسی میں بھی برق، اور انگریزی میں بڑے خوش تقریر۔ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن سے بڑی دلچسپی اور محبت رکھنے والے۔ ساتھ ہی ان کے ذاتی چال چلن سے متعلق بھی حیرت انگیز روایتیں مشہور تھیں۔ خیر ان قصوں کی صحت وعدم صحت سے پبلک کو کیا غرض، اور اس ڈائری کو تو کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں۔ دسمبر 25 میں علی گڑھ کالج کی جوبلی کے موقع پر آئے تو بڑی گراں قدر رقم خاص عربی تعلیم کے لیے دے گئے۔ مارچ 28 کا ذکر ہے کہ دہلی میں کوئی بڑا ایٹ ہوم تھا، جس میں اتفاق سے مہاراجہ کی نظر مولانا پر پڑگئی۔ ملتے ہی مہربان ہوگئے اور بڑے اصرار سے اپنے ہاں بلایا۔ اتفاق دیکھیے کہ ان سے اورنواب صاحب رامپور سے بھائی چارہ اور بقول شخصے دانت کاٹی روٹی تھی۔ مہاراجہ نے یہ جو سنا کہ مولانا کو رامپور جانے اور رہنے کی اجازت نہیں تو سر گئے کہ ''میرے ساتھ چلیے، دیکھوں آپ کو کون رامپور جانے اور رہنے نہیں دیتا ہے نواب سے تو میں بات کہتے وہ حکم منسوخ کرادوں گا، میرے لنگوٹیے یار ہیں'' مہاراجہ نے کچھ ایسی زبردستی کی کہ مولانا کو ان کے ساتھ جاتے ہی بن پڑی۔ وہاں پہنچ، مہاراجہ نے اپنی طرف

سے اپنا وعدہ پورا کیا۔ نواب سے بہت کچھ کہہ سن ڈالا۔ لیکن تقدیر کا نوشتہ کون مٹا سکتا ہے۔ کچھ ایسے الجھاوے پڑ گئے کہ نواب نے ان کی بات بالکل رد کر دی، اور دونوں رئیسوں کے درمیان خود ہی رنجش و ملال کی نوبت آ گئی۔ مہاراجہ واپس ہوئے تو اس کد میں اب انھیں مولانا کے ساتھ اور خصوصیت بڑھ گئی۔ مولانا کو انھوں نے بہ اصرار الور بلایا اور وہاں ان سے بڑی پر لطف ملاقاتیں رہیں۔ مہاراجہ اپنا تخلص وحشی کرتے تھے۔ ایک کتاب مولانا کی نذر کی اور اس پر اپنے قلم سے یہ دلچسپ فقرہ لکھا۔ To my Moulana from his wahshi. (وحشی کا نذرانہ اپنے مولانا کی خدمت میں)۔ یہ حضرت بھی جواب میں کب چوکنے والے تھے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اور کچھ تو نکلا نہیں، جامعہ ملیہ کی انگریزی اسکیم اپنی ہی مرتب کی ہوئی موجود تھی، چٹ اسی کو نکال کر پیش کر دیا، اس چٹ پٹے فقرہ کے ساتھ:

From a bogus Moulana to a real Maharaja.

(ایک بنے ہوئے مولانا کا نذرانہ، ایک اصلی مہاراجہ کی خدمت میں)

....

مولانا کی صحت خراب مدت سے چلی آ رہی تھی، اب خراب تر ہو گئی تھی۔ اصل مرض ذیابیطس کا تھا۔ شکر پیشاب سے بکثرت خارج ہو رہی تھی اور اب البومن وغیرہ بھی خارج ہونے لگے تھے۔ راتوں کی نیند گویا اڑ گئی تھی۔ ہر وقت تلووں کی سوزش بیتاب رکھتی تھی۔ پرہیز کے معاملہ میں مولانا طبعاً ہی کچھ محتاط واقع نہ ہوئے تھے، پھر کثرت کار اور ہجوم افکار، جو ذیابیطس میں توز ہر ہی ہیں۔ 28 میں اصل عمر 50 سے زائد نہ تھی لیکن چہرہ و بشرہ سے 10، 12 سال زائد کے معلوم ہونے لگے تھے۔ حالت خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ مہاراجہ الور کی نظر اس پہلو پر خاص طور پر گئی۔ وہ خود بھی ڈاکٹری کے بعض شعبوں سے واقف تھے اور ذیابیطس کے مریضوں کا علاج تدریج اور مسلسل فاقوں کے ذریعہ سے کرنے کا فن یورپ سے سیکھ آئے تھے۔ وہ اب مولانا کے سر ہوئے'' کہ جس طرح بھی ممکن ہو یہاں کے کام کاج چھوڑ یورپ روانہ ہو جائیے۔ میں اپنے استادوں کے نام تعارف نامے لکھ دوں گا، وہ اور زیادہ توجہ سے آپ کا علاج کریں گے۔ آپ کی زندگی ملک کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کی حفاظت میں مدد دینا آپ کی ذات کی امداد کرنا نہیں،

عین ملک کی خدمت میں حصہ لینا ہے۔ آمد و رفت، قیام، علاج کے سارے مصارف میرے ذمہ۔ آپ وعدہ کیجیے کہ جلد سے جلد آپ روانہ ہو جائیں گے''......مولانا کے لیے وعدہ کر لینا آسان نہ تھا۔ کشمکش میں پڑ گئے۔ ایک طرف مہاراجہ کا اخلاص بالکل صریح اور نمایاں تھا اور علاج کی واقعی شدید اور فوری ضرورت۔ لیکن دوسری طرف ایک رئیس و والیِ ملک سے ہزارہا کی امداد قبول کرنے کا طبیعت پر بار۔ آخر میں یہ وعدہ کیا کہ شوکت صاحب اور ڈاکٹر انصاری سے مشورہ کرلوں، جب کوئی قطعی جواب دے سکوں گا۔ اس پر بڑی مشکل سے چند روز کی مہلت ملی۔ مولانا دہلی آئے، دونوں صاحبوں سے مشورہ کیا اور دونوں نے اپنی منظوری دے دی۔ یہ سارے واقعات وسط اپریل میں پیش آئے۔

ادھر مولانا کی تیسری صاحبزادی حمیدہ بانو کے عقد کا وقت بھی ٹلتا چلا جا رہا تھا۔ داماد ی کے لیے رام پور ہی کے ایک عزیز ماجد علی خاں طے ہو گئے تھے جو الیکٹرک انجینئرنگ کے کام سے واقف تھے، اور اپنا بجلی کا کاروبار شاید رام پور اور کلکتہ میں رکھتے تھے۔ مولانا کے سفر یورپ پر روانہ ہونے سے قبل عقد سے فراغت ہو جانا ضروری تھی۔

ہمدرد کا مسئلہ بجائے خود اہم و مقدم تھا۔ مولانا تو اسے بند کر دینے کی ٹھان چکے تھے اور ارادہ یہی تھا کہ جانے سے قبل اس کا کاروبار بالکل سمیٹ لیں اس نیازمند کو یہ کسی طرح گوارا نہ ہوا۔ اپنے رفیق قدیم مولوی ظفر الملک علوی (مہتمم سچ) سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''ہمدرد کی مالی و انتظامی نگرانی کے لیے تیار ہوں۔ ہر مہینہ دو ایک بار دہلی جا کر دیکھ بھال کر لیا کروں گا، خرچ میں اچھی خاصی کفایت کی گنجائش ہے اور معقول انتظام کے بعد پرچہ پر خسارہ آنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایڈیٹوریل کی ذمہ داری تم لے لو اور انتظامی صیغہ میرے اوپر چھوڑ دو''۔ بڑی تقویت ان کی اس گفتگو سے حاصل ہوگئی، اور دل میں ٹھن گئی کہ جو کچھ بھی ہو، انشاء اللہ ہمدرد کو بند نہیں ہونے دیا جائے گا۔ خط کے ذریعہ سے اجمالاً تو مولانا کو یہ اطلاعیں دے ہی دی تھیں لیکن اصل ضرورت زبانی گفتگو کی تھی، اور پھر صاحبزادی کے عقد میں شرکت کے لیے تو دہلی یوں بھی جانا تھا۔

....

اپریل کی 30 یا مئی کی پہلی تھی ذیل کا مکرمت نامہ صادر ہوا:

29 اپریل 28، دہلی

برادر محترم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

حمیدہ کی شادی 6 مئی کو رکھی گئی ہے مگر ابھی آخری اور قطعی طور پر تاریخ اس وقت مقرر ہوگی جب معظم صاحب 1 کے پاس سے آج کے ارجنٹ تار کا جواب آ جائے گا کہ انھیں اس تاریخ کے لیے رخصت مل جائے گی۔

ظفر الملک صاحب کا محبت نامہ شوکت صاحب کے واسطہ سے جو میری اہلیہ کے نام آیا تھا ابھی دیکھنے میں آیا۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے ہمدرد بند کر دینے کے سوا چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ بہر حال میں چند ماہ کے لیے تمام کام بند کر کے اپنا علاج کرانے انگلستان جاؤں گا۔ غیب سے مدد مل گئی ہے اور مشورہ کرنے کے بعد امداد قبول کر لی گئی ہے۔ سوائے علاج کے اور کوئی غرض اس سفر کی نہیں ہے۔ اور فاقہ کرا کے علاج کیا جائے گا۔ کوئی اور کام کروں گا بھی نہیں۔

براہ کرم مشورہ کے لیے فوراً تشریف لے آیئے اور حمیدہ کے نکاح میں بھی شریک ہو جایئے۔ سوائے قطب میاں صاحب اور احباب فرنگی محل کے اور آپ کے اور ظفر الملک صاحب کے کسی کو نہیں بلا رہا ہوں۔

بہن کی طبیعت کیسی ہے 2۔ میری بہن اور بچیاں سب صحت کامل کے لیے دعا گو ہیں اور خیریت معلوم ہونے کے لیے سخت منتظر ہیں۔ براہ کرم فوراً چلے آیئے۔ تاکہ آخری فیصلہ دو تین دن میں کر دیا جائے اور اخبار کو بند کر دیا جائے۔

میں انشاء اللہ آخری مئی میں ہندوستان سے روانہ ہو جاؤں گا۔ کیا لکھوں دل کی کیا

---

1 معظم علی خاں مرحوم (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ لڑکی کے حقیقی ماموں۔ اس وقت ریاست اندور میں ہائی کورٹ کے جج، چیف جج تھے۔

2 میری بیوی مراد ہیں۔ تازہ زچگی کے بعد زیادہ علیل ہوگئی تھیں۔ محمد علی فرط اخلاص سے ان سے بہن ہی کا رشتہ لیتے تھے۔

کیفیت ہے۔

آپ کا بھائی
محمد علی

جانے پر تیار تھا ہی کہ 2 مئی (چہارشنبہ) کو تار بھی اس مضمون کا پہنچا کہ "دہلی جمعہ کی صبح (4 مئی) تک ضرور پہنچ جائیے۔ اخبار کی بابت آخری فیصلہ بہت ضروری ہے"۔

....

اب کی ظفر الملک صاحب کے ساتھ جم کر دو چار دن رہنا ہوا۔ محمد علی کے ہاں کی ذاتی تقریب میں پہلی بار شرکت کا اتفاق ہوا۔ محمد علی، میاں بیوی دونوں بڑے دل والے بڑے حوصلہ والے تھے، خوب جی کھول کر خرچ کرنا، پورے ارمان اور حوصلہ نکالنا چاہتے تھے اور کھانا کھلانے کے تو بادشاہ تھے۔ لیکن حالات اس کی اجازت کہاں دے رہے تھے۔ بہر حال تقریب ایک بڑی حد تک سادہ ہی انجام پائی گو سادگی کی ابھی اور گنجائش اچھی خاصی باقی تھی۔ باہر کے مہمانوں میں کچھ زیادہ لوگ نہ تھے۔ فرنگی محلی پارٹی (فرنگی محل محمد علی کے شیخ و مرشد ہی کا گھر نہ تھا، اس سارے گھرانے سے ان کے بالکل عزیزانہ تعلقات بھی قائم تھے) کے علاوہ محمد علی کے خاص خاص عزیز تھے، اور باہر کے دوستوں میں شاید صرف نواب محمد اسماعیل خاں جو اس وقت تو صرف میرٹھ کے رئیس اور بیرسٹر تھے (مسلم لیگی لیڈر اور علی گڑھ کے وائس چانسلر وغیرہ بعد کو ہوئے) اور محمد علی کے بہت قدیم اور بے تکلف ملنے والوں میں تھے۔ رئیسانہ زندگی کے عادی تھے۔ محمد علی کے ہاں انھیں رہنے اور سہنے کی تکلیف ہوئی لیکن ہنسی خوشی برداشت کرتے رہے۔

مولانا کے سب سے بڑے بھائی (مولانا شوکت علی سے بھی بڑے) ذوالفقار علی خاں صاحب بی اے گوہر قادیانی (احمدی) ہو گئے تھے۔ اور قادیان ہی میں خلیفۂ قادیان کے ہاں کسی اونچی خدمت پر تھے۔ ان سے بھی ملاقات اب کی ہوئی۔ محمد علی کے عاشقوں میں تھے۔ شوکت صاحب سے ذرا ان بن رہتی تھی، باتوں باتوں میں جھڑپ ہو جاتی تھی۔ بعض قادیانیوں کے مجھے بہت تلخ تجربے ہوئے ہیں، بات بات پر کج بحثی پر آمادہ اور اشتعال انگیز بحثیں چھیڑ چھیڑ کر نکالنے والے۔ یہ ذوالفقار علی خاں صاحب اس کے بالکل برعکس نکلے اور (ایک دوسرے قادیانی

اکبر یار جنگ حیدر آبادی ہی کی طرح) خوش مزاج، بذلہ سنج، منکسر و متواضع اور بڑے پختہ دیندار، غیرت اسلام کے پتلے......مولانا مودودی جو اس وقت تک صرف مولوی ابوالاعلیٰ تھے اور الجمعیۃ کے ایڈیٹر، ان سے بھی پہلی علیک سلیک اسی موقع پر ہوئی۔ وضع قطع انگریزی خوانوں سے ملتی ہوئی۔ چہرہ صفا چٹ لیکن اسلامی عنوانات پر اس وقت بھی خوب لکھتے تھے اور دین کی حمایت ونصرت پر ہر وقت قلم آمادہ۔

دعوتیں اور کھانے بہت اعلیٰ پیانہ پر تو نہیں لیکن کچھ ایسے ہلکے پھلکے بھی نہ تھے۔ مہر یاد نہیں کہ کے ہزار کا بندھا۔ نکاح غالباً قطب میاں صاحب نے پڑھایا یا شاید مفتی کفایت اللہ صاحب نے یہ خوب یاد نہیں۔ ایک دن بغیر اجازت واطلاع جامعہ ملیہ ظفر الملک صاحب کے ساتھ چلا گیا، اور وہاں اتنی دیر ہوگئی کہ کھانا بھی وہیں کھالینا پڑا۔ یہاں جب دستر خوان بچھنے کا وقت آیا تو مولانا کو سخت فکر پیدا ہوئی، اور انتظار میں بڑی دیر تک کھانا ملتوی رہا۔ بیشک یہ ہم لوگوں کی بالکل بیجا حرکت تھی، مولانا کو بلاوجہ فکر وتشویش میں ڈالنے کا خیال آج تک جب آجاتا ہے دل ندامت سے لبریز ہو جاتا ہے......میزبانی کر کر کے، دوسروں کو کھلا پلا کر، اتنا خوش ہونے والا میزبان کمتر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

......☆☆☆......

باب:72

4:1928

(بیمار کا سفرِ یورپ)

مولانا کے معاشی مسئلہ کے حل کی جو اسکیم ہم نیاز مندوں نے مل کر بنائی تھی، اس پر تفصیل سے گفتگو کا اب موقع ملا۔ اس درمیان میں نواب محمد اسماعیل خاں نے خط کے ذریعہ سے ٹوکا بھی تھا کہ ''آپ لوگ یہ خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔ پہلے خود مولانا کی رضامندی تو حاصل کیجیے۔ مجھے ہرگز یقین نہیں کہ ان کی خودداری اس صورت کو گوارا کرے گی''۔ اس پر دل نے الٹے نواب صاحب کی رائے کی تضحیک کی تھی اور کہا تھا کہ ''یہ نواب صاحب بھی خوب چیز ہیں۔ اختیار اور پسند کا اب سوال ہی کب ہے۔ اب صورت اضطرار کی سی پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا اسے بھی نہ گوارا کریں گے تو آخر کریں گے کیا۔ دوسری صورت کوئی ہے بھی تو نہیں۔ اور یہاں تو مخلصوں اور نیاز مندوں کی طرف سے یہ طیب خاطر نذرانہ پیش ہو رہا ہے اس میں تامل و تردد کی بات ہی کیا ہو سکتی ہے''۔...... بہرحال مولانا سے اب اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی اور پہلے ہی منٹ پر نظر آ گیا کہ رائے نواب صاحب ہی کی ٹھیک تھی۔ اور ہم تینوں نیاز مندوں بلکہ مولانا شوکت علی تک کے اندازے تمام تر غلط! بولے، اور ہمت، صبر، استقلال کی پوری قوت کے ساتھ بولے کہ:

''ہرگز نہیں۔ ایسا کوئی بھی انتظام نہیں قبول کر سکتا ہوں، جب تک اپنی قوت بازو سے کما سکتا

ہوں، کماؤں گا۔ قوم میری خدمات اگر نہیں چاہتی تو ہٹا جاتا ہوں۔ پبلک زندگی سے ریٹائر ہوکر بس کوئی ٹیوشن کر کے کسی رئیس زادہ کو دو تین گھنٹہ پڑھا کر ڈیڑھ سو ماہوار میں اپنی گزر بسر کرلوں گا۔ مضمون فروشی کر کے روٹی کمانا دوسروں کو مبارک رہے۔ میں ان کی تقلید نہیں کرسکتا۔ اخبار نویسی میرا پیشہ نہیں، میں تو اسے صرف ذریعہ تبلیغ سمجھ کر کرتا رہا۔ آپ لوگ قطعی اور ہرگز اس قسم کے انتظام کے پھیر میں نہ پڑیں''۔

اللہ اللہ! قرضداری اور زیرباری کے اس ہجوم میں بھی یہ ظرف اور یہ ضبط، بس محمد علی ہی کا کام تھا! ہم لوگ تو اس کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر محمود کے تعلقات ہندو لیڈروں سے بھی بڑے گہرے تھے۔ انھوں نے ایک بڑے نامور اور مقبول ہندو لیڈر کے لیے تفصیل سے بتایا تھا کہ انھیں فلاں ہندو ریاست سے اتنا ملتا ہے اور فلاں سے اتنا۔ اور نہ وہ خود اور نہ ان کی قوم اسے ذرا بھی خودداری کے منافی سمجھتی ہے۔ اور تو اور خود مولانا شوکت علی تک اس اسکیم کو اپنے اور محمد علی دونوں کے لیے منظور کر چکے تھے!......شوکت علی بھی اپنی جگہ ایک بڑے آدمی تھے لیکن محمد علی کے ظرف کو کہاں پہنچتے تھے، محمد علی تو چیز ہی کچھ اور تھے۔ ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

....

بڑی ردوقدح ہمدرد کے جاری رکھنے اور بند کرنے پر رہی۔ مولانا بند کر دینے پر بالکل تلے ہوئے تھے اور دلائل کا وزن ان ہی کے ساتھ تھا۔ ادھر سے یہ نیاز مند اور مولوی ظفر الملک جاری رکھنے پر اڑے ہوئے تھے، اور اس پارٹی کی کمک پر شوکت علی صاحب مع اپنے بھاری بھرکم تن وتوش کے تھے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ مولانا خود تو اس کی ادارت سے ہٹ جائیں اور انتظامی ومالی ذمہ داریوں سے بھی سبکدوش ہوجائیں لیکن روزنامہ بدستور جاری رہے۔ ایڈیٹوریل پالیسی کی نگرانی اس خاکسار کے سپرد، اور انتظامی پہلو مولوی ظفر الملک کے ذمہ۔ اور اس جدید اسکیم کا نفاذ 20 مئی سے ہوجائے تاکہ مولانا اپنی روانگی سے دو چار روز قبل پرچہ کا نیا رنگ ڈھنگ بھی دیکھ لیں۔ ان کا جہاز بمبئی سے 2 جون کو چھوٹنے والا تھا اور وہ ایک ہفتہ قبل دہلی سے براہ اجمیر روانہ ہو جانے کو تھے......20 مئی کے آنے میں دیر کیا لگتی۔ اس پرچہ میں جو ''الوداع'' مولانا نے اپنے

نام اور اپنے قلم سے لکھی، بڑی پر اثر تھی، ابتدائی حصہ درج ذیل ہے:

''حقیقتاً ایک اخبار اسی وقت چل سکتا ہے جبکہ عوام کو اس کی ضرورت محسوس ہو اور وہ کافی تعداد میں اسے خریدیں۔ آج عوام کو ہمدرد کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی اس لیے اسے بند کرتا ہوں اور ایک بار پھر غالب کے اس شعر کو دہراتا ہوں ؎

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

عوام کی آج پھر یقیناً وہی حالت ہے کہ

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس لیے بہتر ہے کہ انھیں دو ایک سال کے لیے ان کے حال پر چھوڑا جائے اور خداوند کریم سے دعا کی جائے کہ وہ انھیں راہبری کی پہچان عطا فرمائے، اور پیشتر اس کے کہ ہر ایک تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور تک بھاگتے بھاگتے وہ بالکل خستہ اور چور ہو جائیں انھیں منزل مقصود کا پتہ لگ جائے، اور اس کی طرف بڑھنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ میں پہلے ہی ''درمے'' ان کی کیا مدد کر سکتا تھا۔ اپنی استطاعت کے مطابق کچھ چندہ کسی فنڈ میں دے دیا اور بس ''قلمے'' اور ''قدمے'' البتہ میں نے مجنونوں کی طرح ان کی امداد کی اور قرض میں بری طرح گرفتار ہو گیا۔ اور صحت کو بھی خیر باد کہہ چکا۔ ذیابیطس کے مرض کے باعث پہلے شکر ہی آیا کرتی تھی مگر امسال چربی (البیومن) بھی آ رہی ہے اور ایسٹیون (زہر) بھی آ رہا ہے اور اعصابی سوزش نے رات کی نیند اور دن کا آرام حرام کر دیا ہے۔ اب ہمدرد کو بھی بند کرتا ہوں اور باہر کی طلب پر کہیں جا بھی نہ سکوں گا۔ قلمے اور قدمے جو ملک وقوم کی خدمت کرتا تھا، مجبور ہوں کہ اسے بند کر دوں۔ البتہ سخنے جو کچھ ہو سکے گا کروں گا۔ اپنی اور اپنے متعلقین کی معاش کے لیے ہر روز دو تین گھنٹہ یا ہر ہفتہ دو تین روز کسی کی خدمت کر کے جو کچھ بطور اکل حلال کے مل سکے گا، اس کے کمانے کی کوشش کروں گا۔ اور باقی وقت میں خود پڑھوں گا اور اپنی بچیوں کو بھی کچھ پڑھاؤں گا۔ اور مسجد جامع میں یا کسی تفریح کی جگہ پر اس بھائی کی خدمت کے لیے حاضر رہوں گا جو مفاد عام کے کسی کام کے متعلق میری رائے دریافت کرتا

پسند فرمائیں گے۔ کانگریس میں، خلافت میں، جمعیت علماء وغیرہ میں اس طرح برابر شریک ہونے کی کوشش کروں گا جس طرح ایک مفلس و نادار ہندستانی اور مسلمان شریک ہوسکتا ہے۔ یہ گوشہ نشینی نہیں ہے بلکہ مکہ سے ہجرت ہے۔ خدا کرے جلد فتح مکہ نصیب ہو۔ جو بھائی مجھے اور میرے اہل دعیال کا اکل حلال کی کوئی صورت بتاسکیں ان کا نہایت ممنون ہوگا۔ لیکن اپنی ذاتی ضروریات کے لیے کسی سے کوئی مدد نہیں قبول کرسکتا۔ سال گزشتہ بھی جب اس قسم کی مدد کے لیے چند بھائیوں نے آمادگی ظاہر فرمائی تھی، میں نے دل سے، ان کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے اس سے مستفید ہونے پر بہ مجبوری انکار کردیا تھا اور اسی پر آج بھی قائم ہوں"۔

اللہ اللہ! یہ مسلمانانِ ہند کا لیڈر اور وقت کا سب بڑا لیڈر، یوں پبلک زندگی سے ہٹنے پر مجبور ہورہا ہے! آئندہ نسلیں یقیناً اس واقعہ پر حیرت کریں گی اور اس کے اسباب ان کی سمجھ میں اسی طرح نہ آئیں گے، جس طرح آج ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تیرہ سو سال قبل سیدنا حسینؓ کو باایں عظمت وجلالت قدر میدان کربلا میں تنہا اور بے یار ومددگار کیسے چھوڑ دیا گیا تھا! ذمہ داری سے خود مولانا کی ذات بھی بری نہیں کہی جاسکتی لیکن بڑا دخل اس ملت کے بے حسی اور بد ذوقی ہی کو تھا اور تفصیلی بحث کی اس "ڈائری" کے ہلکے پھلکے نقوش وتاثرات میں گنجائش نہیں۔

....

مئی کی 21 ہے اور 10، 12 دن کے لیے وطن جاکر میں پھر دہلی آ گیا ہوں۔ اور آج کا ہمدرد میری نگرانی میں نکلا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایک روزنامہ بالکل اپنے چارج میں پا رہا ہوں۔ محض ایڈیٹری اور شے ہے اور مولانا کی جانشینی کرنا کچھ اور۔ سوال محض سلیقہ تحریر وحسن وانشاء کا نہ تھا بلکہ اس سے بڑھ کر صحیح بصیرت اور صحیح ملی رہنمائی کا تھا۔ اور مولانا کے یہی وہ جوہر تھے۔ جن میں اس خاکسار کو ان سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اس لیے طبعی طور پر جہاں فخر ومسرت محسوس ہورہی ہے وہاں دل دھڑکتا بھی جاتا ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ مولانا ابھی یہیں موجود ہیں، آج کا پرچہ میرے سامنے ان کی نظر سے گزرے گا۔ دیکھئے اس میں کیا کیا خامیاں نکلتی ہیں اور کیسی کیسی ڈانٹ سننا پڑتی ہے۔

رات کا وقت ہے اور مولانا مردانہ مکان کے صحن میں مسہری پر آرام کے لیے آ گئے ہیں۔

غضب یہ ہے کہ ہاتھ میں تازہ ہمدرد لیے ہوئے ہیں (ہمدرد صبح کو نہیں شام کو نکلتا تھا) اب یہ بستر پر لیٹ کر میرے سامنے ہی پرچہ پڑھیں گے۔ اسی وقت ان کا ہمدرد پڑھنے کا معمول تھا۔ میرا پلنگ بھی قریب ہی ہے۔ کاش اس وقت میں موجود نہ ہوتا! فوری خفگی سے تو بچ جاتا۔ مولانا نے میرا ایڈیٹوریل ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ عنوان ہے "شیر کی گرج"۔ اور یہ ڈیلی میل (لندن) کے ایک افتتاحیہ کے جواب میں لکھا گیا ہے (شیر سے مراد شیر برطانیہ تھی) خدا خیر کرے۔ چپکے چپکے دعائیں مانگتا جاتا ہوں...... خیر اللہ نے خیریت رکھی اور میں ڈانٹ پھٹکار سے بچ گیا۔

زندگی میں سب سے زیادہ عقیدت اور عقلی محبت ان دو آدمیوں سے ہوئی۔ ایک حضرت علامہ تھانویؒ اور دوسرے مولانا محمد علی۔ اور یہ بات گویا عجب معلوم ہو لیکن ہے واقعہ کہ ڈر بھی سب سے زیادہ ان ہی دونوں کا غالب رہا۔ سچ یا صدق کبھی ان صاحبوں کے نام (اور محمد علی کے تو بار بار کے تقاضے کے باوجود) جاری نہیں کیا۔ اور نہ کبھی اپنی کوئی اور تحریر ان صاحبوں کی خدمت میں از خود پیش کرنے کی جرأت کرتا تھا۔ وہ خود سے پڑھ لیں، یا کوئی خاص ضرورت ہی ان کے سامنے پیش کر دینے کی ہوئی تو اور بات ہے ورنہ خود سے ان کے سامنے لانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی محبت کی دنیا کے بھی عجیب کاروبار ہیں!

لرز رہا ہوں میں جس سے اسی پہ ناز بھی ہے

یہ 5، 6 دن کی مدت کہنا چاہیے کہ مولانا کی ہمہ وقتی رفاقت میں گزری۔ وہ جہاں جہاں بھی گئے "تابع مہمل" کی حیثیت سے ساتھ ساتھ رہا۔ بحری سیاحت کی مشہور عالم کمپنی "ٹامس کک" کا دہلی والا آفس پہلی بار دیکھا اور وہاں جا کر آنکھیں کھل گئیں۔ چیف کمشنر وغیرہ کے دفتر میں بھی پاسپورٹ کے سلسلہ میں دو ایک بار جانا ہوا، اور نماز جمعہ کے لیے تو جامع مسجد کی حاضری مولانا کے مستقل پروگرام میں داخل تھی۔

مہمان بھرے ہوئے ہیں، سب کو جامع مسجد تک لے جانے کے لیے کئی کئی تانگے آ رہے ہیں۔ پھر وہاں پہنچ کر مولانا کا ایک ایک مسلمان سے ملنا سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے محتاجوں اور گداگروں کو ریزگاری اور پیسوں سے نوازنا، یہ سب ان کے معمولات کا جزو تھا۔

25 مئی کا دن گزار کر شب کو ٹرین سے مولانا بمبئی روانہ ہوئے۔ سیدھے نہیں بلکہ

بی بی سی آئی ریلوے سے اجمیر، آبو، احمد آباد ہوتے ہوئے۔ حضرات صوفیہ سے عموماً اور خواجہ اجمیری سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ البتہ اس عقیدت کو درگاہوں کی مروجہ بدعات اور خرافات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ رشک کے ساتھ خواجہ اجمیری کے جذبہ تبلیغ اسلام کا ذکر کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان مزارات پر جا کر مراقبہ ان بزرگوں کی خدمات دینی اور جوش ایمانی ہی کا کرتا رہتا ہوں۔ اسٹیشن میں حسب معمول ساتھ آیا۔ درجہ میں ساتھ پٹنہ کے نواب نصیر حسن خان خیال کا ہو گیا۔

بمبئی سے جہاز پر سوار ہوتے وقت 2 جون کو حسب ذیل تار روانہ کیا:

اللہ آپ کو اور ظفر الملک کو اپنے فضل میں رکھے۔ یہ دعا جہاز پر سوار ہوتے وقت کر رہا ہوں''

اور پھر 6 جون کو جہاز (مقدونیہ نامے) سے ذیل کا مفصل مکتوب روانہ فرمایا خط لکھتے کم تھے، مگر جب لکھنے کا موقع پاتے، تو بس لکھتے ہی چلے جاتے۔

......☆☆☆......

باب:73

5:1928

(مکتوب مسافر یورپ)

6 جون 28 جہاز "مقدونیہ"

پیارے ماجد میاں و ظفر الملک صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

25 مئی کو آپ لوگوں سے رخصت ہو کر 26 مئی کی صبح کو اجمیر شریف پہنچا۔ تاکہ جسمانی علاج سے پیشتر کچھ روحانی علاج بھی کر سکوں۔ نہ معلوم ظفر الملک صاحب کی "وہابیت" [1] زیارت قبور کو کہاں تک روحانی علاج سمجھے اور کہاں تک خود اسے مرض تصور کرے۔ حقیقتاً جو کچھ ان مزارات کے گرد و پیش دیکھنے میں آتا ہے وہ مجھ جیسے "بدعتی" کو اس قدر صدمہ پہنچاتا ہے کہ عرض نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ان عام بدعات میں جو وہاں کی جاتی ہیں اور نہایت بدتمیزی سے کی جاتی ہیں میں جب کبھی اجمیر شریف آتا ہوں اور میری نظر اس مزار شریف پر پڑتی ہے تو میرا خیال اس زمانہ کی طرف جاتا ہے جب سارے ہندوستان میں مشکل ہی سے کوئی مسلمان نظر آتا ہوگا۔ مشکل ہی

---

1 حاجی ظفر الملک علوی کاکوروی (ایڈیٹر ماہنامہ "الناظر") تھے تو حنفی ہی لیکن اپنے تشدد و تقشف کے لیے بدنام تھے۔

سے کسی جگہ کوئی شخص ایک ان دیکھے خدا کو سجدہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہوگا اور اذان کی آواز تو یقیناً کہیں بھی نہ آتی ہوگی اور پھر میں خیال کرتا ہوں کہ ایک ایسے زمانہ میں سنجر کا رہنے والا سرکار مدینہ کے حکم سے غریب نوازی کو اپنا شعار بنا کر سلطان الہند بننے کے لیے ایک ایسے ملک میں آتا ہے اور کسی گوشہ کو اپنے لیے تلاش کرتا، بلکہ راجپوتانہ کے وسط میں ہندوستان کے سب سے بڑے راجہ کی راجدھانی میں داخل ہوتا ہے اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر اپنی پاک وصاف زندگی کے ذریعہ سے اسلام کا اعلان کرتا ہے اور جس وقت ساری جنگی اور مادی قوتیں اسلام کے خلاف ہوتی ہیں اعلائے کلمۃ الحق کرتا ہے اور ہزاروں لاکھوں کو مشرف بہ اسلام کرتا ہے۔ آج کل جبکہ ہزاروں لاکھوں نام کے مسلمان ہر وقت غیر مسلم اکثریت کا رونا رویا کرتے ہیں اس مزار پر جا کر اگر ہم اسی سبق کا آموختہ پھیریں کہ ''لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئاً وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ'' تو مجھے یقین ہے کہ ہم پر بھی آج سکینہ نازل ہونے لگے اور ہماری مدد کے لیے جُنُوْدٌ لَمْ تَرَوْهَا اتر آئیں۔ جاتے ہی درگاہ شریف پر حاضر ہوا۔ پھر مولانا معین الدین صاحب کے بھائی حکیم نظام الدین صاحب کے ہاں جا کر فروکش ہوا۔ اپنے آکسفورڈ کے رفیق صاحبزادہ عبدالواحد خاں سے جا کر ملا اور شب کو پھر درگاہ شریف جانے کے بعد رخصت ہوا۔

میرے جن نئے کرم فرما[1] نے مجھے علاج کے لیے اس بار ولایت بھیجا ہے ان سے دوسرے دن آبو جا کر ملا۔ 29 کو ان سے بھی رخصت ہوا اور اس بار بھی انھوں نے شکریہ کے الفاظ کو زبان پر آنے سے روک دیا۔ اس لیے اس صحبت کو دعا پر ختم کیا اور بادیدۂ تر روانہ ہوا۔ 28 کی شب کو احمد آباد پہنچا۔ انسویا بہن اپنے بھائی امبالال سارا بھائی اور ان کے بال بچوں کے ہمراہ ولایت گئی ہوئی ہیں۔ اور شنکر لال بینکر[2] علیل تھے لیکن انھوں نے انسوئیاں بہن کی موٹر روانہ کر دی تھی اور آشرم سے ایک مدراسی نوجوان مجھے لینے آگئے تھے۔ اسی وقت سابرمتی گیا اور غسل کر کے سونے لیٹا مگر گمن لال بھائی کی جوان موت اور ان کی پیاری بچی رادھا کے رنج وغم

[1] یعنی وہی مہاراجہ الور۔ [2] یہ سب اس زمانہ کی مشہور کانگریسی شخصیت تھیں، اور جمنالال بجاج تو مدتوں کانگریس کے خزانچی رہے۔ آگے چل کر لفظ ''با'' ملے گا۔ اس سے مراد گاندھی جی کی اہلیہ ہیں۔

نے نیند کو بھگا دیا۔ تاہم صبح کو خاصی نیند آ گئی۔ نماز فجر کے بعد پہلے رادھا اور اس کی والدہ کے پاس گیا، پھر با اور مہاتما جی سے ملا۔ اپنے ولایت جانے کا سارا قصہ سنایا اور ان کو اپنا ہم خیال پایا۔ دوپہر کو جمنا لال جی بزاز کی فرودگاہ پر آرام کیا اور شام کو کھانا کھا کر شنکر لال بینکر کے ساتھ ان کی اور انسویا بہن کی قیام گاہ پر گیا۔ نماز مغرب پڑھ کر اسٹیشن کو روانہ ہوا تا کہ گجرات میل ہی میں روانہ ہو جاؤں اور نماز عید الاضحیٰ سے پہلے ہی بمبئی پہنچ جاؤں۔ بمبئی میں عیدین کی نمازیں سورج نکلتے ہی ہو جایا کرتی ہیں اس لیے ریل ہی میں غسل کر کے اور کپڑے بدل کر اور سامان اسٹیشن ہی پر چھوڑ کر شوکت صاحب اور مولانا عرفان وغیرہ کے ساتھ ہی دفتر خلافت کے پاس والی چھوٹی مسجد کا رخ کیا جہاں نماز اچھی طرح مل گئی۔ مگر اس قدر مختصر جماعت میں یقیناً وہ غرض پوری نہیں ہوئی جو مساجد جامع میں بھی بمشکل پوری ہوتی ہے اور جس کو پورا کرنے کے لیے شہر کے باہر عید گاہ بنائی جاتی ہے۔ اس عید کی نماز میں اصفہانی صاحب نے آلہ مکبر الصوت لگانے سے احتراز کیا اور میرے نزدیک سخت غلطی کی اور کٹ ملاؤں سے ڈر گئے۔ میں ان کا استغناء ہی پڑھ کر بھانپ گیا تھا کہ ان بزرگ پر ملاؤں کا خوف غالب ہے۔ جو جماعت گراموفون کو باجا کہتی ہے اور اس میں قرآن کریم کی قرأت سننے کو لہو ولعب سمجھتی ہے، اس سے لاؤڈ اسپیکر کے لیے فتویٰ طلب کرنا ہی حماقت ہے۔ عید کا دن اور دوسرا دن حاجی اسماعیل صاحب خلافت کے سچے اور پکے دوست کے ہاں دعوتوں میں گزرا۔ یا مسز نائیڈو کے ہاں کی دعوت میں۔ یکم جون کو کچھ کھدر اور اون کی جرابیں کترا ک صاحب کے کارخانے میں جا کر بنوائیں۔ ٹکٹ 31 مئی ہی کو لے لیا تھا۔ 2 کو سب سامان بٹورا اور باندھا اور کمپنی کے سپرد کیا۔ اور پھر کچھ آم لے کر اور کچھ ہار پھول بٹور کر بندرگاہ پر گیا۔ کمپنی کی نوازش سے چھ ٹکٹ جہاز پر جا کر رخصت کرنے کے لیے دوستوں کے واسطے مفت مل گئے تھے حالانکہ فی ٹکٹ تین روپیہ قیمت دینا پڑتی ہے۔ بندرگاہ پر ڈاکٹر کو نبض دکھائی، انھوں نے پوچھا اچھے ہو میں نے کہا اچھا ہوتا تو ولایت ہی کیوں جاتا، باردولی [1] نہ گیا ہوتا۔ مگر ان کا اطمینان کر دیا کہ میرا مرض متعدی نہیں ہے اور اب تو میری سیاست

---

[1] باردولی گجرات کا وہ مقام ہے جہاں اس وقت ستیا گرہ اور ترک موالات کی عملی تحریک زور شور سے جاری تھی اور سارے ہندوستان کی نگاہیں اسی طرف لگی ہوئی تھی۔

بھی متعدی نہیں ہے۔ نہ بظاہر میرا مذہب بھی متعدی۔ ایک پولیس کے انگریز افسر صاحب نے طارق 1 تک سے ٹکٹ مانگا۔ اور شوکت صاحب غصہ کے مارے اسی وقت اپنے ٹکٹ کو پھینک کر واپس جارہے تھے مگر ڈاکٹر نے طارق صاحب کو بھی اسی ٹکٹ میں شامل ہونے اور جہاز پر جانے کی اجازت دے دی۔ روانگی کا وقت سنا ہے کہ ایک بجے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے سب رخصت کرنے والے رخصت کر دیے گئے۔ مگر ڈاک ڈیڑھ بجے تک بار کی جاتی رہی اور ڈیڑھ بجے ہم ہندوستان کے ساحل سے رخصت ہوئے۔

کیا کہوں کن افکار اور کن خیالات کا اس وقت دل اور دماغ میں ہجوم تھا۔ پہلا سفر 1898 کا کن امنگوں اور کن امیدوں کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ ایک غریب بھائی کی بے نظیر حیرت انگیز ہمت کی بدولت یکا یک آکسفورڈ جانے کا انتظام ہوا تھا۔ پیسہ عنقا کا حکم رکھتا تھا، سول سروس میں کامیابی کی آرزو تھی۔ دوسرا سفر 1902 میں ہوا تھا جب کہ سول سروس میں ناکام ہو چکا تھا۔ شوکت صاحب بھی ناکامی کی خبر ''پانیر'' میں پڑھ کر زرد پڑ گئے تھے مگر ایک بڑھیا 2 نے دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا کہ کیا ہوا اور پوچھا تھا کہ کیا محمد علی کی امتحان میں ناکامی ہی پر اس قدر مایوس ہوتے ہو۔ اگر اس نے چوری کی ہوتی یا مرتد ہو گیا ہوتا تب تمھاری کیا حالت ہوتی۔ محمد علی کو لکھو کہ میرا اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور اس کی منگیتر بھی ساڑھے تین برس سے بیٹھی ہے۔ اب اسے بلا لو اور اس کی شادی کر دو۔ میں بلایا گیا تھا۔ شادی بھی ہوئی تھی۔ رامپور میں محکمۂ تعلیم کا افسر بھی مقرر ہو چکا تھا اور اب صرف آکسفورڈ بی اے کا امتحان دینے جارہا تھا۔ رامپور میں جو واقعات گزر چکے تھے، وہ بیحد پریشان کن اور بالآخر میرے استعفیٰ کا پیش خیمہ تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا، کہ کیا حشر ہوگا۔ جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ تیسرا سفر سید وزیر حسن صاحب کی معیت میں 1912 میں چھپ چھپا 3 کر ہوا تھا کہ کہیں میرے کرم فرما مسٹن صاحب 4 جن سے دو

---

1 زاہد علی خان کا بچہ، مولانا کا نواسہ اور مولانا شوکت علی کا پوتا۔

2 مولانا کی والدہ ماجدہ مراد ہیں، جو 1902 میں ''بڑھیا'' کہی جانے کے قابل ہرگز نہیں تھیں۔

3 کانپور کے انہدام مسجد کے سلسلہ میں سید وزیر حسن اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری تھے۔

4 یعنی سر جیمس مسٹن لیفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ۔

ہفتے پیشتر ہم سدھار رہے تھے، سنتے ہی میری گرفتاری کا وارنٹ نہ نکال دیں۔ ''ایم علی'' اور ڈبلیوحسن'' کے نام سے دہلی کے ٹکٹ خریدے گئے تھے۔ سورج نکلنے کے پیشتر شوکت صاحب کے ساتھ دہلی کے اسٹیشن سے عیدالفطر کے دوسرے ہی دن اس طرح روانہ ہوا تھا کہ گویا شوکت صاحب کو صرف پہنچانے آیا ہوں۔ گھر میں نہ بچیوں کو خبر تھی نہ نوکروں کو اور سامان بھی یہ کہہ کر بندھوایا تھا کہ شملے جا رہا ہوں، وہاں سردی پڑتی ہے گرم کپڑے زیادہ رکھنا۔ کان پور کی مسجد شہید ہو چکی تھی، سو سے زیادہ مسلمان جن میں بچے بھی تھے اور بوڑھے بھی اس وقت قید تھے۔ ایڈریانوپل کے فاتح ترکوں سے ایسکوتھ صاحب اور سرایڈورڈ گرے سختی کے ساتھ مطالبہ فرمارہے تھے ''کامریڈ'' کے ایڈیٹر نے پریس ایکٹ کے خلاف ایک بے نظیر فیصلہ سرلارنس جنکنس کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور دو سب سے سینئر ججوں کا حاصل کر لیا تھا۔ گو ''مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو'' والا پمفلٹ جس میں بلقانی حلیفوں کے مظالم کی داستان غم نصاریٰ ہی کو سنائی گئی تھی، پھر بھی واپس نہ مل سکا تھا۔ انگلستان کی لبرل حکومت کے پاس جا کر منت سماجت کرنا تھی۔ اس کا بھی جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔

چوتھا سفر 1920 میں کیا گیا اور ایک آخری کوشش اس کی کی گئی تھی کہ خلافت عظمیٰ کو برقرار رکھا جائے۔ ترکی سلطنت کی قوت اور اس کے اقتدار کی حفاظت کی جائے اور ترکوں کو اس غلامی سے محفوظ و مصئون رکھا جائے جس میں ہم خود ڈیڑھ پونے دو برس سے گرفتار تھے اور اس قبضہ کو قسطنطنیہ پر سے اٹھوا دیا جائے جو تقریباً 40 برس سے مصر پر چلا آرہا تھا۔ گزشتہ تجربوں کی بنا پر جانتے تھے کہ کیا حشر ہوگا مگر ع

''رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں'' کے خیال سے احرام سفر باندھا گیا تھا، آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا بھی کیا حشر ہوا۔

اس سفر کے بعد توبہ کر لی تھی کہ اب آستاں بوسی نہ کریں گے۔ اگر پھر جائیں گے تو اسی لیے کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان معاہدہ پر دستخط کریں۔ افسوس وہ معاہدہ آج بھی دور نظر آتا ہے، مگر الحمدللہ کہ توبہ آج بھی نہیں ٹوٹی۔ سرڈینس برے فارن سکریٹری صاحب کو پاسپورٹ کے لیے شملہ ٹیلیفون کیا تو ان کے سوال کے جواب میں صاف کہہ دیا کہ اب نہ تو مجھے برطانیہ کی کسی

سیاسی جماعت پر اعتماد ہے نہ یورپ کی کسی حکومت پر کہ کسی سیاسی کام کی غرض سے یورپ کو جاؤں اور آج مسٹر وانس پولیٹیکل سکریٹری صاحب سے جہاز پر ملاقات ہوئی تو ان کی غلط فہمی کو بھی دور کر دیا کہ میں بٹلر کمیٹی کے سلسلہ میں انگلستان نہیں جا رہا ہوں بلکہ محض اپنی صحت کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اور اس پر ہنسی آتی ہے کہ ایک فاقہ کش ملک سے ایک متمول ملک کی طرف ایک فاقہ مست بہ صرف کثیر اس لیے سفر کر رہا ہے کہ وہاں جا کر فاقہ کر کے اپنا علاج کرائے۔

ہندستانی عورتیں اس جہاز پر بھی ہندستانی لباس میں سفر کر رہی ہیں مگر سوائے مسز بیسنٹ کے اخبار کے نیو انڈیا[1] کے ایڈیٹوریل اسٹاف کے ایک رکن کے جو اچکن اور آڑا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں، مردوں میں صرف میں ہی ایشیائی لباس میں ملبوس ہوں۔ 2 جون کا دن اچھا گزرا مگر 4،2 اور 5 کو ہوا تیز رہی اور تیز تر ہوتی گئی۔ یہ موسمی ہوا ہے جس کا نام بگاڑ کر ''مون سون'' کر لیا گیا ہے اور جو ہندوستان کے لیے بارش لا رہی ہے۔ دہلی کی گرمی کا خیال کر کے دعا نکلتی ہے کہ یہ جلد بمبئی پہنچے اور سب طرف یہ جل تھل کر دے۔ لیکن جہاز والوں کا خیال کرتا ہوں اور بالخصوص عورتوں کا تو جی چاہتا ہے کہ دعا کروں کہ بند ہو جائے اور سمندر کی یہ طغیانی باقی نہ رہے۔ تاہم خلاف توقع میں بالکل اچھا رہا۔ اور ایک وقت کا کھانا بھی نہ چھوڑنا پڑا حالانکہ آدھے سے زیادہ مسافر اور تین چوتھائی سے زیادہ عورتیں کھانے کے کمرہ سے غیر حاضر رہنے لگی تھیں۔ البتہ آج صبح کے بعد سے تموج میں بہت کمی ہو گئی اور آج شب کے ساڑھے گیارہ بجے سے جب یہ خط شروع کیا گیا ہے جہاز پر مردوں اور عورتوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ حالانکہ کل شب کو ان میں سے اکثر خاموش پڑے تھے اور ناچ ہو رہا تھا تو سمندر کی موجوں کا ہو رہا تھا۔

علاوہ مہاراجہ صاحب الور کے وزیر اعظم کے جو میرے ہم سفر ہیں اور چند ہندوستانیوں کے میری کسی سے گفتگو نہ ہوئی اور اس فرصت کو غنیمت جان کر میں نے یا تو اپنی نیند کا قرضہ جو مدتوں سے چڑھا ہوا تھا وصول کیا یا کچھ فرانسیسی زبان سیکھنے کی کوشش کی۔ مرحوم علی گڑھ کالج کے مرحوم سابق طالب علم محمد داؤد صاحب کی نظموں کو ان کے چھوٹے بھائی محمود احمد عباسی پھر شائع کر رہے ہیں اور مجھ سے تقریظ لکھنے کا وعدہ لے چکے ہیں۔ ان کا خط جہاز پر بھی ملا اس لیے خطوں سے بھی

---

[1] اپنے زمانہ کا مشہور انگریزی روزنامہ۔ مدراس سے مسز اینی بیسنٹ کی نگرانی میں نکلتا تھا۔

پہلے اسے لکھنا شروع کیا اور الحمدللہ آج ختم کر دیا۔ شوکت صاحب سے بھی پہلے آپ کے نام یہ خط شروع ہو گیا اور اب اگر آپ اجازت دیں تو اسے ختم کر دوں۔

ڈیک پر میرے نزدیک ہی تین انگریزوں کے بچے دو لڑکیاں اور لڑکا کھیلا کرتے ہیں۔ ان سے یا ان کے والدین ہی سے کبھی کبھی دو چار باتیں ہو جایا کرتی تھیں یا بہار کے دو انگریزی زمینداروں سے جو نیل تیار کراتے ہیں۔ لیکن میرے قریب ہی ایک خوش رو وجیہ اور بلند قامت فوجی افسر بھی لیٹے رہتے تھے اور کبھی کبھی ایک دو لفظ بول لیا کرتے تھے۔ آج ایک بچی سے میری دیر تک گفتگو ہوتی رہی جس میں زیادہ تر میری بچیوں کے نام اور ان کی عمر کے متعلق اس کے سوالات اور میرے جوابات تھے۔ بظاہر اسے سن کر اور کچھ دلچسپ پا کر ان صاحب نے مجھ سے گفتگو شروع کی اور دو گھنٹے تک نہایت آزادی اور صفائی سے مگر پرلطف طریقہ پر سیاسی گفتگو رہی جس کے بعد انھوں نے شکریہ بھی ادا کیا اور دادو تحسین بھی دی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان کے بزرگ میرے دادا کے 58-1857 کے دوست تھے۔ اب تک کی ساری داستان میں نے آپ کو سنادی۔ اب نہ کہیے کہ میں نے خاموشی سے کام لیا ہے۔ کل سے انشاء اللہ حدیث شریف بھی شروع ہو جائے گی اور چونکہ حجاج کے جہازوں کی واپسی کا وقت ہے، راستہ میں آنکھیں ان کو بھی ڈھونڈیں گی۔ ہائے۔

زہے سعادت آں بندۂ کہ کرد نزول
گہے بہ بیت خدا وگہے بہ بیت رسول

مگر خدا بھلا کرے سلطان ابن سعود کا۔ اب وہاں کا راستہ بھی ہم بدبختوں کے لیے بند ہے۔ جہاز ہی پر یہ خبر پڑھی کہ ہم سے بھی زیادہ بدبخت شامی جنھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت میں سب سے بڑا حصہ لیا تھا اور اس کے صلہ میں فرانس کی غلامی اور 58 گھنٹہ کی مسلسل گولہ باری حاصل کی تھی، انھوں نے اب فیصلہ کیا ہے کہ ان کی نجات کے لیے ایک بادشاہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ فیصل بن سلطان بن سعود پر ان کی نظر انتخاب پڑی ہے۔ سچ ہے کہ ملوکیت کی بدعت کی ابتدا شام ہی سے ہوئی تھی۔ اب یزید کی ملکیت کی جگہ نجدیوں کی ملکیت کی طلب ہے۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ تعجب ہے کہ اعصابی سوزش جہاز پر آتے ہی بند ہو گئی مگر کل

دوپہر کو اور آج صبح کو تھوڑی دیر تک محسوس ہوئی۔ لیکن یقیناً یہ آموں کا پھل ہے سو بندرگاہ سعید تک وہ بھی ختم ہو جائیں گے اور لندن جاتے ہی فاقہ ہی فاقہ ہے۔

قطب میاں صاحب کو اور الطاف بھائی کو، سعید کو اور تمام فرنگی محل کو سلام شوق۔ بالخصوص جمال میاں اور محمد میاں اور نور میاں کو۔ مولانا سلامت اللہ صاحب کی خیریت تحریر فرمایئے [1]۔ دہلی میں جعفری کو پیار اور سب کو سلام شوق بالخصوص مولانا کفایت اللہ صاحب کی خدمت میں آداب، مولانا احمد سعید صاحب کو سلام شوق اور ان کی صحت کے متعلق اطلاع دیجیے۔ ڈاکٹر سعید احمد صاحب اور اسرائیلی صاحب، راشد الخیری صاحب کو بھی سلام شوق۔ اب غالباً ناچ بھی ختم ہو گیا اور میرا سر بھی گھومنے لگا اس لیے اب رخصت ہوتا ہوں۔

آپ کی عالی ہمتی کا قدر دان، ہمدرد کا دعا گو
آپ کا بھائی
محمد علی

......☆☆☆......

1۔ یہ سب فرنگی محلیوں اور ان کے لواحق کے نام ہیں۔ مولوی سلامت اللہ صاحب فرنگی محلی مولانا کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔

باب:74
6:1928
(سراپا۔مشاہداتِ فرنگستان)

محمد علی کے دیکھنے والے اس ڈائری کے ناظرین میں آج (نومبر 49 میں) بھی کچھ بہت زیادہ موجود نہ ہوں گے، اور پھر دیکھیے کب اس مسودہ کی تکمیل ہو پاتی ہے اور کتنی مدت اس صفائی میں لگتی ہے۔ اور پھر کتاب کب پریس سے باہر آتی ہے۔ اتنی منزلوں کے طے ہوتے ہوتے تو (جس میں 4، 5 سال کی مدت تو یقیناً لگ جائے گی) محمد علی کے دیکھنے والوں کی تعداد اور بھی کم رہ جائے گی جوانی میں بڑے خوش رو، وجیہ، تندرست وتوانا، کلے ٹھلے کے تھے، اپنے بڑے بھائی شوکت علی سے تو بہر حال کم، لیکن پھر بھی اچھے خاصے تنومند، چہرہ ہشاش وبشاش۔ بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی، آنکھیں بڑی چمکدار، بڑے خوش وضع وخوش لباس، پوشاک زیادہ تر انگریزی سوٹ لیکن کبھی کبھی ٹھیٹھ ہندستانی اور مشرقی بھی۔ داڑھی منڈی ہوئی وموچھیں کسی قدر چڑھی ہوئی۔ جنگ بلقان (12) اور انجمن خدام کعبہ (13) کے زمانہ سے وضع ولباس سب میں تبدیلی شروع ہوئی۔ سن اس وقت 34، 35 کا ہوگا۔ موچھیں کتری گئیں، داڑھی رکھائی گئی، اور پھر بڑھائی گئی۔ لباس رفتہ رفتہ سادہ اور

خالص مسلمانوں کا سا ہوگیا۔ جاڑوں میں سیاہ رنگ کی بالدار اور گرمیوں میں سفید کھدر کی اونچی کشتی نما ٹوپی، جس کا نام ہی محمد علی کیپ مشہور ہوگیا، گاندھی کیپ کی دوگنی۔ کھدر کا سادہ جیب دار کرتا اور پاجامہ۔ اوپر سے ڈھیلی ڈھالی رنگین عبا[1]۔ بلا کے جامہ زیب تھے۔ جو بھی کپڑا پہن لیا بس وہی پھب گیا۔ آخر میں عینک کی بھی مستقل حاجت ہوگئی تھی۔ بال بہت جلد سفید ہونے لگے، سر کے بال بڑے اور پٹوں کی شکل میں تھے۔ ذیابیطس اور فکروں سے گھل گھل کر دبلے ہوجانے کے باوجود بھی چہرہ کی وجاہت آخر دم تک قائم۔ تقویٰ وعبادت الٰہی سے چہرہ پر جو خاص قسم کی نورانیت آجاتی ہے، وہ اس کے علاوہ۔ آواز بلند۔ جس محفل میں ہوتے، سب پر چھا جاتے۔ حد درجہ بذلہ سنج، حاضری جوابی میں اپنا جواب آپ۔ ہنسنے ہنسانے میں برق، ساتھ ہی رونے رلانے میں بھی فرد۔ ہنسی اور آنسو دونوں معلوم تھا کہ ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہوئے ہیں محبت کی آنکھ اندھی ہی کیوں نہ کہی جائے، بہر حال اپنا حال تو یہ تھا کہ صورت بھی محبوبیت میں سیرت سے کچھ کم نہ تھی۔

ترکِ من! ایں مہ غلامِ روئے تو
جملہ ترکان جہاں ہندوئے تو

اور محمد علی کا کمال اگر دل میں رچا ہوا تھا تو محمد علی کا جمال آنکھوں میں بسا ہوا۔ آہ! وہ گزرا ہوا زمانہ کس طرح پھیر لایا جائے، اور کس طرح آج محمد علی کو زندہ سلامت، چلتا پھرتا، ہنستا بولتا سب کو دکھا دیا جائے۔ آہ! وہ زمانہ جب اپنا قال نہیں حال تھا ع

انبساط عید دیدن روئے تو

اور کہاں سے لے آئے جائیں وہ دن جب یہ شاعری نہیں حقیقت بیانی تھی ع

---

[1] یہی وہ لباس تھا جس پر پنڈت مدن موہن مالویہ نے دانستہ یا نادانستہ پھبتی بیگم صاحبہ بھوپال کے لباس کی کسی تھی ہوا یہ تھا کہ ایک دن غالباً 25 میں محمد علی بطور اخبار کے ایڈیٹر یا رپورٹر کے اسمبلی ہال گئے ہوئے تھے، پریس گیلری سے ابھی نکلے ہی تھے کہ پشت کی طرف سے مالویہ جی آنکلے۔ محمد علی نے جب منہ پھیرا تو مالویہ جی حیرت کے ساتھ بولے "ارے آپ! میں سمجھا ہز ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال برقع پہن کر اسمبلی ہال میں تشریف لائی ہیں" محمد علی برجستہ بولے "جی ہاں، اس زنانی محفل میں مردوں کا کیا کام ہوسکتا تھا۔

اے ہلالِ ماتم ابروئے تو

یاد ہے نہ کہ محمد علی ابھی یورپ میں زیر علاج ہیں اور جلد ان سے ملاقات اور گفتگو کی کوئی صورت نہیں۔ خط جب آئے گا، آئے گا۔ جبھی تو اتنا موقع مل گیا کہ درمیان میں ذکر ان کے وضع ولباس وغیرہ کا چھڑ گیا۔ خط کے انتظار میں ہم لوگ ہفتوں صرف کرتے تھے، تو کیا ڈائری کے ناظرین چند منٹ کا بھی انتظار برداشت کرنے سے رہے؟

دہلی تو اب ہمدرد کے نگراں کی حیثیت سے اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ ایک روز دہلی میں ہمدرد آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ولایتی ڈاک آئی۔ ڈیلی ایکسپریس تھا یا کوئی اور لندنی روزنامہ، اس میں خبر یہ نظر پڑی کہ آج پارلیمنٹ کی گیلری میں ایک عباپوش شخص نماز پڑھتے ہوئے دیکھا گیا برطانیہ کے لیے خبر بالکل نئی تھی اور واقعہ بھی یہی تھا کہ جب سے پارلیمنٹ کی عمارت قائم ہے، کیوں کبھی کسی کو اس کے حدود کے اندر نماز پڑھنے کا خیال بھی آیا ہوگا! جعفری جو ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر تھے (ہمدرد کے بند ہو جانے پر ان ہی نے روزنامہ ملت نکالا تھا) قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ خبر سنتے ہی بول اٹھے کہ "یہ سوا مولانا کے اور کوئی نہیں ہوسکتا"۔ اور بالکل سچ کہا۔ ادھر سوا محمد علی کے اور خیال بھی کسی کا جا سکتا تھا؟ وہی یہ کہہ کر گئے تھے کہ جی میں آتا ہے کہ وہاں کے چپہ چپہ پر نماز پڑھوں، پارک کو، ریلوے پلیٹ فارم کو، ہر چیز کو مصلیٰ بنادوں اور جس چیز سے وہاں والے بدکتے ہیں اسی سے انھیں خوب مانوس کردوں۔ شعر جس نے بھی کہا ہو، اس شاعری کو واقعہ بنانا محمد علی ہی کا کام تھا۔

اذان حرم میں کلیسا میں دیر میں ناقوس
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

لیجیے محمد علی کا دوسرا خط بھی موصول ہوگیا اور اب شروع تمبر ہے۔ اس کے پڑھنے کے لیے وقت نکالیے۔ خط کیوں ہے؟ یہ کہیے کہ ایک پمفلٹ کی ضخامت رکھتا ہے۔ کہا کرتے تھے کہ مختصر خط لکھنے کے لیے زیادہ فرصت کی ضرورت ہوتی ہے، یہ مجھے کہاں نصیب ہو۔ بس جو کچھ بھی لکھتا ہوں بالکل قلم برداشتہ لکھتا ہوں، اس میں طوالت سے چارہ نہیں۔ بہر حال اب وہ مکتوب حاضر ہے۔

....

9 اگست 28 لندن

پیارے ماجد میاں، ظفر الملک صاحب اور جعفری

گزشتہ ہفتہ میں جو ہمدرد کے پرچے آئے، ان میں میرے کسی خط کا کوئی ذکر نہ تھا جس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید وہ خط جو یورپ پہنچ کر میں نے لکھا تھا اور 21 جون کو ڈوور کے اسٹیشن پر ڈالا تھا وہ 12-11 جولائی تک آپ حضرات کی نظر سے نہیں گزرا اور اگر ماجد علی 1 صاحب کو خط میں صاف تصریح نہ ہوتی کہ انھوں نے حیات صاحب 2 کو اس تاکید کے ساتھ روانہ کردیا ہے کہ وہ اس خط کو پڑھ لینے کے بعد فوراً جعفری کو بھیج دیں تو میرے دل میں ضرور یہ خوف پیدا ہوجاتا کہ بیگم صاحبہ نے حیات صاحب کو وہ خط تو بھیج دیا مگر یہ لکھنا بھول گئیں کہ پڑھنے کے بعد وہ خط جعفری صاحب کو بھیج دیا جائے تاکہ بہت سے مندرجہ حالات سے قارئین ''ہمدرد'' بھی واقف ہوجائیں۔ جب تفصیل کے ساتھ کسی چیز کے متعلق لکھنا پڑتا ہے تو پھر ناممکن ہوجاتا ہے کہ اس کو ہر خط میں دہرایا جائے۔ اس لیے میں نے یہ انتظام کرلیا تھا کہ کسی نہ کسی کو ہر ہفتے مفصل خط لکھ دیا جائے اور وہ اسے آپ حضرات تک پہنچا دیا کریں۔

21 جون کا خط اس قدر طویل تھا اور اس مصروفیت کی حالت میں لکھا گیا تھا کہ اس کے بعد کسی اور کو دو سطریں لکھنا بھی مشکل تھا۔ چنانچہ بیچاری بیگم صاحبہ تک کو اس ڈاک سے علاحدہ خط نہ روانہ کیا جاسکا۔ لیکن چونکہ ان کی اور بچیوں کی پریشانی کا سب سے زیادہ خیال تھا اس لیے میں نے حیات صاحب کا خط بجائے مکتوب الیہ کو بھیجنے کے بیگم صاحبہ کے پتہ سے بھیج دیا۔ چونکہ اس ہفتہ کی ڈاک کے ہمدرد میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اس لیے مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید حیات صاحب اسے دہلی بھیجنا ہی بھول گئے۔ اور چونکہ بظاہر اس خط کا علم آپ کو نہیں اس لیے آپ غالباً ان کو بھی نہیں لکھیں گے کہ آپ کی یاددہانی پر وہ اس خط کو آپ کے پاس بھیج دیں۔ اس لیے مجبوراً میں خود آپ کو لکھ رہا ہوں کہ ان سے وہ خط ضرور منگالیں۔ وہ پہلی ستمبر کو غالباً بمبئی سے نواب صاحب

---

1 ماجد علی خاں رامپوری۔ مولانا کی تیسری صاحبزادی کے شوہر۔

2 حسن محمد حیات صاحب پنجابی۔ مولانا کے مخلص اور سابق پرائیویٹ سکریٹری۔ ان کا ذکر کئی بار آچکا ہے۔

3 محمد جعفر صاحب مچھلی شہری جامعی جو اس وقت ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر تھے۔

بھوپال کے ہمرکاب روانہ ہوں گے۔ اس لیے اس خط کے ملتے ہی ان کو لکھ دیجیے کہ وہ اپنے خط میں آپ حضرات کو بھی شریک کرلیں۔ مجھے خوف ہے کہ میں نے لندن سے جو ڈاک پہلی بار ارسال کی اس میں کوئی خط آپ حضرات کے نام نہیں ارسال کیا لیکن بیگم صاحبہ اور بچیوں کو اور ماجد علی صاحب کو خطوط لکھ دیے تھے اور نیز شوکت صاحب کو اور سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ، چونکہ بیگم صاحبہ ہی کو لکھا گیا تھا اس لیے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے خط کا ایک حصہ شوکت صاحب اور جعفری صاحب کو بھجوادیں مگر وہ اس شرکت کو گوارا نہیں کرتیں اور ان کے پچھلے خط میں لکھا ہوا آیا ہے کہ آپ میرے خط میں کسی کو شریک نہ کیجیے۔ خواہ کتنا ہی مختصر ہو وہ میرے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ مجھے کاتب بننے کی فرصت نہیں۔ معلوم نہیں اس کے بعد انھوں نے اس خط کی نقل جعفری کو بھیجی یا نہیں۔ بہرحال ہمدرد میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا۔ اگر وہ بھیجی بھی گئی ہے تو غالباً جعمرات تک آپ حضرات کو مل گئی ہوگی۔ خیر اب یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ مفصل خط بالعموم آپ ہی کے نام جایا کرے گا اور جو دوسرے خطوط لکھے جایا کریں گے ان میں سب کا حوالہ دے دیا جایا کرے گا اور انھیں صرف اس قدر لکھ دیا جائے گا کہ بعد ادائے آداب کے عرض پرداز ہوں کہ یہاں سب خیرت ہے اور آپ کی خیرت درگاہ خداوندی سے نیک مطلوب ہے۔ بڑوں کو سلام اور چھوٹوں کو دعا۔ تمت تمام شد۔

پہلے اپنی صحت کے متعلق عرض کردوں کہ اس بار چھ دن کے فاقہ سے جس میں نارنگی اور انگور کا عرق پینے کی اجازت تھی، میری طبیعت بہت اچھی ہوگئی اور یہی نہیں کہ شکر نہیں آئی بلکہ باوجود چربی کے تقریباً اس مقدار میں پائے جانے کے جو گزشتہ ہفتہ میں تھی۔ میرے پاؤں کے تلوؤں میں اعصابی سوزش بالکل نہیں ہوئی۔ البتہ گزشتہ ہفتہ کے دن چند نوجوان طلبہ کے ساتھ ریجنٹس پارک میں چڑیا گھر (Zoological garden) دیکھنے کے لیے جانا ہوا اور چونکہ اس دن صبح کو بہت ہی کم پھل کھائے تھے اس لیے ان طلبہ کے ساتھ چائے میں شریک ہوگیا۔ افسوس ہے کہ یہاں شہد نہ مل سکا اور شکر کا استعمال کرنا پڑا۔ اس دن میں نے خوب ہی بدپرہیزی کرڈالی اور مکھن اور روٹی اور جیم کا بھی استعمال کیا اور کیک کے بھی دو ایک ٹکڑے کھائے، یہ میری بدپرہیزی تھی ورنہ نہ کبھی شکر کا استعمال کیا اور نہ کبھی جیم کا اور نہ کبھی کیک کا۔ یہاں تک کہ روٹی بھی تقریباً ڈیڑھ

مہینے سے نہیں کھائی۔ گومیرے دوست احباب کوشاید اس کا یقین نہ آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بدپرہیزی کرنا پڑی تو میں عمداً پیٹ بھر کر بدپرہیزی کی تاکہ دیکھوں اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ چند ہی گھنٹوں کے بعد سزا بھی پائی۔ پورے ایک ہفتہ کے بعد تلوؤں میں اعصابی سوزش پھر شروع ہوئی اور اس کا کچھ نہ کچھ اثر کل تک رہا، البتہ ایک وقت کا فاقہ کرنے کے بعد الحمدللہ وہ کیفیت بالکل دور ہوگئی اور اس شیریں تجربہ نے میرے یقین کے اور بھی پختہ کردیا کہ میرے معالج غذا کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ یقیناً صحیح ہے۔ اس ہفتے سوائے اس بدپرہیزی کے میں نے ان کے کہنے پر اسی قدر اور بھی عمل کیا کہ گوشت مطلق نہیں کھایا بلکہ سوائے تھوڑی سی ابلی ہوئی مٹر کے اور کوئی پکی ہوئی ترکاری نہیں کھائی اور صرف پھلوں پر گزر کیا۔ مگر پھلوں میں علاوہ نارنگیوں کے اور ناشپاتیوں کے اور خوبانیوں وغیرہ کے کچھ گریاں بھی کھائی گئیں (بادام اخروٹ وغیرہ) اور لطف یہ ہے کہ کھجوریں بھی روزانہ 20، 25 کھائی گئیں۔ اس لیے اس پرہیز میں شکایت کا ذرا بھی موقع نہ ملا۔ ارادہ ہے کہ کل پھر قارورہ کیمیاوی تجربہ کے لیے بھیجوں تاکہ معلوم ہوجائے کہ فاقہ نہ کرنے کے بعد بھی شکر مفقود رہتی ہے یا نہیں۔ ورزش کے معاملہ میں البتہ بہت کچھ فروگزاشت ہوئی ہے۔ لیکن آج سے ارادہ کرلیا ہے کہ دن میں کم سے کم دوتین بار ورزش ضرور کرلیا کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب کا قول ہے کہ صحیح غذا سے زیادہ صحیح ہوا کی ضرورت ہے اور جب تک اندر کی ہوا پوری طرح باہر نہ نکالی جائے گی جسم کا اندرونی حصہ صاف نہ ہوگا۔ اور تمام ورزشیں اسی غرض سے کرائی جاتی ہیں کہ میں صحیح طریقہ سے سانس لے سکوں۔ چربی پوری طرف سانس لینے میں مانع نہ ہوتی رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر میری سانس لمبی ہوگئی تو غذا بھی زیادہ ہضم کی جاسکے گی۔ اور تھوڑی بہت بدپرہیزی سے بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ بہرحال یقیناً اس ڈیڑھ مہینے کے علاج میں اتنا افاقہ ہوا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور میں شوکت علی صاحب کو لکھنے والا ہوں کہ وہ بھی اب پھلوں پر گزارہ کیا کریں اور جس طرح سے میں زمین پر لوٹ لوٹ کر اور دوسری ورزشوں میں لمبی لمبی سانس لیا کرتا ہوں وہ بھی لیا کریں۔ میرا وزن سات سیر گھٹ چکا ہے، کمر چار انچ کم ہوگئی ہے اور سانس ایک سوستر سے ترقی کرکے دوسو تک پہنچ گئی ہے، ان کا وزن تو یقیناً 20، 25 سیر گھٹ جائے گا بلکہ اس سے بھی زائد اور تھوڑے ہی عرصہ میں مصرعہ ''کمر پتلی صراحی دار گردن'' کے

مصداق ہوجائیں گے۔ بیگم صاحبہ بچاری مدت سے دبلا ہونا چاہتی ہیں۔ ان کے لیے بھی یہی علاج مفید ہوگا اور چونکہ وہ نقرس کے مرض میں مبتلا بھی ہیں اس لیے یہ طریق علاج اس مرض کے لیے بھی مفید ہوگا۔ میں بار بار زور دے رہا ہوں کہ لڑکیوں کو لے کر وہ یہیں چلی آئیں۔ اور ابھی اس مضمون کا انھیں تار بھی دے چکا ہوں۔ حمیدہ بی کو بیماری نے بے حد پریشان کر دیا ہے۔ اگر وہ یہاں آگئیں تو حمیدہ بی کا بھی اسی طریقہ پر یہاں علاج شروع کرا دیا جائے گا لیکن دیکھیے وہ آتی بھی ہیں یا نہیں؟ جہاں اس قدر اپنی صحت یابی کے متعلق لکھ چکا ہوں وہاں چند سطریں ایک بزرگ قوم کی وفات کے متعلق لکھنا بھی مناسب نہ ہوگا۔ جمعہ کی صبح کو میں نے اپنا فاقہ ختم کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ دو دن اور فاقہ کیا جائے۔ لیکن چونکہ میں امام سے وعدہ کر چکا تھا کہ نا ٹیٹنگیل گیٹ کے دار الصلوٰۃ میں نماز کے بعد مصلیوں سے اسلام کے متعلق ایک مختصر سے مکالمے کی بھی ابتدا کروں اور خوف تھا کہ اگر اس دن افطار نہیں کیا گیا تو شاید کمزوری زیادہ محسوس ہو۔ لیکن جو حالت جمعرات کو تھی اگر اس کا پہلے ذرا بھی گمان ہوتا تو میں ہرگز جمعہ کو افطار نہ کرتا۔ اور دو چار دن اور فاقہ کرتا۔ کیا معلوم تھا کہ ٹھیک جس وقت میں افطار کر رہا تھا[1] اسی وقت سید امیر علی صاحب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ وہ لندن سے کچھ دور سسکس کاؤنٹی کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں اس زمانہ میں آرام فرما رہے تھے۔ اور مسز امیر علی صاحبہ کے قول کے مطابق وہ آخر تک کام کرتے رہے۔ گو کچھ عرصہ سے وہ صاحب فراش تھے تاہم کسی کو گمان نہ تھا کہ اس قدر جلد داعی اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ یہاں جس طرح جینا مشکل ہے اسی طرح مرنا بھی مشکل ہے۔ جس دن امیر علی صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ لوگ چھٹیاں منانے جا رہے تھے۔ اس لیے کہ گزشتہ پیر کے دن بینکوں کی چھٹی تھی۔ چنانچہ تجہیز و تکفین کا سامان منگل تک نہ ہو سکا۔ تجہیز و تکفین کے پیشے کی یہاں ایک کمپنی ہے۔ چنانچہ اس نے مرحوم کی میت کورڈج سے ویسٹ منسٹر تک پہنچایا ہوگا اور منگل کے دن تعطیل ختم ہونے پر تابوت بنانے کا انتظام کیا۔ اس کمپنی کی ایک اسپیشل ٹرین واٹرلو اسٹیشن سے منگل

---

[1] رائٹ آنریبل سید امیر علی پہلے جج ہائی کورٹ کلکتہ اور بعد کو پریوی کونسل، مصنف "اسپرٹ آف اسلام" وغیرہ جن کی ایک عمر انگریزی میں خدمت اسلام کرنے میں صرف ہوئی۔ انگریزی اہل زبان کی سی لکھتے تھے اور بجز مذہب کے اور ہر حیثیت سے انگریز ہو بھی گئے تھے۔

کے دن بارہ بجے کے قریب (Brook wood) بروک وڈ کو جو ووکنگ (wooking)اور ایلڈرشاٹ(Alder shot) کے درمیان واقع ہے، روانہ ہوئی اور اس میں جنازہ اور اس کو کاندھا دینے والے روانہ ہوئے۔ یورپین رسم کے مطابق پھولوں سے تابوت چھپ گیا ہوگا۔ اس لیے کہ جب میں قبرستان پہنچا تو قبر پھولوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی۔ میں چند طالب علموں کے ساتھ موٹر میں روانہ ہوا تھا۔ مجھے اس کا پہلے علم نہ تھا کہ لوگ اسپیشل میں قبرستان جانے والے ہیں۔ اتوار کی شب کو سر محمد رفیق 1 صاحب سے ملاتب اس کا حال معلوم ہوا۔ اور میں اس سے پہلے ہی موٹر کا انتظام کر چکا تھا۔ احتیاطاً ہم لوگ اسپیشل سے بھی موٹر میں لندن سے روانہ ہوئے لیکن بدقسمتی سے ادھ بیچ میں موٹر رک گئی اور اس کے صاف کرنے میں موٹر کے مالک کو کچھ غلط فہمی ہوئی، جس کے باعث گھنٹہ بھر راستے میں رکنا پڑا۔ بالآخر گزرتی ہوئی ایک موٹر کے چلانے والے سے درخواست کی گئی کہ آٹو موبائل ایسوسی ایشن کے سپاہی کے آگے چل کر بھجوادیں۔ یہ مالکان موٹر کی ایک جمعیت ہے جس کا چندہ دو پونڈ سالانہ ہے اور اس کی طرف سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر عمدہ وردی پہنے ہوئے سپاہی بٹھلا دیے گئے ہیں جو موٹر والوں کو راستہ بھی بتاتے ہیں اور اگر کوئی حادثہ واقع ہوجاتا ہے تو موٹر والوں کی مرہم پٹی کرتے ہیں۔ ان کے پاس موٹر بائیسکل بھی ہے جن میں سائڈ کار کی جگہ ایک چلتی پھرتی موٹر والوں کی ڈسپنسری ہے۔ اس سپاہی کے آتے ہی سب کچھ ٹھیک ہوگیا اور بیس منٹ میں ہم بروک ووڈ (Brook wood) کے قبرستان جا پہنچے۔ ووکنگ کی مسجد کے امام صاحب نماز جنازہ پڑھا چکے تھے البتہ ان کے صاحبزادے وارث امیر علی صاحب مع اپنی والدہ ماجدہ کے اس وقت تک وہاں موجود تھے۔ چنانچہ قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد میں ان کے پاس گیا اور تعزیت کی۔ اس قبرستان میں ہزاروں ہی قبریں ہیں اور اس شہر خموشاں کا نام بھی (Necropolis) ہے۔ ریل کی پٹری اس کے اندر تک آتی ہے نہایت وسیع میدان میں باغ لگایا گیا ہے جس کے چاروں طرف پختہ احاطہ کی دیوار ہے۔ نہایت عمدہ سڑکیں، روشیں چلنے پھرنے والوں کے لیے بنادی گئی ہیں بلکہ گھر آنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہم کو لنچ نہ ملنے کے

---

1 محمد رفیق صاحب دہلوی بیرسٹرایٹ لا۔ مدتوں اودھ میں جج رہے اور پھر الہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہوگئے تھے۔ اس وقت انڈیا کونسل کے ممبر کی حیثیت سے لندن میں رہ رہے تھے۔

باعث جو جائے کے وقت وو کنگ جا کر انڈے وغیرہ تلوانا پڑے تھے، اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس شہر خموشاں کے اندر ایک اچھی خاصی ریسٹوران بھی موجود تھی جہاں لنچ کھایا جاسکتا تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا حصہ مسلمانوں کی قبروں کے لیے بھی ہے اور حصہ پارسیوں کی قبروں کے لیے اور اسی طرح ایک حصہ ہندوؤں کی قبروں کے لیے ہے۔ مگر سید امیر علی صاحب نے عین حیات ہی میں ایک قطعہ اپنے اور اپنے خاندان والوں کے لیے اس طرف خرید لیا تھا جہاں متمول عیسائی دفن ہوتے ہیں۔

یوں تو تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والی کمپنی نے سب کچھ کر لیا ہے لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ قبر کا رخ کسی قدر غلط تھا۔ لیکن الحمدللہ کچھ زیادہ غلطی نہ تھی۔ دفن کرتے وقت قطب نما تلاش کی گئی اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ قبر کی سمت میں صرف تھوڑی سی کجی تھی، زیادہ نہ تھی اور امام صاحب نے میت کا منہ صحیح طور پر قبلہ کی سمت موڑ دیا تھا۔ ہم لوگ جب پہنچے تو قبرستان میں پندرہ بیس ہی آدمی رہ گئے تھے جن میں ایک لارڈ ہیڈ لے [1] اور پنجاب کے سابق لیفٹنٹ گورنر سرلوئی ڈین تھے۔ لارڈ ہیڈ لے کے پاس ہی ایک اور بزرگ بھی تھے جن کا اسم گرامی انگلستان کے اخبارات اور رسالوں میں یا تو جنگ افغانستان کے بعد یکا یک نظر آنا شروع ہوا تھا یا اب پھر دو سال سے مکہ معظمہ کی موتمر عالم اسلام کے بعد سے زیادہ تر اسی سلسلے میں پھر نظر آنے لگا ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ بزرگ کون ہیں۔ یہ ''سردار'' اقبال علی شاہ صاحب تھے، چونکہ اس سے ایک ہی روز پیشتر مجھ سے ان بزرگ کی ٹیلیفون پر گفتگو ہو چکی تھی جس کے متعلق ابھی کچھ عرض کروں گا۔ اور مجھ سے مایوس ہو چکے تھے، اس لیے اس بار علیک سلیک کی نوبت نہ آئی۔ سرلوئی ڈین صاحب [2] نے مجھے پہچان کر اردو میں مزاج شریف کہہ کر میرا حال دریافت فرمایا اور فرمایا ہاں میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں جواب میں الحمدللہ کہہ کر اور ان سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھا۔ مجھے امیر علی صاحب کی قبر کا اور مسلمانوں کی قبروں کا اتنے فاصلے پر ہونا اور متمول انگریزوں کی قبروں سے اس قدر متصل ہونا کچھ زیادہ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ مسلمانوں کی قبریں

---

[1] برطانیہ کا وہ امیر جو اس وقت تک باضابطہ مسلمان ہو چکا تھا۔ اسلامی نام ''فاروق'' تھا۔

[2] سابق گورنر پنجاب۔ اردو و فارسی سے بھی واقف تھے۔

غالباً پہلے یہاں نہ تھیں۔ جتنے کتبے ملے ان سب کو میں نے پڑھا اور معلوم ہوا کہ سب سے پرانی قبر ایک خاتون ضعیفہ احمد فارسی کی ہے۔ جس وقت یہ بیچاری دفن ہوئی تھیں اس وقت شاید کسی کے پاس قطب نما بھی نہ ہوگی۔ اس لیے قبر کی سمت صحیح نہیں ہے۔ اس کے پاس ہی بمبئی کے مشہور و معروف اور نہایت قابل مسلمان ڈاکٹر حبیب جان محمد صاحب کی قبر ہے، جن کا یکا یک ذیابیطس کے عارضہ میں نیشنل لبرل کلب میں انتقال ہو گیا تھا۔ اسی قبرستان میں حیدر آباد کے خطیب امجد حسین کھوکھر ضلع جہلم کے شیخ عبدالحمید اور راندھیر کے داؤد ابراہیم مولانا کی بھی قبریں ہیں جن میں سے مؤخر الذکر کا موٹر کے تصادم سے اسی سال انتقال ہوا ہے۔ اور ان کے ایک رفیق جو اسی تصادم میں زخمی ہوئے تھے اس بار ہمارے شریک سفر تھے۔ ان ہی قبروں میں ایک قبر مصطفےٰ صبحی منزدی کی ہے جو مصری تھے۔ ان کے نزدیک قبر آغا خاں صاحب کے چچازاد بھائی اور حاجی بی بی صاحبہ کے بھائی آغا شمس الدین شاہ کی بھی ہے۔ اس قبر پر غالباً آغا خاں کی طرف سے یہ عبارت کندہ کی گئی ہے:

برادرم عزیزم

زرفتن تو من از عمر بے نصیب شدم
سفر تو کردی و من در وطن غریب شدم

آغا خاں صاحب کو کون غریب کہے گا لیکن ان کی ''غریب الوطنی'' اب ایک ضرب المثل ہے۔ نہ معلوم اس شعر میں کس وطن کی غربت کی طرف اشارہ ہے۔ ان بڑی بڑی پختہ قبروں کے علاوہ کتنی ہی کچی قبریں بھی ہیں اور چند پر بظاہر حکومت کی طرف سے دوران جنگ میں لوح مزار بھی لگا دی گئی۔ چنانچہ حسب ذیل فوجی یہاں دفن ہیں۔...... میں ان سب کے لیے فاتحہ پڑھ کر کے آیا ہوں اور ان کے نام اس لیے لکھ لایا ہوں کہ اگر ''ہمدرد'' کے ذریعہ سے ان کے دور افتادہ پسماندوں کو جن میں سے شاید ہی کوئی ادھر آ نکلے، اطلاع مل جائے کہ ایک مسلمان ان کی قبروں پر فاتحہ پڑھ آیا ہے تو غالباً انھیں خوشی ہوگی [1]۔

---

[1] اتنی محنت و زحمت جس نے محض قلوب مسلمین کی تطییب کے لیے برداشت کیا، اس کے اجر کا کیا ٹھکانا!...... ہمدرد میں یہ سارے نام چھپے تھے یہاں حذف کر دیے گیے۔

ان مسلمانوں کی قبروں میں ایک عجیب قبر پر بھی نظر پڑی، وہ ایک ہندو سپاہی کی تھی جس پر انّا للہ وانّا الیہ راجعون کی جگہ...... کھدا ہوا تھا۔ نہ معلوم یہ ادم بھگوتی نام تو نہیں اور ادوم کی جگہ غلطی سے فقط...... کھد گیا۔

مجھے اس وقت اس کی اطلاع نہ تھی کہ یہاں ہنود کا بھی کوئی قبرستان ہے۔ اور قیاس بھی اس کے خلاف تھے۔ اس لیے کہ ہنود کے مردے تو جلا دیے جاتے ہیں۔ اس لیے صرف ایک ہندو کی قبر کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ اس کا نام موتی رام 112۔ انفنٹری...... کھدا ہوا تھا۔ جب ہم وہاں سے چل دیے تو معلوم ہوا کہ ایک حصہ ہنود کی قبروں کے لیے بھی ہے اور وہاں ہنود کی قبریں بھی موجود ہیں۔

مسلمانوں سے کچھ فاصلہ پر پارسیوں کی متعدد قبریں ہیں اور یہ حصہ بہت ہی زیادہ شاندار ہے۔ سب سے زیادہ عظیم الشان قبر تو واڈیا صاحب کی ہے جس کے متعلق ابھی عرض کروں گا۔ اس کے علاوہ ایک مسقف حجرہ کے اندر رسر رتن ٹاٹا کی قبر ہے اور دوسرے میں ان کے والد ماجد جمشید جی نوشیروان جی ٹاٹا کی قبر ہے۔ اس کے سامنے جمشید جی کی ہمشیرہ مسز داراب جی سکلا نوالہ کی قبر ہے جس پر ان کا مجسمہ (صرف سر اور گردن وغیرہ) پتھر کا کھدا ہوا الٹا دیا گیا ہے۔ داراب جی صاحب کی بھی وہیں قبر ہے۔ غالبًا یہ شاپور جی کے والد ماجد اور والدہ ماجدہ کی قبریں ہیں۔ مسز داراب جی کے چہرہ پر اور بالخصوص آنکھ کے پاس کسی پرند کی بیٹ پڑی ہوئی تھی جسے میں نے وہاں سے علاحدہ کر کے صاف کر دیا اور شاپور جی کے لیے دعا مانگی کہ یہ بہادر اور سچا ہمدرد نوع انسان اور محب وطن انسانوں اور ہندوستانیوں کی کامیابی کے ساتھ خدمت کرتا رہا۔

مگر دیکھنے کے قابل واڈیا صاحب کی عالیشان قبر ہے۔ اس شہر خموشاں میں آنسو گرانا تعجب کی بات نہیں، مگر ہنسی آنا ضرور تعجب انگیز ہے۔ لیکن ہم میں سے ایک بھی اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا، جب کہ ہم نے ایک جانب اس کتبہ کو پڑھا:

I am Nowrosji Noshirwanji wadia of the ancient Aryen race of Perisa. A citizen of the Loyal town of Bombay, who lies here peacefully under the far off sky of wide famed britain.

(اس کا ترجمہ آپ ہی فرمائیں) نہ معلوم وہ بمبئی جس میں نریمان اور بھروچہ جیسے پارسی آج

بھی ہیں جس میں دادا بھائی نوروز جی اور فیروز شاہ مہتا اور جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا اور رتن ٹاٹا جیسے پارسی گزر چکے ہیں، وہ واڈیا صاحب کے اظہار وفاداری اور اس پر اس قدر اصرار کے متعلق کیا کہے گا۔ کیا بمبئی میں صرف جنس وفاداری ہی ملتی ہے۔ حق پرستی حب وطن اور حریت کی جنسوں کا وہاں کال ہے؟ برطانیہ کی شہرت یقیناً دور دور تک پھیلی ہوئی ہے خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے آسمان کو کیوں ''دور'' کیا گیا ہے۔ ہر جگہ کا آسمان وہاں کی زمین سے یکساں فاصلہ پر ہوگا، یہ برطانیہ کا آسمان اس قدر دور کیوں ظاہر کیا گیا؟ اس کے کتبہ کو جس نے پڑھا وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ مگر آنجہانی واڈیا صاحب کا اس میں قصور نہیں ہے۔ ''مردہ بدست زندہ'' بظاہر ان کے کسی ''وفادار'' پسماندہ نے ان توقعات کی بنا پر جو انھیں ''دور دور مشہور برطانیہ'' سے ہیں، برطانیہ کے آسمان اور ''وفادار'' بمبئی کی زمین کی اس طرح مٹی پلید کی ہوگی لیکن یہ عبارت بظاہر کسی پارسی کی بھی تصنیف کردہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ باقی تین جانب جو اور ہیں ان کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو زندہ واوستا سے کہیں زیادہ بائبل پر عبور ہے۔ ''ہرمز'' کا نام تو صرف ایک جگہ آیا ہے لیکن Serious father of his children اور Rodumous کی بار بار تکرار کی گئی ہے اور اسی طرح Lord God کی۔ اور ذیل کی عبارت کو پڑھیے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ کسی عیسائی کی تصنیف کردہ ہے:

These who opened the gate of the morning O, then some of the righteous with hearing in thy wings and lift up the light of thy countenance on us that in thy light we may see the light of life everlasting.

ہم یہاں سے چلے تو لڑکوں کو بھوک لگی تھی۔ اس لیے وو کنگ میں داخل ہوتے ہی کاریج ہوٹل ملا۔ وہاں موٹر رکی اور ہوٹل میں داخل ہو کر خانساماں یا ''خانم سامان'' کی تلاش کی۔ ایک میم صاحبہ جو غالباً مالکہ تھیں، نکل آئیں اور پہلے تو چائے پینے کا وعدہ فرمایا لیکن جب میں آگے بڑھا اور میں نے پوچھا کہ کچھ اور بھی ہمت ہوگی۔ یہ لڑکے بھوکے ہیں، لنچ اب تک نہیں کھایا ہے تو انھوں نے گھبرا کر چائے دینے سے بھی انکار فرما دیا۔ ہم سب کا قیاس ہے کہ انھیں ''شیخ'' سے

خوف آیا اور ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں شیخ اپنی عبا میں ہوٹل کے چھری کانٹے اور چمچے دبا کر نہ لے جائے یا کہیں مالکہ ہی کا مالک نہ بن بیٹھے، میں نے دو تین دن ہوئے اپنے مکان سے قریب ہی سینما میں وہ فلم دیکھا جس کا "The Shaikh's son" عنوان ہے اور جس میں رڈلف ویلنٹینو آنجہانی مراقش کے ایک نوجوان ''شیخ زادہ'' کا پارٹ کرتا تھا۔ ان فلموں کو دیکھ کر کچھ تعجب نہیں۔ اگر ان مالک والے اس اندیشہ سے متردد ہوں کہ اگر شیخ زادوں کی دراز دستیاں یہ ہیں، تو نہ معلوم خود ''شیوخ'' کی دراز دستیاں کیسی ہوں گی۔ جی میں آیا کہ ہوٹل کی مالکہ صاحبہ کو مجبور کیا جائے کہ قانون کی رو سے وہ ہمارا مطالبہ مسترد نہ فرمائیں لیکن ان کی سراسیمی پر رحم آیا اور قصبے میں آگے جا کر ریسٹوران میں چائے پی گئی، سلاد کھایا گیا اور انڈوں کے آملیٹ (جس کو خانساماں ''مالیٹ'' کہتے ہیں) لڑکوں کو کھلائے گئے۔ چکھ میں نے بھی لیا۔

اب ذرا ''سردار'' اقبال علی شاہ صاحب کا حال سنیے۔ آپ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ ان ''خوردوار'' [1] نے علی برادران کے خلاف کیا کیا زہر اگلا ہے۔ یہ افغانوں کے اس مشہور خاندان کے ایک سپوت ہیں، جو غالباً حکومت افغانستان کے خلاف کچھ کارروائی کر کے ہندوستان کو بھاگ آیا تھا اور یہاں سردھنہ ضلع میرٹھ میں آ کر پناہ گزیں ہوا تھا۔ اس خاندان کے بہت سے افراد سے مجھے نیاز حاصل ہے۔ اور بعض تو علی گڑھ میں ہمارے ساتھ پڑھے بھی ہیں۔ ''سردار'' اقبال علی شاہ صاحب بھی علی گڑھ کے پرانے طالب علم ہیں اور جب میں 13 میں یہاں سید وزیر حسن صاحب کے ساتھ آیا تھا تو اس وقت آپ ایڈنبرا میں تعلیم پاتے تھے۔ امتحان تو شاید یہاں ایک بھی پاس نہ کیا مگر ایک میم صاحبہ سے شادی ضرور کر لی۔ سنا ہے کہ ایک عرصہ تک تو ان کے والد ماجد نے جو تحصیلدار تھے کچھ روپیہ بھیجا لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان کے علی گڑھ کے ایک رفیق کے پاس ان کا ایک طول وطویل خط آیا ہے جس میں انھوں نے اپنی اقتصادی مشکلات کی داستان کو دہرایا ہے اور پھر بتایا ہے کہ کس طرح غازی امان اللہ خاں کے اعلان جنگ کے بعد ان مشکلات کا حل اس طرح نکل آیا کہ انھوں نے یہاں کے اخبارات کو برطانیہ کی تائید میں مضامین بھیجے جو پہلے مسترد ہوتے رہے لیکن بعد کو انڈیا آفس کے ایما سے (اور مجھے یقین ہے کہ

---

[1] ''بزرگوار'' کے مقابل کا لفظ۔ مولانا کو ایسے ''متقابلات'' کے گڑھنے میں ملکہ تھا۔

''اصلاح'' کے بعد)) شائع ہونے لگے۔ جب میں 1920 میں پھر یہاں آیا تو یہ بھی مجھ سے ملنے کے لیے آئے مگر میں نے التفات نہیں کیا، البتہ حیات صاحب کی مروت نے انھیں مجبور کیا کہ ملاقات سے انکار نہ کردیں۔ اس لیے دو ایک بار آپ ہمارے مکان پر تشریف لائے۔ 1925 میں آپ مجھ سے دہلی میں ملے اور کامریڈ کے اسٹاف میں نوکری کی خواہش کی اور نمونتاً ایک مضمون بھی لکھ دیا۔ میں اگر ان پر اعتماد کربھی سکتا تب بھی اس مضمون نے ان کی قابلیت کی ایسی قلعی کھول دی کہ ان کو نوکری دینا میرے لیے ناممکن ہوگیا اور زیادہ سے زیادہ یہ کرسکا کہ ان کے سخت اصرار پر ان کے مضمون کی عبارت کو بار بار اصلاح دے کر اسے ''کامریڈ'' میں چھاپ دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے خود "The New Spectator" کا ایک ہفتہ وار پرچہ نکالنا شروع کیا جس کو یہ میرے نام بھی بھیجتے رہے۔ پہلا پرچہ بھیجتے وقت جو خط میرے نام ارسال فرمایا تھا، اس میں میرے ساتھ اپنی عقیدت مندی کا بہت کچھ اظہار فرمایا ہے۔ لیکن اس پرچے کے پہلے ہی صفحہ پر آپ کا پہلا ہی نوٹ شوکت صاحب کی مذمت میں تھا۔ جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس پرچے کی اشاعت کی غرض کیا تھی۔ نواب صاحب بھوپال کے خلاف ہر پرچے میں زہر اگلا جاتا تھا۔ اوران کے بھتیجے کو ریاست کا حقدار بتایا جاتا تھا۔ چند ماہ بعد آپ نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ کا یہ پرچہ میں اپنے پریس میں شائع کیا کروں۔ جس سے میں نے فوراً ہی انکار کردیا۔ اس کے بعد یہ پرچہ شائع ہونا بند ہوگیا۔ اگر کسی شخص کو یہ حسن ظن ہو کہ جو مضامین آپ کے نام نامی سے یہاں کے اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں وہ آپ ہی کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ دفتر ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' سے "The New Spectator" کی فائل منگا کر اپنی ضعیف الاعتقادی کی اصلاح کرسکتا ہے۔ خیالات پریشان اور رکیک۔ عبارت بے ربط اور ناقص۔ یہ آپ کی حقیقی قابلیت کے ثبوت میں موجود ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی کسی کو مزید ثبوت درکار ہوتو وہ مئی یا جون 20ء کی پایونیر کی فائل اٹھا کر دیکھ لے۔ جس میں ایک پرچہ کے پڑھنے والے کو پہلے ہی صفحہ پر ایک اڈیٹوریل نوٹ ملے گا جس میں میرے ایک خط کا جو میں نے یہاں سے شوکت صاحب کے نام لکھا تھا، مذاق اڑایا گیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ پرچہ میری نظر سے گزرا تھا لیکن اسی نوٹ کے بعد ایک اور نوٹ بھی ہے جس میں ''سردار'' اقبال علی شاہ وسط ایشیا کے

expert (ماہر) کے ایک مضمون کے متعلق جو یہاں ایک مصور پرچہ میں مع چند تصاویر کے شائع ہو چکا تھا، درج ہے کہ اس میں جو تصویر دی گئی ہے وہ یقیناً سردار صاحب نے اپنے سفر کے ایام میں ہرگز نہیں کھینچی تھی۔ نہ اس مقام کی تصویر ہے جس کا سردار صاحب نے ذکر فرمایا ہے بلکہ اس سے بہت دور ایک اور مقام کی تصویر ہے۔ ایک اور فوجی افسر کی کھینچی ہوئی ہے جو اس کی ایک تصنیف کردہ کتاب میں شائع ہو چکی ہے۔ اور اس کے فلاں صفحہ پر موجود ہے اور ہمارے وسط ایشیا کے محقق ایک سارق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ کے اخبار بند ہونے کے بعد آپ کی میم صاحبہ ہندوستان سے ولایت چل دیں اور اس ''جنوری'' کے ''دسمبر'' کی طرح۔

سالہا سال ہوئے ہیں ترے پیچھے پھرتے

جنوری تو ہے تو اب ماہ دسمبر میں ہوں

آپ نے تعاقب کی ٹھانی۔ سنا گیا ہے کہ والد صاحب سے روپیہ کا پھر مطالبہ کیا گیا اور جب ان غریب نے کہا میرے پاس روپیہ کہاں تو ان کو دھمکی دی گئی کہ اگر روپیہ نہیں دیا گیا تو ایک دیوانی کے مقدمے میں فریق ثانی کی طرف سے ان کے خلاف گواہی دے دی جائے گی۔ اس پر ان کے دوستوں نے کہا بھائی کہیں سے قرض دام لے کر دے دو ورنہ مقدمہ بگڑ جائے گا۔ چنانچہ کچھ روپیہ اس طرح ملا۔ اس کے بعد بمبئی تشریف لائے تو حبیب الرحمٰن خاں صاحب (نواب حیدر یار جنگ بہادر) جو یقیناً ان کے والد ماجد کو ان کی علیگڑھ کی تحصیلداری کے زمانہ سے جانتے تھے، عازم حج نظر آئے۔ پھر کیا تھا، آپ نے فرمایا کہ حضرت عجیب بات ہے میں بھی احرام سفر باندھ کر آیا ہوں مگر جدہ کا ٹکٹ نہیں ملتا۔ انھوں نے کہا بھائی ایک ٹکٹ تو میرے پاس ہے چنانچہ اس ٹکٹ کو لے کر آپ نے مکہ معظمہ کا قصد فرمایا اور ان ہی کے طفیلیوں میں آپ جلالۃ الملک عبدالعزیز آل سعود ملک الحجاز والنجد وملحقاتہا کے ''مہمان'' بنے اور ان سے مکہ معظمہ میں ملاقات کی۔ اور ایک دن جو غالباً پہلا ہی دن تھا ان کے ہمرکاب آپ موتمر عالم اسلام میں بطور رپورٹر کے شریک ہوئے۔ یہ باتیں میں نے مکہ معظمہ ہی میں سنی تھیں۔ مگر چونکہ میں نے خود تحقیقات نہیں کی ہے اس لیے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ کہاں تک صحیح ہیں۔ مکہ معظمہ پہنچ کر آپ ہم سے بھی ملنے آئے۔ وہاں پہلے ہی سے متعدد جواسیس دور دور مشہور برطانیہ کے موجود تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی ہم سب

بول اٹھے آہا آپ بھی تشریف لائے۔ آپ ہی کی کسر تھی۔ کم از کم مکہ معظمہ میں تو نہ انگریزی ٹوپی ’’برسر‘‘ تھے اور نہ لباس انگریزی ’’دربر‘‘ غالباً ٹوپی تو ترکی تھی۔ اور ریشم کا لانبا کوٹ تھا اور ٹانگوں میں شلوار۔ لیکن اس بد بخت کی کم نصیبی کو کیا کہا جائے گا جو اس طرح مفت سفر کرے بھی حج سے دو دن پہلے جدہ کو چل دے اور وہاں سے عازم یورپ ہو جائے۔

جو ’’ٹائمز‘‘ کے مضامین ماجد میاں نے مجھے ارسال فرمائے تھے ان میں سے ایک مضمون میں ایک عبارت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موتمر عالم اسلام کے جلسے اس ترکی قلعے میں منعقد ہوئے تھے جو پہاڑ پر واقع ہے۔ حالانکہ سارے جلسے جیاد کے میدان والی کشلہ یا ترکی فوجی بارک میں ہوئے تھے جو اس پہاڑ اور قلعے کے نیچے واقع ہے۔ اس عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مضمون کا لکھنے والا کوئی ایسا شخص ہے جس نے اس قلعے کی تصویر ہی دیکھی ہے اور غلطی سے ترکی کشلہ کو ترکی قلعہ سمجھ گیا ہے اور خود موتمر میں ہرگز موجود نہ تھا۔ حالانکہ ’’سردار‘‘ صاحب ایک دن ضرور وزیٹر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے یعنی نام تو آپ کا تھا مگر کام کسی انگریز کا تھا۔ آپ کا کام صرف اس قدر تھا کہ شوکت علی محمد علی کے خلاف چند جھوٹی باتوں سے کڑھ کر دشمنان اسلام اور دشمنان ہندوستان کے ہاں فروخت فرما دیں۔ اس موتمر کے بعد آپ کے خلاف 25-20 مضامین شائع کر دیے ہوں گے۔ اور اس کے بعد آپ کا ایک لکچر ساؤتھ فیلڈ کی اس قادیانی مسجد میں زیر صدارت سر مائیکل اوڈ ائر سابق لفٹنٹ گورنر پنجاب دلوایا گیا تھا جس کے افتتاح کا وعدہ کر کے شہزادہ فیصل ابن عبدالعزیز آل سعود نے بالآخر انکار کر دیا تھا اور جس کے لیے قادیان سے میرے پاس ایک تار آیا تھا کہ میں سلطان ابن سعود کو پھر آمادہ کروں کہ وہ اپنے صاحبزادہ کو اس مسجد کے افتتاح کی اجازت دے دیں۔ مضامین اور لکچر دونوں علی برادران کی مذمت سے بھرے ہوئے تھے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس مکان کی مالکہ صاحبہ نے سب سے اوپر کی منزل سے سب سے نیچے کی منزل میں یہ کہلوا کر طلب فرمایا کہ ایک صاحب آپ سے ٹیلیفون پر بات کرنا چاہتے ہیں اور ان صاحب نے فرمایا کہ میرا نام اقبال علی شاہ ہے۔ ٹیلیفون پر جو مکالمہ ہوا، اب اسے سنیے:

سردار اقبال علی شاہ: مولانا السلام علیکم۔ معاف فرمایئے گا میں نے آپ کو تکلیف دی۔

محمد علی: وعلیکم السلام

س۔ا۔ع۔ش۔ مجھے اس کا علم نہ تھا کہ آپ کو اوپر سے نیچے آنا پڑے گا، میں سمجھتا تھا کہ ٹیلیفون آپ ہی کے کمرے میں ہے۔

م۔ع۔ ارشاد فرمائیے

س۔ا۔ع۔ش۔ فرمائیے آپ کا مزاج تو اچھا ہے

م۔ع۔ جی نہیں

س۔ا۔ع۔ش۔ امید ہے کہ آپ نے میرا قصور معاف فرما دیا ہوگا۔

م۔ع۔ جی نہیں۔

س۔ا۔ع۔ش۔ آپ کا قلب تو نہایت وسیع ہے۔

م۔ع۔ مگر میرا دماغ بالکل تنگ نہیں ہے۔

س۔ا۔ع۔ش۔ کیا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا ہوں۔

م۔ع۔ جی نہیں۔

س۔ا۔ع۔ش۔ میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ امید ہے کہ آپ نے میرا قصور معاف فرما دیا ہوگا۔

م۔ع۔ اور میں بھی پہلے عرض کر چکا ہوں، جی نہیں۔

اس کے بعد میں نے ان ذات شریف کو ان کے تمام مضامین یاد دلائے اور ان کا لکچر یاد دلایا اور کہا کہ میں تنگ دل نہیں ہوں لیکن اس قدر ضعیف الدماغ بھی نہیں ہوں کہ ایسے پاجیوں سے دھوکا کھا جاؤں۔ مجھے تعجب ہے کہ برطانیہ کے ایسے گرگوں کو جو اس کی طرف سے ایسے گندے کام اور جاسوسی کرتے پھرتے ہیں کیسے ہمت ہوئی کہ مجھ سے ٹیلیفون پر گفتگو کریں اور مجھ سے ملاقات کرنا چاہیں۔ میں نے کہا کہ اب اس سلسلہ کو ختم ہونا چاہیے اور میں نے ٹیلیفون کو فوراً منقطع کر دیا۔

اب اس خط کو بھی اسی خاتمہ بالخیر پر ختم کرنا چاہتا ہوں، ورنہ بیچاری بیگم صاحبہ کے نام دو سطریں نہ لکھ سکوں گا، مہاراجہ پٹیالہ کا لکچر اور ٹیکسی والے کی میرے ساتھ گستاخی اور اس کا ثمرہ اور

اس ثمرے کا جو ثمرہ بنگالی طالب علم اور مجھے چکھنا پڑا وہ داستان اس ہفتہ بھی ملتوی رہی۔ انشاء اللہ کل پرسوں اسے لکھ کر رکھوں گا تا کہ اگلے ہفتہ ضرور آپ تک جا سکے۔

''ہمدرد'' کی اشاعت کے متعلق کوئی صاحب کچھ تحریر نہیں فرماتے۔ پرچہ ماشاء اللہ خوب نکل رہا ہے۔ خرچ ظفر الملک صاحب کی ہمت سے گھٹ گیا ہے اور اس پر بھی دس صفحے نکل رہے ہیں۔ اور بارہ کا ارادہ ہے۔ خدا اجر خیر عطا فرمائے مگر یہ تو بتایئے مجھے کہ قدر دانی میں کس قدر اضافہ ہوا۔

اب آپ صاحبوں اور ''ہمدرد'' اور اسلام اور ہندوستان کے لیے دعا پر اس عریضہ کو ختم کرتا ہوں۔

آپ کا بھائی محمد علی

گذشتہ جمعرات یعنی 2 اگست کو میں دارالعلوم گیا تھا۔ جمعہ کو دارالعلوم کا آخری اجلاس تھا۔ اور سکلات والا [1] کے پیہم اعتراضوں اور سوالوں پر لیبرٹی نے محض نام کے واسطے بجٹ کے سلسلہ میں ہندوستان کا مسئلہ بھی چھیڑا۔ صرف دو گھنٹے ایک شب ہندوستان کے 32 کروڑ انسانوں کے لیے بھی وقف کیے گیے۔ مگر وہ بھی آخری اجلاس میں اور کنزرویٹو فرقہ والوں نے عمداً کنیڈا کو انگریزی مزدور بھیجنے کے سلسلہ میں فضول تقریریں کر کے اور وزیر محکمہ کے جواب کے بعد بھی تقریر کے سلسلہ کو جاری رکھ کر اور خلاف انتظام طے شدہ یہاں کے سابق سپاہیوں کی سول سروس میں نوکری کے مسئلہ کو بھی اٹھا کر اتنی دیر لگا دی کہ ہندوستان کا ذکر خیر بجائے 9 بجے شب کے ساڑھے دس بجے شروع ہوا اور ساڑھے بارہ بجے ختم ہو گیا۔ رات کے بارہ بجے تک کی کارروائی اخبار ''ڈیلی ٹیلی گراف'' کی فائل کے ساتھ بھیج دی ہے اور باقی کارروائی یوسف حسین خان [2] (برادر ذاکر صاحب جو آج کل میرے ہمراہ اسی مکان میں مقیم ہیں) خرید کر کے غالباً آج ہی آپ کو روانہ کر دیں گے۔ سکلات والے کی تقریر بے مثل تھی۔ اور ارل ونٹرٹن نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ اس کا مطلق جواب نہ دیں۔ کل مباحثہ کا حال انشاء اللہ اگلے ہفتہ ارسال کروں گا۔

محمد علی

---

[1] بمبئی کے ایک پارسی، جو مدت سے انگلستان میں قیام پذیر تھے، اور برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر بھی منتخب ہو گیے تھے سوشلسٹ خیال کے تھے۔ [2] یہ بعد کو فرانس کی کسی یونیورسٹی سے ایم، اے، اور پی، ایچ، ڈی کی ڈگریاں لے کر آئے اور اس وقت تک عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ وسیاسیات کے استاد ہیں۔ 1952۔

باب:75

7:1928

(دیارفرنگ سے)

خط میں حشو وزوائد آج یقیناً بہت سے معلوم ہوں گے لیکن اب اسے کیا کیجئے کہ زمانہ کا امتداد ہر لحہ اور ہر آن۔ ہر ''تازگی'' کو ''باسی پن'' میں، ہر شادابی کو پژمردگی میں تبدیل کرنے میں لگا رہتا ہے، زمانہ کی گردش اور وقت کے چکر کو کون روک سکا ہے؟ اس وقت عین یہی چیزیں نہایت دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔ اور ان خطوں کی ایک ایک سطر دلکشی اور جاذبیت رکھتی تھی.......... یہ خط موصول ہوہی چکا تھا کہ اسی کے دو چار روز بعد یہ دوسرا مکتوب بھی وصول ہوا۔ دلکشی و گہرائی میں اپنے پیش رو کے نقش قدم پر پڑھنے والے بھی اس سے لطف و نفع حاصل کریں گے، اب یہ تو اللہ جانے۔ ڈائری نویس سے تو بہر حال یہ ممکن نہیں کہ اسے بے درج کیے گزر جائے۔ حاضر ہے اور حسب معمول ضروری توضیحی حاشیوں کے ساتھ حاضر ہے۔ گوخود ان ضروری توضیحات کا معیار بھی گردش لیل و نہار کے ساتھ ساتھ بدل گیا ہے۔

....

راہی ملک جرمنی

16 اگست 1928

پیارے ماجد میاں، ظفر الملک صاحب اور جعفری۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ

میں 13 اگست کی شب کو لندن سے نکلا ہوں اور دو دن پیرس قیام کر کے تین "بچا چچ" کے ساتھ جرمنی جا رہا ہوں جن میں سے دو وہ صاحبین ہیں جن کے ساتھ میں لندن کے مکان میں رہا کرتا تھا اور ایک عبدالرحمٰن صاحب صدیقی 1 کے بھانجے محمد امین فقیہ صاحب صاحبزادہ ہے جو ہمارے فرانس کے حدود میں ترجمان اور سارے عالم میں ہمارے خزانچی ہیں۔ خالد صاحب 9 جولائی سے اپنے والد کے ایک دوست کے ترجمان اور رفیق سفر بن کر لندن سے نکلے تھے اور ان "چچا جان" کو مارسیلز تک پہنچا آئے تھے۔ اس کے بعد جب شوکت عمر صاحب "بٹرسی پالیٹکنک" سے جہاں وہ سات آٹھ ماہ سے پڑھ رہے تھے کامیاب ہو کر لندن یونیورسٹی کے سکنڈ ایئر میں داخل ہو گئے اور ان کے ساتھی اشرف صاحب کو لندن کاٹنے لگا، اور ہمیں ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھائی یوسف کے ساتھ چھوڑ جو پیرس کی سار بون یونیورسٹی سے دفتر وزیر ہند اور برٹش میوزیم میں مطالعہ کرنے آئے ہیں۔ پہلی اگست کو پیرس چلے آئے تھے میرا ارادہ تھا کہ پہلی ستمبر تک لندن رہ کر کرنل آسٹن سے علاج کراتا رہوں اور اس کے بعد فرانس آ جاؤں اور بالآخر ایک ہفتہ اٹلی رہ کر عازم ہندوستان ہو جاؤں، البتہ راستہ میں ایک ہفتہ شہر مصر میں بھی قیام کروں اور اگر کچھ پیسے بچ سکیں تو فلسطین بھی ہوتا آؤں لیکن اگست کا مہینہ لندن والوں کے لیے چھٹی کا مہینہ ہوتا ہے اور غریب اور امیر، مرد اور عورت اور بچے دو تین دن سے لے کر دو ماہ تک کے لیے لندن سے باہر سمندر کے کنارے یا کسی اور تفریح گاہ کو چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ کرنل آسٹن صاحب بھی 11 اگست سے 10 دن کے لیے انگلستان کے مشہور اور قدیم جنگل "نیوفارسٹ" میں چلے گئے ہیں۔ یہاں ووکنگ کے امام صاحب نے اصرار فرمایا کہ عید میلاد کے جلسہ تک جو 8 ستمبر کو ہونے والا ہے لندن میں قیام کروں اور اس جلسہ میں ایک تقریر کرنے کے بعد انگلستان سے رخصت ہوں۔ جب

---

1 علی گڑھ کے مشہور اولڈ بوائے۔ ایک زمانہ میں مولانا کے رفیق خصوصی تھے۔ مدتوں کلکتہ میں رہے، صدر کلکتہ کارپوریشن، ایم، او، اے، ایڈیٹر "مارننگ نیوز" وغیرہ۔ اس وقت غالباً کراچی میں ہیں۔ 1952

میں قاہرہ گیا تھا تو ڈاکٹر احمد فواد نے سخت اصرار کیا تھا کہ یورپ چھوڑنے سے پیشتر جرمنی کے مشہور فرینکفرٹ کے ذیابیطس کے ماہر ڈاکٹر پروفیسر فان نارڈن کو بھی اپنا حال سناتا آؤں اور گو میں کہہ چکا تھا کہ میں علاج صرف کرنل آسٹن کا کروں گا لیکن ان کے اصرار پر اس کا وعدہ کر چکا تھا کہ ان سے اپنا طبی معائنہ ضرور کرالوں گا تاکہ معلوم ہو جائے کہ کرنل آسٹن کے علاج کے بعد اب حالت کیسی ہے۔ اس لیے گذشتہ ہفتہ میں ایک دن جا کر اپنے پاسپورٹ بھی بلجیم، جرمنی اور ہالینڈ کے لیے بھی توسیع کرالیا۔ عجیب حسن اتفاق ہے کہ دوسرے ہی دن جرمنی سے چٹو پدھیا صاحب مسز نائیڈو کے بھائی کی دعوت بھی آئی۔ میں ان کا دعوت نامہ اور اس پر میں نے جواب لکھا تھا دونوں ملفوف کیے دیتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دعوت کس قسم کی تھی اور میں نے اس کا کیا جواب دیا۔ مجھے اس وقت ترجمہ کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ آپ حضرات خود ترجمہ کر سکتے ہیں ورنہ میں اس کا خلاصہ اس خط میں دے دیا ہوتا۔ میں 11 ہی کو روانہ ہو گیا ہوتا مگر بیگم صاحبہ کو جو تار گزشتہ بدھ کو دیا تھا اس کے جواب کا پیر تک انتظار تھا۔ گو گزشتہ ہفتہ کے تار کا جواب نہ آنے سے تقریباً مایوسی ہو چکی تھی اور میں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ وہ میجر سعید محمد خاں[1] کے ساتھ جو بھوپال سے 4 اگست کے جہاز میں روانہ ہو رہے ہیں، مع لڑکیوں کے نہیں آرہی ہیں۔ 13 اگست کو ان کا جواب بھی آ گیا کہ روپیہ کا کوئی بندوبست نہیں ہو سکا اور میں نے حمیدہ بی کو خدا پر چھوڑ خود جرمنی جانے کے لیے رخت سفر باندھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں چٹو پدھیا صاحب کا تار بھی برلن سے آ گیا کہ سب انتظامات کر دیے گئے، چنانچہ وقت بچانے کے لیے اسی شب کی گاڑی میں یوسف صاحب سے رخصت ہو کر روانہ ہو گیا۔ یہ راستہ ساؤتھمپٹن اور اوروے ہو کر آتا ہے۔ اور چینل (رود بار انگلستان) کے عبور کرنے میں چھ گھنٹے لگتے ہیں۔ یہ عام طور پر لوگ اس سے گھبراتے ہیں لیکن وقت کی بچت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ رات کو ڈوور کے لیے ہو کر اور فاک اسٹون بولون ہو کر سفر کیا جا سکتا ہے۔ راستہ میں بڑی خیر ہو گئی۔ ساؤتھمپٹن کے اسٹیشن پر کوئی قلی نہ ملا۔ اس لیے اپنے ہینڈ بیگ وغیرہ اور سوٹ اٹھا کر میں بھی اور مسافروں کے پیچھے ہولیا اور ان ہی کے ساتھ ایک کشتی پر سوار ہو گیا۔ اگر جاتے ہی سونے کے لیے کیبن نہ مانگا جاتا تو بجائے فرانس کے میں جزائر چینل

---

[1] علی گڑھ کے مشہور اولڈ بوائے، خورجہ کے رہنے والے۔

پہنچ گیا ہوتا۔ جب میں نے کشتی پر سوار ہو جانے کے بعد اپنا ٹکٹ کرہ لینے کے لیے دکھایا تو پتہ چلا کہ

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی　　　کین رہ کہ تو میروی بترکستان است

فوراً اتر کر اس طرف گیا جہاں ایک دوسری کشتی فرانس جانے کے لیے کھڑی تھی۔ غریب فرانسیسی مزدور کو تو 5 فرانک مزدوری کے مل جاتے ہیں۔ اسے غنیمت سمجھتے ہیں، لیکن یہاں کے قلیوں کے لیے دو شلنگ بھی مشکل سے کافی ہوتے ہیں۔ اور استغنا کا یہ عالم ہے کہ مسافروں کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ رہے ٹیکسی والے تو اس جماعت میں تو ایسے خبیث بھرے ہوئے ہیں کہ کچھ ٹھکانا نہیں، ساری دنیا سے زیادہ بھاری ہست اور سڑیل ٹیکسیاں لندن کی ہیں لیکن کرایہ پیرس کی عمدہ ترین ٹیکسیوں سے بھی تگنا چوگنا ہے اور انعام بطور انعام کے قبول نہیں کیا جاتا بلکہ حق سے بھی زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر خوردہ لینا پڑتا ہے تو بڑے اصرار کے بعد ملتا ہے، ورنہ ایک شلنگ کا ڈیڑھ شلنگ کرایہ ہوا اور ڈھائی شلنگ دیا جائے تو ٹوپی چھو کر جیب میں رکھ لیتے ہیں اور نہایت اطمینان سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ ان ٹیکسی والوں کے متعلق انشاء اللہ آئندہ کسی خط میں تفصیل سے لکھوں گا اور وہ سارا قصہ دہراؤں گا جو مجھے پیش آیا اور جس کی بدولت لندن کے ایک پرجوش بنگالی طالب علم کو ٹیکسی والے کو دو پاؤنڈ بطور خرچہ دینے پڑے تھے اور مجھے ان کی حمایت کرنے والے سالسٹر اور بیرسٹروں کو ان کے گھنٹہ بھر کی محنت کے لیے پانچ پاؤنڈ سات شلنگ چھ پنس دینا پڑے تھے۔ 14 اکتوبر پیرس پہنچ کر اسی وقت راہیٔ فرانکفرٹ ہو گیا ہوتا مگر چٹو پدھیا صاحب کا جس کے متعلق انکا تار آیا تھا کہ اس میں ہدایات سفر ارسال کیے گیے ہیں۔ مجھے اس دن ٹامس کک کے یہاں سے نہ مل سکا۔ اس کے علاوہ 'بچا چیچ'' کو سین ژرمین کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ واپسی میں یکایک داہنے پاؤں میں درد شروع ہوا اور اس کے باعث شب کو حرارت ہو گئی۔ درد کل بھی رہا اور آج بھی باقی ہے اور قیاس یہی ہے کہ یہ سب ذیابیطس اور نیورائٹس کی علامت، چنانچہ آج شب کو فرانکفرٹ پہنچ کر کل صبح پیر بھی دکھاؤں گا۔ میری صحت کی عام حالت اچھی ہے۔ پچھلے فاقہ کے بعد ایک ہفتہ تک میں نے گوشت نہیں کھایا۔ بلکہ محض پھلوں اور بغیر پکی ہوئی ترکاریوں پر یعنی کھیرا دکگڑی وولایتی بیگن اور کاہو پر گزر کیا۔ قارورہ کا امتحان کرایا

تو شکر نصف فیصدی تھی اور چربی 100-70 فیصدی تھی۔ فاقہ کرنے کے بعد شکر بالکل نہ تھی اور چربی 100-3 فیصدی تھی، وزن مخصوصہ 4.16 سے بڑھ کر 6.16 ہوگیا۔ وزن تو نہیں بڑھا صرف چھ چھٹانک کی زیادتی ہوئی تھی مگر توقع کے خلاف کمر 12 انچ بڑھ گئی تھی، اور پاؤں کے تلوؤں میں اعصابی سوزش پھر کسی قدر شروع ہوگئی تھی۔ اس لیے میں نے پھر ڈاکٹر گالیا کے دستور کے مطابق سفر میں فاقہ شروع کردیا اور آج فاقہ کا چوتھا دن ہے۔ البتہ جس شب کو بخار آیا تھا اور سردی محسوس ہونے کے باعث ترکاری کا شوربا ''بچاچیج'' تیار کرالائے تھے۔ وہ پی لیا تھا مگر صبح ہی کو فروٹ سالٹ کا ایک مسہل اور لے لیا۔ رات اور پرسوں رات بھی بائیں پاؤں میں اعصابی سوزش ہوئی تھی۔ اس سے کچھ امید بھی بندھتی ہے کہ مرض کا فاقوں سے مقابلہ ہو رہا ہے اور ہزیمت اٹھانے سے پہلے مرض زور دکھا رہا ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ کل آپ کو خط لکھتا مگر اس درد کے باعث نہ لکھ سکا اور بجائے اس کے خالد کو ساتھ لے کر پیلیس نامی میوزک ہال دیکھنے چلا گیا۔ برادران من اب تو مدت سے کسی محفل رقص وسرود میں شریک نہیں ہوتا ہوں اور باوجود نفس امارہ کے بہت سے مطالبات کے انھیں پورا کرنے سے باز رہتا ہوں۔ ان ہی کیفیات قلبی کو ایک شعر میں اس طرح ادا کیا تھا۔

یکبارگی ہوس کے چھٹے سارے مشغلے
اے دل نگاہ یار بھی کیا سحر کر گئی

ہندستانی گانا سننے کو البتہ دل تڑپا کرتا ہے اور شوکت صاحب نے تو ایک دو بار نفس کو بہت ہی لالچ دلایا۔ اس لیے کہ گوہر جان [1] کی طرف سے وہ دعوت لائے تھے کہ کبھی کبھی تو گھر آکر دیکھ سن لیا کیجیے۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ سوائے اقبال کے اشعار کے اور حسرت کی غزلوں کے آپ کو کچھ اور نہ سناؤں گی۔ لیکن میں نے ضبط وصبر سے کام لیا اور کہلا بھیجا کہ اب تو معذور ہوں۔ البتہ جب کبھی کلکتہ جاتا ہوں تو پیارے صاحب [2] کا گانا ضرور سن لیا کرتا ہوں اور ''جنگ نگاہ'' نہ سہی ''فردوس گوش'' تو ضرور نصیب ہو جایا کرتی ہے۔ مہاراجہ الور کے ہمرکاب رامپور گیا تھا تو پہلی شب کو جب

---

1 کلکتہ کی بہت مشہور مغنیہ۔ مولانا یہ ذکر اپنے قیام کلکتہ کے زمانہ کا کر رہے ہیں یعنی 1911 کا، نہ کہ اگست 1928 کا، جو اس خط کی تحریر کا زمانہ ہے۔ 2 کلکتہ کے مشہور قوال

میں محفل رقص وسرود میں حاضر نہ ہوا تھا تو بلوایا گیا تھا۔لیکن جب میں نے عذر پیش کر دیا تو مہاراجہ صاحب نے اسے قبول فرمایا۔ بلکہ خود بھی اس کے بعد محفل رقص وسرود میں شریک نہ ہوئے اور اس کے عوض قوالی کی محفل اپنی قیام گاہ کے پاس ہی ہر شب کو منعقد کرائی۔ ہندستان میں جو تھیٹروں کی حالت ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔سینما میں بھی اکثر سوائے بوس وکنار کی تصاویر کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے میں سینما میں نہیں جایا کرتا۔اور ''بچا چچ'' کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا کہ میں نے آج تک چارلی چپلن 1 کو سینما میں نہیں دیکھا تھا اور گزشتہ ہفتہ ہی میں اپنے محلّہ کے ایک سینما میں ان کے فلم پروگرام میں دیکھتے ہی بس پر سے اتر پڑا۔ حالانکہ ٹکٹ پکاڈلی کے لیے تھا۔ تا کہ وہاں جا کر ایک تھیٹر میں سینما دیکھیں۔ البتہ میں سنجیدہ ڈرامے کا عاشق ہوں۔ اور ایلن میٹری جو ابھی انتقال کر گئی ہے اور ارونگ بیر بوہوم اور مسٹر ٹری فاربس رابرٹس اور مسٹر پٹرک اور پھر ان کی بیوی گرٹروڈ ایلیٹ ولسن بیرٹ اور نائد چیفر یز اور پھر لیلا میک کارتھی وغیرہ کو آکسفرڈ کی تعطیلات میں دیکھنے کے لیے بار بار تھیٹر جایا کرتا تھا۔ 1913 میں جب لندن آیا تھا تو مطلق فرصت نہ تھی۔ پھر بھی برنارڈ صاحب کے ایک تماشہ کو دوبارہ جا کر دیکھا، لیکن اب وہ بڑے بڑے ایکٹر باقی نہ رہے تھے۔1920 میں تو اتنی بھی فرصت نہ تھی جتنی کہ 1914 میں تھی، اور حقیقت میں دل بھی اب اس ڈرامے میں لگا ہوا تھا جس میں مصطفےٰ کمال پاشا اور ان کے ساتھی اناطولیہ میں ایکٹ کر رہے تھے۔ البتہ اس بار ذرا فرصت تھی اور ہنڈین میں طیاروں کے کرتب دیکھنے کے بعد شفیع کی رستوران میں ہندستانی کھانا کھا کر تھیٹروں کی طرف رخ کیا۔ مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ ''بچا چچ'' کے اصرار سے ہوبرن کے امپائر نامی میوزک ہال میں گیا اور بالکل خیال نہ رہا کہ یہاں تو محفل رقص وسرود گرم ہوتی ہوگی۔ جب وہاں پہنچ چکا تھا تو میری آنکھوں نے پہلی بار تھیٹر میں وہ نظارہ دیکھا جو کبھی جوانی میں بھی نہ دیکھا تھا۔ یعنی چند عورتیں ٹخنوں سے لے کر رانوں تک برہنہ ہمارے یہاں کی کبوتریوں کی طرح کرتب دکھا رہی ہیں۔ جب میں تیس برس پیشتر انگلستان آیا تھا تو میوزک ہال میں ہر رقاصہ ریشم کے ٹائٹ یعنی رانوں تک موزے پہنے ہوتی تھی۔ پھر بھی ایسے رقص گاہوں میں جانا ''رنگیلے پن'' کی علامت تھی۔ لیکن اب تھیٹروں میں برہنگی کیوں نہ آئے جب سمندر کے

1۔ انگلستان کا مشہور ترین طربیہ فلم ایکٹر

کنارے کے ہر تفریح گاہ میں ہزاروں عورتیں مردوں کی طرح سے بنیان جانگیا پہنے ان ہی کے ساتھ تیرتی پھرتی ہیں۔ اور اس کا نظارہ گو اب تک کسی بندرگاہ پر جا کر نہیں کیا ہے تاہم اپنے جہاز ہی پر ولایت آتے وقت دو تین میم صاحبان کو ڈک پر کرمچ کی حوض میں کودتے پھاندتے اور مردوں کی گردنوں پر سوار ہوتے دیکھ چکا تھا۔ آج کل ہر مصور اخبار میں ان ہزار ہا غسالجات کے حسن کی نمائش اور اس کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں ہر ہفتے چند پرچے مولانا عرفان کی خدمت میں بھیج دیا کرتا ہوں کہ وہ سمجھ سکیں کہ اب نوبت کہاں تک پہنچ گئی ہے۔

برادران من! حقیقت میں اب پردہ یہاں تک اٹھ چکا ہے کہ شب عروسی بھی بے نقاب نظر آتی ہے جب انگلستان کا یہ حال ہو، جہاں میری طالب علمی کے زمانے میں عورتوں اور مردوں کا ساتھ ساتھ نہانا قطعاً ممنوع تھا۔ حالانکہ اس زمانہ میں عورتوں کا سارا جسم ڈھکا ہوتا تھا، تو پھر آج پیرس میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ جب میں نے ''بجا پیچ'' سے سنا کہ وہ مولانا اوژ فولی بر ژیر جا کر اس عریانی کا نظارہ کر چکے ہیں تو میں نے بھی اس خیال سے

کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

فیصلہ کیا کہ پیلس جا کر دیکھوں تو کیا کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے ''پاری پلوریز'' نامی ایک رسالہ میں متعدد تصاویر دیکھ چکا تھا، جس میں دو مسماتیں ''وحید'' اور ''دیلی'' نامی بھی تھیں۔ ان کا لباس دیکھ کر مجھے اس امریکن عورت کا قول یاد آیا۔ جس نے لکھا تھا کہ ''ہاں میں جانتی ہوں کہ ہندوستان کا قومی لباس کیا ہے۔ ہندوستان کا قومی لباس ایک پٹکا اور ایک جیبی رومال ہے''۔ ان غیر مستورات کے سر پر بھی ایک پٹکا تھا اور باقی جسم کے لیے ایک نہایت مختصر سا جیبی رومال رہ گیا تھا۔ اس رومال کو رومالی کی جگہ دیکھ کر بے اختیار غالب کے شعر میں تصرف کرنے کو جی چاہتا تھا۔

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو معشوق کی خشفت ہونا

میں نہیں کہہ سکتا کہ ''خشفت'' کے ہجے کیا ہیں۔ آج تک کبھی لکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا مجھے تو یہ خیال تھا کہ یہ ہمارے روہیل کھنڈ والوں کی پشتو کا ایک لفظ ہے۔ اور خ ق اور ش ت کا اجتماع

یقیناً ''پختو'' پر دلالت کرتا ہے۔لیکن ''بچا چیچ'' نے تصدیق کر دی کہ یہ لفظ مستعمل عام ہے بلکہ پیش پا افتادہ ہے۔جس کا انگریزی ترجمہ شاید یہ ہوگا Worn Threadbare جو کچھ میں نے دیکھا اس کے صرف ایک حصہ کی تصاویر آپ کی خدمت میں ارسال کرتا ہوں۔اگر ان کے بلاک بھی مل جاتے تب بھی ''ہمدرد'' میں یہ تصاویر شائع نہ ہوسکتیں۔گو ایک بار شائع ہو جائیں تو یقیناً ''ہمدرد'' کی اشاعت ''زمیندار'' اور ''انقلاب'' سے بڑھ جائے اور ایک مجرد بے ریش مولف 1 تجربات شب عروسی وغیرہ کو بھی مات کر دے۔

اب میں اس خط کا بھی خاتمہ بالخیر کرتا ہوں۔ہم سیلان سے جو فرانس کا ایلڈر شاٹ یا راولپنڈی ہے گزر چکے ہیں۔اور اب نیلسی سے گزر رہے ہیں۔جو وائے زے پہاڑوں کے سلسلے کے پیچھے فرانس کے مدافعتی خط کے وسط میں ہے۔ممکن ہے کہ اگلا خط اتنا لمبا بھی نہ ہو سکے اس لیے کہ اس دن انگلستان کو واپس ہو رہا ہوں گا۔گزشتہ ہفتہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ جمعہ کے بعد ہی آپ کو خط لکھنا شروع کر دوں گا۔لیکن نماز جمعہ کے بعد نماز گاہ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جماعت سے مذہبی مکالمہ کیا کرتا ہوں اور اس کے بعد آرنلڈ 2 سے ملنے گیا۔اور وہاں سے قادیانی جماعت کے ساتھ شب کا کھانا کھانے گیا۔مگر صرف دعوت ہی نہیں تھی بلکہ ایک پورا استقبال ہو گیا۔ایک نو مسلم آئرش نے ایڈریس پڑھ کر سنایا۔اور مجھے بھی تقریر کرنا پڑی اور وہاں کے امام شائق درد صاحب نے بھی تقریر کی اور دوسرے دن ان ہی نو مسلم آئرش مین صاحب ان کی موٹر میں لندن سے 30-40 میل باہر ان کے دوست اور اپنے واقف کار ایک انگریز نو مسلم صاحب سے ملنے جانا پڑا جو نیا سالینڈ (افریقہ) میں سرکاری ڈاکٹر ہیں۔ان کا نام سانڈرسن ہے اور حج بیت اللہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ان کو ہم نے تار دے دیا تھا مگر افسوس کہ وہ تار ملنے سے پہلے ہی کہیں باہر جا چکے تھے۔یہ نیا سالینڈ کی زبان کے حروف تیار کر رہے ہیں تا کہ عربی رسم الخط میں حروف کا اضافہ کر کے قرآن کریم کا اس زبان میں ترجمہ ٹائپ میں شائع کر دیا جائے۔انشاءاللہ واپسی پر ان سے پھر ملنے ضرور جاؤں گا۔اس سفر کے باعث خط جمعرات سے پیشتر اس بار بھی شروع نہ کیا جا سکا

---

1 دہلی کے ایک خاص مولف کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت اسی قسم کی کتابیں لکھ کر اور فروخت کر کے نام پیدا کر چکے تھے۔ 2 مشہور ماہر ترقیات و اسلامیات سر ٹامس آرنلڈ سابق استاد علی گڑھ کالج۔

اور جتنا لکھا گیا ہے اس کے لیے آپ کو اشرف صاحب [1] کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، جنھوں نے اب تک سوکھی روٹی بھی نہیں کھائی ہے۔ چونکہ "بچا چچ" کو سیر و تفریح کے لیے علاحدہ روپیہ نہیں ملا ہے، اس لیے میرے طریقۂ علاج پر عمل کر کے وہ صرف ایک وقت سوکھی کھاتے ہیں اور پیٹ کاٹ کر سفر کرتے ہیں اور نپولین کے مشہور مقولہ پر کہ "فوج پیٹ کے بل پر چلا کرتی ہے" ایک دوسرے معنی میں عمل کر رہے ہیں۔ فی امان اللہ

آپ کا بھائی محمد علی

1. کنور محمد اشرف، بعد کو ڈاکٹر اشرف پہلے کانگریس کے اور بعد کو کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر

باب:76

8:1928

(ایک بے نوشہ کی بارات۔ مفلس کی آن)

اگست کا مہینہ تھا کہ لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری میں آل پارٹیز کانفرنس کے سامنے نہرو کمیٹی کی رپورٹ بحث و منظوری کے لیے پیش ہوئی۔ کمیٹی ہندوستان کے دستور اساسی کے اصول مرتب کرنے کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ پنڈت موتی لعل نہرو اس کے صدر تھے۔ ممبروں میں دو مسلمان بھی تھے، ایک شعیب قریشی دوسرے سر علی امام، سر موصوف کو تو غالباً غور و توجہ کی فرصت ہی نہ ملی، اور شعیب قریشی صاحب بھی شاید اپنے کو کمزور پا کر دھیمی ہی آواز میں کچھ بولے۔ کمیٹی نے بہرصورت ایک اصولی مسودہ مرتب کر دیا جس میں مسلم حقوق بڑی حد تک پامال ہو رہے تھے۔ جلسہ کے صدر سال رواں کے صدر کانگریس، ڈاکٹر انصاری صاحب تھے۔ مسلم اور غیر مسلم اکابر، کانگریسی اور نیشنلسٹ خیال کے کہنا چاہیے کہ سب ہی جمع تھے۔ عجب پر بہار مجمع تھا۔ خوب خوب تقریریں ہوئیں۔ ہندو ممبر خوب خوب بولے۔ مولانا شوکت علی شریک ضرور ہوئے، لیکن ایک گوشہ میں، کسمپرسی کے عالم میں بیٹھے رہے۔ سامنے آ کر، کھل کر، مخالفت نہ کی۔ یہ حصہ تو محمد علی ہی کا تھا۔ وہ ابھی یورپ سے کہاں واپس آئے تھے۔ جلسہ ساری ہماہمی، ساری گرماگرمی کے باوجود ایک محمد علی کے وجود کے بغیر سونا سونا رہا۔ ع

بزم میں سب سہی مگر تم جو نہیں، کوئی نہیں

ہیملٹ کا تماشا گھنٹوں بغیر ہیملٹ کے پارٹ کے ہوتا رہا.................. بعد کو مسلمان بہت پچھتے پیٹے، کون سنتا تھا، فیصلہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ الٹے شوکت علی بدنام ہوتے اور گالیاں کھاتے رہے کہ گورنمنٹ کے ہاتھ بک گئے ہیں۔ ملک کی ترقی اور آزادی میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ برطانیہ کی غلامی پر قانع رہنا چاہتے ہیں۔ وقس علی ہذا

....

محمد علی دیر میں یورپ سے واپس پہنچے۔ ترکی، فلسطین، عراق وغیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے۔ ان ملکوں میں انھیں داخلہ کی اجازت ہی سرکار برطانیہ کی طرف سے نہیں مل رہی تھی بہ مشکل تمام ملی۔ ابھی کراچی پہنچے ہی کہ پٹنہ میں بہار مسلم کانفرنس کی صدارت کی دعوت پہنچ گئی۔ اور اس کے معاً بعد کلکتہ میں خلافت کانفرنس کی بھی صدارت کرنا تھی۔ خلافت کانفرنس کا یہ شاید سب سے آخری اجلاس تھا۔ اس کے بعد پھر کوئی سالانہ جلسہ نہ ہو سکا۔ ع

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

محمد علی اب اپنے قدیم دوستوں اور عمر بھر کے رفیقوں ہی کے ہدف ملامت بن رہے تھے، ڈاکٹر سید محمود، چودھری خلیق الزماں، تصدق احمد خاں شیروانی، عبدالمجید خواجہ، جو کل تک محمد علی کے دست و بازو تھے، آج سو فی صدی نیشنلسٹ کی حیثیت سے موتی لعل نہرو کے کیمپ میں تھے اور سب سے بڑھ کر ڈاکٹر انصاری، جن کی رفاقت محمد علی کے ساتھ اب تک ضرب المثل تھی، آج مخالفین کے ساتھ تھے اور اردو پریس میں تو بدزبانی اور سب و شتم کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ زمیندار اور مہاراجہ محمود آباد میں ایکا تھا۔ مہاراجہ کی مدحت و منقبت سرائی ہو رہی تھی۔ اور محمد علی کا نام ہر قسم کے تبرا کے لیے وقف تھا ایک خبر دو تین ہفتہ قبل یہ آئی تھی کہ مولانا جب کربلا پہنچے ہیں تو وہاں ان پر رقت طاری ہوئی اور کچھ دیر تک روتے رہے۔ مولانا کے سے رقیق القلب شخص کے لیے اس میں کوئی انوکھی بات تھی ہی نہیں۔ تاہم خبر رساں ایجنسی نے مولانا کی شخصیت کی عظمت کے اعتراف میں اس خبر کو بھی روانہ کرنا ضروری سمجھا۔ ہندوستان میں زمیندار نے اس خبر کا عنوان دیا۔

''محمد علی کربلائی رو پڑے!''

جب مولانا دہلی پہنچے ہیں اور میں حسب دستور فوراً دریاباد سے چل کر دلی آیا تو یہ خبر بھی ان کے گوش گذار کی۔ معاً اور بلا چند سکنڈ تامل کے بولے "یہ نہ لکھا کہ ظفر علی کرم بلائی ختم دیے۔1
اس برجستگی اور حاضر جوابی کے تو وہ بادشاہ ہی تھے۔ غصہ سے بھرے ہوئے ہوں یا رنج میں ڈوبے ہوئے ہوں، یہ زندہ دلی ہر حال میں قائم رہتی۔

ماش کی دھوئی ہوئی دال گھی پڑی ہوئی اور ماش کی کھچڑی خوب گھی کے ساتھ، جاڑوں میں محمد علی کی محبوب غذا تھی۔ اب کی بھی قیام دہلی میں کھانے میں آئی محمد علی اپنی خرابی صحت کے زمانہ میں بھی پرہیز کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے۔ اور اب تو یورپ سے صحت ایک حد تک ٹھیک کر کے لائے تھے۔ اب کھانے پینے میں پرہیز و احتیاط کیا کرتے۔ خوب آزادی سے ہر چیز کھاتے اور کھلاتے پنجاب کے کوئی ایڈیٹر صاحب (خیال ایسا پڑتا کہ مہر صاحب تھے جو زمیندار سے الگ ہوکر اپنا روزنامہ انقلاب نکال رہے تھے اور انقلاب اس وقت ان گنے چنے اخباروں میں تھا جو مولانا کا ساتھ اب تک دیے جا رہا تھا) مہمان آئے ہوئے تھے۔ مولانا پنجابی صحافت سے عاجز آچکے تھے۔ کھانے کی میز پر ان سے کہنے لگے کہ یہ پنجاب کے اخبارات اپنے الگ الگ نام کیوں رکھتے ہیں۔ بس ایک نام ہر اخبار کے لیے کافی ہے۔ "پیسہ اخبار" ہر اخبار پیسہ اخبار2 ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس پر نمبر ڈال دیا کریں۔ پیسہ اخبار (1) پیسہ اخبار نمبر (2) اس پر ان ایڈیٹر صاحب نے بھی خوب لطف لیا اور ہنس ہنس کر تائید کرتے رہے............شوکت علی بیچارہ تنہا اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل ناکافی تھے، جو ہندوؤں میں تو تمامتر اور

---

1 "کرم بلائی" میں اشارہ ہے "کرم آباد" کی طرف۔ مولانا ظفر علی خاں مالک 'زمیندار' کا وطن 26 تا 30 کے ظفر علی خاں کو ان ظفر علی خاں سے کوئی مناسبت نہیں جو شروع 31 میں محمد علی کی موت پر یوں روئے۔

دلکش فضا وطن کی محمد علی سے تھی	رنگینی اس چمن کی محمد علی سے تھی
زنداں کو جس نے مطلع انوار کر دیا	تابانی اس کرن کی محمد علی سے تھی
سر پر لپیٹ لیتے ہیں جس کو عزا کے وقت	آرائش اس کفن کی محمد علی سے تھی
توحید کے اصول کی حرمت کے ساتھ ساتھ	ذلت ہر اک وثن کی محمد علی سے تھی

2 لاہور کے ایک مشہور اخبار کا نام بھی "پیسہ اخبار" تھا، پہلے ہفتہ وار تھا، پھر سالہا سال روزانہ ایڈیشن بھی نکلتا رہا اور پنجاب میں مدتوں، بہت مقبول رہا۔ حاجی محبوب عالم مرحوم اس کے ایڈیٹر اپنے زمانہ کے بڑے کامیاب لوگوں میں تھے۔

مسلمانوں کے بھی ایک بہت بڑے حلقہ میں خلافت کمیٹی کے لیڈروں کی مخالفت میں برپا ہو چکا تھا۔ محمد علی کا آ جانا انھیں غنیمت کیا، ایک نعمت معلوم ہوا۔ ایک دنیا شوکت علی کی مخالف تھی۔ حد یہ ہے کہ خاص محمد علی کے اخبار ہمدرد کا بھی رویہ تمام تر ان کی موافقت و مدافعت میں نہ تھا۔ میں خود تو شوکت علی کا ساتھ دے رہا تھا، لیکن ہمارے نئے منیجر حاجی ظفر الملک علوی صاحب تمام تر نیشنلسٹ خیال کے تھے اور انچارج ایڈیٹر جعفری صاحب کچھ تو ذاتی میلان بھی اسی طرف رکھتے تھے اور پھر ڈاکٹر انصاری وغیرہ بھی کا دباؤ محسوس کر رہے تھے ایک محمد علی ہی کی ذات ایسی تھی جسے حق کے آگے دنیا کی کسی مخالفت و موافقت کی پروا نہیں رہتی تھی۔

....

محمد علی ہندوستان آ گئے، لیکن ہمدرد بدستور میرے ہی چارج میں رہا۔ پرچہ کی پیشانی پر بحیثیت بانی ان کا نام ہوتا تھا اور بحیثیت نگراں میرا۔ پرچہ کی روش و مسلک سے مولانا بحمد اللہ خوش رہے اور یہی مجھے بڑا صلہ اپنی توقع سے زیادہ مل گیا۔ ورنہ دھڑکا برابر یہ لگا ہوا تھا کہ ان کی کڑی نکتہ چینی سے ہم لوگ کیسے بچ سکتے ہیں۔ فرصت و آرام محمد علی کی قسمت میں کہاں تھی۔ یہاں آتے ہی پھر کام میں جٹ گئے یا جوت دیے گئے اور کام لینے والے سب سے بڑھ کر ان ہی کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی تھے۔ کوئی کام کسی درجہ کا بھی ہو۔ سب محمد علی کے سپرد۔ حکم نامہ ان کے لیے موجود۔ بگڑتے، جھنجھلاتے، بلکہ بعض وقت واقعتاً آنسوؤں سے رونے تک لگتے لیکن تعمیل بہرحال کرنی پڑتی۔ شوکت صاحب کے خیال میں محمد علی نہ کبھی تھک سکتے تھے نہ کبھی بیمار یا اور کسی سبب سے معذور ہو سکتے تھے۔ اور اسی حسن ظن میں شوکت صاحب کے ساتھ ساری قوم مبتلا تھی! دسمبر میں صحت درست کر کرا کے ابھی آئے تھے کہ کام کا سارا بوجھ پھر سر پر آ پڑا۔ ابھی پٹنہ، ابھی کلکتہ، ابھی پھر دہلی۔ یہاں صدارت، وہاں تقریر، اس سے جھگڑا، اس سے معرکہ۔ آج اس کا جواب لکھنا، کل اس کے مقابلہ میں بیان دینا۔ اور اب طرہ یہ ہوا کہ چھوٹی صاحبزادی جن کی شادی ابھی چند ہی مہینے ہوئے مئی 28 میں ماجد علی خان کے ساتھ ہوئی تھی وہ بیمار رہنے لگیں اور اندیشہ دق کا پیدا ہو چلا۔ (یاد ہوگا کہ منجھلی صاحبزادی 24 میں اسی مرض میں گزر چکی تھیں) تشویش ہر باپ کے لیے قدرتی تھی، اور پھر محمد علی جیسے سراپا محبت باپ کے لیے۔ اس پر شوکت

صاحب کا، اور ان کی تائید میں صدر خلافت، شفیع داؤدی صاحب کا حکم پہنچا کہ بمبئی میں جو ہندو مسلمانوں میں سخت اور خوں ریز بلوہ ہوا ہے، اس کی پیروی کے لیے فوراً بمبئی آؤ!

شروع مارچ میں میرا جانا دہلی ہوا تو دیکھا کہ محمد علی ایک طرف تو سرمایۂ خلافت کمیٹی وجامعہ ملیہ کی خاطر اور کسی قدر آرام وتبدیلی آب وہوا کے خیال سے بھی، سفر برما کی تیاریوں میں مصروف، اور دوسری طرف خاص دہلی میں ایک عظیم الشان آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کے اہتمام میں لگے ہوئے ہیں۔ میں وسط مارچ میں حج پر روانہ ہو رہا تھا اس لیے رخصتی ملاقات بھی کرنا تھی۔ محمد علی کے ساتھ شریف منزل گیا (اب حکیم اجمل خاں مرحوم کی جانشینی ان کے صاحبزادہ حکیم محمد جمیل خاں صاحب کر رہے تھے) یہیں ابتدائی کمیٹیاں مشورہ وغیرہ کی ہو رہی تھیں۔ غنیمت تھا کہ اس وقت تک جمعیت العلماء مولانا کے ساتھ تھی۔ مولوی احمد سعید صاحب وغیرہ جلسہ میں موجود تھے ورنہ تو رفاقت میں ہم ہی چند قدیم نیاز مند باقی رہ گئے تھے۔ 4،3 مارچ کو میں ادھر واپس آیا اور ادھر مولانا سفر رنگون کے لیے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ ساتھ میں بطور سکریٹری کے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (جامعہ والے) گئے۔

مولانا کا ہٹنا تھا کہ الورراج سے مہاراجہ کے بھیجے ہوئے ایجنٹ دہلی وارد ہوئے۔ مہاراجہ کے راج کی جوبلی منائی جارہی تھی اور خواہش قدرتاً یہ تھی کہ ہمدرد اس موقع پر الور جوبلی نمبر شائع کرے، جس میں مہاراجہ کی تصویریں ہوں، حالات ہوں، وقس علی ہذا۔ یہ مہاراجہ وہی تھے جو ابھی ابھی ہزار ہا ہزار کے مصارف، مولانا کے سفر یورپ اور صحت کے لیے برداشت کر چکے تھے اور مولانا سے گہرا اور خصوصی تعلق خاطر رکھنے لگے تھے۔ ان کے ہاں سے آئی ہوئی فرمائش کو رد کرنا کس کے بس کی بات تھی۔ خصوصاً جب کہ اس اسپیشل نمبر کے مصارف طبع وغیرہ بھی ان کے ہاں سے مل رہے ہوں! جعفری صاحب ایڈیٹر کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو بیچارے دلی سے دوڑے ہوئے میرے پاس چلے آئے۔ پرچہ کا باضابطہ ''نگراں'' اب تک میں ہی بنا ہوا تھا۔ یک بیک بے شان وگمان انھیں دریاباد میں دیکھ میں دنگ ہوا۔ جلدی جلدی انھوں نے صورت حال سے باخبر کیا۔ میں کیا مشورہ دیتا خود ہی حیران رہ گیا۔ نہ قبول کرتے بنتا تھا نہ انکار ہی کرتے۔ آخر میں رائے یہ قرار پائی کہ خود مولانا ہی سے رنگون تار بھیج کر دریافت کیا جائے۔ جعفری صاحب تو کھڑی سواری آئے

ہی تھے۔ پہلی ٹرین سے واپس گئے۔ مارچ کی 10 یا 11 تھی، 13 کو مولانا کا ایک طویل تار جواب میں موصول ہوا:

"13 مارچ۔ رنگون۔ باتصویر جوبلی نامہ کی طبع واشاعت میں مضائقہ نہیں۔ ہمدرد کے خریداروں کے پاس بھیج دیا جائے لیکن خود ہمدرد نے کبھی کوئی خاص نمبر شائع نہیں کیا ہے اس لیے ہمدرد کا جوبلی نمبر مجھے پسند نہیں"۔

یہ ظرف بھی محمد علی ہی کا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہمدرد کو مالی اعانت کی ضرورت قدم قدم پر تھی۔ ادھر مہاراجہ جیسے محسن کی طرف سے فرمائش۔ اس پر بھی ہمدرد کا جوبلی نمبر نکالنا منظور نہیں! زیادہ سے زیادہ اجازت اس کی ایک الگ رسالہ چھاپ کر اس کی تقسیم واشاعت ہمدرد کے حلقہ میں کر دی جائے......افلاس واحتیاج کے وقت خودداری کو قائم رکھنا محمد علی کا جوہر خصوصی تھا، اور یہ واقعہ اس کی صرف ایک نظیر ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزاد وخود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

یہ تو خیر غالب کی شاعری تھی، باقی اس شاعری کو حقیقت میں تبدیل کر کے رکھنا محمد علی جوہر ہی کا کام تھا۔

......☆☆☆......

باب:77

1:1929

(ہمدرد مرحوم۔روز افزوں معذوریاں)

مولانا غریب رنگون میں، بقول شخصے ابھی بستر بھی کھولنے نہیں پائے تھے کہ قومی کاموں کے سلسلے میں دہلی اور بمبئی سے طلبی کے حکم نامے پہنچنے لگے، اور برما کی سرزمین پر پورے دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ انھیں دہلی واپس ہونا پڑا......اس دوڑ دھوپ میں آرام جیسا ملا ہوگا، ظاہر ہی ہے۔ حالانکہ زیادہ تر اسی آرام وسکون ہی کے خیال سے ڈاکٹری مشورہ سے مجبور ہوکر مولانا نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ قوم وملت کی خدمت کی خاطر ان گنت ذاتی تکلیفیں اٹھاتے رہنا مولانا کے لیے مقدر ہو چکا تھا!

وسط مارچ 29 میں میں وطن سے حج کے لیے بمبئی روانہ ہوگیا اور مئی میں مدینہ منورہ میں تھا کہ مدینہ (بجنور) کے ایک پرچہ سے ہمدرد کے بند ہو جانے کی نہایت درجہ اندوہناک خبر ملی۔ ہاتھ مل کر رہ گیا۔ کرتا کیا۔ اور خود مولانا بیچارے بھی کیا کرتے۔ مسلسل مالی خسارہ کب تک اٹھاتے رہتے...... کامریڈ، انگریزی ہفتہ وار فروری 26 میں بند ہو چکا تھا، ہمدرد، اردو روزنامہ اپریل 29 میں بند کرنا پڑا! یہ تھا قوم کی طرف سے قوم کے سب سے بڑے خادم اور سب سے بڑے مخدوم کو عملی صلہ! کوئی دوسرا ہوتا تو عجب نہیں جو اتنی ہمت شکنیوں اور حوصلہ فرسائیوں کے

بعد اس کا جگر شق ہو جاتا یا کم ازکم قومی خدمات کا تو ان کے بعد نام بھی نہ لیتا۔

جون کی 6 تاریخ تھی جب میرا جہاز ساحل بمبئی سے آلگا۔ مولانا شوکت علی، مولوی شفیع داؤدی، مولانا عرفان، سب سے گودی ہی پر ملاقات ہوگئی۔ مولانا عرفان سے ملتے ہی میں نے محمد علی کی خیریت دریافت کی۔ (یہ مولانا عرفان اب تک محمد علی کے مخصوص مخلصین میں سے تھے) سفر برما سے واپسی وغیرہ کا حال اجمالاً ان سے وہیں معلوم ہوگیا۔ اپنی خیریت سے بھی مولانا کو فوری اطلاع دے دینی ضروری تھی۔ اسی دن تار دے دیا۔ مصارف سفرحج سے بچی بچائی ایک مختصر سی رقم پڑی رہ گئی تھی، اسی وقت بمبئی سے مولانا کے نام روانہ کردی۔ اور خط بڑی لجاجت سے لکھ دیا کہ اس مخلص نیاز مند کی اس نذر حقیر کو رد ہرگز نہ کیجیے گا ورنہ بڑی دل شکنی ہوگی۔...... محمد علی کی خدمت کرنا وقت کے سب سے بڑے مجاہد ملت کی خدمت کرنا تھی۔

ڈیڑھ دو دن کے قیام بمبئی میں بہت سی کام کی باتیں (گو بڑی ہی تکلیف دہ) معلوم ہوگئیں۔ ڈاکٹر انصاری (اللہ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے) اب علی برادران سے بالکل الگ ہو چکے تھے۔ بیچارہ پر قومیت اسلامیت سے کہیں زیادہ سوار تھی۔ آخر ان بھائیوں کا ساتھ دے ہی نہیں سکتے تھے جو اول بھی مسلمان تھے، اور آخر بھی مسلمان۔ محمد علی کی غیر موجودگی میں ڈاکٹر صاحب کا ایک طویل شکایتی واعتراضی خط انگریزی میں مولانا شوکت علی کے نام آیا تھا۔ جس کا جواب بھی شوکت صاحب نے بڑا مدلل ومعقول، انگریزی ہی میں انھیں دے دیا تھا۔ اتنے سنجیدہ اور پرمغز جواب کی شوکت صاحب سے توقع بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ بہر حال وہ پوری خط وکتابت نظر سے گزر گئی۔ مولانا کی بیمار صاحبزادی حمیدہ بی کی طبیعت میں بھی دل لگا ہوا تھا۔ یہ سن لیا تھا کہ حالت اور گرتی ہی جاتی ہے۔ مولانا اب دہلی میں بے گھر تھے۔ کوچۂ چیلان کا قدیم، وسیع وشاندار مکان جس میں ہمدرد، کامریڈ کا دفتر، پریس وغیرہ سب کچھ تھا، وہ اب ہاتھ سے نکل چکا تھا، شاید اس کا کچھ کرایہ بھی مولانا کے ذمہ باقی رہ گیا تھا اور مولانا اب وہاں سے بہت دور اپنے داماد ماجد علی خاں کے مکان، مقام راجپور روڈ پر مقیم تھے۔ یہ اپنا انجینئری کا کچھ کاروبار کسی کی شرکت میں کرتے تھے۔ اور اب ان کا کارخانہ بھی بگڑا جاتا تھا۔ بیوی کے علاج میں خاطر خواہ صرف کرنے سے معذور تھے۔ اور اس کا بار بھی

ایک حد تک مولانا پر ہی پڑ گیا تھا۔ آنکھ کی بینائی مولانا کی اور زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی حالانکہ سن ابھی 50، 51 سے زیادہ نہ تھا۔

....

بمبئی سے لکھنؤ اور پھر لکھنؤ سے دریاباد پہنچتے ہی فکر یہ ہوئی کہ ایک احرام سفر، بیمار اور معذور، مظلوم اور دکھیارے مولانا کی عیادت و مزاج پرسی کی خاطر دہلی کے لیے جلد سے جلد بندھے۔ عین اسی وقت یہ والا نامہ صادر ہوا جو ابھی آرہا ہے۔ ایک قرن گزر جانے کے بعد آج یہ خشک اور بے جان سا معلوم ہوگا۔ اس وقت اس میں جان تھی اور ایک ایک فقرہ میں سوز تھا، درد تھا، تڑپ تھی اور بے کسی کی پوری پوری داستان تھی۔

12 جون 1929 .... 25 [illegible] ڈ، دہلی

پیارے ماجد میاں　　　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

زہے سعادت آں بندۂ کہ کرد نزول
گہے بہ بیت خدا و گہے بہ بیت رسول

الحمد للہ کہ آپ بھی اس سعادت کو حاصل فرما کر اعزا و احباب میں آکر شامل ہوگئے۔ کاش میں بھی آپ کے ساتھ گیا ہوتا۔ مگر دیکھیے اب یہ سعادت کب نصیب ہوتی ہے۔ 1335ھ [1] سے اس وقت تک ہزاروں لاکھوں گناہوں کا بوجھ اور اپنے سر لے چکا ہوں، اور اب تو بے حد شقی القلب ہو چکا ہوں، کاش پھر میدان عرفات میں سہ پہر کو بیٹھ کر دل کو بخشش کی امیدوں سے بھرتا اور کاش پھر دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پہنچ کر مولد سے مدفن مبارک کی طرف روانہ ہوتا اور روضۂ پاک پر ندامت کے آنسو بہاتا اور پھر گھنٹوں وہاں بیٹھ کر آپؐ کی مدینہ منورہ کی ساری زندگی کا تصور کرتا اور قلب مضطر کو مسرور کرتا اور بعض وقت باوجود اس ادب کے جس نے مزار مبارک کے پردے کو بھی اپنے گندے ہاتھ نہ لگانے دیے۔ پھر ایک بار عرض کرتا کہ

رکھیے گا آج بھی دیدار سے محروم ہمیں　　　　تھی جو ایک حسرتِ پابوس بدستور ہے آج
رقص بسمل کی ذرا دیر اجازت دیجیے　　　　حسن مسؤل نہیں عشق بھی مجبور ہے آج

---

[1] مولانا کا سال حج۔

عشق خود بدعت وسرمایہ صد بدعت ہے   رحم کر رحم کہ عاشق ترا معذور ہے آج

اپنے والدین، بھائیوں اور بہن اور آمنہ 1 کے لیے اور دوسرے اعزا واحباب نیز اپنے پیرو مرشد 2 کے لیے دعائے مغفرت کرتا۔ حمیدہ 3 کی صحت کا سوال کرتا نیز اپنی صحت کے لیے بھی مخصوص ہندوستان کے اس مہلک انتشار اور ان کی بے فکری کو دور کرنے کے لیے گڑگڑاتا۔ مگر یہ نصیب کہاں۔ نامعلوم اب کب جانا ہوتا ہے۔ شریف حسین ہی کے قبضہ کو میں قبضہ دشمن سمجھتا تھا اور جب جب موسم حج آتا تھا یہ کہہ کر دل کو سنبھالا کرتا تھا کہ ؎

کیا جاؤں کوئے یار میں یوں اذنِ غیر سے
ہے انتظار دیکھیے کب تک بلائے دوست

دیارِ حبیبؐ کے متعلق ہزاروں سوال کرنا ہیں مگر اس کے لیے تحریر بے فائدہ ہے۔ حسب وعدہ تشریف لائیے اور سب کچھ سنائیے۔ افسوس کہ نہ آپ کے جاتے وقت بمبئی پہنچ سکا نہ آپ کی واپسی پر آپ کا خیر مقدم کرسکا۔ جو حالات ہیں ان کو بالتفصیل شوکت صاحب کو لکھ چکا ہوں اس لیے کہ بظاہر وہ اب تک ان سے بے خبر تھے۔ دو دن صرف کر کے 41 صفحے کا خط لکھا نہ معلوم وہ آپ کو دکھایا گیا یا نہیں۔ یا عرفان صاحب سے آپ کو یہاں کے حالات کا پتہ چلا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ 41 صفحے کا خط بھی بیکار گیا۔ اس لیے کہ شفیع داؤدی صاحب کا عجیب وغریب خط آیا ہے کہ آپ کی پریشانی سے سخت تشویش ہے کوئی تدبیر سوچنا چاہیے۔ یہاں آئے تو سوچیں۔ وہاں گرمی بھی سخت ہے یہاں بارش ہوگئی ہے۔ اگر حمیدہ اور بیگم صاحبہ نہ آسکیں تو آپ ہی چلے آئیے۔ شوکت صاحب سخت پریشان ہیں۔ میں نے انھیں کہتے سنا ہے کہ I am collapsing now جو اس سے پہلے کبھی ان کی زبان سے کسی نے نہیں سنا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ فسادات بمبئی کی کمیٹی شہادت لے رہی ہے۔ میں سب سے کہتا تھا کہ ایک محمد علی ان سب کے لیے کافی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جس کے معنی یہی ہیں کہ بمبئی آکر فسادات بمبئی کمیٹی کے سامنے شہادت دو اور شہادتیں دلواؤ

---

1 مولانا کی محبوب لڑکی متوفیہ 24۔ مولانا کی ہمشیرہ کا انتقال بھی حال ہی میں ہوا تھا۔
2 یعنی مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ۔
3 مولانا کی منجھلی لڑکی اس وقت بیمار وصاحب فراش۔

لیکن کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ میں بھی کبھی معذور ہوسکتا ہوں اور آج اپنی علالت نہ سہی حمیدہ کی علالت
کے باعث معذور ہوں۔ آمنہ مرحومہ کی علالت کی تشخیص ہوچکی تھی، علاج تجویز ہو چکا تھا،
تیمارداری کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑ کر کہاں نہیں گیا؟ جب اس کی آخری گھڑیاں گنی جارہی تھیں اس
وقت بھی مصطفےٰ کمال کو بھیجنے کے لیے ایک طویل تار کا مسودہ تیار کررہا تھا۔ اور الغائے خلافت کولڑکی
کی موت سے کہیں زیادہ اہم شے سمجھتا تھا۔ مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ اب تک مرض ہی کوئی تشخیص
نہ کرسکا تھا اس لیے کوئی علاج مفید ثابت نہیں ہورہا ہے تھا۔ اب بخار روز 102، 103، 104،
105 اور اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ہر وقت متلی ہوتی ہے، نہ غذا لگتی ہے نہ دوا۔ نقاہت کا یہ حال
ہے کہ دوا پینے کے لیے اٹھنا بھی محال ہے۔ آج اس ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہوں کل دوسرے سے،
پرسوں تیسرے سے۔ ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر، حکیم، وید کوئی نہیں چھوٹا۔ ملیریا دق Baccillus
coli، نسوانی امراض ہر ایک کے متعلق امتحان ہو چکا اور ایک چیز نہ ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری اور
مولوی عبدالقادر قصوری (کارفرما پنجابی ٹولی دسرگروہ وہابیاں) کے بھتیجے ڈاکٹر محمد جنید قریشی نے
سب جتن کر دیکھے اور مجبور ہو کر کہا کہ اب سول سرجن سے آزادرائے طلب کرو۔ چنانچہ ان کو دکھایا
گیا اور صرف ایک چیز باقی رہ گئی تھی۔ سو انھوں نے احتیاطاً اس کی بھی فرمائش کی یعنی X-Ray
سے آنتوں کا امتحان۔ لیڈی ہارڈنگ زنانہ ہسپتال میں بھی اس کا سامان موجود تھا مگر سنا گیا کہ وہ
لیڈی ڈاکٹر جو تصاویر لیتی ہیں، گرمیوں میں رخصت پر چلی گئی ہیں۔ اس لیے مجبوراً سول ہسپتال
میں حمیدہ کو لے جا کر تصاویر کھنچیں۔ ہسپتال نہایت ہی گندہ اور تکلیف دہ مقام ہے۔ کوئی کمرہ
ایکسرے کے کمرے کے پاس ایسا نہ تھا جہاں مریضہ بارہ تیرہ گھنٹہ رکھی جاسکے۔ خوشامد اور کسی قدر
سختی دونوں کے استعمال سے ایک کمرہ Nurses Quarters میں سول سرجن سے کہہ کرلیا۔
اور 8 بجے صبح کو ایمبولنس میں ڈال کر حمیدہ کو سول ہسپتال لے گیا۔ خود نماز فجر کے بعد ہی سے گیا
ہوا تھا۔ تب جا کر اس کمرے کو صاف کرایا، دھلوایا، خس کی ٹٹی وغیرہ کا انتظام کروایا۔ (پہلے
Lumber Room کا کام دیتا تھا) پنکھا لگوایا، دودھ، ڈبل روٹی میں Bismuth ملا کر
ہزاروں دقتوں سے حمیدہ کو کھلایا گیا۔ ہر وقت متلی کا خوف تھا۔ ایک معجزہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی وقت
سب کچھ نہ ڈال دیا گیا۔ اس لیے کہ جو غذا مرغوب ترین ہوتی تھی اس طرح ڈال دی جاتی تھی مگر

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس دن اس وقت نہ ڈالا۔ ایک تصویر اس وقت لی گئی۔ دوسری ایک بجے دوپہر کو، تیسری پانچ بجے اور چوتھی آٹھ بجے۔ اس کے بعد حمیدہ کو لے کر ہم لوگ اسی کوٹھی پر جو ماجد[1] نے 1 مئی سے ڈاکٹر اشرف کے ولایت جانے پر ان سے پانچ ماہ کے لیے کرایہ پر لی ہے چلے آئے۔ دوسرے دن صبح کو 8 بجے پھر ہسپتال گئے اور پانچویں تصویر کھنچوائی۔ ان تصاویر سے پتہ چلتا ہے کہ غذا کتنی دیر تک آنتوں میں گھومتی ہے۔ پانچ بجے کے بعد دودھ کی برف دی گئی تھی۔ وہ آدھ گھنٹے کے بعد ڈال دی گئی اور متلی پھر ہر روز کی طرح ہوتی رہی۔ ڈاکٹر نعیم انصاری[2] نے جو ابھی دو ہرہ دون میں ایکسرے کا کام سیکھ رہے تھے کہا کہ یہ تصاویر اچھی نہیں ہیں اور تقریباً سو روپیہ بیکار ضائع ہوا۔ سول سرجن ان کو ناقص تو نہیں بتاتے مگر ان سے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ البتہ گمان کرتے تھے کہ آنتوں میں دق ہے۔ نعیم انصاری کی صلاح تھی کہ دہردون میں پھر تصاویر لی جائیں مگر جس دن یہ تصاویر لی گئیں اسی دن سول سرجن نے احتیاطاً Baccilus coli کے امتحان کے لیے پھر قارورہ بھجوایا تھا اور گورنمنٹ کے Analyst کی رائے ہے کہ Baccilus Coli کی Cultural Growth ہوئی حالانکہ اواخر مارچ میں ڈاکٹر حسین نے قارورہ کا امتحان کیا تھا تو باوجود ڈاکٹر انصاری کے گمان کے رپورٹ کی تھی کہ Cultural Growth نہیں ہوئی اور یہ بیسی لس موجود نہیں ہے۔ اس رپورٹ کے بعد علاج میں بالکل کایا پلٹ ہوگئی ہے اور اب پھر Baccilus Coli کا علاج جاری کیا گیا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر انصاری اور قریشی اس علاج کو چھوڑ چکے تھے۔ اب اسی قارورہ سے Vaccine تیار ہو رہا ہے اور چار پانچ روز کے بعد مل جائے گا تو ٹیکے لگوانے شروع کیے جائیں گے۔ ڈاکٹر انصاری نے پہلے پہاڑ پر جانے سے روک دیا ورنہ اپریل ہی میں منصوری بھیج دیا ہوتا۔ مگر اب تاکید ہے اور سول سرجن زور دے رہا ہے۔ ماجد بیچارہ صفدر علی صاحب قدوائی کے جھگڑے کے باعث سخت پریشان ہے۔ حکیم کے سامنے مقدمہ ہو رہا ہے اور کوئی امید تصفیہ کی نہیں اور انھوں نے سب ریاستوں کو لکھ کر بلوں کی ادائیگی رکوادی ہے۔ خود

---

1 ماجد علی خاں حمیدہ بی کے شوہر۔

2 مولانا کے ایک مخلص ساکن انبٹھا (ضلع سہارنپور) مدتوں لکھنؤ میں مطب جاری کیا پھر خدا معلوم کہاں کہاں گھومے۔ آخر میں کئی سال حیدرآباد میں گزارے۔ اس وقت غالباً پاکستان میں ہیں 1953۔

وقتاً فوقتاً اپنے لیے، اپنی بیوی بچوں کے لیے اور نیز اپنی ایک......تک کے لیے رقمیں لیتے رہے مگر اب Material Suppliers کی Bills ماجد کے فرم کے نام آ رہی ہیں اور چار پانچ روز سے سخت تقاضے ہو رہے ہیں اور روپیہ ہر جگہ بند پڑا ہے۔ وہ مارا مارا پھرتا ہے اور میں بھی کوچہ چیلان میں اپنا بندھا بندھایا سامان چھوڑے ہوئے یہاں تیمارداری کرتا ہوں اور رات کو پہرہ دیتا ہوں۔ اب پہاڑ بھی مجھ ہی کو جانا پڑے گا۔ یہاں میں مکان تبدیل کرنا چاہتا تھا مگر پریس کو اکھڑوانا ناممکن ہے اس کی فروخت کی اجازت ڈبنچر ہولڈرز سے لینا ہے اور پھر فروخت کرانا ہے۔ مگر مالک مکان صرف پریس کا حصہ کرایہ پر پہلے کی طرح نہیں دیتے اور وہابیت میں مست مجھے گھر سے نکال رہے ہیں[1] مگر میرا نکلنا آسان نہیں، پریس کو کہاں لے جاؤں؟ کل وکیل کی معرفت ان کا نوٹس آیا ہے کہ 24 گھنٹے میں خالی کردو۔ یہ تو تھا ہی۔ اب منصوری میں مکان کی تلاش ہے اور اگر وہاں گیا تو پریس کو فروخت کون کرے گا؟ ان حالات کو پیش نظر رکھیے اور شفیع داؤدی صاحب کی اس تدبیر کو سوچیے کہ اس لڑکی کو یوں ہی چھوڑ کر بمبئی چلے آؤ اور فسادات بمبئی کی شہادتیں دلواؤ۔

میری صحت اب ایسی ہے کہ مجھ کو بھی اب زندوں میں نہ سمجھیے۔ اس پر بھی آریہ سماج راجپال کے قتل کے بدلہ میں مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں اور ابھی لاہور سے اس Red Letter کے لونڈ بہار نے ایک Carbon paper copy ارسال فرمائی ہے کہ چونکہ تم نے علم دین[2] کی مدد نہیں کی ہے اس لیے ہم تمھیں قتل کر ڈالیں گے۔ دونوں پاؤں بیکار ہیں اور روز حالت بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ بائیں آنکھ پر پانی آ رہا ہے اور Catract[3] بن رہا ہے۔ ہاتھوں میں لکھتے وقت

---

1. کوچہ چیلان کے اس مکان میں ہمدرد، کامریڈ کا وسیع پریس اب تک موجود تھا۔ اس کے مالک ایک اہل حدیث صاحب تھے۔ اور اوپر گزر چکا ہے کہ مولانا 1926ء سے اہل حدیث جماعت میں مبغوض ہو گئے تھے۔

2. لاہور کے ایک آریہ سماجی کتب فروش راجپال نامی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک نہایت گستاخانہ کتاب لکھ ماری تھی، مسلمان قدرتاً سخت مشتعل ہوئے اور ایک پرجوش پنجابی علم الدین نے جا کر اس گندہ ذہنی کو قتل کر ڈالا۔ مقدمہ چلا اور فیصلہ وہی ہوا جو غیر اسلامی قانون اور غیر اسلامی عدالت کو کرنا ہی تھا، اب مولانا کی قوم کے لوگ اپنے مولانا ہی سے بیزار ہونے لگے کہ انھوں نے علم الدین کو بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔

3. موتیابند۔

اور یوں بھی احساس کی کمی ذرا ذرا سی معلوم ہوتی ہے۔

سب سے آخر میں رزق کا سوال ہے اور نہیں جانتا کہ جو روپیہ آج ہے اس کے ختم ہونے پر کہاں سے آئے گا۔ چاہتا تھا کہ ایک سال کے لیے قوت لا یموت کا سامان ہو جائے تو ایک کتاب انگریزی میں اور ایک اردو میں اسلام پر لکھوں [1]۔ پچھلے سفر کے حالات اس سے پہلے لکھ ڈالوں اور کچھ روپیہ سال بھر کے لیے کما لوں مگر...... برما سے واپسی پر سولانا......صاحب ایک ...... پر لٹو ہو گئے۔ رنگون ہی میں جھیل کے کنارے بیٹھ کر حسن پرستی اور غزل گوئی کیا کرتے تھے۔ اب تو جہاز پر تغزل کا زور شور تھا۔ ان ہی کی طرح میں مجھ سے دو شعر زبردستی نکل آئے۔ ان ہی سے میری حالت کا اندازہ کر لیجیے۔ وہ یہ ہیں:

ہوا محسوس جب سے ہے خوشی تیری خوشی اپنی
نہ اپنی موت موت اپنی نہ اپنی زندگی اپنی
کبھی چھوڑا نہ دامن کو ترے پھر تو ہی بتلا دے
اسے بے چارگی تیری کہوں یا بے کسی اپنی

آپ کا تار آتے ہی گمان ہوا کہ آپ اسی دن یا دوسرے تیسرے دن بچیوں کو لینے حیدرآباد جا رہے ہوں گے اس لیے تار کا جواب نہ دیا۔ اب بیمہ کے ساتھ......اور خط ملا۔ حیران ہوں کہ رسید کہاں بھیجوں اور اس عطیہ کی شکایت اور پھر شکریہ کس پتہ پر ارسال کروں۔ جب ہمدرد کے آخری پرچہ کی طلبی کا کارڈ لکھنؤ سے [2] آیا تو معلوم ہوا کہ آپ دریاباد جا رہے ہیں۔ آج......وقت نکال کر بڑی مشکل سے یہ خط لکھا ہے اور دریاباد بھیج رہا ہوں۔ کارڈ جعفری کو بھجوا دیا اور تاکید کر دی کہ اس کی تعمیل کر دو۔ مگر نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا۔ دفتر کا سارا سامان پریس کے حصہ میں بند پڑا ہے۔ کل نماز جمعہ کے لیے شہر جاؤں گا تو کوشش کر کے اپنے فائل میں دیکھوں گا کہ شاید اسی میں اوپر وہ پرچہ مل جائے مگر ۔

---

[1] انگریزی میں مسودہ گو بہت ہی ناقص صورت میں بعد کو نکل آیا اور My Life: a Fragment کے نام سے جوں توں شائع بھی ہو گیا، لاہور کے شیخ محمد اشرف کے ہاں سے۔

[2] ہمدرد میری اس سفر حج کی غیر حاضری ہی کے زمانہ میں بند ہوا تھا۔

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

آپ نے روپیہ کیوں بھیجا؟ خدا گواہ ہے کہ صرف اس خیال سے کہ آپ برا مانیں گے اسے واپس نہیں کیا۔ حمیدہ بی کو اسی وقت دے دیا مگر وہ اوران کے شوہر بھی واپس کررہے تھے۔ بڑی مشکل سے روکا ہے۔ اگر آپ مجھ سے دوستی قائم رکھنا چاہتے ہیں تو خدارا یہ ہرگز نہ کیجیے۔ ہاں جب ضرورت ہوگی اور میرے مصارف آپ سے کم ہوں گے تو ضرور منگوالیا کروں گا۔ شکایت کے بعد شکریہ بھی قبول ہو۔ جمن بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب۔ بچیوں کو پیار۔ خدارا جلد آؤ۔ اگر منصوری گیا تو وہاں بلاؤں گا جس میں اور زحمت ہوگی۔ اگر یہیں آجاؤ تو کیا اچھا ہو۔ دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں اور سننے کو کان۔

لیجیے ابھی خط ختم کیا تو صفحات بے ترتیب ہوگئے اور پاؤ گھنٹہ میں ترتیب دے سکا اور ابھی اطلاع ملی کہ حمیدہ کا بخار بہت بڑھ گیا اور جاڑا آگیا۔ دعا کیجیے خدا رحم کرے۔

آپ کا دلدادہ محمد علی

......☆☆☆......

باب:78

2:1929

بہ کوئے عاشقی از عافیت نشاں نہ دہند
بہ آں کسے کہ براہ ایں دہند آں نہ دہند

جون کی کوئی تاریخ، وسط ماہ کے بعد کی ہے، اور میں دلی براہ مراد آباد پہنچا ہوں، اتفاق سے لکھنؤ سے ریل پر ساتھ اپنے ایک نامور ہمنام اور محمد علی کے مخلص مولانا عبدالماجد بدایونی 1 کا ہو گیا اور بریلی تک رہا۔ وہ بدایوں جا رہے تھے۔ خوب باتیں رہیں۔ اب وقت وہ ہے کہ جمعیت العلما والے بھی ایک ایک کر کے مولانا کی رفاقت سے کٹ رہے ہیں۔ یہی ایک پارٹی رہ گئی تھی جواب تک ساتھ دیے جا رہی تھی۔ لیجیے اب وہ بھی الگ ہو گئی۔ اور محمد علی حق کی خاطر ایک ایک سے کٹ کر، ایک ایک سے لڑ کر، اکیلے اپنے اللہ کے ہو چکے تھے..... جس نے یہ شعر کبھی تخیل کی دنیا میں کہا تھا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

اس کی شاعری واقعات کی دنیا اور عمل کے عالم میں جانچی، پرکھی جا رہی تھی!

صبح کاذب کے وقت دہلی اسٹیشن پہنچ گیا۔ کوچۂ چیلان کا مکان ہی نہیں، راستہ تک مانوس

---

1 بڑے خوش تقریر اور ایک زبردست خطیب تھے۔ انتقال اواخر 1931 میں فرمایا۔

ومحبوب تھا۔ بارہا پیدل بھی آ جا چکا تھا۔ آج ایک نامانوس وغیر معروف مکان تک راستہ پوچھتے پاچھتے پہنچنا ہے۔ خوش قسمتی سے ایک صاحب اسٹیشن پر واقف کار مل گئے ان کی رہنمائی سے نمبر 25 راجپور روڈ پر پہنچا...... یہ کوٹھی مسلمانوں کے محبوب لیڈر اور نامور ایڈیٹر کی نہیں، ایک معمولی شہری کی ہے، اور محمد علی اس کے ہاں بطور مہمان کے ٹھہرے ہوئے ہیں! رامپور کے گلی کوچوں کو، اپنے مکان کے درودیوار کے دیدار کو تو برسوں سے ترسے ہوئے تھے ہی، اب دہلی میں بھی کوئی ٹھکانا رہنے کو نہ رہ گیا۔ غریب الوطنی درغریب الوطنی!

اب سویرا ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ ابھی پلنگ ہی پر تھے۔ محمد علی غریب میرے انتظار میں تصویر اشتیاق بنے ہوئے۔ بڑھ کر لپٹ گئے۔ خوب لپٹائے رہے...... آہ، وہ ان کے معانقہ کی گرمجوشی جس کی گرمی کی یاد آج تک تازہ ہے!

اتفاق سے آج ہی محمد علی کے مقدمہ کی پیشی ہے، عدالت دیوانی میں، سب جج کے ہاں! مقدمہ کیسا؟ مقدمہ گورنمنٹ کی طرف سے نہیں، کسی ہندو یا آریہ سماجی کی طرف سے نہیں، اپنے ہی ایک اہل حدیث بھائی کی طرف سے تخلیہ مکان کی بابت 1! عدالت کا وقت آیا اور مولانا چلے۔ کوئی وکیل اور پیروکار بھی نہیں۔ صرف یہ خاکسار ساتھ اور ایک نوجوان اور جو شاید الامان (مرحوم) کے رپورٹر تھے۔ نیشنلسٹ پریس تو اس وقت تک مولانا کا بائیکاٹ کر ہی چکا تھا۔ ساتھ دینے والے اخبار دو ہی چار رہ گئے تھے۔ انقلاب (لاہور) الامان (دہلی) وغیرہ۔ پہلی بار دہلی کی عدالتِ دیوانی کا منظر دیکھنے میں آیا۔ گواہوں، مدعیوں، مدعا علیہوں، پیروکاروں کے اس انبوہ عام کے درمیان عام مقدمہ والوں کی طرح گھستا اور پلٹا ہوا یہ مسلمانانِ ہند کا سردار و پیشوا!...... وقت یہ تھا کہ عبرت کو خود اس پر رحم آ جاتا!

ہجوم سے نکل کر ایک مرد مسلمان قریب آئے۔ اخلاص کے پتلے۔ دہلی کے عام مسلمانوں کے جان نثار اور مولانا کے خاص نیاز مند۔ نام مولوی عبداللہ تھا (''آٹے والے'' بھی غالباً جزو نام تھا) جھک کر ادر کمال نیاز کے ساتھ صلح ومصالحت کے راستے بھاتے رہے۔ لیکن مصیبت پر مصیبت یہ تھی کہ مولانا اپنے کو مظلوم وقابل ہمدردی سمجھتے کب تھے! اس وقت بھی یہی فرماتے رہے

---

1 اس کا ذکر ابھی پچھلے ہی باب میں گزر چکا ہے۔

کہ ''میں کسی سے رحم کا طالب نہیں، میں ان کٹر غیر مقلدوں کی قلعی پوری طرح عدالت میں کھول کر رہوں گا اور دکھا دوں گا کہ دعویٰ دائر کرنے میں کتنا دخل اس کینہ کو ہے جو ابن سعود کی حمایت میں میرے ساتھ برتا جا رہا ہے''۔ وہ مرد مسلمان بیچارہ سر پٹختا رہا اور عدالت میں پکار ہو گئی۔ اجلاس کے اندر فریق مخالف کے وکیل مولانا کے ساتھ عزت سے پیش آئے اور مصالحت کی گفتگو کرتے رہے۔ حاکم عدالت (مسلمان ہی معلوم ہوتے تھے) نے بھی خاصی توجہ والتفات مولانا کے ساتھ صرف فرمایا اور مولانا تقریر دو ہی چار منٹ کرنے پائے تھے کہ پیشی آئندہ کے لیے ملتوی ہو گئی......
کوئی ایک مصیبت ہو تو بیان کی جائے، شدید قرضداری، شدید جسمانی بیماریاں، شدید دماغی افکار، محبوب لڑکی کی علالت، ذاتی مصیبتوں سے لے کر قومی و ملی مصیبتوں تک کون سی بلا تھی جس کی شکار یہ ایک ذات نہیں ہو رہی تھی ۔

ہو رہے تھے جور ہفت افلاک کے
امتحاں تھے ایک مشت خاک کے

گھنٹوں اپنا درد دل سناتے رہے۔ مجھ سے سوالات جو کیے وہ زیادہ تر حج و زیارت ہی کے سلسلہ کے تھے۔ مکہ، مدینہ، عرفات، جدہ، جہاز وغیرہ کے ایک ایک حال اور انتظام کو پوچھتے رہے۔ حجاز کی فلاح و بہبود ان سے زیادہ کس کے دل کو لگی ہوئی تھی اور ستم یہ تھا کہ سلطان حجاز کی مخالفت کی بنا پر خود حجاز کے مخالف سمجھے جا رہے تھے! رات کو میرے ہزار نہیں نہیں کہنے پر بھی خود ہی پہنچانے اسٹیشن تک آئے!......کون جان سکتا تھا کہ یہ اسٹیشن تک کی ہم سفری، موٹر کی حد تک ان کی آخری ہم سفری ہو گی!

گھر پہنچا ہی تھا کہ کسی ذریعہ سے خبر ملی کہ حمیدہ بی کی علالت بہت زیادہ شدت پکڑ گئی۔ اور مولانا کو جس طرح بھی بن پڑا، سب کو لے لوا کر منصوری جانا پڑا۔ خبر سن کر سناٹے میں آ گیا۔ ہا! کیسی کچھ زحمت ہوئی ہو گی۔ کوچۂ چیلان والے مکان میں برسوں سے سکونت تھی۔ اتنا بڑا لق ودق مکان خالی کرنا، اس سے سارا سامان اٹھوا کر کئی میل کے فاصلہ پر قرول باغ کے نئے مکان میں لے جانا، مولانا جیسے شخص کے لیے کس قدر مصیبت کا باعث ہوا ہو گا، خصوصاً جب کہ وہ خود بیمار، زار ونزار اور لڑکی اتنی شدت سے علیل۔ پھر نہ کوئی ملازم و خدمت گار نہ بھانجوں بھتیجوں میں سے کوئی

موجود، اور دفتر کے اہلکاروں میں کوئی کیوں ہونے لگا تھا، جب سرے سے اب ان کے کسی دفتر ہی کا وجود نہ تھا۔ منصوری پہاڑ کے سفر کا مرحلہ، ایسے نازک مریض کو ساتھ لیے ہوئے اس سے بھی سخت تر! سہارنپور میں گاڑی الگ بدلی جاتی ہے۔ شاید پورا درجہ ریزرو کرالیا ہو، جو دہرہ دون ٹرین میں کاٹ کر لگا دیا جائے گا، لیکن اس کے لیے مصارف کس کے گھر سے بہم پہنچے ہوں گے۔ بہرصورت کتنی طوالت، کتنی مشقت، تعب، اور کتنی زیرباری کا سامنا کرنا پڑا ہوگا! ان ہی خیالات سے متاثر ہو، منصوری خط لکھا اور دوبارہ لکھا، سہ بارہ لکھا۔ سب سے زیادہ دل حمیدہ بی کی صحت ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ خدا معلوم کیا حال ہو اور محبت کے مارے ہوئے باپ پر کیا گزر رہی ہو۔

آخر خدا خدا کر کے وسط جولائی کے بعد جواب آیا۔ حیرت نامہ نہ تھا۔ مکتوب پریشانیوں کی ایک پوٹ تھا۔ پڑھ کر حسرت میں اور اضافہ ہی ہوا۔ بہرحال جیسا بھی تھا، درج ذیل ہوتا ہے۔

....

25 جولائی 29۔ البرٹ لاج۔ منصوری

برادر محترم مکرم حاجی الحرمین الشریفین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خط پیہم آ رہے ہیں، کارڈ آ رہے ہیں اور یہاں سے ایک حرف بھی جواب میں نہیں جاتا۔ پہلے آخری بات سنیے۔ پھر ابتدائی مراحل طے کروں گا۔ ڈاکٹر انصاری وسول سرجن اور ڈاکٹر بجر اور لیڈی ڈاکٹر مسز ڈالٹن نے خوب دیکھ لیا، اور آخری جواب دے دیا۔ صرف مجیب الدعوات کے جواب کا انتظار ہے۔ اس لیے نہ بمبئی جا سکا نہ اس وقت تک دہلی جا سکوں گا جب تک مجھے اپنے ''حکیم'' سے جواب نہ مل جائے۔ دن رات ہم لوگوں کے مریضہ کی چارپائی کے پاس ہی گزر رہے ہیں۔ جس کو جو وقت کچھ سونے کو مل جاتا ہے سو لیتا ہے۔ ایک انگریزی نرس دن بھر رہتی ہے مگر ''بااثر'' نہیں۔ مجھی کو اصرار کر کے دوا (حقیقتاً دوا نہیں بلکہ غذا، اس لیے کہ اب یہی دوا رہ گئی ہے) پلانا پڑتی ہے۔ ایسی حالت میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ ایک طرف سے شوکت صاحب بمبئی کسی ملکی یا ملی کام کے لیے بلاتے ہیں، دوسری طرف شفیع

داؤدی صاحب سے تقاضا کرایا جاتا ہے، تیسری طرف سیٹھ سلیمان مٹھا[1] اسی پر اصرار کرتے ہیں اور مجھے میرے اسلامی فرائض یاد کرائے جاتے ہیں۔ اس وقت بظاہر میرا اسلامی فرض یہی ہے کہ مریضہ کی پٹی کے پاس بیٹھوں۔ برادرم کیا کہوں بعض وقت نماز تک قضا ہو جاتی ہے۔ اس لیے براہ کرم آپ منصوری تشریف لائیے۔ میرے دہلی جانے کا کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں سہارنپور[2] کو لکھنے والا ہی تھا کہ کارڈ ملا کہ دریابادہی کو خط لکھو چنانچہ دریاباد کو لکھ رہا ہوں۔

اب ابتدائی مراحل سنیے۔ ڈاکٹر انصاری اور قریشی کے علاج سے فائدہ نہ ہوا (پہلے Baccilus coli کا پھر آنتوں کی دق کا علاج کیا تھا) تو انھوں نے کہا کہ اب سول سرجن سے رجوع کرو اور اس کو آزادانہ رائے قائم کرنے دو۔ اس نے بھی کوئی رائے نہ قائم کی بلکہ کہا کہ ہر چیز کا تو تم امتحان کرا چکے ہو۔ آنتوں کی تصویریں بھی لوالو۔ اس لیے بڑی سخت محنت اور گفت و شنید بلکہ تہدید کے بعد نیم انگریز نرسوں کے کمروں میں ایک کمرہ گودام کے طور پر استعمال ہو رہا تھا، وہ ملا۔ ورنہ دھوپ اور لو میں پچاس گز اسٹریچر پر اسے ایک نہایت ہی تنگ مردوں سے گھرے ہوئے Private Room سے X-Ray کے کمرے میں لانا پڑتا۔ سخت محنت کے بعد اس کو صاف کرایا۔ اس میں پنکھے اور خس کی ٹٹی کا انتظام کرایا گیا۔ سب سے مشکل مریضہ کو وہ دودھ ڈبل روٹی کھلانا تھی جس میں Bismuth بہت سا ملایا گیا تھا تا کہ تصاویر میں دیکھا جاسکے کہ چار چار گھنٹے کے بعد کھانا کس کس جگہ نظر آتا ہے۔ رو رو کر مریضہ نے کھانا کھایا۔ خدا کا بڑا شکر تھا کہ کھاتے ہی ڈال نہ دیا۔ اس لیے کہ روز یہی ہو رہا تھا۔ بہر حال تصاویر اس دن صبح کو آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک لی گئیں اور ان تمام پریشانیوں اور دقتوں کے بعد نعیم انصاری نے ان کو دیکھ کر کہا کہ بیکار ہیں۔ سول سرجن نے تو کوئی خرابی ان میں نہ بتائی مگر مرض کے متعلق مذبذب تھے۔ Baccilus Coli کے لیے قارورہ کا امتحان اواخر مارچ میں ہو چکا تھا مگر کچھ نہ نکلا تھا۔ احتیاطاً سول سرجن نے سرکاری Laboratory میں امتحان کرایا

---

1 مسلمانان بمبئی کے ایک عوامی لیڈر۔

2 سہارنپور میں میرے بھائی صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ والدہ ماجدہ مرحومہ بھی زیادہ تر ان ہی کے ساتھ رہتی تھیں اور میرا بھی جانا آنا وہاں اکثر ہوتا رہتا تھا۔

اور میجر تلسی رام آئی ایم ایس نے فرمایا کہ ہے اور اسی بنا پر Auto Vaccine تیار ہوا اور ٹیکے لگوانا پھر شروع کیے۔ اور یہی تشخیص قرار پائی کہ B. Coli ہے جو پہلے انصاری صاحب کا قیاس تھا جس کی بنا پر انھوں نے Stock Vaccine سے ٹیکے لگوائے تھے۔ اور بے نتیجہ دیکھ کر قیاس کیا تھا کہ آنتوں کی دق ہوگی۔ سول سرجن کا اصرار تھا کہ دہلی کی لو سخت مضر ہے۔ پہاڑ جاؤ، پہاڑ جاؤ۔ ماجد1 کا روپیہ الور میں پھنسا ہوا تھا اور صفدر علی صاحب کی عنایت سے ان کا دیوالہ نکلا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے دو ہزار روپیہ (چالیس پچاس ہزار میں سے) ملے تو منصوری میں مکان کے لیے انتظام کیا جانے لگا۔ میں پہلے ہی سے نصف مصارف ادا کرنا طے کر چکا تھا۔ سول سرجن نے اس قدر اصرار کیا کہ دہرہ دون تو فوراً لے جاؤ، وہاں جا کر مکان کا انتظار کرنا۔ چنانچہ یکا یک 19 جون کو فیصلہ ہوا کر 20 کی شب کو چل دیں گے۔ میں نے 19 ہی کو کہ عشرہ محرم تھا، قرول باغ میں مکان تلاش کر کے مغرب کے وقت مالک سے کرایہ وغیرہ طے کیا اور 20 کی صبح کو خود ہی جا کر 5 موٹر لاریوں اور 17 ٹھیلوں میں سب سامان دہلی سے قرول باغ ڈھلوایا۔ اسی دن رخت سفر باندھا، اسی دن اور گزشتہ شب میں Through Carrige میں ایک درجہ Reserve کرایا (جو ہو نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ گاڑی دہلی سے نہیں لگتی بلکہ جھانسی سے لگتی ہے) اور اسی شب کو مریضہ ماجد کے بچوں 2 اور اپنے اہل وعیال کو لے کر دہلی سے روانہ ہوگیا۔ پانچ دن دہرہ دون میں پڑا رہنا پڑا اور سخت تکلیف رہی۔ اس لیے کہ گرمی تھی اور اس مکان میں پنکھے نہ تھے۔ مریضہ کے سر پر رکھنے کے لیے برف مشکل سے ملتا تھا۔ ماجد کو معمولی کرایہ کا مکان نہ مل سکا۔ مگر ایک بیش کرایہ مکان والی کو کرایہ دار نہ مل سکا تھا اس لیے اس کی دو منزلہ کوٹھی جو ڈیڑھ دو ہزار کو جاتی تھی سات سو میں مل گئی۔ مگر ہمارے لیے تو یہ بھی ہزاروں تھے۔ 26 کو مریضہ کو لے کر میں یہاں آیا۔ سول سرجن کا علاج شروع ہوا۔ یکم جولائی کو ڈاکٹر انصاری بیچارے گوکرن ناتھ مصرا3 کو دیکھنے یہاں آئے تھے۔ چونکہ اصلاح مرض مطلق نہ ہوئی تھی اس لیے سول سرجن نے انھیں دکھایا اور دونوں کی رائے ہوئی کہ Baccilus Coli

---

1 وہی مولانا کے داماد جن کی بیوی بستر مرگ پر ہیں۔ 2 یہ بچے پہلی بیوی سے تھے۔

3 لکھنؤ چیف کورٹ کے جج تھے۔ مختصر سی بیماری کے بعد یہیں دہرہ دون میں وفات پائی۔

نہیں ہے اور غالباً آنتوں کی دق ہے۔ اب اس کا علاج پھر شروع ہوا۔ اور جب افاقہ نہ ہوا تو لیڈی ڈاکٹر کو بھی دکھایا گیا۔ اور اب قطعی رائے ہوئی کہ آنتوں کی دق ہے۔ اور ڈاکٹروں کے تیور بدلے اور امید کم نظر آنے لگی۔ جب اس کے بعد بھی حالت خراب ہوتی گئی تو سول سرجن سے کہہ کر ڈاکٹر بچر سے بھی مشورہ لیا گیا۔ گزشتہ جمعہ کو یعنی پرسوں انھوں نے کہا کہ کوئی امید نہیں ہے۔ ایک ہی موقع اصلاح کا ہے کہ ہم چیر پھاڑ کر دیکھیں کہ وہ کیا چیز ہے جو حائل ہوگئی ہے۔ اور کھانے کو آنتوں میں نہیں جانے دیتی۔ ہر چیز جو کھائی جاتی ہے ڈال دی جاتی ہے۔ مگر مریضہ میں اب اتنی جان باقی نہیں ہے کہ یقیناً اس کی متحمل ہو سکے۔ غالباً صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے گی۔ اس وقت شوکت صاحب کو تار دیا گیا کہ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا ہے کہ امید باقی نہیں ہے۔ ہماری امید خدا پر ہے۔ ہفتہ کو حالت کسی قدر اچھی رہی اور مریضہ نے اتوار کو ہواخوری کے لیے علی الصباح ڈانڈی اور رکشے میں جانے کے لیے اصرار کیا۔ اور کپڑے بدلے کہ دفعتاً Hysteria کا سخت دورہ پڑا۔ اور حالت اتنی خراب رہی کہ رات کو ہم لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی۔ عجیب بات یہ ہے کہ کل ہی ماجد کی پہلی اہلیہ مرحومہ کی برسی تھی اور مجھے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں اس طرح نہ ہو کہ میرے سسر عظمت خاں صاحب نے اسی شب میں انتقال کیا جس کی مغرب کے وقت میرے والد مرحوم کی برسی کا فاتحہ تھا۔

حکیم محمد احمد صاحب [1] کو دہلی سے بلایا ہے۔ کل نہیں تو پرسوں غالباً آئیں۔ دیکھیے اس وقت تک کیا ہوتا ہے۔ آپ آنے میں تکلف نہ کریں، آپ گھر والے ہیں، مہمان نہیں ہیں۔ پوری ایک منزل مکان کے لیے خالی ہے اور آپ تسلی و تسکین دے سکیں گے۔

میں آپ سے ناراض ہوں کہ باوجود میرے لکھنے کے آپ نے روپیوں کا بیمہ اپنی خوش دامن صاحب کے نام سے بھجوا دیا۔ آدھ گھنٹہ کھولے بغیر سوچتا رہا کہ واپس کروں یا نہیں۔ وہ آپ کی امانت رکھی ہے۔ مختصر سب کو سلام و دعا پیار۔

آپ کا پریشان حال مگر صابر و شاکر بھائی

محمد علی

---

[1] دہلی کے نامور طبیب حاذق، حاذق الملک اول حکیم عبدالمجید خاں کے لڑکے اور حاذق الملک ثانی حکیم محمد اجمل خاں کے بھتیجے۔

باب:79

3:1929

(زخمی شیر بپھرا ہوا)

حمیدہ بیچاری کی طرف سے اب مایوسی ہو چلی...... محمد علی غریب اب کیا کریں گے؟ ایک جوان لڑکی 24 میں اپنے ہاتھ سے علی گڑھ میں دفن کر چکے تھے۔ یہ دوسری بھی اگر خدانخواستہ چلی تو ان پر کیا گزر کر رہے گی، خاص کر جب خود بھی ذیابیطس کے شکار ہیں اور جسمانی قوت اور ایک آنکھ کی بینائی بڑی حد تک جواب دے چکی ہے۔ پیسہ پیسہ سے محتاج الگ ہو رہے ہیں، جتنا زیادہ سوچتا تھا، دل کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا، گھبرا کر جوابی تار دریافت خیریت کا دیا۔

21 جولائی کی صبح کو جواب موصول ہوا:

''منصوری، 20 جولائی، 12 بج کر 20 منٹ

حکیم محمد احمد خاں کو دہلی سے دوبارہ بلوایا۔ نسوانی شکایت تشخیص کیں۔ علاج قابلہ کے ذریعہ سے بتایا۔ بچ جانے کی امید تو دلا رہے ہیں لیکن حالت ہے بدستور نازک''۔

اب زندگی کا جو سال بھی گزرتا تھا، مصیبتوں اور دکھ درد کا دور محمد علی کے لیے پچھلے سال سے زیادہ ہی لاتا تھا۔ ہر دفعہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سال بہت سخت گزرا، دوسرا سال اس سے بھی سخت تر نکلتا تھا۔ محمد علی جیسا شخص مجسم زندہ دلی تھا اور اب اس کی ساری زندگی ایک مسلسل

ٹریجڈی (المیہ) تھی۔ صدمات پیہم اور دل شکستگی کی تصویر حکیم محمد احمد خاں دہلوی بڑے حاذق طبیب تھے۔ ان کے آجانے سے تھوڑی بہت امید بڑھ چلی تھی۔ کچھ دن اسی امید وبیم میں گزرے۔ آخر ہوا وہی جو تقدیر میں لکھا لائے تھے۔ جولائی ہی کی کوئی آخر تاریخ تھی کہ یہ دوسری جوان لڑکی بھی اللہ کو پیاری ہوگئی!

....

منصوری پر دفن کہاں کرتے، رائے یہ ٹھہری کہ دہلی لاکر دفن کیا جائے۔ نعش کو پہاڑ سے اتار کر دہرہ دون تک لانا، پھر وہاں سے ریل پر سہارنپور تک لانا، وہاں سے دہلی کے لیے دوسری ٹرین میں لگانا، ان میں سے ہر مرحلہ وقت طلب۔ وقت طلب اور سب سے بڑھ کر یہ خرچ طلب تھا محمد علی غریب کے پاس تھا ہی کیا۔ جو کچھ بھی تھا سب پہاڑ کے قیام اور ڈاکٹری اور پھر یونانی علاج میں بے دریغ اٹھا چکے تھے۔ اب مفلس قلاش کے حکم میں تھے۔ ریل کے کرایہ تک کا کام کسی نہ کسی طرح قرض ہی سے چلا۔ جوں توں دہلی پہنچے اور جوان لڑکی کو قبر میں خود ہی اتارا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ فرط غم سے بیخود ہورہے تھے لیکن اس بیخودی میں بھی اتنے حواس باقی تھے کہ کفن اور دفن وغیرہ کے ایک ایک جزئیہ سے متعلق احکام شریعت مفتی کفایت اللہ صاحب سے دریافت کرتے جاتے تھے۔ اور جہاں مفتی صاحب نرم پڑ جاتے تھے، خود ہی اصرار کر کے مستحسن جزئیات کی ہدایات ان سے حاصل کرتے تھے...... ہمت کر کے قبر میں اتر تو گئے لیکن وہیں سر میں چکر آیا، دنیا نظر میں تیرہ و تار ہوگئی اور بینائی گویا یک بیک جاتی رہی۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ لوگوں نے ہاتھ پکڑ کر اور سہارا دے کر قبر سے باہر نکالا۔ نور نظر کو کھو کر، دفن کر کے، دل شکستہ باپ کی بصارت صحیح وسالم رہ بھی کیسے سکتی تھی۔

....

مولانا کے اس صدمۂ عظیم کے وقت عملی ہمدردی میں سب سے آگے قدم جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کا رہا۔ ہندی مسلمانوں (خصوصاً بمبئی، گجرات وغیرہ کے باشندوں) کی خاصی بڑی تعداد یہاں عرصہ سے آباد ہے۔ اور یہ لوگ مدت سے مولانا کی زیارت کے مشتاق تھے۔ اب انھوں نے باقاعدہ دعوت نامہ بھی بھیجا اور شاید تار سے اصرار جاری رکھا۔ یہاں بھی مولانا کے

ہواخواہوں کا مشورہ یہی ہوا کہ بہتر ہے کہ بحری سفر کر آئیں۔ دل بہل جانے سے غم وصدمہ بھی ذرا ہلکا ہو جائے گا اور عجب نہیں کہ صحت بھی درست ہو جائے۔ مولانا جانے پر آمادہ ہو گئے۔ تاریخ تک طے ہو گئی کہ 23 اگست کو دہلی سے بمبئی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ اس نامہ سیاہ کو تار پر طلب فرمایا:

''دہلی۔ 21 اگست۔ :8 بج کر 35 منٹ

کیا یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ جنوبی افریقہ کی روانگی سے پہلے ملاقات ہو سکے؟ روانگی 23 کو ہے''۔

تقدیر الٰہی میں سفر درج نہ تھا۔ جنوبی افریقہ کی حکومت نے ایسی ایسی شرطیں مولانا کے داخلہ پر لگائیں کہ ان کا قبول کرنا کسی بھی خوددار ہندستانی کے لیے ممکن نہ تھا۔ جنوبی افریقہ کی حکومت اس وقت عجب برخود غلط اور فرعون بے سامان قسم کے ''گوروں'' کے ہاتھ میں تھی۔ ''کالوں'' کی کوئی عزت ان کے خیال میں تھی ہی نہیں۔ انڈین گورنمنٹ بھی ''گوروں'' ہی کی تھی لیکن یہاں کے گورے بہر حال نسبتاً شریف تھے۔ انھوں نے بڑا زور لگایا، بار بار لکھا پڑھی کی، تاروں پر سفارش کی، کچھ پیش نہ گئی۔ افریقہ کا ابوالہول اپنی بات پر اڑا رہا۔ سفر کی تاریخیں پہلے تو بڑھتی رہیں اور بالآخر سفر ہی منسوخ کرنا پڑا۔ جنرل ہرٹزنگ (وزیر داخلہ جنوبی افریقہ) کا آخری اور انقطاعی تار پا کر مولانا نے جو تار بطور رسید بھیجا، اس زمانہ میں اور اس ماحول میں تو خیر دل وہلا دینے والا تھا ہی باقی قابل دید آج بھی ہے:

''آپ نے سرکار ہند کو اس کا سبق دے دیا کہ دوستانہ معروضات کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اس کا شکریہ۔ اب ہم اسی وقت آئیں گے جب آپ کو یہ سبق دے لیں گے کہ اسلام اور ہندوستان کا احترام کس طرح کیا جاتا ہے''۔

محمد علی

صدر جمعیۃ خلافت

محمد علی جمعیۃ خلافت کے صدر اب کی سال کے بھی تھے لیکن خود جمعیۃ خلافت ہی میں جان اب کہاں باقی رہ گئی تھی؟ وہ کانگریس کے سابق صدر کی حیثیت سے بھی ملک بھر میں عزت

واحترام کے مستحق تھے۔لیکن کانگریسی حلقے ،نہرو رپورٹ کے شائع ہوچکنے کے بعد سے 28 سے ان کے نام سے بیزار ہو چلے تھے۔اوراب متعدد اکابر کانگریس خصوصاً موتی لال نہرو بلکہ خود گاندھی جی تک سے ان کی مخالفت کوئی ڈھکا چھپا ہوا راز نہ تھی۔

یہ سب کچھ تھا لیکن محمد علی خاموش اور معطل بیٹھنے والے کب تھے۔فضا کتنی ہی مخالف، حالات کیسے ہی ناسازگار ہوں،تھکنا اور ہارنا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔اسی 29 میں ایک ہندو ممبر ہربلاس شاردا کی تحریک پر اسمبلی کے سامنے قانون یہ آیا کہ لڑکیوں کی شادی کمسنی میں قانوناً ممنوع قرار دے دی جائے۔ابتداً مسودہ قانون کا تعلق صرف ہندو قوم سے تھا اور ان کے ہاں واقعتاً ایک حد تک اس کی ضرورت تھی بھی۔لیکن بعض نافہم و کج اندیش مسلمان ممبروں اور بعض ''علما'' نے اس کا دائرہ خواہ مخواہ وسیع کرا کے مسلمانوں کو بھی اس کی زد میں لے لیا۔محمد علی کو خبر ہوئی تو آگ ہوگئے کہ عمر نکاح پر یہ غیر مسلم گورنمنٹ کی طرف سے قید و بند کیسی۔مسلمان قطعاً آزاد ہیں کہ اپنی لڑکیوں کو جس سن میں بھی چاہیں بیاہ دیں۔غیروں کی طرف سے ان کے اندرونی و خانگی معاملات میں مداخلت صریحاً ناقابل برداشت ہے۔اٹھے اور اپنے ساتھ جمعیۃ علما دیوبند، فرنگی محل، بدایوں وغیرہ کے علما کی ایک معقول تعداد کو لے اس شاردا ایکٹ کی عملی مخالفت میں اپنے اسی جوش و انہماک کے ساتھ سرگرم عمل ہوگئے۔

اکتوبر ختم ہو رہا تھا کہ ذیل کا گشتی مراسلہ ان کے دستخط سے، دوسروں کی طرح مجھے بھی موصول ہوا:

دہلی۔گلی قاسم جان　　　　28 اکتوبر 29

جناب مکرم　　　　السلام علیکم

دہلی میں علما و زعما کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر 27 اکتوبر 29 کو ایک مجلس مشاورت منعقد کی گئی اور یہ طے کیا گیا کہ وائسرائے ہند کی خدمت میں، وفد لے جانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے جو وائسرائے اور ان کی حکومت کا طرز عمل مسلمانوں کے اس عام جوش و خروش کے متعلق معلوم کرے جو مسلمانوں میں شاردا ایکٹ کے نفاذ سے اپنے تئیں مستثنیٰ کرانے اور شریعتِ اسلامیہ کو مداخلت سے محفوظ رکھنے کے باب میں پھیلا ہوا ہے۔اور یہ

کمیٹی ان مسلمانوں کی ایک کانفرنس منعقد کرے جو اس مقصد سے اتفاق رکھتے ہوں۔ چنانچہ ابتدائی کام کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنادی گئی ہے۔

جناب والا بھی اس کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ جناب جوائنٹ سکریٹری کے پتہ پر اپنی منظوری سے اطلاع بخشیں گے۔ جواب بذریعہ تار مرحمت فرمائیے"۔

(مولانا) محمد علی (صدر)

"قرول باغ، دہلی"

مولانا نے اس سلسلہ میں کیسی کیسی سرگرم کوششیں کیں، کس کس طرح اپنی جدوجہد کو جاری رکھا، وائسرائے کے پاس کس طرح وفد لے گئے۔ وہاں سے کیا جواب لائے، کہاں کہاں تقریریں کیں، جوش وخروش کے ساتھ رہنمائی کن طریقوں پر کی، یہ ساری مفصل داستان دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ لیکن اس کا تعلق سیرت محمد علی سے ہے، نہ کہ اس سرسری ڈائری سے جس کا دائرہ صرف ڈائری نویس کے ذاتی علم میں آئے ہوئے واقعات تک محدود ہے۔

......☆☆☆......

باب:80

1:1930

(سبّ وشتم کی گرم بازاری۔ داماد کا انتخاب)

30 کی پہلی سہ ماہی تمام تر علالت اور مخالفتوں کی نذر ہوئی۔ خلافت کمیٹی اب علانیہ کانگریس سے برسرِ جنگ تھی۔ اور خلافت کمیٹی کی طرف سے کہنا چاہیے کہ سارا کام محمد علی ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ خلافت ورکنگ کمیٹی کی طرف سے ایک بہت طویل اور اہم ریزولیوشن انگریزی میں اسی زمانہ میں شائع ہوا۔ وہ تمام تر محمد علی ہی کا تیار کیا ہوا تھا۔ ادھر سے بولنے والوں، لکھنے والوں، کام کرنے والوں کی کیا کمی تھی، ادھر گویا تنہا محمد علی کی ذات تھی، بجز شوکت علی اور مولانا عرفان اور شفیع داؤدی وغیرہ چند اِنے گنے کارکنوں کے، باقی سب رفیقانِ قدیم ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر سید محمود اور مولانا ابوالکلام آزاد اور عبدالمجید خواجہ اور تصدق احمد خاں شیروانی وغیرہ کانگریس کیمپ میں تھے۔ اور جمعیت العلما کے لوگ بھی رفتہ رفتہ کٹ کٹ کر اسی طرف شریک ہو گئے۔ بقول داغ ؎

ساری خدائی اس کی طرفدار ہو گئی

اتنا نہیں کوئی جو ہو ایمان کی طرف

عبرت کا عجب منظر سامنے تھا۔ کل تک جن کا شمار معمولی رضا کاروں میں ہوتا تھا، جو دوڑ دوڑ کر محمد علی کی خدمت کرنا باعثِ سعادت سمجھتے تھے بلکہ محمد علی ان سے چوکی پر لوٹا رکھنے کو کہہ دیتے تو اس کو وہ

فخر ومباہات سے بیان کرتے، وہ تک آج سب "فرنٹ" تھے..... عوام مسلمین بیشک اس وقت پھر ذرا خلافت کمیٹی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، اور مسلم آل پارٹیز کانفرنس بھی محمد علی کی قیادت تسلیم کر رہی تھی، لیکن خواص کا طبقہ روز بروز الگ بلکہ بیزار ہی ہوتا جاتا تھا اور مخالفین کے اخبارات تو جیسے اس موقع کی تاک ہی میں لگے تھے۔ شیر کو جان بلب اور حالتِ نزع میں پا کر گیدڑ بھی اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

....

انگریزی کا سارا ہندو پریس دشمن۔ اردو کے غیر مسلم اخبارات کی بھی بدزبانی کی حد نہیں۔ ان سب سے بڑھ کر دل شکن، دلآزار اور تکلیف دہ دہلی اور لاہور کے متعدد مسلم اخبارات کی روش! کوئی سخت سے سخت طعن محمد علی کے لیے اٹھ نہ رہا۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی افواہ بشرطیکہ اس سے محمد علی کی توہین و تفضیح کا کوئی پہلو نکلتا ہو، ان اخبارات کے لیے آیت و حدیث کا حکم رکھتی تھی۔ کبھی یہ خبر اڑتی کہ محمد علی نے گورنمنٹ کا عہدہ قبول کر لیا ہے، اور اسمبلی کے اسپیکر مقرر ہونے والے ہیں، کبھی یہ دروغ بے فروغ شائع ہوتا کہ محمد علی کو فلاں مسلم والئ ریاست نے گرانقدر ماہانہ وظیفہ سے نوازنا شروع کیا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اس قبیل کی بھی مضحکہ خیز خبریں یار لوگ گڑھ لیتے کہ محمد علی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی رجسٹراری قبول کرنے والے ہیں جس کی تنخواہ چار پانچ سو سے زائد نہ تھی! یہ "ایماندار" اور "دیانتدار" اخبار نویس ان سب خبروں کو بڑے شوق اور چاؤ کے ساتھ نہ صرف نمایاں کر کے شائع کرتے بلکہ ان پر زور نوٹ لکھتے۔ بڑے بڑے ایڈیٹوریل لکھ ڈالتے اور ان میں زیادہ سے زیادہ زہر ملا دیتے۔ اور حد یہ ہے کہ غریب کی علالت تک ان بزرگوں کی نظر میں بجائے قابل ہمدردی ہونے کے قابل مضحکہ تھی!

ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو!

اس ڈائری کے ناظرین ممکن ہے کہ ان بیانات کو مبالغہ آمیز سمجھیں اور خیال کریں کہ سیاسی مخالفتوں میں بھلا کوئی اتنا تھوڑے ہی حد سے گزر سکتا ہے، اور پھر اس کے مقابلہ میں جو ابھی کل تک ملت کا قائد تھا، ایسے حضرات بہتر ہوگا کہ کہیں تلاش کر کے کم از کم زمیندار [1] (لاہور) الجمعیۃ [2] اور ریاست (دہلی) کی 30 کی فائلیں ضرور پڑھ لیں!

1، 2 ظاہر ہے کہ ان سے مراد نہ آج کا زمیندار اور نہ آج کا الجمعیۃ۔ 51، و52 میں تو یوم محمد علی کے سلسلہ میں تعزیتی مقالے ایسے ادب واحترام کے ساتھ ان پرچوں میں نکلے کہ ان سے آگے بڑھ کر ممکن ہی نہ تھے۔

جوابات کی محمد علی کے ہاں کمی نہ تھی، اب وہ جب جواب دیتے تو مخالفین ہی کے لب ولہجہ میں نہایت سخت اور بہت تلخ جواب دیتے۔ لیکن اول تو بیچارہ کو جواب دینے کی مہلت ہی کہاں تھی ایک انار وصد بیمار کا معاملہ تھا۔ کتنے اہم کام تنہا ان ہی کو انجام دینے پڑ رہے تھے، اس میں سب وشتم کے اس پشتارہ کے پڑھنے کا وقت ہی انھیں کہاں مل سکتا تھا، اور پھر آنکھ کی شدید کمزوری کے باعث طبی ہدایات کے ماتحت ان کا لکھنا پڑھنا بھی بہت محدود رہ گیا تھا۔ ضروری سے ضروری ملی وملکی مسائل کے ہوتے ہوئے ان شخصی تعریضات اور ذاتی گلوں کی انھیں خبر ہی کم ہو پاتی اور سب سے بڑی بات ہے (اور یہ ان کے ظرف کا پیمانہ تھا) کہ جواب وہ سخت تلخ یقیناً دیتے، لیکن صداقت ودیانت کا دامن اس شدید اشتعال کی حالت میں بھی نہ چھوڑتے، یہ کبھی بھی نہ کرتے کہ افترا کے جواب میں افتراء، بہتان کے توڑ کے لیے بہتان پر اتر آئیں......شدید جسمانی آزار، شدید ذاتی صدمات، شدید ہجوم اعدا میں مبتلا ہو کر اگر زبان میں حدت اور مزاج میں غلظت آ گئی ہو تو یہ عین فطرتِ بشری تھی، ایک امر طبعی تھا، اور اس کے لیے سند بعض مسلم اکابر سے مل جاتی ہے۔ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا.

مزاج میں چڑچڑاہٹ آ گئی تھی، تاہم زندہ دلی، بذلہ سنجی، برجستہ گوئی کا سرچشمہ خشک نہیں ہو گیا تھا۔ پنجاب میں نیا نیا ''ٹوڈی'' اور اس سے بڑھ کر ''ٹوڈی بچہ'' چلا ہوا تھا۔ زمیندار اسے خوب اچھال رہا تھا اور روز ان لوگوں کی شان میں جو ''نیشنلسٹ'' نہ تھے ''ٹوڈی بچہ ہائے ہائے'' کا نعرہ لگا رہا تھا۔ اور اس پارٹی سے بچوں اور نوجوانوں نے واقعی اس نعرے سے آسمان سر پر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اتفاق سے عین اسی زمانہ میں محمد علی کا گزر لاہور میں ہوا۔ یہ موٹر پر شہر کے اندر گزر رہے تھے۔ کسی بدتمیز نے پکار کر کہا ''ٹوڈی بچہ ہائے ہائے''! یہ زبان کب رکنے والی اور طرح دینے والی تھی۔ معاً موٹر روک، اسی ردیف وقافیہ میں پکار کر مصرعہ لگایا ''دھوتی بچہ وائے وائے''......''دھوتی بچہ'' میں ہندو پرستی پر جو چوٹ تھی، بالکل ظاہر ہے۔

....

سب سے چھوٹی صاحبزادی (اور اب ''سب سے چھوٹی'' کہاں، چار میں سے کل دو تو

رہ ہی گئی تھیں) گلنار بی کا سن ماشاء اللہ اچھا خاصہ ہو چکا تھا اور موزوں شوہر کی تلاش قدرتاً جاری تھی......دسمبر 21 میں مولانا کی نظر بندی کے زمانہ میں احمد آباد کانگریس کے موقع پر اسی چھوٹی اور ہونہار بچی کی طرف اشارہ کر کے گاندھی جی نے اس سوال کے جواب میں کہ آپ اگر گرفتار ہو گئے تو اپنا جانشین کس کو بنا جائیے گا۔ ہنس کر کہا کہ ''گلنار کو!''...... خاندان اور برادری کا کوئی لڑکا خیال میں نہیں آ رہا تھا۔

مولانا کے ایک بڑے مخلص اور پر جوش جوان عمر رفیق کار شعیب قریشی تھے۔ ان کا ذکر آپ اوپر پڑھ آئے ہیں، خلافت کمیٹی اور وفد حجاز کے سلسلہ میں بھی اور بھی کئی بار اور ڈائری کی ان سطور کی نظر ثانی کے وقت خبر آئی ہے کہ وہ حکومت پاکستان کی طرف سے ہندوستان میں سفیر مقرر ہو کر دہلی آ رہے ہیں۔ علی گڑھ اور آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے، بیرسٹر ایٹ لاء، شریف خاندان، صورت وسیرت دونوں میں ممتاز۔ نہرو رپورٹ کے تجربہ کے بعد کانگریس کی سیاست سے بیزار ہو کر پبلک قومی زندگی ہی کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ اور بھوپال میں ایک بہت اونچے عہدے پر ہو گئے تھے۔ گلنار بی کے لیے نظر انتخاب ان پر پڑی، غالباً عبدالرحمٰن صدیقی سندھی کی تحریک کے دور اول میں اس کے منیجر رہ چکے تھے۔ اب ایک عرصہ سے مولانا سے بے تعلق ہو کر انگلستان میں اپنا کاروبار کر رہے تھے۔ شعیب کے خاص دوستوں میں تھے۔ بہرحال ان ہی کے حسن توسط سے معاملہ نکاح شعیب قریشی کے ساتھ طے پا گیا۔ شعیب اب سن سے ذرا اتر چکے تھے لیکن مرد کے لیے اتنا سن کچھ زیادہ نامناسب بھی نہ تھا۔ تندرست ووجیہ، انتخاب مالی، اخلاقی، دینی ہر حیثیت سے اچھا رہا۔

مولانا تلاش سکون و عافیت میں کچھ روز حیدر آباد کے ایک دور افتادہ مقام پر بمبئی میں اپنے ایک بے تکلف دوست قاسم حسین بدایونی (علیگ) کے پاس رہنے کے بعد اب بمبئی میں تھے۔ شوکت صاحب نے بلا کر بہ اصرار وہیں رکھا تھا، زیادہ تر تو آنکھوں کے علاج کے لیے اور باقی قومی کام تو چھوٹ سکتا ہی نہ تھا۔ اب ہم نیاز مندوں کو فکر تھی تو یہ کہ کس طرح گلنار بی کے عقد سے فراغت حاصل کر لی جائے۔ اور مجھے سب سے بڑھ کر اندیشہ یہ لگا ہوا تھا کہ کہیں شادی کے موقع پر مولانا دل کھول کر نہ خرچ کرنے لگیں۔ جس طرح گفتگو میں ان کی زبان نہیں رک سکتی تھی اسی طرح خرچ کے باب میں ان کا ہاتھ رکنا جانتا ہی نہ تھا۔ مالی حالت جتنی

زبوں تھی، مجھ پر روشن تھی۔ جی یہ ڈر رہا تھا کہ کہیں قرض ورض لے کر ہی سہی ساکھ نہ ڈبو بیٹھیں۔ ڈرتے ڈرتے بمبئی خط لکھا تو کچھ اسراف کی وعیدیں سنا ڈالیں۔ دریافت خیریت ودریافتِ حال کے لیے پہلے ہی دو ایک کارڈ اور لفافہ ڈال چکا تھا۔ جمعیت العلما کے بزرگوں نے مخالفت کی اب پوری طرح ٹھان لی تھی، مجبوراً مولانا کے ہمدردوں اور معتقدوں کو جن میں پیش پیش قطب میاں فرنگی محلی اور مولانا عبدالماجد بدایونی تھے، ایک دوسری جمعیت العلما بھی بنا لینی پڑی تھی۔ جس کا صدر مقام کانپور تھا، اس کے حالات خاص طور پر پوچھنے تھے۔ وسط اپریل میں سب کا اکٹھا جواب آیا۔ بڑے کاغذ کے 39 صفحوں پر! جواب ایسے قلم سے جو رفیقوں کی مسلسل غداریوں اور دوستوں کی خالی خولی بے مغز نصیحتوں سے بھنایا ہوا، اور اپنے خلاف سازشوں کے زبردست جال سے جھلایا ہوا ہے۔ لب ولہجہ کی تلخی اس حال میں شاید بالکل قابل معافی ٹھہرے۔ بعض بعض لفظوں اور فقروں کو اس ڈائری میں مجبوراً قلم زد کرنا پڑ رہا ہے اور یہ بعض جگہ اس سے قبل بھی ہو چکا ہے، لیکن اگر ایسے فقروں کو یکسر ہی قلم زد کر دیا جائے تو اتنی کتر بیونت شاید حدودِ تحریف میں داخل ہو جائے اور ڈائری ڈائری رہ ہی نہ جائے۔

......☆☆☆......

باب:81
2:1930
(شرح وہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو)

11اپریل1930 دارالخلافہ۔لولیس۔مجگاؤں،بمبئی

برادرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے تین کارڈ اور آج ہی جب کہ آپ کو عریضہ لکھنے والا تھا ایک لفافہ بیمہ سب مجھے موصول ہوئے۔ چونکہ لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے ارادہ کیا تھا کہ جب گلنار کی شادی کی تاریخ مقرر ہو جائے گی تو آپ کو بلالوں گا۔اور بلا لکھے پڑھے گفتگو میں سب کچھ کہہ دیا جائے گا۔مگر گلنار کی شادی کی تاریخ شعیب کے اور ہم سب کے رفیق صدیق عبدالرحمٰن صدیقی کی ولایت سے آمد پر موقوف ہے۔اور متعدد تاروں کے تبادلے کے بعد وہ یورپ سے 5اپریل کو تو چل پڑے مگر زیارت روضۂ پاک اور حج بیت اللہ کے بعد ہندوستان پہنچیں گے۔اور ہم سب اسی امید پر جی رہے ہیں کہ ذی الحجہ ہی کی کسی تاریخ کو دہلی پہنچ جائیں گے کیونکہ محرم میں شادی نہ ہو سکے گی اور صفر میں حمیدہ مرحومہ کا انتقال ہوا تھا وہ زمانہ بھی ناموزوں ہوگا۔یوں تو کون عبدالرحمٰن کے حج سے خوش نہ ہوگا بالخصوص جب کہ ان کی صحت بالکل غارت ہوگئی ہے اور

وہ متعدد امراض میں گرفتار ہو گئے ہیں، اور سخت تکالیف اور درد میں مبتلا ہیں۔ لیکن ہم سب چاہتے ہیں کہ گلنار کی شادی جلد سے جلد ہو جائے اور صرف عبدالرحمٰن ہی کی وجہ سے دیر لگ رہی ہے، ورنہ مارچ ہی میں عقد کر دینے کا خیال تھا۔ خط نہ لکھنے کی وجہ میں نے بیان کر دی مگر اب خط لکھ رہا ہوں تو باوجود آنکھوں کی بصارت اس درجہ کھو بیٹھنے کے جی نہیں مانتا کہ مفصل خط نہ لکھوں اور سب باتوں کا جواب نہ دوں اور کچھ شکایات بھی نہ کروں جو ایام سرما میں دل کو جلا رہی ہیں۔

پہلے اسراف کے متعلق سن لیجیے [1]۔ اب میرے پاس ہے ہی کیا جو گلنار کی شادی میں اسراف کروں گا۔ برادرم...... میں نے پہلے بھی ان رسوم میں اسراف سے کام نہیں لیا تھا۔ زہرہ اور آمنہ مرحومہ کی، نہ ان دو بچیوں کی کبھی کوئی رسم ادا کی جو اس اسراف کا الزام مجھ پر لگ سکتا ہے۔ چونکہ نہ عقیقہ میں، نہ بسم اللہ میں، نہ نشرہ میں، نہ منگنی میں کوئی رسم ادا کی تھی اور درحقیقت اس زمانہ کا اکثر حصہ قید و بند میں گزر رہا تھا۔ رسم ادا بھی کس طرح کرتا۔ صرف نکاحوں کے موقعوں پر میری اہلیہ نے کچھ خوشی منائی۔ وہ بھی نہ اس طرح کہ ناچ و رنگ ہوا ہو یا شب گشت ہوئی ہو یا کسی اور طریقہ پر بارات نکلی ہو۔ جب سے پہلے دو بچیاں پیدا ہوئی تھیں ان کی ماں عورتوں کے طریقہ پر ان کے لیے کچھ نہ کچھ میری نہایت محدود تنخواہ میں سے بناتی یا خریدتی ہی رہتی تھی۔ اور وہ بھی زیور نہ تھا بلکہ معمولی روزمرہ کے استعمال کے کپڑے اور برتن بھانڈے۔ جب میں اکتوبر 20 میں یورپ سے واپس آیا تو ایک لڑکی 18 کی تھی اور دوسری 17 سے کچھ ہی کم ہو گی۔ میں تو ایک ہی کا نکاح کرنا چاہتا تھا اور اس کا بھی اس وقت نہیں لیکن میری بیوی نے سب انتظام میرے ولایت سے آنے سے قبل ہی کر لیا تھا اور انھوں نے کہا کہ تمھارے قید و بند کا زمانہ اب پھر آ گیا۔ میں تنہا دو جوان لڑکیوں کی ذمہ داری اپنے سر لینا نہیں چاہتی۔ دو مسلمان نوجوانوں کو اس ذمہ داری میں شریک کرتی ہوں۔ آمنہ کی عمر ابھی 18 کی نہیں ہے جس سے قبل تمھارا ارادہ کسی لڑکی کے نکاح کا نہ تھا لیکن اس کو ہسٹیریا کا مرض ہو گیا ہے اور حکیم اجمل خاں صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی رائے ہے کہ نکاح بہترین علاج ہے۔ دوسرے اتنا روپیہ کس کے پاس ہے کہ ہر سال ایک نکاح کیا جائے۔ میں ان دلائل سے قائل ہو گیا اور نکاحوں کی اجازت دی۔ مگر مجھ کو جامعہ

1۔ میں نے بر بنائے اخلاص و نیازمندی عرض کیا تھا کہ ہر طرح کے اسراف سے احتیاط رہے۔

ملیہ کے آغاز کے باعث ایک منٹ فرصت نہ تھی۔ اس لیے نکاح سے دو تین روز پیشتر مہمان داخل آ کر مراد آباد میں معظم صاحب اور عبدالسلام اور مسعود کے مکانوں میں بیٹھ رہا۔ سوائے مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کے کسی کو بھی مدعو نہ کیا۔ انصاری وغیرہ دہلی سے بلا دعوت کے آ گئے اور کچھ دے ہی گئے۔ مہمانوں کو معمولی کھانا کھلایا گیا۔ صرف رامپور سے بارات آنے پر انھیں رسم کا پلاؤ، زردہ، قلیہ، قورمہ کھلا دیا گیا تو بظاہر نکاح کے کھانے کے لیے اسی طرح ضروری جس طرح عیدالفطر کے لیے سویاں اور شب برأت کے لیے حلوا۔ میں نے اس شادی میں بجز شرکت کے کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس لیے مجھے حق بھی نہ تھا کہ بیگم صاحبہ سے جن کے حسن انتظام کے ہم سب قائل ہیں، کچھ کہتا۔ یہ تھی میرے گھر کی پہلی رسم۔ آمنہ مرحومہ اور والدہ ماجدہ مرحومہ کی موتیں دوسری اور تیسری رسم تھیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اسراف سے کام لیا۔ درحقیقت کوئی رسم ادا نہیں کی گئی اور جو کچھ کی بھی گئی تو خیرات نقد کی گئی اور جمعیت خلافت وغیرہ کی نذر کر دی گئی، یا محلہ کی مسجد میں برقی روشنی کا انتظام کر دیا گیا جو الحمدللہ اس وقت تک جاری ہے۔ آمنہ کا سارا زیور خلافت کو دے دیا گیا۔ یہی بڑی خیرات تھی۔ چوتھی رسم حمیدہ مرحومہ کی شادی تھی۔ جو بڑی دو بہنوں کے تقریباً آٹھ برس بعد ہوئی۔ اس کے لیے بھی باوجود ہماری قید و بند کے میری بیوی نے کچھ نہ کچھ کر لیا تھا۔ مگر وہ انھیں کافی نہ معلوم ہوا۔ اور نہ معلوم مرحومہ کو اپنی آنے والی موت کا پہلے ہی سے کچھ اندیشہ تھا یا لیا (اور ہو بھی تو کیا عجب ہے کہ تین سال سے حرارت اور درد گردہ میں مبتلا تھی اور حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور انصاری دونوں کا اصرار تھا کہ شادی کے بعد ہی نسوانی علاج ہو سکے گا کیونکہ اس نے گھر میں آئی ہوئی لیڈی ڈاکٹر کو فیس دے کر امتحان و معائنہ کے بغیر رخصت کر دیا تھا) خود مرحومہ نے کسی نہ کسی طریقہ پر اپنی ماں پر ظاہر کر دیا تھا وہ دھوم دھام چاہتی ہے۔ میرے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک صاحب نے دسمبر میں تین سو روپے دیے تھے۔ مدراس کانگریس میں اسی کی عمدہ کھدر خرید لی تھی اور ایک دوست کی دکان سے چینی کے برتن اور گلاس وغیرہ قرض لے لیے تھے، اور بس۔ مگر اس کی ماں نے اپنے بھائی معظم کو لکھا کہ اپنے باپ کے ترکہ میں سے 22 برس میں انھوں نے ایک بار کوئی دو ہزار روپیہ آمنہ مرحومہ کے مکان کے لیے زمین خریدنے کو لیے تھے جواب تک یوں ہی پڑی ہے۔ اور ایک بار 26 میں اپنے اور میرے حج

کے لیے دو ہزار لیے تھے۔ اب انھوں نے تین ہزار معظم کو لکھ کر منگوائے اور ساری خرید وفروخت خود کی۔ اس بار چونکہ ماجد مالی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے، اس لیے رامپور سے بھی سب عزیزوں کو نہ بلایا گیا۔ معظم کی بیٹیاں اور میری بہن اور شوکت صاحب کی بچیاں ہی شریک ہوئیں۔ باہر سے بھی کسی کو مدعو نہیں کیا گیا البتہ ایک شب کو دہلی سے کوئی سو پچاس احباب کو کھانے پر مدعو کرلیا گیا۔ یہی اسراف ہوا تھا۔ یا مرحومہ کے لیے کپڑا لیا گیا تھا۔ پہلے اسراف کا کفارہ یہ کیا گیا کہ جامعہ ملیہ کو پانچ، جمعیۃ خلافت اور جمعیۃ علما وغیرہ کو چند سو نقد دیے گئے۔ دوسرے اسراف کا کفارہ یہ کیا جارہا ہے کہ مرحومہ کے کپڑے اور برتن بھانڈے غریب لڑکیوں کو ان کے عقد نکاح کے موقعوں پر دیے جارہے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ گلنار کی شادی کی مجھے سب سے زیادہ خوشی ہے کہ شعیب جیسے صالح مسلمان کے ساتھ خاندان کی رسم کو توڑ کر جوڑا جارہا ہے اور خدا اس کی عمر دراز کرے۔ توکل تو خدا ہی پر ہے لیکن اب اپنی صحت کا خیال کرکے کسی قدر مطمئن ہوں کہ اس رازق حقیقی نے جو مسبب الاسباب ہے، میری بیوی اور بچوں کے لیے ایک یار و مددگار بھی پیدا کردیا مگر اب خوشیاں منانے کی ہمت ہی نہیں۔ دو جوان لڑکیوں کے نکاحوں کے اتنے جلد بعد ان کا انتقال ہوگیا کہ شادی وخانہ آبادی کے نام سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے جو کچھ اسراف کیا ہے وہ والدہ مرحومہ اور آمنہ مرحومہ کی قبروں کے بنوانے میں کیا ہے کوئی قبہ نہیں بنوایا۔ سینے پر سوائے خاک اور گھاس کے کچھ نہیں، مگر ایک جگہ سنگ سبز کا فریم سا بنوادیا ہے اور ایک جگہ سفید سنگ مرمر کا۔ اور لوح مزار کو خود Design کیا ہے۔ آمنہ کی قبر پر پیام اور دعائے اسیری کا پاک شعر کندہ کرادیا ہے۔

تیری صحت ہمیں مطلوب تھی لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

حمیدہ کی قبر بھی سفید سنگ مرمر کی اسی طرح تیار کرائی جارہی ہے، اور اس پر اس زمانے کے کہے ہوئے یہ دو شعر انشاء اللہ کندہ ہوں گے

ہوا محسوس جب سے ہے خوشی تیری خوشی اپنی
نہ اپنی موت، موت اپنی نہ اپنی زندگی اپنی

کبھی چھوڑا نہ دامن کوترے پھرتو ہی بتلادے
اسے بیچارگی تیری کہوں یا بے کسی اپنی

صبر کے سوااب بھی چارہ نہیں۔مگراب یارائے ضبط کم ہے کیا کروں۔

تو نا گفتہ دانی بگفتن چہ سود

نکاح پڑھانے کا مسئلہ میرے اختیار کانہیں ہے۔شعیب کی جومرضی ہوگی کیا جائے گا۔گو میرا تو جی یہی چاہتا ہے کہ میرے صاحب انجمن اور آپ کے پیرومرشد ہی نکاح پڑھائیں1۔ بہر حال انشاءاللہ مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلمائے ہند نکاح نہ پڑھائیں گے2۔

بھائی اگر تم نہ بھی لکھتے3، تب بھی میں شریعت حقہ کے احترام کو قائم رکھنے کی خاطران مفسدوں کا مقابلہ ضرور کرتا، جواسمبلی میں جا کر اپنے تئیں مصلحین کہتے ہیں۔ان ہی پرسورہ بقرہ کی وہ آیات صادق ہیں کہ " اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لاَ تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ...... فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ "۔ میں نے پربھنی4 میں ایک لمباچوڑا برقی پیغام تیار کرنا شروع کردیا مگر ٹائپسٹ نہ ملنے اور خود علیل ہونے کے باعث اسے ٹائپ کر کے بھجوانے نہ پایا تھا کہ اندور میں معلوم ہوا کونسل آف اسٹیٹ نے بھی شاردا بل کو پاس کردیا ہے۔تب تو خود ہی بیٹھ کر ٹائپ رائٹر پر وائسرائے کو ایک طول طویل اور سخت خط لکھا مگر وہ بدبخت منظوری دے چکا تھا۔اور عازم یورپ ہوگیا۔میں بھوپال میں تھا کہ دہلی کے جلسہ کے اطلاع ملی اور میرے پاس جمیل میاں 5 کا تار آیا کہ داعیوں میں مفتی صاحب کا،ان کا اور میرا نام ہوگا،اجازت درکار ہے۔ہفتہ کو تار

---

1 میں نے مشورہ دیا تھا کہ نکاح مولانا حسین احمد صاحب پڑھائیں۔کراچی کے مشہور مقدمہ میں دونوں ایک ساتھ اسیر ہوئے تھے اور ایک ساتھ ہی سزایاب۔اس وقت تک یہی باہمی تعلقات غنیمت تھے۔

2 مولانا سے اس وقت تک مفتی صاحب سے سخت بے لطفی ہو چکی تھی۔

3 شاردا ایکٹ (قانون امتناع از دواج کمسنی) بنا تھا ہندوؤں کے لیے مگر چپکا دیا گیا مسلمانوں کے سر میں۔ میں نے لکھا تھا کہ اس عظیم الشان فتنہ کے مقابلہ کے لیے آپ ہی جیسے قائد کی ضرورت ہے۔

4 پربھنی علاقہ نظام دکن۔مولانا وہاں اپنے ایک دوست کے ہاں سکون، صحت اور تبدیل آب ہوا کے سلسلہ میں مقیم تھے۔

5 یعنی حکیم محمد جمیل خاں دہلوی فرزند حکیم اجمل خان مرحوم۔

ملا۔ ارجنٹ تار کے دم کہاں سے لاتا۔ ارادہ کیا کہ پیر کو معمولی تار دے دوں گا مگر بھول گیا۔ حالانکہ اس دن خط بھی پیر تک پہنچ جاتا۔ بعد کو بمبئی سے گھومتا گھامتا احمد سعید کا خط آیا کہ آپ کا پتہ معلوم نہ تھا اس لیے خلافت کی معرفت لکھا ہے۔ بہر حال میں جواب دینا بھول گیا مگر جلسے کی شرکت کے لیے پہلے ہی دلی پہنچا۔ احمد سعید تعین عمر کی کمیٹی کے سامنے تائید کر چکنے کے بعد خود ہی میری جگہ دائمی بن بیٹھے تھے۔ میں آتے ہی دو بار ان کے اور مفتی صاحب کے گھر اور ایک بار دفتر جمعیۃ گیا مگر نہ ملے[1]۔

دوسرے دن جمعیۃ کا جلسہ تھا جس میں سیاست (سطحی) بہت کچھ تھی مگر مذہب کا قطعی فقدان تھا۔ شام کو دوسرے جلسہ کے متعلق جمیل صاحب کے ہاں مشورہ تھا مگر مفتی صاحب اور احمد سعید دیر میں آئے۔ اور لوگ مشورہ کرتے رہے اور سب کی رائے یہی تھی کہ میں جلسہ کا صدر بنوں۔ وائسرائے کو ایک وفد کے ذریعہ الٹی میٹم دے دیا جائے۔ مسلمان اس ایکٹ سے مستثنیٰ نہ کیے جائیں تو کانپور کانفرنس منعقد کی جائے اور تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ پر عمل کر کے ہر کلمہ گو کو جو اس مداخلت فی الدین سے بیزار ہو دعوت دی جائے اور اس مصیبت پر خدا کا شکر کر کے انتشار اور افتراق کو دور کیا جائے۔ اس لیے باوجود میرے صدر خلافت ہونے کے میں نے صرف خلافت کمیٹی کا جلسہ طلب نہ کیا کیونکہ "معتدلین" نہ آتے، نہ شیعہ اور قادیانی شریک ہوتے۔ اتنے میں مفتی صاحب اور احمد سعید آ گئے۔ پہلے صدارت کے متعلق پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک کس کا صدر ہونا مناسب ہوگا۔ مفتی صاحب کا جواب بے حد (Significant) ہے خود ہی داعیوں میں شامل ہیں اور خود ہی فرماتے ہیں کہ میں اس وقت تک اس کے متعلق بالکل خالی الذہن ہوں۔ مگر احمد سعید نے اس خلا کے پر ہونے کا ثبوت بھی دے دیا اور کہا کہ "مگر جلسہ تو جمعیۃ العلما کا بلایا ہوا ہے، اسی کا مستقل اور دوامی صدر اس کا بھی صدر ہوگا"۔ تب

[1] خوب یاد کر لیجیے۔ کہ یہ وقت کون سا تھا۔ جمعیۃ العلما اور مولانا کے اختلافات اس وقت نہایت درجہ تلخ ہو چکے ہیں۔ مولانا کا دل اپنے سابق رفیقوں کی طرف سے بہت ہی جلا ہوا ہے اور رنج کے خط میں خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ پھر خود بھی ہر طرح کے جسمانی آرام اور قومی و ذاتی صدمات سے چور چور ہیں۔ لہجہ کی کرختگی اور خشونت ایسی حالت میں بالکل درگزر کے قابل ہے۔

جا کر چند دہلی والوں نے جو اس وقت موجود تھے، کہا کہ جلسہ تو اہل دہلی کا طلب کردہ ہے۔ جمیل میاں بھی داعی ہیں۔ اہل دہلی نے مہمانوں کے لیے خود چندہ کیا آپ کو اس لیے دے دیا کہ جمعیۃ العلما کی کمیٹی منتظمہ کا بھی جلسہ ہونے والا تھا۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ ہمارے مہمانوں کا بھی انتظام کر دیجیے گا۔ بالآخر دعوت نامے منگا کر دیکھے گئے تو صاف درج تھا کہ یہ جلسہ جمعیۃ العلما کے جلسے سے بالکل الگ تھا۔ مگر احمد سعید صاحب کا تحریر کردہ دعوت نامہ جو جمعیۃ العلماء والوں کو بھیجا گیا تھا، اس میں جمعیۃ العلما ہی کا جلسہ بتایا گیا تھا۔ اس تضاد وتبائن کا اقبال انھوں نے بھی کیا۔ بہر حال میرا نام صدارت کے لیے پیش کیا گیا اور بلا عذر تسلیم کیا گیا۔ گو چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں علمائے کرام اسے کرہاً قبول کر رہے ہیں۔ آپ کو نہ معلوم وہ گندہ قصہ یاد ہے یا نہیں کہ ایک ہجڑا بنئے کی دکان پر سے اس کی غیر حاضری میں چنے ٹونگ رہا تھا۔ وہ پیشاب کر رہا تھا، پیٹھ پھیر کر دیکھا تو یہ نظارہ نظر آیا۔ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مرد ہے یا عورت۔ گھبرا کر چیخ اٹھا کہ سارے چنے ٹونگ گیا، سارے چنے ٹونگ گئی.....مفتی صاحب نہ پورے دین دار نکلے نہ پورے دنیادار۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ محمد علی کا نام صدارت کے لیے بحیثیت داعی جلسہ پیش فرمائیں اور جمیل میاں بحیثیت داعی دوم اس کی تائید کر دیں گے تو فرمایا جمیل میاں پیش فرمائیں، میں تائید کر دوں گا۔ باوجود سب کے اصرار کے انھوں نے تحریک کرنے سے انکار کیا مگر تائید کرنے کا اقرار کیا۔ نواب اسماعیل خاں[1] نے اس حیرت انگیز انکار واقرار پر ایک سیدھا سوال کیا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ تو کچھ نہ فرما سکے۔ جواب دیا تو یہ کہ تحریک پر اصرار کیوں ہے۔ اس کا جواب دیا گیا کہ جو سلوک مولانا محمد علی کے ساتھ جمعیۃ العلما کے جلسہ میں حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کیا اور باوجود ان کے رکن جمعیۃ اور اس کی انتظامیہ اور عاملہ دونوں مجالس کے رکن ہونے کے اپنی تقریر میں کہا کہ میں محمد علی کو تو جمعیۃ کا رکن ہی تسلیم نہیں کرتا۔ اور جس طرح مسلم لیگ کے جلسہ میں جو گزشتہ اواخر مارچ میں ہوا، انھوں نے "لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ" کی آیت کریمہ پڑھ کر نہرو رپورٹ کے مخالفین کو "خبیث" کا لقب

---

[1] میرٹھ والے۔ بیرسٹر ایٹ لاء، اس وقت بھی قومی کاموں میں پیش پیش تھے۔ بعد کو مسلم لیگ کے رکن اعظم ہوئے۔ 1948

عطا فرمایا تھا اور نہرو انہوں کو 'طیب' کا اور جس طرح مقدم الذکر جماعت کے چلے جانے کے
بعد ڈاکٹر محمد عالم کو صدر تجویز کر کے بلا رائے لیے ہوئے کرسی صدارت پر بٹھا دیا تھا، اور اسی طرح
ایک تجویز نہرو رپورٹ کے متعلق پاس کر لی تھی، اس سے خطرہ ہے کہ جلسے کے لیے لوگوں کے
آتے ہی حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کے بھائی نعیم خود آپ کا نام صدارت کے لیے پیش
کردیں گے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ آپ خود ہی بحیثیت داعی جلسہ محمد علی کا نام پیش فرمائیں
تاکہ وہی بے لطفی پیدا نہ ہو جو مراد آباد میں جمعیۃ العلما کے صدارت کے لیے ان کا نام پیش کیے
جانے کے باعث کانپور کا سالانہ اجلاس جمعیۃ العلما کی مجلس استقبالیہ کو آج تک نصیب ہو رہی
ہے...... اس کے بعد ان ہی کی طرف سے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ صدر کا انتخاب تو حاضرین جلسے کے
ہاتھ میں ہے۔ تو ان سے عرض کیا گیا کہ یہ کلیہ نہیں ہے۔ خود جمعیۃ کے سالانہ جلسے کے لیے
خلافت کانفرنس، کانگریس، مسلم لیگ وغیرہ کے لیے پہلے ہی انتخاب کر لیا جاتا ہے تاکہ اس قسم کی
ناگوار حالت پیدا نہ ہو جو کانگریس کو سورت میں 1906 میں پیش آئی تھی۔ دہلی میں جو آل انڈیا
مسلم کانفرنس آپ نے منعقد کرائی تھی اس کے لیے آغا خاں کا انتخاب ان کی ولایت جانے سے
بھی پیشتر کر کے ان کو مدعو کیا گیا تھا۔ آپ لوگ بحیثیت داعیان کے انتخاب کر لیجیے اور اسی
حیثیت سے جلسہ کا آغاز کل صبح فرما کر محمد علی سے صدارت کرائیے۔ یہ معاملہ صرف فتویٰ دینے کا
نہیں ہے۔ فتویٰ تو جمعیۃ العلما دے ہی چکی ہے۔ اب مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ کرانے
کی تدابیر پر غور کرنے اور ہر عقیدے اور ہر سیاسی روش کے مسلمان کو متحد کر کے شریعت کے
احترام کرانے کا ہے۔ مفتی صاحب نے اس پر کہا کہ اچھا ہم تینوں داعی اس کا فیصلہ کر لیں گے کہ
محمد علی کا نام میں پیش کروں یا جمیل میاں پیش کریں اور میں تائید کروں۔ چونکہ ہم نے اعلان
کر دیا تھا کہ میں اسی شب کو مسجد جامع میں فلسطین، افغانستان، شاردا بل وغیرہ کے متعلق
بالتفصیل تقریر کرنا شروع کروں گا اور دو تین روز تک اس سلسلہ کو جاری رکھوں گا تاکہ ایک عرصہ
سے میری دہلی کی غیر حاضری کے باعث اظہار خیالات کا جو موقع نہیں مل سکا ہے وہ مل جائے۔

1. کانپور اور آگرہ والے۔ کراچی میں 1921 میں مولانا کے ساتھ ہی سزایاب ہوئے تھے اور اس وقت یہی مولانا
کے مخلصوں میں تھے۔ چند سال ہوئے وفات پائی۔

اور یہاں خلاف توقع صرف صدارت ہی کے مسئلہ پر دیر تک بحث چھڑ جانے کے باعث ہمیں مولانا نثار احمد 1 وغیرہ کو مسجد جامع کا جلسہ شروع کردینے کے لیے بھیجنا پڑا۔ اس لیے اب ہم لوگ اٹھ کر مسجد جامع کو چلے گئے۔ جہاں دہلی کے مسلم افراد کی ایک جمعیۃ نے تین راتوں کے لیے جلسوں کا پوسٹر وغیرہ کے ذریعہ اعلان اور روشنی وغیرہ کا انتظام کردیا تھا۔ اور مفتی صاحب وغیرہ کو جمیل میاں کے پاس چھوڑ گئے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ مولانا عبدالحلیم صدیقی 1 ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے بیچ میں کود پڑے تھے اور جمعیۃ العلما اور مفتی کفایت اللہ صاحب کی فضیلت میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے وعظ دے رہے تھے، اور مولانا نثار احمد صاحب کو لب کشائی کا بھی موقع نہ دیا تھا، دوسرے دن بجائے مفتی صاحب کے جلسے کا بحیثیت داعی کے کام کرنے کے احمد سعید نے آغاز کردیا اور یعقوب 2 کی اور مولانا عبدالحلیم کی تقریریں ہونے لگیں جس کے باعث یوں ہی فضا مکدر ہوگئی۔ اب حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مفتی صاحب کا نام پیش کردیا۔ نعیم نے بھی اسی طرح کی تقریر کی (میں اب نہیں کہہ سکتا کہ کس کس نے تقریر کی مگر جہاں تک ایک مریض کا حافظہ کام دے رہا ہے لکھ رہا ہوں) بالآخر خواجہ غلام السیطین نے جو انتظام جلسہ اور دعوت ناموں کے اجرا میں احمد سعید کے ساتھ شریک مقرر کیے گئے تھے، رات کا فیصلہ مفتی صاحب کو یاد دلایا اور مفتی صاحب نے مبہم طریقہ پر اس کی ایک حد تک تصدیق کی، مگر یہ نہ کہا کہ ہم یہ طے کرچکے ہیں کہ بحیثیت داعی ہم خود ہی صدر کو منتخب کرلیں گے۔ کہا تو یہ کہ مجھے اس وقت تک فرصت نہیں ملی کہ جمیل میاں سے طے کرتا کہ وہ محمد علی کا نام پیش کریں اور میں تائید کروں یا میں خود تحریک کروں اور وہ تائید کریں۔ اب بحث اور چھڑ گئی اور پنجابی وہابیوں کی تائید ایک پکے وہابی مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے اس طرح فرمائی کہ خود مجھ سے اپیل کیا کہ میں اپنا نام واپس لے لوں۔ میں نے مجبور ہوکر ایک تقریر کی اور اس کے آخر میں یہ کہہ کر اپنا نام واپس لے لیا کہ مجھ پر اس اپیل کے خلوص کا تو مطلق اثر نہیں ہوا مگر جو حالات پیش آئے ہیں ان کے بعد اس مجلس کی صدارت کرنا میں اپنی توہین سمجھوں گا۔

---

1 جمعیۃ العلما کے ایک سرگرم رکن اس وقت کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں استاذ تھے۔

2 محمد یعقوب صاحب (علیگ) مرادآبادی ڈپٹی پریذیڈنٹ انڈین اسمبلی۔ بعد کو حیدرآباد میں ریفارم آفیسر ہوگئے اور وہیں دفعتاً انتقال کیا۔

برادرم! جو ذہنیت ان دینداروں کی اور جو مکاری ان کے لفظ لفظ سے ظاہر ہو رہی تھی اسے اس طرح ایک ایسے معاملہ میں بھی دیکھ کر جس میں ہمیں اپنی شریعت کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے غیروں کو بھی حاملین شریعت کے افکار اور ان کے اعمال سے متاثر کرنا تھا۔ اور ہر عقیدے اور طبقے کے مسلمانوں کے اس امر میں اتحاد و اتفاق کو عالم آشکارا کرنا تھا۔ میرا دل رو رہا تھا۔ میں نے جمعیۃ العلما کی صدارت کا کبھی بھی خیال نہ کیا تھا مگر جب معلوم ہوا کہ ایک خاص جماعت کو اس پر اصرار ہے اور بلا مجھ سے استمزاج کیے ہوئے انھوں نے چند ماہ پیشتر ہی میرا نام مجلس استقبالیہ کی طرف سے بھجوا دیا تھا اور اس کے بعد علمائے کرام میں عجیب عجیب ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں تو میں نے کانپور سے خط آنے پر اور مجلس استقبالیہ کے اصرار پر صرف اس کا وعدہ کیا تھا کہ خود انکار نہ کروں گا اور نہ خود کوئی کوشش کروں گا۔ اگر منتخب ہو گیا تو مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اور جمعیۃ کی از سر نو ترتیب کے متعلق جو عرصہ دراز سے میرے خیالات ہیں، انھیں بصد عجز و ادب جمعیۃ کے سامنے پیش کر دوں گا۔ مگر جو کارروائی کہ مراد آباد میں ہوئی اور اس سے پیشتر جو مضامین اور خطوط الجمعیۃ میں شفیع داؤدی اور شوکت صاحب کے خلاف صوبہ بمبئی کی جمعیۃ العلما کے جلسہ کی صدارت کے بارے میں بطور پیش بندی کے شائع کیے گئے۔ اور جس طرح کانپور والوں کے ساتھ صریح اور مسلسل بے ایمانی کی گئی ہے اور اب جس طرح بلا حصول رائے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب خود کھسک کر مسند صدارت پر جلوہ افروز ہو گئے۔ اس کے بعد میرے لیے ناممکن ہو گیا کہ ان حضرات سے کوئی توقع اصلاح کی رکھوں۔ جب جلسہ شروع ہو گیا تو میرے پاس متعدد درخواستیں آئیں کہ جلسہ سے ہم سب اٹھ کر چل دیں۔ مگر میں نے انکار کیا اور سب کو روکا تا کہ حکومت کو اور ہنود کو اس نفاق و شقاق کا نظارہ نہ دکھایا جائے۔ سب بیٹھے رہے۔ البتہ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ شام کے جلسے میں نہ آئیں گے۔ ہم نے کوئی احتجاج نہ کیا اور جو بیان ان تمام واقعات کے متعلق تیار کیا گیا اس کے حرف حرف کو صحیح اور درست کرنے کے بعد خود میں نے اس کی اشاعت کو روک دیا۔ جن لوگوں نے جمعیۃ العلما سے استعفے دیے ان کے استعفوں کو بھی اس وقت نہ بھجوانے دیا۔ ہماری جماعت نے وائسرائے کے پاس جو وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا اس میں بھی علاوہ مولانا حسین احمد صاحب کے اور دیوبند کے اکابر کے خود مفتی

صاحب کو بھی شامل کیا۔ میں شام کے جلسہ میں یوں بھی نہ آ سکتا تھا کیوں کہ علیل ہو گیا تھا۔ مفتی صاحب ان تمام بیہودگیوں کے بعد اشک شوئی کے لیے میری عیادت کے نام سے تشریف لائے اور میں نے انھیں ناشتہ کرایا۔ اور وفد میں جانے کے لیے نواب اسماعیل خاں نے ان سے کہا اور انھوں نے اقرار کیا۔ دوسرے دن یہ لکھ کر علاحدہ ہو گئے کہ شام کو میری ''جماعت'' (جمعیۃ نہیں اس لیے کہ اس نے اس کے خلاف کوئی قرارداد نہیں کی) نے کہا کہ تم نہ جانا۔ تاہم میں نے ان سے احکام شریعت در بارۂ نکاح حاصل کیے اور گو مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا عنایت اللہ صاحب کے بیانات نے جو بے حد مفصل اور مرتب تھے، مجھے اس سے مستغنی کر دیا تھا۔ تاہم میں نے بار بار مفتی صاحب سے ان کے بیان کا تقاضا کیا اور باوجود اپنی علالت کے ان سے ملنے گیا۔ مولانا حسین احمد صاحب شاہجہاں پور جا رہے تھے۔ اور اسٹیشن سے سیدھے گورنمنٹ ہاؤس چلے گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب [1] مرحوم نے آنے کا وعدہ فرمایا تھا مگر مرض الموت نے نہ آنے دیا۔ اور طیب [2] کو اپنی جگہ بھجوایا۔ لیکن مفتی صاحب اور ان کے حواریوں کا رویہ دیکھیے کہ مولانا عبدالحلیم صدیقی نے ایک تقریر فرمائی جس میں ارشاد فرمایا کہ خدارا ہمیں گورنمنٹ کے آستانہ پر سر جھکانے کے لیے نہ لے جائیے۔ ہم پر رحم کیجیے (حالانکہ احمد سعید Age of consent committe) کے سامنے غلط سلط شہادت دینے کے لیے بلا تامل چلے گئے تھے۔ بہار کے سجاد نے ہم پر وائسرائے کی دست بوسی کی تہمت لگائی اور احمد سعید نے بھی الجمعیۃ میں دروغ بافیوں کا عرصہ تک سلسلہ جاری رکھا (جو حقیقتاً آج تک جاری ہے) آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان ہم دونوں کو بیگار سمجھ کر سارا کام ہمیں پر چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ مگر یہ سن کر آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کو اسی جاہل مطلق نے جا کر سوتے سے جگایا تھا اور ہمدرد میں میرا ہی مضمون اواخر مارچ 28 میں اس بل کے خلاف شائع ہوا تھا اور اس کو لے کر میں صدر جمعیۃ العلما کی خدمت میں خود حاضر ہوا تھا، اور اس پر بھی ان کی غفلت کا وہ عالم رہا کہ نہرو رپورٹ کے معاملے میں تو یہ اس کی تائید میں در پردہ کوشش کر رہے ہیں مگر شریعت کی حرمت

---

[1] مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی ناظم دارالعلوم دیوبند۔

[2] مولانا محمد طیب دیوبندی موجودہ ناظم دارالعلوم دیوبند۔

برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے شاردا بل کے منظور ہو جانے تک اس قدر کم کام کیا کہ نہیں کرنے کے برابر ہے۔ بہر حال اب باوجود بصارت اور اعصاب کی اس حالت کے اور بخار جاڑے کے دو تین دن میں نے Age of Consent کمیٹی کی رپورٹ پڑھی اور 25 ٹائپ کے صفحات کا تحریری بیان تیار کیا اور ساری رات اور سارا دن خود ہی جاگ کر اور آرام لیے یا کھانا کھائے بغیر اسے ٹائپ کر کے ایک دن پہلے وائسرائے کے سکریٹری کے دے آیا۔ مسلمانوں کی قوم میں ایک بھی ٹائپسٹ نہ ملا جو اس کام کو کرتا۔

تین بجے شام کو یہ بیان وائسرائے کو ملا۔ بیچارہ کو گھنٹہ بھر بھی اس کے دیکھنے کو نہ ملا ہوگا۔ دوسرے دن گیارہ بجے وفد پہنچا۔ جو جواب دیا اس کا جواب ہمارے تحریری بیان میں پہلے سے موجود تھا۔ جب اس نے کہا کہ آپ کے بیان پر میں اس وقت تک صرف ایک سرسری نظر ڈال چکا ہوں تو میں نے اس اقبال سے فائدہ اٹھایا اور کہا کہ آج ہم آپ سے جواب لینا نہیں چاہتے جب آپ اسے دوبارہ اچھی طرح سے پڑھ لیں گے تو آخری جواب اس وقت لیں گے۔ چنانچہ 15 نومبر کو باوجودیکہ وہ اسی دن دکن کے دورہ پر جارہا تھا ڈیڑھ گھنٹہ اس سے مفصل اور صاف صاف گفتگو رہی۔ اور وہ قائل ہو گیا کہ ہم اپنے عقائد اسلامی پر قائم رہتے ہوئے اس قانون کو قبول نہیں کر سکتے۔ گو ہنود کے باعث اپنی مجبوری کا بھی اظہار کیا (اس کو راز ہی میں رکھیے) دوسرے ہی دن وہ نواب صاحب سے ملا اور کہا کہ اگر محمد علی نے Test Case اس بنا پر جیت لیا کہ میں نے جس بل کے پیش ہونے سے پیشتر اس کے پیش ہونے کی اجازت دی تھی (جس کے بغیر کسی مذہب یا مذہبی رسم ورواج کے متعلق کوئی مسودہ ہی نہیں پیش ہو سکتا) وہ صرف ہنود کے لیے تھی تو میرے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے اور مسلمانوں پر اس کا نفاذ کسی دوسرے بل کے ذریعہ سے نہیں ہونے دوں گا۔ میں وائسرائے سے ملنے سے پیشتر مفتی صاحب اور احمد سعید کے سامنے جامع مسجد میں مسلمانوں کو جتا کر گیا تھا کہ کیا کہنے جاتا ہوں اور واپس آ کر مسجد جامع میں نماز مغرب سے قبل جو گفتگو ہوئی تھی، سب دہرا دی اور دونوں کو گھر سے بلوا کر ان ہی کے سامنے سب کچھ کہا۔ تاہم ان کی حرکات ملاحظہ ہوں کہ ایک مجلس ناموس تحفظ شریعت بناتے ہیں جس میں نہروانی جماعت [1]

[1] نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں صدر کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کے ہم خیال لوگ۔

حبیب الرحمٰن لدھیانوی، نعیم اور ظفر علی خاں تک ہیں لیکن میرا نام تک نہیں ان کی بے سود ہڑتال کی میں نے مخالفت نہیں کی، گو اسے بے سود اور غیر موثر سمجھا، تاہم مجھے بدنام کیا گیا۔ پھر جب اس سے بھی کام نہ نکلا تو جلوس نکالا، مجھ سے آ کر ملے اور امداد چاہی تو میں نے اس جلسہ میں بھی ان کی صدارت میں تحریک پیش کی۔ گو انھوں نے میری رائے پر عمل نہ کیا اور جلوس کو چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کی کچہری تک نہ لے گئے۔ اس کے بعد ان حضرات کے پاس کچھ نہ تھا۔ میرے گھر آئے، میں نہ تھا۔ دوسرے دن اسماعیل خاں اور شفیع کو لے کر ان کے گھر گیا تو انھوں نے کہا کہ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں! تب میں نے وہی تدبیر بتائی جو میں اندوری کے قیام میں طے کر چکا تھا کہ اس قانون کی خلاف ورزی کی جائے۔ مگر اس طریقہ پر نہیں جس سے شریعت بدنام ہو یعنی محض خلاف ورزی کی خاطر بلا ضرورت گڈے گڑیا کا بیاہ کرنا بلکہ جس لڑکے کو جس کی عمر 16 یا 17 سال کی ہو، قانون' کے باعث نکاح کی ضرورت ہو اور وہ اس حالت میں فرض یا کم سے کم واجب ہی ہوتا ہو، ایک 15 یا 16 برس کی تندرست اور بالغ لڑکی سے اس کا نکاح کرا دینا یا نابالغہ کا نکاح اس کے ولی کے حکم سے کرانا جب کہ اسے عمر یا سفر کے باعث اندیشہ ہو کہ اگر وہ مر گیا تو لڑکی یا اس کا مال و متاع خراب لوگوں کے ہاتھ میں پڑ جائے گا اور اس لیے وہ اس کے سسر وغیرہ کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ یا ایسی حالت میں جب کہ لڑکی کی ماں زندہ نہیں ہے یا بڑی بہن کی شادی ہونے کے بعد وہ رخصت کر دی جائے گی۔ اور اس کی تربیت کے لیے ساس کے سوا کوئی عورت میسر نہیں ہے یا ولی اس قدر غریب ہے کہ بچی کی پرورش نہیں کر سکتا اور سسر کے حوالے کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ صرف ان ہی حالتوں میں نکاح پڑھوا کر اور رخصت کرا کے شاردا ایکٹ کی خلاف ورزی کی جائے[1]۔

یہاں تک 11 اپریل کو لکھا جا چکا تھا مگر اتنا لکھنے کے بعد اس قدر تھک گیا کہ دوسرے دن کے لیے مجبوراً ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن دوسرے دن آنکھوں کے Specialist کے پاس گیا اور اس نے بہت محنت کے ساتھ آنکھوں کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ بائیں آنکھ تو بالکل جا ہی چکی ہے۔ اس سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیے لیکن سیدھی آنکھ کی حالت بھی نہایت خطرناک ہے۔ معلوم ہوتا

---

[1] اس کے آگے مکتوب مولانا کا لکھا ہوا نہیں، کسی اور کے قلم کا ہے۔

ہے کہ آپ نے حال ہی میں نگاہ پر زیادہ زور ڈالا ہے یا جوش کی حالت میں کسی سے باتیں کی ہیں۔ اس لیے کہ خون کی ایک دو پھٹکیں تازہ نظر آ رہی ہیں۔ غالباً یہ اسی عریضہ کے متعلق ڈاکٹر کا خیال تھا یا ایک اور خط کے متعلق جس کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں، جو میں نے سپرو1 کو خود ہی بیٹھ کر مسلسل چھ گھنٹے میں ٹائپ کیا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر کا بیان ہے کہ آنکھ کی Blood Vessel2 دیواریں پھٹنے کے بعد اتنی کمزور ہوگئی ہیں کہ اب ہر وقت دوبارہ پھٹنے کا اندیشہ ہے۔ اس وقت تک خدا کا بڑا فضل ہوا ہے کہ گو ہر طرف خون کی چند پھٹکیں موجود ہیں جو بصارت کو دھندلا کر رہی ہیں مگر بیچ کے دائرے میں جسے Macula کہتے ہیں ایک پھٹک بھی موجود نہیں اور جو کچھ ہے وہ اسی آنکھ کی بصارت ہے۔ اگر آپ نے لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھا یا تقریر کی تو نہیں کہہ سکتا کہ چند سیکنڈ یا چند منٹوں یا چند گھنٹوں میں آپ بالکل اندھے نہ ہو جائیں۔ آپ کی آنکھ کے لیے کوئی دوا نہیں جو مفید ثابت ہو، سوائے اصل مرض کے علاج کے جو ذیابیطس ہے۔ اور سال دو سال کے مسلسل آرام کے۔ میں تو کہوں گا کہ آپ نوکر کو بھی کمرے میں نہ پکارا کریں بلکہ اسے کمرے ہی میں بیٹھے رہنے دیں تاکہ اشارے سے بلا سکیں۔ اس کو پکار کر بلانے سے بھی آنکھ کے کسی نہ کسی BloodVessel کے پھٹنے کا اندیشہ ہے اور اگر (Hemorrage3) ہو گیا اور خون کی پھٹک آنکھ کے سامنے آ گئی تو آپ بالکل اندھے ہو جائیں گے۔ کامل ایک گھنٹہ کے امتحان کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے Eye specialist4 کی یہ رائے ہے۔ مجبور ہو کر سب کام چھوڑنا پڑا ہے۔ مگر ڈاکٹر نے جو مزید شرط لگائی ہے کہ تفکرات کو دور رکھو، اس کا کیا انتظام کر سکتا ہوں۔ بالخصوص اس زمانہ میں جب کہ بظاہر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانانِ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ مسلمان جو ہماری قید و بند سے بھی متاثر ہو کر ہماری منت سماجت پر ہم سے متفق نہیں ہوتے تھے اور انگریزوں کی غلامی ترک کر کے ہندوؤں سے مصالحت کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے ان میں سے بعض باوجود ہماری آج کل کی منت و سماجت کے ہندوؤں کی غلامی کی طرف جھپٹے چلے جا رہے ہیں اور صرف اس لیے کہ اگر ہندو اس جنگ میں جیت گئے تو ہمارا کیا

---

1 سر تیج بہادر سپرو۔ ہندوستان کی لبرل پارٹی کے مشہور لیڈر۔ 2 شریان خون۔
3 سیلان خون۔ 4 ماہر امراض چشم۔

حشر ہوگا اور ان ستیہ گرہی سور ماؤں کو اپنی حفاظت کا سوائے اس کے کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ علی برادران پر حملہ کریں۔ ان نبرد آزماؤں کو اس کا بھی خیال نہیں کہ وہ ایک مریض پر بھی جوان کا جواب نہیں دے سکتا۔ متواتر حملے کررہے ہیں اور اس کے خلاف گندے سے گندے اور جھوٹے سے جھوٹا پروپیگنڈا کررہے ہیں اور لطف تو یہ ہے کہ حاملین شریعتِ حقہ یعنی علمائے کرام ان نبرد آزماؤں کے قائد اور رہنما ہیں اور الجمعیۃ[1] کے کالم اس کے لیے وقف ہوگئے ہیں۔ اب ان جملہ ہائے معترضہ کو میں یہیں ختم کرتا ہوں اور اپنے عریضہ کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتا ہوں۔ میری بتائی ہوئی تدبیر پر خوب جرح وقدح کی گئی اور جو تدبیر بتائی جارہی تھیں یعنی شراب کی دکانوں پر پکٹنگ وغیرہ۔ اس پر بھی غور کیا گیا اور آخر کو یہی طے پایا کہ دہلی میں ہم سب مل متفقہ طور پر متذکرۂ بالا قسم کا نکاح پڑھوا کر شاردا ایکٹ کی خلاف ورزی کریں اور جب ہم پر مقدمہ چلایا جائے تو عذر پیش کریں کہ اس قانون کا نفاذ مسلمانوں کے خلاف نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ ہماری شریعت کے خلاف ہے اور ایسے قانون کو مجلس مقننہ میں پیش کرنے سے پہلے گورنر جنرل سے۔

(مکتوب اس مقام پر اچانک ختم ہوگیا ہے۔ اس کے آگے کے فقرے پھر مولانا کے قلم سے)

برادرم ایک اپاہج بھائی سے جس قدر لکھایا لکھوایا جاسکا۔ مگر اتنے دن کے انتظار کے بعد مجبور ہوکر اس عریضے کو اسی طرح ناتمام بھیج رہا ہوں۔ میری آخری تحریر ہے۔ آخری تقریر بی اماں کے مولد امروہہ میں 3/4/5 کو کروں گا[2]۔ براہ کرم وہاں تشریف لے آئیے۔ کانپور کا وعدہ فرمانے کے باوجود انتظار ہی دکھایا۔ اگر میں واقعی آپ کا اپاہج بھائی اب بھی اس قابل ہوں کہ آپ جیسا مسلمان مجھ سے مل سکے تو ضرور آئیے۔

محمد علی

---

[1] جمعیۃ العلما کا اخبار جو اس وقت ہفتہ وار یا سہ روزہ تھا۔

[2] امروہہ میں جمعیۃ العلما کا جدید کا جلسہ تھا۔ یہ انتہائی حسرت ویاس کے لفظ مسلمانان ہند کے سب سے بڑے لیڈر کے قلم سے کل 52 سال کی عمر میں نکل رہے ہیں

باب:82

3:1930

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

صحابیوں کے سرتاج عمر فاروقؓ سے متعلق جب حدیث نبوی میں یہ مضمون نظر سے گزرا تھا کہ عمرؓ کی حق گوئی نے ان کا کوئی دوست باقی نہ رکھا، تو دل پر بڑا اثر پڑا تھا، اور حیرت بھی ہوئی تھی۔ قدرت حق نے اس کا ایک ہلکا سا نمونہ آنکھوں کو دکھا دیا۔ محمد علی اس آفتاب کے سامنے ایک ذرہ سہی، لیکن بہرحال اس ذرہ پر بھی اسی آفتاب کا پرتو پڑ رہا تھا۔ یہ مخالف، وہ مخالف، عمر بھر کے دوست رفیق، عزیز مخالف۔ جو اپنے خاص دست و بازو تھے وہ مخالف۔ اب کارٹون ان کے نکل رہے ہیں، ہجویں ان کی چھپ رہی ہیں اور مخالفانہ مضمونوں اور تقریروں کی تو حد ہی نہیں۔ اور یہ ساری یورش اس محمد علی پر، جس کی بائیں آنکھ تو بالکل ہی جا چکی اور داہنی آنکھ کے بھی چلے جانے کا ہر وقت خطرہ۔ زور سے بات کرنا تک منع تھا!......عجب تماشہ تھا۔ کل تک عین مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں یہ الزام بعض حقدسین کی زبان سے لگایا جا رہا تھا کہ محمد علی تو بالکل ہندوؤں کے ہاتھ بک چکے ہیں۔ برابر مسلمانوں پر ظلم وزیادتی ہوتے دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں بولتے۔ اور آج جب محمد علی کانگریس میں اندھادھند شرکت سے روکنے لگے تو خود ہی لوگ پلٹ پڑے اور کہنے لگے کہ یہ تو عین انگریز پرستی ہے۔ یہ ہمیں آزادی

کی راہ سے روک رہے ہیں!

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا!

لمبا چوڑا خط جس کے بعض حصے خون جگر سے لکھے ہوئے ہیں، ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، لیکن جی نہیں مانتا کہ بعض فقروں پر دوبارہ آپ کو توجہ نہ دلائی جائے۔ سنیے:

''ہندوستان کے سب سے بڑے ماہر امراض چشم کی یہ رائے ہے۔ مجبور ہو کر سب کام چھوڑنا پڑا ہے۔ مگر ڈاکٹر نے جو مزید شرط لگائی ہے کہ تفکرات کو دور رکھو، اس کا کیا انتظام کر سکتا ہوں۔ بالخصوص اس زمانہ میں جب کہ بظاہر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانان ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ مسلمان جو ہماری قید و بند سے بھی متاثر ہو کر ہماری منت وساجت پر ہم سے متفق نہیں ہوتے تھے اور انگریزوں کی غلامی ترک کر کے ہندوؤں سے مصالحت کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے ان میں سے بعض باوجود ہماری آج کل کی منت وساجت کے ہندوؤں کی غلامی کی طرف جھپٹے چلے جار ہے ہیں اور صرف اس لیے کہ اگر ہندو اس جنگ میں جیت گئے تو ہمارا کیا حشر ہوگا اور ان ستیہ گرہی سور ماؤں کو اپنی حفاظت کا سوائے اس کے کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ علی برادران پر حملہ کریں۔ ان نبرد آزماؤں کو اس کا بھی خیال نہیں کہ وہ ایک مریض پر بھی جو ان کا جواب نہیں دے سکتا۔ متواتر حملے کر رہے ہیں اور اس کے خلاف گندے سے گندے اور جھوٹے سے جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ حاملین شریعتِ حقہ یعنی علمائے کرام ان نبرد آزماؤں کے قائد اور رہنما ہیں اور الجمعیۃ[1] کے کالم اس کے لیے وقف ہو گئے ہیں''۔

اجلاس جمعیۃ العلما کی صدارت کے لیے مولانا کا نام بعض علما کی طرف سے پیش ہوا۔ لیکن بعض بڑے ذمہ دار اور اونچے قسم کے علما نے یہ کہہ کر اس کی شدید مخالفت کی کہ محمد علی ''عالم'' نہیں ہیں۔ اعتراض ضابطہ سے صحیح تھا لیکن اول تو بعض غیر علما اس کے قبل بھی جمعیۃ کی صدارت کر چکے تھے، اس کی نظیر موجود تھی۔ دوسرے محمد علی کا اصل استدلال یہ تھا کہ مذہبی

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ 1930 کے الجمعیۃ کا ذکر ہے، نہ کہ اس ڈائری کے مسودہ کے وقت کا۔ 45 کے الجمعیۃ کا اور اس کی نظر ثانی کے وقت 1952 کے الجمعیۃ کا۔

مباحث میں تو علما کی قیادت بیشک مسلم لیکن جمعیۃ جب مذہبی مسائل پر نہیں بلکہ سیاسی امور پر بحث کررہی ہے تو اب عالم اور غیر عالم کے کوئی معنی نہیں۔علما کا احترام اپنی جگہ پر قطعاً مسلم، لیکن صرف مذہبیات کے حدود کے اندر یہ نہیں کہ عالم کو ہر حال میں اور ہر موقع پر غیر عالم سے بلند تر رکھا جائے۔محض دنیوی مسائل پر جہاں بحث ہوگی وہاں عالم و غیر عالم ہر مسلمان کا درجہ یکساں ہے۔محمد علی اپنی علی گڑھی اور ولایتی تعلیم و تربیت کے علماء کے احترام کے ہرگز منکر نہ تھے۔ وہ ان کے پورے مرتبہ شناس وقدر شناس تھے لیکن اس غلو کے بھی قائل نہ تھے۔ درجۂ اعتدال و توازن قائم رکھے ہوئے تھے۔ احترام واجب کے ڈانڈے پرستش سے الگ کیے ہوئے تھے۔ان کا کہنا یہ تھا کہ جس طرح ڈاکٹر صرف مسائل طب میں مستند و معتمد ہے اور وکیل صرف مسائل قانون میں، اسی طرح فقیہ صرف مسائل فقہ مقتدا و محترم تسلیم کیا جائے گا۔ یہ نہیں کہ چونکہ وہ فقیہ ہے اس لیے محفل مشاعرہ کا بھی صدر وہی ہو، مسائل طب میں بھی اس کا حکم چلے۔سیاسیات میں بھی وہی امام تسلیم کرلیا جائے ...... یہ نکتہ آج ایک موٹی اور معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس وقت خدا معلوم کیوں بہتوں کی سمجھ میں یہ آیا نہیں، یا بعض کو اس کے نہ سمجھنے ہی میں مصلحت نظر آئی۔ بہر حال محمد علی کو بہت کچھ اس جرم میں سننا پڑا۔اور یقیناً اس طوفانِ سب وشتم سے ان کے بہت سے گناہ زبان کے دُھل گئے۔ ذیل میں اقتباسات اس قسم کی ''شریفانہ'' تحریروں کے دیے جاتے ہیں کہ ڈائری خواں کچھ تو اسوقت کی فضا کی تیرگی کا اندازہ کرسکیں......لیکن نہیں، اس سے سوااس کے کہ آج اتنے دنوں کے بعد پھر کچھ تلخیاں عود کرآئیں، اور ناظرین کو بھی مزید غصہ اس وقت کے مخالفین و معاندین پر آ جائے، اور کچھ حاصل نہیں اس لیے ان اقتباسات کی یہاں تلاش نہ فرمایئے۔

....

یہ سب کچھ تھا ہی، ادھر لڑکی کی شادی کی تاریخ سر پر چڑھی چلی آرہی تھی۔اوپر گزر چکا ہے کہ گلنار بی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔منگیتر شعیب قریشی مولانا کے خاص رفیقوں میں رہ چکے تھے۔سن سے ذرا اتر چکے تھے مگر ماشاء اللہ ہر طرح کس بل سے درست، خوب ٹانٹھے، جیسا کہ ہر جوان صالح و پاکباز جوانی کے بعد تک رہتا ہے۔تاریخ بالآخر طے پا گئی اور دعوت نامہ

اس نیاز مند کے نام موصول ہوا۔ دعوت نامے بہت ہی محدود تعداد میں جاری ہوئے تھے۔ مخصوصین کے نام نہیں بلکہ مخصوصین میں جو اخص تھے صرف ان ہی کے نام۔ اور اسی فہرست میں یہ ڈائری نویس بھی داخل تھا۔ مولانا اب بمبئی سے دہلی واپس آ چکے تھے اور قرول باغ میں جو نیا مکان اقبال منزل کے نام سے لیا تھا، وہی مقیم تھے۔ اس مکان کو کوچۂ چیلان والے وسیع مکان سے کوئی مناسبت نہ تھی، تاہم یہ بھی غنیمت تھا کئی درجہ چھوٹے چھوٹے تھے اور سب ملا کر فی الجملہ گزر کے قابل تھا۔ شادی اسی مکان سے ہونے والی تھی، اور خط یہیں سے موصول ہوا:

''23 مئی 30۔ اقبال منزل، قرول باغ، دہلی

برادرم ماجد میاں صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

ایک نہایت ہی طویل مگر اپنی بینائی کے باعث نا تمام عریضہ مدت ہوئی ارسال کر چکا ہوں 1 مگر اب تک رسید نہ ملی 2۔ کانپور آنے کا وعدہ کر کے نہ آئے 3۔ حالانکہ اس وعدہ میں بھی مجھ سے علاحدگی کا اعلان 4 تھا۔ اب امروہہ بلایا تب بھی نہ آئے 5۔ سنا ہے بہن کی طبیعت نادرست ہے 6۔ اگر یہ ہے تو دست بہ دعا ہوں، گو

کیا کہوں میری دعا بھی تو نہیں ہے مقبول
ورنہ خود حالت اس قدر خراب کیوں ہوتی

گلنار کا نکاح چھ بجے شام کو بتاریخ 29 ذی الحجہ 29 مئی قرار پایا ہے، مع بہن اور بچوں کے تشریف لائیے۔ آپ کا سخت انتظار ہے۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کا انتقال ہو گیا 7۔ عالی حضرت نواب صاحب رامپور سخت علیل ہیں 8 مگر اپنی مجبوریوں کے باعث معذور ہوں 9۔ یہ سنت مارچ سے ٹلتے ٹلتے آخر مئی تک آ پہنچی۔ تشریف آوری کے وقت سے مطلع فرمائیے۔

ہمدرد کے نام سچ آتا تھا جو بند ہو گیا۔ تعجب ہے کہ سچ میرے نام جاری نہ ہوا۔ 10

آپ کا بھائی محمد علی

مکتوب میں کئی باتیں تشریح طلب ہیں اس لیے کتابت میں اس پر ہندسہ ڈال کر تشریحات نمبروار ذیل میں عرض کی جاتی ہیں:

تشریحات

---

1 وہی طویل مکتوب بمبئی سے 11 اپریل کا لکھا ہوا ہے، جو اوپر درج ہو چکا۔

2 یہ ممکن نہ تھا کہ مولانا کا مکتوب آئے اور جواب نہ عرض کیا جائے۔ خدا معلوم اس وقت کیا صورت پیش آ گئی تھی جو مولانا تک جواب نہ پہنچ سکا۔

3 کانپور میں جدید جمعیۃ العلما کا افتتاحی جلسہ ہوا تھا۔ اور کانپور ہی اس جدید جمعیۃ کا مستقر قرار پایا تھا۔ صدر غالباً مولانا ہی مقرر ہوئے تھے۔ اصلی کارکن اور بہت پیش پیش مولانا عبدالماجد بدایونی تھے۔

4 میں نے اپنے عریضہ میں لکھا تھا کہ آپ جہاں کہیں بھی موجود ہوں اور جس غرض سے بھی بلائیں، مجھے حاضری میں کیا عذر ہو سکتا ہے لیکن یہ حاضری محض شخصی تعلق اخلاص و نیازمندی کی بنا پر ہو گی نہ کہ اس مجلس کے ساتھ ہم آہنگی کی بنا پر۔ مولانا نے اس کو اپنے سے علاحدگی کے معنی میں لیا۔

5 امروہہ میں دوسرا جلسہ اسی جدید جمعیۃ کا بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا اور اس میں مولانا نے گویا اپنا دل چیر کر رکھ دیا تھا۔ بڑا چرچا ان کی اس تقریر کا رہا تھا۔

6 عین اس وقت تو نہیں لیکن اس سے کچھ قبل گھر میں طبیعت زیادہ علیل تھی۔

7 نواب سلطان جہاں بیگم نور اللہ مرقدہا مراد ہیں۔ بڑی مسلم صفت و درویش دل فرماں روا گزری ہیں۔

8 ہز ہائنس نواب حامد علی خاں مراد ہیں۔ اسی کے چند روز بعد انتقال کر گئے۔ یہ وہی ذات شریف ہیں جنھوں نے اپنی آخری عمر تک محمد علی کو رامپور میں قدم نہ رکھنے دیا۔ حالانکہ محمد علی اپنی طرف سے ان کی ذات خاص کے ساتھ برابر تعلق وفاداری و نیاز مندی قائم رکھے رہے۔

9 مطلب یہ کہ ان حالات کے اقتضا کا یہ تھا کہ عقد کی تاریخ کچھ بڑھا دی جائے لیکن دوسری معذوریاں اس راہ میں حائل تھیں۔

10 حضرت مولانا تھانویؒ اور خود محمد علیؒ، یہ دونوں بزرگ ایسے گزرے ہیں کہ ان سے جہاں مجھے انتہائی عقیدت اور محبت تھی، وہیں میں ان سے ڈرتا بھی بہت رہتا تھا۔ دونوں کے احساس نہایت نازک ولطیف تھے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ چیز پر بھی نظر رکھتے تھے۔ میں نے کبھی ان دونوں بزرگوں کے نام سچ یا صدق جاری نہیں کیا۔ اس ڈر سے کہ خدا معلوم کون سی تحریر ان کے مذاق لطیف پر گراں گزرے۔ اور فوراً مجھ سے مواخذہ ہونے لگے.....مولانا محمد علیؒ نے بعد کو ایک بار زبانی بھی تقاضا کیا کہ سچ میرے نام کیوں نہیں آتا میں نے جواب عرض کیا کہ ''مجھے اپنا تعلق نیاز مندی آپ کے ساتھ بہت ہی عزیز ہے، اور اس کے تحفظ کے خیال سے میں نہیں چاہتا کہ آپ میرا اخبار پڑھتے رہیں''۔

......☆☆☆......

باب:83

4:1930

(چھوٹی لڑکی کا عقد۔ عالمِ ناسوت میں آخری ملاقات)

دعوت نامہ ایسے وقت پہنچا، جب میں تھانہ بھون میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ کی خدمت میں طویل عرصہ کے لیے مقیم تھا۔ حضرت تھانویؒ کے ساتھ گہری عقیدت دو ڈھائی سال سے پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے تو ان کے مواعظ و تصانیف متعلق فن سلوک کو پڑھ کر، اور پھر جب سے جولائی 28 میں پہلی بار ان کی زیارت ہوئی، اس وقت سے عقیدت کے درجات میں بھی ترقی ہو گئی تھی، اور آمد و رفت کا سلسلہ بھی قائم ہو گیا۔ چنانچہ اب جب کہ آخری مئی 30 تھا، یہاں 6،5 ہفتوں کے قیام کے ارادہ سے آیا ہوا تھا، اور ابھی یہ مدت آدھی بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ خط پاکر ایک عجب پس و پیش میں مبتلا ہو گیا۔ نہ جاؤں تو دل اسے کیسے گوارا کرے، جاؤں تو اس سفر کے لیے حضرت تھانویؒ سے اجازت حاصل کرنے کی ہمت کہاں سے لاؤں...... مولانا سے اور حضرت سے بے لطفی ایک مدت سے چلی آ رہی تھی، اور بے لطفی کا سبب خاص یعنی شدید سیاسی اختلاف، اب نسبتاً بہت ضعیف ہو چکا تھا، پھر بھی غلط فہمیوں کا پہاڑ درمیان میں حائل تھا...... غلط فہمیوں اور باہمی رنجشوں سے جب رسول پاکؐ کے صحابیوں تک کا دامن نہ پاک رہ سکا، تو چودھویں صدی ہجری کے بزرگانِ امت کے لیے اس سے بری اور تنزیہ کا دعویٰ کس منہ سے کیا

جاسکتا ہے؟ یہ شان تو اس دنیا والوں کی نہیں ہے، صرف اہل جنت کی ہوگی کہ وَنَزَعْنَا مَا فِی صُدُوْرِھِمْ مِنْ غِلٍّ۔

ڈرتے ڈرتے حضرت کی خدمت میں ذکر کیا۔ اجازت صرف ملی ہی نہیں، بلکہ بڑی خندہ جبینی اور انبساط قلب کے ساتھ ملی۔ یہی نہیں، اصرار وتاکید کے ساتھ ارشاد ہوا کہ ''ضرور جائیے۔ اتنے قدیم تعلقات کے حقوق کی ادائی یہی ہے''...... کیا کہا جائے ان بیداد گروں کو جنھوں نے حضرت تھانوی کو ''خشک'' مشہور کر رکھا ہے!...... بیوی اور بچیاں اس وقت سہارنپور میں تھیں۔ بھائی صاحب وہیں ڈپٹی کلکٹر تھے، اور اس سلسلہ میں میرے بھی اہل وعیال وہاں آکر عرصہ تک رہ جاتے تھے، تھانہ بھون سے وہاں کا فاصلہ ہی کیا تھا۔ سہارنپور آ، سب کے لے لوا، 5، 6 آدمیوں کا قافلہ دہلی کو روانہ ہوگیا۔ شادی وغیرہ کی تقریبات میں شرکت کا اپنا عام معمول اس وقت بھی نہ تھا۔ عزیزوں کے ہاں شرکت کا اتفاق کم ہی ہوتا تھا۔ محمد علی کے ہاں کی کشش عزیزوں کے ہاں سے بڑھ کر تھی۔ شدید گرمی میں سفر اختیار کر کے شریک ہوا اور وہ بھی تنہا اپنی ذات سے نہیں، بیوی اور بچیوں کو لے کر شریک ہوا۔ ایک طرف یہ احساس بھی پورے طور پر تھا کہ مہمان جتنے بھی بڑھیں گے، خواہ مخواہ محمد علی پر زیر باری ہی ہوگی۔ اور اس لیے عقل کا مشورہ یہی تھا کہ شریک نہ ہوا جائے۔ لیکن دوسری طرف یہ ڈر بھی تھا کہ اگر اب کی بھی بلائے پر نہ گیا، محمد علی کو بڑی سخت ناخوشی ہوگی اور یہی خیال آخر میں سب پر غالب آیا۔

محمد علی کے ساتھ اب سیاسی کام کرنے والے زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ابھی چند سال تک ان کے مشن کے مخالف رہ چکے تھے۔ سرکار برطانیہ سے اپنے ہوا خواہانہ تعلقات کے لیے بدنام تھے، اور ''نیشلسٹ'' تحریک کے بالکل مخالف تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کے ذاتی تعلقات محمد علی سے پہلے بھی بہت اچھے تھے، لیکن اب وہ ان کی سیاسیات میں بھی بہت پیش پیش ہوتے جارہے تھے۔ سچ برابر اپنے اسی مسلک قدیم کے ساتھ، گو لب ولہجہ کو ہلکا کر کے نکل رہا تھا۔ سچ کو ان بزرگوار کی اتنی مداخلت خلافت کمیٹی میں دیکھ کر ناگواری کے ساتھ حیرت ہوئی۔ اور ایک بار ڈرتے ڈرتے یہ عرض کرنا پڑا کہ اور کسی سے تو کچھ کہنے سننے کی ہمت نہیں، البتہ ملت کے سب سے زیادہ محبوب اور مخلص ترین لیڈر محمد علی سے یہ ضرور کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

....

صبح کوئی 8، 9 کا وقت ہوگا جب ہم لوگ اسٹیشن سے ایک شکرم[1] پر لدے پھندے قرول باغ میں اقبال منزل کے دروازہ پر آکر رکے، سامنے ہی نظر اپنے ہمنام مولانا بدایونی اور نواب محمد اسماعیل خاں (میرٹھ والے) پر پڑی۔ یہ لوگ اس وقت مولانا کے مخلص ترین رفیق تھے اور مولانا بدایونی تو دور تحریک خلافت میں بھی بہت کچھ ساتھ دے چکے تھے باہر کے مہمانوں میں یاد پڑتا ہے کہ بس ہم ہی تین تھے اور باقی مہمانوں میں مولانا کے اعزہ و اہل خاندان تھے۔ چند ہی منٹ میں محمد علی خود دکھائی دیے۔ پر جوش معانقہ کے بعد فوراً بولے "آپ کے مصرعہ کے جواب میں جی تو آیا کہ بچ کو ایک پوسٹ کارڈ پر ایک شعر ہی لکھ کر بھیجوں ۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں !

شعر سنا تھا کہ جیسے میرے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا، ندامت کا احساس آج تک زندہ ہے......
کیا گزر گئی ہوگی محمد علی کے قلب پر، جب مجھ جیسے ہمہ اخلاص و نیاز کے قلم سے وہ مصرعہ اپنی شان میں پڑھا ہوگا! یہ بالکل ٹھیک ہے کہ اس وقت تک وہ گالیاں کھاتے کھاتے اور سب و شتم سنتے سنتے ہر طنز و ہر تعریض کے بالکل عادی ہو چکے تھے، لیکن میرے قلم سے اس مصرعہ کے ادا ہونے کے معنی ہی کچھ اور تھے۔ حسین بن منصور حلاج کی حکایت سنی ہے کہ اوروں کے پھینکے ہوئے پتھر بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیے تھے لیکن ابوبکر شبلی کے ہاتھ کا پھول بھی نہ سہ سکے۔

....

دہلی جمعیۃ العلما کا مرکز و مستقر تھا، اور یہاں اس وقت محمد علی کی مخالفت شباب پر تھی۔ جامع مسجد کی جمعہ والی تقریروں میں کسی مقرر کا محمد علی کے مقابلہ میں ٹھہرنا مشکل تھا۔ حالانکہ جمعیۃ کے پاس خود بھی بڑے بڑے خوش بیان مقرر موجود تھے۔ آخری مولوی شاہ عطاء اللہ صاحب

---

1. کرایہ کی گھوڑے گاڑی کو (جس میں دو گھوڑے جتے ہوتے تھے) شکرم کہتے تھے۔ 1930 تک دہلی میں اس کا رواج تھا اور یہ اسٹیشن پر مل جایا کرتی تھی۔

بخاری امرتسر سے دہلی لائے گئے۔شاہ صاحب خطیبوں اور مقرروں کے سردار تھے خصوصاً عوام کے مجمعوں کے لیے تو خطیب اعظم۔ میرے دہلی پہنچتے ہی خبر یہ سننے میں آئی کہ مولانا کو پوری طرح زیر کرنے کے لیے یہ سب سے زیادہ زبردست توپ لے آئی گئی ہے۔اوران کے چیلنج کے الفاظ بھی سننے میں آئے ،جن کا دہرانا بھی اب تکلیف دہ ہے۔خود مولانا سے ذکر آیا تو غصہ کے لہجہ میں نہیں نیم مزاحیہ انداز میں بولے کہ ''جی ہاں میں نے بھی سنا ہے، مسلم کے مقابلہ میں بخاری کو لایا گیا ہے''۔''بخاری'' اور ''مسلم'' کا تقابل ظاہر ہے۔مولانا ان صنعتوں کے بادشاہ تھے۔بہرحال اس لطیفہ گوئی سے اپنا دل مطمئن نہ ہوسکا اور فکر یہ پیدا ہوئی کہ کسی طرح اس فتنہ کو روکا جائے، ورنہ معاملہ بہت آگے بڑھ جائے گا۔اور نتائج بڑے افسوس ناک اور بہت دوررس نکلیں گے۔معلوم ہوا بخاری شاہ صاحب قرول باغ ہی میں جامعہ ملیہ کے ایک پنجابی استاذ کے ہاں فروکش ہیں، ہمت کر کے وہاں پہنچا،مولانا سے اجازت لیے بغیر، اجازت لینے کی ہمت ہی کس میں تھی، شاہ صاحب اس ڈائری نویس پر شروع سے کرم فرمایا کرتے تھے، آج بھی اسی گرمجوشی سے ملے۔میں کھل کر عرض کیا کہ'' آپ کی دہلی تشریف آوری کی غرض یہ سننے میں آئی ہے۔اگر یہ صحیح ہے تو ملت کی بڑی بدقسمتی ہے۔جی تو یہی چاہتا تھا کہ آپ مولانا کے رفیق کی حیثیت سے کام کرتے، جیسا کہ دو چار سال ادھر تحریک خلافت کے دور میں کر بھی چکے ہیں۔لیکن بدقسمتی سے یہ اگر اب نہیں ممکن، تو یہ تو کسی حال میں بھی نہ ہو کہ آپ اور وہ ایک میدان میں باہم حریف اور مناظر کی حیثیت سے قدم رکھیں اور خلقت کچھ آپ کے ساتھ ہو کچھ ان کے ساتھ ہو۔اس میں تو سارے مسلمانوں کی رسوائی ہے۔اور کچھ نہیں تو کم از کم میری خاطر ہی سے اس تکلیف دہ امکان کو ختم کیجیے''۔شاہ صاحب نے بڑی تشفی کی باتیں کیں اور مجھے اطمینان دلایا کہ وہ خبر ہی مجھے بہت مبالغہ آمیز ملی تھی......بہرحال اس کامیاب ملاقات کے بعد شاہ صاحب کا شکر گزار لوٹا، اور ان کا یہ احسان آج تک یاد ہے۔

....

قیام دو ڈھائی دن رہا۔ ہمیشہ شگفتہ اور باغ و بہار رہنے والے محمد علی کو پہلی بار میں نے متفکر اور اداس پایا۔ عمر بھر کی زندہ دلی اب رخصت ہو رہی تھی۔52 سال کی عمر میں 64-65 سال

کے معلوم ہونے لگے تھے۔ ذاتی صدموں، جسمانی بیماریوں، مالی پریشانیوں، قومی اور ملی فکرمندیوں کے ہجوم نے وقت سے کہیں قبل بوڑھا کر دیا تھا۔نوشہ ڈاکٹر انصاری کے ہاں ٹھہرے تھے۔ باراتیوں میں سب سے پیش پیش عبدالرحمٰن صدیقی سندھی ایم اے تھے جو ایک طرف نوشہ کے حبیب لبیب تھے اور دوسری طرف محمد علی کے مخلص قدیم...... ہائے وہی عبدالرحمٰن جن کی قسمت میں چند ہی مہینہ بعد، لندن میں محمد علیؒ کو غسل میت دینا اور کفن پہنانا لکھا تھا!...... دلہن والوں میں سب سے پیش پیش مولانا عبدالماجد بدایونی تھے۔ بارات سہ پہر کو موٹروں پر آئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی متعدد عمارتیں اس وقت قرول باغ ہی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک بڑی عمارت مع وسیع لالہ زار صحن کے، اقبال منزل سے قریب ہی تھی، بارات وہیں اتری، وہیں نکاح ہوا۔ خطبہ نکاح مولانا بدایونی نے پڑھا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب، مولوی سعید صاحب وغیرہم کی شرکت کا تو اب امکان ہی نہ تھا۔ رہے سہے تعلقات جو مولانا حسین احمد صاحب سے تھے، وہ بھی اس وقت تک ٹوٹ چکے تھے۔ سیاسی و ملی اختلافات سے قطع نظر، محمد علی نے جیب سے ان کا ایک کارڈ بھی نکال کر دکھایا جس میں دعوت نامہ کے جواب میں تقریب کے اسرافی پہلو پر کچھ گرفتیں تھیں۔ محمد علی کا دل ہر طرف سے ٹوٹا ہوا تھا، اس وقت ان فقروں کی برداشت کی قوت کہاں سے لاتا! بعد مغرب اسی لان پر چائے اور ناشتہ رہا۔

گاندھی جی کی تحریک نمک سازی زوروں پر چل رہی تھی۔ اور محمد علی مسلمانوں کو لیے ہوئے اس سے علاحدہ تھے۔ اب کی ہی قیام میں اپنے دو تین شعر اس تحریک کی رفتار سے متعلق سنائے جن میں شوخی کے ساتھ ساتھ ذرا تلخی بھی تھی۔ افسوس ہے کہ اب حافظہ میں صرف ایک ہی مصرع ہے۔

یہ نمک سازی کرے اور وہ نمک پاشی کرے

باقی قافیے ''خدمت کاشی کرے'' ''شب باشی کرے'' تھے۔ اب یہ شعر بھلا کہاں مل سکتے ہیں؟

....

محمد علی کے بعض بے تکلف دوست اور مخلص اپنی بیویوں کو ان کے سامنے لے آئے تھے۔

میری دقیانوسیت مجھے اس کی اجازت نہ دے سکی۔اب کی قیام میں ایک روز رات کے وقت جب محمد علی زنانہ میں آئے تو بعض بعض بیویوں کو پردہ میں دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون کون ہیں، میرا سلام کہہ دو۔ان کی بیگم صاحبہ نے میری بیوی کو بتایا۔ بولے ''بہن! مجھ اندھے سے کیا پردہ۔ اب میرے سامنے آنے میں کیا مضائقہ''...... مسئلے کے شرعی وفقہی پہلو سے یہاں غرض نہیں۔ غور صرف اس پر کیجیے کہ حسرت کی کن گہرائیوں کے ساتھ یہ فقرہ دل سے نکلا ہوگا! بصارت ایک آنکھ کی تو واقعی جا چکی تھی اور دوسری کی بھی اچھی خاصی دھندلی ہو چکی تھی! یہ بے نور 80-85 سال کے سن میں نہیں، کل 52 سال کی عمر میں وہ آنکھیں ہو رہی تھیں، جن کی ذہانت کی چمک دمک ابھی کل تک دوسروں کو حیران کیے ہوئے تھیں!

تیسری شام تھی کہ مولانا سے بعد مغرب رخصت ہوا...... عالم ناسوت میں آخری رخصتی، آخری مصافحہ، آخری معانقہ! کون جان سکتا تھا کہ اب یہ پیارا پیارا چہرہ حشر تک دیکھنا نصیب نہ ہوگا! یہ محبت واخلاص سے منور، اور اسلامیت کے نور سے دمکتا ہوا مکھڑا اب کبھی زندگی بھر دیکھنے میں نہ آئے گا!

اب ہم یہاں ہیں اور تماشہ ہے حشر تک
آنکھیں ہوئی ہیں بند رخِ یار دیکھ کر!

ہائے، اس چہرہ کی محبوبیت اور نورانیت کا ایک ایک ہلکا سا عکس بھی کسی طرح کاغذ کے صفحہ پر منتقل کیا جا سکے!

ہرگز نیامد در نظر نقشے زرویت خوب تر
شمسے ندانم یا قمر حورے ندانم یا پری

......☆☆☆......

باب:84

5:1930

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔ بیمار مظلوم

امیر المومنین سیدنا حضرت علیؓ کی خلافت کے حالات جب تاریخ وسیر کی کتابوں میں نظر سے گزرتے ہیں تو حیرت اور عبرت دونوں شدت کے ساتھ ہوتی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین عزیز، اسلام لانے میں شرف اولیت سے ممتاز، شجاعت میں بے مثال، علم، عمل، تفقہ وورع میں اپنی نظیر آپ۔ تمام صحابی آپ کے فضل وکمال کے قائل، اس پر یہ حال کہ آپ خلیفہ ہوئے نہیں کہ بغاوتیں ہر طرف پھوٹ پڑیں۔ اِدھر شورش، ادھر بدامنی، آج اس مخلص نے بغاوت کر دی، کل وہ وفادار غدار بن گیا۔ بڑے بڑے قدیم مخلص غدر وفساد پر آمادہ، سرکشی وگستاخی پر مستعد، ہر ہر فرد معترض ونکتہ چین، جیسے کسی کی زبان میں لگام ہی نہیں...... آنکھوں نے اس منظر کو ایک ہلکے پیانہ پر محمد علی کی زندگی کے آخری دور میں دیکھ لیا۔ علیؓ صحابی ہی نہیں، خلیفہ راشد بھی تھے، محمد علی بیچارہ عام امتی۔ اس کھلے ہوئے فرق مراتب سے قطع نظر کر لیجیے۔ تو تاریخ اپنے کو دہراتی ہوئی موجود۔ محمد علی ابھی چند سال قبل ملت کے عملاً ''امیر المومنین'' ہی تھے۔ مسلمانان ہند کے محبوب ترین لیڈر۔ یا اب یہ حال ہو گیا کہ بچہ بچہ دشمن ونکتہ چین۔ خال خال اخبارات مثلاً انقلاب (لاہور) والامان (دہلی) ساتھ رہ گئے اور سچ تو اپنی

محدود بساط کے ساتھ مخلص تھا ہی۔ باقی سارے کے سارے اخبارات اور اخبار نویس بس آستین چڑھائے ہوئے۔ جی میں بے اختیار آیا کہ ایک مستقل مقالہ ''علیؒ اور محمد علی'' کے عنوان سے لکھیے اور دنیا کو دکھایئے کہ خادم کے حصہ میں بھی قسمت کچھ مخدوم ہی کی سی آرہی ہے۔ اور اپنا یہ منصوبہ مولانا کو لکھ بھی بھیجا۔ یہ بھی عرض کر دیا کہ اپنا پریس ایجنٹ اب مجھی کو کر دیجیے۔ سب سے لڑلوں گا، بھگت لوں گا۔ نت نئے جھوٹے سے جھوٹے اور گندے سے گندے الزامات اب ہم نیاز مندوں کے لیے برداشت سے باہر ہوگئے ہیں۔ لکھنؤ کے حاجی ظفر الملک علوی (سچ کے منیجر اور بانی) کہاں ابھی کل ڈیڑھ برس ہوئے ہمدرد کی منیجری بلا معاوضہ کرنا اپنے لیے باعث فخر وسعادت سمجھ رہے تھے اور کہاں اب مقابلہ ومخالفت میں قلم درکف!

....

مولانا اب شملہ میں تھے۔ زار و نزار وضعیف و ناتواں، بستر مرض پر دراز۔ ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے، دماغی کام کرنے کی قطعی ممانعت کر رکھی تھی۔ اتنی سکت ہی کہاں تھی کہ مخالفین ومعاندین کی طرف توجہ کر سکیں۔ دہلی سے لڑکی کے عقد کے معاً بعد روانہ ہوجانے کو تھے، اور یہی مجھ سے فرمایا بھی تھا۔ جب کئی دن ہوئے تو میں نے دریافت خیریت کو عریضہ لکھا۔ جواب شملہ سے آیا:

''18 جون 30۔ ڈونارڈ لاج۔ کارٹ روڈ شملہ

برادر محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میرے امراض کی فہرست یوں بھی طویل ہو چکی تھی، صرف مرگ ناگہانی کا انتظار اور تھا۔ اب قلب پر بھی ریاح کا بار بار حملہ ہو رہا ہے۔ اس نے مرگ ناگہانی کا بھی انتظام کر دیا۔ ارادہ کر چکا تھا کہ گلنار کے نکاح کے بعد ہی میں یہاں آجاؤں گا مگر ایک وہابی کی نالش نے 15 دن روکے رکھا[1]۔ 15 کو چل کر 16 جون کو یہاں پہنچا۔ راستہ میں درد اٹھا۔ دوسرے دن یہاں بھی

1۔ یہ وہی دیوانی کی نالش کوچہ چیلان کے مکان اور پریس کے سلسلہ میں تھی، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ جولائی 29 کے واقعات کے ذیل میں۔

شب کو وہی حالت رہی۔ تیسرے دن صبح کو بھی وہی حالت تھی۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ اب طبیعت قدرے سدھری ہے۔

میں اب ظفر الملک صاحب کے مضامین اور عطاء اللہ شاہ کی تقاریر اور کفایت اللہ صاحب اور احمد سعید صاحب کی سازشوں کے جواب دینے کے قابل کہاں ہوں جو جلسوں میں شریک ہوں۔ ڈیڑھ ماہ آرام اور کچھ کام کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ آیئے تو یہاں آیئے تا کہ دل کھول کر باتیں ہوں۔

آپ کا عقیدت مند بھائی

محمد علیؒ''

آہ کہ یہ آخری خط تھا جو مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا موصول ہوا......کون اس وقت جان سکتا تھا کہ اس کے بعد ایک خط بھی ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھنا نصیب نہ ہوگا[1]۔

شملہ مشہور و معروف دار الصحت تھا۔ بڑے بڑے پرانے مریضوں کو ڈاکٹری مشورے وہیں کی آب و ہوا میں کچھ بسر کرنے کے دیے جاتے تھے۔ پھر دہلی وغیرہ کے شور و شغب سے دور وہاں کا سکون خود ایک بہت بڑی نعمت تھا، علاج کے لیے سہولتیں ایک سے بڑھ کر ایک اور ڈاکٹر تو بڑے سے بڑا موجود۔ شملہ اس وقت ہندوستان کا گرمائی دار السلطنت ہی تھا، جس طرح دلی سرمائی دار السلطنت تھا۔ وائسرائے بہادر سال کا بیشتر حصہ وہیں بسر فرماتے تھے۔ صرف جاڑوں کے چار مہینوں کے لیے دہلی میں نزول اجلال ہوتا تھا۔ محمد علی کے امراض کی شدتوں پر آخر وائسرائے کو بھی رحم آ گیا۔ اتفاق سے اس وقت وائسرائے تھا بھی ایک بڑا شریف دل انگریز، لارڈ اِرون نامے

---

[1] شروع جولائی میں میں نے حضرت تھانویؒ کی خدمت میں جو خط لکھا تھا، اس کا اقتباس ذیل مسودہ حکیم الامت (باب 29) سے نقل کرتا ہوں:

''مولانا محمد علی صاحب اس وقت بہت زائد علیل ہیں۔ قدیم امراض ذیابیطس وغیرہ پر جدید امراض ریاحی، دورۂ قلب وغیرہ کا اضافہ ہوگیا ہے۔ تنفس سا ہر وقت رہنے لگا ہے۔ شملہ میں ایک ہسپتال میں پڑے ہوئے ہیں۔ خواب آور دوا کے بغیر ایک گھنٹہ بھی نہ سونا ممکن ہے نہ لیٹنا۔ دعائے صحت کے لیے خصوصیت کے ساتھ استدعا ہے''۔

(جو بعد کو لارڈ ہیلیفیکس کے لقب سے مشہور ہوا) اس نے خود اپنا ڈاکٹر ان کے علاج کے لیے بھیج دیا۔ غرض جو بھی ممکن انسانی تدبیریں دوا علاج کے سلسلہ میں تھیں، ہوتی رہیں۔ افاقہ خاطر خواہ تو نہ ہوا، اور نہ کسی کو اب اس کی امید باقی رہ گئی تھی۔ البتہ کئی ہفتوں کی دوا درمن اور ہم نیاز مندوں کی مسلسل مخلصانہ دعاؤں کے بعد اتنا ہوا کہ مولانا شملہ سے سفر کرنے کے قابل ہو گئے۔

ان کی یہ جبری فرصت کا زمانہ مجھے بہت غنیمت نظر آیا۔ جھٹ حضرت تھانوی کی بعض مختصر کتابیں پارسل بنا روانہ خدمت کر دیں کہ لیٹے لیٹے انھیں حسب فرصت ملاحظہ فرما لیجیے گا۔ عجب کیا جو مشیت الٰہی میں اب وقت آ گیا ہو کہ اسلام کے دو بہترین خادموں کے درمیان غلط فہمیاں دور ہو جائیں اور ایک نئی مصالحت و مفاہمت کی بنیاد پڑ جائے۔ شوق وطن اور قصد السبیل، یہ دو نام تو اچھی طرح یاد ہیں شاید ایک آدھ اور کتاب مثلاً تربیت السالک بھی ان کے علاوہ تھی۔ مدت دراز کے بعد وقت آیا تھا کہ محمد علی کا دل حضرت تھانوی کی طرف سے صاف ہو چلا تھا اور اتفاق سے اس وقت نسبتاً فرصت بھی انھیں تھی۔ یہ عاجز تو دونوں کی نیاز مندی اپنے لیے سرمایہ سعادت سمجھ رہا تھا۔ دل نے کہا کہ اس خداداد موقع سے پورا فائدہ اٹھایئے اور اپنی والی جہاں تک بھی بن پڑے، دونوں کو ایک دوسرے سے قریب لایئے۔

....

کتابیں پہنچیں۔ لیکن تقدیر نے ایک بار پھر تدبیر کو باطل کر دیا۔ مولانا ابھی انھیں پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ سفر کی ٹھن گئی۔ والیٔ بھوپال ہز ہائنس نواب سر حمید اللہ خان، مولانا کے پرانے عقیدت مندوں میں تھے اور اب رامپور کے نئے نواب کو (جو اسی جون میں اپنے والد متوفی کی جگہ مسند نشین تھے) بھی مولانا سے عناد باقی نہ تھا۔ یہ دونوں مولانا کو بلا رہے تھے۔ اس زمانہ میں برطانیہ کی لیبر وزارت نے ہندوستان سے صلح کرنے اور مطالبات ہند پر غور کرنے کے لیے دسمبر میں ایک گول میز کانفرنس لندن میں منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ اس میں ہندوستان کی ساری ہی پارٹیوں کے نمائندے بلائے جاتے۔ مسلمانوں کے نمائندوں میں سب سے پہلا نام مولانا ہی کا وائسرائے (لارڈ ارون) کے ذہن میں آنا چاہیے تھا اور شاید آیا بھی۔ لیکن مخالفین اور حاسدین یہاں بھی نہ چوکے۔ اورنج کی سرگوشیوں سے لے کر اخبارات کے صفحات تک مولانا کی ذات پر

خوب خوب حملے کرڈالے۔ ایک مشہور دہلوی معاند نے تو کمال ہی کیا۔ کسی سے انگریزی میں لکھوا کر، اور اپنے صرف سے کئی سو کی تعداد میں چھپوا کر ایک پورا پمفلٹ مولانا کی مخالفت میں برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں اور وزیروں کے پاس ڈاک سے روانہ کر کے، خود اپنی رسوائی کا مستقل سامان کرلیا!...... چلا ہوا مصرع

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

شاید ایسے ہی موقع کے لیے ہے...... یہ سب کوششیں بحمد للہ ناکام رہیں۔ اور مولانا کا انتخاب بالآخر گول میز کانفرنس کی ممبری کے لیے ہو کر رہا۔ مولانا اب بھوپال میں نواب صاحب کے مہمان تھے اور اپنے ہر ضعف و خستگی، ناتوانی و شدت مرض کے باوجود ولایت جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ جانتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کی وکالت ان سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا۔ اور نہ اس امت کا نقطۂ نظر اتنی خوبی سے کوئی اور سمجھا سکتا ہے۔ اخباری اطلاع اس درمیان میں یہ چھپی کہ اب مولانا کو افاقہ ہو رہا ہے۔ اور مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس (مسلم کانفرنس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ) لکھنؤ میں 15 اگست کو قرار پایا۔ کچھ امید پڑی کہ شاید مولانا اس جلسہ میں آجائیں۔ بڑی امیدوں کے ساتھ شروع اگست میں عریضہ بھوپال کے پتہ پر لکھا۔ پانیر (31 جولائی) میں کسی کا مضمون بھی مولانا کی شخصیت پر مع ان کی تصویر کے نکلا تھا۔ عنوان تھا ''قابل مگر ناکام لیڈر'' Brilliant man without an achievement تمام تر مخالف فضا میں یہ مقالہ غنیمت معلوم ہوا کہ اس میں فی الجملہ تو مولانا کے کمالات کی داد تھی۔ مخالفت کی شدت دیکھ کر دبی زبان میں کچھ یہ عرض معروض بھی تھی کہ ذرا اپنے رویہ میں بھی نرمی و مصالحت آمیزی پیدا کرنا چاہیے۔ اور بھی کچھ معروضات تھے۔ جواب مفصل اور خوب مفصل اگست کے چوتھے ہفتہ میں موصول ہوا۔ اور آہ کہ یہ ان کا آخری خط تھا جو سرزمین ہند سے مجھے موصول ہوا۔ اور یہ خط بھی لکھا ہوا نہیں، ان کا صرف لکھوایا ہوا تھا۔ محض دستخط آخر میں اپنے قلم سے کیے تھے...... کون جانتا تھا کہ تازہ دستخط کے لیے بھی اب آنکھیں عمر بھر ترستی ہی رہیں گی۔

خط کا لب و لہجہ یقیناً بہت تلخ ہے، خصوصاً دوسرے مخدومان ملت سے متعلق۔ لیکن خط کا پورا پس منظر اگر سامنے ہو تو خط نویس اپنی ان تلخ نوائیوں کے لیے شاید بالکل ہی معذور قرار پا جائے۔

خصوصاً جب کہ وہ غریب ایک طرف ذیابیطس ضعف اعصاب، شدید ضعف بصارت، ضعف قلب، ضغطۂ دم (خون کا دباؤ) اکٹھے اتنے امراض کا شکار ہو اور دوسری طرف طنز وتعریض، طعن وتشنیع کے تیروں کے مسلسل بارش سے اس کا دل چھلنی ہو چکا ہو، بہرحال اب وہ والا نامہ ملاحظہ ہو۔

......☆☆☆......

باب:85

6:1930

(مظلوم کی آہ۔ بیمار کی کراہ)

30 ستمبر 30۔ گیسٹ ہاؤس۔ بھوپال

برادرم محترم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا محبت نامہ مورخہ 2 اگست مجھے کوئی 7، 8 اگست تک غالباً مل گیا تھا۔ لیکن چونکہ محض عیادت نامہ نہ تھا بلکہ سیاست نامہ [1] بھی تھا اس لیے جواب کی ہمت اس وقت نہ کرسکا اور ڈاکٹر عبدالرحمن [2] کے حکم سے اس وقت تک انتظار کیا جب کہ وہ خود گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر خط لکھنے کے قابل ہوجانے کی امید تھی۔ جوں ہی حالت اس قابل ہوئی، سیدھی آنکھ نے تقریباً جواب دے دیا اور جس بیمار کو نئے نواب صاحب رامپور اور شوکت صاحب کی طلبی پر رامپور جانے سے ڈاکٹر

---

[1] ایک بار پھر یاد کرلیجیے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا شدت سے علیل ہیں اور ساتھ ہی خود اسلامی پریس میں ہر طرح کے طنز وتعریض اور گندے گندے القابات کے ہدف بنے ہوئے۔ مزاج میں جھنجھلاہٹ ایسے موقع پر بالکل طبعی ہے۔

[2] ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال کے خاص ڈاکٹر اور سرجن مولانا کے بھی بے تکلف دوستوں میں تھے۔

صاحب نے روک دیا تھا اور نواب صاحب بھوپال نے معذرت کا تار بھیج کر اس کی وجہ بیان کر دی تھی، اس کو دوسرے ہی دن بمبئی بھاگنا پڑا کہ ڈاکٹر چشم کو پھر آنکھ دکھائے اور بالکل اندھا بننے سے بچ سکے۔ اس دن سے آج تک آنکھ اس قابل نہیں ہے کہ کچھ بھی لکھ پڑھ سکوں، دوسروں کا محتاج۔

آپ نے میری صحت کے متعلق 2 اگست کو لکھا تھا کہ "میری دعاؤں سے خدا خدا کر کے آپ کے افاقہ کی خبر سنائی دی"۔ یقیناً میری بیماری میں افاقہ ہوا تھا مگر نہ اس قدر کہ جتنا عام طور پر سمجھ لیا گیا۔ حقیقتاً افاقہ کا زائد حصہ خود شملہ کی بلندی سے نزول تھا۔ سولن پہنچتے ہی جبکہ ہوا اتنی رقیق نہ رہی اس سے زائد افاقہ ہو گیا۔ اور پہلی بار اتنی بھوک لگی کہ میں نے دوسروں کو چائے پیتے دیکھ کر خود بھی ایک پیالی چائے مانگی۔ باقی افاقہ پلنگ پر پڑے رہنے سے ہوا۔ شاید کسی قدر دواؤں سے بھی ہوا ہوگا۔ رہا دعاؤں کا معاملہ، میں کب آپ کی دعا کی تاثیر کا قائل نہ تھا۔ البتہ اگر اب بھی صاحب فراش ہوں تو ممکن ہے کہ تھانہ 1 بھون تو نہیں مگر شاید دیوبند 2 کی مقدس ہستیوں کی آپ کی دعاؤں میں شرکت کا اثر ہو۔

اگر آپ کو افاقہ کے متعلق غلط فہمی نہ ہوئی ہوتی تو آپ ہرگز مجھ سے نہ پوچھتے کہ میں 15 اگست کو لکھنؤ آ رہا ہوں یا نہیں 3۔ "شدرحال 4" اب تو میرے مذہب میں گول میز کانفرنس ہی کی شرکت کے لیے جائز رہ گیا ہے جس کے متعلق ابھی عرض کروں گا۔ میں آج ہی معہ اپنی اہلیہ کے دہلی جانا چاہتا ہوں تاکہ رخت سفر باندھ سکوں لیکن گزشتہ ہفتوں میں خون کا دباؤ کسی قدر بڑھا رہا اور ضیق نفس بھی کسی قدر رہا۔ اس کے باعث ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نے پھر امتناعی حکم جاری کر دیا اور اب صرف میری اہلیہ دو ایک دن میں چلی جائیں گی۔ ارادہ تھا کہ رامپور جاتے وقت آپ کو تار دے کر کم از کم وہیں بلا لوں اور نہ معلوم واپسی ہو یا نہ ہو، چلتے وقت آپ سے مل لوں۔ لیکن اب آپ سے اتنا قرب بھی اسی طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ بھوپال تشریف لائیں اور خلافت کمیٹی کے جلسہ میں جو 2 اور 3

---

1 اشارہ ہے حضرت تھانوی کی جانب جن سے مولانا سے تعلقات میں اب پہلے کی سی کشیدگی نہیں باقی رہی تھی۔

2 اشارہ ہے مولانا حسین احمد صاحب کی طرف جن سے مولانا کے تعلقات اب بہت ہی کشیدہ ہو چکے تھے۔

3 یہ جلسہ مرکزی خلافت کمیٹی کا تھا اور اس میں مولانا کی شرکت کے لیے ہر شخص چشم براہ بنا ہوا تھا۔

4 تلمیح ہے، ایک حدیث کی جانب جس کا یہ مضمون ہے کہ شدرحال (کجاوہ کا کسنا یعنی سوار پر سفر اختیار کرنا)

اکتوبر کو ہونے والا ہے بمبئی جا کر شریک ہوں۔ میں انشاءاللہ 29۔30 تک بمبئی چلا جاؤں گا بشرطیکہ گول میز کانفرنس کے التوا کا حکم نہ آیا۔ براہ کرم ضرور آ کر مل لیجیے۔ گو اب میں بزدل اور غدار ہوں اور آپ کے 1 کی طرف ایسا ہندو پرست نہیں رہا جیسا کہ وہ دو تین سال پیشتر مجھ کو کہتے تھے۔ تاہم چونکہ آپ کو نہ صرف دیوبند بلکہ تھانہ بھون سے بھی عقیدت ہے اس لیے بزدلوں اور غداروں سے ملنا بھی آپ کے مذہب میں ناجائز نہ ہوگا۔

پانیر 2 میں جو مضمون نکلا تھا وہ خود لغو تھا اور اس کا لکھنے والا بھی لغو۔ یہ ایک متعصب ہندو کا لکھا ہوا ہے جو ان بزرگوں کی طرح خوب جانتا ہے کہ جینا اور سر محمد شفیع بھی خریدے جا سکتے ہیں مگر محمد علی انمول ہے۔

آپ جس طرح مذہب کے بارے میں اب تک صراط مستقیم پر نہ پڑ سکے اور آپ کی زندگی میں اس کے پہلے حصہ کی فلسفیت کے خلاف ابھی تک رد عمل جاری ہے اور آپ سائنس کو حرام سمجھتے ہیں 3 اسی طرح آپ اب تک سیاست میں بھی صراط مستقیم پر نہ پڑ سکے۔ تہذیب مغرب کی بیہودگیوں اور مغربی استعمار کے خلاف ابھی رد عمل جاری ہے اور وہ ہنود کی تنگدلی اور تعصب کو ایک بڑی حد تک آپ کی آنکھوں سے چھپائے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نہ پانیر کے مضمون نگار کی شیطنت 4 کو پہچان سکے اور نہ ستیہ گرہیوں کی روزانہ دروغ بافی کو۔

میرے اسمبلی کے انتخاب کے متعلق آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے 5، اس سے مجھے اندیشہ

---

1 ایک مشہور عالم کا نام۔

2 21 جولائی کے پانیر میں مولانا پر ایک مفصل مضمون کسی کا نکلا تھا جس میں مولانا کو بہترین مگر ناکام ترین لیڈر دکھایا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو باب ماقبل۔ مکتوب الیہ نے اپنے خط میں اس مضمون کی فی الجملہ داد دی تھی۔

3 یہ صرف مولانا کا خیال ہی خیال تھا جو یقیناً میری ہی گفتگو یا تحریر کی بے اعتدالیوں سے پیدا ہو گیا ہوگا مگر بہر حال یہ تمام تر واقعہ نہیں۔

4 یہ لفظ مکتوب الیہ نے بدل کر رکھ دیا ہے مولانا کا اصل لفظ اس سے زائد کریہہ تھا۔

5 لیڈر ٹربیون وغیرہ ہندوؤں کے انگریزی اور اردو کے روزناموں کے حوالہ سے بعض اسلامی روزناموں نے بھی یہ خبر خوب پھیلانا شروع کر دی تھی کہ مولانا اسمبلی کی ممبری کے امیدوار ہیں اور اس کے بعد اس کی صدارت (اسپیکری) کے لیے۔

ہوا کہ آپ نہ صرف زمیندار وغیرہ پر اعتراض کر رہے ہیں بلکہ مجھ سے بھی استفسار کر رہے ہیں کہ کیا واقعی تم اسمبلی میں شریک ہو گے۔ حقیقتاً میرے قلب کی حالت نہ اس وقت ایسی تھی کہ میں سکون کے ساتھ ان چیزوں کے متعلق لکھ سکتا نہ اب پوری طرح اس قابل ہوا ہوں کہ سکون کے ساتھ ان کے متعلق کچھ لکھ سکوں۔ آپ کو شاید یہ سن کر حیرت وافسوس دونوں ہوں کہ میں نے اپنے دو دوستوں کو اس کی اجازت رپن ہسپتال میں دے دی تھی جہاں کہ بستر مرض ذرا سی دیر میں بستر مرگ ہو سکتا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو مجھے اسمبلی کا ممبر منتخب کرا سکتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ میں اب اس رائے پر پہنچا تھا کہ اگر نیا دستور اساسی ایسا بن گیا کہ اس میں اسمبلی کو حقیقی آزادی مل گئی تو میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں گا گو اس وقت تک میں مولانا حسین احمد صاحب کی طرح اس میں شرکت کو جائز نہیں سمجھتا۔ ایک زمانہ میں مولانا حسین احمد صاحب میرے ہم خیال تھے اور جمعیۃ العلما کی مجلس انتظامیہ میں میرے ہی کہنے سے جیل سے چھوٹتے ہی انھوں نے ایک تحریک سوراجیوں کے نقطۂ نظر کے خلاف پیش کرنا چاہی تھی جس کو ......کفایت اللہ صاحب نے (آپ زمیندار اوز......کی دروغ بافیوں پر تو معترض ہیں......کفایت اللہ صاحب اور الجمعیۃ کی افترا پردازیوں کے متعلق نہ آپ نے کبھی کچھ لکھا نہ مولانا حسین احمد نے) ٹال دینا چاہا تھا۔ دو سال بعد ......صاحب [1] اور ان کے ......احمد سعید [2] نے مولانا حسین احمد ہی سے ایک ریزولیوشن تیار کرا کے جمعیۃ العلما کے جلسہ انتظامیہ میں پاس کرا ہی کے چھوڑا۔ جس میں سر کے گرد ہاتھ گھما کر ناک پکڑی گئی تھی اور اسمبلی اور کونسلوں میں شرکت کے جواز کا فتویٰ دارالافتا سے شائع کیا گیا تھا۔ خیر یہ پرانی بحث ہے۔ میں مسلمان ممبران اسمبلی کی بے اصولیوں اور نفس پروریوں سے اتنا تنگ آ گیا تھا کہ نواب اسماعیل خاں اور شفیع داؤدی صاحب کے اصرار سے اور چند اور خلافت والوں کے کہنے سے میں نے اسے قبول کر لیا تھا کہ اگر دستور اساسی کی بنیاد حقیقی آزادی قرار پائی تو میں شریک ہو جاؤں گا اور ان کے دوش بدوش تحفظ اسلامی اور اتحاد ملل ہند کے لیے جدوجہد کروں گا۔ میں خود وائسرائے کو رائے دے چکا تھا کہ انتخاب گول میز کانفرنس کے بعد کیا جائے لیکن

---

1 مفتی صاحب کا ذکر ہے۔

2 موصوف کو مولانا نے تشبیہ عہد جاہلیت کے ایک شخص سے دی تھی جو اپنی پرخوری وتن وتوش کے لیے مشہور تھا۔

شملہ میں جب کہ میری حالت بہت خراب تھی مجھے اطلاع ملی کہ انتخاب ابھی ہوگا، اس پر میں نے فیصلہ کیا کہ اگر میرے دوست ضرورت سمجھیں تو میرا انتخاب کرادیں۔ لیکن چونکہ پہلا اجلاس گول میز کانفرنس کے بعد ہوگا میری شرکت اس پر منحصر ہوگی کہ دستور اساسی آزادی پر مبنی ہو۔ یہ تھی کل حقیقت لیکن آپ کی ستیہ گرہیوں نے اس پر اسپیکری وغیرہ کا قصر تیار کردیا۔

چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

جب کہ واقعہ تو یہ ہے کہ حقیقت کو دیکھتے ہوئے بھی یہ مفتری افترا پردازی سے باز نہیں آتے اور افسانہ گوئی کے بغیر رہ نہیں سکتے۔

انقلاب میں جو مکتوب شائع ہوا تھا وہ میری درخواست کے ایک ماہ سے زائد کے بعد شائع ہوا۔ میں تو ہمدرد کو بند کر کے مہر سکوت اپنے ہونٹوں پر لگا چکا تھا۔ لیکن اس ملت مرحومہ کی مردم شناسی کو کیا کہا جائے، الجمعیۃ اور زمیندار وغیرہ کی افترا پردازیوں کے بعد مجبور ہو کر یہ خط سالک صاحب [1] کو لکھنا پڑا اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اس میں فراہم کردہ مواد کو اپنے دو ایک مضمون میں شائع کردیں جو انھوں نے نہیں کیا۔

اب شرکت (گول میز) کانفرنس کے متعلق کچھ مواد آپ کو بھیج رہا ہوں [2] کہ آپ اسے اپنے کسی مضمون میں شائع کرادیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا اصلی خط وائسرائے کے نام کا شائع کیا جائے تا آنکہ اشد ضرورت نہ ہو مگر ان اس کا سارا مواد آپ حرف بہ حرف شائع کرسکتے ہیں اور یہ بھی لکھ سکتے ہیں کہ ان خیالات کا اظہار میں نے ان حلقوں میں کردیا تھا جہاں سے دعوت آئی تھی۔ پاؤں میں پہلے ہی حس نہ تھا اب حالت کچھ بدتر ہی ہے اور سردی میں ہر وقت گنگرین اور یا ان کی قطع و برید اور اسی طرح کی موت کا اندیشہ رہے گا جس سے ڈاکٹر انصاری کے مرحوم و مغفور مجھلے بھائی صاحب کو دوچار ہونا پڑا۔

اب تک صاحب فراش ہوں۔ کانفرنس کے روزانہ اجلاس میں نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں

---

1 شریک ایڈیٹر روزنامہ انقلاب (لاہور)۔ 2 میں نے لکھا تھا کہ لوگ طرح طرح کے اتہامات لگا رہے ہیں آپ خود ان معاندین کے منہ نہیں لگتے نہ سہی، لیکن اپنے متعلق صحیح معلومات تو اس نیازمند کے پاس کبھی کبھی بھیج دیا کیجیے۔ اشاعت انشاءاللہ معقول طریق پر ہوجایا کرے گی۔

بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیوں سے ایک ایک نقطہ پر جنگ کرنا پڑے گی۔ ان تین محاذوں پر جنگ کرنے میں ہر وقت دل کی حرکت یکا یک بند ہو جانے اور موت کا اندیشہ ہے[1] سب سے زائد کہ اب لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ کامل نابینائی کا ماہر علاج چشم نے پورا یقین دلا دیا ہے کہ اگر میں سب کام چھوڑ کر نیپال جیسے ملک کو نہ چلا جاؤں جہاں دنیا کی کوئی خبر نہ ملے۔ لیکن اس پر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطان جابر اور رعایائے جابر دونوں کے سامنے کلمہ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں[2]، تا آنکہ اس کام میں مر جاؤں۔ اس لیے قرض دام لے کر، بھیک مانگ کر اور جس طرح بھی ہو سکے گا تین چار ہزار روپیہ فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے چلوں گا اس لیے کہ وہ زندگی کے سارے منازل و مراحل میں میری رفیق سفر رہی۔ جب منزل مقصود کے لیے احرام باندھوں تو چاہتا ہوں کہ وہ موجود ہوں[3]۔ ورنہ لندن کا بدترین موسم ہے۔ اور ہر متمول انگریز اور میم انگلستان تک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں کو بھاگ جاتے ہیں۔ بہر حال وائسرائے کا دعوت نامہ اور میرا جواب ملفوف میرے خط بنام وائسرائے کو بطور خط کے نہ چھاپیے۔ اپنے مضمون میں آپ اس کے خیالات کو میرے ہی الفاظ میں شائع کر سکتے ہیں...... اخبار ہی اس کے لیے بہتر ہوگا۔

جب آپ یہاں آئیں گے تو آپ کو وہ خطوط دکھاؤں گا جو مسلمانوں کی نمائندگی کے متعلق میں نے بستر مرض پر سے بھی وائسرائے کو لکھے تھے۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ میری گستاخیوں کو معاف کیجیے اور میری کامیابی کے لیے دعا کیجیے اور جلد آ کر مجھ سے مل جایئے۔ میری اہلیہ کا بھی سلام قبول کیجیے اور اپنے گھر میں ہمارا اسلام شوق کہیے اور بچیوں کو خوب سا پیار کیجیے۔

آپ کا گستاخ بھائی

محمد علی"

---

[1] یہ بہادر مجاہد جس کے خلاف ہر قسم کے اتہامات کے نعرے خود اسی کی قوم کے اکابر لگا رہے تھے۔

[2] اشارہ ہے اس حدیث نبوی کی طرف جس میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ سلطان جائر کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔

[3] سچے بندہ کی یہ دردناک پیشین گوئی کیسی سچی اتری۔

اس کے بعد ان ہی کا تب صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا کارڈ مورخہ 3 اکتوبر بھوپال سے حسب ذیل ملا:

''یہ عریضہ حسب ارشاد مولانا محمد علی صاحب قبلہ لکھ رہا ہوں۔ صاحب موصوف یکم اکتوبر کا دن گزار کر شب کی گاڑی سے بمبئی روانہ ہو گئے۔ یہ فرمایا کہ جناب کو اور جناب قطب الدین عبدالولی صاحب کو اس امر کی اطلاع کر دوں کہ ہر دو حضرات موصوف کے لیے دعا فرمائیں اس لیے کہ مولانا ممدوح کی علالت کا سلسلہ روانگی کے وقت تک تھا گو کسی قدر سابقہ حالت سے مرض میں کمی تھی لیکن جدید شکایت ملیریا کی ہو گئی تھی جس سے ایک روز متلی کے باعث تکلیف رہی مگر روانگی کے دن اس میں افاقہ ہو گیا تھا''۔

......☆☆☆......

باب:86

7:1930

(مرنے کے لیے۔ اللہ کے شیر کی آخری گرج)

شروع اکتوبر کی کوئی تاریخ تھی کہ مولانا جہاز پر بیٹھ برطانیہ روانہ ہوگئے۔ اپنی پہنچ نہ بھوپال ہوسکی نہ بمبئی۔قسمت میں یہی تھا کہ رخصتی ملاقات نہ ہونے پائے، حالانکہ مولانا نے بھوپال بار بار بلایا اور بمبئی میں بھی کئی دن ان کا قیام رہا تھا......آہ! یہ گمان بھی کسے تھا کہ یہ ولایت کا مسافر حقیقتاً ٹکٹ جنت کا لے رہا ہے!......علالت روز بروز بڑھتی اور حالت ہر روز گرتی جارہی تھی۔ بیدرد معاندین، شاید اپنے ظرف پر قیاس کر کے سمجھ یہ رہے تھے کہ مولانا یہ سفر کسی لطف وتفریح کی خاطر کرر ہے ہیں۔ وہاں اس کا امکان ہی اب کیا باقی رہ گیا تھا۔ ادھر دھن تھی تو بس یہ کہ گرتا پڑتا، لڑکھڑاتا، جس طرح بھی بن پڑے، اس نادر موقع پر پہنچوں اور دین اور وطن کی طرف سے آخری فریضۂ تبلیغ ادا کر جاؤں۔ میرے نام کا خط بھوپال سے لکھا تھا جو ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، ایک بار پھر ان کے فقروں سے اپنی یادداشت تازہ کر لیجیے:

''شدّ رحال اب تو میرے مذہب میں گول میز کانفرنس ہی کی شرکت کے لیے جائز رہ گیا ہے......پاؤں میں حس پہلے ہی نہ تھا، اب حالت کچھ بدتر ہی ہے۔اور سردیوں میں گنگرین یا ان کی قطع وبرید اور اسی طرح کی موت کا اندیشہ رہے گا جس سے ڈاکٹر انصاری کے مرحوم ومغفور منجھلے بھائی کو

دوچار ہونا پڑا تھا...... اب تک صاحب فراش ہوں۔ کانفرنس کے روزانہ اجلاس نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیوں میں ایک ایک نقطہ پر جنگ کرنی پڑے گی۔ ان تین محاذوں پر جنگ کرنے میں ہر وقت دل کی حرکت یکا یک بند ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ سب سے زائد یہ کہ اب لکھ پڑھ نہیں سکتا...... میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطان جائر اور رعایائے جائر دونوں کے سامنے کلمہ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں تا آنکہ اس کام میں مر جاؤں''۔

اللہ اللہ! کیا ہمت تھی، اور کتنا مضبوط ایمان تھا! موت کو اپنی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے ہیں، پھر بھی بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ شملہ میں جب سرکاری ہسپتال میں اسٹریچر پر پڑے ہوئے ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ کو لائے جا رہے تھے تو کسی نوعمر یورپین خاتون نے ترس کھا کر انگریز ڈاکٹر سے پوچھا کہ ''ان بڑے میاں کو کیا تکلیف ہے؟'' ڈاکٹر نے جواب دیا ''یہ نہ پوچھو۔ یہ پوچھو کہ کون سی تکلیف انھیں نہیں ہے؟''...... سفر شروع کرتے کرتے تو حالت اور بھی زار ہو چکی تھی۔ بیوی کو بھی باوجود مصارف سفر مہیا نہ ہونے کے جو ساتھ لیے جا رہے تھے تو وہ بھی اس خیال سے کہ جو زندگی کی ہر منزل میں رفیق رہی، وہ سفر آخرت شروع کرتے وقت بھی پاس ہی رہے۔ خط میں یہ الفاظ بھی تو تھے:

'' قرض دام لے کر، بھیک مانگ کر، جس طرح بھی ہو سکے گا، تین چار ہزار روپیہ فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے چلوں گا، اس لیے کہ وہ زندگی کی ساری منازل و مراحل میں میری رفیق سفر رہی جب منزل مقصود کے لیے احرام باندھوں تو چاہتا ہوں کہ وہ موجود ہو''۔

عین روانگی کے وقت ایک بڑے مخلص رفیق، میرے ہم نام مولانا عبدالماجد بدایونی نے جب پوچھا کہ آخر علالتوں کی رپورٹ اور ایک زندہ لاش بنے ہوئے آپ ولایت جا ہی کیوں رہے ہیں؟ تو جواب میں صرف یہ الفاظ کہے'' مرنے کے لیے''۔

....

جہاز پر جب سوار ہوئے ہیں، تو خود سے سوار ہونے کے قابل کہاں تھے۔ اسٹریچر (بیمار ڈولی) پر لٹا کر سوار کرائے گئے۔ فرانس پہنچتے پہنچتے حالت اور ردی ہو گئی، لندن ابھی دور

تھا۔ اور حالت اتنی گر گئی تھی کہ اتنے سفر کا تحمل بھی ممکن نہ تھا، راستہ ہی سے پیرس میں اتار لیے گئے۔ اور علاج یہیں بڑے بڑے ماہرین فن کا شروع کر دیا گیا۔ عین جس وقت ہندوستان میں یہ سخت تشویش انگیز اطلاعیں آ رہی تھیں یعنی یکم نومبر یا اس کے لگ بھگ، اسلامی ہند کا ایک خاصہ بڑا طبقہ، اسلامی ہند کی کشتی کے اس سب سے بڑے ناخدا پر قہقہہ لگا رہا تھا! آپ کہتے اور سمجھتے ہوں گے کہ یہ وقت تو وہ تھا کہ دشمن بھی ایسے موقع پر قابل رحم و ہمدرد ہو جاتا ہے، لیکن محمد علی غریب کی قسمت میں یہ بھی نہ تھا؟ شقاوت کے پورے کمالات کے ساتھ عین اس وقت یہ ایڈیٹوریل لاہور کے مشہور ''اسلامی'' روزنامہ زمیندار میں ''مولانا محمد علی کی علالت'' کے زیر عنوان نکلا تھا:

''اس وقت جب کہ گول میز کانفرنس کے دوسرے مندوبین ہائیڈ پارک کی سیر سے دل بہلا رہے ہیں اور ہوائی جہازوں کی نمائشیں دیکھ رہے ہیں، مولانا محمد علی پیرس میں صاحب فراش ہیں۔ اگر یہ علالت مولانا کی شملہ کی علالت سے مماثل ہے جس کے بعد آپ فوراً بھوپال پہنچ کر والی بھوپال کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہو گئے تھے تو چنداں تشویش کی بات نہیں''۔

گویا محمد علی کا جرم یہ تھا کہ وہ شملہ کی شدید علالتوں کے بعد زندہ کیوں باقی رہ گئے!......آپ کہیں گے کہ شرافت تحریر کی حد کر دی۔ لیکن ذرا ٹھہریئے، ابھی کچھ درجے اور باقی ہیں:

''اگر اس علالت کی واقعی کوئی حقیقت ہے، تو یہ امر سخت مصیبت ناک ہے''۔

آپ جلدی سے یہ نہ کہہ اٹھیے کہ خیر، بیچارہ نے کچھ تو تلافی کر دی، لیکن اس ''مصیبت ناکی'' کی ذرا تشریح بھی سن لیجیے۔ ہمدردی اس لیے نہیں کہ محمد علی کی زندگی کی قیمت کسی ادنیٰ مسلمان کی زندگی کے برابر بھی ہے، یا یہ کہ لکھنے والے کو محمد علی کی جان کا درد و قلق کسی درجہ میں بھی ہے، بلکہ طنز و تعریض کے اس بھاری پتھر کے نیچے حقیقت یہ دبی ہوئی ہے کہ:

''جس اعزاز کے حصول کے لیے مولانا ممدوح نے اپنے اصول کو چھوڑا، اس سے کچھ فائدہ اٹھانے کا موقع آپ کو نہ مل سکے گا......دعا ہے کہ خدا مولانا کو صحت عطا فرمائے تا کہ آقایان فرنگ کے آستانہ پر ناصیہ فرسائی کرنے کی جو آرزو انھیں اس پیرانہ سالی میں کشاکشا یورپ لے گئی ہے، پوری

ہوجائے''![1]۔

اور یہ تحریر جو محض نمونہ کے طور پر درج ہوئی، نہ اس اخبار ہی کی آخری اور اکیلی تحریر تھی اور نہ خود یہ اخبار اپنے اس رنگ تحریر میں منفرد تھا!...... محمد علی کا شاریوں بھی صالحین امت میں تھا، پھر بھی خدا جانے زبان کے کتنے گناہ ان سے سرزد ہوتے رہے ہوں گے۔ حکمتِ خداوندی نے کیا اچھا سامان ان گناہوں کے دھل جانے کا یوں بدزبانوں کے زبان وقلم سے ادا کرادیا!

دنوں سے گزر کر نوبت ہفتوں کی آچکی، اور علالت کی تشویش انگیز خبریں برابر پیرس سے آتی رہیں، خدا خدا کر کے وسط نومبر میں افاقہ ہوا اور محمد علی اس قابل ہوئے کہ کسی طرح لندن پہنچ سکے۔ معاندین کے طبقہ کے سوا اور جتنے مسلمان تھے، سب کے دل سے یہی دعائیں نکل رہی تھیں کہ مولانا کسی طرح لندن پہنچیں تا کہ ان کی شرکت کے بغیر مسلمانوں کی نمائندگی کانفرنس میں ادھوری کیا بہ منزلۂ صفر کے رہ جائے گی، اللہ نے غریب مسلمان کی سن لی، اور مولانا کانفرنس میں پہنچ گئے۔ پہلے ہی اجلاسِ عام میں ان کی جو تقریر ہوئی، اس نے دوست تو دوست دشمنوں تک سے داد لے لی۔ دسمبر کے شروع کی کوئی تاریخ تھی، جب مولانا کی تقریر کا جو خلاصہ تار پر اخبارات میں آیا اس میں بھی یہ الفاظ موجود تھے:

''ہم دونوں بھائی وہ پہلے دو شخص ہیں جنھیں لارڈ ریڈنگ نے جیل میں ڈال دیا تھا۔ لارڈ ریڈنگ سے مجھے انتقام لینا مقصود نہیں لیکن اپنے ملک کی آزادی کا تو میں اس وقت قائل ہوں گا جب مجھے یہ اختیار حاصل ہوجائے کہ میں جب چاہوں، لارڈ ریڈنگ کو ان کے کسی جرم پر جیل

1۔ کتنا مختلف تھا نومبر و دسمبر 1930 کا زمیندار جنوری 1952 کے زمیندار سے جواب یہ لکھتا ہے ''وہ باتیں کرتا تو سننے والے ایسا محسوس کرتے جیسے شیر نر کچھار میں گونج رہا ہے، تقریر کے لیے کھڑا ہوتا تو سامعین یہ سمجھتے کہ آسمان کے آغوش میں بادل گرج رہا ہے، منبر پر ہوتو امام غزالی کی زندہ تصویر، میدان میں ہوتو محمد بن قاسم کا قابل فخر نمونہ ...... اسلامیان ہند کا قائد اولوالعزم اور مجاہد سپہ سالار چلتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے مضبوط قدموں سے کرۂ ارض کا سینہ بیٹھا جاتا ہے۔ دوران تقریر میں اپنا تنا ہوا ہاتھ جوش کے ساتھ لہراتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ اپنے آہنی پنجہ سے گردش افلاک کو مروڑ ڈالنے کو آگے بڑھ رہا ہے...... مختصر یہ کہ وہ ایک ہی وقت میں بلند پایہ شاعر، بے مثال ادیب، متبحر عالم، حقیقت بیان خطیب، عدیم النظیر مقرر، اعلیٰ ترین مدبر، کوہ وقار مجاہد، اولوالعزم سپہ سالار، لاثانی اخبار نویس، جلیل القدر رہنما اور بہترین سیاستدان تھے، افسوس ہے کہ پاکستان کو اس مجسمۂ علم و عمل اور تصویر عزم وہمت جرنیل کی قیادت نصیب نہ ہوسکی۔

بھجوادوں......

میں درجۂ نوآبادیات کا قائل نہیں۔ میں تو آزادیٔ کامل کو اپنا مسلک قرار دے چکا ہوں ...... برطانیہ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو نامرد و بزدل بنادیا ہے، لیکن 33 کروڑ کی جس آبادی نے خود اپنے میں مرجانے کی ہمت پیدا کرلی ہے، اسے مارڈالنا کچھ آسان نہیں...... اصلی مسئلہ اس وقت ہندو مسلم مفاہمت کا مسئلہ ہے۔ دونوں کو آپس میں لڑا کر حکومت کرانے کا مسئلہ اب ایک بھولا ہوا خواب ہے...... میں مریض ہوں اور اپنے بستر مرض ہی سے یہاں آیا ہوں، اب میں اس وقت تک اپنے غلام ملک میں زندہ واپس نہ جاؤں گا جب تک کہ اپنے ہمراہ روح آزادی کو لے کر نہ جاؤں، اگر آپ نے یہ نہ دیا تو میرے لیے اپنے ہاں قبر کی جگہ دیجیے''۔

اللہ اللہ! یہ اللہ کے شیر کی آخری گرج تھی، جو کہنا چاہیے کہ عین سلطان جائر کے دربار میں بلند ہوئی، اور حدیث نبوی کی وہ بات پوری ہوئی کہ سلطان جائر کے سامنے کلمہ حق کہنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے!......خوب لحاظ رکھ لیجیے کہ یہ دسمبر 30 کا زمانہ تھا۔ 47 و 48 نہ تھا۔ 30 کے معیار تقریر وتحریر میں رکھ لیجیے، اور جب ایک نظر اس تقریر کے تیوروں پر کیجیے۔ یہ لارڈ ریڈنگ وہی ''صاحب جبروت'' بزرگ ہیں جو 21 میں ہندستان کے وائسرائے تھے، اور جن کی قہرمانی سے ایک عالم لرز رہا تھا۔ اور یہ حضرت بہ نفس نفیس گول میز کانفرنس میں جلوس افروز بھی تھے...... ''موت یا آزادی''! یہ قلندرانہ نعرہ بیبا کی سے کون لگا سکتا تھا، بجز اس مردمومن کے جس کا ایمان غیب پر اس کے شہود ومشاہدہ سے شاید کچھ کم نہ تھا۔ مالک الملک کو اپنے بندۂ غیور کی بات کی لاج رکھنی تھی۔ کیسی بات اس کی زبان سے نکلوادی۔

....

ادھر دنیا ہمت مردانہ کی ان رجز خوانیوں سے گونج رہی تھی، ادھر ہندوستان (خصوصاً لاہور، دہلی، اور بمبئی) کے بعض معلوم ومعروف اور اردو وانگریزی اخبارات مسلسل بدزبانیوں اور سب وشتم کے تیر برسانے میں مشغول تھے، بیماریوں کی خبریں اور کارگزاریوں کی رودادیں اس زمانہ میں دوسرے ذریعوں سے آتی رہیں۔ خود مولانا کے خطوط اس درمیان میں جو آئے وہ اپنی بڑی

صاحبزادی زہرہ بی کے نام آئے۔لیکن اکثر ان میں یہ تصریح بھی ہوتی تھی کہ وہ خط اس نامہ سیاہ کے پاس بھیج دیے جائیں۔مولانا کی چھوٹی صاحبزادی گلنار بی اپنے شوہر شعیب قریشی (وزیر ریاست بھوپال) کے ساتھ خود بھی اس وقت انگلستان میں تھیں۔اور بیگم محمد علی تو (جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے) آخر وقت میں اپنے شوہر نامدار کا ساتھ دینے کے لیے ہمراہ ہی تھیں اور ان کی عمر کی آخری منزل میں بھی زندگی بھر کی رفاقت کا حق ادا کر رہی تھیں......بیگم محمد علی محض بیوی نہ تھیں، محبوب اور بڑی چہیتی بیوی تھیں......مولانا شوکت علی بھی لندن ہی میں تھے۔غرض محمد علی کے قریبی عزیزوں میں اس وقت صرف زہرہ بی ہی ہندوستان میں تھیں اور قدرتاً ان کے ہر خط کی مخاطب بھی یہیں تھیں۔ذیل میں اس دور کے صرف دو خط درج کیے جاتے ہیں۔نمونہ کے لیے بالکل کافی ہوں گے۔پہلا خط 6 نومبر کا پیرس سے لکھا ہوا ہے اور دوسرا اس سے سات ہفتے بعد 26 دسمبر کا لندن سے لکھا ہوا۔

باب: 87

8:1930

(سفر کی کہانی مسافر کی زبانی)

(1)

پیرس (اسپلنڈر ہوٹل)

6 نومبر 1930

پیاری زہرہ

خداوند کریم تجھے اور طارق کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آج ہندوستان سے چلنے کے ایک ماہ اور دو دن بعد میں پہلی بار تجھے یہ خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیج رہا ہوں تا کہ تو اور سب عزیز واقارب اور دوست احباب مطمئن ہو جائیں کہ خداوند کریم کے فضل سے میں نے دوبارہ زندگی پائی۔ حقیقتاً جو دھچکا مجھے اس بار لگا وہ سب سے زیادہ سخت تھا۔ باوجودیکہ یہ جگہ شملہ کی طرح سطح سمندر سے اونچی نہ تھی تاہم خون کا دباؤ بالکل شملہ کی طرح 190 سے اوپر ہو گیا تھا اور لیٹنا سانس کے باعث ناممکن ہو گیا تھا۔ بھوپال میں بھی ابتدائے ستمبر میں بمبئی سے واپسی پر خون کا دباؤ یکا یک اس طرح بڑھ گیا تھا مگر سانس کی یہ حالت نہیں ہوئی تھی۔ اس بار سب سے زیادہ تکلیف دہ بخار، جگر کا بڑھ جانا اور اس میں درد پیدا ہو جانا، بھوک کا بالکل غائب ہو جانا متلی، کا بار بار ہونا اور صفرے

کی عجیب وغریب زیادتی جس کے باعث پانچ دن تک غذا بالکل ہضم نہ ہوسکی اور اس طرح ایک طرف ضعف اور دوسری طرف صفرے سے کشتی لڑنا، یہ سب کچھ ہوا۔

شملہ میں مرض کا پہلا سخت حملہ تھا اور بدن میں مقابلہ کی قوت تھی۔ بھوپال میں بمبئی واپسی پر حملہ اس قدر سخت نہ تھا مگر بدن میں اب جان نہ تھی۔ یہاں تو کچھ نہ پوچھو کیا گزری۔ خدا تیری بی کا بھلا کرے، رات دن میری رفیق سفر تھی اور مجھے اطمینانِ قلب حاصل تھا۔ خدا بھلا کرے میرے مصری اور ترک دوست ڈاکٹر بہجت وہبی کا جنھوں نے بہتر سے بہتر ماہرین علاج قلب ومعدہ سے میرا علاج کرایا۔ اور صبح وشام خود بھی اس میں مصروف رہے۔ جو امداد ان سے ملی ساری عمر میں کسی سے نہیں ملی۔ ان کے لیے دعا نکلتی ہے۔ ان سے زیادہ اچھا اور سچا مسلمان میں نے بھی آج تک نہیں دیکھا اور ان کا عشق میرے دل میں پہلی بار اس وقت جاگزیں ہوا تھا جسے اب کوئی پچیس برس ہوئے ہوں گے جب میں نے مدراس کے اسلامی اخبار میں اس مضمون کی نقل پڑھی جو انھوں نے انگلستان کے مشہور رسالہ ''انیسویں صدی اور مابعد'' Nineteenth century and after میں پین اسلامزم یعنی اخوت اسلامی پر لکھا تھا۔ اقبال سے بھی پہلے میں نے اپنے اسلامی خیالات کا نقشہ ان کے اس مضمون میں دیکھا تھا۔ اس سچے مسلمان پر جو ڈاکٹر انصاری کی طرح ایم ڈی کی ڈگری انگلستان سے لے چکا ہے اور جو مصری حکومت میں جنگ سے پہلے اناٹومی یعنی علم تشریح کا پروفیسر تھا۔ اس کے اسلام اور اس کی علمی اور عملی قابلیت کے باعث جو کچھ گزرا ہے وہ ایک بڑی داستان ہے اور جس طرح وہ آج پیرس میں ایک جلاوطن کی زندگی گزار رہا ہے اور دال روٹی کھا رہا ہے وہ بھی ایک داستان سے کم نہیں ہے۔ انشاء اللہ کبھی یہ سب داستان دہرائی جائے گی۔ آج وقت نہیں۔ جب میں 1920 میں وفد خلافت کو لے کر آیا تھا تو میرے ترک دوست اسعد فواد بے اور میری مصری دوست زیبا خانم اسعد کی بیگم صاحبہ کے ساتھ یہ سوئزرلینڈ میں رہتے تھے۔ پہلی بار ان تینوں دوستوں سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ جب 1928ء میں مہاراجہ صاحب الور کی فیاضی اور قدر افزائی کے باعث میں یورپ کو پھر علاج کے لیے آیا تو ڈاکٹر وہبی نے مجھے یہاں کے ایک ماہر علاج ذیابیطس کو بھی دکھایا تھا۔ جب جرمنی جاتے وقت پیرس ہی میں بیمار پڑ گیا تھا تو انہی نے دیکھا بھالا تھا اور فرینکفرٹ روانہ کرایا تھا۔ واپسی میں مظفر اور میں

اسی ہوٹل میں جہاں یہ رہا کرتے ہیں ٹھہرا تھا، جہاں اب بیماری کے باعث بی اور میں رہتے ہیں۔

جہاز پر تو میں آنکھوں سے اندھا تھا اور قلب کی حالت خراب تھی البتہ عدن پہنچتے تک طبیعت درست ہوگئی تھی۔ وہاں جہاز سے اترنا چڑھنا اور اپنی مریدنی خیر النساء اور حسین بھائی کے لائے ہوئے کھانے میں ذرا سا چکھ لینا بھی مضر ثابت ہوا اور دو دن بعد اس کا اثر محسوس ہوا مگر دو چار روز بعد طبیعت پھر سدھر گئی۔ میں شوکت صاحب، زاہد اور بی کے ساتھ قاہرہ تو اس بار نہ جاسکا مگر پورٹ سعید میں بیت المقدس سے آکر حضرت مفتی اعظم امین الحسینی صاحب جہاز پر مجھ سے مل گئے۔ اور ان کے سکریٹری اور ہمارے موتمر عالم اسلام منعقدہ مکہ معظمہ کے ترجمان عجاج صاحب قاہرہ جاکر شوکت صاحب سے مل آئے اور ان ہی کے ساتھ واپس آکر مجھ سے مل بھی گئے۔ قاہرہ جانے کی طاقت مجھ میں نہ تھی البتہ تین دن بعد مالٹا اتر کر میں نے اس جگہ کو دیکھا جہاں ہمارے سردار حضرت محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے رفیق مولانا حسین احمد صاحب اور عزیز گل صاحب وغیرہ مریدوں اور شاگردوں کے ساتھ قید کردیے گئے تھے۔ اس میں تکان ضرور محسوس ہوئی گو میں موٹر سے بالکل نہ اترا تھا اور صرف ایک گھنٹہ اس میں گھوما تھا۔ مارسیلز میں اکرم روحی بے اور ان کے ساتھ یہ حضرت محمد رشاد خلیفۃ المسلمین مرحوم کے صاحبزادے جو اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ یہیں رہتے ہیں، ملے۔ یہ شعیب صاحب سے ملنے آئے تھے۔ ہم اسی دن پیرس چلے گئے اور گو راستہ لمبا اور راستہ بھر اپنی ٹوٹی پھوٹی کہا، دس بارہ لفظ فرانسیسی زبان میں اپنے کمرہ کے مسافر کو سمجھانا پڑا کہ پہلے ہم گاندھی جی کے ساتھ مل کر کس طرح کام کرتے تھے اور اب کیوں مسلمانوں کی حق تلفی سے پریشان ہو کر ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے اس تحریک سے علاحدہ ہیں، مگر ہندوستان کی آزادی کے لیے آواز بلند کرنے لندن جارہے ہیں جس کے باعث مجھے کم آرام ملا، تاہم شام کو پونے گیارہ بجے ہم بخیریت پیرس پہنچ گئے اور ڈاکٹر وہبی اور شوکت اللہ شاہ کو اسٹیشن پر پایا۔ رات کو آرام سے سویا، صبح کو غسل کیا، ناشتہ کیا اور بی کے لیے چند ضروری چیزیں خریدنے بازار گیا۔ یہاں White Away سے بیسیوں بڑی دکانیں تین چار بے حد مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک میں سب چیزیں مل گئیں، مگر مجھ پر یہ محنت سخت گزری اور بھوک سے بیتاب ہوگیا۔

ایشیائی کھانے کی تلاش میں ایک ارمنی کی دکان میں گیا جہاں گوشت حلال ملتا ہے۔ خدا نے تمھاری بی کو بے حلال کیے ہوئے گوشت سے اب تک بچایا ہے اور انشاء اللہ ہم لندن میں بھی اس سے محترز رہیں گے۔ اس دوکان میں پہلی جو چیز ملی وہ طولمہ (دولمہ) تھے مگر مجھے پسند نہ آئے تاہم بھوک سے مجبور ہو کر کھائے پھر گوشت اور چاول ملے جو خوب لذیذ تھے اور پیٹ بھر کر کھائے گئے۔ غلطی یہ ہوئی کہ اس پر اکتفانہ کیا گیا دہی میں ملے ہوئے سیخ پر لگے ہوئے گوشت کے ٹکڑے بھی کھائے جو سب سے زیادہ مزے دار تھے اور ذرا سی کھیر بھی۔ اس قدر شکم سیر ہو کر کھانا ہزاروں مرتبہ کھایا تھا مگر اب بیماری نے قوتِ ہضم نہیں چھوڑی تھی۔ ذرا ہوا کھا کر جو ہوٹل آیا تو سوءِ ہضم کی شکایت محسوس ہوئی۔ پلنگ پر آتے ہی لیٹ گیا رات کو کچھ نہ کھایا اور صبح بھی احتراز کیا البتہ غسل کر کے دو پہر کو ہوا خوری کے لیے بی کے ساتھ موٹر میں گیا اور الموڑہ کے دوست بدری ناتھ پانڈے اور گوونڈ ولبھ پنت جی سوراجی لیڈر نینی تال کے داماد چندر دت پانڈے صاحب جو یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ساتھ تھے واپسی میں قے ہوئی اور پت نکلے۔ شب کو بخار بھی ہو گیا۔ یہ 18 اور 19 اکتوبر کی سرگزشت ہے۔ اس کے بعد چار پانچ دن سخت حالت خراب رہی۔ بالآخر (ڈاکٹر بوری) ماہر علاجِ قلب نے جلد سے جلد جو دن علاج کے لیے نکال سکتے تھے ڈاکٹر وہبی کی دوستی کی وجہ سے دیا۔ اس سے پہلے ایک دن ایک اور ماہر علاج قلب کے گھر جا کر قلب کی حرکت کا بجلی سے نقشہ کھچوایا اور قارورہ کا امتحان کروایا لیکن جگر کی خرابی نے بیتاب کر دیا تھا، پت برابر بن رہے تھے اور چونکہ غذا ہو نہیں رہی تھی اس سے خلو معدہ کے باعث اور بھی زیادتی تھی اور ان کے نکلنے میں آسانی نہ تھی۔ مجبور ہو کر معدہ کے علاج کے ماہر کو بلایا۔ اس نے کہا چونکہ تم کل ڈاکٹر بوری کا علاج شروع کرا رہے ہو اس لیے میری مداخلت بیکار ہوگی۔ تاہم شب کو سکون معدہ اور جگر کے لیے ڈاکٹر کر بیر نے افیون کا انجکشن دو چار دن دلوایا جس سے اب نیند آنے لگی۔ دوسرے ہی دن سے ڈاکٹر بوری کا علاج شروع ہوا اور تین دن میں انھوں نے جگر کو درست کیا۔ قلب کی حالت کسی قدر بہتر کی اور اب ان کا علاج باقاعدہ ہونے والا تھا کہ آغا خان صاحب نے اصرار کیا کہ میرے دوست ڈاکٹر واکیز کو بھی دکھاؤ۔

یہ ڈاکٹر بوری سے زیادہ مشہور ماہر علاج قلب ہیں مگر اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ایک

شفاخانہ ان کے سپرد ہے، وہیں روزانہ جاتے ہیں مگر گھر پر کسی کا علاج نہیں کیا کرتے۔ یہاں تک کہ ٹیلیفون کی کتاب میں سے اپنا نام نکلوا دیا ہے۔ اسی باعث ان سے رجوع نہیں کیا گیا تھا۔ مگر آغا خاں نے اصرار کیا اور ان کو راضی کیا۔ مگر ان کے آنے کا چار پانچ دن انتظار کرنا پڑا اس لیے کہ وہ پیرس سے باہر گئے ہوئے تھے۔ مگر ان کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈونیز ویلو جو غالباً سمرنا کے رہنے والے ہیں آئے اور آکر دل، جگر، معدہ وغیرہ کی حالت دیکھ کر گئے۔ پیروں پر ورم پڑ گیا تھا۔ پیشاب آور دوا لکھ کر دے گئے اور اب چند دن صرف یہی علاج رہا۔ بالآخر گزشتہ جمعہ کو بتاریخ 21 اکتوبر پروفیسر واکیز نے خود یہاں آکر مجھے خوب غور سے دیکھا اور تجویز کیا کہ چونکہ انھیں جلد کانفرنس میں شریک ہونا ہے اس لیے دل کی اصلاح بجائے منہ سے دوا لینے کے پچکاری سے رگوں میں لینا چاہیے تا کہ جلد از جلد اثر ہو۔ چنانچہ 1 نومبر کو اللہ کا نام لے کر پچکاریاں کی گئیں اور کل 5 کو دے کر بند کر دی گئیں۔ اس عرصہ میں سب دوائیں بند کر دی گئیں۔ البتہ شب کو سوتے وقت ایک یا ڈیڑھ بڑا چمچہ ایک خوش ذائقہ شربت دیا جانے لگا تا کہ علی الصباح بلا تکلف ایک یا دو اجابتیں ہو جایا کریں اور روز صبح کو نمک کا بدمزہ اور تکلیف دہ جلاب جو شملہ سے اس وقت تک روزانہ بلا ناغہ دیا جاتا رہا نہ دیا جایا کرے۔ واقعی یہ شربت بہت اچھا ثابت ہوا اور تمھاری بی اور میں دونوں اسی کا استعمال کرتے ہیں (بی کا قارورہ بھی امتحان کے لیے پرسوں بھیجا گیا ہے تا کہ نقرس کا علاج تجویز کیا جا سکے) چونکہ پیشاب آور دوا بھی بند کر دی گئی اس لیے پیروں کا ورم اور بھی زیادہ ہو گیا۔ مگر آج پچکاریاں بند کر دی گئیں اور وہ پھر جاری ہو گئی ہے۔ روز بروز حالت بہتر ہوتی گئی مگر تین دن ہوئے سورج خلاف معمول دو دن سے نکل رہا تھا میں بھی بی کے ساتھ موٹر میں جنگل کی ہوا کھانے چلا گیا تو معلوم ہوا کہ کس قدر کمزور ہو گیا ہوں۔ 18 اکتوبر سے کمرہ میں بند تھا۔ اس سے پہلی بار 3 نومبر کو نکلا تو لفٹ (Lift) تک جانا دوبھر تھا اور پھر دس پندرہ منٹ آرام کرنے کے بعد ٹیکسی تک جانا مشکل تھا۔ خیر گھنٹہ بھر جنگل میں موٹر دھوپ میں گھمائی، پھر ایک جگہ آکر بی کو دودھ کی برف کھلوائی اور ڈھائی گھنٹہ بعد پھر ہوٹل آئے۔ ڈاکٹر وہی صاحب اتفاق سے دیکھنے آئے اور نہ پایا تو سخت ناراض ہوئے اور اسی وقت معلوم ہوا کہ پچکاریوں کے زمانہ میں بھی اس کا سخت پرہیز تھا۔ کھانے کا تو پرہیز تھا ہی سوائے دودھ کے ڈبل روٹی اور ترکاری کے

سوپ(soup)سب کچھ بند تھا۔البتہ تین چار دن تمھاری ساتھ کی ہوئی مونگ کی دال خوب کام آئی۔کھچڑی پکوائی جاتی تھی مگر آج تک کسی نے ایسی کھچڑی نہیں کھائی،کبھی دال نہیں گلی،تو کبھی چاول نہیں گلے اور گلوائے گئے تو اس قدر پانی ڈالا گیا کہ کھچڑی کا کسی کو گمان نہ ہوسکتا تھا۔دلیا معلوم ہوتی تھی،اس میں نمک کم کہ ورم نہ بڑھے اور چکنائی ندارد کہ جگر نہ بڑھے،تاہم یہ سب کھانوں سے لذیذ تر معلوم ہوتی تھی،اس لیے کہ سوائے لابنے کدو کے سوپ کے کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی،البتہ آلو ابلے ہوئے پیس کر دیے جاتے تھے جس میں لیموں اور زیتون کا تیل ڈال کر سلاد بنا دیا جاتا تھا۔خیر یہ بھی زمانہ جوتوں گزر گیا۔

آج صبح 9: بجے آ کر پروفیسر وا کیز ااور ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر ڈونیز ویلو نے پھر دیکھا اور کہا الحمدللہ دل میں جو خرابیاں نظر آتی تھیں وہ سب دور ہوگئی ہیں۔اور حسب قرارداد سابق اب تم کل دس بجے لندن جا سکتے ہو۔سوائے پیشاب اور دوا کے اور اجابت کے لیے شربت کے بارہ دن تک کوئی دوا استعمال نہ کرنا۔اس کے بعد دل کی دوا جو منہ سے دی جاتی تھی وہ کھایا کرنا،اگر خدانخواستہ پھر کوئی سخت خرابی محسوس ہو تو پچکاریاں پھر شروع کر دینا۔کانفرنس میں روزانہ شرکت کی غالباً ضرورت نہ پڑے،نہ ہر وقت حاضری کی،جتنا زیادہ آرام کر سکو کرنا،ہمیں امید ہے کہ کانفرنس میں وقتاً فوقتاً رائے بھی دے سکو گے۔حسب ضرورت تقریر بھی کر سکو گے۔جب اس سے فارغ ہو جاؤ تو پھر پیرس آ کر ہمارا علاج کروانا انشاءاللہ ایک یا ڈیڑھ مہینہ کے علاج کے بعد قلب ایسا ہو جائے کہ کبھی گویا یہ مرض ہوا ہی نہ تھا۔دوا اور غذا کے متعلق مفصل ہدایات وہ اس وقت ارسال کر رہے ہیں تاکہ لندن جا کر ڈاکٹر عبدالرحمٰن ان پر خود بھی عمل کر سکیں اور مجھ سے بھی عمل کراتے رہیں۔ان کا انگریزی میں ڈاکٹر وہیں ترجمہ کر لیں گے۔بیگم صاحبہ بھوپال کو راستہ میں انفلوئنزا ہو گیا،اسی لیے عبدالرحمٰن صاحب پیرس نہ رک سکے۔اگر ان کی طبیعت درست ہوگئی ہوگی تو وہ شاید آج لندن سے یہاں آ جائیں تاکہ میرے ہمراہ سفر کریں۔ورنہ فرانس کی حد پر یعنی کیلے کی بندرگاہ میں زاہد آ جائیں گے اور اپنے ہمراہ ہم دونوں کو لندن لے جائیں گے۔آج کل کیلے سے ڈوور تک سمندر کا سفر تکلیف دہ ہوتا ہے۔جس دن شوکت صاحب لندن گئے اس دن سخت طوفان تھا۔ زاہد صاحب تو یہاں سے 26 اکتوبر ہی کو لندن روانہ ہوگئے تھے۔شوکت صاحب ایک ہفتہ بعد

یعنی 2 نومبر کو گئے ۔ یہاں ایرانی، افغانی اور ترکی سفرا سے ملاقات کی۔ رؤف بے حسب معمول خود یہاں تشریف لائے اور گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں۔ عدنان بے اور ان کی بیگم صاحبہ خالدہ ادیب خانم یہیں تھے مگر اب لندن تشریف لے جا چکے ہیں۔ وہاں ان سے ملاقات ہوگی۔ فتحی بے صاحب یہاں ترکی کے سفیر تھے مگر وہ ایک نئی سیاسی پارٹی کی صدارت کے لیے انگورہ جا چکے ہیں۔ ان کی جگہ میرے پرانے رفیق اور سچے مسلمان منیر بے صاحب ترکی سفیر ہو کر آئے ہیں۔ پہلے یہ سوئزرلینڈ میں تھے۔ ان سے میری دوستی 1920 میں ہوئی تھی، جب کہ توفیق پاشا کی سرکردگی میں پہلا ترکی وفد صلح کے لیے آیا تھا اور شرائط صلح کو سخت تباہ کن پا کر واپس چلا گیا تھا۔ جب مجھے ...... جا کر اس وفد سے ملنا ہوتا تھا تو نماز کے لیے مصلیٰ ان ہی کے ہاں ملتا تھا۔ ان ہی کے ذریعہ سے ہم نے خفیہ طریقہ سے سلطان وحید الدین کے پاس توفیق پاشا کی بہو اور سلطان کی لڑکی کی معرفت اپنے وفد کا خط بھجوایا تھا۔

افغانی سفیر یہاں اب تک وہی ہیں جو شاہ ولی خان کے ہمراہ یورپ آئے تھے اور جنھیں متھرا سے اپنے ساتھ بٹھا کر موٹر میں دہلی لایا تھا، تا کہ وہ اسی شام کو اپنے سسر کے ساتھ اپنی ساس سے ملنے نینی تال جا سکیں۔ گول میز کانفرنس کا کام الحمدللہ جہاز پر اچھی طرح ہوتا رہا، اور مہاراجہ صاحب الور نے اس میں بڑی مدد کی۔ شوکت صاحب اسی لیے یہاں سے 2 تاریخ کو چلے گئے۔ آغا خاں صاحب دو دن پہلے جا چکے تھے۔ مجھ سے ان کی ٹیلیفون پر خوب باتیں ہوئیں اور ان کو متفق پایا۔ جو خبریں بعض امریکن اخبارات کے ذریعہ سے ملیں ان سے امید ہوتی ہے کہ ہندوستان کا مطالبہ غالباً متفق ہو" خدا ہم چنیں کند"۔ کامیابی ہر حالت میں سخت مشکل ہے۔ مگر اس کے بغیر ناممکن ہے۔ خدا کرے مہا سبھائی ذہنیت سمندر پار جا کر بدل جائے اور ہندوستان والوں کو اپنی غلامی کا صحیح احساس ہو جائے اور ایک دوسرے کو غلام بنانے کے خیال کو چھوڑ کر سب کو دوسروں کی غلامی سے نکالنے کی کوشش کریں۔ خدا ہندو مسلمان دونوں کو توفیق دے کہ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں اور غلامی سے اتنے بیزار ہوں کہ نہ دوسروں کی غلامی قبول کریں اور نہ دوسروں کو غلام بنانے کی کوشش کریں۔ آمین ثم آمین۔

اب رخصت ہوتا ہوں ۔ اس خط کو سب عزیز و اقارب کو رامپور میں سنا کر فوراً عرفان

صاحب کے پاس بھجوا دینا کہ اسی ہفتہ خلافت میں شائع ہو جائے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس کی نقل دفتر خلافت کو بھجوا دی جائے۔ اصل تم اپنے پاس رکھو۔

یہی خط نواب اسماعیل خان اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے لیے ہے۔ سب کو سلام دعا پیار۔ طارق کو بالخصوص۔

تیرا دعا گو اور دعا کا طالب

محمد علی''

......☆☆☆......

سات ہفتہ بعد کا خط

(2)

''ہائیڈ پارک ہوٹل
26دسمبر1930

پیاری زہرہ

خداوند کریم ہم سب کو جلد اور بامراد ملائے۔ خدا کو یوں ہی منظور تھا کہ میں آج تجھے اپنے ہاتھوں سے خط لکھوں۔ ورنہ گزشتہ جمعہ کو جو بڑا خط اپنے سکریٹری سے میں ٹائپ کراتا رہا ہوں، اس کے شب کو ختم کراتے ہی میری طبیعت اتنی بگڑی کہ میں نے خود ہی بڑے ڈاکٹر یعنی ڈاکٹر امیر ولکر کے دوست ڈاکٹر رائل اور تلمنہ بی کے شوہر ڈاکٹر انکلیو ریا کو بلایا اور دونوں نے حالت اس قدر ابتر پائی کہ فوراً دو نرسوں کو بلوا بھیجا اور اگر اتنی جان بھی نہ ہوتی کہ پاس کے ہسپتال (St.Georages Hospital) تک جو سڑک کے کونے پر ہے، بھیجا جاسکتا ہے تو ضرور بھیج دیا جاتا۔ 9 کی شب کو حرارت تو ضرور 99 تھی مگر نبض 135۔ 20 کو بالکل بے ہوش رہا۔ حرارت 97 رہی مگر نبض 100 تک گری پھر 135 تک بڑھ گئی۔ 21 کو حرارت 95 گر گئی مگر جلاب کے باعث جس کا ہوش مجھے صرف اجابت آنے سے ہوتا تھا نبض 80 تک گر گئی۔ آنکھ کھلی تو ذرا بھی ہوش نہ تھا کہ میں دو دن سے موت کے منہ میں تھا۔ نہ اس کا ہوش تھا کہ دن ہے یا رات۔ رات کو دن سمجھ کر لارڈ سینکی لارڈ چانسلر کو جو وزرا میں سب سے معقول آدمی ہے، اس شب کے وقت حاضری کھانے پر بڑی منت سماجت نرس کی کر کے

بلایا۔ کیوں کہ ریمزے میکڈانلڈ ہندو مسلم معاملات کو سلجھانے سے قاصر تھا اور مجھے دھن اسی کی تھی۔ نہ معلوم کس طرح نرس راضی ہوگئی۔ غالباً اتنا بڑا نام سنا تو ہیبت زدہ اور مرعوب ہوگئی۔ لارڈ سینکی بڑا شریف انگریز ہے، سمجھ گیا اور سن چکا تھا کہ موت اور زیست کے بیچ میں ہوں۔ اس لیے دوسرے ہی دن صبح گیارہ بجے آنے کا وعدہ لکھ کر دیا۔ وہ آئے اور گو شوکت صاحب نے بھی اسی وقت آنا چاہا اور میں گھبرایا کہ بات نہیں کرنے دیں گے جس سے کسی قدر ناچاقی ہوتی۔

تاہم دس منٹ ہی میں میں نے اپنا مطلب ادا کر دیا اور کہہ دیا کہ سارے ہندوستان کا ہندو مسلم (مسئلہ) ایک ہے، قومی ہے اور تاریخی ہے، صوبہ وار نہیں ہے صرف اصول پر ہر جگہ طے ہوگا اور وہ اصول یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو پوری قوت مسلمانوں کو دو اور تسمہ ہنود کے لیے اس طرح لگا رہنے دو یعنی Power of Mojority خواہ 5 یا 6 کی ہو یا 40-45 کی اور Protection of Minority خواہ 45 کی ہو یا 40 کی۔ غضب یہ ہو رہا ہے کہ سکھوں اور انگریزوں کے بہانے سے پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی مجارٹی کو مینارٹی کیا جا رہا ہے اور لطف یہ ہے کہ کل آنکھ کھولتے ہی بیگم شاہنواز کی تحریر اس مضمون کی پڑھی کہ پنجاب میں ایک دو مسلمان کم کر دیے جائیں تو کیا حرج ہے۔ رحم لی اور ملک پروری نہیں ہے، پاگل پن ہے۔ یہاں آئے ہی کیوں تھے۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ 5 دن سے برابر ترقی ہے، کل 31 تک ہسپتال جا کر آرام کرنے کا ارادہ ہے۔ ایک رات کی ساری نیند اس مصیبت میں گئی کہ 6 دسمبر تک ''خلافت'' میں میری پوری تقریر کا ترجمہ نہیں شائع ہوا تھا حالانکہ 21 کی شب کو دی تھی اور اسی شب کو اصلاح کر کے مسلم آؤٹ لک، لاہور کو ارسال کی تھی۔ تین گھنٹہ جس مصیبت میں کاٹے تھے وہ خدا ہی جانتا ہے (اب یہ) ''خلافت'' والے تو دو ہفتے میں لندن کے اخباروں سے بھی لے سکتے تھے۔ مگر فکر کسے اور عقل کس کو۔ دفتر میں عجیب لونڈ ھار چھوڑ کر آیا تھا۔ خدا رحم کرے۔ اچھا اب رخصت۔ اس کی بہت صاف نقل کسی سمجھدار شخص سے کرا کے عرفان صاحب بلکہ کسی اور کو بمبئی بھیج دو کہ بغیر سنسر کے دیر لگائے ہوئے فوراً طبع ہو جائے۔ اصل ماجد، ذوالفقار اور معظم کو دکھاتے ہی اسماعیل خان صاحب کو

بھیج دو اور ان سے کہہ دو کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو اسے ڈاک سے بھیج دیں۔ کاش کسی ترکیب سے حیات کو بھی فوراً ہی پہنچ سکتا۔ مگر اب سکریٹری کی جگہ ایک چھوڑ دو نرسیں ہیں خدا معلوم مصارف کیسے ادا کروں گا۔ بی کے لیے مجبور ہو کر ایک علاحدہ کمرہ لیا ہے جس میں شوکت صاحب بھی آ کر سو جاتے ہیں۔ مظفر زاہد کے ساتھ ہے۔

طارق کو اور تجھے پیار۔

تمھارا

محمد علیؔ"

......☆☆☆......

باب:88

:1931

(ملت یتیم ہوگئی)

دسمبر کے آخری ہفتہ کی ابتدا تھی کہ اپنی خانگی ضرورتوں سے حیدرآباد ڈیڑھ دو ہفتہ کے ارادہ سے جانا ہوا۔ محمد علی کے پرستاروں کی کہاں کمی تھی۔ یہاں بھی شیدائیوں کا ایک اچھا خاصہ حلقہ موجود تھا۔ کانفرنس کی تقریروں پر ہر کان لگا ہوا۔ ہر زبان پر داد وتحسین، علالت سے تشویش واضطراب ہر دل میں پیدا۔ خیریت وصحت کی دعائیں ہر لب پر۔ انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا ایک خط، اور ساتھ ہی وزیر اعظم برطانیہ کے نام ٹائپ شدہ محضر یہاں ملے۔ خط میرے نام تھا، اور سیاست وعلالت دونوں کی دلآویز ومؤثر تفصیلات سے لبریز۔ دست بہ دست گشت ہونے لگا اور پھر الٹ کر مجھے اس کا دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔ ورنہ یہ ڈائری ہرگز اس سے محروم نہ رہتی۔ اپنی شدید ،خطرناک اور (جیسا کہ چند ہی روز میں ثابت ہوگیا) مہلک بیماری اور اس کے آلام وشدائد کو اپنے شگفتہ پیرایہ میں لکھنا، یہ محمد علی ہی کا حصہ تھا.....کون جانتا تھا کہ شمع اب بالکل بجھنے ہی کو ہے، اور یہ بہار اس کی آخری بھڑک اور آخری جھلملاہٹ کی ہے! بیماری کے دورے اب جلد جلد پڑنے لگے تھے۔ اور عقلاً وقتِ آخر اب بالکل سامنے تھا۔ لیکن طبیعت کمبخت غفلتوں میں مدہوش وسرشار۔ یہ باور کرنا ہی کب چاہتی تھی اپنے اور دوسروں کے بہلانے کو دل ہمیشہ تاویل کر لیتا تھا کہ ’’نہیں‘‘،

جس طرح پچھلے دورے جھیل لے گئے، اب کی بھی اللہ انھیں اچھا ہی کردے گا''۔ محمد علی کے بغیر دنیا کیسی سونی ہو جائے گی۔ امت اسلامیہ پر کیا حشر ہوگا، مسلمانانِ ہند کیسے یتیم اور بے سر دھرے کے ہو جائیں گے، نفس ان امکانات ہی کو تصور کے سامنے لاتا جھجکتا اور ہر دفعہ ان کو اپنے سامنے لانے سے ٹال لے جاتا تھا!

....

بات کہتے 1931 شروع ہو گیا۔ جنوری کی غالباً 4 تھی، جب حیدر آباد سے براہ دہلی واپسی کی ٹھہری۔ شب میں خواب دیکھا کہ کوئی جنازہ اٹھائے ہوئے ہوں۔ دن میں اداسی، افسردگی اور خوف کا اثر قائم رہا۔ سہ پہر کو ٹرین روانہ ہوئی۔ راستہ میں 5 کو تازہ اخبار نہ مل سکے۔ بڑے بڑے جنکشن جہاں تازے اخبارات مل سکتے تھے، اتفاق سے رات گئے پڑے۔ 6 کو صبح سویرے گاڑی دہلی پہنچی۔ اسٹیشن پر میرا بھتیجا ملا جو طبیہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ ایک ہی آدھ بات کے بعد اس نے کسی سلسلہ میں کہا'' کل تو کالج بند تھا اور شہر میں ہڑتال تھی''۔ ''کیوں''؟ سوال کرنے کو تو بے دھڑک کر دیا۔ لیکن نہ پوچھیے کہ اس ایک آدھ سیکنڈ کے قدرتی وقفہ میں دل پر کیا گزر گئی! بات بالکل موٹی اور صاف تھی۔ سوا ان مولانا کے اور ہو کون سکتا تھا؟ کون دوسرے مولانا بیمار تھے جن کے انتقال پر شہر میں ہڑتال ہو جاتی، ابھی ریل سے مع پورے سامان کے اتر بھی نہ پایا تھا کہ یہ سوال و جواب شروع ہو گئے تھے۔ اتر رہا تھا کہ یہ بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ جواب ملنے میں دیر ہی کیا لگتی'' مولانا محمد علی''!......اف! کیسی منحوس گھڑی تھی، جو یہ الفاظ کان کے پردوں سے ٹکرائے! ہائے! کاش کبھی یہ خبر سننے کو نہ ملتی! جی تلملایا۔ جیسے کوئی نو گرفتار پرندہ قفس کے اندر تڑپ رہا ہو۔ نہ روتے بنتا تھا نہ کچھ کہتے سنتے۔ زبان پر ایک چیخ کے ساتھ'' اِنَّا لِلّٰہِ'' کے الفاظ آئے اور پلیٹ فارم پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا! آنکھوں کے نیچے اندھیرا آرہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا الٹ پلٹ ہوئی جارہی ہے! دو چار منٹ بعد جب حواس ذرا قابو میں آئے، تو جھٹ جانماز بچھا کر پلیٹ فارم پر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا، اور چار رکعتیں پڑھ کر اس پاک و پاکیزہ روح کو ایصال ثواب کیا۔ اور دعا کے لیے جو ہاتھ اٹھائے تو اب رونا بھی دل کھول کر آیا۔ طبیعت بھری ہوئی تھی ہی، آنسوں انڈ انڈ کر اب نکلنے شروع ہوئے۔ دعا مناجات کے

الفاظ اب کہاں یاد لیکن عجب نہیں جو کچھ اس قسم کے ہوں:

''اے اللہ! تیری ذات ہر طرح بے نیاز ہے لیکن ہم بندے اب کیا کہہ کر اپنے دل کو سمجھائیں۔ اتنا بڑا سردار اٹھ گیا۔ قوم کی قوم بے سری ہوگئی۔ ساری امت یتیم ہوگئی۔ اب کون ہماری صحیح رہنمائی کرے گا؟ انگریزوں کے، ہندوؤں کے، سارے غیر مسلموں کے مقابلہ میں کون ہم سب کی طرف سے سینہ سپر ہوکر آگے بڑھے گا؟ یہ اخلاص، یہ فراست اب کہاں دیکھنے میں آئے گی؟ اے اللہ! محمد علی کو اٹھا کر آخر ہم لوگوں کو اب کس پر چھوڑا کس کے دل میں یہ درد، کس کی عقل میں یہ رسائی ہے؟

اے اللہ! تو اپنے اس بندے کی خطاؤں سے، لغزشوں سے در گزر کر! وہ تیرے دین کا دیوانہ تھا، تیرے نام کا عاشق تھا، تیرے رسول کا پروانہ تھا۔ اپنی عزت، اپنی وجاہت، اپنی قابلیت، اپنی صحت وہ سب تیرے دین ہی کے لیے وقف کیے ہوئے تھا۔ انسان تھا، بشر تھا، بشری کمزوریاں بھی یقیناً رکھتا تھا، غصہ ور تھا، مزاج اور زبان پر قابو نہ تھا۔ ان سب خطاؤں کو تو اپنی مغفرت بے حساب کے پانی سے دھو دے۔ اس نے تیری راہ میں کتنے دکھ درد سہے، کتنے ظلم اٹھائے، اپنوں اور بیگانوں سب کے تیروں کا کیسا ہدف بنا رہا۔ تجھ پر یہ سب خوب روشن ہے۔ اس کی مظلومیت ہی کو اس کا شفیع بنا، اس کو جنت اور اپنے غفران ورضوان کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ میں جگہ دے! اس کا حشر اپنے اولیا ومقبولین اور اپنے بندگانِ متقین وصالحین کے ساتھ کر۔ اس کی تربت پر اپنی رحمت کے بیشمار پھول برسا۔ اور ہم سب کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو صبر عطا فرما۔ تیرے ہی کسی عارف نے تیری زبان سے ادا کیا ہے ؎

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون وچرا در قضائے ما

سو اس کا ظہور آج سے بڑھ کر اور کب ہوا ہوگا۔ تیرے بڑے سے بڑے دشمن اور نافرمان باغی بندے کیسے ہٹے کٹے گھوم رہے ہیں اور وہ جو تیرے پیچھے اپنے کو فنا کیے ہوئے، مٹائے ہوئے تھا، اسی کو تو نے اٹھالیا''!

....

رو دھو کر طبیعت جب ذرا ہلکی ہوئی تو تانگہ کر کے سیدھا ایڈیٹر روزنامہ ملت، جعفری صاحب کے ہاں گیا۔ محمد جعفری (ہمدرد کے خوب جانے پہچانے ہوئے سب ایڈیٹر اور پھر ایڈیٹر) گو اب مولانا کی سیاست سے علاحدہ ہو چکے تھے، پھر بھی برسوں ان کی صحبت میں رہ چکے تھے، ان کے مرتبہ شناس تھے، اور اب بھی رشتۂ اخلاص ان سے جوڑے ہوئے تھے۔ ان سے مل کر دل کی بھڑاس اور نکلی۔ رونا از سر نو آیا۔ اور اب تعزیت میں وہ شریک تھے۔ عزا و ماتم کے موقع پر کسی مخلص و غمگسار کا مل جانا خود ایک بڑی نعمت ہے..... جعفری ہی بیچارہ نے جلے ہوئے دل کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ فلاں ادارہ کو بھی بادلِ ناخواستہ اور شرماشری، رائے عامہ سے ڈر کر، مولاناؒ کے ماتم میں حصہ لینا پڑا۔ یہ بھی وہیں سننے میں آیا کہ کل شام کو تعزیت کا جو عظیم الشان جلسہ شہر میں ہوا تھا، اس کی صدارت فلاں عالم کو دی گئی تھی، لیکن ان کی پھسپھسی اور بے دلی سے کی ہوئی تقریر سے کہیں زیادہ گرمجوشی، اخلاص اور اثر دیش بندھو گپتا (ایڈیٹر ''تیج'') کی تقریر میں تھا...... آج دہلی کا شہر ہی میری نظر میں کچھ سے کچھ تھا۔ جعفری کے ہاں آنے جانے میں آخر دو مرتبہ ان ہی سڑکوں سے گزرنا پڑا۔ بظاہر سب چہل پہل اسی طرح کی تھی، اسٹیشن پر مسافروں کا وہی ہجوم، وہی ریل پیل، ٹراموے، بسوں، تانگوں کا وہی شور و غل، بازاروں کا وہی ہنگامہ۔ لیکن اپنی نظر میں آج دلی بالکل سونی ہی تھی، اس کا سہاگ لٹ چکا تھا۔ کہاں سہاگن کا چہرہ اور کہاں بیوہ کا بشرہ! ایک محمد علی کی ذات سے معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر پر رونق ہے۔ آج جب وہ نہیں تو رونق کی جگہ ہر چہار طرف اداسی ہی اداسی۔

ہے تمھارے ہی دم سے یہ بزمِ طرب ابھی جاؤ نہ تم، نہ کرو یہ غضب
کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائے گا کیا کہ جو رونق بزم تمھیں نہ رہے

....

محمد علی کی کتاب زندگی ختم ہوگئی۔ ڈائری کے نام سے جو یہ کتاب ڈائری نویس نے اپنے ذاتی تاثرات کی ان سے متعلق گھسیٹ ڈالی، وہ بھی اب خاتمہ کے قریب آگئی۔ صرف ایک باب آگے اور آتا ہے جس میں ایک عام اجمالی تبصرہ ان کی زندگی پر ہوگا۔ اور اس کے بعد چند ضمیمے ملیں گے۔ سچ میں ان کا ماتم ہفتوں نہیں مہینوں بلکہ شاید برسوں ہوتا رہا۔ ان تعزیتی تحریروں،

اور منثور و منظوم ماتموں میں اقبالؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید سلیمان ندوی، و حفیظ جالندھری کے افاداتِ قلم خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور مولانا شوکت علی وہ حافظ ہدایت حسین بیرسٹر مرحوم کی تحریریں جو ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں، وہ سب بطور ضمیمہ محفوظ کردی گئی ہیں۔ اسی طرح اس نامہ سیاہ کی دوسری تحریریں بھی جو کسی نہ کسی موقع پر حضرت مرحوم کے سلسلہ میں نکل چکی ہیں۔

لیکن سب سے بڑھ کر مؤثر اور بابرکت حضرت مولانا تھانویؒ کا میرے نام کا مختصر سہ سطری تعزیت نامہ ہے۔ دونوں بزرگوں کے درمیان ایک عرصہ دراز تک تو خاصی ناگواری رہ چکی تھی اور پوری صفائی تو آخر تک بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس پر بھی جو خط حضرتؒ نے میرے خط کے جواب میں مجھے تحریر فرمایا، وہ ظاہر کررہا ہے کہ اولیاء اللہ کا ظرف بھی کتنا بلند ہوتا ہے! ضمیمہ کا انتظار کیوں کیجیے۔ وہ خط یہیں اور ابھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

''محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے، بیان نہیں کرسکتا، خدا جانے کتنی دفعہ دعا کرچکا ہوں اور کررہا ہوں۔ مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اسی اعتقاد کی بنا پر محبت ہے، وہ صرف ایک صفت مسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں 1۔ اس لیے ایک ہی صفت سے محبت ہے، اور اس کو روح الصفات سمجھتا ہوں''۔

......☆☆☆......

---

1 دونوں نے ایک دوسرے کو غالباً ایک بار دور سے دیکھا تھا، دہلی کی جامع مسجد میں۔ قریب سے تعارف اس وقت بھی نہ ہوا تھا اور اس کو بھی ایک لمبی مدت ہوچکی تھی، غالباً 1912 میں جب محمد علی بجائے ''مولانا'' کے مسٹر تھے۔ اس نامہ سیاہ نے دونوں بزرگوں کو ملانے اور یکجا کرنے کی جو کوشش کی تھی، اس کا ذکر حضرت تھانویؒ کے حالات کے سلسلہ میں کتاب ''حکیم الامت: نقوش وتاثرات'' میں ملے گا۔

باب:89

(اے ہلالِ ماخمِ ابروئے تو)

شیخ احمد سنوسیؒ کو چھوڑ کر، جن کی عظمت وجلالت کا اثر مجھ پر گو بہت گہرا اثر رہا، لیکن ان سے کل صحبت ہی گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی نصیب رہی، اور اس لیے اس نقش کو بھی زیادہ پائیداری نصیب نہ ہوئی، مستقل، گہرا اور پائیدار اثر میری زندگی پر سب سے زیادہ دو ہی شخصیتوں کا پڑا اور میری زندگی کے بہ قدر ظرف سنوارنے اور سدھارنے میں سب سے زیادہ معین ہوا......اگر یہ ناکارہ زندگی اپنی نااہلی کے باعث کچھ بھی سنور اور سدھر سکی ہو!......اور ان دونوں میں ترتیب زمانی کے لحاظ سے حق تقدم مولانا محمد علی کو حاصل ہے۔

ان کا نام اس وقت سے سننے میں آنے لگا جب اپنا بالکل بچپن تھا۔ اسکول کے کسی بالکل ابتدائی درجہ کا طالب علم تھا، اور وہ کالج کے منتہی ہو چکے تھے۔ ماہنامہ علی گڑھ سے میگزین کے حصۂ انگریزی میں ان کا نام اور ان کے کارنامے بار بار آتے تھے۔ اور اپنے پڑھے لکھے عزیزوں سے یہ چیزیں سن سنا کر ان کی عظمت اسی وقت سے دل پر بیٹھ گئی۔ پھر رفتہ رفتہ خود ان کی اردو اور انگریزی تحریریں مزے لے لے کر پڑھنے لگا، اور نقش عظمت روز بروز اور گہرا ہوتا گیا۔ کالج سے نکلا ہی تھا کہ پہلی بار ان کی زیارت ہوئی۔ اب وہ کامریڈ کے مشہور ایڈیٹر تھے اور تحریک علی گڑھ کے ایک نامور علمبردار، عظمت تو پہلے سے قائم تھی ہی، محبت بھی پہلی نظر پڑتے ہی پیدا ہو گئی۔ ''چوں برتو

افتدم نظر'' کا معاملہ۔ باقاعدہ ملاقات اور تعارف کوئی دوسال بعد ہوا۔ محبت اس ساری مدت میں برابر بڑھتی ہی رہی، اور یہ اپنی مذہبی بدعقیدگی کے باوجود۔ پھر 21 و 22 میں جب وہ جیل میں تھے، اور میں از سرِ نو مسلمان ہو چکا تھا، ان کا عشقِ رسولؐ دیکھ کر اور نعتیہ کلام پڑھ کر خود ان کی ذات کے ساتھ ایک عاشقانہ اور والہانہ کیفیت پیدا ہو گئی۔ اور محبت اور علمی عظمت میں نئی آمیزش گہری مذہبی عقیدت کی بھی ہو گئی۔ 23 میں جب وہ جیل سے باہر آئے تو انھیں مرشد سمجھ کر پابوسی کے لیے لپکا، انھوں نے جھکنے سے روک کر دوستانہ مصافحہ اور معانقہ پر سنبھال لیا۔ اور مدت العمر اپنی طرف سے بطور دوست، رفیق اور عزیز کے رکھا..... میری ان کی عمر میں 14 سال کا فرق تھا۔ سن کی بڑائی چھوٹائی کا یہ فرق مرتبہ کے لحاظ سے بھی آخر تک قائم رہا۔ انھوں نے اپنی طرف سے ہزار بے تکلف کرنا اور بالکل مساوات کی سطح پر لے آنا چاہا لیکن مجھے ''ایاز قدر خود بشناس'' کی پند سود من۔ یاد تھی۔ میں کبھی اپنی حد سے آگے نہ بڑھا۔

ستمبر 23 سے وسط 30 تک بکثرت یکجائی رہی۔ سال میں کئی کئی بار میں دہلی جاتا (شروع میں جانا علی گڑھ ہوتا) اور اس سے زیادہ وہ لکھنؤ آتے رہتے۔ متعدد سفر ان کے ساتھ کیے۔ دہلی سے لکھنؤ تک دہلی سے پانی پت تک، کانپور سے لکھنؤ تک وغیرہا۔ ایک ایک بار بھوالی اور کانپور اور بمبئی میں یکجائی رہی۔ ان کی پبلک زندگی کے علاوہ ان کی خانگی زندگی کا بھی کوئی گوشہ نظر سے مخفی نہ رہا۔ ان کی رنجشیں بھی ان کے قریب ترین عزیزوں کے ساتھ دیکھیں۔ غرض یہ کہ انھیں بہت ہی قریب سے دیکھا اور ہر طرح سے جانچا، پرکھا، تولا۔ یہ کہنا کہ ان کی شخصیت ہر بشری کمزوری سے پاک تھی، حدِ مدح میں شاعرانہ مبالغہ کرنا ہوگا۔ وہ نہ فرشتہ تھے اور نہ کوئی نبی مرسل۔ ہر معمولی انسان کی طرح گوشت و پوست سے بنے ہوئے اور جذبات و احساسات رکھنے والے ایک امتی تھے۔ مزاج کے تیز تھے اور گو پٹھان نہیں، لیکن بہر حال،، رامپوری'' تھے۔ اشتعال بہت جلد قبول کر لیتے۔ خصوصاً آخر کے چند سالوں میں کثرتِ آلام و امراض اور ہجوم افکار کے باعث۔ اور بات بات میں غصہ میں آجاتے۔ زبان پر قابو باقی نہ رہا تھا۔ جوش میں خدا معلوم کیا کیا زبان پر آجاتا۔ اور خرچ بھی زبان ہی کی طرح قابو سے باہر تھا..... لیجیے، بس بشری

1 سچ (مرحوم) 16 جنوری 1931

کمزوریوں کی فہرست ختم ہوگئی، مجھ جیسے گہرے اور قریبی تعلق رکھنے والے کے علم میں بھی ختم ہوگئی۔ رواج عام اس وقت اپنے اپنے اخبار متعلقہ میں طرح طرح کے القاب وخطابات کا چلا ہوا تھا۔ زمیندار میں مولانا ظفر علی خاں ''ظفر الملت والدین'' تھے۔ تنظیم میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو ''سیف الملت والدین'' تھے وغیر ہا۔ محمد علی نے کبھی اپنے کو ''محمد الملت والدین'' لکھوانے نہ دیا۔ اور تو اور ''رئیس الاحرار'' انھیں ایک دنیا لکھ رہی تھی لیکن اپنے اخبار ہمدرد میں اس لفظ تک کے روادار نہ ہوئے۔ خرچ جیسا اپنی ذات پر کرتے، ویسا ہی پیسہ دوسروں کو کھلانے پلانے، تحفہ وتحائف پیش کرنے اور دکھیاروں کو دینے لینے میں اٹھاتے۔ اور دو چیزوں کے تو کہنا چاہیے کہ بادشاہ تھے۔ ان دو صفات میں ان سے بڑھ کر کیا، ان کے ہم پلہ بھی اپنے علم وتجربہ میں کوئی دوسرا نہ ملا:

(1) ایک اسلام اور امت اسلامی سے بے انتہا محبت، دنیا میں کہیں کسی مسلمان کو تکلیف پہنچے، اور ممکن نہ تھا کہ محمد علی کا قلب اس سے نہ دکھے..... کانٹا افریقہ کے کسی مسلمان کے چبھا، اور اس کی چبھن محمد علی یہاں بیٹھے محسوس کر رہے ہوں۔

(2) دوسرے سچائی اور حق گوئی: پارٹی کی مصلحتوں سے متاثر ہوتے میں نے ہندوستان کے چیدہ سے چیدہ مسلم اور ہندو لیڈروں کو دیکھا اور تحزب (جماعت بندی) میں مبتلا بڑے بڑے علما ومشائخ کو پایا ہے۔ بے لاگ اور بے دھڑک۔ دوست، عزیز، بزرگ کسی کی پروا کیے بغیر دل کی بات زبان پر لے آنے والا محمد علی کا سا کوئی دوسرا دیکھنے میں نہ آیا..... سادگی، اخلاص، بے تکلفی، بے تصنعی یہ سب صفات اس ایک صفت کے لازمی برگ وبار تھے۔

اتنی خوبیوں اور ظرف وکردار کی ان ملکوتی بلندیوں کے بعد، عجب کیا جو حق تعالیٰ حشر میں ان کے پیر ومرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی قدس اللہ سرہ (متوفی 1926) کے اس وجدانی حسن ظن کو صحیح ثابت کر دکھائے کہ اگر علی برادران عہد نبویؐ میں ہوتے تو ان کے جذبات ایمانی سے کیا بعید کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی نام کے ساتھ جنت کی بشارت دے دیتے کہ محمد علی فی الجنۃ وشوکت فی الجنۃ.....رضی اللہ عنہم ورضوعنہ۔ اور محمد علی کی محبت اور اتھاہ محبوبیت کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ آج جب ان کا مسکراتا ہوا شگفتہ اور شاداب چہرہ نظر کے سامنے پھر جاتا

ہے تو 20 سال گزر چکنے پر بھی، خدا جانتا ہے کہ ان کی وہ محبوبیت تازہ ہو جاتی ہے اور دل بھر آتا ہے......خسرو دہلوی نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کو مخاطب کر کے جو کچھ عرض کیا ہے، اس کے مصرعے مصرعہ اپنے لیے قال نہیں حال!

ترکِ من ایں مہ غلام روئے تو!

اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ع

جملہ ترکانِ جہاں ہندوئے تو!

اور اس سے بھی بڑھ کر ع

انبساط عید دیدن روئے تو!

اور

اے ہلال ماتم ابروئے تو!

خدا معلوم آپ نے کسی خوش گلو مطرب کی زبان سے یہ غزل کبھی سنی ہے یا نہیں؟ اگر سنی ہے تو بس تصور اسی پر سوز محفل کا جما لیجیے۔ اپنی تو سب سے بڑی مسرت ایک دو دن نہیں برسوں یہی رہی کہ اس روئے انور کی زیارت ہو جائے اور اپنے کسی عمل کا سب سے بڑا صلہ یہی کہ اس کی داد محمد علی کی زبان سے مل جائے!

ہائے، کتنا محبوب و شاداب چہرہ اور کتنا دلکش و پر بہار بشرہ تھا، جو صبح محشر کے طلوع تک کے لیے نظر سے مخفی ہو گیا!......جی چاہتا تھا کہ بس دیکھے ہی چلے جائیے اور باتوں میں وہ دلآویزی کہ بس سنتے ہی رہیے۔

......☆☆☆......

ضمیمہ: 1

(محمد علی)1

''شب برأت'' ایک خیر و برکت والی رات ہے، کسے خبر تھی کہ یہ شب، شب قیامت یا نمونہ شب قیامت بھی بن سکتی ہے، مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں، کون کہہ سکتا تھا کہ اب کی اسی رات کو ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا؟ زندگیاں مانگتے ہیں، صحتوں کے لیے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اس وقت اسے اٹھالیا جائے گا، جس کے وجود سے ملتِ اسلامیہ کا وجود تھا۔ جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی، اور جس کی موت، اللہ کا نام جپنے والوں کی موت، محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے۔ اس پچھلے زمانہ میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری، کیسے کیسے اکابر اٹھالیے گئے، ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا نہیں پڑا، انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبادیا، ترکوں پر ''اتحادیوں'' کا نرغہ ہوا، شریف نے بغاوت کی، مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکہ لٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ و بالا ہوا، عراق میں خاک اڑی، مصر کا سردار اٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین تھرائی، یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا۔ ایک محمد علی کا دم ہر زخم کے لیے مرہم تھا۔ ہر تازہ صدمہ کے وقت دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی تو اس خیال سے کہ کچھ بھی چلا جائے محمد علی تو ہم میں موجود ہے۔ آہ شعبان 1349 ہجری کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھن گیا۔ اور جس پاک و بے نیاز نے محمدؐ کے لیے یہ منادی

1 سچ (مرحوم) 16 / جنوری 1931

کردی تھی کہ" مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ" اس کے فرشتوں نے بندوں تک محمدؐ کے ایک وفادار غلام محمد علی کے لیے بھی یہی صدا پہنچا دی!

اے پاک پروردگار، اے سب کے جلانے اور سب کے اٹھانے والے مولا، تیرا ارادہ بے شک سب کے ارادوں پر حاکم، تیری حکمت و مصلحت قطعاً سب حکمتوں اور مصلحتوں پر غالب، تیری مشیت بلاشبہ آن کی آن میں ہر بہار کو خزاں، ہر خوشی کو رنج، ہر عید کو محرم بنا دینے پر قادر لیکن کیا ہم جیسے ناتواں وکمزور بندوں کا ظرف اتنی سخت آزمائش، اتنے بڑے ابتلا، اتنے کڑے امتحان کے قابل تھا؟ ایسی آزمائشیں تو ابرار وکاملین کی ہوا کرتی ہیں، ہم کم ظرف اس لائق تھے کہ جس گھڑی تری رحمت کے سب سے زیادہ بھوکے ہوں، تیرے فضل وکرم کی بھیک کے لیے تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گڑگڑا رہے ہوں عین اسی وقت ہماری سب سے بڑی زندہ دولت ہماری سب سے قیمتی کمائی، ہماری سب سے زیادہ عزیز پونجی، ہمارے ہاتھوں سے یوں نکل جائے؟ اور دل چاہتا تھا جس کی موت کی خبر کبھی نہ سننی پڑے، اسے دم توڑتے اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اس کے لاشہ کو اپنے کاندھوں پر اٹھائیں! تیری جناب میں ادنیٰ گستاخی کا تصور بھی نہیں لایا جاسکتا، لیکن اے کمزوروں اور ناتوانوں کے دلوں کی خبر رکھنے والے مالک، انصاف کر کہ تیرے حبیب ومحبوب کو اس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر جب فاروق اعظمؓ کا قلب تاب نہ لاسکا تو تیرے اس حبیب پاکؐ کے ایک ہمنام غلام کے غم مفارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں، تو ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے! ہم نادان ونابینا تو ادنیٰ سے ادنیٰ آزمائش کا بھی تحمل نہیں کرسکتے، وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے کڑی آزمائش کے لیے دل وجگر کس سے مانگ کر لائیں۔

جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں، مرثیے لکھے جارہے ہیں، تجویزیں پاس ہو رہی ہیں کہ ایک بڑا قومی لیڈر اٹھ گیا، نیشنل کانگریس کا سابق صدر چل بسا، ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار رخصت ہوگیا، یہ سب کچھ صحیح ہوگا، لیکن یہ کسی کی زبان پر نہیں آتا کہ اللہ کا بندہ اٹھ گیا، اپنے رب کا پرستار چل بسا، محمدؐ کے نام کا عاشق زار رخصت ہوگیا! آج ماتم اس کا نہیں کہ ایک جادو بیان مقرر اور بہترین انشاپرداز گم ہوگیا، ماتم اس کا ہے کہ وہ گم ہوگیا جو سچائی کا پتلا تھا، جو حق گوئی کا مجسمہ تھا،

جس نے اپنی مرضی کو اپنے مولا کی رضا میں فنا کر دیا تھا جس نے زریں لباس چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی تھی، جس نے بیش قیمت سوٹ اتار کر جیل کی کملی اوڑھ لی تھی، جس کے دل میں سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اگر دھن تھی تو اللہ کے دین کی، اور ہر لمحہ اور ہر آن اگر تڑپ تھی تو رسولؐ کی نصرت و خدمت کی! اس کی بچی آپ بیتی تو خود اسی کے ایک شعر میں سنیے۔

سب کھو کے تری راہ میں میں دولت دنیا

سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

بیشک اس نے دنیا اور دولتِ دنیا ساری کی ساری کھو کے رکھ دی اور کھوئی بھی کسی کی راہ ہی میں! ''کھوتے'' ہوئے اور ''لٹتے'' ہوئے سب نے دیکھا ''پاتے'' اور ''لیتے'' ہوئے کی جھلک کسی کسی نے ''آج'' بھی دیکھ لی اور ''کل'' انشاء اللہ سب ہی دیکھیں گے۔

ذہانت ناموری شروع ہی سے حصہ میں آئی، علی گڑھ میں نام پیدا کیا، آکسفورڈ جا کر ناموری کہاں سے کہاں پہنچی ''سول سروس'' کی جانب لپکے الٹے پاؤں واپس کیے گئے۔ بڑودہ اور رامپور دونوں کی قدر شناسیوں کا چندروز مزہ چکھا۔ بیوہ اور تہجد گزار ماں کی دعا نے جو غلاف کعبہ پکڑ کر ربِ کعبہ سے مانگی تھی کہ میرے شوکت اور محمد علی کو اسلام کا خادم بنا دے ساتھ نہ چھوڑا، جو نہ صرف ''مسٹر'' بلکہ مسٹروں کا سردار تھا، دیکھتے ہی دیکھتے ''مولانا'' تھا چہرہ پر داڑھی، سر پر پٹے، جسم پر کھدر، حافظہ میں قرآن اور دل کے اندر اسلام کا سوز، دین کی تڑپ ایک سوزش تھی کہ ہر وقت پھونک رہی تھی، ایک جوشش تھی کہ ہر آن خون کو کھولا رہی تھی! لڑکی ایک نہیں، دو لڑکیاں، چھوٹی بچیاں نہیں، پالی پوسی، شادی شدہ جوان لڑکیاں، عاشق زار باپ کے آغوش میں تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مریں! قومی زندگی میں ہر طرف سے مخالفت، ہر منصوبہ ناکام، ہر سمت سے الزامات، قابلیت کا اعتراف سب کو، خلوص کا اقرار، دشمنوں تک کو، لیکن ناکامی ہر طرف سے مسلط، کامریڈ ہمدرد کے بلند ترین معیار کا قائل ہر ایک متنفس۔ لیکن دونوں پرچے ناقدری کی نذر! نظر بندی کی سختیاں جھیلیں، جیل خانہ کی کڑیاں اٹھائیں، اور آخر عمر میں اس سے بڑھ کر آزمائش کہ عمر بھر کے رفیقوں اور عزیزوں سے بے تعلقی، آویزش، جنگ! مسلم لیگ سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، جمعیۃ العلما سے جنگ ''پنجابی ٹولی'' سے جنگ، ''بنگالی ٹولہ'' سے جنگ، احناف سے

جنگ، اہل حدیث سے جنگ، ہندوؤں اور انگریزوں سے جنگ مدت سے تھی ہی اب اپنے مخلصوں، عزیزوں اور بھائیوں سے بھی جنگ! تصدق شیروانی، مجید خواجہ، ڈاکٹر محمود اور انتہا یہ ہے کہ انصاری تک سے جنگ! دیکھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ترس آجاتا تھا، لیکن جس کی نگاہ جہاں تک پہنچ چکی تھی کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

اسے کوئی کیا سمجھاتا اور کیونکر روکتا! اللہ کا شکر اللہ کے لیے سب سے لڑا اور خوب لڑا، شاعری کے عالم میں زبان سے جو کچھ نکلا تھا، واقعات کی دنیا میں اس نے اسے سچ کر دکھایا کہ آج اگر ساری دنیا مجھ سے روٹھی ہوئی ہے تو میں بھی ساری دنیا سے روٹھا ہوا ہوں۔

احباب بار بار بگڑ بگڑ کر کہتے تھے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے، خبطی ہو گیا کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بناتا چلا جا رہا ہے، نہ مصلحت وقت پر نظر ہے، نہ کسی کی دل شکنی کی پروا، نہ اپنا نفع نقصان دیکھتا ہے، کوئی کہتا کہ آخر ساری دنیا کے اخبارات چل رہے ہیں، کامریڈ و ہمدرد کو بھی آخر کاروباری اصول پر کیوں نہیں نکالا جاتا؟ کوئی صاحب فرماتے کہ کونسل اور اسمبلی میں جانے کے بجائے فضول شور وغل میں پڑ کر محمد علی نے اپنی قوت اور وقت ضائع کیا، ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا کہ جامعہ ملیہ کی پرنسپلی پر جم جانا تھا، یا تاریخ پر ریسرچ کے بعد کوئی محققانہ تصنیف کرنی تھی، اعتراضات صحیح تھے، محمد علی واقعی دیوانہ ہو چکا تھا، اسے جو کچھ دکھایا گیا تھا اس کے بعد بھی اگر دیوانہ نہ ہو جاتا تو اس کی دیوانگی میں کیا شبہ تھا؟

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد
مرعسس را دید و در خانہ نہ شد

کیسا وطن اور کہاں کی وطن پرستی؟ آج ہر طرف سے زور لگ رہا ہے، محمد علی کو نیشنلسٹ ثابت کر دکھایا جائے، وہ ''دیوانہ'' عقل و فرزانگی سے بیگانہ، دیوانگی کے اس مرتبہ تک پہنچ چکا تھا جہاں نہ ''نیشنلزم'' باقی رہ جاتی ہے نہ ''کیمونزم'' وہاں مدنظر صرف خالق کی رضا تھی۔ کیا خدا کی شان ہے

---

1 سچ (مرحوم) 23 رجنوری 1931

کہ جو اتنا اونچا ہو چکا، اسے نیشنلزم کی پستی پر زبردستی گھسیٹ گھسیٹ کر لایا جارہا ہے اور جو مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی پرستاری میں لگ چکا تھا، اس کے لیے باعث فخر یہ بتایا جارہا ہے کہ وہ ''وطن'' اور ''ہندوستان'' کے بت کا پجاری تھا! بیشک محمد علی بہت بڑا ہندوستانی تھا، اسے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا، لیکن اس کی ہندوستانیت ماتحت تھی اس کی اسلامیت کے! وہ خدا، اور ''وطن'' دو کا قائل نہ تھا۔ قائل صرف ''خدا'' کا تھا اور چونکہ خدا ہی نے وطن والوں کی خدمت بھی فرض کر رکھی ہے اس لیے وہ وطن کا خادم بھی تھا۔

تمنائیں اور آرزوئیں بڑے بڑوں سے وابستہ کی گئی ہیں اور جب وہ امیدیں ان پاکوں سے پوری نہیں ہوئی ہیں تو ناپاکوں نے ان پر حملے بھی خوب خوب کیے ہیں۔ آج کی کوئی نئی بات نہیں، یہ سنت قدیم سے چلی آرہی ہے۔ قَالُوْا یَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا اَتَنْهٰنَا اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَا اِلَيْهِ مُرِيْبٍ. اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے کہ جس نے ذرا سا بھی دعویٰ محبت کا کیا، اس کا امتحان بھی ہو کر رہا۔ کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چروا دیا گیا، کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا، کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی تھی، کسی کے خاک اور خون میں لوٹنے اور تڑپنے کا تماشا دیکھا گیا، کسی کو جلاوطنی نصیب ہوئی، کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کرایا گیا اور کسی کو قید خانہ کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا۔

محمد علی کے لیے کیا یہ قانون بدل دیا جاتا؟ اور جس نے یہ کہا تھا کہ

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

اسے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا؟ محبوبوں کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہوتا ہو، محبوبوں اور عاشقوں، سوختہ جانوں اور دل نگاروں کے لیے بھی ایک قاعدہ مقرر ہے، ذلت و رسوائی، قید و بند، قتل و خون، ناکامی و نامرادی، شکست و شکست نفس!

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیز | عشق عاشق باد و صد طبل و نفیر
عشق معشوقاں دو رخ افروختہ | عشق عاشق جان او را سوختہ

محمد علی تو جا، اور خوش خوش جنت میں اپنی جگہ لے! تجھے آج کون مردہ کہتا ہے؟ غریب الوطنی کی موت بجائے خود ایک درجۂ شہادت رکھتی ہے۔ پھر تیرے شہید وصدیق ہونے پر تو اللہ کا کلام شاہد ہے "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ لَھُمْ اَجْرُھُمْ وَنُوْرُھُمْ" تو اس وقت اپنے ماتم کرنے والوں سے کہیں زیادہ مسرت وآزادی کے ساتھ اپنا وہی روشن چہرہ لیے ہوئے عالم برزخ میں جنت کی سیر کر رہا ہے اور تیرے نیاز مندوں کو اپنی جگہ یہ یقین ہے کہ بغیر اپنے دوستوں اور مخلصوں کے جم غفیر کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے تو ہرگز جنت کے اندر قدم رکھنا پسند نہ کرے گا۔ اپنی ناسوتی زندگی میں تو نے اپنے چھوٹوں کو اپنے سے آگے رکھا، جنت کی لطیف فضا میں تیرا یہ جوہر کہیں زیادہ روشن ہو کر چمکے گا۔ اور جس طرح دنیا میں تو نے لاکھوں کروڑوں کی رہنمائی کی، جنت میں بھی انشاء اللہ بہتوں کی رہبری اور رہنمائی کا علم تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ مدت ہوئی تو نے اپنے ایک رفیق خاص غلام حسین مرحوم (سب ایڈیٹر کامریڈ وایڈیٹر نیو ایرا) کے ماتم میں چند شعر کہے تھے، وہی شعر آج تجھے خود سنانے کو جی چاہتا ہے۔

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا — چند نعم البدل دیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کیے ہوتے
خوب کتنا بہشت کا رستہ — ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

بدنصیب قوم تو رو، اور ساری عمر روتی رہ، آج تو بیوہ ہوگئی، تیرا والی وارث چل بسا، تیرا سہاگ لٹ گیا، صبر کر، جس طرح غمزدہ رانڈیں اور سوگوار بیوائیں صبر کیا کرتی ہیں! خفتہ بخت ملت تو آج یتیم ہوگئی، تیرے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا، شفقتِ پدری سے تو محروم ہوگئی۔ صبر کر جس طرح بے کس اور بے بس یتیم صبر کرتے رہتے ہیں! اللہ میں سب قدرت ہے، وہ ہر نیست کو ہست، ہر ناممکن کو ممکن کر دکھا سکتا ہے۔ لیکن ہم گرفتار اسباب بندے اب کیا کہہ کر اپنے دل کو سمجھائیں اور کس چیز سے اپنے کو تسکین دیں؟

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح

باز رفتی وکس قدر تو نہ شناخت دریغ

محمد علی کی عمر کل 52 سال کی ہوئی۔ حضور انورؐ نے اسی عمر میں مکہ سے ہجرت فرمائی تھی۔ آقا کی زندگی کا عکس وفادار غلام کی زندگی کے آئینہ میں خاصہ نظر آتا رہا، قبل اس کے مخدوم کی زندگی میں مدنی زندگی کی فاتحانہ شان جھلکنے پائے خادم کا رشتۂ حیات ہی منقطع کر دیا گیا! آج کی حسرتیں کون کہہ سکتا ہے کہ کل کس کس طرح نکل کر نہ رہیں گی۔

......☆☆☆......

ضمیمہ:2

(محمد علی کا مقام[1])

محمد علی کی موت، آپ نے دیکھا، کہاں ہوئی؟ وطن سے ہزارہا میل دور، ہندوستان کے کسی گوشہ میں نہیں، حجاز میں نہیں، عراق نہیں، مشرق کے کسی حصہ میں نہیں، خاص سرزمین انگلستان پر، فرنگیوں کے دیس میں، اہل کفر کے درمیان، وطن سے دوری، اکثر عزیزوں سے مجبوری، غریب الوطنی! محمد علی کو تو اپنا وطن نہایت عزیز تھا اور اپنے وطن سے بھی بڑھ کر اپنے آقا کا وطن عزیز ومحبوب تھا، یہ کیا ہوا کہ موت ایسے دار الکفر میں واقع ہوئی؟......لیکن یہ بھی آپ نے دیکھا کہ مرنے کے بعد جگہ کہاں ملی؟ وہ جگہ، جو ہمارے آپ کے تصور سے بھی بالاتر تھی، بیت المقدس! سلیمانؑ و داؤدؑ کا قبلہ، موسیٰؑ وعیسیٰؑ کا قبلہ اور خود نبی القبلتین کا پہلا قبلہ! صدہا انبیا کا مقام، بیشمار پیمبروں کی سجدہ گاہ!

موت ہوتی کہاں ہے اور جگہ ملتی کہاں! حدیث کو چھوڑیے، جس میں یہ ذکر ہے کہ بیت قدس کی مسجد میں ایک نماز کا ثواب ہزاروں نمازوں کے برابر ہے، خود قرآن مجید دیکھیے وہ کیا کہتا ہے کہ مسجد کا نام مسجد الاقصیٰ، دور والی مسجد، کہاں سے دور؟ کس سے دور؟ برائیوں سے دور، گندگیوں سے دور، پلیدیوں سے دور! ''اَلَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ'' تنہا وہ مسجد ہی نہیں، اس کا آس پاس اس کا پڑوس، اس کا گردونواح، برکتوں والا، برکتوں اور رحمتوں کا گنجینہ، بھلائیوں اور

1. سچ (مرحوم) 23 جنوری 1931

پاکیزگیوں کا خزینہ! ہاں وہ مقام جہاں اس کے لایا گیا تھا، اور انتہائی عروج کے وقت لایا گیا تھا، جو سب سرداروں کا سردار اور سارے پاکوں سے بڑھ کر پاک ہوا ہے، " سُبۡحَانَ الَّذِیۡ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلاً مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصیٰ " سبحان اللہ! کتنی زندگیاں اس موت پر نثار جس کے بعد یہ درجہ نصیب ہوا!!! "جسم" جہاں سے جہاں پہنچایا گیا، سب نے دیکھا "روح" کہاں پہنچائی گئی ہوگی اس کا اندازہ کون کرے! جسے آدمی کاندھوں پر لاد کر لے گئے، اسے سب نے دیکھا، جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ میں لے گئے ہوں گے، اس کا درجہ و مرتبہ کون پہچانے؟

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت

مرگے کہ زاہداں بہ دعا آرزو کنند!

لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کا ایک بڑا سیاسی لیڈر اٹھ گیا، اور یہ کہہ کر گویا ماتم کا آخری لفظ ختم کر دیتے ہیں! اللہ کے بندو! یہ مرتبے کہیں محض قومی لیڈروں کو حاصل ہوا کرتے ہیں، کہیں محض ایڈیٹروں، انشا پردازوں، خطیبوں کے نصیب میں آیا کرتے ہیں؟ سچی بات کسی کے منہ سے نہیں نکلتی کہ محمد کا دیوانہ اٹھ گیا! ہاں وہ محمد علی اٹھ گیا جو محمدؐ کے دین کا شیدائی، محمدؐ کے رب کا پرستار، محمدؐ کی امت کا عاشق، محمدؐ کے نام کا دیوانہ تھا، وہ محمد علی جس نے اپنے کو محمدؐ میں فنا کر دیا تھا، محمدؐ کے غلام کے مرتبے بھی اور اونچے نہ کیے جائیں گے تو اور کس کے لیے کیے جائیں گے؟

......☆☆☆......

ضمیمہ:3

("اسلام کا دیوانہ")

(فاضل اجل، شیخ وقت، علامہ مناظر احسن گیلانی بہاری، شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ کی تقریر، جو مولانا کے جلسۂ تعزیت منعقدہ 5 جنوری 1931 میں شہر حیدرآباد دکن میں کی گئی)

مولانا محمد علی مرحوم جن کو اب میں حضرت مولانا شاہ حاجی حافظ محمد علی شہید نور اللہ ضریحہ و اشرق نبور وجہہ روحہ کہتا ہوں کے متعلق لوگوں کا کچھ ہی خیال ہو لیکن ان کے ایک نادیدہ مخلص کے سامنے ان کی حقیقت اس سے زیادہ نہ تھی کہ نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوچے کے ایک مجذوب فقیر تھے۔ کل ساڑھے آٹھ بجے حیدرآباد کے مسلمانوں کا ایک عظیم جلسہ رسم تعزیت ادا کرنے کے لیے جمع ہوا تھا، میں بھی اس میں شریک ہوا تھا، جلسہ سے کچھ دیر پیشتر دماغ میں چند مصرعے موجزن ہو گئے۔ قلمبند کر لیا چونکہ تعزیتی تجویز کے پیش کرنے کی سعادت میرے سپرد ہوئی تھی، اس لیے کھڑا ہوا اور بول نہیں سکتا تھا! لیکن بولنے پر مجبور ہوا۔ حمد و نعت کے بعد " وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئاً وَّسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلاً وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ. پھر حدیث "اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَلِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوىٰ، الحدیث، پڑھی اور کہنے لگا کہ اپنی بے زوری میں زور پہنچانے کے لیے میں نے پناہ اسی

تاریخی اہمیت لی ہی ہے جس کے نیچے دنیا کے سب سے بڑے انسان سے جدا ہو جانے کے بعد دنیا کی سب سے بہترین جماعت کو تسلی ملی تھی۔ دیکھو رامپور کی ایک بیوہ جو ایمان واسلام کے گھرانے کا روشن چراغ تھی، اور عزم ویقین کا پہاڑ، اس سے کہا گیا کہ اپنے بچوں کو اس اسلامی مدرسہ میں بھیج دے جس کا نام مدرسۃ العلوم مسلمانان تھا۔ نیک نیت ضعیفہ نے اسلام ہی کے لیے غالباً اس نیت سے اس نے اپنے بچوں کو وہاں داخل کیا لیکن معاملہ دوسرا ہوا، اس نے اسلام کے آغوش میں پرورش پانے کے لیے لڑکوں کو اس مدرسہ میں بھیجا تھا لیکن ان کو ایسی گود میں ڈال دیا جس کی ہر شکن اسلامی تحریک کے لیے خطرناک ضرب تھی۔ لڑکے بیوہ کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس نے ان کو دین سے نزدیک ہونے کے لیے بھیجا تھا لیکن وہ دور ہوتے گئے اور اتنے دور کہ بالآخر ان میں چوتھا جو تھا اس کے لیے یہ بعد بھی کافی نہ ہوا اور وہ آکسفورڈ کے بلند میناروں پر چڑھ گیا جہاں سے اس کی ماں کا روشن ایمان نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ بڑی کامیابیاں، بڑی اولوالعزمیاں تھیں جو اس غیر اسلامی فضا میں اس کے اردگرد جمع ہو آئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے عہد کا وہ تیسرا ہونہار طالب علم شمار کیا گیا۔ کرزن رلنلڈ ماشے کے بعد اس کی تصویر سے آکسفورڈ کے معلموں نے اپنے نمائشی کمرہ کو سجایا۔ وہ ہندوستان واپس ہوا یہ جذبہ لے کر کہ روپے کے کسی ڈھیر میں اپنا حصہ مقرر کرے، اور عمدہ موٹریں، دلکش بنگلے، قسم قسم کے کھانے، طرح طرح کے لباس سے لذت اندوز ہوتے ہوئے ہم چشموں میں اپنے کو نمایاں کرے۔ چند دنوں کے لیے وہ اس وادی میں چلا گیا لیکن بڈھی ماں کی پاک نیت غیب میں جا کر جاذبہ الٰہیہ کی صورت میں مبدل ہوئی۔ مسٹر محمد علی (آکسن) پر پالٹیکس کا جنون سوار ہوا، بڑودہ سے روانہ ہوا، دیکھا گیا کہ چڑھی ہوئی مونچھوں، زرق برق سوٹوں کے درمیان ایک عالیشان کوٹھی کے اندر ٹائپ رائٹر لیے ہوئے اس مسلمان بڈھی بیوہ کا لڑکا ہندوستان کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک اپنے ادبی زور، انشائی قوت، سیاسی مہارت کا غلغلہ بلند کر رہا ہے۔ نہ صرف ہندی انگریزی داں بلکہ خالص اینگلوسیکسن نسل کے افراد جن میں اس عہد کا وہ شخص بھی شریک تھا جو براعظم ہند کا گورنر جنرل اور برٹش ایمپائر کے تاجدار کا نائب السلطنت سمجھا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ لارڈ ہارڈنگ کی بیوی ہفتہ کے اس دن کو نہایت اضطراب میں گزارتی تھی جس دن کامریڈ پہنچنے کی امید ہوتی تھی۔ سیاست پہلی کمند تھی جو پھینکی گئی تاکہ محمد (ﷺ) کے

ایک بھاگے ہوئے غلام کو اس کے آستانے تک پہنچا دیا جائے۔ دوسری جنبش دنیا کے اس "حادثۂ عظمیٰ" سے شروع ہوئی جس نے مختلف دوروں سے گزرتے ہوئے بالآخر مسئلہ "خلافت" کے مستقل عنوان سے شہرت حاصل کی، "خلافت" کا دامن اگر ایک طرف عالمگیر سیاست عالم سے بندھا ہوا تھا، لیکن بہرحال اس کا دوسرا کنارہ اس سراپردۂ نبوت سے وابستہ تھا، جس کے گوشے قبۂ خضرا کے کنارے لٹک رہے تھے۔ سچ یہ ہے کہ محمد علی نے خلافت کو سیاست سمجھ کر پکڑا لیکن خلافت نے مسٹر محمد علی (آکسن) کو اس نیت سے پکڑا جو اس کی ضعیفہ ماں کی آخری آرزو تھی۔ کچھ دن گزرے کہ آکسفورڈ کا مشہور و معروف علی گڑھ کالج کا فخر و ناز گھسیٹا جا رہا تھا، کھینچا جا رہا تھا، اور ان جھٹکوں کے ساتھ گھسیٹا جا رہا تھا کہ دیکھنے والوں کو رحم آنے لگا، وہ کھنچا کھنچا، اتنا کھنچا کہ بالآخر اس کی نگاہوں سے وہ سارا تماشا نابود ہو گیا جواب تک اس کے سامنے تھا۔ اب اس کے آگے کچھ نہ تھا اور اگر کچھ تھا تو وہ صرف جمال جہاں آرا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، وہ اس میں غرق ہوا، ڈوبا اور ایسا ڈوبا کہ پھر کبھی نہ ابھرا۔ عشق کی وادی میں سیاست کے میدان سے آیا تھا، نادانوں نے آخر وقت تک اس کو لیڈر، قائد، انگریزی زبان کا منشی، اردو کا خطیب و شاعر سمجھا، حالانکہ محمد علی تو جانباز محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ اور یوں "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" کی تفسیر پھر ایک بار ایسی ہستی کے ذریعہ سے کرائی گئی جس کی عظمت و جلال کا سکہ ایشیا پر بھی جما ہوا تھا اور اس کے رعب و قابلیت کی دھاک یورپ کے قلوب پر بیٹھی ہوئی تھی، جس کا ذکر افریقہ کے صحرا میں بھی عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا، اور جسے وہ بھی جانتے تھے جو نئی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ حدیث بخاری کے پہلے صفحہ میں پڑھو اور اس کی شرح ایشیا کی وسعتوں یورپ کی کشادگیوں، امریکہ کی پہنائیوں، افریقہ کے طول و عرض پر مطالعہ کرو۔

محمد علی کیسی غلطی تھی ان لوگوں کی جو تجھے آخر میں بھی وہی سمجھتے تھے جو تو اول میں تھا۔ اور اس سے صبر و قرار کی توقع کرتے تھے، اس سے حزم و احتیاط کی امیدیں باندھتے تھے، حالانکہ اس کا دم گھٹتا تھا۔ وہ اس سے مصلحت دوزی و عاقبت اندیشی کا انتظار کرتے تھے، حالانکہ وہ مصلحت سوز تھا۔ ہاں! کبھی وہ مسٹر محمد علی (آکسن) تھے، لیکن کیا اب وہ علوی شجاعت کے اندر غرق ہو کر صرف

---

1. آگے فارسی کا کلام مولانا مناظر احسن گیلانی کا ہے۔

محمد (ﷺ) میں فانی ہونے والا انسان نہ تھا۔ یقیناً اس نے کبھی شیکسپیر اور ملٹن کے اشعار یاد کیے تھے لیکن اب اس کی زبان پر قرآن مجید کی ربانی آیتوں کے سوا اور بھی کچھ تھا، کیا عجیب انجام ہوا اس شخص کا جو شیطانی راہوں پر سلوک کرنے کے لیے نیت کی نہیں بلکہ تجویز کی غلطی سے پڑ گیا لیکن جذب کی قوت نے راہ کفر کے اس سالک کو اسلام کے میدان کا مجذوب بنا دیا۔ وہ آکسن اور مسٹر بن کر جوان ہوا تھا لیکن حاجی، حافظ، مولانا بن کر شہید ہو گیا۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ. وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ.

مولانا عبدالماجد صاحب! میں نے کن مشکلوں سے ان فقروں کو ادا کیا اور کس طرح اس وقت لکھ رہا ہوں بس کیا عرض کروں۔ میں نے مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میری روح ان کو دیکھ رہی ہے، خدا جانے کیا مناسبت تھی۔ آپ کا بار بار یہ جملہ یاد آتا ہے کہ ''تجھ سے اور ان سے بڑی مناسبت ہے''۔ بہر حال میں نے اور خدا جانے کیا کہا، کیا بکا، اس کے بعد ہی چند مصرعے جو موزوں ہوئے تھے شکستہ گشتہ حال میں چیخ چیخ کر سنانے لگا۔ اب آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، جو کچھ ان کو پا رہا ہوں ان مصرعوں میں شاید ان کی تصویر کسی نہ کسی طرح اتر گئی ہے۔

بدین مصطفٰے دیوانہ بودی — فدائے ملت جانانہ بودی
بہ بزم ما رئیس عشق بازاں — بہ رزم دشمناں فرزانہ بودی
بہ دل بودی فقیرے بینوائے — بہ قالب پیکر شاہانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی — دگرنہ عاشق مستانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم — تو شمع دین را پروانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشق پاکت — ز آئین خرد بیگانہ بودی
با ایمانہا ز تو زورے وشورے — بجانہا ہمت مردانہ بودی
رسیدی از رہِ اغیار تا یار — عجب مستے عجب دیوانہ بودی

چہ آمد بر سر رنداں کہ آں را
خم و خمخانہ و پیمانہ بودی

......☆☆☆......

ضمیمہ: 4

(''دیباچہ سیرت محمد علی'')

(سیرت محمد علی، مصنفہ مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی، شائع شدہ 1934 پر دیباچہ مؤلف ڈائری کے قلم سے)

ماضی قریب میں اسلامی ہند کی سرزمین نے جو چوٹی کے اکابر و مشاہیر پیدا کیے اگر یہ سوال ہو کہ بہ لحاظ جامعیت ان میں سرفہرست کس کو بنایا جائے، اور کون ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانح حیات کے اندر اجمالاً پوری عصر حاضرہ کی تاریخ آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جاسکتا ہے، اور وہ نام امت کے محبوب ترین ناموں ''محمد'' اور ''علی'' کا مجموعہ ہوگا۔

اس دور نے یقیناً بعض بڑے اور جلیل القدر علمائے دین پیدا کیے۔ لیکن ان کی ناموری صرف دینداروں کے طبقہ تک محدود رہی، بعض نامی و گرامی مشائخ طریقت پیدا کیے لیکن ان کا نام بس مریدوں اور معتقدوں ہی کی زبان تک رہا، بعض مشہور رفارمر پیدا کیے، لیکن ان کی اور ان کے ''رفارم'' دونوں کی شہرت، انگریزی تعلیم یافتہ گروہ سے آگے نہ بڑھی بعض زبردست خطیب و زبان آور پیدا کیے لیکن انھیں کانفرنسوں کے پلیٹ فارم اور کانگریس کے ڈائس کے باہر کسی نے نہ جانا، یہ چیدہ مشاہیر اور اکابر کا حال ہوا۔

دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر نکلیں اور ان سے بھی تنگ تر دائروں میں گونج گونج کر رہیں، ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز مشرق نے بھی نے سنی اور

مغرب نے بھی، شمال نے بھی اور جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی لہروں نے بھی، پڑھے لکھوں نے بھی اور ان پڑھوں نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی، شہر کے مہذبوں نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی۔ وائسرائگل لاج کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی برجیوں نے بھی، اور جیل خانہ کی تنگ وتاریک کوٹھریوں نے بھی، راجوں اور مہاراجوں کے قصر و ایوانوں نے بھی۔ اور فاقہ کشوں نے، ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی!

اس کا کلام سن سن کر ڈرائنگ روم کے کوچ اور صوفے کھلکھلا کھلکھلا کر ہنسے، اس کا پیام سن سن کر مسجد کے محراب و منبر بلبلا بلبلا کر روئے۔ خانقاہیں، مدرسے، پارک اور نشاط خانے، کھنڈر، ویرانے، ''قوم پروروں'' کی کانگریس اور ''ملت پروروں'' کی کانفرنس، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل اور علی گڑھ، جمعیۃ العلما اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، سب کے چپہ چپہ پر اس کے نقش قدم کے نشان، سب کا ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز!

معاصر اور حریف بہت سے تھے، یہ قبول خداداد اور مرجعیت تام کی دولت سے وہی ایک ممتاز، یہ سعادت زور بازو کا نتیجہ نہیں۔ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ.

کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کا ہو جاتا ہے حق تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے، بزرگوں کا قول ہے یقیناً صحیح ہوگا، لیکن آنکھوں کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ جو اللہ کے بندوں کا ہو گیا تھا، اللہ کے بندے اس کے ہو گئے تھے۔ محمد علی نے اپنے کو اللہ کی خاطر، اللہ کے دین کی خاطر خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دیا تھا، وعدۂ ربانی کہ:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَہُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا. یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ہیں، خدائے رحمٰن ان کے لیے (خلق کے دل میں) محبت پیدا کر دے گا۔ (مریم۔ ع۹)

کی تفسیر لفظ و عبارت میں بہت دیکھی تھی، گوشت و پوست میں مجسم محمد علی کی زندگی میں نظر آئی۔

....

اس دل ودماغ کا، ایسا جامع الصفات سردار کسی قوم کی خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے جنھیں یہ نعمت ملی انھوں نے قدر نہ کی...... وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے؟ ......دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا رکنے والی تھی۔ ایک آنی دولت اور فانی نعمت تھی، آئی اور گئی۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی وکس قدر تو نہ شناخت دریغ

اور پھر مسلمان! انھوں نے اپنی تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہے؟ شیر خدا علی مرتضیٰؓ کی! خلیفۂ رسول عثمان غنیؓ کی؟ جوانانِ جنت کے سردار حسینؓ کی؟ جب اپنی شور بختیوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر نہ پہچانی تو اسے کیا غم وماتم کہ ان کے غلاموں کے غلام، محمد علی کی ناقدری رہی؟ اور اسے خوانخواہ شور بختی ہی کیوں قرار دیجیے؟ صناع کامل کی مصلحتوں کی تھاہ، اور حکیم علی الاطلاق کی حکمتوں کے بھید کون پا سکا؟ کم تھے جنھوں نے محمد علی کو پہچاننے کی کوشش کی، کمتر تھے جو اس کوشش میں کامیاب رہے۔

ادب وسیاست، خطابت وصحافت، قیادت اور انشا پردازی طرح طرح کے گہرے گہرے نقاب کچھ اس طرح تہ بہ تہ پڑے ہوئے تھے کہ چہرے کے اصلی خط وخال اور بشرہ کے حقیقی حسن وجمال کا مشاہدہ دشوار ہوگیا تھا، مبارک تھے وہ جنھوں نے قریب آکر دیکھ لیا، مبارک تر تھے وہ جنھوں نے دور ہی سے فراستِ ایمانی کی روشنی میں بھانپ لیا، اور جیتے جی نہ سہی، مرنے کے بعد یوں فاش وبرملا کہہ دیا[1]۔

بہ دین مصطفےٰ دیوانہ بودی	فدائے ملت جانانہ بودی
بہ بزم ما رئیس عشق بازاں	بہ بزم دشمناں فرزانہ بودی
بہ دل بودی فقیرے بے نوائے	بہ قالب پیکر شاہانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی	وگرنہ عاشق مستانہ بودی
سیاست تہمتے بر حسن پاکت	زآئین خرد بیگانہ بودی

1۔ آگے فارسی کا کلام مولانا مناظر احسن گیلانی کا ہے۔

چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم　　تو شمع دین را پروانہ بودی
سیاست تہمتے برعشق پاکت　　ز آئین خرد بیگانہ بودی
بایما نہاز تو زورے وشورے　　بجانہا ہمت مردانہ بودی
رسیدی از رہِ اغیار تایار　　عجب مستے عجب دیوانہ بودی

محمد علی کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں لیکن صحیح ترین مرقع یہی ہے۔ محمد علی جو کچھ بھی رہے ہوں، علی گڑھ کے ایک مشہور کھلنڈرے، آکسفورڈ کے ایک بہترین طالب علم، انگریزی کے ایک اعلیٰ انشاء پرداز، ایک بہترین ایڈیٹر، شیکسپیئر کے ایک ماہر نقاد، اتھیلو وغیرہ کے ایک اعلیٰ مبصر، ایک سحر بیان مقرر، ایک بلند پایہ شاعر، ملک کے ایک نامور رہنما، ایک ممتاز ترین سیاسی سردار، لیکن آخر میں، آخر میں یہ ساری حیثیات سمٹ سمٹا کر صرف ایک ہی حیثیت میں جمع ہو گئی تھیں، اور جو کبھی اپنی عقل وفرزانگی کے لیے مشہور تھا، وہ اپنے ضبط ودیوانگی کے لیے بدنام ہو کر رہ گیا! مرنے پر کانوں میں آوازیں آئیں کہ ملک وملت کا سیاسی رہنما چل بسا، لیکن دل سے صدا اٹھی تو بس یہی کہ آج ''محمدؐ'' کا دیوانہ دنیا سے رخصت ہو گیا!

ہاں وہ محمدؐ کا شیدائی، دین مصطفےٰ کا دیوانہ، امتِ محمدی کا بن داموں کا غلام تھا، ہندوستان ہی میں نہیں عالم اسلام میں کسی کلمہ گو کے پھانس چبھتی اور اس کی چبھن محمد علی کے ہونے لگتی، مصیبت کسی مسلمان پر بھی آئے اور درد سے بیتاب محمد علی، اسلام پر قانونِ اسلام پر، شعائر اسلام پر، کہیں کوئی حملہ ہو اور تڑپ محمد علی کے دل وجگر میں پیدا! مقابلہ انگریزوں سے آپڑے، ہندوؤں سے پڑ جائے، حکومت سے ہو خود مسلمانوں سے ہو، محمد علی کا سینہ ہر وار کے لیے سپر بنا ہوا! 26 میں حج اور شرکت موتمر اسلامیہ کے لیے جب جانے لگے اور سلطان ابن سعود کی حکومت ابھی نئی نئی ہوئی تھی، تو ہمدرد میں اپنے قلم سے خود لکھا ''اب نہ بنی امیہ کا دور ہو سکتا ہے، نہ بنو عباس کا، نہ خاندان عثمان کا، اب حکومت اسلام ابن اسلام کی ہو گی''۔

دن رات، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یہی دھن تھی اور اسی کا کلمہ، آخری سفر پر جب بمبئی سے روانہ ہونے لگے جو سفر آخرت کا پیشہ خیمہ تھا، تو اس وقت بھی اسلام کے تحفظ ناموس پر کچھ ایسے ہی الفاظ زبان سے کہے۔ حق تھا کہ ایسے شخص کی موت جب آئے تو سارا عالم اسلام ؐ تی سے لے

کر غرب تک اس کی عزاداری میں سیہ پوش ہو جائے اور شمال سے جنوب تک ایک ماتم سرا بن جائے، اور یہی ہوا، پھر غریب الوطنی کی موت کے بعد جگہ ملی تو کہاں؟ وہاں جہاں کے لیے آرزو اور تمنا بڑے بڑے صدیقوں اور شہیدوں نے کی ہے، خود بعض انبیائے کرام علیہم السلام تک نے کی! سلیمانؑ اور داؤدؑ کا قبلہ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا قبلہ، خود نبی القبلتین کا پہلا قبلہ!

خاکِ قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت (اقبالؔ)

جسم کو جو عروج نصیب ہوا وہ سب نے دیکھا ''روح'' کو جو مقام حاصل ہوا ہوگا اس کا اندازہ کون کرے؟ جسے آدمی کاندھوں پر اٹھا کر لائے، اسے سب نے دیکھا، جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے اس کے درجہ و مرتبہ کو کون پہچانے!

ایک ایسا شخص جو ایک طرف وزیر ہند (مسٹر مانٹیگو) اور وزیر اعظم برطانیہ (مسٹر لائڈ جارج) کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلہ خلافت پر آزادانہ تقریر کر سکتا ہو، جو عین ہیجانِ مخالفت کے وقت لندن اور پیرس کی بڑی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں مدلل و مفصل، شستہ و برجستہ اظہار خیال کر سکتا ہو؟ جو وائسرائے اور گورنروں کے سامنے شاردا ایکٹ اور دوسرے قوانین کے سلسلہ میں مخالفانہ بحثیں کر کر کے انھیں قائل و معقول کر سکتا ہو، کامریڈ میں سیاستِ حاضرہ اور مذہب پر دس دس، بیس بیس کالم کے مضامین بہترین ادب و انشاء کے ساتھ سپرد قلم کر سکتا ہو، انگریزوں کی کلب لائف میں شریک ہو تو ایسا گھل مل جائے کہ ان ہی میں سے ایک معلوم ہونے لگے، دوسری طرف مسجد کے منبر پر وعظ کہنے کھڑا ہو تو روتے روتے اپنی داڑھی بھگو لے اور سننے والوں کی ہچکیاں بندھ جائیں۔ محفل سماع میں بیٹھے تو اس کا وجد و حال دیکھ کر دوسرں کو وجد آ جائے۔ مسئلہ قتل مرتد پر جب فقہی استدلال و استنباط شروع کرے تو اچھے اچھے اہل علم عش عش کر اٹھیں۔ آزاد خیال اتنا کہ ہر کلمہ گو کو اپنا حقیقی بھائی سمجھ لے، متقشف ایسا کہ مصطفیٰ کمال اور امان اللہ خاں کو آخر تک معاف نہ کرے، نماز کا پابند اتنا کہ برطانوی ایوان پارلیمنٹ کے برآمدہ میں بھی جانماز بچھا کر کھڑا ہو جائے۔ اور اس خالص فرنگستانی عمارت میں بالکل ہی پہلی بار رکوع و سجود کی ایک نظیر قائم کر جائے۔ دلیر اتنا کہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے

مجمع میں گھس جائے۔ سلطان ابن سعود کے منہ پر بھرے مجمع میں سب کچھ کہہ سن کر رکھ دے۔ ادیبوں کی محفل میں ادیب، شاعروں کی مجلس میں غزل گو، اہل سیاست کی صف میں ممتاز، عوام و خواص دونوں کے اعتماد وعقیدت سے سرفراز، ایسی ہمہ گیر، ایسی عامۃ الورود ہستی کی سوانح مرتب کرنا کوئی آسان بات ہے؟

مذہب، سیاست، علم، ادب، تعلیم، صحافت، کانفرنسیں اور جلسے، اس پچیس تیس سال کے اندر اسلامی ہند بلکہ ایک حد تک مملکت ہند اور عالم اسلامی میں، جو بھی تحریک کسی بھی ادارے میں ہوئی، محمد علی کی شخصیت اس کے اندر کارفرما اور محمد علی کا اثر براہ راست نہ سہی بالواسطہ سہی، اس میں موجود، ایسے شخص کی سیرت نگاری ایک شخص کی سیرت لکھنا نہیں، وقت کی پوری تاریخ مرتب کر ڈالنا ہے، کس پہلو کو لیا جائے، کس کو چھوڑا جائے، کون کون سے رخ نمایاں کیے جائیں اور کون سے مدھم ہی رہنے دیے جائیں، کیا کیا پھیلایا جائے اور کیا کیا سمیٹ لیا جائے، ہر ہر موضوع ایک مفصل اور مبسوط گفتگو کا طالب، ہر ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی۔

ضرورت تھی کہ اچھے جید اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی پوری جماعت، ترتیب سوانح کا کام ہاتھ میں لیں اور وہ بھی فی الفور نہیں، ایک عرصہ تک تلاش وتفحص جاری رکھنے کے بعد اپنی فکر وکاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم مجلدات میں مرتب کر کے شائع کرتی، لیکن حالات مساعد نہ ہوئے تھے نہ ہوئے، تفصیلات کو چھوڑیے، ان اسباب کی شرح اگر کی جائے تو خود ایک مستقل رسالہ ''شرح اسباب'' تیار ہو جائے۔ جمود وافسردگی کے اس منظر کو دیکھ کر جامعہ ملیہ کا ایک نوعمر ونوخیز ہونہار اہل قلم آگے بڑھا اور اپنی عمر وتجربہ کی کمی کو ہمت کی فراوانی سے پورا کر کے بلا تکلف اور بے دھڑک اس بار عظیم کے لیے اپنے سروشانہ کو پیش کر دیا جس کے سنبھالنے کے لیے کئی کئی قوی الجثہ اور تنومند پہلوان کشتیاں نکالے ہوئے اور اکھاڑے جیتے ہوئے درکار تھے۔ آفرین ورحمت اس کی ہمت پر، آفرین ورحمت جامعہ کی مستعدی وکارگزاری، جامعہ، ہاں وہی محمد علی کی یادگار جامعہ ملیہ...... وہ پودا جسے محمد علی نے اپنے ہاتھ سے زمین میں لگایا، بڑھایا، سینچا، پالا۔

منازل سفر کی دوریوں اور راہ کی دشواریوں، زاد سفر کی بے سروسامانیوں اور یاران طریقت کی کج ادائیوں کی حکایت کیا، اور کس سے کیجیے؟ اور کیجیے بھی تو سننے والوں سے امید کیا رکھیے، خود

جو ہر ہی کے الفاظ میں:

خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے!

بہر کیف و بہر حال چند ماہ کی مختصر مدت میں، شوق و عقیدت کے جذبات اپنے نقوش جو کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے، وہ حاضر خدمت ہیں۔ یہ ''لخت دل'' ہیں۔ ان پر ''مال تجارت'' کا دھوکا نہ ہو۔

آ گے بڑھنے سے قبل معروضات ذیل کو ذہن نشین فرمالیا جائے۔

صاحب سیرت کی زندگی، سپاہی کی زندگی تھی، ساری عمر دشمنوں سے اور کبھی کبھی دوستوں سے بھی لڑتے اور مقابلہ کرتے ہی گزری، ممکن نہیں کہ محمد علی کی سیرت دیانت کے ساتھ لکھی جائے اور محض بزم آرائیوں کی داستان پر ختم ہو جائے ''خالدؓ جانباز'' کے وقائع اور کارنامے کوئی ''حافظ شیراز'' کی زبان میں آخر کیوں کر بیان کرے؟ بعض نازک دلوں کے جذبات کو جا بجا صدمہ یقیناً پہنچے گا اس کے لیے شروع سے تیار رہنا چاہیے۔ مؤلف نے سنبھل سنبھل کر اور بہتوں کے جذبات کی رعایت کر کر کے قلم اٹھایا ہے، پھر بھی واقعات میں تحریف کے مجرم تو نہیں ہو سکتے تھے، علی مرتضیٰؓ کے سیرت نگار کے لیے جنگ صفین اور حسین بن علیؓ کے سوانح نویس کے لیے میدان کربلا کا ذکر زبان قلم پر نہ لانا کیوں کر ممکن ہے؟

......☆☆☆......

ضمیمہ:5

(''جوہر اور ان کی شاعری'')

کلام جوہر (مکتبہ جامعہ دہلی، 1935) پر مقدمہ، مؤلف ڈائری کے قلم سے)

'' آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں، بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا، جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے، جن میں میرے ایک حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کار بے کاراں کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب میں تھا اس لیے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو) کہ

آیا دہلی سے ایک مشکی خر   آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجیے [1]

---

[1] نوشتہ 26 ستمبر 1935

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا　　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا مجھے بھی لے جاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں۔ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیے تھے جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیے، سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر وسخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سینے میں نہ صرف شعر وسخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں، اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں، غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر وسخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش 1878 کے اواخر کی ہے، میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو اور فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا اب کسی کو یاد نہیں، ورنہ جب میری Official Biography (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری ''امت'' کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتش دان کی نذر کیا جائے یا سیرت پیشوائے قوم وملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے سنسر نے (جن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکا یک ہوگیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چڑ ونٹے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ ''بھائی ہے تو چڑیا چڑ ونٹے کی کہانی اور مطلب بھی صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو اور جواب وہی ہمارے سر پڑے''۔ آپ نفسیات کے ماہر ہیں کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچتے والا سیرت نگار باوجود نقاد سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئی معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کردیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ انھیں داخل ہی

کردو۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لیے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنیے گیارہ برس کی عمر میں علی گڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظے کی تعریف کی کہ ''المامون میز پر رکھی تھی، اٹھا کر پڑھنے لگا اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا، حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے''۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعہ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا، مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصا شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحان نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم میں شعرائے باکمال نے حاجی اسماعیل خان صاحب (تربیت الدجاج اور یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی۔ ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا، ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب آنریبل و آزمودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے برادر ''اصغر''۔ خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعدہ حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا، چودھویں کو پیش ہوا کرتا تھا، اور شمع پیش نہ کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا ''لان'' جائے مشاعرہ تھا۔ ایک چودھویں کو بارش ہو گئی تو 3 تا 4 دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا۔

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں
لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو بس اتنی

ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور ''سبزۂ خط'' وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد وتقویٰ کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا دو برس کسی اور کے خیال نے۔ مگر یہ آخری خیال باعصمت تھا اور محض حالات گردوپیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد ''کپڑے پھاڑے گھر کو آئے'' تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنیٰ نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گزشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ، مگر زیادہ تر رمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے۔ اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانہ میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ کر بھیجو، اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں۔ Touch Stone کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں۔ A poor thing but mine own۔

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں...... (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں ممکن ہے بقول آپ کے ''میری امت'' ان سے کچھ تسکین پائے بہر حال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست افشانی کے لیے ہیں''۔

(2)

جوہر کی شاعری کی داستان آپ نے خود جوہر کی زبان سے سن لی۔ یہ ٹکڑا ان کی کسی تصنیف کا نہیں، کسی اخباری مضمون کا نہیں ایک خانگی مکتوب کا ہے۔ تاریخ اس پر 6 اگست 1916 کی پڑی ہے۔ چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظر بند تھے۔ اس وقت کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ حضرت شاعر بھی ہیں۔ 16 کے شروع میں، اسی نظر بندی کی حالت میں ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی، پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں۔ کسی والا نامہ میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج

کردیے تھے۔ اس پر اس نیاز مند کا اشتیاق بڑھا۔ عرض کیا کہ اور عنایت ہو۔ عنایتیں مسلسل ہوئیں۔ دوبارہ عرض کیا کہ آپ کے یہ جو ہرتو اب جا کر کھلے۔ ذرا کچھ فرمائیے تو آپ نے یہ شعر گوئی کا فن کب سیکھا؟ کہاں سیکھا؟ کس سے سیکھا؟ جواب مفصل مرحمت ہوا، آپ اوپر پڑھ چکے، بالکل قلم برداشتہ، اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دنیا میں کہیں سوچ بچار کر کے، ٹھہر ٹھہر کر اور غور کر کے لکھے جاتے ہیں؟...... بیچارہ کو خیال تک نہ ہوگا کہ کسی دن یہ خانگی بے تکلف تحریریں بھی چھپ کر اور تصنیفوں کا جزو بن کر رہیں گی۔

(3)

محمد علی کو دنیا نے اول اول جانا تو اس حیثیت سے کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں، بولتے خوب ہیں، علی گڑھ کے فدائی ہیں، قوم کے شیدائی ہیں، مخلص ہیں، پرجوش ہیں۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کردی۔ آکسفورڈ گئے، نام اور چمکا۔ ہندوستانی طلبہ کی مجلس نورتن کے نام سے قائم کی، خود ہی صدر بنائے گئے (یا کانگریسی اردو میں "چنے گئے") لوٹ کر آئے۔ بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے۔ ٹائمس آف انڈیا میں مضمون نگاری شروع کی، شہرت اور بڑھی۔ 1911 آ گیا۔ کلکتہ سے کامریڈ نکلا۔ حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی دانوں کے حلقے میں دھوم مچ گئی۔ نثر میں شاعری! واہ واہ! اور سبحان اللہ! کے نعرے ہر طرف! ڈرائنگ روم میں بھی اور کلب میں بھی شکسپیئر کے فلاں ڈرامہ پر تنقید کیا خوب لکھ دی! مسلم یونیورسٹی کے نظام زیر تجویز مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا! 1912 آیا۔ کامریڈ کو دہلی لائے۔ یہیں سے ہمدرد نکالا۔ اب محمد علی ایڈیٹر نہ تھے، ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر صحیح معنی میں لیڈر تھے۔ اب قوم ان کی نہ تھی وہ قوم کے تھے۔ جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی بے خودانہ اور مجنونانہ ادھر لپکے! بلقانی اتحادیوں کی ہر ضرب ترکوں کے جسم پر نہیں محمد علیؒ کے قلب پر پڑ رہی تھی! کچھ اور بن نہ پڑی تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ترکی روانہ کر دیا۔ چندہ کے لیے پکارا تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامہ خونیں پیش آ گیا۔ محمد علی دیوانہ وار جھٹ اس آگ میں بھی کود پڑے!...... اب ان کا شمار ہوشیاروں میں، عاقلوں میں تھا کب؟ اب وہ مستوں کے ساتھ مست تھے! ہاں مست الست!

ولایت گئے اور آئے، گرجے، چیخے چلائے، دم لینے نہ پائے تھے کہ 1914 کی محشر خیز جنگ یورپ شروع ہوگئی..... خلافت اسلامیہ کی آخری جنگ! آہ کہ وہ آخری جنگ جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم لہرایا..... محمد علیؒ اب اپنے عالم میں کہاں تھے، قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منہ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی تو نظر بند ہوئے، نظر بندی مہینے دو مہینے کی نہیں اکٹھے پانچ برس کی! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے، اس میں بھی پانچ پانچ برس زبان بندی، معطلی کی نذر! شاعری کے جوہر اسی زمانہ میں چمکے۔ مظلوم کی زبان بن کر نالہ و فریاد کرتے ہیں، ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں۔

ہوں لاکھ نظر بند دعا بند نہیں میں
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

جس کے دیوانے تھے، اس کے ہاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں مہر ہی مہر لیکن حقیقت مہر کبھی صورت قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو ان کا معاملہ سب سے نرالہ ہی رہتا ہے۔ امتحان پر امتحان، سوز پر سوز، ابتلا پر ابتلا۔

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیز
عشق عاشق بادو صد طبل و نفیر

محمد علیؒ اس بھید کو پا گئے تھے۔ اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چلے تھے، سوچ سمجھ کر بولے۔

یہ نظر بندی تو نکلی رو سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اور پھر اس سے بھی ترقی کر کے بولے کہ جو منزل مقصود پیش نظر ہے اس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے؟ اس کے لیے نقد جان کا مطالبہ ہونا تھا۔

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسرے کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی اس میں رشک کی کیا بات ہے۔ حصہ بقدر جثہ، یہ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے۔

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سر دار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

آپ فرمائیں گے کیا خوب مصرعہ لگایا ہے۔ یہ خاکسار عرض کرے گا کیا خوب اظہار حقیقت کردیا ہے! اسی نظر بندی کے زمانے میں ایک بار ملاقات ہوئی، پوچھا رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں؟ فرمایا ''ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے، یورپ پہنچوں اور گلی گلی گھر گھر تبلیغ اسلام کروں''!

نظر بندی اور اس کے بعد جیل پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا۔ ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار، توپ گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پینترے! ادھر ہندوستان کے اندر حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان! شروع 1920 میں محمد علیؒ دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے دوڑے دوڑے پھر یورپ پہنچے اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں۔ وقت کی ضرورت ناگزیر کہ موضوع صرف تحفظ خلافت ہی دیا لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا چپکے چپکے اور اندر ہی اندر دین کی تبلیغ بھی۔

اذاں حرم میں کلیسا میں دیر میں ناقوس
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا۔ ''عدم تشدد'' پر لاکھ زور دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جرم بہرحال جرم ہی بنا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڑھ میں ڈال چکے تھے اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ نومبر 1921 میں پکڑے گئے اور اگست 23 تک کچھ کم دو برس پھر چوروں اور رہزنوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ سرکار والا تبار کے مہمان......اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن سجدے والی زمین رفعت میں آسمان سے مل مل کر رہتی تھی! ذرا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روداد تو کان لگا کر سن لیجیے۔

معراج کی سی حاصل سجدہ میں ہے کیفیت
اک فاسق وفاجر میں اور ایسی کراماتیں

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ استقبال میں وہ بھی پیش پیش جن کے ہاں وطن، مذہب سے عزیز تر، دنیا دین پر مقدم۔ گانگریس کے صدر منتخب ہوئے، ملک نعروں سے گونج اٹھا! محمد علیؒ کی زبان پر ایک ہی نعرہ، سب نعروں سے بالاتر، وہی نعرۂ تکبیر!......وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا اللہ اکبر!

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار تھیں، چاروں دل و جان سے بڑھ کر محبوب، جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی آمنہ دق میں مبتلا ہوئی۔ جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا تھا۔ خود اپنی نازوں کی پالی لخت جگر کے لیے یہ خبر سن کر کیسا کچھ پھڑ پھڑایا ہوگا! دل پر کیا کچھ بیت کر رہی ہوگی! بیٹی سے عالم خیال میں کہتے تھے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

دوا درمن کی انتہائی تدبیریں تو غریب بے حوصلہ والدین بھی کر ڈالتے ہیں۔ پھر وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا ہو، وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور!

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر ایک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہل تسلیم ورضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نور نظر دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر اور گڑ گڑا گڑگڑا کر رض معروض کرنے لگ جاتے ہیں۔

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے، قرآن میں کیا
تخرج الحی من المیت مذکور نہیں
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

اب اس کے بعد جو شعر ہے اس کے پڑھنے سے پہلے اولاد والے اپنا کلیجہ تھام لیں۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو ہم کو بھی منظور نہیں

اللہ اللہ! جیل سے نکلے تو جسے گودوں میں کھلایا تھا، اسے قبر میں بھی اتارا!

24 کا وسط تھا کہ خود ترکوں نے منصب خلافت کو توڑ کر رکھ دیا......نہ پوچھیے کہ محمد علیؒ پر کیا گزر کر رہ گئی! خلافت اسلامیہ کا مٹنا قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی خبر محمد علیؒ کے حق میں خود قیامت بن کر رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل وجگر پس کر جھلس کر رہ گئے۔ وسط 24 سے آغاز 31 تک زندہ ضرور رہے اور بہت سے زندوں سے بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے، سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے جھگڑے اور بچھڑے۔

28 میں منجھلی لڑکی کی شادی کی اور سال ہی بھر بعد 29 میں اسے بھی اپنے ہاتھوں دفنایا۔ کامریڈ نکالا، ہمدرد نکالا مگر دونوں کو بند کرنا پڑا۔ کانگریس والوں کی زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انگورہ بھی گئے آئے۔ یہ سب کچھ ہوا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا لیکن دل کی کلی جو الغائے خلافت سے مرجھا چکی تھی پھر نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ محمد علیؒ اب زندہ تھے کب؟ یوں کہیے کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے وہ پورے کر رہے تھے!......اب وہ انسان نہ تھے صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہ سوزاں!

آخری سفر دیکھنے میں لندن کا سفر تھا گول میز کانفرنس کے لیے، اور حقیقت میں سفر آخرت! بدبینوں نے کہا کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے تو انگریز اور ہندی سب پکار اٹھے کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے یا ایک متحرک کوہ آتش فشاں! فاش وبرملا کہا (جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے) کہ ''آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر''۔

مالک نے بندہ کی لاج رکھ لی۔ جنوری 1931 کی پانچویں تاریخ اور شعبان 1350 کی پندرھویں شب میں عین اس وقت جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی کی، مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے مشیت الٰہی نے یہ نعمت عظمیٰ دنیائے

اسلام سے واپس لے لی!.....شاید اس لیے کہ اس کے ہم قوم اور ہم وطن اس کے اہل نہیں ثابت ہوئے تھے!'' آزادی محمد علیؒ کے ملک کو کیا ملتی، محمد علیؒ کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل لے کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لیے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں، قبلہ اول ہیکل سلیمان کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل، اقبال نے کہا ذرا دیکھنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام اور شیدائی محمد علیؒ جا کس راستہ سے رہا ہے ع

سوئے گردوں رفت زاں را ہے کہ پیغمبر گزشت

اس موت پر، اس مدفن پر رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور شور سے تنہا لکھنؤ یا دہلی یا کلکتہ یا بمبئی نہیں سارے ہندوستان میں ہوا، سارے عالم اسلام میں ہوا، اس کی نظیر تاریخ اسلام میں تو آسانی سے نہ ملے گی۔ آخری اطلاعیں یہ ہیں کہ قدس شریف میں مقبرہ ایک زیارت گاہ خلائق بن گیا ہے۔ زائروں کا ہجوم رہا کرتا ہے، مجاوروں کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے! خود کہہ بھی تو گئے تھے۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

....

وہ مشک ہی کیا جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے؟ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے، اس کے لیے ضرورت نہ کسی تمہید کی، نہ دیباچہ کی، نہ پیش نامہ کی۔ ورق الٹیے اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجیے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی طویل، عریض، ضخیم دیوان کہ گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں جب جا کر کوئی چیز اپنے مذاق کی مل پائے۔ ایک ننھی منی سی کتاب جب جو حصہ چاہے کھول لیجیے۔ البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پرانے رہرو کی زبان سے سنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں تو شاید راہ اور زیادہ سہولت اور خوشگواری سے کٹ جائے۔

محمد علی ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے۔ اس سن کا کھیل کود ذرا

ملاحظہ ہو۔

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو ۔۔۔ مگر اے ہم نفس دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے
یقین آنے کو تو آ جائے تیرے عہد و پیماں کا ۔۔۔ تیری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں ۔۔۔ پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

....

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش ۔۔۔ تھی رات یاس اور دلِ ناصبور تھا
میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا ۔۔۔ دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں۔ زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے تھے۔ انگریزی 1907 ہے۔ علی گڑھ، محمد علی کے محبوب علی گڑھ میں لڑکوں نے انگریز استادوں کے خلاف اسٹرائک کر رکھی ہے۔ کالج بند، خدایان کالج حیران و پریشان، بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس ہی برس ہوئے ہیں مگر اتنے عرصہ میں دنیا کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ محمد علی آتے ہیں، اتفاق سے وہی دن سرسید کی برسی کا ہے۔ اولڈ بوائز جمع ہو کر جلسہ منا رہے ہیں۔ محمد علی اپنے نیچری سے ڈرتے لرزتے نہیں ناز کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں اپنے جیسے بڈھے لڑکوں کو سنا سنا کر کچھ عرض کرتے ہیں۔ معروضہ میں ناز بھی ہے اور نیاز بھی، شوخی اور مستی بھی اور درد و گداز بھی۔

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو
یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو
وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو
تمھیں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علی گڑھ میں
اور اس پر یہ تماشا کہ ہر طرف اور جابجا تم ہو
سکھا یا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شرسارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

تم ہی ہو زندۂ جاوید باقی جانے والے ہیں
نمونہ ہیں فنا کا ہم تو تمثیل بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گزرا۔ اب محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند ہیں، یک بیک خبر پہنچتی ہے کہ غلام حسین چل بسے۔ کون غلام حسین؟ کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علیؒ کے دست و بازو، انگریزی کے زبردست انشا پرداز۔ کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد نیو ایرا کے ایڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان تندرست۔ سرِشام لکھنؤ میں ایک پبلک جلسہ سے چلے آ رہے تھے کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آ کر ٹکر دی اور یہ رونق صحافت وسیاست رخصت۔ محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو نالۂ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں۔

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
اے مرے رند بادۂ حق کے — ابھی دو چار خم پیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کیے ہوتے
خوب کتنا بہشت کا رستہ — ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی ہے، شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی اہتمام، کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور و فکر، نہ اصلاح و ترمیم، بس جو دل میں آ گیا جھٹ کہہ گزرے، یہی حال نثر کا ہے یہی حال نظم کا ہے۔

زمانہ حکومت کی اصطلاح میں ''نظر بندی'' کا لیکن احکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت ''نظر کشائی'' کا قرار پایا۔ خوب خوب پتہ کی کہنے لگے۔

سوز دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو
ہے درد دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو

دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے اسے
اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سنیے گا۔

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لیے
یہ کیا کہ مے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو
سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا
جو ہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ذیل کی غزل ایک اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
جینا وہ کیا کہ دل میں تری آرزو نہ ہو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

حنا کا قافیہ اس طرح میں آسانی سے آسکتا تھا، لیکن ذرا دیکھیے محمد علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے۔

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے و لے — میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل — ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالی کا ایک لاجواب شعر ہے۔ [1]

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حالی بہر حال ایک مسلم استاد تھے۔ جوہر ان کے مقابلے میں مبتدی اور نو آموز محض، پھر بھی شعر کچھ ایسا ہیٹا نہیں رہا۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تیری انتہا کے بعد
لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں — آتا ہے لطف جرمِ تمنا سزا کے بعد

---

1 یہ مضمون خلافت (بمبئی) کے محمد علی نمبر کے لیے لکھا گیا تھا، پھر صدق جلد اول نمبر 3 (کیم جون 1935) میں شائع ہوا

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ۔

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم ہی اور تھا۔ جیل کے باہر ہندوستان بھر کی سڑکوں پر، گلیوں میں، گھر گھر زبانوں پر چرچا تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ کہنا تو محمد علی کی "بی اماں" کا تھا اور محمد علی خود جیل کے اندر کیا کہہ رہے تھے؟

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے　　پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین بن علیؓ کو　　خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے یا اپنی آٹو بیاگرافی (خودنوشت سوانح عمری) "آپ بیتی" قلم بند فرما رہے تھے؟

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا　　سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے　　یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف　　کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اے شافع محشر جو کرے تو نہ شفاعت　　پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لیے ہے

کیوں ایسے نبی پہ نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے　　اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لیے ہے

اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

کیوں جان نہ دوں غم میں تیرے جب کہ ابھی ہے
ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے

بعد وفات جب ایک عالم ماتم وشیون سے گونجنے لگا تو صاحب معارف مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان ہی اسی دوسرے مصرعہ کو رکھا

ماتم یہ زمانہ میں بپا تیرے لیے ہے

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا یا تعزیت نگار کو۔ عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو۔ جسم قید فرنگ میں، دل ترکوں میں اٹکا ہوا۔ جیل کے اندر اخبار آنے نہیں پاتا۔ جیل خود آبادی سے بہت دور۔

ایک دن دور دراز سے اللہ اکبر کے نعرے کان میں آتے ہیں۔ دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا۔ جوش سے بے خود یہ قیدی گوشہ نشین کہہ اٹھتا ہے۔

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی
سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

مطلع سن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلیے۔

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا — تفسیر آج ہو گئی کیدی متین کی
تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا — ایک عرض اور بھی ہے ابھی اس کمترین کی
اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اس کے باب میں — کب ہو گی لامکاں سے مشیت مکین کی
تینوں حرم اسی کے جو ہے لاشریک لہ — ترکیب ہے درست یہی ایک تین کی

اسی ''گھر'' کے جنون نے تو خود اپنا گھر چھڑایا اور جلاوطن بنا رکھا تھا۔ رامپور میں پیدا ہوئے تھے۔، پلے تھے، بڑھے تھے، کھیلے تھے، چپہ چپہ دل میں بسا ہوا تھا مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جا سکتے۔ کسی کو یہ مستقل جلاوطنی بھگتنا پڑے جب قدر معلوم ہو۔ ٹھنڈی سانس بھرتے جاتے ہیں اور آبدیدہ ہو کر کہتے جاتے ہیں۔

گھر چھٹایوں کہ چھوڑنے والے — ہم نہ تھے ان کے آستانے کے
ایک ایک کر کے سب کے سب تنکے — ہوئے برباد آشیانے کے
دیکھیے اب یہ گردشِ تقدیر — کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال — ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

قید اور وہ بھی قید تنہائی! بیجاپور کی کال کوٹھری کے اندر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا کیا نعمتیں نصیب میں آ گئیں۔ سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا۔ کیا کچھ دیکھ لیا۔ کیا کچھ دکھا دیا! راز بھی کیوں کھلتا؟ ایک دن قلم کی زبان درود خوانی پر آئی تو کچھ اتے پتے اس عالم کے بھی دیتی چلی گئی۔

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے — ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں — ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت اک فاسق وفاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

قربان ہوجائیں اس قید پر ہزار آزادیاں! نثار ہوں اس ویرانہ پر ہزار ہا آبادیاں! مشت خاک کا شمار اب عالم پاک میں تھا۔ لوجب تپ کر، دہک کر، لال انگارہ بن جائے تو لوہا باقی ہی کب رہ جاتا ہے۔ جو ہر اب عالم معانی وحقائق کی سیر کررہے تھے، ان کی شاعری الفاظ وحرف کی اب رہ کہاں گئی تھی؟ ایک دیوانہ تھا دیوانہ جسے ایک دوسرے دیوانہ نے بلا کسی ظاہری تعارف وملاقات کے خوب پہنچانا اور خوب ہی کھوڈالا ۔

بدین مصطفٰے دیوانہ بودی فدائے ملت جانا نہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی وگرنہ عاشق مستانہ بودی
سیاست تہمتے برعشق پاکت ز آئین خرد بیگانہ بودی
رسیدی از رہ اغیار تایار عجب مستے عجب دیوانہ بودی

(ازمولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

زبان پر آئی ہوئی ''واہ'' کا غلغلہ بس یہیں محفل کے فرش تک، دل سے نکلی ہوئی ''آہ'' کی رسائی مالک کے عرش تک! رومی اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ اس لیے کہ کلام فصیح وبلیغ ہوتا تھا؟ یا اس لیے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی روح ہوتی تھی؟ فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہوگئے، محاورات تبدیل ہوگئے، ترکیبیں نئی ہوگئیں، لیکن حی وقیوم کا نام جپنے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں! خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جو ہرنے بھی اپنے کو اسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹادیا تھا، فنا کردیا تھا۔ عجب کیا ہے کہ کچھ زندگی ان کے نصیب میں بھی آجائے۔

......☆☆☆......

ضمیمہ: 6

محمد علیؒ

(مبلغ، مفسر، مناظر[1])

(1)

''انگریزی ترجمۃ القرآن کے نسخوں کا پہنچنا میرے حق میں سردو بہ مستاں یاد دہانیدن کا مضمون ہوگیا۔ جن کرم فرمانے یہ تحفہ عنایت کیا تھا، انھیں میں نے خط میں لکھا کہ ''اس سے بڑھ کر مسرت کا دن اور کون میرے لیے ہوگا کہ اس قید و بند سے رہائی پاتے ہی یورپ پہنچوں اور وہاں کے ہر شراب خانے سے نہ سہی تو کم از کم ہر ہر پارک، ہر ہر چوراہے سے ان جنگ کے دیوانوں کو اس دین کی تبلیغ کروں جو اسلام کی آشتی اور امن کے اندر قومی جنگ و جدل کے نعروں کو یکسر خاموش کر دیتا ہے۔ اسلام کی حکومت اس عصبیت و تنگ نظری کی دشمن ہے، جو قوم کو خلق کرتی رہتی ہے، اور انسان کا کام تمام کرتی رہتی ہے۔ ہمارا اللہ رب العالمین ہے۔ اس کے ہاں تفریق نہ عرب و عجم کی، نہ آریائی اور سیماطیقی نسلوں کی اور نہ اینگلو سیکسن اور ٹیوٹن قوموں کی''۔ (ص 121)

یہ الفاظ کس کے قلم سے نکل رہے ہیں؟ تبلیغ اسلام کی یہ تڑپ کس کے دل میں اٹھ رہی ہے؟ دعوتِ دین کے اس جوش و ولولہ سے کس کا سینہ شق ہوا جا رہا ہے؟...... کہیں مولوی محمد علی لاہوری نہ

---

1. یہ مضمون خلافت (بمبئی) کے محمد علی نمبر کے لیے لکھا گیا تھا پھر صدق جلد اوّل نمبر 3 (یکم جون 1935) میں شائع ہوا۔

سمجھیے گا۔ یہ دردِ دل اس محمد علی کا ہے جو ''کامریڈ'' کا ایڈیٹر تھا اور ملک وملت کا مشہور لیڈر، چھنڈواڑہ کا نظر بند، اور کراچی کا باغی، کانگریس کا صدر اور احرار کا سردار، تحریک خلافت کی جان اور تحریک ترکِ موالات کا روح رواں۔ جسم اسیر فرنگ اور روح طوافِ کعبہ میں مشغول! ہاں وہی محمد علی جو کبھی علیگ اور آکسن تھا۔

یہ نظربندی تو نکلی رد سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

''حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے اور معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے'' ان مصرعوں کو جی چاہے چھوڑتے جایئے مگر کیا اس شعر پر بھی نہ رکیے گا؟

فیض سے تیری ہی اے قید فرنگ
بال وپر نکلے، قفس کے در کھلے!

شعر وقافیہ کی داد کا خیال بھی دل میں نہ لایئے۔ یہ اگر شاعری ہے تو آخر آپ بیتی کسے کہا جائے گا؟

....

محمد علیؒ کو بے شمار انسانوں نے جانا، گنتی کے چند تھے جنھوں نے پہچانا۔ ''تقریر'' کی گرج دلوں کو دہلا کر، ملک کے در ودیوار کو ہلا کر رہی۔ ''تکبیر'' کی بھنک بس خال ہی خال کسی کے کان میں پڑی۔ بجلی کے لیمپ کو جلتا اور چمکتا سب ہی دیکھتے ہیں، بجلی کا ''کرنٹ'' کس خزانہ سے آتا ہے اس کی خبر کسے ہوتی ہے؟ قوم کی لیڈری، سیاسیات کی رہبری، سب نے دیکھی ان ساری سرفروشیوں اور جانبازیوں کی تہ میں جو دین کی تڑپ تھی اس پر نظر بہت کم لوگوں کی پڑی۔ مہرولی لینسڈاؤن ہوتے ہواتے، نومبر 15 میں چھنڈواڑہ پہنچے اور نظربندی کے کوئی چار برس یک لخت یہیں گزارے۔ قرآن مجید کی تلاوت، برکت اور ثواب کے خیال سے شروع سے کرتے چلے آئے تھے، معانی ومطالب کی سمجھ کے ساتھ اس کا مطالعہ زندگی میں پہلی بار اب شروع کیا۔ اسلام کی دردمندی پہلے سے موجود تھی۔ اب قرآن پاک نے اپنا اعجاز دکھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنا والہ وشیدا، مست ودیوانہ بنالیا!...... بارود اگر بجھی ہوئی ہو تو دیا سلائی دکھاتے ہی آگ پکڑ لینے میں دیر

کیا لگے گی؟...... مسلمان محمد علی نے اب از سر نو اسلام قبول کیا۔ اب وہ مسلمان اس لیے نہیں تھا کہ مسلمان گھرانے میں پیدائش ہوئی تھی اور باپ دادا کا مذہب اسلام چلا آتا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ اس کی عقل نے اور تحقیق نے اس مذہب کو اختیار اور اس کے دل نے اور دماغ نے اس دین کو سب سے اچھا اور سب سے پکا اور سب سے ستھرا پایا۔

''نومسلم'' کے جوش کا پوچھنا کیا۔ نومسلم محمد علی کی ذہنیت عام بشری ذہنیت سے انوکھی نہ تھی۔ بلا کا جوش تبلیغ پیدا ہوا۔ دل بے تاب کہ جو دولت اپنے کو نصیب ہوئی ہے کھینچ کھینچ کر اور گھسیٹ گھسیٹ کر ایک عالم کو اس میں شریک کرلیا جائے۔ جلد سے جلد بھی اور زائد سے زائد بھی۔ اور طبیعت بے کل کہ دنیا جہان میں اللہ کا کوئی بندہ اس نعمت سے محروم نہ ہونے پائے۔

لیکن سب سے بڑی دھن اس کی کہ کوئی اور آئے نہ آئے کم سے کم یورپ اور امریکہ تو ضرور ہی اسلام کی حلقہ بگوشی میں آجائیں۔ پانچ برس بعد 1923 کے مئی جون میں جب بیجاپور جیل میں قید سخت کاٹ رہے تھے، اس وقت اسلام پر انگریزی زبان میں تصنیف کی سوجھی۔ نہ کتابوں کا کوئی بڑا ذخیرہ پاس، نہ بیٹھنے کے لیے کرسی اور میز، اور پھر ادھر دل ترکی اور ہند کے قومی ملی معاملات میں اٹکا ہوا۔ ادھر ہوش، جوان چہیتی لڑکی کے مرض الموت کی خبریں پاکر اڑے ہوئے۔ اس پر بھی ذوق وشوق نے اچھی خاصی ضخامت کا مسودہ تیار کرادیا۔ ختم ہوجانے اور نظر ثانی کے بعد تو خدا جانے کیا کچھ اور کتنا کچھ ہوجاتا۔ موجودہ ناقص، ناتمام اور بالکل قلم برداشتہ ابتدائی مسودہ کی صورت میں وفات کے بعد 1931 میں طومار کاغذات کے اندر جو کچھ ملا وہ جامعہ ملیہ والوں کی ہمت سے ٹائپ ہوگیا ہے۔ فل اسکیپ کے 363 صفحہ میں آیا ہے۔ اور انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ جو خاکہ ذہن میں تھا، مشکل سے اس کا نصف دائرہ تحریر میں آسکا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

کتاب ایک طرح کی آپ بیتی یا خودنوشت سوانح عمری (آٹو بیا گرافی) ہے۔ مضمون یہ ہے کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا آنکھ کھول کر اسلامی تعلیمات کے یہ یہ نشانات دیکھے۔ گھر میں یوں رسما مذہبی تعلیم پائی۔ مکتب، اسکول، کالج میں مذہبی وروحانی حیثیت سے ماحول کی صورت یہ رہی۔

گردوپیش بے دینی کے چلن یہ یہ دیکھے۔ جنگ بلقان، یورپ کی سیاسی بددیانتی کے ہولناک مظاہرے فلاں فلاں دیکھنے میں آئے۔اور پھر جنگ عمومی نے یورپ کے روحانی واخلاقی افلاس کا پردہ بالکل ہی فاش کر دیا۔حق گوئی نے نظر بند کر دیا.....نظر بندی 15-1914 کے زمانہ میں پہلی بار قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کا موقع ملا۔اس نے آنکھیں کھول دیں۔اسلام کی حقیقت اب سمجھ میں آئی۔عبدیت الٰہی اور خلافت فی الارض کے معنی اب روشن ہوئے۔یورپ کے سارے درد کا درمان وحید اسلام ہی نظر آیا۔اپنی ترقیوں پر مطمئن، نت نئے آلات کی ایجاد میں منہمک، سارا فرنگستان مہذب درندہ بنا ہوا۔ایک دوسرے کے خون کا پیاسا، اپنی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ان غریبوں کو کیا خبر کہ دنیا کو تسکین کی راہ دکھانے والا مذہب، اسلام کے نام سے موجود ہے۔یہ بدنصیب تو اپنے مذہب کو مذہب سمجھے ہوئے ہیں۔ان مروجہ مذاہب کی جو حقیقت ہے اس سے تو لامذہبی بھی کوئی ایسی بری چیز نہیں۔گڑھی ہوئی انجیلیں، پولوس کی مشرکانہ تعلیمات، بھلا ایسے خرافات کے مجموعہ کو آسمانی مذہب حقانیت وروحانیت سے واسطہ کیا؟......آگے خدا جانے کیا کیا ہوتا۔ناتمام کتاب بس یہیں پہنچ کر تمام ہو جاتی ہے۔کتاب کا نام "Islam the Kingdom of God"۔یعنی اسلام حکومت الٰہی ہے۔اسم بامسمیٰ اس لیے کہ تشریح کتاب بھر میں زمین پر نیابت الٰہی قائم کرنے اور دنیا کو عدل سے بھر دینے کی اور مرکزی نقطہ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" کی تفسیر ہے۔اسی کتاب کا جسے اب تک نہ کسی کمپوزیٹر نے کمپوز کیا، نہ کسی پریس نے چھاپا، نہ کسی دارالاشاعت نے شائع کیا، اقتباس شروع مضمون میں درج کیا گیا، محمد علی وہاں ذکر پانچ سال قبل 1918 کی کیفیت کا کر رہے ہیں، لیکن کیفیت پانچ سال بعد 1923 میں بھی جوں کی توں موجود ہے۔(اور موجود تو 1931 میں مرتے دم تک رہی) ایک اقتباس آپ دیکھ چکے، اب دوسرا ملاحظہ ہو:

''آسٹریلیا یا افریقہ کے کسی وحشی کو جس نے اپنے وحشت زار سے زائد کچھ بھی نہ دیکھا ہو ذرا ایک بیک پکڑ کر کسی جہاز پر تو سوار کرا دیجیے اور وہ جہاز رکے آ کر ساحل امریکہ پر جو آج دنیائے قدیم کے ہر متمدن سے متمدن خطہ سے بڑھ چڑھ کر ہے۔اسی وحشی کے لیے اس براعظم کا انکشاف کیا آج بھی ویسا ہی حیرت انگیز نہ ہوگا جیسا کولمبس نے چارسو برس قبل کیا تھا؟ بلکہ اس

سے بھی بڑھ کر۔ اس لیے کہ کولمبس کو تو خالی خولی ایک براعظم ہی ملا تھا اور اس وحشی سیاح کو اس کے ساتھ ساتھ ایک پورا تمدن بھی ملے گا۔ اس کی مسرت اور اس کی حیرت کا کیا کہنا؟ بس یہی حال میرا بھی (قرآن پڑھ کر ہوا) مجھے بھی بیک وقت دوہری دوہری دولتیں نصیب ہوئیں۔ اللہ کو اور اللہ کے کلام کو تو سمجھا ہی، ساتھ ساتھ اپنی حقیقت بھی سمجھ میں آ گئی۔ (ص 65)۔

لوگ کہتے ہیں کہ خود شناسی سے خدا شناسی تک پہنچو، یہاں الٹی خدا شناسی ہی خود شناسی کا بھی ذریعہ بن گئی۔ ''مَنْ عَرِفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرِفَ رَبَّهُ'' (جس نے اپنے کو پہچانا اپنے رب کو بھی پہچان لیا) مدت سے سنتے چلے آئے تھے، آج محمد علی کی زبان سے ''مَنْ عَرِفَ رَبَّهُ فَقَدْ عَرِفَ نَفْسَهُ'' (جس نے اپنے رب کو پہچانا، اپنے آپ کو بھی پہچان لیا) بھی سن لیا!

....

نومسلم کے جوش تبلیغ کا اندازہ اسی نومسلم کی زبان سے کیجیے:

''میں اپنی اس نئی دنیا کی دریافت کو کیا اپنے ہی تک سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا؟ نہیں، کہاں ممکن تھا؟ دوسرے معاملات میں کیسا ہی خودغرض سہی، اس حقیقت کبریٰ کا، اس حقیقت الحقائق کا انکشاف جس گھڑی میرے روبرو ہوا، میرا اسارا وجود اس سے پر ہو گیا، میں اسے چھپانا چاہتا بھی تو میرے سینے کے اندر اس کا چھپا رہنا کیوں کر ممکن تھا؟ میری روح کا توریشہ ریشہ اس انکشاف سے پھٹنے لگا اور جی بے اختیار بے قرار ہو کر یہ چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر اور پکار پکار کر سب کو اس کی دعوت دینی شروع کر دوں...... گھر کے بوڑھوں بچوں کو، نوکروں چاکروں، کتے بلی جانوروں کو، بے جان درختوں اور جھاڑیوں کو، سب کو یہی پیغام، یہی بشارت (دیوانہ وار) پہنچانا شروع کر دوں''۔ (ص 96)

کیا خبر تھی کہ حق کے اندر یہ بے پناہ قوت رکھ دی گئی ہے۔ مشہور فرنگی فاضل میکس مولر کا قول ہے کہ:

''حق کا نشہ ایمان والوں پر ایسا سوار رہتا ہے کہ جب تک وہ اپنے خیال میں قول اور عمل سے اس کا اظہار نہ کر ڈالیں، جب تک وہ اپنے پیام و منادی روئے زمین کے چپہ چپہ پر نہ کر چکیں، ان کے دل کو چین اور قرار آ ہی نہیں سکتا''۔

محمد علیؒ اس مقولہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

''مدتیں گزریں جب میں نے اول اول اس عبارت کو پڑھا تھا، تو اس کے خطیبانہ انداز بیان کو خوب داد دی تھی۔ اب جب اپنے اوپر آ کر پڑی تو معلوم ہوا کہ حق و ایمان اندر ہی اندر جو عظیم الشان غیبی قوت پیدا کر دیتا ہے اس کے سامنے یہ عبارت خطیبانہ اور زور دار ہونا کیا معنی بالکل کمزور اور پھسپھسی سی ہے۔ مومن کا قلب تو ایک بم کا گولہ ہوتا ہے کہ اب پھٹا اور جب پھٹا''۔ (ص96)

امتی کا ذہن یہ سب کچھ کہنے سننے کے بعد معاً اپنے رسولؐ اور رسولوں کے سردار کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ اسے آقائے نامدار کا بے پناہ جوش و تبلیغ یاد پڑ جاتا ہے۔ وہ کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کو دعوت دینا، وہ ضیافت کے بعد اپنی برادری والوں کے سامنے اسلام کی روحانی ضیافت پیش کرنا، وہ سالہا سال مکہ میں اسی کے پیچھے ہر طرح کی سختی برداشت کرنا، وہ اپنے شہر والوں سے مایوس ہو کر طائف کا رخ کرنا اور وہاں کی آبادی کا انتہائی بیہودگی سے پیش آنا، لہولہان مکہ واپس تشریف لانا، پھر حج کے موقع پر مدینہ والوں سے آس لگانا، ناکام ادھر سے ادھر پھرنا، حاجیوں کے اس گروہ سے اٹھ کر ابھی اس گروہ کے پاس جانا، ایک ایک کا دل ہاتھ میں لینا اور زبان کی موتی بہلانا، سمجھانا، پرچانا، غرض ایک اللہ کی منادی کے پیچھے خلق اللہ کی خفگی مول لینا، دنیا جہان کے جتن کر ڈالنا، یہ سارا سماں اس امتی کی نظر میں پھر جاتا ہے۔ اللہ اکبر اس رسولؐ کی ہمت، استقلال کی، پامردی کی، ایثار کی، تحمل کی تھاہ کوئی بھی پا سکا ہے! اور پھر

''وہ حق ہی کیا جو اپنا مبلغ آپ ہی نہ ہو۔ ''مشنری'' اور ''تنخواہ دار'' کیا خوب! سچا ''مشنری'' (مبلغ) تو وہ ہے جو تبلیغ کی خاطر اپنی نقد جان تک حاضر کر دے، چہ جائیکہ خدماتِ تبلیغ کا معاوضہ بصورت نقد وصول کرے''۔ (ص98)

دل میں جذبہ صادق موجود ہو تو میدان عمل کی تلاش کے لیے کیا کہیں باہر جانا ہے۔ موقع تو ہر جگہ موجود ہے۔ محمد علی نے تبلیغ بیتول جیل کی چہار دیواری کے اندر، یارانِ مجلس کے درمیان ہی شروع کر دی۔ ذرا یہ چھوٹی سی کہانی ان ہی کی زبانی سنتے چلیے:

''توریت میں تو نہیں، البتہ قرآن میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یوسف علیہ السلام

نے توحید کا وعظ اور بہترین وعظ اپنے ساتھ کے دوقیدیوں کو سنانا شروع کردیا تھا، ان قیدیوں کو جواب تک فرعون مصر کو اپنا خدا جانتے اور مانتے ہوئے تھے اور یوسف سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھ رہے تھے۔ میں نے بھی یہی وعظ جیل میں شروع کر کے اس سنت پیغمبری پر عمل کیا اور میرا تجربہ تو ہندوستان کے اندر ایک سے زائد جیل سے متعلق بالفاظ شیکسپیئر یہ ہے کہ ہر شر کے اندر خیر کا جلوہ ضرور ہوتا ہے"۔ (ص 141)

....

لیکن اصلی لگن یورپ جا کر اپنا پیام حق سنانے کی لگی ہوئی تھی، کچھ اس کا ذکر مضمون کے شروع ہی میں آپ سن چکے، کچھ اب سنیے:

"ویلز (مشہور انگریز مصنف) کی یہ دونوں کتابیں پڑھ کر میں بے تاب ہوگیا کہ یورپ پہنچوں اور اس کا پیغام ان کافروں تک پہنچاؤں جنھوں نے قوموں اور نسلوں اور حکومتوں کی پوجا کرنا اپنا شعار بنالیا ہے۔ حالانکہ پرستش حق ہے صرف خدائے واحد کا۔ کٹی ہوئی اور ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی نہیں، بلکہ سارے عالم و مسلم کائنات انسانی کے پروردگار عالم کا۔ بس ہماری طرف سے اس کی اطاعت ہو اور اس کی طرف سے فضل وکرم"۔

"اس کے یہ معنی نہیں کہ تبلیغ کی ضرورت ہندوستان میں اور خود مسلمانوں کے اندر نہیں۔ یقیناً یہاں بھی بہت ضروری ہے اور خیرات کی طرح تبلیغ کو بھی اپنوں ہی سے شروع کرنا چاہیے۔ لیکن دوسری طرف اس حقیقت سے کیسے چشم پوشی کر لی جائے۔ کہ بڑوں کا بگڑنا بہت ہی بڑی برائی ہے اور ایشیا و افریقہ کے مقابلہ میں اس وقت یورپ و امریکہ کی بڑائی سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ اپنی ساری ترقیوں کے ساتھ کاش یورپ و امریکہ اگر اپنے اندر وہ شے پیدا کرلیں جس کے بغیر کوئی ترقی حقیقی ترقی کہی ہی نہیں جاسکتی یعنی جذبۂ دینداری تو یہ تو وہ کچھ کرسکتے ہیں جو ایشیا و افریقہ ابھی مدتوں کرسکنے کا دم نہیں رکھتے"۔ (ص 126)

"اگر مغرب کسی طرح ہمارے مذہب کا مطالعہ کرنے اور اس کے سمجھ لینے پر آمادہ ہوجاتا تو میں نے اس وقت خیال کیا کہ رنگ اور نسل کے پیدا کیے ہوئے سارے جھگڑوں کا خاتمہ ہوجائے۔ اور مغرب و مشرق دونوں بڑے نفع میں رہیں"۔ (ص 134)

یہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی شفیق طبیب کو کہیں سے تریاق ہاتھ آ گیا ہے اور وہ بیتاب ہے کہ کس طرح مار گزیدہ تک اڑ کر پہنچے اور اسے موت کے منہ سے جا کر نکال لائے۔

(2)

قسمت میں نہ تھا۔ یورپ گئے، لندن اور پیرس دونوں جگہ خوب ہی تقریریں کیں لیکن حیثیت مبلغ اسلام کی نہ تھی۔ رئیس وفد خلافت کی تھی۔ ان تفصیلات کی تلاش یہاں نہ کیجیے کہ کن مجبوریوں سے اور کیسے نازک حالات کے ماتحت قید سے چھوٹتے ہی کس طرح یورپ روانہ ہو جانا پڑا۔ بہرحال ہوا یہی۔ ترکوں سے شرائط صلح درپیش، معاہدہ بالکل دستخط ہونے کو، ایسی حالت میں محمد علی اپنے دو تین رفیقوں کے ساتھ ہندوستان کی خلافت کمیٹی کی طرف سے یورپ پہنچتے ہیں اور معاً ترکوں کی وکالت شروع کر دیتے ہیں۔ وفد سیاسی اور گفتگو کے مخاطبین آبادیاں اور قومیں نہیں بلکہ حکومتیں اور وزارتیں۔ تبلیغ اسلام اور مذاکرۂ دینی کا موقع تو ظاہر ہے کہ کہاں نکل سکتا تھا۔ حسرت برسوں بعد تک رہی۔

"ہمارے وفد کی نوعیت بہت مقید ہو کر رہی۔ خطاب یہ تو نہیں بجز حکومتوں کے......اور کسی سے جائز نہ تھا لیکن یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مخاطبت اصلی حکومتوں ہی سے تھی، تبلیغی آزادیاں اب کہاں باقی رہ سکتی تھی" (ص 147)......اس پر بھی کیا محمد علی چوکنے والے تھے؟

"میری مذہبی دیوانگی دیکھ کر انگلستان میں متعدد دوستوں نے مشورہ دیا کہ مذہب کا نام بھی تقریروں میں زبان پر نہ لانا، لیکن اس مشورہ پر عمل بھلا کب ہو سکتا تھا؟ ہم بھی کیا کوئی ترکی قوم پرور تھے، جو اپنی قوم کی سرزمین کے لیے لڑ رہے تھے؟ ہم تو ترکی نہیں ہند کے رہنے والے تھے اور رعایا اس شاہ انگلستان کی جس سے ترکی برسر جنگ......لیکن تھا کیا؟ تھا یہ کہ ہم مسلمان رعایا تھے، جنگی اطاعت مسیحی فرمانروا کے ساتھ مشروط۔ اس واضح اور صریح شرط کے ساتھ تھی کہ ہمارے جذبات دینی کا احترام کیا جائے گا اور جذبۂ دینی ہی کا تو تقاضا تھا کہ ہم اس حکومت کی نصرت و تائید میں وفد لے کر آئے تھے جس کی بقا کا دامن خلافت عالم اسلامی سے وابستہ تھا۔ دول متحدہ نے جو ہماری سند نمائندگی تسلیم کی اور ہمیں کہنے سننے کا حقدار قرار دیا تو اسی بنیاد پر تو"۔ (ص 147)

پھر آخر ترکوں کے خلاف جو اس قدر تعصب پھیلا ہوا تھا کہ اس کی آخر بنیاد کیا تھی؟ وہی مذہب یعنی ترک چونکہ مسلمان ہیں، اس لیے انھیں حاکم بنے رہنے کا کوئی حق ہی حاصل نہیں۔ کیونکہ خود اسلام کا تصور ان بدنصیبوں کے دلوں میں کیا تھا؟ (نعوذ باللہ) مشرقی ظلم واستبداد، تقشف وتنگ نظری اور نفس پرستی کا مجموعہ اور عقائد میں جابجا یہود اور مسیحیوں کی تعلیمات سے سرقہ! معاذ اللہ جن لوگوں کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو چکی تھی، ان کے سامنے ترکوں کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے کوئی معنی ہی نہ تھے جب تک یہ سارے پردے ایک ایک کر کے ہٹا نہ لیے جائیں..... محمد علی سے بڑھ کر ان نزاکتوں کو کون پہچان سکتا؟ اور پہچاننے کے بعد کون ان سے بڑھ کر ان کی روایت کرتا؟ موقع بے موقع جب جب بس چل سکا، تقریر میں، تحریر میں، جہاں دیکھیے سیاسیات میں ایمانیات کا پیوند!..... صورت پر جایئے تو ایک پرشوکت تقریر، معنی کی جانب آیئے تو محض ایک نعرۂ تکبیر!

یورپ کی مشہور عالم گیر جنگ ابھی تازی تازی ختم ہوئی تھی، محمد علی کی ہر تان اسی پر آ کر ٹوٹتی تھی کہ یورپ ذرا اپنے کو دیکھے تو زخموں سے کیسا چور چور جسم ہے، گویا ایک مستقل گھراتا سور! ان سارے امراض کا مداوا اگر کہیں ہے تو صرف شفاخانۂ اسلام میں۔

....

یورپ کی جان کا اصلی روگ اور تہذیب نو کا سب سے زبردست دیوتا ''وطن'' اور ''قوم'' ہے

ع

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے (اقبال)

جس کو دیکھیے قوم اور وطن کے نشہ میں سرشار، نسل ورنگ کے مرض میں گرفتار، تجارتی رقابت، معاشی کشمکش، قومی منافرت، بلوے، بغاوتیں اور کشت وخون، قتل وغارت، بم اور مشین گن، ڈریڈناٹ اور تارپیڈو، تڑپتی ہوئی لاشیں اور خاک وخون میں لوٹتے ہوئے سر، لازمی نتائج!

---

1 الحمدللہ کہ اس مقالہ کی تحریر کے چند سال بعد 1942 میں کتاب ایک نئے نام MY life:A fragment کے ساتھ محمد افضل اقبال ایم اے لاہوری کی مستعدی کے طفیل شیخ محمد اشرف تاجر کتب انگریزی لاہور کے ہاں سے 250 صفحوں کی ضخامت سے شائع ہوگئی۔ ہندوستان میں مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، دہلی سے مل سکے گی 1952

ہولناک جنگ یورپ کے زمانہ اور قرب صلح کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

''اب مجھے یہ آس بندھی کہ ادھر صلح ہوئی اور ادھر ٹھیک اسی گھڑی میں یورپ پہنچوں اور خوشامدیں کر کر کے ان کے دلوں میں اتاروں کہ اس دین پر ذرا تو غور کریں جو نسل ورنگ کی پیدا کی ہوئی دشمنی کے مٹانے میں ہر معیار سے اب تک کامیاب ہی ثابت ہوا ہے''۔(ص147)

''موجودہ مسیحیت نے خدا کے باپ ہونے پر اتنا زور دیا لیکن انسان کے بھائی ہونے کا اسے خیال ہی نہ آیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اتنی پیش گوئی تو کی ہی جاسکتی ہے کہ یورپ بعد جنگ بہرحال وہ نہ ہوگا جو یورپ قبل جنگ تھا اور اس ہولناک جنگ کا بھوت اتر جانے کے بعد اسے اس دین کی طرف بآسانی متوجہ کیا جاسکے گا جس کی دعوت حکومتِ الٰہی نے دی ہے اور جس کی پکار یہ ہے کہ حکم وحکومت صرف خدائے واحد کی ہے۔ سب انسان یکساں اسی ایک بادشاہ کی رعایا ہیں اور سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ سوچ کر میں نے دل میں عہد کیا کہ جوں ہی جنگ ختم ہوئی اور ہم رہا ہوئے، میں یورپ اس جدید ترین شریعت کو لے کر پہنچوں گا جو ساتھ ہی قدیم ترین بھی ہے کہ خدا نے اسی کا مکلف انسانوں کو بنایا تھا''۔(ص137)

انسان خدا کا خلیفہ ہے۔ زمین پر اپنے خالق کی طرف سے حکومت کرنے کو بھیجا گیا ہے جس قانون کے مطابق اسے حکومت کرنا ہے اسی کا نام شریعت اسلامی ہے۔ روئے ارض پر عدل وامن کا اگر قیام منظور ہے تو بجز اسلام قبول کیے اور اسلام کے قانون پر عمل کیے چارۂ کار نہیں۔ یہی سبق ہے جو محمد علی دیتے ہیں۔ یہی سبق ہے جو اپنی اس کتاب میں جابجا دیتے گئے ہیں۔ یہی سبق ہے جو رئیس وفد خلافت کی حیثیت سے جتنا بھی بن پڑا محمد علی دے گئے۔

....

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کی متعدد تفسیریں نظر سے گزری ہوں گی، معروف ومتداول تفسیر تو یہ کہ قبولِ اسلام پر کسی کو مجبور نہ کیا جائے۔ مقصود اعلیٰ غلبۂ اسلام ہے جو جزیہ کی صورت میں بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جب دین حق کا وضوح ہو چکا، اس کے قبول کرانے کے لیے جو بھی طریقے استعمال کیے جائیں ان پر جبر واکراہ کا اطلاق کا نہ ہوگا۔ وقس علی ہذا۔

---

1 صدق 11 جولائی 1936

خلاصہ یہ کہ دین کے باب میں جبر نہیں۔ آج اس آیت کی تعبیر ایک اور سن لیجیے۔ ''فی'' کے معنی ''اندر'' کے بھی تو ہیں۔ اس لیے آیت سے یہ بھی تو نکل سکتا ہے کہ ''دین کے اندر آکر کوئی جبر واکراہ باقی نہیں رہ جاتا۔ جب حق کا کامل وضوح ایک بار ہو گیا، جب عقیدہ ایسے مالک پر جم گیا جو اپنے پرستاروں کی خبر گیری و دلد ہی سے کسی آن غافل نہیں ہوتا تو اب دین کا مطالبہ جو کچھ بھی ہو، فرمائش جس قسم کی بھی اطاعت و عبادت کی ہو، مومن کی طرف سے غفلت و تساہل ممکن کیوں کر ہے۔ جبر واکراہ کی گنجائش ہی اب کہاں باقی رہی! بندۂ مومن تو ایسے محبوب آقا و پروردگار کی رضا جوئی کے لیے ہنسی خوشی دوڑ دوڑ کر اپنا سب کچھ پیش کر دے گا۔ اپنے کو لٹا دے گا، اپنی جان تک نذر کر دے گا۔ جان آخر کیا چیز؟ اسی کا عطیہ اور اسی کی ملک، اس کی حکمت و مصلحت ہم سے جس وقت بھی اس کی واپسی کا تقاضا کرے تو ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی کیا پس وپیش ہو سکتا ہے۔ اس دین کے اندر داخل ہو جانے کے بعد سارا کاروبار تو رضا کارانہ رغبت وشوق اور والہانہ محبت و ذوق کا چلنے لگتا ہے۔ جبر وزبردستی کا نشان ہی کہاں باقی رہ جاتا ہے؟''

آیت کی یہ تفسیر ہو یا نہ ہو (اور زیر نظر کتاب کوئی تفسیر ہے بھی نہیں) لیکن کیا بطور ایک لطیف صوفیانہ نکتہ کے بھی آپ اس کی داد نہ دیں گے؟ اور یہ تو محض ایک آیت نمونہ کے طور پر ہے جو نقل کر دی گئی ہے ورنہ اس طرح بیسیوں مضامین متعدد آیات قرآنی سے استنباط و استخراج کیے ہوئے محمد علی کی کتاب اسلام میں درج ہیں۔

....

یورپ کے مبلغ اسلام کے لیے ایک ہی وقت میں جنگ کے تین تین محاذوں پر نظر رکھنی لازمی ہے۔ ایک طرف تو دہریت، مادیت اور الحاد کا زور ہے۔ قرآن مجید کو اس رنگ میں پیش کرنا ہے کہ ملحدوں اور لامذہبوں کے اعتراضات از خود ساقط ہوتے جائیں۔ دوسری طرف مسیحیت کے پھندے بھی میدان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور مسیحیت کو چونکہ عموماً حکومت کی سرپرستی اور پشت پناہی حاصل ہے، اس لیے قدرتاً یہ فتنہ شدید تر ہے۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی وغیرہ ساری حکومتیں خواہ برائے نام سہی لیکن ہیں بہر حال ضابطہ سے اب تک مسیحی ہی۔ اب مبلغ اسلام جب یورپ کے علاقہ میں پیش قدمی کرے گا تو اس کو مذہب مسیحیت سے عظیم الشان مقابلہ کے لیے

پوری طرح مسلح ہو جانا چاہیے۔ پھر مسیحیت بجائے خود کوئی مستقل مذہب نہیں، یہودیت ہی کی ایک شاخ ہے جس میں یونانی بت پرستوں کے شرک کی قلم لگی ہوئی ہے، پس مسیحیت کے مقابلہ میں قدم اٹھانے والے کی نظر مسیحیت کے ان ماخذوں یعنی مذہب یہود اور عقائد مشرکانہ یونان پر بھی خوب عمیق و وسیع رہنی چاہیے۔ ڈھائی پونے تین سو صفحہ کی کتاب میں (چھپنے پر ممکن ہے کہ ضخامت کچھ بڑھ جائے) بحمداللہ ان مباحث کا کوئی گوشہ چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ خصوصاً مسیحیت پر تو ایسی زبردست تنقید کی ہے کہ جن لوگوں کی عمریں عیسائیوں سے مناظرہ اور گفتگو میں گزری ہیں وہ بھی اس کتاب سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ انگریزی میں ایک اصطلاح Higher Criticism کی ہے۔ اردو میں اس کے مقابل کسی اصطلاح کا علم نہیں۔ لفظی معنی ''تنقید اعلیٰ'' کے ہیں۔ مراد اس سے یہود و نصاریٰ کی کتب مقدسہ کی تنقید ہے۔ یورپ میں یہ ایک باضابطہ اور مستقل فن بن چکا ہے (جیسے ہمارے ہاں فن اسماء الرجال) اور ستر اسی سال کے اندر اس پر صدہا تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں بائبل کی ایک ایک کتاب لے کر اس پر مفصل بحث ہوتی ہے کہ وہ کتاب کس زمانہ کی یا کن کن زبانوں کی تصنیف ہے؟ کس مصنف نے تنہا یا کن کن مصنفوں نے مل کر اسے تصنیف کیا ہے؟ جس شخص کی جانب منسوب ہے اس کی جانب انتساب کہاں تک صحیح ہے؟ جعلی و الحاقی عبارتیں کیا کیا اور کہاں کہاں ہیں؟ وقس علیٰ ہذا۔ محمد علی کی سطر سطر سے ٹپکتا ہے کہ جیل کی فرصت کے زمانہ میں انھوں نے بائبل اور اس کی تنقیدات عالیہ کا خوب ہی مطالعہ کیا ہے اور اس سمندر میں گہرے غوطے لگا کر خوب خوب موتی نکالے ہیں۔

صحابہ کرامؓ اور حواریان مسیح کا تقابل، واقعہ احد سے صحابہ کرامؓ کی جان نثاری پر استدلال، حواریوں کے ''اعمال نامے''، ان کے مقابلہ میں حضرت صحابہ کرامؓ کے جیتے جاگتے معتبر و مستند واقعات، مسیحیت کی حقیقت، حضرت مسیح کا اصلی مشن، مذہب یہود میں مشرکانہ خیالات کی آمیزش، فیلو (Philo) فلسفی کے اثر سے مسیحیت کا مسخ ہو کر پولوسیت بنا جانا و پال (پولوس) کی سعی مسخ کی مفصل پردہ دری، موجودہ مسیحیت میں شرک جلی کا امتزاج، اناجیل اربعہ خصوصاً انجیل یوحنا کی جعلی حیثیت، علوم نظری میں تو غلو کی ہجو، امام احمد بن حنبلؒ کی مدح و توصیف، امام پر سید امیر علی کی

---

1 یعنی وسط 1936 میں

تعریض اور اس کے جواب، یہود کی مغضوبیت دور حاضرہ میں، سائنس اور مذہب کے حدود، ابتدأحدیث کے مصالح، تدریجی نزولِ قرآن کے مصالح (امت کے لیے، کفار کے لیےاور پیغمبرؐ کے لیے) علم کلام کا بنیادی مسئلہ، مسیحیت پر یونانی فلسفہ کا اثر، مسیحیت پر ایران کے مذہب تنویہ کا اثر، مسیحیت کی تاریخ، تحریف کتبِ سماوی سابقہ کا ثبوت، امیر علی اور سرسید نے اسلام پر دفاعی حیثیت سے جو کتابیں لکھی ہیں ان پر محاکمہ وغیرہ ان تمام عنوانات پر فاضلہ تبصرہ دیکھنے کا اگر اشتیاق ہوتو اپنے اشتیاق کا عملی ثبوت بہم پہنچا کر جامعہ ملیہ سے کتاب شائع کرائیے۔ نمونہ کے طور پر صرف ایک ایک مقام کی سیر اور کرتے چلیے:

''لیکن تفسیر وتعبیر کی اس ذاتی آزادی کے بعد جس کا میں پوری طرح قائل ہوں اور کسی آزادی کا قائل نہیں اور یہ معصیت تو میرے نزدیک اکبرالکبائر کا مرتبہ رکھتی ہے کہ کوئی بندہ اور بشر تفسیر وتعبیر کی آڑ پکڑ کر کلام الٰہی میں کچھ اپنی طرف سے بڑھادے یا گھٹادے یا اس میں کچھ اور ردو بدل کردے! تنقید اعلیٰ نے خوب روشن کردیا ہے کہ بائبل یعنی عہد قدیم وجدید دونوں کی کتنی کتابیں دوسروں کے نام سے لکھ دی گئی تھیں اور رفتہ رفتہ جوالحاقات ہوتے رہےان کے لحاظ سے تو وہ کتابیں کیا ہیں گویا طبقات الارض کے مطابق مختلف ادوار کے اور وہ بھی تہ بہ تہ طبقے ہیں! اور ستم یہ کہ ان تمام تحریفات کے تسلیم ہوجانے کے بعد ہی یہ ماہرین فن اس تحریف پر کوئی ملامت وسرزنش نہیں کرتے بلکہ مجرموں کی طرف سے یہ صفائی پیش کرنے لگتے ہیں کہ اخلاص وصداقت کا معیار تو آخر ہر زمانہ اور ہر ملک میں مختلف ہی رہا ہے! بلکہ بعض نے تو کمال ہی کرکے یہاں تک کہہ دیا کہ محرف کی نیت تو نیک ہی ہوتی ہے! اور اس لیے وہ قابل الزام نہیں بلکہ قابل عزت ہے۔ چنانچہ مسٹر چیڈوک اپنی کتاب دی بائبل آف ٹوڈے میں لکھتے ہیں:

''جن لوگوں نے خود لکھ کر ان تصانیف کو اکابر (یعنی انبیاء علیہم السلام وحوارین) کی جانب منسوب کردیا ہے، ان کے حق میں اتنا تو بہرحال کہا ہی جاسکتا ہے کہ انھیں خودنمائی اور ذاتی شہرت مقصود نہیں تھی۔ اپنے کو انھوں نے مٹادیا، اپنے کو گمنام و بےنشان کردیا تاکہ کتب مقدسہ کی عظمت میں فرق نہ آنے پائے''۔

---

1 جو معا بعد تخت وتاج سے دستبردار ہوکر محض ڈیوک آف ونڈسر رہ گئے۔

کیا خوب! اگر یہ استدلال صحیح ہے تو آخر اس میں کیا برائی ہے جو بت پرست قوموں میں بتوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہم پرست معتقدوں کے سوالات کے جوابات خود چھپے ہوئے بت کی زبان سے دیا کرتا ہے۔ گمنامی اور بے نشانی میں تو اس کا بھی مطلق شبہ نہیں ہوسکتا۔ اور پھر دنیا میں جتنے بڑے بڑے جعلساز ہوئے ہیں جنھوں نے مصنوعی سکے بنائے ہیں وجعلی دستاویز تیار کی ہیں، جعلی نوٹ چلائے ہیں، یہ غریب کس خودنمائی اور ذاتی شہرت ونمود کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں؟ کیوں نہ اسی دلیل سے ان سب کو ہیرو قرار دے لیا جائے؟ افسوس ہے کہ خود بائبل کے اندر اس جعل وتلبیس کی سند جواز موجود ہے، ملاحظہ ہو پال کا مکتوب رومیوں کے نام باب 3 آیت 7۔

لیکن قرآن کریم کی تعلیم نے اس کے برعکس ایسے محرفین اور جعلسازوں کی شدید مذمت کی ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (بقرہ آیت 76) اور حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا جعلساز اور کھوٹے سکے گھڑنے والا بھی اس مجرم کے جرم کا مقابلہ نہیں کرسکتا جو بندہ اور بشر ہو کر اپنے کلام کو معاذ اللہ کلام الٰہی بنا کر پیش کردے''۔ (ص 161-162 ملخصاً)

کتاب مسودہ کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ مولانا کے شیدائیوں کی تعداد خدا کے فضل سے ہر طبقہ میں اچھی خاصی موجود ہے اور پھر یہ کام تو خالص دینی ہے۔ خوش نصیب ہے وہ جس کے نصیب میں کتاب کے مراتب طبع واشاعت کی تکمیل آجائے۔[1]

......☆☆☆......

1. الحمد للہ کہ اس مقالہ کی تحریر کے چند سال بعد 1942 میں کتاب ایک نئے نام My life A Fragment کے ساتھ محمد افضل اقبال ایم اے لاہوری کی مستعدی کے طفیل شیخ محمد اشرف تاجر کتب انگریزی لاہور کے ہاں سے 250 صفحوں کی ضخامت سے شائع ہوگئی۔ ہندوستان میں مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، دہلی سے مل سکے گی (1952)

ضمیمہ:7

محمد علیؒ 1

جواہر لعل کے نقطۂ نظر سے

یا

''جوہر'' میزانِ جواہر میں!

محمد علیؒ کو صدارت کانگریس (کوناڈا۔دسمبر 1923) کے بعد کانگریسی لیڈروں کے جو جو تلخ اور دردناک تجربات پیش آئے، خدانہ کرے کسی اور کو پیش آئیں۔لیکن اس کے باوجود گنتی کے جن دو چار لیڈروں سے وہ آخر تک خوش رہے یا یوں کہیے کہ زیادہ ناخوش نہیں ہوئے ان میں ایک جواہر لعل نہرو بھی تھے۔محمد علی جب صدر ہوئے تھے تو انھیں کانگریس کا جنرل سکریٹری مقرر کیا تھا۔آج یہ خود صدر کانگریس ہیں، اور محض کانگریس ہی کے صدر نہیں کہنا چاہیے کہ ایک گاندھی جی کو مستثنیٰ کر کے ملک کے سب سے بڑے لیڈر بلکہ یہ ایک استثنا بھی کچھ واجبی سا ہے...... بہرحال آج ان کا نام بک رہا ہے، اور ان کے زبان اور قلم کا ایک ایک لفظ یورپ میں بھی اور ہند میں بھی جواہرات کا مول رکھتا ہے۔

ان کی تازہ آپ بیتی یا خودنوشت سوانح عمری کو انگریزی میں نکلے ہوئے ابھی دن ہی کے

1۔ صدق 11 جولائی 1936

ہوئے، برسوں نہیں، مہینوں نہیں، کہنا چاہیے کہ ہفتوں کی بات ہے۔ اسی اپریل ہی میں تو پہلا ایڈیشن لندن میں نکلا۔ بس چھپنے کی دیر تھی کہ ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اسی مہینے کے اندر دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئی اور آنا فاناً وہ بھی ختم!...... اردو کے مصنفین اس داستان "طلسم ہوش ربا" پر کیسے یقین کریں؟...... مئی کا مہینہ آنا تھا کہ نوبت تیسرے ایڈیشن کی آ گئی! قیمت گھٹنے کے بجائے اور بڑھ گئی اور بڑھی بھی تو کیسی، اضافہ پانچ فیصد یا دس فیصد کا نہیں، پچاس فیصدی سے زائد کا! (پہلے ہندوستان میں سات روپیہ کو آتی تھی، اب گیارہ روپیہ کو آنے لگی) انگریز پبلشر کیا کوئی ایسا نادان تھا کہ گھر میں سونا برسے اور وہ دوڑ دوڑ کر اسے سمیٹنے اور بٹورنے کی کوشش نہ کرے؟...... ادھر داد فطرت کی اس ستم ظریفی کو دیکھیے کہ جواہر لعل اٹھے تھے سوشلزم کی تبلیغ کو، سرمایہ داری کو مٹانے کو اور بنے جا رہے ہیں دھڑا دھڑ رائلٹی سے خود بھی سرمایہ دار!

آپ بیتی کسی کی بھی ہو، بہرحال جی لگنے والی ہوتی ہے اور پھر یہ تو ایک مشاق صاحب قلم کے قلم سے ہے، دلکش کیوں نہ ہوتی؟ ضخامت چھ سو صفحہ سے اوپر۔ اور وہ بھی اچھی بڑی تقطیع پر اور خاصی گنجان طباعت کے ساتھ۔ اس پر بھی آخر میں جی اکتا نہیں جاتا کہ اتنی طوالت کیوں کرتے چلے گئے، بلکہ کچھ جھنجھلا کر ہی رہتا ہے کہ ابھی کچھ اور لکھنا تھا ختم کیوں کر دیا۔ مصنف کا نقطۂ نگاہ ظاہر ہے کہ کانگریسی اور "اشتراکی" ہے اور اس نقطۂ نگاہ کو ظاہر ہے کہ آخر عمر کے محمد علیؒ سے ہمدردی ہو ہی کیا سکتی تھی۔ اور اس لیے محمد علی کے حالات و کمالات کی تلاش کے لیے کتاب کے اوراق کی الٹ پلٹ سودمند ہونے کی توقع ہی کب ہو سکتی تھی؟ پھر جواہر لعل کی اس کتاب کے اقتباسات، دوسرے لیڈروں کے ساتھ محمد علی سے متعلق، ہندوؤں کے انگریزی اخبارات اور پھر ان سے نقل ہو کر مسلمانوں کے اخبارات میں شائع بھی ہو چکے تھے...... توقع اگر پہلے کچھ تھوڑی بہت تھی بھی، تو ان اقتباسات نے اسے زندہ کب رہنے دیا تھا؟

....

لیکن جواہر لعل بہرحال جواہر لعل ہیں اور ان کی سرگزشت حیات، ان کی شخصیت کی آئینہ بردار۔ ہندو نامہ نگاروں کی پستیوں سے بالاتر۔ ممکن نہ تھا کہ محمد علی اپنی زندگی میں جواہر لعل کی نگاہ میں کچھ اور ہوتے، اور وفات کے بعد جواہر لعل کی کتاب میں کچھ اور ہو جاتے جواہر لعل "دین"

سے بے بہرہ سہی، ''دیانت'' سے تو نا آشنا نہیں۔ کسی کے وہ دشمن سہی لیکن شریف دشمن۔ محمد علی ان کی اس بزم کاغذی میں، ایک دو بار نہیں، بار بار آتے ہیں۔ اور رواداری میں نہیں دیر تک، جواہر لعل سے سابقہ اسی طرح رکھتے ہیں جس طرح واقعات کے عالم میں، گوشت پوست کی دنیا میں رکھتے تھے، کبھی ہنستے ہیں، کبھی ڈانٹتے ہیں، کبھی محض مل ملا کر چلے جاتے ہیں۔ ہم آپ، اپنی اپنی محفلوں میں محمد علی کو بار بار دیکھ چکے ہیں۔ اب ذرا دیکھیے جواہر لعل کی عینک سے وہ کیسے نظر آتے ہیں۔

محمد علی مسلمانوں کے لیڈر تو بہت مدت ہوئی ہو ہی چکے تھے۔ ''آل انڈیا'' لیڈر یعنی سارے ہندوستانیوں کے لیڈر کہنا چاہیے کہ تحریک خلافت کے وقت سے ہوئے۔ لیکن خود تحریک خلافت ہی کیا تھی؟ ایک دوسرا نام علی برادران کا، یا عام فہم و عام پسند لفظوں میں محمد علی شوکت علی کا 1919 ختم ہو رہا تھا۔ دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں کہ علی برادران پہلی قید فرنگ سے چھوٹے، اور چھوٹتے ہی دھاوا کر کے کانگریس کے اجلاس (امرتسر) میں پہنچے۔ آنا ان کا نہ تھا۔ ملک کی تاریخ میں انقلاب کا، سیاسیات کی سرزمین پر ایک بھونچال کا آنا تھا۔ سات کروڑ مسلمانوں کی قوم کا مسلمہ مسلک اس وقت تک سرکاری وقت سے ''وفاداری'' کا تھا۔ مشیت الٰہی میں وقت آیا کہ سیلاب کا بند اب ٹوٹے اور پانی کا ریلا پورے زور کے ساتھ آئے۔ محمد علیؒ کا پبلک تعارف جواہر لعل سے اسی موقع پر ہوتا ہے:

> ''امرتسر کانگریس پہلی گاندھی کانگریس تھی.....علی برادران نظر بندی سے ابھی ابھی رہا ہوئے تھے۔ معاً کانگریس میں آ شریک ہوئے۔ قومی تحریک میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی، ایک نئی روح دوڑ گئی۔ محمد علی چند ہی روز بعد، یورپ، وفد خلافت لے کر روانہ ہو گئے''۔ (ص 44 تا 45)

30 کے شروع میں شاید مارچ کا مہینہ تھا، الہ آباد میں مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ مسلم لیگ کے زیر اہتمام سید رضا علی صاحب کی کوٹھی پر ہوا یہ وہی سید رضا علی مراد آبادی ہیں جو آج آنریبل [1] اور سی آئی ای اور ''سر'' اور خدا جانے کیا کیا ہونے کے بعد افریقہ میں گورنر جنرل بہادر کے ایجنٹ ہیں، اس وقت الہ آباد میں وکیل اور زبردست ''مسلم لیگی'' تھے...... اتنا معرکۃ الآرا جلسہ اور محمد علی ہندوستان میں نہ موجود ہوں؟ شوکت علی غریب سے جو کچھ بن پڑا، کیا۔ لیکن محمد علی کی بات کوئی کہاں سے لاتا۔ جواہر لعل اس ''خلا'' کا صرف ذکر کر کے گزر جاتے ہیں۔ (ص 46)

---

1. یعنی وسط 1936 میں

21 کا زمانہ بھی حکومت ہند کے لیے عجب پریشانی کا زمانہ تھا۔ اور پریشانی کیوں، سراسیمگی کہیے۔ وائسرائے بہادر سے لے کر ہر ہر ضلع کے بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب کے ہاتھ پیر پھولے ہوئے۔ بچوں کی سیٹی پر دشمنی کے بگل کا گمان، بوڑھوں کی کھنکار پر '' کانگریس کی جے'' کا اشتباہ! اتفاق کی بات کہ 10 مئی کو موتی لعل جی کی صاحبزادی کی شادی کی تاریخ قرار پائی۔ کسی نے اڑادی کہ 1857 کا مشہور و معروف ہنگامہ (غدر) بھی اسی تاریخ کو تو میرٹھ سے شروع ہوا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ صاحب بہادروں کی جیبوں میں پستول، بڑے بڑے پرانے خیر خواہ اور بیرے، خانساماں، سب مشتبہ۔ قلعہ میں تیاریاں کہ شاید شہر کی گوری آبادی کو پناہ یہیں لینی پڑے۔ پولیس، فوج سب لیس۔

یہ طول طویل داستان تو چھوڑیے، مضمون سے اس کا تعلق بس اس قدر رہے کہ جشن شادی کی اس '' وحشت ناک'' تاریخ میں مدعو، گاندھی جی کے ساتھ محمد علی شوکت علی بھی تھے۔ (ص 71)

دہشت، صرف گورنمنٹ ہی پر طاری نہ تھی۔ اس میں مبتلا خود جواہر لعل جی بھی تھے۔ ادھر ڈر یہ سمایا ہوا کہ یہ قانون سرکار کی خلاف ورزی اور توہین کس بے جگری سے بڑھتی چلی جاری ہے۔ ادھر دھڑکا یہ لگا ہوا کہ یہ تحریک خلافت کی روز افزوں ترقی کے ساتھ جذبۂ مذہبیت کو بھی ترقی کیسی ہوتی جارہی ہے! بیرسٹر تصدق شیروانی کے چہرے پر داڑھی، بیرسٹر مجید خواجہ کے چہرے پر داڑھی! اور سب سے بڑھ کر خوفناک وجود علی برادران کا!

''علی برادران خود ہی مذہبی خیال کے تھے، اور اس آگ کو ہوا دیتے رہے''۔ (ص72)

سال کی آخری سہ ماہی تھی کہ کراچی کا مشہور مقدمہ چلا، اور علی برادران کو دو دو سال کی سزائیں ملیں۔ ہند جدید کا یہ روزنامچہ اس اندراج سے خالی رہ نہیں سکتا تھا:

''علی برادران کو طویل سزائیں اس جرم میں ملیں کہ انھوں نے فوج میں بغاوت پھیلانی چاہی۔ جن الفاظ کی بنا پر ان پر مقدمہ چلا، ہندوستان کے سیکڑوں جلسوں میں ہزار ہا اشخاص نے ان ہی کو دوہرایا''۔ (ص78)

آج کے ہز مجسٹی ایڈورڈ[1] ہشتم، 22ء21 میں شہزادہ ویلز تھے، اور ہندستان کے دوروں کو

---

[1] جو معابعد تخت و تاج سے دستبردار ہو کر محض ڈیوک آف ونڈسر رہ گئے۔

تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ گورنمنٹ کی بے بسی حدکمال کو پہنچ چکی تھی۔ فکر اس کی ہوئی کہ ''باغیوں'' سے کچھ تو صلح کی طرح ڈالی جائے۔ ایسا ہوا کہ شہزادہ کے ورود کلکتہ کے وقت ساری نیک نامی، بدنامی میں تبدیل ہو کر رہے۔ خیال آیا اور سلسلۂ جنبانی شروع ہوئی۔ مشہور لیڈر سی۔آر۔داس جیل میں تھے۔ نظر ان ہی پر پڑگئی کہ گاندھی جی کو ہموار اگر کوئی کرسکتا ہے تو وہی ہیں۔ رائے یہ قرار پائی کہ ایک مختصری کانفرنس، حکومت اور کانگریس کے درمیان ہو۔ اب سوال یہ پیش ہوا کہ اس میں شریک کون کون ہو؟ گاندھی جی نے کہا اسیر کراچی، محمد علی کی شرکت تو بہر حال ضروری ہے۔ جواب ملا کہ یہ تو بہر حال ناممکن ہے اور لیجیے، اسی پر معاملہ ختم!

''تجویز غالباً اس لیے گرگئی کہ گاندھی جی کا اصرار تھا کہ مولانا محمد علی، جو اس وقت کراچی جیل میں تھے، ضرور اس کانفرنس میں شریک ہوں۔ گورنمنٹ نے اسے نہ مانا''۔ (ص87)

خود جوہر کا ایک شعر ہے۔

ہیں یوں تو فدا ابر سیہ پر سبھی میکش
پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لیے ہے

گورنمنٹ کی اس ضد کے عالم آشکارا ہو جانے کے بعد کہ صلح کی گفتگو اس سے ہوسکتی ہے، گاندھی جی سے ہوسکتی ہے لیکن نہیں ہوسکتی تو ایک محمد علی سے، جوہر کی نظم اور جواہر کی نثر میں کس غضب کا توارد ہو کر رہتا ہے!

21 میں ہندوستان کے جیل خانوں کی بارکیں جو سیاسی لیڈروں سے دھڑا دھڑ بھرنی شروع ہوئیں تو اکثر لیڈروں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔ لیکن محمد علی اس باب میں آزمودہ کار تھے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں، 14 میں، مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح طویل نظر بندی اور جیل سے مشرف ہوچکے تھے (ص90) یاد ان کی ہر موقع پر آتی ہے، خاص طور پر وہ اس وقت یاد آئے جب خود کانگریس والوں کے سامنے کونسل کے قطعی مقاطعہ کا فرمان نافذ ہوا تو ایک نہیں کئی آوازیں اس رائے کی مخالف تھیں۔ ان لوگوں کے سامنے آئرلینڈ کی ''سن فین'' تحریک کی مثال تھی یعنی کونسلوں پر قبضہ تو کرلیا جائے لیکن ان میں جاکر کام نہ کیا جائے۔ جواہر لعل کی بھی یہی رائے تھی:

''محمد علی اس وقت بسلسلۂ وفد خلافت، یورپ میں تھے، جب واپس آئے تو کامل مقاطعہ کی رائے

---

1 یہ ہولناک پیش گوئی ''اس صورت میں تو نہیں لیکن 48 میں گاندھی جی کے قتل کی صورت میں بہر حال پوری ہو کر رہی (52)۔

سے اختلاف ظاہر کیا۔ وہ اسی ''سن فین' طریقہ کو پسند کرنے والے تھے''۔(ص99)

تذکرہ جو ہر اس طرح ضمناً وتبعاً تو اس جواہر نامہ میں بہت جگہ آ گیا، مفصل اور مستقل تذکرہ اس موقع پر ہے جب محمد علی کانگریس کے صدر ہیں، اور جواہر لعل کانگریس کے سکریٹری۔ اتفاق واختلاف، قرب وبعد کے منظر، تفصیل سے یہیں دیکھنے میں آتے ہیں:

''23 کا دسمبر تھا کہ کانگریس کا سالانہ اجلاس کوکناڈا (علاقۂ مدراس) میں منعقد ہوا۔ صدر مولانا محمد علی تھے اور اپنے حسب معمول خطبۂ صدارت بڑا ہی لمبا چوڑا پڑھا۔ لیکن اس طوالت کے باوجود تھا وہ دلچسپ ہی۔ مسلمانوں کا سیاسی اور فرقہ وارانہ نظارہ دکھا کر بتایا یہ تھا کہ وائسرائے کے پاس 1908 میں جو مسلمانوں کا وفد سر آغا خاں کی قیادت میں گیا تھا اور جس کے مطالبہ پر انتخاب جداگانہ کا سرکاری اعلان ہوا، وہ وفد خود سرکار ہی کی طلب پر مرتب ہوا تھا، اور سوال وجواب سرکاری ہی تھے۔

میں انکار کرتا رہا لیکن محمد علی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ان کے زمانۂ صدارت بھر کے لیے کانگریس کا جنرل سکریٹری ہو جاؤں۔ آئندہ کی روش جب تک صفائی سے پیش نظر نہ ہو، میں عہدہ قبول کرنے سے گریز کر رہا تھا، لیکن محمد علی کے اصرار پر غالب نہیں آ سکتا تھا۔ اور یہ اپنی جگہ پر ہم دونوں کو محسوس ہو گیا تھا کہ میرے سوا کوئی اور سکریٹری، صدر صاحب کے ساتھ پوری طرح نباہ کر بھی نہیں سکتا۔ محمد علی کی محبت بھی غضب کی تھی اور غصہ بھی غضب کا۔ اور میری خوش قسمتی تھی کہ میرا شمار محمد علی کے محبوبوں میں تھا۔ محبت باہمی اور ہم خیالی کا رشتہ ہم دونوں کو جوڑے ہوئے تھا۔ ان کی مذہبیت بے پناہ تھی اور میرے خیال میں حدود عقل وعلم سے متجاوز۔ اور میں مذہب سے کورا۔ لیکن میری کشش کی چیز تھی ان کی اخلاص مندی، ان کی زبردست قوت عمل اور ان کی طباعی وذہانت۔ وہ بڑے ظریف تھے لیکن ان کے چبھتے ہوئے فقرے دلآزاری کی حد تک پہنچ جاتے تھے، اور ان کے کتنے دوست ان سے اسی وجہ سے روٹھ روٹھ گئے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی فقرہ انھیں سوجھ جائے اور زبان تک آئے بغیر دل ہی میں رہ جائے، پھر نتیجے جو کچھ بھی ہوں ہوا کریں''۔(ص117)

محمد علی کی جو صورت ہماری آپ کی جانی پہچانی ہوئی تھی اس سے یہ تصویر کچھ ایسی بہت مختلف تو نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مصور جہاں کیمرہ لیے کھڑا ہے، اس کی دھوپ چھاؤں کا کچھ اثر

تو تصویر کے رنگ پر بہرحال پڑے گا۔

''پورے سال بھر نباہ خوب ہوتا رہا، گو چھوٹے چھوٹے اختلافات بھی بہت پیش آتے رہے، میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں آتے ہی یہ قاعدہ چلایا کہ سب ممبروں کو صرف سادہ نام ہی لکھا جائے باقی تعظیمی القاب القط ہی کر دیے جائیں۔ ہندوستان میں یہ القاب ہیں بھی کیسے بے گنتی، مہاتما اور مولانا، اور پنڈت اور شیخ اور سید اور منشی اور مولوی اور ان پر تازہ اضافہ شریمت اور شری کا! اور انگریزی کے مسٹر اور اسکوائر تو موجود ہی تھے۔ اور پھر ان کا استعمال اس قدر اسراف کے ساتھ اور اس قدر کثرت کے ساتھ تھا کہ میں نے چاہا کہ ایک سنہ قائم کر دوں لیکن میری چلنے نہ پائی۔ محمد علی نے واسطے دلا دلا کر، تار پر، بحیثیت صدر مجھے حکم دیا کہ ابھی پرانا دستور قائم رکھا جائے، اور خصوصاً گاندھی جی کو تو ضرور مہاتما رہنے دیا جائے''۔ (ص 117)

اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ محمد علی کو حفظ مراتب کس درجہ عزیز تھا۔ لیکن خیر، یہ ایک معمولی سی بات تھی۔ اہمیت کی اصل شے اب ملاحظہ ہو:

''جس موضوع پر ہمارے آپس میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی، وہ خدا تھا۔ محمد علی کو عجیب وغریب ملکہ حاصل تھا کہ خدا کا ذکر وہ کانگریس کے ریزولیشنوں تک میں لے آتے تھے؟ کہیں یہ کہ خدا کا شکر ادا کیا جائے، کہیں یہ کہ خدا سے دعا کی جائے! میں ہمیشہ مخالفت کرتا اور اس وقت محمد علی میرے الحاد پر برس پڑتے! لیکن یہ بات بھی عجیب تھی کہ اس کے بعد وہ مجھ سے یہ کہا کرتے کہ زبان سے تم کچھ بھی کہو یا ظاہری عمل سے جو کچھ بھی دکھاؤ، اپنے باطن میں تم مذہبی شخص ہو ضرور۔ میں نے خود بارہا غور کیا کہ ان کا یہ مقولہ کہاں تک صحیح تھا لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں مذہب اور مذہبی کے معنی ہی بہت کچھ مختلف ہیں''۔

محمد علی کے جوش مذہبی کے نظارے ہم آپ تو بہت سے دیکھ چکے ہیں لیکن جواہر لعل کی یہ شہادت، خود منکر اور بیگانۂ دین ہو کر، کسی دوسری شہادت سے کچھ کم وزن رکھتی ہے؟...... عجب نہیں کہ حشر میں بھی ایک دستاویز محمد علی کے حق میں، اور سینکڑوں ہزاروں تحریروں سے بڑھ کر قیمتی نکل آئے اور عقل وفرزانگی کی اسی ایک شہادت کے گزر جانے کے بعد پھر محمد علی کی دیوانگی وشوریدگی کے لیے کسی اور بیان کی، کسی اور دلیل وبرہان کی ضرورت ہی نہ باقی رہ جائے!

''میں محمد علی سے مذہبی بحث ومباحثہ کرنے کو ٹال ہی جاتا تھا، اس لیے کہ میں خوب سمجھتا تھا کہ اس سے فریقین کو بس غصہ ہی آ آ کر رہے گا اور ممکن ہے انھیں میری کسی بات سے دکھ پہنچ جائے۔ مذہب کوئی سا بھی ہو، اس کے پختہ پیرووٴں سے مذہب کے موضوع پر گفتگو کرنا نازک۔ اور مسلمانوں سے مخاطبت میں تو یہ نزاکت اور بڑھ جاتی ہے اس لیے کہ انھیں تو دائرے سے باہر ہونے کی اجازت ہوتی نہیں، عقائد کے لحاظ سے ان کا سیدھا راستہ تو ایک ہی ہے جو تنگ بھی ہے اور مومن کو داہنے بائیں کسی طرف ذرا بھی ہٹنے کی اجازت نہیں۔ ہندووٴں کی حالت اس سے ذرا مختلف ہے گو ہمیشہ یہاں بھی نہیں''۔

جواہر لعل جی نے ابھی ایک ہلکی سی چوٹ محمد علی کی طوالت پسندی پر کی تھی لیکن یہ مذہب اور لا مذہبی اور ہندو ذہنیت پر ایک بھلا چنگا تبصرہ خود ہی کر ڈالا، جسے ہمارے موضوع سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ اب اس کے بعد سنیے:

''تو اس لیے میرے اور محمد علی کے درمیان مذہبی گفتگو نہیں آنے پاتی تھی لیکن بھلا وہ چپ رہنے والے کب تھے۔ کچھ ہی روز بعد (یہ شاید 1925 ہو یا شروع 1926) ان کے لیے ضبط کرنا ناممکن ہو گیا۔ ایک دن وہ اہل ہی تو پڑے دہلی میں ان کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ انھوں نے گھیر گھار کر مذہب کے موضوع پر مجھے لانا چاہا۔ میں ٹالنا چاہا اور عرض کیا کہ ہمارے نقطۂ خیال اتنے مختلف ہیں، اور ایک دوسرے کو قائل کرنا مشکل ہی ہے، لیکن وہ بھلا کب ٹالے بالے میں آنے والے تھے۔ بولے 'صاف صاف کہہ ڈالو تمھارے خیال میں مذہب کے معاملہ میں کچھ دیوانہ سا ہوں، تو آج اسی کو خوب اچھی طرح صاف کر لو'۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ ''میں نے مذہب کا مطالعہ کیا ہے اور مطالعہ بھی عمیق و وسیع۔ ادھر دیکھو۔ وہ سامنے الماریاں جو کتابوں سے بھری ہیں وہ مذہب ہی سے متعلق ہیں، خصوصاً اسلام اور مسیحیت سے متعلق اور ان میں جدید ترین کتابیں بھی ہیں، مثلاً ویلز کی God: the invisible king۔ پھر دوران جنگ میں طویل نظر بندی کی جو مہلت ملی، یہ وقت میں نے قرآن مجید کے مطالعہ میں صرف کیا اور تفسیر اور ترجمے دیکھے۔ اور اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ قرآن میں جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں 97 فیصدی تو ایسی ہیں جو بالکل عقل میں آ جاتی ہیں۔ اب رہیں 3 فیصدی عقل بشری سے ماوراامور سے متعلق

ہیں، سو ظاہر ہے کہ جس کی 97 فیصدی باتیں بالکل دلنشین ہوگئیں، اس کی بقیہ 3 فیصدی پر ایمان لانے سے کون سا امر مانع ہوسکتا ہے''؟

''یہ استدلال تو کچھ ایسا قوی نہ تھا، لیکن بحث و مباحثہ سے بہر حال میں بچنا چاہتا تھا۔ میرے لیے حیرت کی چیز وہ نہیں جو میں نے اب تک کہی بلکہ وہ ہے جواب کہنا چاہتا ہوں۔ یعنی اس کے بعد محمد علی نے کہا کہ ''قرآن جو کوئی بھی انصاف اور بے تعصبی سے پڑھے گا وہ اس پر ایمان لے آئے گا۔ اور یہ میرے علم میں ہے کہ گاندھی جی اسے خوب پڑھ چکے ہیں، اس لیے دل ہی دل میں اسلام کی صداقت کے تو لامحالہ قائل ہوگئے ہوں گے، کبر نفس کی بنا پر اس کا اعلان نہ کریں تو اور بات ہے''۔ (ص118 تا 119)

جواہر لعل کا قلم جزدیات میں یقیناً کہیں کہیں بہک گیا ہے لیکن کلی اور اصولی حیثیت سے محمد علی کی ذہنیت کا جو نقشہ دکھا دیا ہے، وہ بالکل نقل مطابق اصل ہے...... دنیا میں کون، بجز محمد علی کے ایسا سر پھرا تھا کہ دوسروں سے اس طرح لپٹ لپٹ کر تبلیغ کیے جاتا! مخاطب ہیں کہ سننے سے جی چرا رہے ہیں، پہلو بدل رہے ہیں اور وہ ہیں کہ اپنی دھن میں مست، سناتے چلے جاتے ہیں! ......دنیا ایسوں کو خرد باختہ دیوانہ نہیں تو اور کیا عاقل و فرزانہ کہے گی؟

اس کے بعد تذکرہ کا رخ خالص سیاسی ہے۔

''سال صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے ہٹتے گئے، یا ان ہی کی زبان کے تتبع میں کانگریس ان سے ہٹتی گئی۔ رفتار اختلاف بہت ہی تدریجی رہی، یعنی اس مدت میں یعنی کئی سال تک محمد علی کانگریس میں اور آل انڈیا کانگریس کے جلسوں میں نہ صرف برابر شریک ہوتے رہے بلکہ سرگرم حصہ بھی لیتے رہے۔ لیکن دوری اور بیگانگی بہر صورت بڑھتی ہی گئی۔ اس صورت حال کی ذمہ داری فلاں فرد یا فلاں فلاں افراد پر ڈالنی تو شاید صحیح نہ ہو اس لیے کہ واقعات ملک کی رفتار ہی نے اس نتیجہ کو ناگزیر بنا رکھا تھا تاہم یہ نتیجہ افسوسناک ضرور تھا کہ جس نے ہم میں سے بہتوں کے دل کو دکھ پہنچایا۔ اس لیے کہ اختلافات، فرقہ وارانہ مسئلہ پر جو کچھ بھی ممکن ہو لیکن سیاسی مسئلہ میں تو کوئی اختلاف نہ تھا۔ محمد علی آزادئ ہند کے دلدادہ تھے اور جب یہ سیاسی مطمح نظر مشترک تھا تو پھر فرقہ وارانہ مسئلہ میں بھی ہمیشہ ان سے سمجھوتا کی گنجائش تھی۔ محمد علی کو ان رجعت پسندوں سے کوئی نسبت ہی نہ تھی جو فرقہ وارانہ مسائل کے علمبردار بنے گھوم رہے ہیں''۔ (ص119 تا 120)

تقدیر نے ذرا یاوری کی ہوتی تو حالات کیا سے کیا ہو گئے ہوتے! مشہور و معروف نہرو رپورٹ ستمبر 28 میں نکلی۔ محمد علی بیمار و زار، ذیابیطس کے شکار، کئی مہینہ قبل یورپ علاج کے لیے جا چکے تھے۔

''ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ محمد علی 28 کے موسم گرما میں یورپ جا چکے تھے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کی اس وقت ایک زبردست کوشش ہوئی اور کامیابی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ کاش محمد علی اس وقت ہوتے۔ بہت ممکن تھا کہ نتائج دوسرے نکلتے۔ لیکن جب تک وہ واپس آئیں، معاملات بہت دور تک پہنچ چکے تھے۔ اور حالات ناگزیر نے انھیں دوسرے فریق میں لا کھڑا کیا''۔ (ص 120)

یہ ذکر آج ملک کی آزادیٔ کامل کے سب سے بڑے علمبردار اسی محمد علی کا ہو رہا ہے جو 30 میں خود اپنے بہت سے بھائی بندوں کی زبان میں ''ٹوڈی'' تھا ''غدار'' تھا ''قوم فروش'' تھا، طلب جاہ کا پتلا اور نمائش کا متوالا تھا!

''دو سال بعد 1930 میں جب جیل بھرنے لگے اور قانون شکنی کی زبردست تحریک پھر شروع ہوئی، محمد علی نے کانگریس کے فیصلہ کی خلاف ورزی کی اور گول میز کانفرنس میں شریک ہو گئے۔ مجھے ان کی شرکت سے دکھ پہنچا۔ میرے خیال میں وہ خود بھی اس سے خوش نہ تھے چنانچہ لندن میں انھوں نے جو کچھ کیا، اس سے صاف یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے لیے اصل جگہ ہندوستان کا میدان جنگ ہے نہ کہ لندن کانفرنس کا بے ثمر کمرہ! اگر مقدر میں ان کا ہندوستان واپس آنا ہوتا تو مجھے اپنی جگہ پر یقین ہے کہ وہ دوبارہ شریک جنگ ہو کر رہتے۔ جسمانی حیثیت سے ان کی حالت یاس کو پہنچ چکی تھی اور سالہا سال سے مرض کا تسلط ان پر جمتا چلا آ رہا تھا۔ لندن جب پہنچے تو ضرورت انھیں آرام و سکون کی تھی، برعکس اس کے انھیں دھن اس کی سوار رہی کہ واقعی کوئی کارنامہ اپنے شایان شان انجام دے ڈالیں۔ بس اسی نے انھیں اور جلد ختم کر ڈالا۔ نینی جیل میں ان کی خبر وفات پا کر میں دھک سے رہ گیا''۔ (ص 120)

آخری وقت کا منظر آپ دیکھ چکے، تو اب اس زندگی میں آخری ملاقات کا نظارہ بھی کرتے چلیے۔ وہ بھی کچھ کم اثر انگیز نہیں:

''میری آخری ملاقات محمد علی سے دسمبر 29 میں لاہور کانگریس میں ہوئی تھی۔ میرے

خطبۂ صدارت کے بعض حصے انھیں ناپسند ہوئے تھے اور ان پر وہ شدت سے نکتہ چینی کرتے رہے۔ وہ محسوس کررہے تھے کہ کانگریس آگے بڑھتی جارہی ہے اور سیاسی اقدامات میں پیش پیش ہورہی ہے اقدامات میں وہ خود سب سے پیش پیش رہنے والے تھے اس لیے قدرتاً یہ دیکھ دیکھ کر بے چین ہورہے تھے کہ انھیں پیچھے رہ جانا پڑے اور دوسرے آگے نکلتے چلے جائیں۔ مجھے انھیں نے خاص طور پر نصیحت فرمائی کہ "دیکھو جواہر لعل! تمھیں متنبہ کیے دیتا ہوں کہ یہ جو آج تمھارے ساتھی بنے ہوئے ہیں، تمھارا ساتھ نہیں دینے کے۔ وقت پڑنے پر سب تم سے غداری کرجائیں گے۔ تمھیں پھانسی پر چڑھانے والے تمھارے یہی کانگریسی ہوں گے......ایک ہولناک پیشین گوئی!" (120)

تین چار صفحے کا مفصل تذکرہ یہی تھا......لفظی ترجمہ کی سعی کسی ایک مقام 1 پر بھی نہیں کی گئی ہے۔ کوشش صرف یہی رہی ہے کہ جواہر لعل اگر اردو میں لکھتے تو اس مفہوم کو کیوں کر ادا کرتے...... اس مستقل تذکرہ اور ابتدا کے ضمنی تذکروں کے علاوہ دو جگہ ذکر اور ہے۔ ہندو مسلم نزاعات اور "فرقہ وارانہ" کشمکش کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"صدی کی دوسری دہائی کے وسط میں بارہا کوششیں اس کی ہوئیں کہ گفت وشنود، بحث ومباحثہ کے ذریعہ سے کوئی صورت مفاہمت کی پیدا ہو۔ ان جلسوں کا نام اتحاد کانفرنس ہوا کرتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ معرکۃ الآرا کانفرنس وہ تھی جو 1924 میں مولانا محمد علی صدر کانگریس کی دعوت پر دہلی میں ہوئی تھی، اس وقت جب کہ گاندھی اپنا اکیس دن کا مشہور برت رکھے ہوئے تھے"۔ (ص139)

مسلمانوں میں احساس قومی وتحریک وطنی کے ارتقا کے سلسلہ میں لکھتے ہیں، اور یہ زمانہ 1914 کا ہے کہ:

"مسلمانوں کے طبقۂ اعلیٰ کا جو رجحان اب وطنیت کی جانب ناگزیر ہو چکا تھا، اسے نہ گورنمنٹ روک سکتی تھی نہ آغا خاں، جنگ عظیم نے اس تحریک کی رفتار تیز کردی اور ادھر نئے نئے لیڈر پیدا

---

1 "یہ ہولناک پیشین گوئی" اس صورت میں تو نہیں لیکن 48 میں گاندھی جی کے قتل کی صورت میں بہرحال پوری ہوکر رہی (52)

ہوتے گئے ادھر آغا خاں ہٹتے گئے۔ علی گڑھ کالج تک کو اپنا رنگ بدلنا پڑا اور نئے لیڈروں میں سب سے زیادہ زبردست طاقت والے علی برادران ہی تھے جو دونوں کے دونوں علی گڑھی تھے"۔(ص466)

غرض اسی طرح محمد علیؒ کی قوت کا، شخصیت کا، جوش کا، اخلاص مندی کا، مذہب پرستی کا اعتراف جواہر لعل کے حقیقت نگار قلم سے، موجود ہے، اتنی وضاحت وصراحت اور اتنی تکرار وتواتر کے ساتھ کہ اس سے زیادہ کی توقع کسی طرح بھی نہیں قائم کی جاسکتی تھی۔ جواہر لعل آخر اپنی ہی سرگزشت لکھ رہے تھے کہ کوئی "مناقب محمد علی" لکھنے تو بیٹھے نہ تھے...... ہندو اخبارات نے کتاب کے جو اقتباسات شائع کیے تھے، ان میں اور اصل کتاب میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ عوام کی زبان پر چڑھا ہوا ایک مصرع ہے:

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

دنیائے اسلام کے "گوہر" نہ سہی "جوہر" کی قدر "جوہری" نہ سہی "جواہر" کے ہاں تو پوری طرح موجود ہے!

......☆☆☆......

ضمیمہ:8

محمد علی اور تحریک ہجرت[1]

(جس زمانہ میں ''سچ'' کی اشاعت ملتوی تھی اور ''صدق'' ابھی جاری ہوا نہ تھا[2]، سرتھیوڈر ماریسن کے ایک مضمون پر ذیل کا مراسلہ روزنامہ ملت (دہلی) میں شائع کرنا پڑا تھا۔ کوئی افسانہ کیسا ہی فرضی ہو، جب بار بار دہرایا جاتا ہے تو خلقت کی نگاہ میں ایک مسلم تاریخی حقیقت بن جاتا ہے۔ حال میں ایک اسلامی معاصر کے کالموں میں پھر اسی افسانہ کی بازگشت نظر پڑی، اس لیے مراسلہ مذکور خفیف لفظی تغیر کے بعد ''صدق'' میں شائع کیا جا رہا ہے)

ایڈیٹر صاحب ملت۔ السلام علیکم

آپ کے روزنامہ میں سرتھیوڈر ماریسن کے ایک مبسوط مضمون کا ترجمہ مسلسل نکل رہا ہے، ماریسن صاحب مدتوں علی گڑھ میں مسلمانوں کے ملازم رہ چکے ہیں اور مسلمانوں کے ہمدرد مشہور ہیں۔ لیکن اسلامی سیاسیات پر ان کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے حسب توقع خالص برطانوی امپیریلزم کے نقطۂ نظر کی ترجمانی ہے۔

سارے مضمون کے مغالطوں اور غلط بیانیوں کی مفصل تردید کی نہ حاجت نہ مہلت۔ اس وقت صرف ایک مسئلہ کو تمثیلاً پیش کرنا ہے اور وہ بھی مختصر لفظوں میں۔ 9 مارچ کے پرچہ میں

---

1 صدق کیم دسمبر 1936 2 یعنی شروع جنوری 34 سے لے کر آخر اپریل 35 کا زمانہ

سر موف فرماتے ہیں:

''مولانا محمد علی مرحوم، انگلستان ایک وفد لے کر آئے اور انھوں نے مسٹر ایچ اے ایل فشر کے سامنے جو وزیر ہند کی نیابت کر رہے تھے، یہ تشریح کی ...... مگر مولانا محمد علی کو خالی ہاتھ ہندوستان واپس آنا پڑا اور وہاں سے واپسی پر انھوں نے اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی نے اپنے ہم مذہبوں کو یہ تلقین شروع کر دی کہ حکومت نے اسلامی شریعت کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالا ہے، اور اس لیے ہندوستان اب دارالحرب ہے، اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر ایسے ممالک میں ہجرت کر جائیں جہاں اسلام کی حرمت و عزت اب تک قائم ہے۔ اس آواز پر لبیک کہنے میں ہزاروں سیدھے سادھے مسلمان تحریک ہجرت میں شریک ہو گئے''۔

اس کے آگے ان بدنصیب مہاجرین کے مصائب کی تفصیل ہے اور پشاور اور کابل کے درمیان بوڑھوں اور بچوں اور عورتوں کی قبریں بن جانے کا دردناک تذکرہ ہے۔ گویا علی برادران کی سیاہ فرد جرائم کا ایک اہم عنوان یہ بھی ہے کہ انھوں نے بے سمجھے بوجھے ہزارہا مسلمانوں کو بے خانماں اور طرح طرح کے ناقابل بیان شدائد میں مبتلا کرا دیا!

یہ الزام حکومت کے ایجنٹوں کی زبان پر پہلی بار نہیں آیا ہے۔ لندن یونیورسٹی کے ایک نامور ''مستشرق'' پروفیسر گب ہیں۔ آپ نے ''ماہرین فن'' کے قلم کا ایک مجموعۂ مضامین ''وِدَر اسلام'' (Whither Islam) کے نام سے سال دو سال ادھر شائع فرمایا ہے، اس کے صفحات میں بھی یہی مضمون شد و مد سے دہرایا گیا ہے۔ گو علی برادران کے نام کی تصریح نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ 20 کی تحریک ہجرت کے سلسلہ میں جو کچھ بھی بے عنوانیاں پیش آئیں ان کی ذمہ داری علی برادران خصوصاً مولانا محمد علی پر ڈال دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سر مائیکل اوڈائر کے معروف و معلوم مظالم پنجاب کے سر تھیوڈر ماریسن سے منسوب کر دیا جائے۔ ماریسن صاحب تو تاریخ کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور ان کی تاریخ دانی مشہور ہے۔ کیا انھیں یاد نہیں رہا کہ ہجرت کا زور تو 20 میں جون، جولائی اور اگست کے مہینوں میں رہا۔ جب محمد علی غریب، تحریک کی رہنمائی کرنا الگ رہا، ہندوستان سے اور اپنے وطن سے ہزارہا میل دور عین سر ماریسن کے وطن میں موجود اور اپنے نہیں ان کے ہم وطنوں کے سامنے تبلیغ حق کا فریضہ ادا کر رہا تھا!...... ہندوستان کی سرزمین

کوتو وہ مہینوں قبل غالباً فروری میں چھوڑ چکا تھا!

محمد علی کی ذات الگ رہی، محمد علی جس کمیٹی کے روح رواں تھے یعنی مرکزی خلافت کمیٹی، خود اس کا بھی کوئی تعلق، تحریک ہجرت سے، اگست 20 تک مطلق نہ تھا اور تحریک تمام تر دوسرے ہاتھوں میں رہی! سرکاری سالنامہ ''انڈیا20 میں'' بہت کچھ جھوٹ کے باوجود اتنا تو بھی تحریر ہے کہ تحریک ہجرت کا آغاز صوبہ سندھ سے ہوا اور تحریک صوبہ سرحد میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ''مقامی ملاؤں کے اثر سے'' پھیلی۔ (ص52 کتاب مذکور)

بے خانماں مہاجرین کے جوش ہمدردی میں کاش سر مارلین کو برطانوی شرافت کا وہ یادگار واقعہ یاد آجاتا جو مہذب و شائستہ گورے سپاہیوں کے ہاتھوں کیا گڑھی ریلوے اسٹیشن پر پیش آیا تھا! ایک بدمست گورا، شراب کے نشہ میں (اور شاید حکومت کے نشہ میں بھی) جھومتا ہوا زنانہ درجہ میں گھسا، اسے دیکھ کر ایک غریب مہاجر حبیب اللہ عورتوں کی عزت و آبرو بچانے کو آگے بڑھا اور اسی جرم کی پاداش میں وہیں کھلے خزانے ''دلیر و شجاع'' فوجی گوروں کی ایک پوری جماعت کے ہاتھ سے شہید ہو کر رہا...... جن حضرات کے پاس ینگ انڈیا بابت 1920 کی فائل موجود ہو وہ جولائی اور اگست کے پرچوں میں خود گاندھی جی کی تحریریں اسی موضوع پر نیز چشم دید گواہوں کی باضابطہ شہادتیں ملاحظہ فرمالیں۔

مرکزی خلافت کمیٹی نے تحریک ہجرت کا کام اپنے ہاتھ میں لینا، 10 اگست کے جلسہ میں منظور کیا۔ کارروائی پوری باقاعدگی اور نظم کے ساتھ کرنے کو مولانا شوکت علی نے سب سے پہلے سفیر افغانستان متعینہ دہلی سے معاملات طے کرنے ضروری خیال کیے۔ چنانچہ سفیر صاحب سے مراسلت 17 اگست کو شروع کی۔ 6,7 ہفتے گزر گئے اور محض ضابطہ کی مراسلت ہی ہوتی رہی، یہاں تک کہ تحریک ترک موالات، اپنی پوری تفصیل کے ساتھ بروئے کار آگئی، اور معاً خلافت کمیٹی، تحریک ہجرت نہیں بلکہ ترک موالات کی جانب انہماک، جوش و قوت کے ساتھ متوجہ ہوگئی...... مولانا محمد علی اس وقت تک بھی ہندوستان نہیں آئے تھے۔ وہ تو کہیں شروع اکتوبر میں ہندوستان پہنچے ہیں۔ اگست اور جولائی اور جون کے واقعات کا ہفتوں اور مہینوں پیشتر کے گزرے ہوئے واقعات کا ذمہ دار اس مرحوم کو قرار دینا، یورپ ہی کے ''مؤرخین محققین'' کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔

ضمیمہ:9

محمد علی: کیا خوب آدمی تھا

(ریڈیو اسٹیشن دہلی سے تقریر، 18 مارچ 1940 وقت 15: منٹ)

(ریڈیو ایک سرکاری محکمہ ہے، اس کی تقریروں میں، خیال رکھ لینا چاہیے کہ نہ سیاسیات پر کچھ کہا جا سکتا ہے اور نہ مذہب پر کھل کر گفتگو ہو سکتی ہے۔ محمد علیؒ پر بھی تقریر ان عام قواعد سے مستثنیٰ نہ تھی، احتیاط کے باوجود بعض الفاظ اور فقرے اصل تقریر کے وقت چھوڑ ہی دینے پڑے تھے)

نومبر کا مہینہ ہے اور شروع کی تاریخیں، سنہ انیس سو چھبیس (1926)، سہ پہر کے وقت کانپور اسٹیشن سے لکھنؤ میل چھوٹنے کو ہے کہ دو شخص ندوہ کے سالانہ اجلاس سے موٹر پر بھاگا بھاگ اسٹیشن پہنچتے ہیں، اور جھٹ پٹ ٹکٹ لے لوا، اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنٹیر وں کی مدد سے پھینک پھانک سیکنڈ کلاس کے ایک درجہ میں جا داخل ہوتے ہیں۔ دو انگریز بمبئی سے بیٹھے چلے آ رہے تھے۔ نو وارد دونوں کے دونوں ٹھیٹھ ہندوستانی۔ کھدر پوش، عبا پوش، داڑھی باز، ایک وجیہ و جامہ زیب، دوسرا کریہہ و بد قطع، صاحب بہادران نو واردوں کا کینڈا دیکھ کر کچھ ہنسے، کچھ مسکرائے۔ عجب نہیں جو یہ سمجھے ہوں کہ یہ بلا ٹکٹ گھس آئے ہیں۔ یا ریل کے "بابوشاہی" روزہ مرہ میں "ود آؤٹ" (Without) والے ہیں!

خوش قطع نو وارد نے اسی برتھ پر قبضہ جما لیا جس پر "صاحب" پہلے سے جمے ہوئے تھے۔

گاڑی چلی اور گنگا کا پل بات کہتے آ گیا۔ ادھر پہیوں سے گھڑ گھڑ کی آواز آئی ادھر صاحب بہادر ان دونوں دیسی آدمیوں کی طرف دیکھ چھیڑ کی ادا سے مسکرائے اور منہ بنا کر بولے "So this is mother Ganges" یہی گنگا مائی ہے طنز کا زور لفظ Mother پر تھا۔ پاس کا کھدر پوش معاً چائے کی پیالی منہ سے ہٹا، انگریزی زبان میں ٹھیک انگریز کے لب ولہجہ میں بولا ''اچھا! تو آپ کا دریا سے یہ رشتہ ہے؟ مرد آدمی یہ دریا کو مائی اور موسی، اماں اور خالہ کہنا کیا معنی؟'' ''صاحب'' یہ تڑاق سا جواب پا، سناٹے میں آ گئے...... یہ تڑ پڑ جواب دینے والا محمد علی اور اس کا ساتھی کہیے یا ''تابع مہمل'' آپ کا یہ خادم!

صاحب بیچارہ کو یہی گمان تھا کہ یہ چہرہ پر داڑھی اور سر پر پٹے رکھائے ہوئے اور جسم پر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے ہندوستانی کچھ بھی انگریزی جانتا ہوگا، چہ جائیکہ انگریزی میں جواب دے سکے۔ اور پھر وہ بھی ایسی شستہ و برجستہ! کچھ دیر غوطہ میں رہے، پھر ادھر سے منہ پھیر کر گفتگو اپنے پرانے اور ہم جنس رفیق سفر سے کرنے لگے۔ اتفاق سے موضوع گفتگو تھا کرکٹ۔ ولایت کی مشہور ٹیم ایم سی سی، نئی نئی ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ دونوں صاحب بہادر لگے آپس میں یہ گفتگو کرنے کہ فلاں کھلاڑی ایسا ہے اور فلاں ویسا۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی محمد علی سے نہ رہا گیا۔ بول اٹھے ''دخل در معقولات معاف، آپ رائے زنی میں بڑی زیادتی کر رہے ہیں'' اور لگے تفصیل و تشریح کرنے کہ فلاں میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں یہ خرابی۔ ہوتے ہوتے تبصرہ نفس کرکٹ پر شروع ہو گیا اور بیان ہونے لگی گویا انگلستان کرکٹ کی پوری تاریخ۔ بولنے والا اب گفتگو کیوں کر رہا تھا، یوں کہیے کہ کسی انسائیکلو پیڈیا کا آرٹیکل کرکٹ پر سنا رہا تھا۔ صاحب بہادر فرط حیرت سے دم بخود کہ الٰہی یہ کس قیامت کا انسان ہے کہ شکل ملاؤں کی سی، اور ماہرانہ معلومات اور فنی تنقید میں کرکٹ بازوں کا استاد! آخر سنتے سنتے گھبرا کے ایک بار بولے آپ کو بڑی ہی معلومات کرکٹ سے متعلق ہیں!'' انھوں نے کہا ایسی معلومات ایک مجھی کو کیا، ہر علی گڑھ والے کو ہوتی ہیں''۔ وہ بولا ''اچھا تو آپ علی گڑھ کے پڑھے ہیں، کپتان رہے ہوں گے''۔ بولے ''جی نہیں، کپتان تو بڑے بھائی (Big Brother) تھے''۔ یہ شوکت صاحب کے لیے Big Bother کی اصطلاح خود محمد علی کی چلائی ہوئی تھی اور سارا انگریزی پریس اس سے واقف ہو چکا تھا۔ صاحب

بہادر نے اپنے نزدیک گویا بڑی پہیلی بوجھی اور بول اٹھے "You talk like Muhammad Ali یہ تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں!" یہ بولے I am Muhammad Ali زبان کیسی، میں خود ہی محمد علی ہوں!

صاحب کی حیرت اب دیکھنے والی تھی۔ آنکھیں پھاڑے اور نظر اس کھدر پوش کے چہرے پر گڑائے ہوئے بولے Realy!one of the two Ali brothers کیا واقعی! وہی محمد علی، جو علی برادران میں سے ایک ہے! انھوں نے چمک کر جواب دیا yes, and the younger and more sharp tongued of the two جی ہاں وہی بھائی جو دونوں میں چھوٹا اور زبان کا زیادہ تیز ہے!" صاحب کو اب کی اپنی حیرت کو دور کرنے میں دیر سیکنڈوں کی نہیں منٹوں کی لگی، بے چین اور بے قرار، پہلو پر پہلو بدل رہے ہیں اور ٹکٹکی ہے کہ محمد علی کے چہرہ کی طرف لگی ہوئی۔ محمد علی نے جو یہ دیکھا تو صاحب بہادر کو اور گڑبڑانا شروع کر دیا۔ بولے "یہ میرا نام سن کر آخر اتنی گھبراہٹ کیوں؟ کیا یہ خیال تھا کہ علی برادران جہاں کہیں کسی انگریز کو دیکھ پاتے ہیں بس اس پر جھپٹ پڑتے ہیں؟ تو اطمینان رکھیے اطمینان، دیکھ لیجیے نہ (ہاتھ پھیلا کر) یہ میرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں۔ حملے و ملے کا تو خیال بھی دل میں نہ لائیے"۔ صاحب کے ہاتھ میں وقت کا مشہور انگریزی روزنامہ ٹائمنر آف انڈیا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے بڑھا کر "اچھا، ان الزامات کا کیا جواب ہے، جو یہ روز آپ پہ لگا تا رہتا ہے؟" محمد علی نے پرچہ کو چھوا تک نہیں بولے "اسے تو آپ ہی پڑھیے میں پرچہ کو نہیں، پرچہ نویس کو خوب پڑھ چکا ہوں۔ آکسفورڈ میں میرے زمانے میں تھا، مجھ سے پیچھے، آتا جاتا اس کو اس وقت بھی کچھ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ گلہ ہو اور گلہ بان نہ ہو تو نہ سہی، لیکن یہ عجب تماشا ہے کہ اس کا کوئی گلہ نہیں اور کہتا اپنے کو گلہ بان ہے!" یہ سارا لطیفہ تھا ایڈیٹر صاحب کے نام Mr. Sheppard پر! داستان خاصی طویل ہو گئی، ایک ہی قصہ کو کہاں تک نہ سنے جائیے گا۔ چھوڑیے یہیں اس قصہ ناتمام کو۔

....

1920 ہے۔ محمد علی، وفد خلافت لے کر یورپ گئے ہوئے ہیں، کوئی سننا نہیں چاہتا اور یہ ہیں کہ اپنی سنائے چلے جاتے ہیں۔ لندن میں ایک جلسہ میں تقریر کا موقع ڈھونڈھ نکالا۔ کن

مشکلوں سے اجازت پانچ منٹ کو ملی۔ کہنے کھڑے ہوئے کہ ''حضرات! یہ تو سن لیجیے کہ میں آرہا ہوں چھ ہزار میل کے فاصلہ سے اور ترجمانی مجھے کرنا ہے 30 کروڑ انسانوں کے خیالات کی، اب آپ خود ہی حساب لگا لیجیے کہ فی منٹ نہیں، فی سیکنڈ بھی نہیں، ہر سیکنڈ کی کسر میں کتنوں کے خیالات وجذبات آپ تک پہنچاؤں گا''۔ آوازیں آنے لگیں آپ کہے جائیے کہے جائیے اور ہر پانچ منٹ کے بعد پانچ ہی پانچ منٹ اور بڑھتے رہے یہاں تک کہ پورے بیس منٹ ہو گئے!

اس سفر میں لندن کا ایک اور منظر۔ مولانا مخالفین کے مجمع میں تقریر کر رہے ہیں کہ ''صلح کے وقت ہم استنبول کس طرح چھوڑ سکتے ہیں، تھریس اور سمرنا تو پھر غنیمت ہیں......لیکن استنبول سے ہماری تاریخ وابستہ ہے......'' یہیں تک پہنچے تھے کہ ایک گوشہ سے آواز آئی کہ ''یعنی یعنی؟ استنبول آخر کب سے آپ کے قبضہ میں ہے؟'' جواب میں دیر کیا تھی، کھٹ سے ارشاد ہوا کہ ''کوئی فاضل تاریخ مجھ سے سنہ دریافت کر رہے ہیں۔ اس وقت تو بس اتنا یاد ہے کہ جب سے آپ کے پاس ہندوستان ہے، اس کے تگنے زمانہ سے ہمارے پاس استنبول ہے!'' جلسہ لوٹ لوٹ گیا اور فاضل تاریخ کی آنکھیں پھر نہ اونچیں ہوئیں!

....

مہاراجہ الور جو ابھی کل تک زندہ تھے، ابھی تو بہت سے لوگ ان سے واقف ہوں گے۔ 28 میں ایک بار مہربان ہوئے، مولانا کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ انگریزی کے تو ماہر تھے ہی فارسی کا بھی اچھا مذاق رکھتے تھے۔ شاعر تھے، وحشی تخلص تھا۔ پہلی ملاقات میں اپنا دیوان مولانا کو پیش کیا تو اس پر یہ الفاظ لکھ دیے "To my Maulana from his Wahshi" اپنے مولانا کی خدمت میں ان کے وحشی کی طرف سے!'' یہاں کیا دیر تھی جیب سے جامعہ ملیہ کا نصاب اپنا تیار کیا ہوا نکالا، چٹ اس پر یہ سطر لکھ، سارا قرضہ، دم نقد چکا دیا "From a bogus Maulana to a real Maharaja" ایک نام کے مولانا کی طرف سے ایک کام کے مہاراجہ کی خدمت میں!''

لطائف وظرائف اس طرح کے کوئی دو چار، دس بیس ہوں تو کہے جائیں۔ یہاں تو اٹھتے

---

[1] صدق یکم دسمبر 1941

الگ رہا، کسی کو یاد ہی کب رہ سکتے ہیں؟ اور یاد کو بھی چھوڑ یے یہی کیوں کر ممکن تھا کہ کوئی سال کے ہر دن اور ہر دن کے چوبیس گھنٹے، ہمزاد بنا ساتھ ہی ساتھ لستا اور چپکا رہے؟ ہا! جس قبر میں قوم وملت کی بے شمار آرزوئیں اور ولولے مدفون ہیں وہیں آج ہزار ہا ہزار ادبی لطیفے اور چٹکلے بھی زیر خاک ہیں۔

مناسبت لفظی کے بادشاہ تھے۔قوتِ حافظہ بلا کی تھی۔ برجستگی اور حاضر جوابی تو کہنا چاہیے کہ ان پر ختم تھی۔ چاہے کسی والی ملک کے دربار میں ہوں، جامع مسجد کے منبر پر ہوں، عدالت کے کٹہرے میں مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہوں، کہیں اور کسی حال میں ہوں، اپنی آمد طبع سے نہ چوکتے۔حد یہ ہے کہ شدید غصہ کی حالت میں بھی ذہانت کند نہ ہو جاتی اور اس پر جلا ہوتی۔ایک بار کیا ہوا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ دہلی میں حکیم صاحب کے مکان پر ہو رہا ہے، محمد علی بیمار و معذور لیٹے ہوئے ہیں، بمخالف صف میں ایک اور مشہور لیڈر ہیں۔ یہ بھی ایک روزنامہ کے مالک ہیں، ان کے ہمراہ ان کے نفس ناطقہ روزنامہ کے ایڈیٹر صاحب بھی ہیں اور صاحبزادہ بھی۔ بحث نے طول پکڑا، گرما گری نے زبانوں پر چھالے ڈال دیے۔سوال و جواب کی تلخیوں نے منہ کے مزے خراب کر دیے، آخر وہ تینوں صاحب ناخوش ہو جلسہ پر لعنت بھیج اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ادھر وہ اٹھے اور ادھر محمد علی نے پکار کر کہا ''غضب ہو گیا باپ، بیٹے، روح القدس تینوں کے تینوں خفا ہو گئے!''

....

ذہانت کے لیے بڑا میدان شعر و شاعری کا تھا۔محمد علی شاعر بھی تھے اور شاعری کی دنیا میں نام تھا جوہر۔ بڑے بھائی کا تخلص تھا گوہر۔فرماتے تھے کہ منجھلے بھائی شوکت بے تخلص رہے جاتے ہیں، ان کے لیے تجویز کرتا ہوں اسی وزن و قافیہ میں شوہر...... بے شک عروس سخن کو ایسا شوہر کبھی کیوں ملنے لگا تھا!

شیفتہ کی مشہور غزل ہے ''پشیمانیوں میں ہم'' ''نادانیوں میں ہم''۔اس پر غزل کہنے بیٹھے تو مطلع ارشاد ہوتا ہے:

کیوں شہر چھوڑ جا پھنسیں دہقانیوں میں ہم
مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیابانیوں میں ہم

علی گڑھ کے مشہور خاندان شیروانی سے تعلقات بڑی بے تکلفی کے تھے۔اس کے ایک معزز فرد کی زبان سے کہتے ہیں ۔

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم

خود بیجاپور جیل میں تھے۔ بڑے بھائی لحیم وشحیم، راجکوٹ جیل میں پڑے پڑے دبلے ہو گئے تھے، ان کی زبان سے ادا کیا ہے۔

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن وتوش جب نہیں
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

ابھی نوجوان ہی تھے کہ علی گڑھ کالج میں زبردست اسٹرائیک ہوئی اور کل کچھ ایسی بگڑی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب کالج ہی کا دم واپسیں آپہنچا، سرسید کی برسی کا دن آیا اور عین اسی دن اولڈ بوائز نے اپنا سالانہ جلسہ منانا طے کیا۔ محمد علی آتے ہیں اور ایک منظوم عرضداشت سرسید کی روح کی خدمت میں، اپنے ہی جیسے بڈھے لڑکوں کو سنا پیش کرتے ہیں۔ دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا، ہمارے ناخدا تم ہو

سرسید کے عقائد مذہبی ملحوظ خاطر رہیں۔

یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو
سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور وشر سارا جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

ردیف دال یہ غزل کیسی چل گئی ہے، اور ہر شعر کیسا بولتا ہوا ہے۔

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے و لے میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ۔

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کا گھر گھر اس گیت سے گونج رہا تھا ۔

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ جیل کے باہر تھا، جیل کے اندر خود محمد علی کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے ۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے ۔ پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین بن علیؓ کو ۔ خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا ۔ سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے ۔ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ شاعری نہ سہی آپ بیتی کا ٹکڑا تھا

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف ۔ کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

....

خوش نصیب تھے وہ جنھوں نے محمد علی کو دور سے، سردار قوم کی حیثیت سے جانا، پیشوائے ملت کی حیثیت سے پہچانا، خوش نصیب تر تھے وہ جنھوں نے قریب سے دیکھا۔ بحیثیت دوست کے، عزیز کے، انسان کے، ان دیکھنے والوں نے کیا کچھ دیکھ لیا، کیا کچھ پالیا۔ ایک صداقت مجسم، پیکر اخلاص، جرأت، ہمت و بے خوفی کا مجسمہ! پاس والے جتنا قریب سے دیکھتے تھے، جوہر کے یہی جوہر اور زیادہ کھلتے گئے، ابھرتے گئے، نکھرتے گئے۔ کہتے ہیں کہ اہل سیاست وہ ہوتے ہیں جو کہتے کچھ ہیں، کرتے کچھ ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو محمد علی قطعاً سیاسی نہ تھے، ایک بار نہ تھے، ہزار بار نہ تھے۔ محبت کے پتلے تھے، مہر والفت کے بندے، بیوی بچوں، دوستوں، رفیقوں کے عاشق زار، عزیزوں کے جاں نثار، اجنبیوں تک کے مونس وغمگسار۔ کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے، میں تو محبت کا بھوکا ہوں۔ عالم اسلام کے ساتھ شیفتگی کا یہ عالم، افریقہ میں کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے اور اس کی چبھن محمد علی دہلی میں بیٹھے محسوس کریں۔ ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' کسی کے حق میں شاعری ہوگی، ان کے حق میں واقعہ۔ لوگوں کو مہمان بنانے، کھانا کھلانے، خاطریں کرنے کے حریص۔ خود اپنے گھر میں مفلسی و ناداری، مہمان اور دوسروں کو پکڑ پکڑ کر لا رہے ہیں اور زبردستی کھانا کھلا رہے ہیں!

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار۔ ایک سے بڑھ کر ایک لاڈلی۔ 23 میں ابھی جیل میں تھے کہ منجھلی لڑکی، جوان، شادی شدہ، دق میں مبتلا ہوگئی اور مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ مجبور اور محصور۔ صدہا میل دور، باپ پر کیا گزر رہی ہوگی! جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا ہے وہ اپنی نازوں کی پالی نورنظر کے واسطے کیسا کچھ بلبلایا ہوگا، تلملایا ہوگا، پھڑ پھڑایا ہوگا۔ کچھ اور زور نہ چلا تو عالم خیال میں بیٹی سے کہنے لگا۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں ‏ ‏ ‏ تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

اور پھر اپنے دل کو یوں سنبھالنے لگے۔

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا ‏ ‏ ‏ جو ہر ایک حال میں امید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ ‏ ‏ ‏ اہل تسلیم ورضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نورنظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رورو کر عرض کرتے ہیں۔

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے، قرآں میں کیا ‏ ‏ ‏ "تخرج الحی من المیت" مذکور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم ‏ ‏ ‏ آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ تقدیر کا نوشتہ کسی علاج وتدبیر سے مٹ نہیں سکتا، شعر کہنے سے پہلے کلیجہ ہاتھوں سے تھام لیتے ہیں۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو ‏ ‏ ‏ نہیں منظور تو ہم کو بھی منظور نہیں

ایک نہیں دو دو جوان پہاڑ سی لڑکیوں کا جنازہ اپنے ہاتھوں اٹھایا۔ قبر میں اتارا، سلایا۔ دل ذاتی صدموں کی تاب کہاں تک لاتا۔ قومی صدمے ان سے بھی بڑھ چڑھ کر 24 میں ترکوں نے خلافت نہیں توڑی، محمد علی کا جگر پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ جیے اس کے بعد بھی برسوں، اور بہت سے زندوں سے بڑھ کر اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ نہ پنپنا تھا نہ پنپے، ہنسے بھی، بولے بھی، گرجے بھی، لیکن اندر ہی اندر برابر گھلتے رہے، پگھلتے رہے، سلگتے رہے۔

پروردگار سے اتنا ربط و تعلق کم دیکھنے میں آیا ہے۔قرآن پڑھنے بیٹھتے تو قرآن ہی کے ہو جاتے۔ جہاں یہ مضمون آجاتا کہ ڈرنے کی چیز بندے نہیں اللہ ہے تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ،اوران آیتوں کو بار بار پڑھتے "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" تو گویا تکیۂ کلام تھا۔سورہ یوسف کی آیت "ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" کوفرمائش کر کے سنتے اور وجد کرتے ۔ایک مشہور مفکر نے شہادت دی ہے کانگریس کا ریزولیوشن ہو،تقریر ہو، کچھ ہو،کمال تھا محمد علی کو کہ ہیر پھیر کر خدا کا نام ضرور لے آتے تھے۔آخر آخر دل سب کی طرف سے ٹوٹ گیا تھا اور خود اپنے مصرع کی تفسیر ہو کر رہ گئے تھے ؎

یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

جنوری 1931 کی 4اور 5 کی درمیانی شب مسلمانوں کے ہاں پندرھویں شعبان کی مبارک شب اور روئے زمین کے مسلمان، ذوق وشوق سے جان کی ایمان کی، دنیا کی اور آخرت کی، دونوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ اس برکت والی رات میں مشیتِ الٰہی نے اپنی یہ نعمت ان سے واپس طلب کر لی ۔شاید اس لیے کہ محمد علی کے اہل وطن و اہل ملت اس نعمت کے اہل ثابت نہ ہوئے ۔جان، لندن میں جان آفریں کے سپرد کی اور آخری آرام گاہ کے لیے جگہ کہاں نصیب ہوئی ؟ قبلہ اول میں ہیکل سلیمانی کے قریب، جامع سے متصل !اقبال کو الہام ہوا ؎

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

ماتم وشیون کی صدائیں ملک کے ایک ایک گوشہ سے ،ایک ایک شہر، ایک ایک قصبہ ایک ایک گاؤں سے،اور ہندوستان ہی نہیں سارے عالم اسلامی میں اس زور وشور سے اٹھیں، اور اتنے روز تک رہیں کہ تاریخ میں مثال مشکل ہی سے ملے گی۔"ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے" ان ہی کا مصرع ہے اور یہ بھی تو خود ہی فرماتے ہیں ۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

......☆☆☆......

ضمیمہ:10

محمد علی کے خطوط[1]

(شروع سال 41 سے دہلی ریڈیو اسٹیشن نے اپنے ہاں سے مشاہیر کے خطوط پر تقریروں کے ایک سلسلہ کا آغاز کیا تھا۔ سلسلہ کا عنوان تھا ''سمندر پار سے خطوط'' اور اس میں وہی خطوط جگہ پا سکتے تھے جو ہندوستان کے باہر سے لکھے گئے ہوں۔ اپریل میں باری محمد علیؒ کے خطوط کی بھی آئی۔ اور اس وقت مدیر صدق نے ذیل کی تقریر نشر کی۔ ریڈیو ایک سرکاری محکمہ ہے۔ اس کی پابندیوں کو ناظرین تقریر پڑھتے وقت ذہن میں رکھیں۔ تقریر کا وقت 15 منٹ کا تھا)

نوجوانی سے لے کر اپنے قبل از وقت بڑھاپے تک محمد علی یورپ سمندر پار چھ بار گئے اور خط ہر دفعہ وہاں سے بہت سے لکھے۔ لیکن شروع میں ان خطوط کو کون محفوظ رکھتا؟ اس وقت کسے خبر تھی کہ گودوں کا کھلایا ہوا لڑکا، ساتھ کا کھیلا ہوا نوجوان ایک روز شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے گا؟ آخر کے خطوط بے شک بہت سے ہوں گے اور بہت سے لوگوں کے پاس، لیکن وہ زیادہ تر اختلافی اور نزاعی مسئلوں سے لبریز۔ انھیں کوئی ریڈیو پر کیسے لائے، خاص و عام کو کیسے سنائے؟ اس ذخیرہ کے علاوہ بھی جتنے ہیں اتنے زائد ہیں کہ کوئی انھیں پھیلانے پر آئے تو آج کا سارا پروگرام اسی ایک عنوان کی نذر ہو جائے۔ داستان گو تھک جائے اور داستان ختم نہ ہو پائے۔

---

1 صدق یکم دسمبر 1941

محمد علی مولانا تو بہت بعد کو ہوئے۔شروع میں تو مدتوں مسٹر ہی کہلائے۔ پہلا سفر 1898 میں کیا۔ جب پرانی صدی کے ختم ہونے کے دوسال رہ گئے تھے۔ سن اس وقت بیس سال کا تھا۔ دوسرا سفر 1902 میں کیا جب نئی صدی کو شروع ہوئے بھی دو ہی سال ہوئے تھے۔ سن اس وقت 24 سال کا۔ دونوں سفر طالب علمی ہی کے سلسلہ میں تھے۔ زیادہ تر آکسفورڈ اور لندن میں۔ مشغلے اسی سن وسال کے لائق اور مراسلے ان ہی مشغلوں کے مناسب حال۔ انگریزی میں لکھے ہوئے بڑے بڑے طویل مراسلے علیگڑھ منتھلی میں "Oxford Idling" کے عنوان سے کئی کئی نمبروں میں نکلتے رہے۔ ذکران میں زیادہ تر ہوتا کالج کے کھیل کود کا، ہمجولیوں کی رنگ رلیوں کا، اور سب سے بڑھ کر کشتی رانی یا کشتی بانی کا۔ اس دور سے یقیناً آپ کو کچھ زیادہ دلچسپی نہ ہوگی۔

تیسری بار انگلستان جانا 1913 میں ہوا۔ اب محمد علی ملک کے ممتاز جرنلسٹ اور انگریزی کے مشہور انشا پرداز تھے۔ کامریڈ عرصہ سے نکل رہا تھا اور اب ہمدرد بھی نکلنا شروع ہوگیا تھا۔ کانپور کی ایک نئی نکلنے والی سڑک کی زد میں ایک مسجد کا گوشہ آرہا تھا اس پر قدرتاً ایک سخت ہیجان برپا ہوگیا تھا اور معاملہ شہر بلکہ صوبہ کی حدود سے نکل کر "آل انڈیا" بن چکا تھا۔ محمد علی آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری کو ساتھ لے، چپ چپاتے ولایت روانہ ہوگئے کہ وہاں جاکر اس معاملہ، اور ایک یہی کیا، ملک کے بہت سے معاملات پر لوگوں سے ملیں ملائیں، دلوں کو گرمائیں، طبیعتوں کو نرمائیں، تقریر سے، تحریر سے، قلم سے، زبان سے۔ غرض وہاں پہنچ کر ہندوستان خط بہت سے لکھے، عموماً انگریزی میں۔ اکثر کامریڈ میں چھپ بھی گئے۔ انھیں پڑھ کر نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے اس وقت کے ہندوستان کا، اس وقت کے ہندی مسلمان کا، اس وقت کے انگلستان کی شان وشوکت کا۔ ناکامیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں، ہمت پست نہ ہوئی۔ دعوتیں اور ضیافتیں محمد علی کی بکثرت ہوئیں۔ لندن میں بھی اور ایڈنبرا (نیوکاسل وغیرہ میں بھی۔ ان جلسوں اور صحبتوں میں شریک انگلستان کے مشاہیر بہت سے ہوئے۔ مثلاً اہل قلم واہل صحافت میں ایچ جی ویلز، جی کے چسٹرٹن، اے جی کارڈنز، سی پی اسکاٹ، جے اے اسپنڈر، ویلنٹائن ولیمس اور آئر لینڈ کے مشہور شاعر ڈبلو بی ایٹس) اہل سیاست میں ریمزے مکڈانلڈ، کیری

ہارڈی، جن ڈلن، آئر ے ہر برٹ، ڈاکٹر رور فرڈ، مسٹر نیوٹسن وغیرہم۔ کچھ ایسے مشاہیر بھی تھے جو عین وقت پر خود آنے سے معذور ہو گئے اور اپنے بجائے اپنے معذرت نامے بھیج دیے۔ مثلاً برنارڈ شا، مسز بلنٹ وغیرہم۔ محمد علی ان جلسوں سے خوب کام نکالے۔ جو کچھ کہنا ہوتا ان ہی موقعوں پر کہہ ڈالتے۔ طویل مراسلے، ان کے ٹائمز میں تو بار نہ پاتے، البتہ دوسرے مشہور اخبارات میں ان کے بیانات نکلتے رہتے۔ لارڈ ہیڈ لے اس زمانے میں نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اور لیڈی ایولین کو بولڈ تو ان سے قبل ہی اسلام قبول کر چکی تھیں۔ ان راستوں سے بھی محمد علی نے انگلستان کی سوسائٹی کے اندر خوب گھس پیٹھ پیدا کی۔ اور اپنے مشن میں کچھ ایسے زیادہ ناکام نہ رہے۔

16 دسمبر 1913 کے کامریڈ میں جو مراسلہ نکلا ہے، اس میں اپنے اس سفر پر گویا تبصرہ کرتے ہیں۔ ''27 نومبر کو ہم لوگ خود ایک الوداعی لنچ اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو دے رہے ہیں۔ اس لنچ کی حیثیت سیاسی اور نزاعی نہ ہوگی بلکہ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ہم ہندوستان اور انگلستان، اور اسلام اور مسیحیت کے درمیان سفارت کا کام دے سکیں۔ اور تاکہ ہم اپنے مخاطب انگریزوں اور انگریزنوں دونوں کو بتا دیں کہ وہ ہمارے ملک اور ہمارے مذہب سے ایسے بے تعلق نہ رہیں جیسے کہ اب تک رہ چکے ہیں۔ بلکہ ہمارے عزم اور ہمارے مقصد اور گلے شکوے خود ہماری زبان سے سن لیں۔ مشہور افسانہ نگار ایچ جی ویلز سے ملاقات ہو ہی چکی ہے بلکہ اب کی جمعہ کی تو ان میاں بیوی نے اپنے ہاں رات کو کھانے پر مدعو کر دیا ہے۔ اور وقت بھی سوا آٹھ کا رکھا ہے کہ میں اس وقت تک ہندوستان کی ڈاک سے فارغ ہو جاؤں''۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان اور اسلام کے معاملہ میں ان لوگوں کی بے خبری اور جمود دور کرنے اور انھیں بار بار چونکاتے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے ہم خیال لوگ ہندوستان سے بار بار آتے اور یہاں کی رائے عامہ کو برابر تیار کرتے رہیں۔ میں بحیثیت مجموعی مایوس نہیں ہوں''۔

محمد علی اب ملک و ملت یعنی ہندوستان اور اسلام دونوں کے سفیر تھے، اور یہ دوہرا نقطۂ نظر قائم ہو چکا تھا۔ چوتھا سفر انگلستان اور فرانس کا 1920 میں وفد خلافت کے صدر کی حیثیت سے کیا۔ اب ان کا شمار ملک کے مسلم لیڈروں میں تھا اور مسلمانوں میں تو وہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی

حاصل تھی کہ باید وشاید۔ اب ان کی حیثیت سفیر سے زیادہ مجاہد کی تھی۔ انگلستان خصوصا شہر لندن میں بہت سی تقریریں کیں۔ اسکیس ہال، کیکسٹن ہال وغیرہ میں، اور کچھ فرانس میں بھی۔ موضوع تقریر اسلام اور ہندوستان دونوں کی ترجمانی اور پرجوش ترجمانی ہی رہتا تھا۔ تقریروں اور پبلک تحریروں کے انہماک میں ہندوستان خطوط لکھنے کا وقت کہاں سے نکالتے۔ اور جو کچھ لکھے ہیں ان کی اشاعت کی نوبت اور بھی کم آئی۔ کوئی اخبار اس وقت اپنے ہاتھ میں تھا نہیں نہ اردو کا نہ انگریزی کا۔

پانچویں بار بیمار اور زار و نزار ایک قدر دان، جوہر شناس ہندو رئیس کے خرچ پر 1928 میں اپنے علاج کے لیے یورپ روانہ ہوئے۔ ذیابیطس کا علاج فاقوں کے ذریعہ سے کرنا تھا اور اس طریق علاج کے ماہرین فرانس میں تھے۔ اس لیے قدرتاً اب کی زیادہ تر قیام فرانس ہی میں رہا۔ اور ڈاکٹروں کی شدید تاکید پر سیاسیات وغیرہ سے ایک بڑی حد تک الگ تھلگ رہنا پڑا۔ اس سفر میں راستہ سے جو مفصل خط لکھا ہے، قابل ملاحظہ ہے۔ اقتباس ذرا طویل ضرور ہوگا لیکن اس سے ایک طرف تو اس سفر اور چوتھے سفر دونوں کے مقاصد روشنی میں آجائیں گے۔ اور دوسری طرف مولانا کا مجلسی اور معاشی نقطۂ نظر بھی کسی قدر واضح ہو جائے گا۔ خط ولایتی جہاز میڈونیا سے لکھا گیا ہے۔ تاریخ 6 جون 28 کی پڑی ہے اور اب جامعہ والوں نے خطوط محمد علی کے مجموعہ میں چھاپ بھی دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''چوتھا سفر 1920 میں کیا گیا اور ایک آخری کوشش اس کی کی گئی تھی کہ خلافت عظمیٰ کو برقرار رکھا جائے۔ ترکی سلطنت اور اس کے اقتدار کی حفاظت کی جائے...... گزشتہ تجربوں کی بنا پر جانتے تھے کیا حشر ہوگا۔ مگر

رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اس خیال سے احرام سفر باندھا گیا تھا، آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا بھی کیا حشر ہوا۔ اس سفر کے بعد توبہ کر لی تھی کہ اب آستاں بوسی نہ کریں گے۔ اگر پھر جائیں گے تو اس لیے کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان معاہدہ پر دستخط کریں۔ افسوس وہ معاہدہ آج بھی دور نظر آتا ہے، مگر الحمد للہ کہ توبہ آج بھی نہیں ٹوٹی...... آج مسٹر والش پولیٹیکل سکریٹری صاحب سے جہاز پر

ملاقات ہوئی تو ان کی غلط فہمی کو بھی دور کر دیا کہ میں بٹلر کمیٹی کے سلسلہ میں انگلستان جارہا ہوں۔ محض اپنی صحت کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اور اس پر ہنسی آتی ہے کہ ایک فاقہ کش ملک سے ایک متمول ملک کی طرف سے ایک فاقہ مست بصرف کثیر اس لیے سفر کر رہا ہے کہ وہاں جا کر فاقہ کر کے اپنا علاج کرائے۔

ہندستانی عورتیں اس جہاز پر بھی ہندستانی لباس میں سفر کر رہی ہیں مگر سوائے مسز اینی بیسنٹ کے اخبار نیو انڈیا کے ایڈیٹوریل اسٹاف کے ایک رکن کے جو اچکن اور آڑا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں، مردوں میں صرف میں ہی ایشیائی لباس میں ملبوس ہوں...... آج صبح سے تموج میں بہت کمی ہو گئی اور آج شب کے ساڑھے آٹھ بجے سے جب یہ خط شروع کیا گیا ہے جہاز پر مردوں اور عورتوں کا ناچ ہو رہا ہے...... ڈیک پر میرے قریب ہی ایک خوش رو وجیہ اور بلند قامت فوجی افسر بھی لیٹے رہا کرتے تھے اور کبھی کبھی ایک دو لفظ بول لیا کرتے تھے۔ آج ایک ایک بجے سے میری دیر تک گفتگو ہوتی رہی جس میں زیادہ تر میری بچیوں کے نام اور ان کی عمر کے متعلق اس کے سوالات اور میرے جوابات تھے۔ بظاہر اسے سن کر اور کچھ دلچسپ پا کر ان صاحب نے مجھ سے گفتگو شروع کی اور دو گھنٹے تک نہایت آزادی اور صفائی سے، مگر پر لطف طریقہ پر سیاسی گفتگو رہی جس کے بعد انھوں نے شکریہ بھی ادا کیا اور داد بھی دی، بعد کو معلوم ہوا کہ بریگیڈیئر جنرل ہیں''۔

دوسرا خط فرانس کے قیام کے بعد لندن سے 19 اگست کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے طویل اقتباسات بھی نہ لطف سے خالی ہوں گے نہ فائدے سے۔ اس لیے اور بھی کہ اس میں ذکر ایک مشہور بزرگ قوم کی وفات کا ہے جن سے محمد علی کی خاصی چشمک رہ چکی تھی۔ اپنی صحت اور بد پرہیزی کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں:

جمعہ کی صبح کو میں نے اپنا فاقہ ختم کیا۔ کیا معلوم تھا کہ ٹھیک جس وقت میں افطار کر رہا تھا اسی وقت سید امیر علی صاحب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے...... گو کچھ عرصہ سے وہ صاحب فراش تھے تاہم کسی کو گمان نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد داعی اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ یہاں جس طرح جینا مشکل ہے اس طرح مرنا بھی مشکل ہے۔ جس دن امیر علی صاحب کا انتقال ہوا ہے لوگ چھٹیاں

منانے جارہے تھے۔ تجہیز وتکفین کا سامان منگل تک نہ ہوسکا۔ یورپین رسم کے مطابق پھولوں سے تابوت چھپ گیا ہوگا۔ اس لیے کہ جب میں قبرستان پہنچا تو قبر پھولوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی...... دوکنگ کی مسجد کے امام صاحب نماز جنازہ پڑھا چکے تھے۔ اس قبرستان میں ہزاروں ہی قبریں ہیں اور اس شہرخموشاں کا نام بھی (Necropolis) ہے۔ ریل کی پٹری اس کے اندر تک آتی ہے نہایت وسیع میدان میں باغ لگایا گیا ہے جس کے چاروں طرف پختہ احاطہ کی دیوار ہے۔ نہایت عمدہ سڑکیں، روشیں چلنے پھرنے والوں کے لیے بنادی گئی ہیں۔ اس شہرخموشاں کے اندر ایک اچھی خاصی ریسٹوران بھی موجود تھی جہاں لنچ کھایا جاسکتا تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا حصہ مسلمانوں کی قبروں کے لیے بھی ہے۔ یوں تو تجہیز وتکفین کا انتظام کرنے والی کمپنی نے سب کچھ کرلیا ہے لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ قبر کا رخ کسی قدر غلط تھا۔ لیکن الحمدللہ کچھ زیادہ غلطی نہ تھی۔ اور امام صاحب نے میت کا منہ صحیح طور پر قبلہ کی سمت موڑ دیا تھا۔ ہم لوگ جب پہنچے تو قبرستان میں پندرہ بیس ہی آدمی رہ گئے تھے جن میں ایک لارڈ ہیڈ لے اور پنجاب کے سابق لیفٹننٹ گورنر سرلوئی ڈین تھے۔ سرلوئی ڈین صاحب نے مجھے پہچان کر اردو میں مزاج شریف کہہ کر میرا حال دریافت فرمایا اور فرمایا کہ ہاں میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں جواب میں الحمدللہ کہہ کر اور ان سے ہاتھ ملاکر آگے بڑھا...... مسلمانوں کی قبریں غالباً پہلے یہاں نہ تھیں۔ جتنے کتبے ملے ان سب کو میں نے پڑھا اور معلوم ہوا کہ سب سے پرانی قبر ایک خاتون صفیہ احمد فارسی کی ہے۔

یہ خط بھی جامعہ کی چھپی ہوئی تازہ کتاب خطوط محمد علی میں درج ہو چکا ہے۔ آگے چل کر اسی خط میں بمبئی، حیدرآباد، جہلم، راندیر اور مصر کی متعدد میتوں کی قبروں کا ذکر ہے، اس کے بعد فوجیوں کی قبروں کی ایک بڑی لمبی فہرست ہے، اس سے کچھ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ محمد علی سیاسیات کے علاوہ بھی انگلستان میں کیا کیا دیکھتے تھے اور کس نظر سے۔

''اس پر بھی وہ کام کررہا ہوں جو نہ کسی اور سے ہوسکتا ہے نہ کوئی کرتا ہے۔ بااثر لوگوں پر گفتگو سے اثر ڈالتا ہوں، ٹیلیفون پر رات دن باتیں ہوا کرتی ہیں۔ خواہ ٹائمز کا فارن ایڈیٹر ہو، خواہ برنارڈ شا...... وزیر ہند نے نہایت شرافت سے خود ہی دوبارہ آنے پر یہاں اصرار کیا۔ اس طرح گھنٹہ بھر گفتگو کی اور مجھ سے اعتراف کیا کہ تم نے جو باتیں بتائیں وہ تو عجیب وغریب

ہیں۔ پیچیدہ ترین مسائل پر جو سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے، آج ایک روشنی کا سیلاب ٹوٹ پڑا۔ اسپکٹیٹر کے ایڈیٹر سے دو گھنٹے باتیں ہوئیں، اور اس پر پورا پورا اثر پڑا۔ اسی طرح ٹائمز کے فارن ایڈیٹر سے ساڑھے 10 سے 12 تک ٹیلیفون پر گفتگو ہو چکی تھی۔ خود ہی اس نے ملنے کی خواہش کی۔ سوا گھنٹہ اس سے ہندوستان کے متعلق گفتگو ہوئی۔ یہ بھی گرویدہ ہو کر گیا"۔

یہ وقت تھا جب اسی محمد علی نے جواب نہ مسٹر تھا نہ مولانا بلکہ صرف دیوانہ، راؤنڈ ٹیبل (گول میز) کانفرنس کے بھرے مجمع میں اپنی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ ہندوستان کا ساحل آخری بار چھوڑتے وقت بھی تو جب ایک مخلص نے بڑھ کر پوچھا تھا کہ "آخر اب اس حالت میں جا کس لیے رہے ہیں؟" تو دیوانہ کی زبان سے پھٹ سے یہی نکلا تھا کہ "مرنے کے لیے" سچے کی بات اللہ نے سچ بھی کیسی کر دکھائی!

......☆☆☆......

ضمیمہ: 11

محمد علیؒ: بانی جامعہ

(جوہر کے جوبلی نمبر کے لیے لکھا گیا[1])

محمد علی اپنی زندگی بھر کچھ نہ کرتے صرف جامعہ ہی کی بنیاد ڈال جاتے تو بھی ایک کارنامہ سرمایۂ عمر ہونے کے لیے کافی تھا...... اللہ کا وہ شیر تو اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کر دھر کر دنیا سے اٹھا۔

ہائے کیا زمانہ وہ 1920 کے آخر اور 1921 کے نصف اول کا تھا! کتنا جوش وخروش! اخلاص تھا کہ سینوں سے ابلتا ہوا، امڈتا ہوا، ایثار تھا کہ عہد صحابہؓ کا نمونہ دنیا کو ایک بار پھر دکھا رہا تھا۔ بوڑھے، جوان، بچے، مرد، عورت سب اپنے اپنے رنگ میں مست! کل کی فکر میں آج کو تجے ہوئے ''آجل'' کے خیال میں ''عاجل'' کو بھولے ہوئے، چھوڑے ہوئے..... محمد علی ان دیوانوں، سرفروشوں کے لشکر کا سردار۔

تلقین یہ شروع کی کہ ایسی خدا فراموش و مذہب دشمن حکومت جو خلافت اسلامیہ سے برسر پیکار ہو، اس کے اور اس کے ملحق اداروں اور محکموں سے کسی طرح کا تعلق جائز نہیں، اس کے عہدے، اس کے منصب، سب بحکم ''عطائے تو بہ لقائے تو'' اس کی طرف قابل واپسی۔ پھر

---

1. صدق 12، نمبر 48 (7 فروری 1947)

سرکاری اور نیم سرکاری تعلیم جوان سارے تعلقات کی لیے سنگ بنیاد ہے وہ بدرجۂ اولیٰ قابل ترک ولائق احتراز۔ تو اب مسلمانوں کے بچے کیا کریں؟ کریں یہ کہ

ایں سررشتۂ تعلیم مادر دستِ ما باشد

اپنی تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں...... نصاب اپنا ہو، استاد اپنے ہوں، تعلیمی ماحول اپنا ہو۔ پیام لے کر رخ پہلے علی گڑھ کا کیا کہ وہیں کے یہ ساختہ پرداختہ تھے اور وہیں ان کا سب سے بڑا امید گاہ تھا۔ پیام سہل اور معمولی نہ تھا، ایک مستقل انقلاب کی دعوت تھی اور انقلاب کا رجز کن کانوں کو خوشگوار معلوم ہوا ہے؟ لڑکوں میں چند سعید روحوں نے بڑھ کر لبیک کہا، باقی ہر طرف سے انکار وملامت ہی کے آوازے بلند ہوئے...... اس سے پولیس کے ڈنڈوں اور سنگینوں کے سائے میں نکالے گئے۔

داستان بڑی طویل اور دردناک ہے۔ حالات کا اندازہ کرنے کے لیے اس وقت کے اخبارات کے فائلوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ علی گڑھ متضاد تاروں سے روز ناموں کے کالم لبریز ہوتے تھے۔ کمتر کوئی مصیبت تھی جو محمد علی اور ان کے جواں ہمت رفیقوں کو جھیلنی نہ پڑی ہو۔ رسم افتتاح کے لیے شیخ الہند مولانا محمود حسن کا وجود مقدس ہاتھ آ گیا، اور بے سروسامانی کے اسی عالم میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوگئی۔ وہی جامعہ جس نے ایک فرزند رشید ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی صورت میں پیدا کر دیا۔

کلاسیں درختوں کی چھاؤں میں ہونے لگیں۔ لڑکوں کے رہنے سہنے کے لیے خیمے نصب ہوگئے۔ محمد علی سب ہی کچھ تھے۔ چندہ بھی لائیں، پرنسپلی کے فرائض بھی ادا کریں، استادوں کا انتخاب بھی کریں۔ نصاب درس بھی ہر مضمون کا شروع سے لے کر بی۔ اے۔ تک کا مرتب کریں!...... عین اس عالم میں جب ذرا سے بھی سکون سے سانس لینے کی نوبت آئی، اس نیاز کیش کو جس کی شہرت چند روز قبل تک پورے ملحد ہونے کی تھی اور بجا تھی، جنوری 1921 میں خط لکھا کہ فلسفہ کی پروفیسری کی جگہ تمھارے لیے روکے ہوئے ہوں لیکن مذہب علم سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی طرف سے اطمینان دلا دو تو بے تکلف چلے آؤ۔ خط کی اصل عبارت مکتوباتِ محمد علی وغیرہ کے سلسلہ میں بار بار چھپ چکی ہے۔ یہ محض خلاصہ درج ہوا۔

اس غرض سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ محمد علی کو مذہب کس درجہ عزیز تھا۔ اور وہ ہر معاملہ کو مذہب ہی کی عینک سے دیکھنے کے کس قدر عادی تھے۔ حقیقتاً وہ مذہبی دیوانے تھے۔ انھیں غلط سمجھا اس نے جس نے انھیں سیاسی فرزانہ خیال کیا۔ جامعہ قائم کرنے سے ان کی پہلی غرض یہ تھی کہ یہاں سے دین وملت کے سنجیدہ خدمت گزار پیدا ہوں اور ضمناً ملک ووطن کی خدمت بھی ہو جائے۔

پانیر نے جو اس وقت تک تمام تر انگریزی ہاتھوں میں تھا، مولانا کی زندگی ہی میں ایک مضمون ان پر لکھا تھا جس کا حاصل ہی تھا کہ یہ ہندوستان کا وہ ذہین اور طباع شخص ہے جو کوئی تعمیری کام اپنی یادگار نہیں چھوڑے جا رہا ہے...... اس خیال کی تردید کے لیے جامعہ ملیہ کا وجود کافی ہے۔ جو ایسی سعید اولاد چھوڑ جائے، اسے یہ کہنا کہ وہ لاولد اٹھ گیا، کیسی صریح زیادتی اور ظلم ہے!

......☆☆☆......

ضمیمہ:12

محمد علی کی یاد1

محمد علی کا انتقال شروع 31 میں ہوا۔ کسی زندہ قوم کے فرد ہوتے تو اب تک خدا جانے ان کی کتنی سوانح عمریاں تیار ہو چکی ہوتیں اور ان کی تقریروں اور تحریروں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان پر تبصروں اور تحشیوں کا کتنا بڑا انبار لگ چکا ہوتا! یہاں یہی غنیمت ہے کہ جس طرح بھی بن پڑا ''سیرت محمد علی'' جامعہ ملیہ کے زیرا ہتمام شائع ہوگئی۔ اس کے بعد سے سناٹا تھا۔ یہاں تک کہ اس خادم ملت کی تقریروں اور تحریروں کے بھی ضبط کا کوئی اہتمام نہیں! شکر اور صد شکر کہ بعد مدت جامعہ والوں میں احساس فرض بیدار ہوا...... وہی جامعہ، جو محمد علی کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہے ؎

بعد مدت کے ترے مستوں کو پھر آیا ہے ہوش!

....

مضامین محمد علی، درسی کتابوں کی چھوٹی تقطیع پر 509 صفحوں کی خاصی ضخیم کتاب ہے۔ مرتب، ایک جامعی فاضل، محمد سرور صاحب بی اے استاد تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہیں، کتاب مجلد مع تصاویر محمد علی۔ قیمت 8 روپے۔ دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ (امین الدولہ پارک) ہر جگہ مکتبہ جامعہ سے مل جائے گی۔ شروع میں فہرست مضامین اور مرتب کے قلم سے چند صفحوں کا مقدمہ۔

1 صدق یکم مئی 1939

نام سے دھوکا یہ ہوتا ہے کہ شاید یہ کل مضامین کا مجموعہ ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ مضامین صرف ہمدرد کے درج ہیں۔ اور ہمدرد کے بھی دور اول (1912 تا 1914) کے نہیں، صرف دور ثانی (نومبر 1924 تا مارچ 1929) کے۔ پھر اس دور کے بھی سارے مضامین نہیں، انتخاب سے کام لے کر ایک بڑا حصہ اس دور کے مقالات کا یکجا کر دیا گیا ہے۔ دیباچہ میں ان ضروری تصریحات میں سے ایک چیز بھی درج نہیں۔ اور یہ بڑی فروگزاشت ہے۔ کل مضامین ایک جلد میں سما بھی کہاں سکتے تھے۔ متعدد جلدیں ان کے سمیٹنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ لیکن چونکہ اس کا کوئی قرینہ نہیں کہ یہ محض جلد اوّل ہے۔ اس لیے قیاس یہی ہوتا ہے کہ ناشرین نے اسی ایک مجموعہ پر اپنی ہمت کو ختم کر دیا۔ خدا کرے یہ قیاس غلط نکلے اور اگر ناشرین یہ ارادہ بھی کر چکے ہوں تو محمد علی کے قدر دان اپنی قدر دانی کا عملی ثبوت اس زور و شور سے بہم پہنچائیں اور ناشرین کی ایسی ہمت افزائی کریں کہ انھیں خواہ مخواہ اپنا ارادہ بدلنا اور اس مجموعہ کو محض جلد اول قرار دینا پڑے۔

محمد علی کو کوسنے والے، گالی دینے والے بے تعداد تھے، ماننے والے، داد دینے والے شاید ان سے بھی زائد۔ کم ایسے تھے جو محمد علی کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے۔ فاضل مرتب کا شمار ان ہی چند خوش نصیبوں میں ہے۔ انھیں بہت ممکن ہے کہ محمد علی کی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع زیادہ نہ ملا ہو لیکن بہر حال وہ اس شہید ملت کی شخصیت کو سمجھ خوب گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''وہ مخالفتوں اور مصیبتوں میں ہمت ہارنے کو گناہ سمجھتا تھا۔ اپنوں سے لڑا، بیگانوں کو ان کی ناحق دوستی پر ڈانٹتا رہا۔ اپنے بگڑ گئے اور بیگانوں نے بدنام کرنا شروع کر دیا لیکن اس باہمت اور جوانمرد کے چہرے پر شکن تک نہ آئی اور اپنوں اور بیگانوں کا آخر دم تک نہایت پامردی سے مقابلہ کرتا رہا۔ محمد علی اسوۂ حسینی کو اپنے لیے آرام جاں سمجھتا تھا اور اسی پر وہ تمام عمر رہا۔ وہ شہید ملت ہے، اور اس کی گفتار، کردار، اس کی جانکاہیاں، بیتابیاں، دوستوں سے محبت، اور پھر ان سے عداوت۔ دشمنوں سے نفرت اور پھر ان سے محبت، عزیزوں سے مخالفت، دل سوزوں سے بعد، خون دل پلا پلا کر کسی نخل کو برومند کرنا اور اس کے پھل کو تلخ پا کر اس سے ہاتھ کھینچ لینا کسی بات کو اپنی طبیعت حق شناس کے خلاف پا کر اس کی مخالفت کے درپے ہونا، خواہ اس کی مخالفت میں اس کے عزیز سے عزیز جذبات کا خون ہی کیوں نہ ہو، بظاہر اس کا مجموعۂ اضداد ہونا اسی اسوۂ

حسینی کی جلوہ فرمائیاں ہیں''۔

''کتاب کی غرض، اسی ''خانما خراب'' لیکن دراصل متاع حاصل کی حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ محمد علی کا دماغ بڑا تھا اور دل اس سے بھی بڑا۔ اردگرد کے نامساعد حالات، زمانہ کے تغیرات، ملک و وطن کے متضاد مظاہر اور اسلام اور جہانِ اسلام کے انقلابات نے محمد علی کے دل و دماغ کو کچھ اس طرح متاثر رکھا کہ اس کی شعلہ نوائیاں ہر اس خرمن کو، جو اسے باطل نظر آتا، جلا کر بھسم کرنے پر تل جائیں۔ اس قسم کی خاشاک سوز آگ کو پردوں میں سجا کر دوسروں کو دکھانے کی کوشش بہت مشکل ہے۔ مرتب نے اپنے بس بھر اس امر کی سعی کی ہے کہ قارئین ......اس آگ کی حقیقت کو سمجھیں''۔

''اندیشہ قوی اس کا تھا کہ 'ملیت'' (یا صحیح طور پر ''وطنیت'') کی موجودہ رو جو ملی بلکہ بہت سے دینی اداروں تک کی اسلامیت کو بہائے لیے جارہی ہے، کہیں اسی لپیٹ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یہ معلم بھی نہ آجائیں، اور محمد علی کی تصویر ان کے قلم سے ناقص، ادھوری، اور مسخ شدہ نکلے۔ لیکن یہ اندیشہ باطل ثابت ہوا۔ انھوں نے توازن قائم رکھا اور تصویر بڑی حد تک صورت کے مطابق ہی کھینچی۔

....

نومبر 24 سے مارچ 29 تک کا زمانہ محمد علی کی زندگی کا ایک بہت مختصر اور محدود حصہ ہے۔ اور پھر جب اس دور کے بھی کل مضامین یکجا نہ ہوں تو یہ دور اور بھی سکڑ جاتا ہے لیکن ایک اعتبار سے یہ دور ان کی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔ محمد علی جب اگست 23 میں قید سے رہا ہوئے تو معاً ان کی خدمت میں کانگریس کی صدارت پیش کی گئی۔ دسمبر 23 سے دسمبر 24 تک وہ صدر کانگریس رہے اور اسی حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں دورہ کرتے رہے۔ ٹھیٹھ اسلامیت کے باوجود، اس وقت وہ انتہائی قومیت کے بھی علمبردار تھے۔ یہاں تک کہ بیگانوں نے تو خیر، اپنوں نے بھی انھیں ہندو پرست کہنا شروع کر دیا۔ اور 26 کے مرکزی کمیٹی کے ایک اجلاس میں جو دہلی ہی میں، اور غالباً دفتر ہمدرد ہی میں منعقد ہوا تھا، ایک بہت مشہور عالم نے کھلے الفاظ میں محمد علی کو اسی کے طعنے دیے۔ 30 میں محمد علی کھلم کھلا کانگریس سے الگ ہو گئے لیکن اس کی ابتدا،

آخر 28ء ہی سے ہو چکی تھی۔ مضامین کے پیش نظر جلد میں دونوں مسلکوں کی جھلک موجود ہے۔ کانگریسی رنگ کی گہری اور مسلم کانفرنسی رنگ کی ہلکی...... حالانکہ جب محمد علی سرتاپا کانگریس میں غرق تھے جب بھی ان کی اسلامیت کب ''ہلکی'' پڑنے پائی تھی؟ صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً۔

مضامین کی ترتیب بلحاظ تاریخ نہیں، بلحاظ موضوع ہے۔ تاریخی الٹ پلٹ اس لیے ناگزیر ہے۔ بہت سے پچھلے مضامین شروع میں آگئے ہیں اور بہت سے پہلے مضامین نے جگہ آخر میں پائی ہے۔ شروع میں دو دعائیہ مضامین کا مقدمہ ہے۔ پھر ''آپ بیتی'' جس کے اندر 30 مضامین ہیں۔ پھر ''مسائل ملی'' جو 12 مضامین کا جامع ہے۔ پھر ''مسلمان اور متحدہ قومیت ہند'' جس کے تحت میں کل دو مضامین ''شخصیات'' پر۔ پھر ''مسلمان اور آزادی'' مع چھ مضامین کے۔ آخری عنوان ''بادشاہت اور جمہوریت'' کا جس میں پانچ مضامین ہیں۔ یہ ترتیب عنوانات، اگرچہ نہ جامع ہے نہ مانع لیکن بہر حال جیسی کچھ ہے بہت غنیمت ہے، اور پڑھنے والے کی رہنمائی کے لیے خاصی حد تک کافی۔ پڑھنے والے کو فرط اشتیاق میں دقائق تالیف وترتیب پر غور کرنے کا ہوش ہی کب باقی رہے گا؟

....

گائے اور باجہ جس طرح آج اتحاد وطنی کی راہ میں حائل ہیں، محمد علی کے وقت میں بھی تھے، محمد علی نے دہلی کی یونٹی کانفرنس کے موقع پر آخر 24 میں جواہر لعل نہرو اور چند ہم خیال ہندوؤں مسلمانوں کی اتفاق رائے سے یہ چاہا تھا کہ

''گائے ذبح کرنے اور باجہ وغیرہ کے تمام مسائل اسی طرح طے کردیے جائیں کہ تمام ملتوں کو صاف اور صریح طور پر مذہبی آزادی دی جائے، لیکن اسی کے ساتھ اس توقع کا بھی اظہار کردیا جائے کہ یہ کانفرنس امید کرتی ہے کہ اس آزادی کا استعمال اس طرح نہ کیا جائے گا کہ دوسروں کی دلآزاری ہو مگر لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مدن موہن مالویہ نے اس کو گوارا نہ کیا، اور جو تجاویز منظور ہوئیں، ان میں اس مذہبی آزادی کو مقامی رواج کی شرائط وحدود کے ساتھ مشروط ومحدود کردیا گیا''۔ (ص195)

سواب، اس دل جلے کے الفاظ میں:

''یہ مسئلہ اس وقت طے ہوگا جب یا تو سڑکوں کو آیند و روند کے واسطے چھوڑا جائے اور اسے ہر کام کے لیے بند کر دیا اور یا پھر ان کو بالکل کھول دیا جائے۔ ہندو آزاد ہوں کہ جس وقت چاہیں اور جہاں چاہیں اور جب تک چاہیں، ڈھول اور تاشے پیٹا کریں اور سنکھ اور قرنا پھونکا کریں۔ اور ساتھ ہی ساتھ مسلمان آزاد ہوں کہ جتنی گائیں جس طرح سجا کر جس سڑک سے جہاں چاہیں لے جائیں، اور ان کا گوشت چاہے ڈھکا لے جائیں چاہے کھلا لے جائیں، کوئی کسی کا مزاحم نہ ہو۔ چند دن میں آپ ہی دونوں ملتیں ایک دوسرے کی ضد پر اپنے فرائض ادا کرنا چھوڑ دیں گی اور شرافت اور بھل منسی کی طرف عود کریں گے اور حقیقی رواداری کو اپنا شعار بنائیں گے''۔ (ص196)

پھر آگے چل کر مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ

''اسلام کسی مسلمان کو اس کا حکم نہیں دیتا کہ وہ مسجد کے سامنے مجرد باجہ کے ساتھ ایک جلوس کے نکلنے پر کسی کا مقابلہ کرے، اور اس سے جنگ وجدال کرے۔ باجہ کو زبردستی روکنا میرے نزدیک مناسب نہیں ہے لیکن اگر کوئی ملت مسلمانوں کی عبادت میں خلل انداز ہو اور اس پر اصرار کرے کہ نہیں ہم تو تمھاری عبادت کے وقت ضرور شور مچائیں گے تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو حسب استطاعت اس خلل اندازی کو بند کرنا چاہیے، اس بارے میں پھر وہی احکام شریعت متعلق سمجھے جانے چاہئیں جو فرائض مذہبی کی ادائیگی کی بندش کے متعلق ہیں''۔ اور سب سے آخر میں:

''ہندو مسلمانوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں اور مسلمان ہندوؤں کو۔ اور حکومت اس تماشہ کو دیکھ رہی ہے، اور کسی سے آج مرعوب نہیں، اور دونوں کو مرعوب کیے ہوئے ہے۔ یہ ایک سیاسی جنگ ہے اور میں نہ اسی کو گوارا کر سکتا ہوں کہ مسلمان ہندوؤں سے مرعوب ہو جائیں اور نہ اسی کو چاہ سکتا ہوں کہ ہندو مظلوم رہیں'' (190)

تازگی اور زندگی کلام جوہر کا خاص جوہر ہیں۔ بارہ بارہ پندرہ پندرہ برس کے لکھے ہوئے مضامین معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کل کے لکھے ہوئے ہیں۔ تشریح طلب واقعات وتلمیحات پر مرتب کو حواشی دینے ضرور تھے۔ اور یہ ایک بڑی کمی ہے جو تہذیب کتاب کے سلسلہ میں رہ گئی۔ لیکن اس پر بھی کوئی نمایاں بے لطفی کتاب پڑھنے میں معلوم نہیں ہوتی۔

جنوری 27 میں ''نئی دہلی'' میں مرکزی اسمبلی کے نئے اسمبلی ہال کا افتتاح وائسرائے بہادر کے ہاتھوں بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا۔ امیدوں کے سبز باغ نے کتنوں کے غنچۂ دل کھلا رکھے تھے۔ محمد علی بقول خود ''حکومت کی بے وفائی پر وفاداری کا حلف نہ اٹھانے کا حلف اٹھا چکے تھے''۔ تاہم اردو کے قلیل الاشاعت لیکن سب سے زیادہ معزز باثر روزنامہ کے ایڈیٹر تو بہرحال تھے۔ تماشہ میں شریک ہوتے ہیں اور دوسرے دن اپنے ناظرین کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتے ہیں:

''...... کتنے سادہ لوح ہوں گے جو اپنے دلوں میں اس آرزو کو چھپائے ہوئے امید وبیم کی حالت میں ہوں گے، کتنے اور ہوں گے جن کا اصولِ زندگی عشاق کی طرح یہی ہے کہ

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

یہ نام کے عاشق اسی میں مگن ہیں کہ اصلاحات کی توسیع کے لیے شاہی کمیشن مقرر ہو یا نہ ہو نائب شہنشاہ کا درشن تو نصیب ہوگا۔ اسی سے بھاگ کھلیں گے۔ ملک کے وارث خالق کے حکم سے تو خلق ہی تھی، مگر اس نے بادشاہت اور شہنشاہیت کے فریب میں آکر اپنی آزادی کیا بلکہ ملکیت کو غلامی کے عوض کب کا بیچ دیا، اور وہ حقیقت شناس ہستیاں بھی جن سے توقع کی جاسکتی تھی کہ ''اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً'' کے ترکہ کو کبھی کسی کے فریب میں آکر نہ چھوڑیں گی، وہ بھی بظاہر دولت وثروت سے محروم ہو کر اس فریب پر مجبور تھیں کہ بادشاہوں کو دیکھ کر قصیدوں میں لکھیں۔

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے اب فریب طغرل و سنجر کھلا

کاش طغرل و سنجر کے فریب کی طرح قیصر ہند اور نائب قیصر کا فریب کھل جاتا اور کوئی ان تماشائیوں سے کہتا کہ۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا می روی

32 کروڑ کی مخلوق، یعنی نسل انسانی کا ایک خمس مٹھی بھر اجنبیوں کی غلامی میں مبتلا ہے۔ جو سات ہزار میل کے فاصلہ سے سات سمندر پار آکر ان پر حکومت کرتے ہیں، عجوبۂ روزگار یہ چیز ہے۔ اور پانچ براعظموں کے تماشائی دور دراز مقامات سے آکر تاج بی بی کا روضہ اور دلی کا

لال قلعہ یا قطب مینار کی جگہ اس کا تماشا کریں تو تعجب کی بات نہیں، لیکن آج یہ مخلوق خود دوسروں کی تماشائی ہے!......

ہر ملت اور ہر طبقہ کے لوگ تھے، اور سب سے زیادہ نمایاں وہ وارثان تاج وتخت تھے جو نائب السلطنت کے سید تھے ہاتھ پر جلوہ کناں تھے جن میں سورج بنسی بھی تھے اور چندر بنسی بھی۔ مگر آج جن کا جگمگاتا لباس اور زنانہ زیوران کو اس چمکتے ہوئے ذرہ سے ہرگز زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ جن پر حکومت کا مہر عالم تاب چمکتا ہو اور ان کو بھی چمکارہا ہو۔

میں اگر فقط نامہ نگار ہوتا تو مجلس کی ترتیب، شرکائے جلسہ کا لباس یا آج کل کے فیشن کے مطابق بعض کی بے لباسی نہیں تو کم لباسی، اور فوج کی صف آرائی اور جلوس کے طمطراق کا حال لکھتا، مگر کیا کروں کی میرا حقیقی شعار نہیں۔ ملک وملت کے عشق میں قلم کو بھی ایک آلہ کی حیثیت سے اٹھالیا گیا ہے......

لاؤڈ اسپیکر زنے ایک ایک حرف یعنی کھانسی، کھنکار، سنوادی مگر گوش مژدہ ہوش ساری تقریر میں ایک حرف مطلب بھی نہ سن سکا۔ سارے ملک میں سرکار والا تبار کے قدوم میمنت لزوم نے تفریق وانتشار پھیلا رکھا ہے لیکن لاٹ صاحب بہادر نے فرمایا کہ یہ قانون سازی کا گول گھر اتحاد کی علامت ہے!......اور کیوں نہ ہو، ہمارے تعلیم یافتہ ہمیشہ ہمیش اسی چکر میں رہیں گے اور یہ دَائِـرَـةُ السَّـوْءِ اسی طرح تا قیامت باقی رہے گا......خیال تھا کہ کم سے کم شاہی کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوگا مگر تقریر کا خاتمہ صرف دعا پر ہوا۔ دوا کا نام بھی نہ تھا۔ لاٹ صاحب نے دعا فرمائی کہ خدا اس عمارت میں کام کرنے والوں کو عقل وعدل کی توفیق دے۔ ہم سوا آمین کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ خدایا اگر ان کو عدل نہیں دیتا تو ہمیں کو عقل دے کہ اس فریب عدل سے نجات پائیں۔ (ص302 تاص306)

اب تو کسے یاد رہ گیا ہوگا لیکن بات کچھ ایسے بہت دنوں کی نہیں۔ وسط 26 کی ہے کہ وطنیت کے بعض علمبرداروں نے ''فرقہ واریت'' سے تنگ آکر ایک نئے نظام کی طرح ''انڈین نیشنل یونین'' کے نام سے، صدائے طبل ودہل کے ساتھ نہیں صدائے ناقوس کے ساتھ ڈالنی چاہی تھی، پنڈت موتی لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے دستخط سے جو دستور العمل اس نئی مجلس

کا شائع ہوا، اس کی رو سے ہر ممبر کو سب سے پہلے یہ اقرار کرنا تھا کہ ''ہندوستان کی ترقی اور آزادی کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتیں ایک مشترکہ اور متحدہ ہندستانی قومیت پیدا کریں''۔ اور اقرار نامہ کی سب سے آخری دفعہ یہ تھی کہ ''میں کسی ایسے فرقہ وارنہ نظام کا جسے یونین نے قومیت ہند کو نقصان پہنچانے والا قرار دیا، نہ ممبر ہوں اور نہ ممبر ہوں گا''۔ محمد علی کا قلم اس پر ایک طویل تبصرہ کے دوران میں رواں ہوتا ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک مقصد اور حصول مقصد کے لیے وسائل کا تعلق ہے اس نئی تحریک میں کوئی ندرت نہیں، اور جس خطرے کا ذکر خود ان حضرات نے اپنے بیان میں کیا کہ کہیں یہ مجلس بھی صرف یہی نہ کرے کہ موجودہ سیکڑوں مجالس میں ایک اور اضافہ کرے، اس سے بچنا اس مجلس کے لیے آسان معلوم نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں مذہب سازی اور مجلس سازی کا ایک مہلک مرض پیدا ہو گیا ہے اور بجائے اس کے کہ ہم موجودہ مذاہب میں سے کسی کے احکام کی پابندی کریں یا پرانی مجالس سے کسی کے مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کریں، ایک نئے مذہب اور نئی مجلس کے بانی ہونے کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہر مذہب اپنے معتقدین پر کچھ نہ کچھ ذمہ داری عائد کرتا ہے اور ہر مجلس اپنے اراکین کو کسی نہ کسی قدر ضرور پابند کرتی ہے، اس ذمہ داری کا شعور واحساس تو ہم میں پیدا نہیں ہوتا اور ان پابندیوں سے تو ہم اکتا جاتے ہیں، مگر نئے نئے مذاہب اور نئے نئے مجالس کی بنیاد ڈالنے کے لیے ہمارے ہاتھ کھجلاتے رہتے ہیں۔ ایک ندرت البتہ اس نئی مجلس کے بانیوں نے رکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے اراکین تمام مجالس ملی سے علاحدہ ہو جائیں۔ مگر یہ ندرت ایسی زبردست تھی کہ اسی باعث یہ نئی مجلس عجوبۂ روزگار بنی جاتی تھی۔ اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے اور انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے دوزخ کی جو تصویر کھینچی ہے اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے دروزہ پر کندہ ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو، امید کو باہر چھوڑ آئے۔ پنڈت موتی لعل نہرو صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے بظاہر ایک نئی جہنم پیدا کرنا چاہی تھی جس کے دروازہ پر کندہ ہو کہ جو اس میں داخل ہونا چاہے وہ ملت ومذہب کو باہر چھوڑ آئے یقیناً ایک مختلف الا جزا اگر متحدہ اور مشترکہ قومیت کو ترتیب اور نشوونما دینا ہر محب وطن اور وطن پرور ہندستانی کا فرض ہے۔ لیکن بے سوچے سمجھے کمال تعیم کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ کمیونزم یا

ملیت، نیشنلزم یا قومیت کے منافی ہے۔اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ کوئی شخص قوم پروری یا ملت پروری کے جوش میں لوگوں کو اپنے کنبہ اور خاندان کی پرورش اوران کی تعظیم سے منع کرتا پھرے......قومیت کو منتہائے نظر بنانا یورپ کی تقلید جامد ہے اور وطنیت خود دشیت یا بت پرستی ہے۔اسلام وطن پرور ہے مگر وطن پرست نہیں"۔(ص259تا262)

''زفرق تا بقدم ہر کجا کہ ی نگرم''۔سارے مجموعہ میں چھوڑنے کے قابل کون سا مضمون ہے، سب ہی مضامین اول سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہیں۔لیکن بعض مضامین پھر بھی خصوصیت کے ساتھ،اورایک سے زائد بار پڑھنے کے قابل ہیں۔اگر کسی اور غرض سے نہیں تو کم از کم مضمون نگار کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے۔اور محمد علی کے دماغ اور دل دونوں کا عکس دیکھنے کے لیے۔اوران ہی میں ایک وہ مضمون ہے جو وسط کتاب میں مسودۂ قانون توہین انبیاو بزرگانِ دین پر ہے۔کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ آج سے چند سال قبل ادھر تعزیرات ہند میں کوئی دفعہ انبیا وہادیان مذہب کی توہین کو جرم قرار دینے والی تھی ہی نہیں!اوراس سے بعض خبیث طبع لوگوں کو گندہ ذہنی کے خوب مواقع مل جاتے ہیں۔چنانچہ 27 میں اس قسم کا ایک سخت مسلم آزار واقعہ لاہور میں پیش آیا۔ہائی کورٹ سے ملزم بری ہوگیا۔سارے اسلامی ہند میں ایک تہلکہ مچ گیا سب نے ناانصاف جج پردھاوا بول دیا۔حواس صرف محمد علی کے درست رہے، پرزور رائے عامہ کے خلاف ہمدرد میں لکھا کہ ''قصور قاضی کا نہیں، قانون کا ہے''۔(افسوس اور حیرت ہے کہ یہ مضمون لائق مرتب کی نگاہِ انتخاب سے کیسے رہ گیا؟)اور پھر خود ہی ایک مسودۂ قانون اس مضمون کا پیش کیا جو بالآخر اسمبلی میں پاس ہوکر دفعہ 295۔الف کے نام سے تعزیرات ہند کا جز بنا۔

اس مسودہ کو مسلمان ارکان اسمبلی کی خدمت میں پیش کر کے لکھتے ہیں کہ ''مجھ جیسے عطائی نے ایک مسودۂ قانون تیار کیا ہے، جسے آج اطبائے حاذق کے سامنے نہایت ادب اور عجز وانکسار کیساتھ پیش کررہا ہوں''۔باقی

جہاں تک خود میرا تعلق ہے مجھے نہ قانون کی ضرورت ہے نہ عدالتوں کی حاجت،اگر کوئی ہندستانی بھائی اس قدر شقی القلب ہے کہ مجھ سے تو ایک معمولی جانور کا تقدس منوا کر اس سے متمتع ہونے کے حق سے میری دستبرداری کا طالب ہے لیکن انسان جو اشرف المخلوقات ہیں،

ان میں سب سے اشرف نبی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم اور باعث تکوین عالم (ﷺ) کا جو تقدس میرے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اس کا اتنا پاس بھی نہیں کرتا کہ اس برگزیدہ ہستی کی توہین کر کے میرے قلب کو چور چور کرنے سے احتراز کرے، تو ہندوستان کو اس غلامی سے نکالنے کے لیے جس میں آج وہ مبتلا ہے اور جو گاؤ پرست ہندوؤں کے وجود سے کہیں زیادہ ہمارے اور ہماری ملت کی بے حرمتی کا سبب ہے، مجھ سے جہاں تک صبر ہو سکے گا، صبر کروں گا اور جب صبر کا جام لبریز ہو جائے گا تو اٹھوں گا اور یا تو اس گندہ دل، گندہ دماغ، گندہ دہن کافر کی جان خود لے لوں گا یا اپنی جان اس کوشش میں کھودوں گا''۔ (ص345)

انگریزی حکومت کے طرزِ کار پر دوسروں نے کیا کچھ کہہ ڈالا اور کتنا کچھ کہہ ڈالا ہے محمد علی کو دیکھیے، ان کی ساری ذہنیت کا عطر دو لفظوں میں کھینچ کر رکھ دیا ہے:

''انگریز کسی کو ہرگز اس وقت تک کچھ نہیں دیتے جب تک انھیں اس کا یقین نہ ہو جائے کہ اگر آج اتنا بھی نہ دیا گیا تو کل کو اس سے دوگنا اور تگنا دینا پڑے گا''۔ (ص350)

جامعہ ملیہ کے خصوصیات کی تفصیل میں رسالے کے رسالے اور کتابوں کی کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر دیکھیے خود بانی جامعہ کس حیرت انگیز اعجاز کے ساتھ اس کی خصوصیات چشم زدن میں گنا جاتا ہے:

''خدا پرستی، ملت پروری، وطن دوستی'' (ص418)

ایسی کتاب جو اسلامی جوش، سیاسی معلومات، تاریخ سیاسیات ہند، اور ایک نہیں بیسیوں مسائل حاضرہ کے اعتبار سے قابل قدر ہو، اور دلچسپ زبان اور دلکش حسن بیان کے ساتھ، باوجود تقریباً 600 کی ضخامت اور خوشنما جلد و طباعت کے کل 8 روپے میں ہاتھ آ جائے اس کے مطالعہ سے اپنے کو محروم رکھنا (اگر شدید تنگ دستی ہی مانع ہو، جب تو مجبوری ہے ورنہ اور کسی عذر کی بنا پر تو) خود اپنے ذوق سلیم پر ظلم کرنا ہے!

......☆☆☆......

ضمیمہ:13

زندگی کی آخری شب

(مولانا شوکت علی صاحب کا مکتوب روزانہ خلافت میں)

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

لندن۔ 9/1/31
عزیزم جعفر صاحب

السلام علیکم

میں نے دفتر کے تمام کارکنوں کے نام خطوط لکھے تھے، تاکہ کسی کو شکایت باقی نہ رہے، آپ کا نمبر آج آیا ہے، اور یہ خط میں خونِ جگر سے لکھ رہا ہوں۔ تم کو سلام کیا لکھتا۔ ہر ہفتہ تمھارا خط آتا تھا اور حالات معلوم ہوتے تھے۔ اوروں کو سلام لکھتا یا اس کو جو دفتر میں بہت سے کاموں کا ذمہ دار تھا۔ آج کے خط سے تمھاری شکایت دور ہو جائے گی۔ مگر میں یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ میں جب خلافت کے لیے خط لکھتا ہوں تو وہ خط سب خلافت کے حامیوں کے لیے ہوتا ہے۔ اب چند خطوط میرے اور آئیں گے اس کے بعد میں خود بمبئی اور ہندوستان میں ہوں گا۔ اور کولھو کا بیل پھر کام میں لگ جائے گا۔ اور اب انشاءاللہ پہلے سے زیادہ طاقت اور کامیابی کے ساتھ کیوں کہ خدا بہت

سے نئے کام کرنے والے پیدا کر رہا ہے۔ آج محمد علی کا جنازہ پانچ دن کفن دوزوں کے مکان پر آرام کر کے ظلمری بندرگاہ کو گیا اور 3 بجے جہاز ''زکنڈہ'' اس کو لے کر بیت المقدس کو روانہ ہو گیا۔ 16 جنوری کو بیگم محمد علی، زاہد اور میں اسی جہاز پر مارسیلز سے روانہ ہوں گے اور 21 جنوری کی صبح کو پورٹ سعید پہنچیں گے جہاں مصر، شام، فلسطین اور عراق کے عرب بھائی اس کو مسجد اقصیٰ میں دفن کریں گے۔ میرا بھائی کہو، بیٹا کہو، سردار کہو، غلام کہو، یا معشوق، مجھ سے رخصت ہو گیا اور اب میں اکیلا رہ گیا۔ بہت بے دست و پا ہوں مگر خدا پر بھروسہ ہے۔ اور ایک محمد علی کی جگہ دین مقدس کی خدمت کے لیے ہزار محمد علی پیدا کر دے گا۔ میں تم سے دور ہوں پھر بھی خوب جانتا ہوں کہ اس موت سے مسلمان بجائے کمزور ہونے کے کمر پر ہمت باندھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ خیر جو کچھ ہوا اسلام کا یہ مخلص سپاہی میدان جنگ میں ایک زبردست ڈنکے کی چوٹ مار کر سپاہی کی موت مر گیا، اور اسلام کا نام کر گیا۔ ہنستا اور کھیلتا دنیا سے اٹھ گیا۔ آج دل میں صدمہ ہے، ہاتھ حالات لکھتے ہوئے کانپتا ہے، پورا قصہ بمبئی میں آ کر سناؤں گا۔ اس وقت تک دل پر قابو پا جاؤں گا۔ آج عبارت آرائی کو دل قبول نہیں کرتا پھر بھی جبر کر کے ضروری حالات لکھتا ہوں۔

محمد علی کا علاج صرف احتیاط، سکون اور پرہیز تھا۔ سب سے زیادہ آرام اور سکون کی ضرورت تھی، مگر وہ کہاں نصیب ہوتی۔ مسلمانوں کی موت اور زیست کا سوال تھا، کس طرح خاموش رہتا۔ عمر بھر کبھی احتیاط کام کے وقت نہ تھی، اب کیا کرتا۔ اور پرہیز کون عمر بھر کرتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوت 10 برس معمولی احتیاط کی زندگی بسر کرنے میں کام کرتی اس کو دس مہینے میں خرچ کر دیا۔ اور بی اماں مرحومہ کی طرح یہ طاقت خرچ کر کے میٹھی نیند سو گیا۔ آخری دورہ تقریباً 20 دسمبر کو پڑا تھا۔ میں 23 دسمبر آئرلینڈ 4 دن کے لیے جانا چاہتا تھا مگر اس کی وجہ سے ملتوی کر دیا، نرسوں کے ہاتھ میں وہ دے دیا گیا۔ اور ہم سب شب و روز ہائیڈ پارک ہوٹل میں موجود رہتے تھے۔ اور میں تو وہیں سوتا تھا۔ 48 گھنٹہ کی کشاکش کے بعد خدا نے خطرہ سے باہر کر دیا اور اب امید پڑی تھی کہ وہ کام سے باز آئیں گے اور خدا ان کو صحت دے گا اور وہ ہندوستان مع الخیر واپس جائیں گے۔ طبیعت اس قدر درست ہو گئی تھی کہ 31 دسمبر کو گلنار بانو کی سالگرہ کے موقع پر محمد علی نے بہت سے احباب کو ہندستانی شفیع ہوٹل کے تیار کیے ہوئے کھانے کی دعوت دی۔ آج تک کبھی

کسی اولاد کی سالگرہ نہیں منائی تھی۔ جب میں نے منع کیا تو کہا کہ "مت روکو، میرا چل چلاؤ کا وقت ہے، وہ بچی خوش ہو جائے گی"۔ میں اسی دن آئر لینڈ چلا گیا کیونکہ محمد علی کی صحت اچھی تھی اور وہاں جانا ضروری تھا تاکہ مقررہ ملاقاتیں ہو جائیں، اور آئر لینڈ کے حالات سے واقف ہو جاؤں۔ چار دن رہ کر واپس آیا اور اتوار کی صبح کو 6 بجے لندن واپس آ گیا۔ مگر گاڑی ہی میں ساڑھے 8 گھنٹہ تک رہا۔ بیماری کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی اور کیسے ملتی۔ ہفتہ کے دن صبح کو ایک گھنٹہ بھر نواب عبدالقیوم سے سرحد کے معاملہ پر مفصل گفتگو کی۔ وہ خود سرحد کی کمیٹی کے ممبر تھے اور چاہتے تھے کہ سرحد کے معاملہ میں مسلمان نہایت سختی سے ساتھ کھڑے ہوں اور مطالبات میں کمی نہ کریں۔ اس کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ سندھ کے بارہ میں سر شاہنواز بھٹو سے گفتگو کی۔ تیسرے پہر کو بیگم عبدالعزیز صاحب لاہور سے 2 گھنٹے مسلمان عورتوں اور اسلامی حقوق کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ دو دن قبل تین گھنٹے متواتر سر جوفرے کاربٹ کے سامنے شارٹ ہینڈ والے کو ہندو مسلم مسئلہ پر اپنے خیالات لکھوائے اور دوسرے دن ڈھائی گھنٹے خود اس کے پروف صحیح کیے۔ 5 بجے شام کو ہفتہ کے دن ڈاکٹر سے کہا کہ میں تھک گیا ہوں ذرا آرام کر لوں۔ دو گھنٹے آرام کیا۔ جب 7 بجے غفلت سے ہوشیار ہوئے تو دماغ درست تھا مگر زبان بند ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر رائٹز کو، ڈاکٹر انکلیشر یہ نے بلایا اور انھوں نے کہا کہ دماغ میں خون کی رگیں پھٹ گئی ہیں اور اب کوئی امید نہیں ہے۔ یہ واقعہ قریب 11 بجے شب کا تھا۔ سب کو پہچانتے تھے، سیدھی ٹانگ، سیدھے ہاتھ اور سارے جسم پر سیدھی طرف اثر تھا، فالج کا سا۔ 2 بجے سے بالکل غافل تھے اور ساڑھے 9 بجے دن کو نہایت سکون کی حالت میں دنیا سے کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

عبدالرحمٰن صدیقی صرف علاوہ نرس کے کمرہ میں تھے۔ انھوں نے سب کو پکارا اور لوگ بھی آ گئے۔ اور میں انتقال کے 15 منٹ بعد پہنچا اور گلنار بانو تھوڑی دیر قبل۔ جن لوگوں نے ہفتہ کے روز ملاقات کی تھی ان کو اس طرح گزر جانے کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ ساری قوت صرف کر دی تھی اور دماغ اس قدر اسراف کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

میں جب اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو اسی وقت صاحب خانہ نے اطلاع دی اور میں سیدھا ہوٹل

آیا۔ بیگم محمد علی کی خدمات اور ہمت کا تذکرہ کرنا بیکار ہے، شب وروز خدمت کی۔ مظفر علی ویانا سے ملنے کو آ گئے تھے، وہ زاہد بھی حاضر رہتے تھے۔ شعیب صاحب کو جب کام سے فرصت ملتی تھی تو وہ بھی دن میں تین چار پھیرے کرتے تھے۔ ہز ہائنس مہاراجہ الور تو اس رات بالکل نہیں سوئے۔ پانچ یا چھ مرتبہ کمرے میں دیکھنے آئے اور بعض اوقات سونے کے کپڑوں میں اور ننگے پاؤں۔ ان کو اس قدر صدمہ ہے کہ جب مجھ کو دیکھتے ہیں رنج کی وجہ سے سلام کر کے منہ دوسری طرف کر لیتے ہیں۔

عزیزی میں تم سے کیا کہوں۔ میں نے محمد علی کا چہرہ اس قدر خوبصورت کبھی نہیں دیکھا۔ میٹھی نیند اطمینان سے جیسے کوئی سوتا ہوتا ہے۔ آخری وقت میں ذرا تکلیف نہ تھی، سکون تھا۔ مسلمان تھا، مسلمان کی موت اس کفرستان میں مرا، اور تمام ملک والوں سے خراج تحسین وصول کیا۔ خبر ہوتے ہی ہر طرف سے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ یہاں کے ہوٹلوں سے میت صرف رات کے 12 بجے کے بعد باہر نکالی جاتی ہے، لندن کے تقریباً سب ہندو اور مسلمان آنے والے آتے تھے اور زیارت کر کے چلے جاتے تھے۔ گول میز کے سب ارکان باری باری آتے تھے۔ سفید چادر چہرہ پر پڑی تھی، جب ہٹا کر منہ کھول کر میں دیکھتا اور دکھاتا تھا تو بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص آرام سے سو رہا ہے، آنکھ یا چہرہ پر تکلیف کا ذرہ برابر بھی پتہ نہ تھا۔ شام ہی کو ہوٹل کے منیجر نے مشہور کفن تیار کرنے والے کارخانہ لبس کو بلایا جس کی منتظمہ ایک معقول عورت تھی۔ زاہد جا کر سب جگہ دیکھ آئے۔ رات کے 12 بجے موٹر کر کے اور امٹریچر بھی اور بہت ہوشیار اٹھانے والے احتیاط سے میت کو اٹھا کر لفٹ سے نیچے لائے اور موٹر میں رکھا۔ میں اسی موٹر میں سوار ہوا۔ نئے مکان میں رکھا جہاں رات ہی کو دوا کا انجکشن دے کر نعش کو ایسا کر دیا گیا کہ دس برس تک بھی خراب نہ ہو۔ میں اور دو مسلمان عزیز طالب علم اس مکان میں زمین پر سوئے۔ صبح کو عبدالرحمٰن صدیقی، مظفر اور میں نے غسل میت دیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے، زبان پر کلمہ طیبہ اور قرآن مجید تھا اور محبت والے ہاتھ خدمت کرتے تھے۔ زاہد ٹیلیفون پر بیٹھے سب کو اطلاع دیتے تھے۔ نماز جنازہ شام کو 6 بجے پیڈنگٹن ٹاؤن ہال میں ہوئی جہاں 400 یا 500 آدمیوں کی گنجائش تھی۔ عالیشان جگہ تھی، تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ 5 بجے ہی لوگ آنا شروع ہو گئے۔ مہاراجہ کشمیر، نواب صاحب بھوپال، مہاراجہ بیکانیر اور تمام ارکان اور وزراء مع وزیر ہند موجود تھے۔ جب جنازہ کی موٹر آئی تو ہز ہائینس شاہ ولی

خان سفیر افغانستان، عفیفی پاشا سفیر مصر، نوری اسفند یاری صاحب سفیر ایران، شیخ حافظ وہبہ صاحب سفیر حجاز اور مسلمان ارکان گول میز کانفرنس اور دیگر حاضرین نے کندھا دیا۔ باہر انگریزوں کا ہجوم تھا اور اندر بھی تمام جماعتوں کے انگریز نمائندے تھے۔ ہال میں نماز ہوئی۔ کفن کا بکس یہاں بہت خوبصورت بناتے ہیں اور قیمتی ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی آئینہ کی کھڑکی تھی جس میں سے چہرہ نظر آتا تھا۔ اخبار والے موجود تھے، سب نے فاتحہ کے بعد زیارت کی اور ایک گھنٹہ کے بعد میت پھر قیام گاہ پر گئی۔ خوبصورت پھولوں کے ہار مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ دھولپور، مہارانی کوچ بہار، حیدرآباد دکن کے وزرا اور لندن کے ہندستانی طلبہ کی طرف سے رکھے تھے۔ دولہا اچھا تھا۔ قریب ہی میں سوتا تھا۔ دن اور رات تلاوت قرآن مجید ہوتی تھی۔ 5 جنوری کو نماز جنازہ ہوگئی۔ آج صبح میت جہاز پر گئی۔ ہندوستان لاتے تھے مگر فلسطین کا تذکرہ عبدالرحمٰن صاحب صدیقی نے کیا تھا۔ اور بعد کو مفتی اعظم کی دعوت اور تمام برادران وطن کی دعوت پر مسجد اقصیٰ میں دفن کا قصد کیا گیا تا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے تعلقات برادران عرب سے وابستہ ہو جائیں۔ 21 کو پورٹ سعید پہنچیں گے۔ بیگم صاحبہ اور زاہد جہاز سے بعد تجہیز و تکفین بمبئی آئیں گے اور میں خشکی سے شام اور بغداد ہوتا ہوا کراچی جہاز سے پہنچوں گا۔ وہاں ہمارے عزیز دوست اور قابل فخر مجاہد رؤف بھی موجود تھے اور میت کو کندھا دے رہے تھے۔ اخبارات اور تاروں میں تمام جگہوں سے اظہار ہمدردی ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ اس مجاہد اسلام کی موت بھی کام زندگی سے اچھا کرے گی۔ دعا فرمایئے۔ بمبئی تاروں سے ہمدردی کی خبر ملی۔ خدا تم کو جزائے خیر دے۔ بمبئی تو مسلمانوں کی خدمت کچھ کر گیا۔

......☆☆☆......

ضمیمہ:14

آخری لمحے اور وصیتیں

(از: جناب حافظ ہدایت حسین صاحب بیرسٹر ایم ایل سی کانپور)

مولانا محمد علی کے میرے تعلقات 1894 سے تھے جب کہ میں اور وہ دونوں علی گڑھ میں تعلیم پاتے تھے، یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ جو تعلقات برادرانہ اس وقت قائم ہوگئے تھے، ان میں باوجود اکثر اختلاف آرا کے کبھی کمی نہ ہوئی بلکہ اور زیادہ مستحکم ہوتے گئے۔

خلافت کے زمانہ میں بھی نان کوآپریٹر نہیں تھا لیکن جب وہ آتے میرے یہاں ہی ٹھہرتے۔ اختلاف آرا سے ذاتی تعلقات میں فرق نہ آیا۔

جس جواں مردی سے انھوں نے ملک اور قوم کی خدمت کی وہ عدیم المثال ہے، آخر میں ان کو برادران ہنود سے بہت شکایت پیدا ہوگئی تھی، وہ اعلانیہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو ہرگز وہ اس حیثیت میں نہیں دیکھ سکتے جس میں کہ ہندو ان کو رکھنا چاہتے ہیں۔ 11 نومبر 1930 کو جناب نواب صاحب چھتاری نے ...... اپنے چند ہندو دوستوں کے ایٹ ہوم اپنے جائے قیام الگزینڈر ہوٹل لندن میں دیا تھا۔ اس میں صاحب وزیر ہند مسٹر ویجوڈ بین بھی تشریف لائے تھے۔ میں اور مولانا ایک کوچ پر بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ مسٹر بین نے مجھ سے کہا کہ مولانا سے باتیں کرنا فخر ہے، تم اکیلے ہی یہ فخر کیوں کر حاصل کر سکتے ہو، مجھ کو بھی حصہ دو۔ میں ہٹ گیا اور مسٹر بین مولانا

کے پاس بیٹھ گئے اور بہت دیر تک دونوں میں ہندوستان کے متعلق گفتگو ہوتی رہی، مولانا نے وہاں بھی مسلم مطالبات کی تائیدوترجمانی کی تھی، 15 نومبر سے مولانا محمد علی کی حالت اچھی نہیں تھی لیکن باوجود سخت بیماری کے مولانا راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جاتے اور حصہ لیتے تھے۔ پرائم منسٹر سے ان کی یہ شکایت پیدا ہوگئی کہ وہ مسلم مطالبات کو سننے پر ہمدردانہ طریقہ سے تیار نہیں ہیں، وفات کے چندروز قبل وہ صاحب فراش ہوگئے تھے، میں ان کو دیکھنے جب مجھے فرصت مل جاتی تھی برابر جاتا تھا، بعض مرتبہ روز بعض مرتبہ دوسرے تیسرے روز۔ اپنی وفات سے کچھ ہی قبل ایک نہایت، معرکتہ الآرا مضمون مسلم مطالبات پر انھوں نے لکھوا کر پرائم منسٹر کو بھیجا جو ممبران راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کو بھی بھیجا گیا۔ جس روز ان کا انتقال ہوا ہے اس دن بھی میں ان کو دیکھنے گیا تھا۔ مجھ کو انھوں نے یٰسین شریف تلاوت کرنے کو کہا اور اس کے بعد آخری وصیت مسلم مطالبات کے متعلق انھوں نے یہ کی کہ ہندوستان میں پانچ صوبے مسلمانوں کی اکثریت والے قائم کرانے میں بہ جان ودل کوشش کرنا اور اگر یہ پانچ صوبے قائم ہوجائیں تو انتخاب جداگانہ کو اس طرح ترمیم کردینا کہ مسلمانوں کے انتخاب میں چالیس فیصدی کم سے کم مسلمانوں کے ووٹ ہوں اور کم سے کم دس فیصدی دیگر اقوام کے ووٹ ہوں۔ آخرالذکر ترمیم میں چند دقتوں کا ہونا انھوں نے تسلیم کیا، لیکن یہ کہا کہ میں انتخاب جداگانہ کو ترک کرنے کی رائے نہیں دے رہا ہوں بلکہ اس میں ترمیم کی رائے دے رہا ہوں۔ گفتگو بہت صاف تھی اور آخر وقت تک ہوش وحواس بجا تھے۔ افسوس کہ مسلمانوں کا ایک ایسا چراغ کہ جس کی اس وقت سخت ضرورت تھی گل ہوگیا۔ خدائے تعالیٰ نے اس کو بخش دیا اور اپنے الطاف سے اس کو مالا مال کردیا، لیکن مسلمانوں کو اس کی رہبری سے محروم کردیا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات
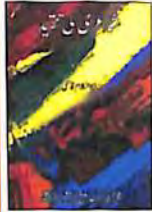
₹ 196/-

ISBN 978-81-7587-925-6

9 788175 879256

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025